نعرۂ حق

سوامی وویکانند

کی

تقاریر اور تصانیف سے انتخاب

جلد اوّل

رامکرشن مشن نئی دہلی

طبع اوّل ۱۹۶۳ء

پبلشر :- سوامی سوواہانندا

قیمت مجلّد آٹھ روپیہ — مجلّد فل کلاتھ دس روپیہ

NÁRA - E - HÂQ

(Selections from Swami Vivekananda)

VOL. I

[FIRST EDITION]

Price :- *Rs. 8·00* ... ... ORDINARY BINDING

Rs. 10·00 ... ... DELUXE BINDING

1963

Published by

SWAMI SWAHANANDA

Ramakrishna Mission

NEW DELHI

Printed at Kapur Printing Press, Delhi

پیش لفظ

سوامی وِویکانند کی سویں سالگرہ کی تقریب پر رامکرشن مشن کی مختلف شاخوں سے اُن کے لیکچروں اور دُوسری تصانیف کے مجموعے اپنے دیش کی زبانوں میں شائع کیۓ جارہے ہیں اس سلسلے میں سوامی سوداہانندا جی سیکریٹری رامکرشن مشن نئی دہلی نے فیصلہ کیا کہ سوامی وویکانند کی تقاریر اور تصانیف کا انتخاب اُردو زبان میں بھی چھپوایا جائے چنانچہ اس بنا پر اُنہوں نے سرکار ہند کے محکمہ تعلیم سے مالی امداد کا وعدہ بھی لے لیا اُس کے بعد اُنہوں نے سوامی جی کی تصانیف کا انتخاب میرے ہاتھ میں دے کر ترجمہ کی ذمہ داری مجھے سونپ دی اِس لئے نہیں کہ مجھ میں اس کام کی کوئی خاص اہلیت ہے بلکہ اس وجہ سے کہ سوامی جی کی اُردو دان طبقے میں زیادہ واقفیت نہیں۔

بہرحال میں نے اپنے ایک دوست کی معرفت اُردو کے دو مانے ہوئے ادیبوں کو ترجمہ کرنے پر راضی کر لیا "نعرہ سنیاس"، "پارلیمنٹ آف ریلیجنز" اور دُوسرے چند مضامین کا ترجمہ میں نے اپنے سر لے لیا اور باقی کام ان بزرگوں کے سپرد کر دیا۔ خیال تھا کہ کتاب چھ مہینوں میں تیار ہو جائے گی لیکن جب مجھے ترجمہ وصول ہوا تو میں نے دیکھا کہ اِس پر نظرِ ثانی کی ضرورت تھی مجھے ان دونوں عُلما کا پورا پورا احترام ہے، لیکن شاید چونکہ اُنہوں نے جلدی سے کام ختم کرنے کی کوشِش کی اس لئے اُن کے ترجمے میں وِویکانند کے خیالات کی پُر زور روانی نہ آسکی۔ مجھے ان صفحات میں وِویکانند کی رُوح نظر نہ آئی اُن کی بھگتی اور پریم کا رس نہ مِلا۔ کسی حد تک تو مترجم مجبور تھے کیونکہ انتخاب میں بہت سے "نوٹ"[1] شامل تھے، "یہ نوٹ" سوامی جی کے لیکچروں کی یادداشتیں ہیں اور بحیثیت نوٹ ہونے کے ان میں روانی ہو ہی نہیں سکتی

---

[1] Notes

روانی پیدا کرنے کے لئے انہیں کچھ نہ کچھ پھیلانا پڑتا ہے میں نے ایسا کرنا ضروری سمجھا ہے کیونکہ اِس مجموعے کا مقصد وویکانند کے خیالات کو اُن بھائیوں تک پہنچانا ہے جو براہِ راست انگریزی میں اُن کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کر سکتے وویکانند کے الفاظ میں معنی اس طرح کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں کہ بسا اوقات اُن کے محض لفظی ترجمہ سے (خواہ وہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو) پُورے معنی پیدا ہی نہیں ہوتے، اس لئے جہاں تک مجھ سے بن پڑا ہے، میں نے ترجمہ کرتے وقت یا اُس پر نظرِ ثانی کرتے وقت معانی کو خصوصًا پیشِ نظر رکھا ہے، چونکہ انگریزی اور اُردو کا اپنا اپنا محاورہ ہے، اس لئے بیان کی روانی اور خیال کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی خاطر میں نے کہیں کہیں کچھ جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں۔ اُمید ہے کہ اہلِ ذوق کو اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہوگا۔

مجھے اپنی خامیوں کا پُورا احساس ہے لیکن سوامی وویکانند سے عقیدت اور محبت کے تقاضے نے مجھے اپنے "ایڈیٹر" کے حقوق کا استعمال کرنے پر مجبور کر دیا اور میں نے اپنے ادیب دوستوں کے ترجمہ کو مرتب کرتے وقت اس میں جہاں کہیں بھی سوامی جی کے معانی کو اُبھارنے کے لئے ضروری سمجھا کم و بیش ردّ و بدل کر دیا ہے یہاں تک کہ بہت سے حصّوں کو کلیتًا اپنے الفاظ اور اپنی طرز میں لکھ دیا ہے، اِن "قلم درازیوں" کے لئے میں اُن بزرگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وویکانند کے نام پر وہ مجھے بخش دیں گے البتہ اس گستاخی کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تمام کتاب کا بیان کسی قدر ہموار ہو گیا ہے؛

کتاب کو اس طرح تہذیب و ترتیب دینے کے لئے مجھے کافی وقت نکالنا پڑا بعض اوقات ترجمہ پر نظرِ ثانی کرنے میں براہِ راست اصل سے ترجمہ کرنے سے بھی زیادہ وقت لگنے لگا، یہ دیکھ کر میں نے سُوامی جی کی اجازت سے کچھ منتخب شدہ مضامین کی بجائے[1] دُوسرے مضمون چُن کر اُن کا براہِ راست ترجمہ کر دیا تاکہ کتاب کی اشاعت میں اور زیادہ تاخیر نہ ہو، اطلاعًا عرض ہے کہ اس مجموعہ میں جن مضامین کا ترجمہ میں نے خود کیا ہے وہ یہ ہیں نعرہ سنیاس، مذہب کیا ہے، مذہب اور معیارِ عقل، پارلیمنٹ آف ریلیجز، دنیا کے مذہبی رہنما، پیرما، حق و رعائت۔

ان حالات میں کتاب کی تیاری میں اندازے سے کہیں زیادہ وقت لگ گیا، دُوسرے چینی حملے نے میری مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا دفتر میں کام کی بھرمار کی وجہ سے آٹھ نو گھنٹے صرف ہونے لگے اور اس کام کے لئے رات ہی کو وقت نکالنا پڑا نتیجہ یہ ہوا میری صحت خراب ہو گئی اور مجھے کچھ عرصہ بسترِ علالت پر دراز رہنا پڑا اس کے بعد کام کی رفتار بہت کم کرنا پڑی اور کتاب وقت پر شائع نہ ہو سکی اس کے لئے میں سوامی جی سے معافی کا خواستگار ہوں۔

---

[1] اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان مضامین کو ترتیب دے کر اس مجموعے کی دُوسری جلد میں شامل کرنے کا ارادہ ہے۔

آخر میں مجھے اُن سب اصحاب کا شکریہ ادا کرنا ہے، جن کی مدد اور تعاون سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے، میرے مترجم دوستوں میں سے ایک صاحب نے خصوصاً میرا ہاتھ بٹایا۔ کتابِ ہٰذا کے کاتب اور اُن کے معاون کاتبوں نے متواتر محنت اور جانفشانی سے کتابت کی اور پورے تحمّل سے غلطیوں کی تصحیح کی۔ میرے ایک دوست نے ساری کتاب پڑھ کر کتابت اور زبان کی غلطیوں کو دُور کرنے میں مدد دی اور پرنٹرز نے ۲ دو ہی مہینے میں کتاب چھاپ کر شائع کر دی لیکن ممکن ہے کہ باوجود سب کی محنت کے کتاب میں کئی غلطیاں اور خامیاں رہ گئی ہوں ناظرین سے میری التجا ہے کہ اِن سے درگزر کرتے ہوئے وِویکانند کے خیال اور معانی کی طرف توجہ دیں۔

بھگوان کی دَیا سے کتاب اب چھپ کر تیار ہو گئی ہے، آج میں اپنی عقیدت کے اس پھُول کو سوامی وِویکانند کی خدمت میں بھینٹ کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اُن کی معرفت اِسے اُس یزدانی ہستی کے پاک قدموں میں جگہ نصیب ہو، جس کی الہامی آواز خود وِویکانند کے وجود میں مجسم ہوئی تھی۔



جنونِ آگہی ہوں شورشِ حق و صداقت ہوں
میں طوفانِ مسرّت ہوں میں عرفانِ محبت ہوں
سدا جو کامیاب و کامراں ہو میں وہ لذّت ہوں
نہ ہو جو آشنائے رنجِ کلفت میں وہ راحت ہوں

سوامی جی کے سوانحِ حیات

سوامی وویکانند کا جنم ۱۲ جنوری ۱۸۶۳ء کو کلکتہ کی ایک بستی "سملہ" میں ہوا۔ اُن کے پتا وشوانا تھ دت ہائی کورٹ کے ایک نہایت کامیاب وکیل تھے۔ اُن کی ماتا کا نام بھونیشری دیوی تھا۔ سوامی وویکانند کی تعلیم وتربیت پر اُن کا خاص طور پر اثر پڑا۔

سوامی جی کا نام نریندر ناتھ دت تھا لیکن سب اُنہیں "نرن" نام سے پکارتے تھے۔ نرن ایک شرارتی اور چنچل لڑکا تھا۔ دوسروں کو خوب چڑاتا تھا اور اپنی بہنوں کو خاص طور پر تنگ کرتا تھا۔ سکول میں بھی کھیل کود میں سب سے آگے رہتا تھا لیکن ساتھ ہی اس قدر ذہین کہ اُستاد اُسے کچھ نہیں کہتے تھے۔

وہ نہ صرف جسمانی طاقت کا مالک تھا۔ بلکہ اُس کے دماغ میں بھی کسی قسم کا خوف وہراس نہ تھا ایک دفعہ وہ درخت سے چھلانگیں لگا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے کہا کہ ایسا مت کرو، اِس درخت میں ایک بھوت رہتا ہے۔ وہ تمہاری گردن مروڑ دے گا نرن اُس وقت تو چپ ہو گیا لیکن جب وہ بزرگ چلے گئے تو پھر چھلانگیں لگانے لگا۔ جب اُس کے دوست نے بھوت کا خوف دلایا تو نرن ہنس کر کہنے لگا۔

"اگر کوئی بھوت ہوتا تو اب تک میری گردن کئی بار مروڑ دی گئی ہوتی"۔ نرن کی شرارتوں سے تنگ آکر ایک دفعہ اُس کی ماں نے کہا:۔ میں نے بھگوان شِو سے ایک سپوت مانگا تھا لیکن اُنہوں نے مجھے ایک بھوت بھیج دیا ہے"۔

نریندر کی قابلیت اور ذہانت کے سب قائل تھے۔ سکول اور کالج میں اُس کی دھاک تھی اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ اُس کی یادداشت نہایت تیز تھی اِس کے کالج کے پرنسپل نے لکھا ہے:۔ میں نے اِتنی قابلیت

اور ذہانت کا مالک کسی لڑکے کو نہیں پایا۔ یہ بڑا ہو کر نمایاں کام کرے گا۔

کالج کی تعلیم نے نریندر کے دل و دماغ میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا۔ اُسے اپنے مذہب کی سچائی پر شک ہونے لگا۔ وہ اصلاح کی تحریکوں میں حصّہ لینے لگا اور برہمو سماج سے اُس کی عقیدت بڑھنے لگی لیکن اس سے اس کی تسلّی نہ ہوئی۔ وہ مہرشی دیوندر ناتھ ٹیگور کے پاس گیا اور کہا مہاراج کیا آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟ وہاں سے منفی میں جواب پا کر وہ شری رام کرشن کے پاس دکشنیشور کے مندر میں پہنچا۔ جب اس نے اُن سے وہی سوال کیا تو اُنہوں نے کہا" بھگوان کے درشن ہو سکتے ہیں بھگوان سے عین اسی طرح گفتگو کی جا سکتی ہے جیسے میں تم سے کر رہا ہوں" آہستہ آہستہ نریندر شری رام کرشن کے نزدیک ہوتا گیا اور آخر ان کا ہی ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بھی نریندر کو اپنی ساری شکتی اور آگہی دیدی وویکانند کے اپنے لفظوں میں "مجھے جو کچھ ملا ہے اپنے گورو دیو سے ملا ہے۔ اور جو کچھ میں کر پایا ہوں وہ سب گورو دیو جی کی برکت ہے"۔ شری رام کرشن سے ہی انہوں نے اپنی زندگی کا مشن حاصل کیا اور وہ مشن یہ ہے کہ انسانوں میں خدا کو جلوہ گر دیکھ کر سب کی سیوا کرو، ہر جاندار کو بھگوان کا رُوپ مان کر اس کی سیوا ہی سچا دھرم ہے۔

شری رامکرشن ۱۸۸۶ء میں دُنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ اُن کے بعد نریندر نے ان کے سب چیلوں کو یک جا کر کے رام کرشن مشن کی بنیاد رکھی اور جلد ہی شری رامکرشن دوسرے چیلوں کے ساتھ خود بھی سنیاس اختیار کر لیا اسکے بعد نوجوان سنیاسی نے ہندوستان کا دَورہ کیا۔ اِس دورے میں اُن کے دل پر ہندوستان کی غریبی اور مفلسی کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے اپنے دیش کی ترقی اور بہبودی کے لئے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں "میں مُلک بھر گھوم آیا ہوں، مجھے اپنی آنکھوں سے عوام کی غریبی اور مصیبت دیکھ کر بہت ہی دُکھ ہوا اور میں خوب رویا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جب تک تنگ دستی اور دُکھ کو نہ مٹایا جائے۔ مذہب اور آتم گیان کی باتیں کرنا بالکل فضول ہے۔ میں اپنے دیش باسیوں کی بھلائی اور بہبودی کے لئے امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں وہ مذہب ہی کیا جس کے سائے میں غریبی بستی ہو، میرا دل اب بہت وسیع ہو گیا ہے اور مجھے دیش بھر کے درد کا احساس ہے۔

چنانچہ دیش کی عزّت بڑھانے اور اُس کے لئے دُنیا کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر وہ ۱۸۹۳ء میں امریکہ گئے۔ وہاں انہوں نے پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں شرکت کی اور اپنی تقریر سے تہلکہ مچا دیا۔ یہاں اُنہوں نے دُنیا کو کائناتی اخوت کا پیغام سُنایا اور کہا " بھگوان تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں وہ سب کے سب اس تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں" اُنہوں نے اعلان کیا کہ " اگر دُنیا میں کوئی ایک عالمگیر مذہب ہونا ممکن ہے تو وہی مذہب ہو سکتا ہے جس کا کسی خاص مقام یا وقت سے کوئی تعلق نہ ہو جو کسی بھی طرح محدود نہ ہو۔ جس کے سُورج کی روشنی بھگوان کرشن اور یسوع مسیح کے پُجاریوں اور دوسرے سب مذاہب کے پیروؤں کو یکساں طور پر حاصل

ہو"۔

اِس تقریر کے بعد سوامی جی کا نام امریکہ اور یُورپ میں گونج اُٹھا۔شہرت اور عزت کے اس ریلے میں بہہ جانا بہت ممکن تھا۔لیکن وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دیش اور اپنے فرائض کو نہ بھولے۔ وہ اپنے خطوط میں لکھتے ہیں:۔

نوجوانو! دیش سیوا کے لئے کمر کس لو، بھگوان کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھتے چلو، پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ کون گرا۔بس بڑھتے چلے جاؤ"۔

سوامی جی امریکہ اور یُورپ میں تین سال تک متواتر کام کرتے رہے، ۱۸۹۶ء کے آخر میں وہ بھارت کے لئے روانہ ہو کر ۱۸۹۷ء کے شروع میں کامیابی کا سہرا باندھے اپنے دیش میں واپس آئے۔یہاں تمام ملک اُن کے قدم چُومنے کو جُھک رہا تھا اُن کا جو عالی شان استقبال ہوا۔وہ ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے سوامی جی نے جنوب سے شمال تک مُلک کا فاتحانہ دورہ کیا اور اُن کے جان بخش پیغام سے لوگوں میں ایک نئی زندگی کی لہر دَوڑ گئی۔سوامی جی نے اعلان کیا:۔

"ہمارا مذہب وہی ہے جو ہمیں مَردانگی سِکھائے۔ہماری تعلیم وہی ہے جس سے مَردانگی کی بُو آئے۔ہمارا فلسفہ وہی ہے جو ہماری قوت میں اضافہ کرے۔یہی ایک معیار ہے حقیقی رُوحانیت کا، یہی کسوٹی ہے سچّے مذہب کی، جو مذہب، جو نظریہ، جو فلسفہ انسان کو جسمانی، ذہنی، اخلاقی یا روحانی کمزوری کی طرف لے جاتا ہے۔وہ سراسر جھوٹ ہے۔ افترا ہے، اس کے پاس نہ بھٹکو۔وہ زہرِ ہلاہل ہے اُسے چھُو تک نہیں وہ موت ہے، زندگی نہیں۔سچ وہی ہے جو تقویت دے سچ ہی پاکیزگی ہے۔سچ ہی علم ہے۔جھوٹ جہل کا دوسرا نام ہے سچ کے علم بردار و! اُٹھو اور کمزور کرنے والی ریتوں کو خیرباد کہو اور جان بخش سچی رُوحانیت کو اپناؤ، یاد رکھو، جیسے زندگی بذاتِ خود مشکل پسند نہیں ہے۔اسی طرح سچائی، پیچیدہ نظریوں کا سِلسلہ نہیں، حقیقت سادگی کے مترادف ہے"۔

اُنھوں نے فرمایا:۔"ہر فرد کی طرح ہر قوم کا بھی ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جو اس قوم کی صدیوں کی تاریخ سے اُبھرتا ہے، یا یوں کہو کہ ایک بُنیادی سُر ہوتا ہے جس میں اُس قوم کی اور کارروائیاں دوسرے سُروں کی طرح مِل کر ایک میٹھا راگ پیدا کر دیتی ہیں۔کوئی قوم اپنے مرکزی موضوع سے مُنحرف ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی"۔

"ہندوستان کا مرکزی موضوع، اس کا تاریخی راستہ، اس کے راگ کا بنیادی سُر رُوحانیت ہے۔ہاں ایک بار پھر بھارت کے ہر طبقہ اور ہر ذات کے مَرد عورت اور بچّے کو سُنا دو کہ تمہاری وراثت رُوحانیت ہے کوئی

طاقتور ہو یا کمزور، اونچی ذات کا ہو یا نیچی ذات کا، امیر ہو یا غریب، عالم و فاضل ہو یا اَن پڑھ، اُلٹا، سب میں ایک ہی لازوال رُوحِ اعظم ہے جو کسی طرح بھی محدود نہیں جس کو جاننے سے بے حد طاقت حاصل ہوتی ہے جس کو جان کر ہر چیز ممکن ہو جاتی ہے اور نیکی اور بھلائی کرنے کی بیکراں قوت بیدار ہو جاتی ہے ہر شخص سے پکار پکار کر کہہ دو۔ " اُٹھو جاگو، اور آگے بڑھو، رُکنا تمہارا کام نہیں، جب تک منزلِ مقصود تک نہ پہنچ جاؤ، بڑھتے چلو" تمہاری کمزوریوں نے تم پر جادو کر رکھا ہے تمہیں موت کی نیند سُلا دیا ہے جاگو، یہاں کون ہے جو کمزور ہے، رُوح کو کون کمزور کہتا ہے تم ہر طاقت کے مالک ہو تم ہر جگہ ہو، کوئی شے تم سے چھپی نہیں ہے، اپنے آپ کو جانو، اُٹھو اور اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر تم بھی انا الحق کے نعرے لگاؤ اپنے آپ سے غافل ہونا ہی خُدا سے مُنکر ہونا ہے اُٹھو اور یقینِ خودی کا اعلان کر دو۔"

اِس پیام کے ساتھ ساتھ سوامی جی نے اپنے ہم وطنوں کو اُن کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، فرمایا" ہم اپنی ذلّت کے خود ذمہ دار ہیں، ہمارے آبا و اجداد نے عوام کو صدیوں سے روندا ہے، وہ غریب اس قدر پس گئے ہیں کہ اُنہیں اپنے انسان ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ سالہا سال سے اِن مظلوموں سے فقط محنت و مشقت کا کام لیا گیا ہے۔ ان کی حالت باربرداری کے جانوروں کی سی بن گئی ہے، اِن غریبوں کا خیال کرو۔ اگر تمہارے دل میں اِن کروڑوں اِنسانوں کے لئے درد نہیں ہے تو تمہاری روحانیت، تمہاری ویدانت ایک بے معنی نظریہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی! کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے دل میں اپنے نام کی شہرت کی خواہش نہیں ہے؟ کیا تمہیں اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں ستاتا؟ کیا تمہیں اپنی جائیداد کی فکر نہیں ہے؟ اور کیا تم میں اپنی جان پر کھیل جانے کی ہمت ہے؟ اگر تم اِن تمام مرحلوں سے گزر چکے ہو تو دیش بھگتی کے رستے پر پہلا قدم اُٹھانے کے قابل ہو۔ دیش بھگتی کوئی آسان اور سستی چیز نہیں ہے، فضول باتوں سے دیش بھگتی نہیں ہوتی۔ جاؤ اپنے لئے کوئی عملی پروگرام بناؤ۔ محض نکتہ چینی سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ عملی طور پر دوسروں کی مدد کرو۔ کسی دُکھیارے کا دُکھ بانٹو۔ کسی غمزدہ کی دل جوئی کرو اور اُنہیں دکھ درد کے اندھیرے سے نکال کر زندگی کی روشنی میں لے آؤ۔ اس کام میں تمہارے رستے میں بہت سی مشکلات آئیں گی تمہیں بڑی سے بڑی مشکلوں کو مٹانے کی ہمت پیدا کرنا ہوگی۔ اگر تمام دُنیا تمہارے راستے میں حائل ہو جائے تو بھی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تمہیں اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر تم میں یہ طاقت ہے تو تم ضرور کامیاب ہوگے مگر جان لو کہ یہ کام آسان نہیں۔"

سوامی جی نے اس طرح دیش بھگتی اور خدمتِ خلق کا پرچار کیا۔ اِس کام کو سرانجام دینے کے لئے کئی مٹھ قائم ہوگئے۔ کتنے ہی سیوا آشرم بن گئے۔ جو آج بھی قائم ہیں۔ اور عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔

۱۸۹۹ء میں سوامی جی مغرب کے دوسرے دورے پر روانہ ہوگئے۔ کچھ دنوں لندن میں رُکے، اِس کے بعد سال بھر امریکہ رہے پھر پیرس، وی آنا، استنبول، ایتھنز اور قاہرہ ہوتے ہوئے دسمبر ۱۹۰۰ء میں واپس بھارت پہنچ گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کا کام ختم ہوچکا تھا۔ اُن کی صحت بھی جواب دے چکی تھی۔ اب وہ زیادہ وقت کلکتہ میں اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں گزارنے لگے۔

آہستہ آہستہ سوامی جی نے سب کاموں سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دُنیا کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ آخر وہ دن آپہنچا۔ ۴ جولائی ۱۹۰۲ء شکروار کی صُبح کو وہ مندر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے تین گھنٹے تک دھیان میں مگن رہے۔ اِس کے بعد ماتا کے چرنوں میں ایک میٹھا بھجن اَرپن کیا جس کو سُنکر سب آشرم نواسی سُست ہوگئے۔ بہت دیر تک مندر سے بھجن کی میٹھی میٹھی لہریں اٹھتی رہیں۔ آخر سوامی جی سیڑھیوں سے اُترے اور آشرم کے میدان میں گھومنے لگے۔ دوپہر کا کھانا خلاف معمول سب کے ساتھ مل کر کھایا، اس کے بعد تین گھنٹے تک سنسکرت پڑھاتے رہے۔ شام کی پُوجا کے وقت وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور ایک گھنٹہ تک دھیان میں لگے رہے، اِس کے بعد بستر پر لیٹ گئے۔ اُن کی مالا اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ایک گھنٹہ کے بعد اُنہوں نے کروٹ لی۔ اور گہرا سانس لیا، پھر ایک دوسرا سانس لیا اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ شانت ہوگیا۔ سوامی جی ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح جگت ماتا کی گود میں ہمیشہ کے لئے سوگئے۔

سوامی جی کی عمر اس وقت اُنتالیس سال اور کچھ مہینے تھی وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں چالیس سال تک نہ جی پاؤں گا۔ اور ان کی یہ بات پُوری ہوئی لیکن دراصل وہ زندۂ جاوید ہیں۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں۔ لیکن وہ اب بھی اپنا کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

———×———

نعرۂ سنیاس

وہ نغمہ جو ہوا تخلیق کوہساروں میں
جواں ہوا جو ہمالہ کے پاک غاروں میں
لطیف جس کا ترنّم ہے آبشاروں میں
رواں دواں ہے جو گنگ و جمن کے دھاروں میں
جگاؤ نغمۂ سنیاس، اوم تت ست اوم [1] (۱)

جسے جہان کی آلائشیں نہ چھو پائیں
زن و پسر کی کوئی بندشیں نہ چھو پائیں
زمین و زر کی جسے خواہشیں نہ چھو پائیں
حصول مرتبہ کی کاوشیں نہ چھو پائیں
وہ پاک نغمۂ سنیاس، اوم تت ست اوم (۱)

جو لامکاں ہے وہ آئے مکاں میں پھر اک بار
بندھے خدائے زماں خود زماں میں پھر اک بار
اٹھاؤ شورِ اناالحق جہاں میں پھر اک بار
یہ نعرہ گونج اٹھے آسماں میں پھر اک بار
کہ میں ہوں سچدانند[2] اوم اوم تت ست اوم (۱)

---

[1] سوامی جی کی نظم کے بند کا نمبر واوین میں درج کر دیا گیا ہے۔ [2] سچدانند کے معنی صفحہ ۹ پر دیکھیے۔

تمام کاٹ دو پاؤں کی بیڑیاں اپنی
یہ موہ مایا کی سونے کی بندشیں ساری
یہ بھاری آہنی زنجیر بغض و کینہ کی
تمہاری اصل غلامی نہیں۔ ہے آزادی

لگاؤ نعرۂ سنیاس اوم تت ست اوم (۲)

یہ فرقِ نیک و بد و امتیازِ سود و زیاں
یہ خوفِ نارِ جہنّم یہ شوقِ باغِ جناں
نشاط و غم کا تصوّر یہ بیش و کم کا گماں
نظر کا پھیر ہے اضداد کا یہ سارا جہاں

طلسم سوز ہے سنیاس، اوم تت ست اوم (۲)

نڈر ہو، شیر ہو، سنیاس کے علمبردار
شرابِ کہنۂ توحید سے ہو تم سرشار
غلام موت تمہاری۔ حیات باجگذار
جگاؤ سوئی ہوئی قوتوں کو پھر اک بار

لگاؤ نعرۂ سنیاس، اوم تت ست اوم (۲)

اندھیرے پھیلے ہیں چاروں طرف جہالت کے
یہ سائے اندھی محبت کے بہری نفرت کے
گھنے ہیں گیسوئے شبرنگ حسنِ فطرت کے
چھپے ہیں سینکڑوں سورج جہاں حقیقت کے

تو خود ہے مطلعِ انوار، اوم تت ست اوم (۳)

جمی ہوئی ہے یہاں تہ پہ تہ اندھیرے کی
مگر یہ ہوتا ہے دھوکا کہ ایک ہلکی سی!
دیئے کی لو ہے کہیں دُور ٹمٹاتی ہوئی
اُمید اندھی ہے جاتی ہے ٹھوکریں کھاتی
مٹاؤ ظلمتِ سنسار[1] اوم تت ست اوم (۳)

جہاں خیال ہے جاہ و جلال و حشمت کا
جہاں جنونِ امارت ہے خوف عسرت کا
جہاں مظاہرہ ہوتا ہے محض طاقت کا
وہاں گزر نہیں ہوتا کبھی صداقت کا
سچائی عجز و مروت میں ڈھونڈ تت ست اوم (۱۰)

جہاں ہے شور بپا دار و گیر و وحشت کا
جہاں مچا رہے طوفاں ہمیشہ طاقت کا
فساد و جنگ و جدل ہو جہاں جہالت کا
وہاں خموش ہی رہتا ہے سازِ فطرت کا
جگاؤ نغمۂ سنیاس اوم تت ست اوم (۱۰)

جہاں بھرا ہے ہوس نے سوانگ اُلفت کا
جہاں جنون کی حد تک ہے پیار عورت کا
جہاں یہ ہوتا ہے دن رات خون محبت کا
وہاں ہمیشہ ہی ہوتا ہے راج ظلمت کا
نکل تو مایا کے چنگل سے اوم تت ست اوم (۱۰)

---

[1] اگر "ظلمتِ سنسار" ناگوار گزرے تو "ظلمتِ کونین" پڑھ لیجیے۔

وصالِ یار سے گھٹتی نہیں ہے بُوالہوسی
شرابِ عیش سے بڑھتی ہے اور تشنہ لبی
ہوں لاکھ پوری نہیں مٹتی خواہشات کبھی
ہمیشہ رہتی ہیں لذّات کچھ ادھوری سی

بس ایک اوم مکمل ہے اوم تت ست اوم (۳)

بس ایک اوم کو اپناؤ اوم تت ست اوم
بس اوم ہی میں سما جاؤ اوم تت ست اوم
تم اپنی اصلِ خودی پاؤ اوم تت ست اوم
جنم مرن سے نکل آؤ اوم تت ست اوم

لگاؤ نعرۂ سنیاس اوم تت ست اوم (۳)

یہ سچ ہے کاٹتے ہیں سب وہی جو بوتے ہیں
ہنسی خوشی کوئی رہتے ہیں کوئی روتے ہیں
کسی کی جاگتے کٹتی ہے کوئی سوتے ہیں
کچھ ایسے عمر کے بس دن تمام ہوتے ہیں

کرم کے گھیر سے باہر ہے لیک تت ست اوم (۴)

جنم مرن کا یہ سب سلسلہ یہ مجبوری
یہ ڈال رکھی ہے اپنے گلے میں جو پھانسی
اُٹھو ودیک کے خنجر سے کاٹ دو رسی
تمہارے ہاتھ میں اپنے تمہاری آزادی

مٹاؤ اپنی غلامی کو اوم تت ست اوم (۷)

خیال و خواب ہیں سارے جہان کے رشتے
نہ بھائی بندھو نہ ماتا پتا کوئی تیرے
نہ کوئی دوست نہ دشمن نہ بیوی اور بچّے
تو ہے وہ آتما جس میں سمائے ہیں سارے
نہیں ہے تیرے سوا کوئی اور تت ست اوم (۵)

تو اپنا آپ ہی پردہ ہے اپنا منظر ہے
تو خود ہی عکسِ منور ہے خود مصور ہے
تو خود ہی شعر ہے نغمہ ہے خود سخنور ہے
تو اپنی آپ ہی منزل ہے اپنا رہبر ہے
جدھر بھی دیکھ اُدھر تو ہی تو ہے تت ست اوم (۶)

نہ نام ہے نہ ترا رُوپ ہے مگر تُو ہے
نسیم ہے نہ چمن ہے نہ گُل مگر بُو ہے
ترا مقام مُعیّن نہیں تو ہر سُو ہے
تو چھُپ کے آپ ہی اپنی نظر سے خود جُو ہے
شہود و غیب ترا کھیل اوم تت ست اوم (۶)

تو خود ہے مخزنِ انوار۔ اوم تت ست اوم
تو خود ہے خالق و فنکار۔ اوم تت ست اوم
تو اپنا آپ ہے شہکار۔ اوم تت ست اوم
تو اپنا آپ خریدار۔ اوم تت ست اوم
تو اپنے راز کا جویا ہے اوم تت ست اوم (۶)

کہاں کہاں تو پھرے گا بھٹکتا آوارا
نہ اس جہاں سے نہ اُس سے ملے گا کوئی پتا
نہیں ہے دونوں جہانوں میں کوئی تیرے سوا
تو اپنے آپ میں کھو کر خود اپنے آپ کو پا

خودی میں دیکھ خدا اوم اوم تت ست اوم (۷)

چمن بھی گُل بھی نسیمِ سحر بھی تجھ میں ہے
فلک کی وسعتیں اور بحر و بر بھی تجھ میں ہے
فسونِ حُسن و طلسمِ نظر بھی تجھ میں ہے
جنونِ آگہی۔ علم و ہُنر بھی تجھ میں ہے

تجھ ہی میں رازِ صُوَر ہے تمام، تت ست اوم (۸)

خود آگہی کی مئے ناب سے تو ہے سرشار
ترے لئے نہیں اپنے کوئی۔ کوئی اغیار
نہ تجھ سے پہنچے کبھی بھی کسی کو کچھ آزار
زباں پہ سب کے لئے ہو دُعائے خیر ہزار

کہ سب تجھ ہی میں سمائے ہیں اوم تت ست اوم (۸)

تو نعرہ زن ہو کہ "سنیاس پالیا میں نے
اُمید و یاس سے دامن چھڑا لیا میں نے
نشاط و غم کا تصوُّر مٹا لیا میں نے
حدودِ دشت و چمن کو مِلا لیا میں نے

مِلی ہے وسعتِ ست[۱] نام اوم تت ست اوم (۸)

[۱] اگر "وسعتِ ست نام" پر اعتراض ہو تو وسعتِ کو نین پڑھ لیجیے۔

گُناہ بھی مرے دامن میں پارسائی بھی
جہاں ہے نیکی وہاں مجھ میں ہے بُرائی بھی
خودی کا زعمِ غلط بھی ہے اور خدائی بھی
میں پابگل ہوں پہ ہے عرش تک رسائی بھی

جو اِن وآں سے میں گزرا تو اوم تت ست اوم (۸)

جو کام لینا تھا اس سے وہ لیا میں نے
مری بلا سے مرا جسم اب جئے یا مرے
گلوں سے لاد دے کوئی اُسے کہ ٹھکرا دے
مرے لئے ہے برابر بُرا بھلا جو کہے

مرے لئے تو ہر اک شئے ہے اوم تت ست اوم (۹)

تجھے جہان میں سنیاسی کم ہی سمجھیں گے
یہاں کے لوگ حقارت سے تجھ کو دیکھیں گے
ہر ایک بات پہ تیری ہنسی اُڑائیں گے
تجھے ستائیں گے پاگل تجھے پکاریں گے

دُعائیں سب کو دیئے جا تو۔ اوم تت ست اوم (۱۲)

نہیں ہے گھر نہ سہی وسعتِ فلک ہے، تری
گیاہ و برگ تو ہے بوریا نہیں نہ سہی
نہ بیش و کم ہے ترے واسطے، خوشی نہ غمی
خیالِ ہست میں آنے نہ پائے تیرے کمی

تو اپنے حال میں رہ مست اوم تت ست اوم (۱۱)

جو روکھی سوکھی ملے شُکر کر، خوشی سے کھا
ملے نہ کچھ بھی اگر مَن میں اپنے میل نہ لا
تری بلا سے جئے یا مرے یہ جسم ترا
کرم کا سِلسلہ تونے تو اپنا توڑ دیا

لیا جو اپنے کو پہچان اوم تت ست اوم (۱۱)

بہارِ بَن کے گلُستاں سے تو گزرتا جا!
گلوں میں شاخ میں غنچوں میں تُو نکھرتا جا
فضا میں نکہت و رنگ و جمال بھرتا جا!
تو ہر نظر کو شناسائے راز کرتا جا!

کئے جا عام تو جلوؤں کو اوم تت ست اوم (۱۲)

بس اب تو کٹ ہی گیا سارا جال مایا کا
یہ آنے جانے کا سب سِلسلہ ہی ختم ہوا
بس اب تو تیرا جنم پھر کبھی نہیں ہوگا
بس اب تو دُور نہیں دن وہ تیری مُکتی کا

کہ اوم میں تو سما جائے اوم تت ست اوم (۱۳)

جو چار دن ابھی باقی ہیں زندگانی کے
نشاطِ رُوح میں بس کر گزار دے سارے
جو دُردِ مے ابھی باقی ہے جام میں تیرے
مِلا کے آنکھ سے ساقی کی آنکھ سب پی لے

کہ بعد ازیں تو ہے بس اوم اوم تت ست اوم (۱۴)

مٹا حجابِ نظر کوئی فاصلہ نہ رہا
نہ کوئی بندہ رہا اور کوئی خدا نہ رہا
ذرا بھی آج مَن و تو کا ماجرا نہ رہا
نشاں نہ دُنیا کا باقی ہے ماسوا نہ رہا

جو تھا وہ ہے وہ رہے گا دوام تت ست اوم (۱۲)

(صفحہ ۱ سے آگے) سچدانند تین لفظوں سے مُرکب ہے۔ ست چت۔ آنند، یعنی وجودِ واحد۔ شعورِ مُطلق اور سرورِ مکمل
ویدانت کے مُطابق انسان بلکہ تمام کائنات کی اصل اور حقیقت "ست چت آنند" ہے۔ اِس خیال کو کئی
سال ہوئے میں نے یوں منظوم کیا تھا:۔

شعاعِ ہست کو تاریکیوں میں نیست کی لاکر
حسیں تاریکیوں کو چشمِ اِنساں کر دیا تُونے (ست)
شعُورِ بے خودی کو رنگِ احساسِ خودی دے کر
خودی کو ذرّے ذرّے میں نمایاں کر دیا تُونے (چِت)
نِشاطِ زندگی کو غم کے پردوں میں نہاں کر کے (آنند)
غمِ ہستی دو عالم میں پریشاں کر دیا تُونے
خودی نے مست نظروں سے شعورِ ہست کو پایا
تماشائے جہاں کا راز عُریاں کر دیا میں نے
خودی کو بے خودی، غم کو نشاطِ زندگی کر کے
شبِ تاریکِ ہستی کو چراغاں کر دیا میں نے

(ایڈیٹر)

مذہب کیا ہے؟

دندناتے ہوئے قوی ہیکل دیو کی طرح ریل کا انجن چھکا چھک چھکا چھک لپکتا چلا آرہا ہے، دھرتی اس کے پاؤں تلے کانپ رہی ہے، ریل کی پٹری پر لرزہ طاری ہے اور دُور ایک رینگتا ہوا ناچیز کیڑا اس ارتعاش کو محسوس کرتا ہے اور اپنی محدود قوت کو پوری طرح کام میں لاکر پٹری کے اوپر سے سرک جاتا ہے انجن بجلی کی سی سرعت سے گزر جاتا ہے لیکن کیڑے کو کچل نہیں پاتا پٹری کے بازو سے لپٹی ہوئی یہ سہمی ہوئی ننھی سی جان پھر اپنے ٹکڑے ہوئے جسم کو ڈرتے ڈرتے پھیلا کر زمین پر اُتر آتی ہے، زندگی موت کی زد سے نکل کر پھر اپنی راہ پر چلنے لگتی ہے۔

سوچو تو اس ناچیز کیڑے اور ریل کے دیو صورت انجن میں کیا فرق ہے؟ آخر اس چھوٹے سے کیڑے کی ہستی تو بس اتنی ہے کہ ایک لمحہ میں کچلی جاسکتی ہے، مگر پھر بھی یہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس میں جان ہے، اس کے برعکس انجن جسیم اور بھاری بھرکم ضرور ہے لیکن مُردہ مادہ ہے، بے جان ہے، اس کی تمام طاقت تمام سینہ زوری، تمام رفتار محض مشینی ہے، میکانکی ہے، اس لحاظ سے ریل کی پٹری پر رینگنے والا ناچیز کیڑا جسے انجن کا ذرا سا لمس بھی جان سے مار سکتا تھا انجن سے کہیں زیادہ عظیم ہے کیونکہ وہ لامحدود زندگی کا حصہ دار ہے، خود اس میں اپنی رفتار کو کم بیش کرنے کی طاقت ہے انجن کو جس طرح ڈرائیور چلائے اُسے ویسے ہی چلنا ہوتا ہے، یہی فرق ہے مُردہ اور زندہ میں، مشین میں طاقت ضرور ہے لیکن وہ بس وہی کام کرسکتی ہے، جس کے لئے اُسے بنایا گیا ہے، اس کی میکانکی حرکت زندگی کی حرکت نہیں، زندگی کی حرکت میں آزادی اور شعور شامل ہیں، مُردہ مادہ ہر صورت میں محبوس و محدود ہے، کیونکہ اس کی نقل و حرکت میں آزادی اور شعور

کو ہرگز دخل نہیں۔ زندگی آزادی اور خود مختاری کے مترادف ہے، یہی آزادی اور خود مختاری ہی ہمارا طرۂ امتیاز ہے، اور ہماری تمام زندگی دراصل اسی آزادی اور خود مختاری کو حاصل کرنے کی متواتر اور مسلسل جدّوجہد پر مشتمل ہے، ہم ہر لمحہ پہلے سے زیادہ آزاد ہونا چاہتے ہیں، ہماری تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنا ہی تو ہے، ہماری زندگی کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے، زندگی کا کمال مکمل آزادی ہی میں مضمر ہے، جب انسان ہر بندش سے آزاد ہو جاتا ہے تو اپنے کمال کو پا لیتا ہے۔

ہمیں اس بات کا پوری طرح شعور اور احساس ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاٹھ پُوجا، بھجن اور کیرتن زہد اور تقویٰ، ترک اور ریاضت غرضیکہ عبادت اور پرستش کی ہر مروجہ صورت کے پسِ پردہ حصولِ آزادی ہی کی خواہش اور کوشش کارفرما ہے، مثلاً ارتقا کی پہلی منزلوں میں انسان بھوت پریت کی پُوجا کرتا ہے۔ اپنے آبا و اجداد کی رُوحوں کی پرستش کرتا ہے، سانپ اور اژدہے کے آگے سر جھکاتا ہے، اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی عبادت کرتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس لئے تاکہ وہ غیر شعوری طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ ہستیاں اُس سے زیادہ بڑی ہیں، زیادہ طاقت ور ہیں اور اس کی آزادی کی راہ میں مُخل ہیں، وہ ان طاقتوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اُسے تنگ نہ کریں، اس کی خواہشات کی تکمیل کے راستے میں حائل نہ ہوں بلکہ اس حد تک مددگار ہوں کہ اُسے دنیا کی تمام نعمتیں محنت اور مشقت کے بغیر ہی مل جائیں۔ دُوسرے لفظوں میں انسان ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے ان طاقتوں سے جنہیں وہ اپنے سے بڑا سمجھتا ہے مدد طلب کرتا ہے یہی عبادت اور پرستش کی بنیاد ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو آدمی کی نظر ہمیشہ معجزات پر لگی رہی ہے، دنیا ہر وقت کسی نہ کسی معجزہ کی متوقع رہتی آئی ہے۔ ہم لاکھ کوشش کریں معجزے کی اُمید ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مابعد الفطرت کا خیال ہم سے جُدا ہونے نہیں پاتا بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہمارے دماغ کا وجود بذاتِ خود اسرار و معنیٔ حیات کی تلاش کے لاانتہا سلسلے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی ابدی جستجو مجسم اور مسلسل ہو کر انسانی دماغ بن گئی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ تر غیر تربیت یافتہ لوگ ہی مابعد الطبیعات کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ یہودی قوم ہمیشہ معجزے کی دُعا مانگ کر اس کا انتظار کرتی رہی ہے بلکہ ہزارہا سال سے تمام دنیا اُس معجزے کی راہ تک رہی ہے جس سے ہماری زندگی جنت کی زندگی میں مبدل ہو جائے بہر حال اس کا تو آپ کو اعتراف ہے کہ ہر شخص دنیا سے نالاں ہے کسی کو تسلی نہیں۔ چاروں طرف بے چینی اور ناشکیبائی ہے، ہم اپنی حالت پر راضی نہیں ہیں ہم آئے دن اپنے لئے ایک نیا نصب العین تیار کرتے ہیں

اور ابھی اس کی تحصیل کے لئے چند قدم ہی چلنے پاتے ہیں کہ ایک اور بلند تر آدرش تخلیق کر لیتے ہیں، ہم کسی خاص چیز، مقام یا مرتبہ کو حاصل کرنے کا تہیّہ کر کے اس کے لئے لگاتار سخت کوشش کرتے ہیں لیکن ہمیں جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری مطلوبہ چیز ہماری ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اس سے ہماری تسلی نہیں ہوتی، بس بے چینی اور مایوسی ہے کہ ہر وقت دل پر چھائی رہتی ہے، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر ہمارے نصیب میں انتشار اور بے قراری ہی لکھی ہے۔ اگر ہماری قسمت میں پریشانی ہی ہے تو ہمارے دماغ کو کیوں کسی غیر معلوم حقیقت کی تلاش ہے؟ ہمارے دل و دماغ کی خود اپنی حقیقت کیا ہے؟ اس جہاں گیر بے چینی اور بیقراری کے کیا معنی ہیں؟ اس کی وضاحت بس یوں ہی ہو سکتی ہے کہ انسان کی منزل مکمل آزادی ہے اور وہ ہر گھڑی زیادہ سے زیادہ آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جنم سے مرن تک انسان کی تمام زندگی کشمکش، اور جد و جہد میں مبتلا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی قوانین زندگی کے خلاف احتجاج کرتا ہے، اس کے گلے سے پہلی آواز ایک چیخ کی صورت میں نکلتی ہے جیسے کہ وہ زندگی کی غلامانہ بندشوں کے خلاف بغاوت کر رہا ہو، یہ احساس حبس جو انسان اپنے ساتھ لئے دنیا میں آتا ہے، آزادی کی آرزو کو جنم دیتا ہے، اور آزادی کی زبردست خواہش سے ہی ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا ہوتا ہے جو آزادِ مطلق ہے، خدا کا تصور ہماری سرشت میں داخل ہے، یہ تصور ہمارے وجود کا بنیادی عنصر ہے، ویدانت نے مکمل آزادی کے اس تصور کو ست چت آنند کا نام دیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ہستی، شعور اور مسرّت، ویدانت میں خدا کا بلند ترین تصور وہ ہستی ہے جس میں وجود، شعور اور نشاط بیک وقت کمال پر پہنچ گئے ہوں، بلکہ وجودِ ہستی و شعور نشاط ہی کے کمال کا نام خدا ہے۔ آگہی (گیان) کا عطر اور نشاط کا ست ہی خدا ہے، خدا ہماری زندگی کا مقصد ہے، ہم مدتوں اپنے دل کی اندرونی آواز کو دباتے رہے ہیں، ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ قوانین قدرت کے مطابق زندگی بسر کریں لیکن ہماری فطرت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمیں قدرت کے بظاہر اٹل قانونوں کے خلاف سر اُٹھانے پر مجبور کرتی ہے، بغاوت ہماری فطرت کا تقاضا ہے، ہم اس بات کو پوری طرح سمجھیں یا نہ اپنی اس فطری خاصیت کے معنی کو پائیں یا نہ لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے اندر ایک مسلسل کش مکش جاری ہے، یہ کش مکش عموماً غیر شعوری طور پر ہوتی رہتی ہے لیکن وقتاً فوقتاً یہ کش مکش شعور کی سطح پر بھی نمودار ہو جاتی ہے، ہمارے رُوحانی رُجحانات اور جسمانی مطالبات کے درمیان یا یوں کہئے کہ ہمارے دماغ اور نفس کے درمیان یا دماغ کے اعلیٰ اور ادنیٰ حصوں کے درمیان ہمیشہ یہ کش مکش جاری رہتی ہے، ایک چیز ہمیں محدود و محبوس رکھنے میں کوشاں ہے تو دوسری آزاد ہونے کے لئے بے تاب ہے، اسی کش مکش سے ہماری انفرادی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے، جہاں مکمل آزادی ہے وہاں انفرادیت کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا اسی

طرح جہاں قدرت کی مکمل غلامی ہے، وہاں مُردہ مادّے کا وجود ہوتا ہے زندگی کا ظہور نہیں ہوتا۔

زندگی بذاتِ خود احساسِ حبس کے خلاف بغاوت ہے، یہ جو تقریباً ہر مذہب میں جہنم کا تصور ملتا ہے اس عظیم حقیقت کا ثبوت ہے کہ ہم پیدائشی باغی ہیں، ہم قوانین کی بندشوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے چلے آئے ہیں، پیدائش کے وقت بھی ہم چلّا چلّا کر کہتے ہیں "ہائے یہ بندھن کیسا؟ یہ قانون کیوں؟" جب تک ہم قدرت کے قوانین کی پوری طرح پیروی کرتے ہیں ہماری ہستی مشینوں کے وجود سے بہتر نہیں ہوتی۔ کائنات کا کاروبار چلتا رہتا ہے اور اس میں میکانکی طور پر ہم بھی شامل ہیں لیکن ہم میں اس چکر سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں ہوتی، ہماری فطرت قوانینِ قدرت کا عکس ہو کر رہ جاتی ہے، جب ہم اس میکانکی درجہ سے اوپر اُٹھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی ایسی طاقت ہے جو قوانینِ قدرت کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہے تو ہم انسانی زندگی کے ارتقاء کا پہلا قدم اُٹھاتے ہیں ہماری رُوح آزادی کا نعرہ لگاتی ہے "آزادی، آزادی" "مطلق اور مکمل آزادی" کی صدا درونِ قلب سے اٹھتی ہے، لیکن صد حیف کہ اس مقام پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوانینِ قدرت نے ہمیں پوری طرح جکڑ رکھا ہے اور غلامی ہی ہمارے حصے میں آئی ہے۔

ہمارا یہ مجبوری کا احساس ہی خارجی امداد کی تلاش کا محرک بنتا ہے، ورنہ یہ سانپ اور اژدھے یا جن اور بھوت کی پُوجا کے کیا معنی؟ یہ معجزوں کی جستجو کے مختلف طور و طریق کیا مطلب؟ آخر ہم کیوں کہتے ہیں کہ ایک چیز میں جان ہے اور دُوسری میں نہیں؟ اس تلاش، اس جستجو، اس جد و جہد کا آخر کچھ تو مطلب ہونا چاہیئے یہ کشمکش، یہ سعی مسلسل بے معنی اور فضول تو نہیں ہوسکتی، یہ سب کرشمے ہیں انسان کی تلاشِ آزادی کے، لیکن ہم ابھی تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ قوانینِ قدرت کے دائرے میں آزادی ناممکن ہے۔ یہاں تو اٹل قانون ہے اور بس، ستاروں سے ذرّوں تک سب قانون قدرت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور قدرت کی تمام وسعتیں انسان کے لئے آزادی کو محدود کرنے کی حدیں ہیں، تمام عالمِ کائنات میں انسان کے لئے آزادی ناممکن ہے، لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کا یقین نہیں آتا۔ خارجی علم جسے ہم آج کل سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں ہزار ہا سال سے اس کوشش میں ہے کہ قدرت پر قابو حاصل کر کے آزادی حاصل کرلی جائے، لیکن ایک قانون سے گزر کر اُس سے زیادہ ہمہ گیر قانون سے پالا پڑتا ہے، پھر بھی ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ قدرت کی چار دیواری میں حصولِ آزادی ناممکن ہے، ہم ابتدائے زمانہ سے قوانینِ قدرت کا مطالعہ کرتے آرہے ہیں لیکن اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ خود انسان انہیں قوانین کا پابند ہے، ہماری رُوح بار بار آزادی کی رٹ لگائے جاتی ہے، جب سے انسان نے خدا کی آزاد مطلق ہستی کا تصور پایا ہے، وہ قدرت کی دوامی غلامی کو قبول کرنے کے لئے کسی صورت بھی راضی نہیں ہوتا، بندشوں میں گھر کر بھی انسان بندشوں کا قائل نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے "میں مانتا ہوں کہ

میں جنم سے غلام ہوں، مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ قدرت نے مجھے ہر طرف سے جکڑ رکھا ہے، میری مشکیں کس رکھی ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو قدرت کے ہر قانون سے بالا ہے، جو آزاد مطلق ہے، جو خود قدرت کا آقا اور حاکم ہے جس کے اشارے پر قدرت ناچتی ہے۔ میں غلام سہی پر اس ہستی کو پا کر آزاد ہو سکتا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ آزادیٔ مطلق یعنی خدا کا تصور انسانی دماغ کا اتنا ہی اہم اور بنیادی جزو ہے جتنا کہ فطرت کی مجبوری اور غلامی کا خیال اگر جبر ایک حقیقت ہے تو اختیار کا ہونا بھی لازم ہے، اگر انسان مجبور ہے تو اُس کا خُدا مختارِ کُل ہے، سچ تو یہ ہے کہ فطرت کی مجبوری اور خدا کے اختیار کے تصور دراصل دونوں اس ایک حقیقت کے دو رُخ ہیں جسے ہم آزادیٔ مطلق کہہ سکتے ہیں، آزادی کے بغیر زندگی ناممکن ہے، آزادی کے بغیر کوئی پودا تک اُگ نہیں سکتا، کوئی کیڑا تک رینگ نہیں سکتا، فرق صرف اتنا ہے کہ پودے یا کیڑے میں زندگی کبھی انفرادی شخصیت کے درجہ تک اٹھا ہوتا ہے لیکن آزادی کا احساس غیر شعوری طور پر ان میں بھی کارفرما ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پودا قدرت کا غلام نہیں بلکہ اپنی خاص صورت اور اپنی مخصوص قسم کے تحفظ کے لئے زندہ رہتا ہے یہی حال زندگی کی دُوسری صورتوں کا ہے۔

جبر اور اختیار کی کش مکش ہر جگہ اور ہر وقت جاری ہے۔ بظاہر ہر قدم پر ہماری آزادی قوانینِ قدرت کی پابند معلوم ہوتی ہے لیکن جتنا ہی مادی دُنیا کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے ان وسیع بندشوں سے نکلنے کا خیال بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے، جیسے ہمارا علم مادّیات بڑھتا ہے اور ہم قوانین قدرت کی عالم گیری سے واقف ہوتے ہیں ویسے ہی ان ہمہ گیر قوانین سے بالا اور آزاد حالت کا تصور بھی زیادہ کشادہ اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اور اس طرح جبر اور اختیار کی یہ مسلسل جنگ جاری رہتی ہے یہ جنگ کبھی ایک صورت اختیار کر لیتی ہے کبھی دوسری شکل میں نمودار ہوتی ہے، وقت اور مقام کے لحاظ سے، اور انسانی ارتقا کے مطابق مختلف مذہب اور مسلک ظہور میں آتے ہیں اور نئے نئے اعتقاد والے فرقے پیدا ہوتے ہیں، صوری اختلافات کی وجہ سے یہ فرقے آپس میں برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، بہت حد تک جبر اور اختیار کے تصادم کی یہ صورتیں ناگزیر ہیں جبر کی حدیں بڑھیں گی تو آزادی بھی ان حدوں کو عبور کرنے کے لئے اور زیادہ مکمل صورت اختیار کرے گی، اگر ہم اس بات کو ذہن نشین کر لیں تو پھر "جنگِ ہفتاد و دو ملّت" بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی منزل یعنی مکمل آزادی کی طرف گامزن ہیں۔

اسی مکمل آزادی کے تصور ہی کو مجسم کر کے ہم قادرِ مطلق یا خدا کہتے ہیں، خدا کی ہستی سے انکار ناممکن ہے، آزادی کے خیال کے بغیر زندگی ناممکن ہے اسی خیال ہی کے سہارے تو ہم جیتے ہیں اس کا ترک

کیونکر ممکن ہو سکتا ہے مثلاً اگر آپ کو اپنی آزادی اور خودمختاری کا پورا یقین نہ ہوتا تو کیا آپ میرا لیکچر سننے کے لئے یہاں آتے؟ آپ میں سے کون ہے جو یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ یہاں اپنی خوشی اور مرضی سے آیا ہے؟ کون ہے جسے قدرت کے اٹل قوانین کے باوجود اپنی آزادی اور اپنے اختیار کا احساس نہیں، یہی احساس تو ایمان ہے، یہی خدا کی ہستی کا اقرار، ممکن ہے کہ کسی نہ کسی وقت حیاتیات کی سائنس یعنی بائیالوجی (Biology.) اس احساسِ اختیار کی وضاحت مہیا کر دے، آزادی کی اس دائمی جد و جہد کی تشریح کر دے لیکن یہ سب کچھ مان بھی لیا جائے تو بھی مکمل آزادی کا تصور بجائے خود قائم رہتا ہے، یہ خیال تو کسی صورت نہیں مٹنے پاتا جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اختیار اور آزادی کے اس تصور کی اتنی ہی حقیقت ہے جتنی قوانین قدرت کے سامنے ہماری مجبوریوں کی۔

غلامی اور آزادی، روشنی اور اندھیرے، نیکی اور بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر غلامی اور مجبوری کی کوئی حقیقت ہے تو آزادی اور اختیار کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مانا کہ انسانی ارتقا کے مطالعہ سے بیشتر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی مجبوریوں کا زیادہ احساس رہا ہے لیکن آزادی اور اختیار کا تصور بھی ضرور رہا ہوگا۔ آج ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اوائل تاریخ کے انسان کا احساسِ مجبوری حصولِ آزادی کی جد و جہد کی ایک صورت تھی، لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ آزادی اور اختیار کے خیال نے جنم ہی نہیں لیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب انسان کے ضمیر میں ناپاکیزگی اور گناہ کا خیال بہت کم ہوتا ہے کیونکہ ارتقا کے اس مقام پر اس کا درجہ جانوروں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے اس لئے اُسے گناہ کی مجبوری کا احساس نہیں ہوتا وہ تو مادّی مجبوریوں کے خلاف جد و جہد کرتا ہے۔ اس کی ساری کوششیں اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف ہوتی ہیں لیکن انسانی شعور کے اس پست مقام سے ہی آہستہ آہستہ دماغی محدودیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے روحانی آزادی کی زبردست خواہش میں مبدل ہو جاتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ یزدانی نور جہالت کے موٹے موٹے پردوں کے پیچھے بالکل نظر ہی نہیں آتی لیکن جوں جوں جہالت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس نورِ ازلی کی کرنیں چھن چھن کر آنے لگتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی اور کمال کا یہ لازوال مجسمہ ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ ریز ہے جس کو جتنی تابِ دید ہوتی ہے اسے اُتنا ہی فیض یاب ہوتا ہے، فرق صرف درجے کا ہوتا ہے، نوعیت کا نہیں ہوتا۔

اس نقطۂ نظر سے تمام عالم ایک عبادت گاہ ہے اور قدرت کی ہر جُنبش اور حرکت خدا کی پرستش کی ایک صورت ہے، جہاں کہیں زندگی جلوہ گر ہوتی ہے، آزادی اور اختیار ساتھ لئے ہوتی ہے اور چونکہ مکمل آزادی اور اختیارِ کُل کا نام ہی خدائی ہے اس لئے آزادی کی جستجو خدا کی تلاش ہے، خدا کی عبادت ہے اور حصولِ آزادی

کا مطلب وصلِ الٰہی ہے۔

مکمل آزادی ملتے ہی ہمیں قدرت پر پُورا اختیار حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ آزادی علم اور آگہی کے بغیر ناممکن ہے، ہم جانتے ہیں کہ جتنا وسیع ہمارا علم ہوتا چلا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ قدرت ہمیں فطرت پر حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس اختیار اور قدرت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی طاقت کا احساس ہوتا چلا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر کوئی ہستی ایسی ہے جو قادرِ کُل ہے، جو آزادِ مطلق ہے تو اس ہستی کا علم بھی مکمل ہوگا، اسے قدرت سے پوری طرح واقفیت ہوگی یعنی وہ ہستی حاضر و ناظر ہوگی، دانائے کُل ہوگی۔ آزادی اور قدرت، اختیار و معرفت کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، یہ دونوں ایک ساتھ ہوتی ہیں اور وہی ہستی قوانینِ قدرت سے بالا ہو سکتی ہے اور کامل کہلا سکتی ہے جس میں پوری آزادی اور قدرت کے ساتھ ساتھ علم اور معرفت بھی بدرجۂ اُتم موجود ہو۔

اس کے علاوہ کامل ہستی کے اعلیٰ ترین تصوّر میں برکت اور دائمی سکون شامل ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ مذہب کا بلند ترین تصوّر اس برکت اور شانتی کا تصور ہے جو مکمل آزادی سے پیدا ہوتی ہے خصوصاً ویدانت میں تو بھگوان کے متعلق تمام خیالات کی اصل وہ آزادِ مطلق ہستی ہے جو کسی چیز کی پابند نہیں جس میں کوئی تغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو قوانینِ قدرت سے بالا ہے، بلکہ قدرت خود اس ہستی میں شامل ہے جو ہمیشہ یکساں ہے، ساتھ ہی ویدانت یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ مکمل آزادی آپ کی اور میری، ہم سب کی اصل ہے، اسی کو پانا ہی سچی نجات ہے باقی سب غلامی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہم سب یہ تو مانتے ہیں کہ خدا کی عظیم الشان ہستی ہمیشہ قائم ہے۔ بس ایک اسی کو ثبات ہے لیکن جب ہم اُسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، جب ہم آزادی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو ہم اپنی جدوجہد کو قدرت کی خارجی سطح پر ہی محدود کر لیتے ہیں اپنی روزمرّہ کی زندگی کی معمولی باتوں پر اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں ہم دولت کمانے، جاہ و مرتبہ پانے اور کسی کی محبت حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ چیزیں غلامی کی زنجیریں ہیں۔ ان کے حاصل کرنے سے آزادی نہیں ملتی بلکہ ان سے غلامی کو تقویت پہنچتی ہے، تغیر پذیر اور فانی چیزیں ہمیں اپنی اصل سے اور دور لے جاتی ہیں آخر قدرت کی درخشندگی کی اصل کیا ہے؟ وہ کیا شے ہے جو قدرت کی ہر روز بدلتی ہوئی صورتوں میں متواتر درخشاں ہے؟ دُنیا سورج یا چاند یا ستاروں کی روشنی سے زندہ نہیں، زندگی کی چمک، قدرت کا حُسن و جمال، عالمِ کائنات کی تابانی سب اسی ازلی اور ابدی نور سے پیدا ہیں جسے ہم خدا یا بھگوان کہتے ہیں، دنیا میں جہاں کہیں بھی نور کی کرنیں نظر آتی ہیں سب اسی کا عکس ہیں

سُورج کی تاب وتپش بھی اُسی سے ہے اور ہمارے ضمیر کی چشم افروز روشنی بھی وہی ہے جو ہر طرف نوُر پاش ہے اُسی کے نور سے سب چیزیں روشن ہیں۔

تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خُدا اپنا ثبوت آپ ہے۔ خود درخشاں ہے حاضر و ناظر ہے، دانائے کُل ہے۔ آزادِ مطلق ہے۔ تمام فطرت کا آقا و مالک ہے شہنشاہِ عالم ہے، ہم اس بات کو سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن دُنیا میں جہاں کہیں بھی اور جیسے بھی پُوجا ہوتی ہے، سب اُسی ہی کی عبادت اور پرستش ہوتی ہے، وہی ہم سب کے سجدوں کی آستان ہے[1] بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جس چیز نے ہم سب کو حیران اور پریشان کر رکھا ہے اور جسے ہم بدی اور شیطنت کے نام سے پکارتے ہیں، وہ بھی خدا ہی کی پرستش کی ایک صورت ہے[2]، اگر خدا مکمل آزادی کا نام ہے، تو اُس آزادی کو حاصل کرنے کی ہر کوشش اُس کی پُوجا ہے۔ اگر اُس کی صورت بگڑی ہوئی ہے تو کیا اُس کی نوعیت تو دُوسری نہیں آپ کو میری بات سے خوف تو ضرور آئے گا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گناہ اور ثواب، خیر و شر آزادی حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں، وہی آزادی کی خواہش ہے جو ایک آدمی کو نیک اعمال کی طرف مائل کرتی ہے اور دُوسرے کو بُرے کاموں کی ترغیب دیتی ہے، میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ دُوسری حالت میں آزادی کی خواہش غلط رستے پر چل نکلی ہے لیکن اس حقیقت سے کیوں کر انکار ہو سکتا ہے کہ قوتِ تحریک دونوں حالتوں میں ایک ہے، اور وہ ہے بندشوں سے نکل کر آزاد ہونے کی خواہش[3]، آزادی کی یہ تمنا عالمِ کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے، زندگی کی ہر دھڑکن کی محرک ہے[4]۔ حیاتِ عالم کے وجود میں بس یہی واحد دل دھڑک

---

[1] ہمہ کس طالبِ یار اند چہ ہشیار چہ مست ❊ ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

[2] میخوارہ و سرگشتہ و رندیم و نظر باز ❊ و آنکس کہ چو ما نیست دریں شہر کدام است
با محتسبم عیب مگوئید کہ او نیز ❊ پیوستہ چو ما در طلبِ شربِ مدام است

[3] نیک سیرت آدمی دل کی کشادگی اور نظر کی وسعتوں میں آزادی محسوس کرتا ہے، اور اپنی محبت کے دائرے کو متواتر وسیع تر کرنے کی کوشش کرتا ہے، برعکس اس کے شیطان سیرت آدمی تمام دُنیا کو اپنے بس میں لانا چاہتا ہے، اس کے ہر کام میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے اور ہم اسے بجا طور پر بد اعمال کہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

[4] روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست ❊ منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست
ناظرِ روئے تو صاحب نظر انند آرے ❊ سرِ گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

رہا ہے، اسی کی نسبت سے ہی اعضائے زندگی کی کثرت سمجھ میں آتی ہے،

یہ ہے خدائے ذوالجلال کا وہ عظیم تصور جو ہمیں اُپنشدوں میں ملتا ہے، لیکن اُپنشد ہمیں نہیں رُک جاتے وہ ہمیں یہاں سے بھی آگے اس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں اوّل اوّل ہم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں اُپنشد کہتے ہیں کہ ہماری اصل اور خُدا در حقیقت ایک ہیں، بندہ اور خدا اصل میں دو نہیں بلکہ ایک ہی ہستی ہیں۔ وہی ہستی جو تتلی کے خوب صورت پروں میں اور گلاب کے دل کش غنچوں میں رنگ بن کر جلوہ گر ہوتی ہے، اُسی کے دم سے تتلی پرواز کرتی ہے اور غنچہ کھلتا ہے، وہی خالق جو ہمیں زندگی بخشتا ہے، خود ہمارے اندر ہماری قوتِ محرکہ بن کر رہتا ہے اسی کے پیار کی گرمی سے حیات رُونما ہوتی ہے، اور اُس کی سرد مہری سے کڑی سے کڑی موت واقع ہوتی ہے، زندگی اور موت اسی کی قدرت کے کرشمے ہیں زندگیِ جاوداں اُس کا عکسِ منور ہے اور موت اُسی کی کالی پرچھائیں۔ اگر ہمیں اُپنشدوں کے خدا کے ہمہ گیر تصور کو سمجھنا ہے تو اُس کی دونوں صورتوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ہم عام طور پر دنیا کی خوف ناک چیزوں سے اس طرح دور بھاگتے ہیں جیسے خرگوش شکاری کتوں کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ خرگوش کی طرح سر چھُپا کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ خطرے سے بچ گئے، حالانکہ اس طرح کی خود فریبی سے ہماری موت اور بھی یقینی ہو جاتی ہے۔ تمام دُنیا خوف ناک چیزوں کے آگے بھاگ رہی ہے اور آخر یہ دہشت ناک چیزیں اِسے دبوچ لیتی ہیں۔ خطرے کا مقابلہ اس طرح کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دفعہ میں بنارس شہر کے ایک ایسے حصے سے گذر رہا تھا جہاں ایک طرف تو بڑا بھاری تالاب تھا اور دُوسری طرف ایک بہت اونچی دیوار تھی اس علاقے میں بے شمار بندر رہتے تھے۔ شاید آپ جانتے ہیں کہ بنارس کے بندر کافی بڑے ہوتے ہیں اور اشتعال میں آجائیں تو مسافروں کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں تالاب کے پاس سے گزرنے لگا تو انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ مجھے اپنی گلی سے نہیں جانے دیں گے گروہ کے گروہ میرے گرد آکر چیخنے اور شور مچانے لگے یہاں تک کہ وہ اس قدر نزدیک آگئے کہ میرے پاؤں پر جھپٹ مارنے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی لیکن میں جو بھاگنے لگا تو بندروں نے میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا، جتنا میں تیز بھاگتا اتنا ہی تیزی سے وہ میرے پیچھے دوڑتے آتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ دانت نکال کر کاٹنے کو آگئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جان بچ نہیں پائے گی۔ عین اس وقت ایک اجنبی کا ادھر سے گزر ہوا اس نے مجھے پکارا اور کہا "بھاگو مت ان وحشیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ"، چنانچہ میں فوراً رک گیا اور مڑ کر بندروں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آناً فاناً بندر بھی رک گئے، اور ایک ایک کر کے سب وہاں سے چلے گئے، دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کا یہی راز

ہے۔ خوف ناک اور دہشت ناک چیزوں کا دلیری سے ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ زندگی کی مشکلات بنارس کے بندروں کی طرح بھاگ جاتی ہے اور ہمیں اُن کے آگے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہتی اگر ہمیں آزادی حاصل کرنا ہے تو اُس کا واحد طریقہ قدرت پر اختیار حاصل کرنا ہے' قدرت کے آگے بھاگنے سے کام نہیں چلے گا بزدلوں کی کبھی جیت نہیں ہوتی۔ ہمیں خوف سے جنگ کرکے اس پر فتح حاصل کرنا ہے' ہمیں مشکلات کا سامنا کرکے انہیں مٹانا ہے' ہمیں جہالت کا مقابلہ کرکے اُسے بھگانا ہے' ہاں تو ہمیں ہر خوف ناک چیز کا شیروں کی طرح مقابلہ کرنا ہے' آخر یہ تمام ڈراؤنی چیزیں کیا ہیں جن سے ہمیں دہشت ہوتی ہے؟ اور سب سے ڈراؤنی چیز' موت کیا ہے جس سے سب ڈرتے ہیں؟ کیا آپ کو ان سب خوف ناک چیزوں کے ڈراؤنے نقاب کے پیچھے بھگوان کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر نہیں آتا؟ اس رُخِ روشن کا خیال کیجئے سب خوف دُور ہو جائے گا' شیطنت' خوف اور مصیبتوں سے فرار ان کو تعاقب کی دعوت دینا ہے' جتنا کوئی اُن سے بھاگے گا اتنا ہی وہ اس کا پیچھا کریں گے' اُن کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جایئے تو سب دُم دبا کر بھاگ جائیں گے' تمام دنیا عیش و آرام کی طالب ہے' سب لوگ سُکھ اور چین کی پوجا کرتے ہیں کون ہے' جو دکھ اور درد کا سامنا کرنے کو تیار ہے' کس میں رنج و الم کو پُوجنے کی ہمت ہے' آزادی تو تب ہی ملتی ہے جب انسان سُکھ اور دُکھ دونوں سے بالا ہو جاتا ہے۔ سُکھ بھوگ کر اور دکھ سے بھاگ کر آزادی دستیاب نہیں ہو سکتی ہم سب کو دُکھ سُکھ کا سامنا کرنا ہے اُن سے گزرنا ہے' آزادی کا جذبہ ہم سب میں ہے' دُکھ سُکھ کے کواڑوں سے بنے دروازے سے گزر کر ہی انسان آزادی کی فضا میں سانس لے سکتا ہے بھگوان کو پوجنے کی خواہش ہم سب کے دل میں ہے' ہم سب اپنے مالک کی پرستش کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ہمارے اور خدا کے درمیان جسمانی کمزوریوں کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ قوانینِ فطرت کی قوتیں پہاڑ بن کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں اور ہماری نظر محدود ہو کر رہ جاتی ہے' لیکن ہمیں وُسعتِ نظر پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں خدا کے پورے جلوے کی دید کی تاب پیدا کرنا ہوگی فقط برکت اور رحمت نیکی اور بھلائی حُسن وجمال اور رنگ و نکہت ہی میں نہیں بلکہ ظلم اور قہر' آفت اور مصیبت' رنج و غم اور کثافت و گُناہ میں بھی اُسی ایک ہی ہستی کا جلوہ دیکھنے کی اہلیت پیدا کرنا ہوگی آج تک دنیا میں نیکی کے خدا کا پرچار ہوتا آیا ہے' میں جس خدا کی تعلیم دیتا ہوں وہ نیکی اور برائی دونوں کا خدا ہے اگر ہمت ہے تو آؤ میرے اس خدا کو قبول کرو جس میں نیکی بھی ہے اور برائی بھی۔ یہی نجات اور مطلق آزادی کا واحد طریقہ ہے اِس طریقے سے انسان کو اس آخری حقیقت کا شعور اور احساس ہوتا ہے جسے وحدت الوجود کہتے ہیں جب ہم گناہ و ثواب دونوں کو خدا کے وجود میں شامل کر لیتے ہیں تو بھلے بُرے کا فرق نہیں رہتا چھوٹے بڑے کا امتیاز مٹ جاتا ہے' ہمارا دماغ ان تفرقات کی بندشوں سے آزاد ہونے لگتا ہے اور جوں جوں ہم

مطلق آزادی کے نزدیک ہوتے چلے جاتے ہیں، ہماری مشکلات مٹتی جاتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر خدا کی خاص رحمت ہو رہی ہے ہم اس کے سایہ تلے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ ہمیں جہنم میں ڈال دے یا بہشت میں رکھ لے ہمارے لئے دونوں برابر ہیں۔ ہمیں دونوں میں وہی جلوہ گر نظر آتا ہے، بلکہ جنت و دوزخ کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ آدمی آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کوئی کیوں کر یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں جہان بھر کے دوسرے آدمیوں سے برتر ہوں" یہ فرق و امتیاز تو بس اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ہماری نظر میں خدا کے علاوہ اور چیزوں کی انفرادی ہستی موجود ہوتی ہے، جب نظر میں بس اُسی کا جلوہ ہو جب ہر شے میں ہر جگہ اور ہر وقت وہی نظر آئے تو فرق و امتیاز کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے، خدا کو پا کر ہی ہمیں وحدت کا احساس ہوتا ہے نہیں تو کثرت ہی کا شعور رہتا ہے۔

مثال کے طور پر میں اُپنشدوں کی ایک کہانی پیش کرتا ہوں، دو خوب صورت پرند، ایک درخت پر رہتے تھے۔ یہ دونوں دوست ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہیں ہوتے تھے۔ ایک درخت کی چوٹی پر رہتا تھا اور دُوسرا نچلی شاخوں میں، آخرالذکر پرند درخت کے پھل کھاتا تھا۔ کبھی کڑوے اور کبھی میٹھے پھل اُس کے مُنہ لگتے تھے۔ میٹھے پھل کھا کر خوش ہوتا اور کڑوے پھلوں سے اُسے رنجش ہوتی اور کبھی سخت کڑوا پھل کھا بیٹھتا تو دُکھی ہو کر چوٹی والے پرندے کی طرف دیکھنے لگتا جو میٹھے اور کڑوے پھلوں سے بے نیاز اپنے آپ میں مست بڑی شان سے چوٹی پر اطمینان کی تصویر بنا بیٹھا ہوتا اُس کی شاہانہ عظمت کو دیکھ کر یہ پرندہ بھی پھُدک کر اونچی شاخوں کی طرف چلا جاتا لیکن جلد ہی پھل کھانے کے شوق سے مجبور ہو کر رُک جاتا اور پھر کڑوے اور میٹھے پھل کھانے لگتا ایسا کئی بار ہوا اور یہ پرندہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتا گیا۔ آخر کار اُس کے مُنہ ایک ایسا سخت کڑوا پھل لگا کہ اُس کا جی بھر گیا اور اوپر والے پرندے کی طرف بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ اس کے بہت نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اُس نے دیکھا کہ جو نور اوپر والے پرندے سے برس رہا تھا اُس کی شعاعوں نے اُسے کچھ اس طرح گھیر لیا کہ وہ خود اوپر والا پرندہ بن گیا۔ اس کو پورا اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا اُسے اپنی شان و عظمت کا احساس ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ دراصل دو پرند کبھی تھے ہی نہیں، نچلی شاخوں میں تو چوٹی والے پرندے کا عکس رقص کر رہا تھا۔

یہی حال ہم سب کا ہے، دراصل ہماری ہستی خدا کی ہستی سے جُدا نہیں، ہستی تو ایک ہی ہے، اس کے عکس کی مختلف صورتوں سے کثرت کا دھوکا ہوتا ہے، جیسے سورج ایک ہے لیکن شبنم کے لاکھوں قطروں میں اس کا عکس جُدا جُدا ہے۔ اسی طرح حقیقت ایک ہے اُسی کے جلوے بے شمار نظر آتے ہیں۔ شبنم کے قطرے

لہ کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے ✻ کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا۔ غالب

بخارات بن جاتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے لاکھوں سُورج غائب ہو جاتے ہیں اور بس ایک ہی سُورج رہ جاتا ہے اسی طرح خدا کی واحد ہستی کے کروڑوں عکس جب سمٹ جاتے ہیں تو وہی ایک حقیقت رہ جاتی ہے۔ ہمیں اپنی انفرادی شخصیت کو مٹا کر ہی خدا سے ایک ہونے کا احساس ہو سکتا ہے، نظر عکس سے ہٹ کر ہی اصل کو دیکھ سکتی ہے۔ انسانی خودی کو مٹا کر ہی اپنی یزدانی خودی کا شعور مل سکتا ہے، یہ تمام کائنات اپنی وسعتوں کے باوجود ہماری تسلّی کے لئے کافی نہیں ہے، ہم یہاں خود کو محدود محسوس کرتے ہیں اور ہر وقت اپنی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اسی مقصد کی خاطر کنجوس زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے میں لگا رہتا ہے، ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے، گناہ گار گناہ کرتا ہے اور یہ جو آپ یہاں آکر مذہب اور فلسفہ کی بات سُن رہے ہیں اس کی محرک بھی وہی ایک قوت ہے جسے آزادی کہتے ہیں، دنیا کے تمام کاروبار کا حاصل یہی ہے اس کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ سمجھ بوجھ کر یا لاشعوری طور پر ہر شخص کمال حاصل کرنے میں کوشاں ہے، اور یہ یقینی امر ہے کہ ہر شخص اپنے کمال تک پہنچ کر رہے گا جو شخص دُکھ درد اور مصیبتوں کا بوجھ اٹھائے، جہنم کے راستے گناہ کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے، اُسے کمال حاصل کرنے میں وقت ضرور لگے گا لیکن بالاخر وہ بھی اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ ایسے شخص نے جو غلط راستہ اختیار کیا ہے ہم اسے عام طور پر اس راستے سے ہٹا نہیں سکتے، لیکن جب وقت کے ہاتھوں اُس کو کچھ شدید چوٹیں لگیں گی تو اُس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور وہ بھی اس سیدھے راستے پر آجائے گا جو اُسے خدا تک لے جائے گا۔ آخر کار نیکی، پاکیزگی، بے غرضی، خود سپردگی اور روحانیت کا راستہ ہر شخص کے لئے کُھل جاتا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جہاں عوام غیر شعوری طور پر اپنے کمال کی منزل کی طرف گامزن ہیں، وہاں اہل بصیرت دیدہ و دانستہ اپنی ذات کے انکشاف کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اسی خیال کو سینٹ پال[۱] نے یوں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں" وہ خدا جس کی آپ سب لوگ انجانے میں پوجا کرتے ہیں میں اسی خدا کا آپ کے سامنے اعلان کرتا ہوں[۲]" یہ ہے وہ عظیم الشان سبق جسے تمام دنیا کو سیکھنا چاہیئے۔

فطرت اور زندگی کے متعلق فلسفے اور منطق کے بے شمار نظریئے سب بے سود ہیں اگر ان سے ہمیں اپنی منزلِ مقصود تک جانے میں مدد نہیں ملتی، آؤ ہم مخلوقات کی ہر شئے سے اپنی وابستگی کا احساس اور

---

۱ Saint Paul

۲ The God that ye ignorantly worship Him declare I unto ye.

شعور پیدا کریں آؤ ہم دیکھیں کہ ہم سب میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے، اور وہ حقیقت، وہ وحدت خود ہماری ذات ہے۔ آؤ ہم دنیا کی ہر شے میں اپنی ذات کے جلوہ کو دیکھنے کی اہلیت پیدا کریں آؤ ہم خدا کے سب محدود تصورات کو ترک کر دیں اور قبائلی دیوتاؤں اور مختلف مذہبی فرقوں کے علیحدہ علیحدہ خداؤں کی پرستش اور عبادت کی حدود سے نکل جائیں تاکہ ہمیں ہر طرف اور ہر جگہ خدا ہی خدا نظر آئے، یہی سچی آگہی ہے۔ یہی علمِ معرفت ہے یہ وہ حالت ہے جب خارجی اور داخلی دنیا میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک طرف دل کے مندر میں ہر وقت بھگوان کی پوجا ہوتی ہے، دوسری طرف عالم کائنات کی ہر شے سربسجدہ نظر آتی ہے خدا کی عبادت کے مختلف طریقوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور ہر شخص کا مخصوص طریقہ ہر لحاظ سے حق بجانب نظر آنے لگتا ہے۔

میں آپ کو یہ سچی آگہی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو خدا کے متعلق سب محدود خیالات کو خیرباد کہنا ہوگا ہر شخص میں اسی کو دیکھنے کی کوشش کیجئے وہی سب کے ہاتھ بن کر کام کر رہا ہے، وہی پاؤں بن کر چل رہا ہے، سب منہ اسی کے ہیں کھانا وہی کھا رہا ہے، اسی کے دم سے زندگی ظہور پذیر ہے، ہر دماغ میں اسی کی روشنی ہے ہر خیال اسی سے ابھرتا ہے، وہ اپنا ثبوت آپ ہے، وہ خود درخشاں ہے، اس کا وجود خود ہمارے جسمانی وجود سے بھی زیادہ قریب ہے، اس حقیقت کو جان لینے کا نام ہی مذہب اور ایمان ہے اور میری بھگوان سے یہی پرارتھنا ہے کہ ہم سب کو آگہی کی اس برکت سے مالا مال کر دے۔ جب ہمیں اس وحدت کا پورا احساس ہو جائے گا تو ہم امر ہو جائیں گے۔ ہم سمجھ جائیں گے کہ لازوال عالمِ کائنات کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے ہم مادی طور پر بھی زندۂ جاوید ہیں[1]۔

یہی ہے زندگیٔ دوام کا رازِ سربستہ، آؤ اعلان کر دو کہ میں کوئی محدود ہستی نہیں ہوں، میری ہستی کائناتی ہے، گزرے زمانوں کی سب عظیم ہستیوں کی روح میں ہی تھا، میں ہی بدھ کی روح تھا، عیسےٰ میں ہی تھا، اور محمدؐ بھی میں ہی۔ جتنے رہنما اور معلم گزرے ہیں سب میں میرا ہی جلوہ تھا اس کے ساتھ ہی دنیا کے تمام ڈاکو لٹیروں کی ہستی بھی میرے ہی دم سے تھی، میں نے ڈاکے ڈالے، قتل کئے اور مجھے ہی سُولی پر چڑھایا گیا[2]۔ میں ہرگز محدود و محبوس نہیں ہوں۔ میری ہستی کائناتی ہے۔ تمام عالم ایک زندہ وحدت

---

[1] ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔"

I am the universal ; I am the life of all the sons of the past ;

I am the soul of Buddha, of Jesus, of Mohammad ; I am the بقیہ اگلے صفحہ پر

ہے اور میری ہی ذات ہے وہ وحدت، میں زندۂ جاوید ہوں، میری ابتدا ہے نہ انتہا، میں لازوال ہوں، لافانی ہوں۔ لاثانی ہوں۔

اُٹھو میرے دوستو۔ اپنی حقیقت کو پہچانو اپنی ذات کا انکشاف ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے، سب کائنات تمہاری ذات میں موجود ہے، تم سے جُدا نہیں۔ میری نظر میں اپنی حقیقت کا اعلان ہی سچا علم ہے، گھٹنے ٹیک کر ماتھا رگڑنا اور اپنے آپ کو گناہ گار کہنا سراسر جھوٹ ہے، انسانی ارتقا کا بلند ترین مقام وہ ہے جہاں تفرقات کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ انسانی مذہب کی بلند ترین تعلیم وہ ہے جو ہمیں کائناتی وحدت کا راز بتاتی ہے۔ یہ کہنا کہ میں فلاں ابنِ فلاں ہوں، اپنی ذات کو محدود کر دیتا ہے، یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس خیال کو کلیتاً ترک کر دو، اپنی زندگی کو اس خیال سے تشکیل دو کہ میری ہستی کائناتی ہے اور ہمیشہ اس بلند مقام پر کھڑے ہو کر خدا کی بلند ترین ہستی کی عبادت کرو۔ زندگی کا اعلیٰ ترین مظہر تم خود ہو۔ اپنی ہستی کے دیپ جلا کر بھگوان کی پوجا کرو، خدا رُوحِ پاک ہے، رُوح کا واسطہ رُوح سے ہی ہو سکتا ہے اس کی عبادت رُوح سے کرو[ا]، صدقِ دل سے کرو۔ عبادت کے کم درجہ طریقوں سے انسان کے مادی خیالات کو رُوحانی سطح تک اُٹھنے میں مدد ملتی ہے لیکن یہ طریقے مقاماتِ راہ ہیں، بالآخر لامحدود کائناتی ہستی کی سچی عبادت روح کی وساطت سے ہی ہو سکتی ہے۔ ہر محدود چیز مادی ہے۔ فقط رُوح لامحدود ہے انسان بھی دراصل رُوح ہے اور لامحدود ہے، لامحدود کی عبادت لامحدود کر سکتا ہے، یعنی لامحدود کو لامحدود ہی سمجھ سکتا ہے اور پا سکتا ہے، آؤ ہم پوجا کے اِس معیار کو اپنائیں اور لامحدُود ہو کر لامحدُود کی پُوجا کریں۔

میں جانتا ہوں کہ ان خیالات کی عظمت کا تصور کرنا آسان نہیں، اُن کو سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا تو

---

soul of all the teachers and I am all the robbers that robbed and all the murderers that were hanged. I am the Universal.

[ا] God is spirit, is infinite. Man is spirit and therefore Infinite and the Infinite alone can worship the Infinite.

اور بھی مشکل ہے، بات یہ ہے کہ یہاں ذکر اس چیز کا ہے جو بیان سے باہر ہے جو شعور کی گرفت میں نہیں آسکتی نظریہ بازی آسان ہے، میں آپ کے سامنے خوب باتیں بنا رہا ہوں، فلسفہ بگھار رہا ہوں، لیکن عین ممکن ہے کہ اسی گھڑی اگر کوئی چیز میری مرضی کے خلاف ہو جائے تو مجھے خود بخود فوراً غصہ آجائے گا۔ میں اپنے اعلیٰ فلسفہ کو بھول جاؤں گا مجھے یہ یاد نہیں رہے گا میری ہستی کائناتی ہے، میں جھٹ اپنے آپ کو اپنی انفرادی شخصیت پر محدود کر لوں گا اور میرا ردِ عمل اسی کے مطابق ہوگا ایسی حالت میں میں اپنے آپ سے یہ کہنا بھول جاتا ہوں کہ "میں روح ہوں اس معمولی سی رنجش سے میرا کیا بگڑتا ہے، میرا بگڑ ہی کیا سکتا ہے۔ میں تو روح ہوں" میں بھول جاتا ہوں کہ یہ سب تو میرا ہی رچایا ہوا کھیل ہے، میں خدا کو بھول جاتا ہوں۔ مجھے اپنی مطلق آزادی کا دھیان نہیں رہتا۔

روحانی آزادی کا رستہ لمبا اور کٹھن ہے، اس پر چلنا تلوار کی تیز دھار پر چلنے کے برابر ہے[1] مہاتماؤں نے اس راہ کی مشکلات کا بار بار ذکر کیا ہے، لیکن ان مشکلات کو سر کرنا ہی ہوگا اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں سے ہار مت مانو، پاؤں کی ان بیڑیوں کو کاٹ ڈالو' اُپنشدوں نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا ہے، "اٹھو، جاگو' اور بڑھتے چلو، رکو مت، منزل سے اِدھر دم لینا حرام ہے[2]'

تلوار کی دھار کی طرح تیز سہی لیکن ہم اس راہ پر ضرور چلیں گے۔ مشکل اور لمبا سہی لیکن ہم اس راستے کو ضرور سر کریں گے۔ آخر انسان کو دیووں اور دیوتاؤں دونوں کے مقام سے آگے گزرنا ہے، اگر آج ہمارے سر پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں، اگر آج ہم رنج والم میں مبتلا ہیں تو اس کا الزام خود ہمارے ہی سر پر ہے۔ ہمیں اپنے دکھ درد کا علاج آپ کرنا ہے، مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کون کہتا ہے کہ

---

[1] Sharp like the blade of a razor, long and difficult and hard to cross is the way to freedom.

اَلا یا اَیُّہَا السّاقی اَدِر کاساً وَّ ناوِلہا ۞ کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا
شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل ۞ کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ۞ جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

[2] Arise, awake and stop not till the goal is reached.

جد وجہد فضول ہے، کون کہتا ہے کہ زندگی زہر کا پیالہ ہے اور یہاں امرت کی تلاش بے سُود ہے، امرت یقیناً ہے اور ہر شخص کو اُسے پانا ہے، زندگی جاوید ہر شخص کا حق ہے۔ خود بھگوان کرشن نے کہا ہے "اِدھر اُدھر کی راہیں ترک کردو فضول ہاتھ پاؤں نہ مارو، میری شرن میں آؤ میں تمہیں سنسار کے اُس پار لے جاؤں گا۔ ڈر کی کوئی بات نہیں"[۱]۔ یہ پیغام ہمیں دنیا کی سب مقدس کتابوں سے ملتا ہے[۲]۔ انجیل مقدس سے یہی آواز اس طرح آرہی ہے، "اے میرے مالک ہمیں طاقت دے کہ جیسے آسمانوں پر تیری رضا سب کو قبول ہے ویسے ہی زمین پر بھی تیری رضا ہمیں صدق دل سے قبول ہو، کیونکہ تو ہی سرورِ عالم ہے تمام عظمت اور شان تجھ سے ہی منسوب ہے[۳]۔

سیدھی سی بات ہے لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے، سخت مشکل ہے، کہنے کو تو میں جھٹ کہہ اٹھتا ہوں کہ "میرے مالک میں اِسی دم تیری شرن میں آرہا ہوں، مجھے اپنا پریم بخش دے، میں تیرے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں، بُرا بھلا جیسا بھی ہوں تیرے در پر پڑا ہوں۔ اگر میں نے کوئی بھلائی کی ہے اگر مجھ سے کوئی نیک کام ہو پایا ہے تو سب تیرے قدموں میں بھینٹ کرتا ہوں، میرے گناہ۔ میری برائیاں اور میرا دکھ درد تم سے پوشیدہ نہیں، میں انہیں بھی تیرے ہی آگے پیش کرتا ہوں۔ تو میرا سب کچھ لے لے اور میں جیسا بھی ہوں مجھے قبول کر، مجھے اپنا لے میرے مالک میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا" اسی طرح میں یہ بھی کہتا ہوں کہ "خداوندا تیری رضا مجھے قبول ہے"، لیکن ذرا سی بات میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے آگ لگ جاتی ہے، میں طیش میں آجاتا ہوں، مذہبی صداقتوں کا اعتراف کرنا آسان ہے، اُن پر عمل کرنا مشکل ہے، اور عمل ہی تو مذہب کی جان ہے۔

سب مذہبوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے، اگر کچھ فرق ہے تو مذہبی رہنماؤں کی زبان میں ہے

۱؎ Give up all these paths and struggles. Do thou take refuge in Me. I will take thee to the other shore, be not afraid.

۲؎ Thy will be done upon earth as it is in heaven.

۳؎ Thine is the kingdom and the power and the glory.

سب کا مقصد انسان کی جھوٹی خودی کو مٹانا ہے، تاکہ سچی خودی آشکار ہو جائے اور خدا کی رضا سچے معنوں میں قبول ہو۔ یہودیوں کی مقدس کتاب میں خدا یوں اعلان کرتا ہے "میں تمہارا واحد خدا اور مالک ہوں میرے سامنے کسی دوسرے خدا کا نام نہ لو میں کثرت کے خیال کو برداشت نہیں کر سکتا، یاد رکھو کہ اس لحاظ سے مجھے دوسرے دیوتاؤں سے سخت حسد ہے[1]" مطلب یہ ہے کہ جہاں خدا کی ہستی کا سچا شعور اور احساس ہوتا ہے وہاں کسی اور چیز کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا ہے تو اور کچھ نہیں، آؤ ہم صدق دل سے یہ دعا کریں کہ خداوندا میری کوئی ہستی نہیں بس تو ہی تو ہے، اور یہ کہہ کر خدا کے علاوہ سب چیزوں کے خیال کو کلیتاً اور عملاً ترک کر دیں۔ اس کے بعد اسی کا راج ہو، وہی ہر طرف اور ہر شے میں جلوہ گر نظر آئے۔ ممکن ہے کہ ہماری پوری اور سچی کوششوں کے باوجود ہمارے پاؤں لڑکھڑا جائیں اور ہمیں پھر یزدانی مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے کی کوئی ضرورت محسوس ہو، مایوس ہونے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کوئی بات نہیں اگر ہمیں سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ہمیں سہارا بھی مل جائے گا اور اگر ہمارا ارادہ مصمم اور مضبوط ہے تو ہمیں ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

زندگی لامحدود ہے، خدا کی رضا کو قبول کرنا اور اسے عملی جامہ پہنانا اس کا ایک پہلو ہے، عارضی ناکامی اور مایوسی اسی لامحدود زندگی کا ایک دوسرا پہلو ہے اور جب تک آدمی زندگی کے ہر باب پر عبور حاصل نہیں کر لیتا زندگی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ ہم صدق دل سے چاہتے بھی ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ خداوندا تیری رضا ہمیں قبول ہے لیکن ہر گھڑی ہمارا غدار من اس کے خلاف سخت بغاوت کرتا ہے، اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے، اس کا واحد علاج یہی ہے کہ ہم بار بار اس ارادے کو دہراتے رہیں کہ خدا کی مرضی ہماری مرضی ہے بس اس طریقے ہی سے ہم اپنے نفس پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ہم دماغ کی غلامی کر کے اس کا کہنا مان کر آزادی اور اختیار حاصل نہیں کر سکتے ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم اپنے نفس کے احکام بجالانے سے انکار کرتے رہیں اور اپنے ضمیر کی آواز پر کان دیں۔ دنیا میں سب گناہ معاف ہو سکتے ہیں لیکن غدار قوم فروش کو معاف نہیں کیا جا سکتا، ہمارا من خود ہمارا مخالف ہے۔ یہ ہماری ذات کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ یہ ہمیں اپنی یزدانی عظمت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اکساتا ہے، اگر ہم نفس کی باتوں میں آ کر اپنی حقیقی ذات کی آواز کو سننے سے انکار کرتے ہیں تو ہم اپنے ساتھ غداری

---

[1] I the Lord thy God am a jealous God ; thou shalt have no other gods before Me.

کرتے ہیں، آؤ آج ہم قطعی فیصلہ کرلیں کہ جو کچھ بھی ہو ہم اپنا تن من سب بھگوان کے ارپن کر دیں گے، اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کر دیں گے، اُسی کی رضا پر قانع رہیں گے۔ اُسی کی مرضی کو اپنی مرضی بنائیں گے۔ کسی فلاسفر نے کیا خوب کہا ہے، اگر کوئی شخص یہ دو بار کہتا ہے کہ خداوند تیری رضا مجھے قبول ہے تو وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، جب ایک بار کہہ دیا کہ "خداوند تیری رضا مجھے قبول ہے"۔ تو اُسے دُوسری بار دُہرانے کے معنی ہی کیا ہیں۔ جب اُس کی رضا قبول کرلی تو باقی رہ ہی کیا گیا دوبارہ کہنے کا تو مطلب ہوا کہ ہمارا پہلا فیصلہ قطعی نہیں تھا آؤ ہم ایک ہی بار بالکل قطعی فیصلہ کرلیں، اور ہمیشہ کے لئے اعلان کریں کہ "خداوندا جیسے آسمانوں پر تیری رضا سب کو قبول ہے ویسے ہی ہم زمین پہ تیری رضا قبول کرتے ہیں[1]۔ تو ہی سرورِ دو عالم ہے تمام عظمت اور شان تیری ہے اور تیری رہے گی۔"

---

[1] بہ درد و صاف ترا کار نیست خوش درکش ❊ کہ ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است
اگر بلطف بخوانی مزید الطاف است ❊ وگر بہ قہر برانی درون ما صاف است
من و مقامِ رضا بعد ازیں و شکر و شکیب ❊ کہ دل بدردِ تو خُو کرد و ترک درماں گفت
در طریقت ہرچہ پیشِ سالک آید خیرِ اوست ❊ در صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

مذہب اور معیارِ عقل[لہ]

(علم اور عرفان)

ہمارے ایک رشی جن کا نام نارد تھا ایک دفعہ ایک دوسرے رشی سنت کمار کے پاس اُن سے حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے گئے۔ رشی سنت کمار نے پوچھا اب تک کیا کیا علوم حاصل کر چکے ہو، نارد جی نے بتایا کہ چاروں ویدوں کے علاوہ علم نجوم وغیرہ سب پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ رشی سنت کمار بولے کہ ویدوں کا علم اور علم نجوم اور فلسفہ وغیرہ کی حیثیت ثانوی ہے سب سے اعلیٰ علم وہی ہے جس کی مدد سے ہم برہم کو پا سکتے ہیں۔

یہ خیال کہ خارجی علوم کا درجہ داخلی عرفان سے بہت کم ہے۔ ہر مذہب میں پایا جاتا ہے، ہر مذہب کا دعوے ہے کہ خارجی علوم ہماری زندگی کے ایک جزو کو بیان کرتے ہیں لیکن داخلی عرفان جو مذہب سے حاصل ہوتا ہے ہمیں لامحدود اور لازوال حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور اس لئے اس کا درجہ سب علوم سے بلند ہے۔ اس دعویٰ کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ بدقسمتی سے مذہب کے علمبردار خارجی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، یہاں تک کہ ان علوم سے مذہبی حقائق کا ثبوت ملتا ہو تو بھی اُن کو مذہب کے نزدیک نہ آنے دیا گیا۔ مذہب اور خارجی علوم میں یہ خود ساختہ فاصلہ بڑھتے بڑھتے عناد و عداوت تک جا پہنچا اور اس دشمنی نے تعصب کی صورت اختیار کر لی مذہب کا دعویٰ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ روحانی علم ہی سچا علم ہے عرفان ہی ہماری سچی رہنمائی کر سکتا ہے کیونکہ یہاں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔ خارجی علم کی باتوں پر کان دھرنا بے کار ہے مذہب والوں کے یہ طور دیکھ کر خارجی علم کے طرفدار عقل اور منطق کی تیز تلوار سے مذہب کی ہر بات کا قلع قمع کرنے پر تُل گئے یہ جنگ ہر زمانے اور ہر ملک میں ہوتی رہی ہے اور آج بھی جاری ہے۔ مذہب کو ہمیشہ شکست ہوئی ہے اور کئی بار تو ایسا معلوم

لہ Religion and Reason.

ہوتا تھا کہ مذہب جہان سے اٹھ ہی جائے گا۔ زمانۂ جدید میں اس کی مثال انقلابِ فرانس[1] ہے جب مذہب اور رُوحانیت کی قدروں کو کچل دیا گیا اور اُن کی جگہ عقلی قدروں نے لے لی۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ بس عقل اور منطق کو خُدا مان کر اس کی پُوجا کی گئی۔ انقلابِ فرانس تو گذشتہ واقعات کا اعادہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس انقلاب کی شکل میں مذہب اور عقل کے پُرانے عناد نے ایک جنگِ عظیم کا رنگ اختیار کر لیا جو آج تک جاری ہے بلکہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ایک طرف تو طبعی علوم نے آج بہت ترقی کر لی ہے دُوسری طرف رفتارِ زمانہ سے غافل ہو کر مذہب پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گئے ہیں۔ مذہب اور عقل کے درمیان یہ خلیج جتنی وسیع ہوتی جاتی ہے اتنی ہی نفرت اور دشمنی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ آج کل کے لوگ بظاہر کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ اپنے دل میں بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک عقل کسی بات کو قبول نہ کرے اُس پر ایمان اور اعتقاد لانا ناممکن ہے۔ وہ زمانہ گیا جب لوگ پنڈتوں، ملّاؤں اور پادریوں کے کہنے پر یقین کر لیتے تھے یا مذہبی کتابوں کی ہر بات کو مان لیتے تھے یا سماج کی دیکھا دیکھی مذہبی رُسوم کی پیروی کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو آج کل بھی اندھا دھند ہر قسم کی مبیّنہ مذہبی اور رُوحانی باتوں پر فوراً یقین لے آتے ہیں لیکن ان ضعیف الاعتقاد لوگوں میں سوچ بچار کی طاقت ہی نہیں، ان لوگوں کا ایمان تو بس اندھی تقلید اور دماغی کاہلی ہے۔ زمانہ جلد ہی ان لوگوں کو جھنجھوڑ کر جگا دے گا۔ بھلا کوئی کب تک سویا رہ سکتا ہے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہی حالت رہی تو مذہب اور عقل کی جنگ جلد ہی ختم ہو جائے گی اور مذہب ہمیشہ کے لئے ہار جائے گا اور ہم رُوحانیت کی بے بہا دولت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا اس نعمت کو بچایا جا سکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا کوئی ایسی صُورت ہے کہ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر روحانی حقائق کو ثابت کر دیا جائے۔ اگر خارجی عُلوم کی بنیاد عقل اور منطق پر ہے تو مذہب کی بُنیاد عقل اور منطق پر کیوں نہیں رکھی جا سکتی؟ میں سمجھتا ہوں کہ نئی زمانہ عقل اور مذہب میں موافقت بہت ضروری ہے، اگر عقل کو مخصوص طریقوں سے استعمال کر کے سائنس اور خارجی علوم میں اس قدر ترقی ہو سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ عقلی تجزیہ سے مذہبی صداقتوں کا ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکے اگر مذہب عقل کا چیلنج قبول نہیں کر سکتا۔ اگر مذہب عقل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا ہے تو ایسے مذہب کا مٹ جانا ہی اچھا ہے، سمجھ لو کہ ایسا مذہب شروع ہی سے فضول اور بے کار توہمات کا سلسلہ تھا اور توہمات کا مٹ جانا ہی اچھا ہوتا ہے، یقین مانئے ایسے مذہب کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں لیکن مذہب کوئی وہم نہیں، خواب و خیال نہیں۔ رُوحانیت ایک روشن حقیقت ہے، توہمات کو مٹ جانے دو عقل کو اپنا کام کر لینے دو، مذہب کے روشن چہرے پر جو گرد جم گئی ہے اُسے صاف ہو لینے دو، پھر دیکھئے مذہب کس آب و تاب سے چمکتا ہے۔ رُوحانیت کس شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ سائنس کو توہمات کی بوسیدہ بنیادوں کو ڈھا لینے دو، مذہب کی شاندار

---

[1] The French Revolution.

عمارت کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اس سے رُوحانیت کے محل کی پائندگی اور بھی نمایاں ہو جائے گی طبیعات اور علم کی طاقت محض خارجی ہے۔ مذہب اور رُوحانیت کی داخلی قوت میں جب سائنس کی خارجی طاقت شامل ہو جائے گی تو مذہب کی عظمت پُوری طرح ثابت ہو جائے گی۔ مجھے اُن لوگوں سے اتفاق نہیں جو کہتے ہیں کہ عقل اور مذہب میں موافقت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ دونوں کے میدان ہی مختلف ہیں اور مذہبی اصولوں کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنا فضول ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کہنا خود اپنی بات کی تردید کرنا ہے۔ سب مذہب والوں کا دعویٰ ہے کہ صرف اُن کا مذہب ہی سچا ہے، کیوں کہ وہ اُن کے پیغمبر پر نازل ہوا اب اگر دو مذہبوں کی اخلاقیات میں ایک ہی بات کے متعلق مختلف اور متضاد احکام درج ہوں تو عقل اور منطق سے کام لئے بغیر کوئی کیونکر یہ جان سکتا ہے کہ کس مذہبی ہدایت پر عمل کرنا ٹھیک ہے مثلاً ایک مذہب لوگوں کو زبردستی اپنے دائرے میں لانے کی اجازت دیتا ہے یہاں تک کہ بعض حالات میں قتل بھی روا سمجھتا ہے۔ دوسرا مذہب تشدّد اور قتل کو بدترین گناہ قرار دیتا ہے، دونوں مذہبوں کے پیرو اپنے اپنے مذہب کو سچّا کہتے ہیں، اور اس کے ثبوت میں اپنی اپنی مقدّس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دو مقدس کتابوں میں دو ایسی باتیں لکھی ہوں جو ایک دُوسرے کی ضد ہوں تو وہ کونسا معیار ہے جس کی رُو سے ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی؟ ہر مذہب کے حامی اپنی بات کی حمایت میں یہی ایک دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہماری بات خُدا کے اُن احکام پر مبنی ہے جو خُدا نے ہمارے پیغمبر کی معرفت عائد کئے اگر حق اور باطل کو جانچنے کا معیار یہی ہے تو قتل کرنا بھی روا ہے اور کسی کو نقصان نہ پہنچانے کی تلقین بھی بجا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ کبھی خُدا ایک بات کو روا قرار دیتا ہے اور کبھی اس کے خلاف احکام صادر کرتا ہے، ایسے خدا پر ایمان لانا مشکل ہو جاتا ہے جن لوگوں میں ذرا بھی ذہانت ہے وہ قدرتی طور پر مذہب سے احتراز کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب مذہبی کتابوں کے حوالے سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی تو ہمیں کوئی ایسا معیار دریافت کرنا ہوگا جو ان کتابوں سے بھی بلند ہے اور جس کی مدد سے مختلف مذہبی احکام کے حق و باطل کا اندازہ لگایا جا سکے ہم صاف طور پر مانیں یا نہ یہ معیار عقل اور منطق ہی کا معیار ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عقل الہام کو سمجھنے سے قاصر ہے، آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا عقل کی روشنی میں مختلف پیغمبروں کی الہامی باتوں کی حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ الہام اور چیز ہے اور منطق اور چیز۔ آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر عقل اور منطق ہمارے مسئلے کو حل نہیں کر سکتے تو مذہبی کتابوں اور پیغمبروں کے متعلق جو جھگڑے فساد صدیوں سے ہوتے آرہے ہیں اُن کا قلع قمع کرنا بھی ناممکن ہے، اگر عقل کی مدد سے

اِن جھگڑوں کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تو یوں سمجھ لینا پڑے گا کہ تمام مذہب جھوٹے ہیں متضاد باتوں کا ایک سلسلہ ہیں جن کی تہ میں اخلاقیات کا کوئی بنیادی اُصول کام نہیں کر رہا۔ آخر مذہب یا رُوحانیت کا ثبوت خود انسان کی سرشت سے ہی توملے گا۔ مقدس کتابیں بھی انسان ہی کی فطرت کا اظہار ہیں۔ کتابوں سے آدمی کی تخلیق نہیں ہوتی۔ انسان ہی کے وجود سے یہ کتابیں ظہور میں آئی ہیں ان کی اپنی کوئی خارجی اصل نہیں۔ برعکس اس کے عقل انسان کی سرشت کا جزو ہے، ہمیں اپنی فطرت اپنی سرشت سے باہر اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملے گا۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر مذہبی کتابوں میں اختلاف ہے تو اس کا فیصلہ عقل ہی کر سکتی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ عقل کو گمراہ نہ ہونے دیا جائے۔ عقل سے خلافِ فطرت کام نہ لیا جائے۔ اس سے میرا کوئی خاص مطلب نہیں۔ میں وہی بات کرنے کو کہہ رہا ہوں جو ہر تعلیم یافتہ مرد اور عورت کے دل میں ہے، سب یہی تو چاہتے ہیں کہ زمانۂ حال کی غیر مذہبی اور سائنٹیفک (Scientific) معلومات کی روشنی میں مذہبی اصولوں اور اخلاقیات کا تجزیہ کیا جائے۔ تاکہ اگر مذہب اور رُوحانیت کی کچھ حقیقت ہے تو ثابت ہو جائے۔

دلیل اور منطق کا اُصول یہ ہے کہ کسی محدود اور مخصوص چیز کی تشریح اس سے کم محدود اور مخصوص چیز کی نسبت سے کی جاتی ہے اس عملِ تعمیم سے ہم بالآخر اس بنیادی اُصول اُس عالمگیر حقیقت تک آپہنچتے ہیں جس کا اطلاق دنیا کے سارے مظاہرِ قدرت پر ہوتا ہے اور ہم اُسے کائناتی اصول مان لیتے ہیں، اور اُسے قانونِ فطرت کا نام دیتے ہیں اگر واقعاتِ عالم اس قانون کے مطابق ہوتے ہیں تو ہم انہیں اطمینان سے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہم بنیادی اصول سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خاص واقعات کو فوراً کائناتی قانون سے نسبت دے کر اُس کی تشریح کر لیتے ہیں مثلاً درخت سے سیب کو گرتے دیکھ کر نیوٹن کو اچنبھا ہوا، اس واقعہ سے اُس کے دماغ میں ایک ہل چل سی مچ گئی لیکن جب اُس نے کششِ ثقل ارضی کا قانون دریافت کر لیا تو اُسے تسلی ہو گئی۔ انسانی ادراک و شعور کا یہ پہلا اصول ہے۔ ہم کسی آدمی کو سڑک پر گزرتے دیکھتے ہیں۔ ہمارا دماغ فوراً اُسے بنی نوع انسان کے وسیع تصور کے دائرے میں لے آتا ہے اور ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اسی عمل کو برسرِ کار لاتے ہوئے ہم خاص سے عام محدود سے وسیع اور وسیع سے وسیع تر کی طرف جاتے ہیں اور بالآخر وہ کائناتی اصول دریافت کر لیتے ہیں جو تمام عالم پر حاوی ہے اور یہ ہے احساسِ حیات۔ شعورِ خودی جس کی نسبت سے ہم باقی سب چیزوں کے وجود کا ادراک کرتے ہیں اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے، ہم سب انفرادی طور پر مرد، عورت اور بچے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہم سب انسان کہلاتے ہیں۔ ہم بنی نوع انسان کا ذکر یوں کرتے ہیں گویا سب کا وجود ایک ہو اسی طرح آدمی۔ بلی اور کتے کی انفرادی طور پر مختلف نوعیت ہے لیکن مجموعی طور پر ہم سب کو جاندار کہتے ہیں اس سے آگے بڑھے تو ہم نباتات کو بھی اپنے میں شامل کر لیتے ہیں اور سب کو "زندگی" یا حیات کہتے ہیں، اور آخر میں مادیات کو بھی اس مجموعے میں ملا کر "وجود" کا نام دیتے ہیں اس کا مطلب صرف یہی

ہے کہ ہم محدود چیز کو وسیع تر چیز سے نسبت دیتے ہوئے کائناتی اصول دریافت کرتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں عام اطلاق کے بہت سے نظریئے اور اصول بھرے پڑے ہیں۔ ہمارا دماغ مختلف قسم کے کلوں کا ذخیرہ ہے جنہیں اپنے اپنے خانے میں رکھ دیا گیا ہے، جب کبھی کوئی نئی بات وقوع میں آتی ہے ہمارا دماغ اُسے جانی پہچانی باتوں کے کسی مناسب خانے میں ڈالنا چاہتا ہے، اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہماری تسلی ہو جاتی ہے اور ہم کہتے ہیں اسے تو ہم جانتے ہیں"۔ اسی چیز کو علم یا ادراک کہتے ہیں لیکن اگر ہم کسی نئے واقعے کو اپنے دماغ کے کسی خانے میں نہیں ڈال سکتے تو ہمارے اندر ہل چل مچ جاتی ہے اور ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ اپنے دماغ سے کوئی نیا عام اطلاق کا اصول نہ نکالیں اسی لئے تو کہتے ہیں کہ علم اور ادراک تقسیم و ترتیب کا دُوسرا نام ہیں۔ یہ نئے اصول ہمیں کہیں باہر سے دستیاب نہیں ہوتے بلکہ ہمارے ہی دماغ میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں خارجی واقعات ہمارے دماغ کو محرک کرتے ہیں اور دماغ اپنے اندر غوطہ زن ہو کر نئے نئے موتی نکال لاتا ہے۔

علم اور ادراک کا دُوسرا اصول یہ ہے کہ ہر چیز کی صحیح تشریح اور تفسیر خود اس کی سرشت اور فطرت کی نسبت سے حاصل ہوتی ہے کسی خارجی مصدر سے نہیں ملتی۔ کسی زمانے میں لوگ سمجھتے تھے کہ اگر ہوا میں زور سے پتھر پھینکا جائے تو اُسے کوئی بھوت واپس پھینک دیتا ہے، اسی طرح ہزاروں قدرتی باتوں کو لوگ غیر قدرتی ہستیوں سے منسوب کر کے اُن کی کچھ نہ کچھ تشریح کر لیتے ہیں لیکن یہ تشریح عموماً غلط ہوتی ہے مثلاً یہ کہنا کہ پتھر اس لئے گرتا ہے کہ بھوت اُسے زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے، ایک قدرتی واقعہ کی تشریح ضرور ہے لیکن یہ تشریح ایک خارجی محرک پر مبنی ہے داخلی فطرت پر منحصر نہیں، جب کشش ثقل زمین کا اصول دریافت کر لیا گیا تو داخلی تشریح حاصل ہو گئی اور اس سے ہماری پوری تسلی ہو گئی جدید فکر کا رجحان اس نوعیت کی تشریح تلاش کرنے کی طرف ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر چیز کا راز اُسی کی داخلی فطرت میں ہے اور اس راز کو آشکار کرنے کا نام ہی سائنس ہے۔ واقعاتِ عالم کی تشریح کے لئے سائنس کسی خارجی وجود کو ضروری نہیں سمجھتی مثلاً علم کیمیا کے ماہر کو کسی کیمیائی عمل کی تشریح کے لئے بھوت پریت وغیرہ کے وجود کی ضرورت نہیں اسی طرح دوسرے سائینسداں بھی اس قسم کے خارجی محرکات سے بے نیاز ہیں۔

سائنس کا یہی اصول مذہب پر عائد ہونا چاہیئے اور میری کوشش یہ ہے مذہب کو اسی اصول کی کسوٹی پر جانچا جائے۔ اگر کوئی مذہب اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا یا اگر کسی مذہب کی کچھ جزویات اس معیار پر پوری نہیں اترتیں تو اُن کا ترک ہی بہتر ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ سائنس کے مقابلے میں بیشتر مذہبی نظریوں کی تشریح داخلی فطرت پر مبنی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن مذہب کا وقار کم ہوتا چلا جاتا ہے، مثلاً تقریباً تمام پرانے

حاشیہ صفحہ گذشتہ

لے Existence.

مذہب شخصی خدا کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس خدا کی ہستی کائنات سے باہر اور اُس سے جُدا ہے، یہ خدا کائنات کا مالک ہے، اس کا حکمران ہے دنیا کا کاروبار اُس کی رضا سے ہوتا ہے اس نظریئے کے حق میں جو دلائل صدیوں سے پیش کی جاتی رہی ہیں اُن سے سب واقف ہیں، میں اُنہیں دُہرانا نہیں چاہتا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اُس شخصی خدا کو سب رحیم و کریم مانتے ہیں، لیکن دنیا میں جو ناانصافی اور عدم مساوات کے روز مظاہرے ہوتے ہیں ان کی کوئی وجہ نہیں بتاتا کہ آخر رحیم و کریم اور منصف خدا کے ہوتے ہوئے یہ ظلم کیوں ہوتے ہیں؟ خیر اس بات کو چھوڑیئے، فلسفہ اور سائنس کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں، سائنس اور فلسفہ تو یہ کہتے ہیں کہ خارجی شخصی خدا کا تصور اصلاً ہی غلط ہے، کائنات کی تخلیق کا خیال ہی بے بنیاد ہے، ان نظریوں کا ثبوت خود کائنات کی سرشت سے نہیں ملتا یہ کہنا کہ اس دُنیا کا سبب دنیا سے باہر ہے اور اس کے موجب اور محرک کا وجود اس سے علیحدہ ہے ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ جب ہم پتھر ہوا میں پھینکتے ہیں تو کوئی بھُوت اُسے واپس زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے شخصی خدا کا تصور دنیا کی تشریح کے لئے ناکافی ہے یہی وجہ ہے کہ مذہب سائنس اور فلسفہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے:

ارتقا کا اصول بھی اسی بنیادی اصول کا ایک نیا پہلو ہے کہ ہر چیز کی تشریح خود اُس کی سرشت سے ملنی چاہیئے زمانۂ جدید کے اس انقلاب انگیز خیال کا سارا مطلب آخر یہی تو ہے کہ ہر چیز کی سرشت ہی میں اُس کی ہر صورت کا راز پنہاں ہے، ہر چیز فطرتاً بار بار ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ اور اس اظہار کے دوران میں اپنے پوشیدہ رنگوں کو اُبھارتی ہے، اور نئی نئی صورتیں اختیار کرتی ہے لیکن ہر نئے انداز کا محرک اور سبب خود اُس کی فطرت ہے، دراصل علّت اور معلول ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں جب یہ حقیقت پنہاں ہوتی ہے تو ہم اُسے سبب کہتے ہیں اور جب یہ آشکار ہوتی ہے تو اثر کہلاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالمِ کائنات اس ایک حقیقت کی ارتقائی صورتوں کا ظہور ہے، دنیا کسی خارجی خُدا کی تخلیق نہیں ہے، ہمیں اپنے سمیت جو کچھ نظر آتا ہے اسی ایک ہی سبب کے مختلف اثرات ہیں لیکن نہ تو سبب اثرات سے علیحدہ ہے اور نہ اثراتِ سبب سے باہر، ہر ظاہر اثر اپنے پوشیدہ سبب ہی کی ایک صورت ہوتا ہے، یہ صورت سبب ہی میں مضمر ہوتی ہے اور ضرورت ہو تو حالات کے مطابق نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ اپنے سبب سے مختلف نہیں ہوتی اسی کو ارتقا کہتے ہیں سبب اور اثر کے اس سلسلے کا نام ہی کائنات ہے، ہمیں اس کائنات کی تشریح کے لئے اس سے باہر کسی خارجی محرک کے تصور کی چنداں ضرورت نہیں ہے ہمیں اس دنیا کے خالق کا خیال درکار نہیں۔ ایسی صورت میں کچھ عجب نہیں کہ مذہب کی وقعت کم ہوتی چلی جا رہی ہے کیونکہ تقریباً تمام مذہب اب تک ایک مافوق الطبعی حقائق کے نظریئے کو اپنائے چلے جاتے ہیں، فی زمانہ ایسے شخصی خدا کا تصور قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ اس تصور کے

مُطابق تو خدا ایک بہت ہی جسیم اور طاقتور آدمی ہے اور بس زمانۂ جدید کا انسان اس تصور سے کہیں آگے نکل گیا ہے ؛

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی مذہب ایسا ہو سکتا جو فلسفہ اور سائنس کے ان دونوں اصُولوں کے موافق ہو جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ اِس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ مذہب اول تو حصولِ علم کے اس اُصول پر پُورا اترے کہ ہمارا دماغ خاص سے عام کی طرف جاتا ہے اور ہم چند واقعات کی بنا پر کُلیہ قائم کرتے ہیں (یا یوں کہیے کہ ہم مخصوص اور محدود علم سے ہمہ گیر اور وسیع تر علم پاتے ہیں) اور دُوسرے ارتقا کے اس اصول کے موافق ہو کہ سبب اور اثر ایک دُوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے، ان اصولوں کے تحت آخر ہمیں ایک ایسے ہمہ گیر کائناتی کُلیے کو دریافت کرنا ہے جو سب علم اور ادراک پر حاوی ہو ہمیں اس حقیقت اس بنیادی سبب تک پہنچنا ہے جو ادنیٰ اور اعلےٰ ہر صورت میں مکمل اور کامل ہے، کائنات کی تشکیل کا اولیں اور عظیم ترین سبب اپنے معمولی سے معمولی اثر سے جدا نہیں ہو سکتا، اثر خواہ سبب سے کتنا ہی دُور افتادہ کیوں نہ ہو اصلاً اُس کی فطرت اپنے بنیادی سبب کی فطرت ہے۔ سبب اور اثر کا فاصلہ ارتقا کے ایک سِلسلے کا نام ہے، حقیقت وہی ہے جس میں سبب اور اثر دونوں شامل ہوں، فلسفۂ ویدانت میں اس حقیقت کو برہمہ کا نام دیا گیا ہے، برہمہ وہ ہمہ گیر تصور ہے جس سے سب چیزوں کی تشریح ہوتی ہے۔ برہمہ کے نام سے کوئی صفت منسوب نہیں ہے، برہمہ کو "ست چت آنند"[1] (وجودِ واحد، شعورِ مطلق و نشاطِ مکمل) کہا گیا ہے۔ میں نے ابھی آپ کے سامنے مثالیں دے کر دکھایا کہ "زندگی"[2] یا "وجود" یا ہستی کا تصور وہ تصور ہے جس سے آگے انسانی دماغ جا ہی نہیں سکتا۔ اس میں مادیّات، نباتات اور حیوانات سب شامل ہیں۔ اسی طرح "شعور"[3] یا احساسِ ہست یا آگہی بھی۔ علم و ادراک کے سلسلے میں سب سے اعلیٰ تصوّر ہے "شعور" یا آگہی سے میری مراد مختلف قسم کی عام فہم باتوں سے نہیں جن سے ہم اپنا دماغ بھر لیتے ہیں بلکہ آگہی کے معنی ہیں وہ رس جو ہمارے تمام علوم کی جان ہے، جس کی بدولت ارتقا کا عمل جاری ہے، اور جس کا اظہار انسان اور حیوان سب میں ارتقا کی مختلف صورتوں میں ہو رہا ہے آگہی کا یہ رس ہمارے روزمرہ کے تمام مدرکات کا سرچشمہ ہے، آگہی وہ واحد اور ہمہ گیر حقیقت ہے جس سے ہمارے تمام علوم کی کثرت ظہور پذیر ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر سائنس نے کوئی بات ثابت کر دی ہے تو وہ وحدتِ حیات کا نظریہ ہے۔ یہ وحدت نہ صرف رُوحانی ہے بلکہ دماغی اور جسمانی بھی، کون کہتا ہے کہ ہم جسمانی طور پر ایک دُوسرے سے مختلف ہیں، فرض کیجیے کہ ہم مادہ پرست ہیں اور خدا کی ہستی میں یقین نہیں رکھتے پھر بھی ہمیں ماننا پڑے گا

---

[1] Sat-Chit-Anand, Absolute Existence Knowledge & Bliss.

[2] Existence.

[3] Knowledge.

کہ تمام کائنات مادّے کا ایک بے کنار سمندر ہے جس میں آپ اور میں کچھ دیر گرداب کی طرح اپنی انفرادیت کے چکر میں رہ کر پھر اس سمندر کی لہروں میں کھو جاتے ہیں، جس مادّے سے آج میرا جسم بنا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ سال پہلے آپ کے تندرست و توانا جسم کا جزو بن کر چل پھر رہا ہو یا خورشیدِ عالمتاب کا حصہ بن کر شعلے کی صورت میں لپک رہا ہو یا کسی سرسبز و شاداب پودے کی رگوں میں رس بن کر بہار دے رہا ہو، دنیا کی ہر شے ہر گھڑی اپنی صورت بدلتی رہتی ہے، اگر ثبات ہے تو بس اس بنیادی وحدت کو جس سے یہ سب کثرت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ ہمارے جسم ایک دُوسرے سے علیحدہ ہیں اور ہم مختلف شخصیتوں کے مالک ہیں دراصل تمام اجسام ایک ہیں، یہی حال ہمارے دماغوں کا ہے، ہم ہر دماغ کو دوسرے سے علیحدہ سمجھتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو ہر دماغ بھی شعور و احساس کے بیکراں سمندر میں ایک گرداب کی صورت رکھتا ہے، اس کا ثبوت خود آپ کے سامنے موجود ہے، دیکھئے تو کس طرح میرے خیالات بغیر کسی رُکاوٹ کے آپ کے دماغوں میں داخل ہو رہے ہیں اور آپکے خیالات میرے دماغ میں چلے آ رہے ہیں، دراصل ہم سب کی ہستی ایک ہے، جسم ایک ہے، دماغ ایک ہے، اور جسم اور دماغ سے اُوپر اٹھئے تو رُوح ایک ہے، رُوح جسم اور دماغ کی وہ واحد قوتِ محرکہ ہے جس سے دونوں کی تشکیل ہوتی ہے، رُوح یا آتما ہی کا وہ ہمہ گیر تصور ہے جس کی وحدت میں سب کثرت بیک وقت پوشیدہ اور ظاہر ہے، بہر حال آپ آتما کو مانیں یا نہ، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم سب ایک بنیادی وحدت کے حصہ دار ہیں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ دراصل ہم جسمانی اور دماغی لحاظ سے بھی ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہیں، سائنس آئے دن اس بنیادی وحدت کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے مغرور انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ہے، سائنس اُسے بتاتی ہے کہ اعلیٰ ترین انسان اور کمترین کیڑے میں طبیعاتی اور کیمیائی لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیونکہ اموُبا[1] کی ابتدائی منزل سے ترقی کرتے کرتے ہی انسان اپنے حالیہ مقام تک پہنچا ہے اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے جنموں میں ہم اور آپ کیڑے مکوڑے بھی رہ چکے ہیں، اسی کیڑے میں ارتقا کی وہ پوشیدہ طاقت تھی جس کی بدولت وہ بڑھتے بڑھتے انسان کے درجے تک آ پہنچا ہے یہ ہے "وحدت الوجود" کی نئی تعلیم جو ہمیں سائنس سے ملتی ہے، اس تعلیم کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اپنے آپ کو، اپنے سے بلند ہستیوں کے برابر سمجھ کر تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن کون ہے جو انسان اور حیوان کی مساوات کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوگا۔ بنی نوع انسان کی جہالت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص اپنے نسب کا سلسلہ کسی ایسے بڑے آدمی سے جوڑنا چاہتا ہے جس کے دبدبے اور رعب کی وجہ سے سب اس کی عزت کرتے ہوں، خواہ وہ آدمی کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو، رہزن اور ڈاکو ہی کیوں نہ ہو برعکس اس کے اگر ہمارے آبا و اجداد میں کوئی بزرگ

---

[1] Amoeba.

نہایت غریب رہا ہو تو ہم اُس کے نام تک کو بھلا دینا چاہتے ہیں خواہ وہ شرافت اور دیانتداری میں اپنی مثال آپ ہو، لیکن شکر کا مقام ہے کہ سائنس کی بدولت ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ رہے ہیں، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادّی سطح پر زندگی ایک ہے، اس تعلیم سے مذہب کو تقویت پہنچی کیونکہ مذہب بھی یہی سکھاتا ہے کہ دماغی اور روحانی سطح پر زندگی ایک ہے۔ بہرحال ویدانت کے ادویت وادی فلسفے کی تعلیم یہ ہے کہ آتما[1] ہی تمام کائنات کا رس ہے، سب زندگی کی اصل ہے، انفرادی اور مجموعی زندگی اُسی سے ہے اور ''وہ آتما تم ہو''[2] تمہاری حقیقی خودی ہی خدا ہے۔ تمہاری وسعت میں تمام کائنات سمو رہی ہے تمام عالم تمہاری ہستی کا پرتو ہے، جو کوئی اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ اور مختلف سمجھتا ہے، وہ خواہ مخواہ مصیبت مول لیتا ہے، دنیا کے تمام دکھ درد اِس احساسِ تفریق سے پیدا ہوتے ہیں، وحدت کے احساس میں سچی خوشی ہے، نشاطِ کامل احساسِ خودی کا دوسرا نام ہے، جو یہ جانتا ہے کہ وہ اور کائنات ایک ہیں۔ وہی ستیہ چت آنند ہے، وہی برہمہ ہے،

ظاہر ہے کہ ویدانت سائنس کے مطالبات کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اس فلسفہ کے بنیادی نظریے میں ہمہ گیری ہے اور یہ دنیا کی ہر شئے پر پوری طرح حاوی ہے۔ یہ فلسفہ قانونِ ارتقا کے موافق ہے اور کسی خارجی محرک یا سبب کا محتاج نہیں اس کے علاوہ فلسفۂ ویدانت ہر چیز کی تشریح اُس کی اپنی فطرت اور سرشت کی نسبت سے کرتا ہے ویدانت میں جس خدا کا تصوّر ملتا ہے وہ ایک ایسی وحدت ہے جس کے باہر کوئی دوسری چیز نہیں، ویدانت کے برہمہ کے علاوہ اور کسی چیز کی ہستی نہیں، ویدانت میں خالق اور مخلوق کا تصوّر نہیں ملتا۔ یہاں تو برہمہ ہی کائنات کے اندر اور باہر ہے وہی سب کچھ ہے، ویدانت میں برہمہ کو یوں مخاطب کیا گیا ہے ''تو ہی مرد ہے تو ہی عورت ہے تو ہی جوان ہے جو جوانی کے نشے میں سر بلند کئے جا رہا ہے اور تو ہی بوڑھا ہے جو زندگی کے بوجھ تلے دب کر لڑکھڑا رہا ہے'' برہمہ ہر جگہ موجود ہے وہ ہے تو ہم ہیں ہم اُسی کو تو ہر وقت اور ہر مقام پر دیکھتے ہیں، سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُسی کی بدولت ہی تو جیتے ہیں اسی میں بس کر تو زندگی گزارتے ہیں اسی کی حرکت سے ہم میں جان ہے اُسی کے دم سے ہماری ہستی[3] ہے۔ یہی خیال انجیل مقدس میں بھی ملتا ہے آپ کے پیغمبر نے بھی ایسے خدا کا تصور پیش کیا ہے جو کائنات کے اندر اور باہر موجود ہے، جو اس جہان کی رُوحِ رواں ہے جو اس کا رس ہے، اُس کو زندہ رکھنے والا دل ہے جو اس دنیا کی ہر شے میں جلوہ گر ہے وہ ست چت اور آنند (ہستی، آگہی اور مسرت) ہے وہ وجود شعور اور نشاط کا بے کنار سمندر ہے اور ہم اور آپ اس سمندر میں چھوٹے چھوٹے قطروں کی طرح ہیں جنہیں سمندر

---

[1] Atma.

[2] Thou art that.

[3] In Him we live and move and have our being.

کی لہریں کبھی اُچھال دیتی ہیں اور کبھی اپنے دامن میں سنبھال لیتی ہیں ہماری ہستی برہمہ کی ہستی سے جُدا نہیں ہم تو اسی کے اظہار کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ برہمہ نورِ مُجسّم ہے تو ہم اُس نور کی کرنیں ہیں۔ برہمہ مکمل بیان ہے تو ہم چھوٹے چھوٹے حرف یا الفاظ ہیں کرنیں نور سے جُدا نہیں الفاظ بیان سے علیحدہ نہیں۔ دراصل برہم ہی برہم ہے، یہ ہمیں جو آدمی آدمی میں فرق نظر آتا ہے یا ہم جو فرشتے اور آدمی، آدمی اور جانور جانور اور پودوں اور پودوں اور پتھروں میں تمیز کرتے ہیں دراصل یہ فرق نوعیت کا نہیں درجے کا فرق ہے، زندۂ جاوید فرشتے سے لے کر بے جان پتھر تک سب میں وہی برہمہ جلوہ گر ہے، ہو سکتا ہے کہ برہمہ کا جلوہ مجھ میں کم ہو اور آپ میں زیادہ، لیکن اس سے جلوے کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اظہارِ جلوہ کے ذرائع میں بھی کوئی فرق نہیں، فرق ہے تو ارتقا کے مقام کا آپ ارتقا کی اونچی منزل پر ہیں اور میں مقابلتاً نیچے ہوں لیکن ہم دونوں برہمہ کے نور کی جلوہ گاہ ہیں، آپ کی اصل، آپ کی سرشت اور فطرت بھی خدا ہے اور میری بھی آپ اپنے مقام پر پاکیزگی اور تقدس کے کمال کو حاصل کر چکے ہیں اور میں ابھی گناہ میں لت پت ہوں آپ فرشتہ خصلت ہیں اور میں شیطان سیرت۔ آپ سے نور کی کرنیں چھن رہی ہیں اور مجھ سے تاریکیاں برس رہی ہیں لیکن مجھے بھی برہمہ سے واصل ہونے کا اُتنا ہی حق ہے جتنا آپ کو اور صرف حق ہی نہیں مجھے بھی آخر برہمہ کے مقام پر پہنچنا ہے کیونکہ برہم ہی میری اصل ہے، میں بھی ست چت آنند ہوں۔ آپ نے آج اپنی اصل کو آشکار کر لیا ہے، آپ کو مبارک ہو لیکن میری اور آپ کی اصل ایک ہی ہے کچھ دیر رُک جائیے کل تک میں بھی اپنی اصل کو جلوہ گر کر لوں گا۔ نہ مجھے اور نہ آپ کو کسی خارجی مدد کی ضرورت ہے یہ تمام کائنات برہمہ ہی تو ہے۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر سب کائنات برہمہ ہی ہے تو کیا برہمہ محض مادہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ مادہ کیا ہے؟ مادہ برہمہ کی وہ صورت ہے جسے ہم حواسِ خمسہ کی مدد سے دیکھتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ برہم محض مادہ ہے، جب ہم حواسِ خمسہ سے اوپر اُٹھ کر برہمہ کا تصور ذہن سے کرتے ہیں تو برہم کی ایک غیر مرئی صورت پیدا ہو جاتی ہے برہمہ ایک کائناتی من[1] (دماغ) کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ برہم محض دماغ ہے اس سے بھی آگے رُوح کا مقام آتا ہے، اور جب رُوح برہمہ کا احساس کرتی ہے تو برہمہ روحِ اعظم کی صورت میں نظر آتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ چونکہ سب کائنات برہمہ ہے اس لئے برہمہ مادہ ہے۔ برہمہ مادہ نہیں بلکہ مادہ کے پسِ پردہ جو حقیقت ہے وہ برہمہ ہے مثلاً اس کرسی کو لیجئے۔ برہمہ یہ کرسی نہیں لیکن برہمہ ہی کی حقیقت سے اِس کرسی کا شعور ہوتا ہے اس کرسی کے شعور کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک تو وہ خارجی چیز ہے جو میرے جسمانی وجود سے باہر ہے

---

[1] Universal Mind.

اور جس کا ادراک میں اپنے حواس اور دماغ سے کرتا ہوں اور دوسری وہ داخلی چیز جس سے میرے حواس اور دماغ میں ادراک کی اہلیت پیدا ہوتی ہے، ان دونو چیزوں کے ملنے سے "کرسی" کا شعور پیدا ہوتا ہے، برہمہ وہ لازوال حقیقت ہے جو ان دونوں کے پیچھے ہے جو ہماری خارجی دنیا میں بھی موجود ہے اور داخلی دنیا میں بھی جو ہمارے حواس اور دماغ سے بالا ہے اور جس کو ہمارے حواس اور دماغ مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں۔ کبھی وہ ہمیں کرسی کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی میز بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، ہمارے کمرے، مکان، ہمارے شہر، ہمارے ملک، ہماری دنیا، سورج چاند ستارے سب کے سب اسی برہمہ کی مختلف صورتیں ہیں یا یوں کہیئے کہ برہمہ کی ہستی ایک پردہ ہے جس پر ہمارے حواس اور دماغ یہ تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اگر ایسا ہے تو یہ کیوں کر ہوتا ہے کہ ہم سب کو کرسی کرسی ہی نظر آتی ہے اور میز میز، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہر شخص ست چت آنند کے کینوس (پردے) پر ایک ہی قسم کی تصویریں بنا رہا ہے، بات یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ایک ہی نظر سے برہمہ کو دیکھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف آدمی برہمہ کو مختلف رنگوں میں دیکھتے بھی ہیں لیکن یہ لوگ مختلف سطحوں پر ہوتے ہیں، جو لوگ ایک ہی سطح پر ہیں وہ برہمہ کو ایک ہی صورت میں دیکھ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ لیتے ہیں اور سب کو کرسی کرسی اور میز میز نظر آتی ہے۔ ہمارے علاوہ لاکھوں ہستیاں ایسی ہو سکتی ہیں جو برہمہ کے پردے پر ہماری دنیا کی تصویروں سے مختلف تصویریں بناتی ہیں لیکن ہم ان لوگوں اور اُن کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ نہیں سکتے کیونکہ ہماری زندگی کی سطح اُن سے مختلف ہے، اس بات کا ثبوت بھی جدید سائینس مہیا کر رہی ہے یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آج کل طبعیاتی کھوج اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ بنیادی حقیقت ہمیشہ لطیف ہوتی ہے، مجسم صورت تو بس ظاہری ہوتی ہے۔ سائینس ٹھوس مادے کے مقام سے گزر کر بجلی کی لطیف لہروں تک آ پہنچی ہے، بہرحال سائینس کے آئیندہ نتائج کچھ بھی ہوں، مجھے تو آپ کو یہ دکھانا ہے کہ اگر کوئی مذہبی نظریہ آج کل کی سائینس اور دوسرے علوم کی کسوٹی پر پورا اتر سکتا ہے تو وہ ویدانت کا ادویت وادی فلسفہ ہے یہ فلسفہ سائینس کی وہ دونوں شرائط پوری کرتا ہے جن کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے، یہ نظریۂ حیات ہر چیز پر عائد ہوتا ہے[1]، اس کی ہمہ گیری اور وسعت میں سب زندگی سما جاتی ہے یہ کسی مخصوص شخصیت پر محدود نہیں ہے۔ جو نظریہ شخصی خدا تک محدود ہوتا ہے وہ کائناتی نہیں ہو سکتا۔ شخصی خدا کے وجود کے تصور کے ساتھ ساتھ اُس کی صفات کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے اور ہم اسے رحیم کریم پاک منور وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں اس دنیا میں نیکی اور برائی، روشنی اور تاریکی۔ پاکیزگی اور گندگی ساتھ ساتھ ملتی ہیں لیکن ہم شخصی خدا کے تصور میں صرف اچھی صفات ہی بھر دیتے ہیں اور دنیا کی تلخ حقیقتوں کو اُس سے

---

[1] It is the highest generalisation.

منسوب نہیں کرتے' اس طرح خدا کا تصور شروع سے ہی اُدھورا رہ جاتا ہے' ہم اچھی اور خوشگوار صفات سے مرکب ایک تصور قائم کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا شخصی خدا ایسا ہے لیکن ویسا نہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایک اور وجود کا تصور تخلیق کرنا پڑتا ہے جو ویسا ہے ایسا نہیں جس میں وہ سب برائیاں ہیں جو ہم نے اپنے شخصی خدا کے تصور سے خارج کر دی ہیں اس طرح شخصی خدا کے تصور کے ساتھ شخصی شیطان کا تصور بھی لازم ہو جاتا ہے' خدا اور شیطان ایک دوسرے کے لازم اور ملزوم ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ شخصی خدا کا تصور مکمل نہیں اور اس کو کائناتی درجہ نہیں دیا جا سکتا ہمیں اس سے زیادہ مکمل اور ہمہ گیر نظریہ تلاش کرنا ہوتا ہے اور وہ نظریہ ہے غیر شخصی برہمہ (خُدا) کا برہمہ کے تصور میں یہ کائنات جیسی ہے ویسی قائم رہتی ہے یہاں کی مسرتیں اور مصیبتیں نیکیاں اور برائیاں سب کی سب برہمہ ہی میں بسی ہیں' آپ پوچھیں گے وہ بھی بھلا کس قسم کا خدا ہو گا جس سے بُرائی بھی منسوب کی جاتی ہے ؟ ایسے غیر شخصی خُدا کے تصور کے معنی یہ ہیں کہ نیکی اور برائی دونوں ایک ہی طاقت کے دو مختلف کرشمے ہیں' نیکی اور بُرائی کو دو مختلف چیزیں مانا ہی نہیں جاتا اس نظریئے کے مطابق نیکی اور بُرائی کو مختلف چیزیں ماننا ایک زبردست غلطی ہے' دنیا کی بہت سی مصیبتیں اسی غلط خیال کے باعث پیدا ہوئی ہیں۔ مذہبی جھگڑے اور فساد اسی خیال سے اُٹھتے رہے کہ نیکی اور بدی ایک دُوسرے کے متضاد دو مختلف طاقتیں ہیں' جو ہمیشہ ایک دُوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہیں' نیکی کی فتح کے نام پر نہ جانے کتنے قتل و خون ہوئے کاش کہ ہم نیکی اور بدی کو ایک دُوسرے کا دشمن نہ سمجھتے۔ شاید اس طرح آدمی آدمی کا دشمن نہ بنتا۔ مجھے تو آج تک کوئی ایسا آدمی ملا نہیں جو مجھے دکھا سکے کہ فلاں چیز مکمل طور پر اچھی ہے اور فلاں کلیتاً بُری میری نظر سے تو کوئی واقعہ ایسا نہیں گزرا جو یا تو کلیتاً اچھا ہو یا کلیتاً بُرا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا جو چیز آج اچھی ہے کل بُری ہو سکتی اور آج جو بُری ہے کل اچھی بھی ہو سکتی ہے' اسی طرح جو چیز میرے لئے اچھی ہے وہ آپ کے لئے بُری ہو سکتی ہے۔ اور جو چیز آپ کے لئے اچھی ہے وہ میرے لئے بُری ہو سکتی ہے میں تو اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نیکی اور بُرائی دونوں سلسلۂ ارتقا کی کڑیاں ہیں بلکہ نیکی اور بدی بذاتِ خود اضافی خیال ہیں۔ ارتقا کے دوران میں ایک ہی مقام کو آج اچھا کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے بلند منزل پر جا کر وہی مقام بُرا نظر آتا ہے مثلاً اگر کسی طوفان میں میرا کوئی دوست مر جاتا ہے تو مجھے اُس طوفان میں برائی ہی بُرائی نظر آئے گی لیکن اسی طوفان سے مختلف بیماریوں کے لاکھوں جراثیم مر جاتے ہیں اور اس طرح ہزاروں انسانوں کی جانیں بچ جاتی ہیں مجھے اُن کا خیال تک نہیں آئے گا۔ لوگ اس طُوفان کو برکت سمجھیں گے لیکن میرے لئے وہ قہر ہی رہے گا ظاہر ہے کہ نیکی اور برائی اضافی چیزیں ہیں' اُن کا تعلق اس اضافی دنیا سے' اس عالمِ شہود سے ہے۔ جس غیر شخصی خدا کا ہم تصور پیش کر رہے ہیں وہ کوئی اضافی ہستی نہیں ہے اس کے متعلق یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔ وہ نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ وہ ان دونوں اضافی صفات سے بالا ہے' ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے بُرائی کی بجائے

نیکی میں اس کا جلوہ زیادہ روشن ہوتا ہے نیکی ارتقا کی زیادہ اُونچی منزل ہے ۔

اگر ہمارا غیر شخصی خدا اضافی ہستی نہیں اور اگر کائنات اُسی میں بس رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کائنات بحیثیتِ مجموعی ساکن و ثابت ہے حرکت اور تغیر کا تصور اضافی ہے ایک چیز دُوسری کی نسبت سے حرکت کرتی ہے وہ بدلتی رہتی ہے انفرادی طور پر دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے اور ہر لمحہ حرکت میں ہے ارتقار کا سلسلہ اسی حرکت اور تغیر پر مشتمل ہے لیکن ہمارا غیر شخصی خدا مکمل ہے، اُسی میں سب دنیا بسی ہے اس لئے اس کی نسبت حرکت و تغیر کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہمارا خُدا سکونِ جاوداں ہے ہماری کائنات اٹل اور پائیدار ہے، حرکت اور تغیر کا ادراک بس عالم شہود کی ظاہری سطح پر ہے جہاں کی ہر چیز اضافی ہے مثلاً میں اس کُرسی کی نسبت سے حرکت کرتا ہوں یہ کرسی ساکن ہے اور میں اس کے مقابلے میں آگے پیچھے جا سکتا ہوں ۔ حرکت کے تصور کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک چیز دوسری کی نسبت سے حرکت کرتی ہے، اگر تمام کائنات کی وحدت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس "واحد الوجود" ہستی میں حرکت اور تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آخر یہ واحد وجود کس کی نسبت سے حرکت کرے گا پس ثابت ہوا کہ ہمارا غیر شخصی خدا، ہماری ہستئ مطلق[ل]، ہمارا برہم سکونِ جاوداں ہے اور اس میں مکمل ثبات ہے حرکت اور تغیر کو اس سے منسوب کیا ہی نہیں جا سکتا حرکت اور تغیر تو شہود کے کرشمے ہیں یہ محدودیت کے مناظر ہیں ۔ غیر شخصی خدا کی ہستی ہر صورت سے مکمل ہے ہر شے اس ہستی میں شامل ہے چھوٹے سے چھوٹا ایٹم[ے] بھی اس کا جزو ہے اور شخصی خدا بھی اسی ہستی کا ایک پرتو ہے جسے ہم خالق و شہنشاہِ عالم کہتے ہیں جس کے آگے سر جھکا کر اور گھٹنے ٹیک کر دعائیں مانگتے ہیں وہ اسی غیر شخصی ہستی کا بلند ترین جلوہ ہے ہمیں شخصی خدا سے انکار لازم نہیں عقل شخصی خدا کی ہستی کو قبول کر سکتی ہے غیر شخصی حقیقت مختلف رنگوں میں جلوہ نما ہوتی ہے ہم سب کی زندگی اسی کے دم سے ہے ۔ آپ میں اور مجھ میں یہی کار فرما ہے لیکن ہماری زندگی کی جلوہ گاہ تنگ و تاریک ہے اس میں وُسعت اور روشنی نہیں شخصی خدا ایک کشادہ اور درخشندہ مظہر کا تصور ہے جہاں غیر شخصی خدا کی ہستی کا زیادہ سے زیادہ جلوہ نظر آ سکتا ہے اس سے بلند اور وسیع تصور ہمارے ذہن کے لئے ناممکن ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شخصی خدا تک پہنچ سکتے ہیں ہم اُس کو پا سکتے ہیں یہ جو ویدانت اعلان کرتا ہے کہ آپ کی اور میری حقیقی خودی ہی خدا ہے اس سے مراد شخصی خدا نہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کی اصل وہ غیر شخصی ہستی ہے جس کے دم سے ہم زندہ ہیں مثلاً مٹی سے بہت بڑے ہاتھی کا بھی مجسمہ بنایا جا سکتا ہے اور ایک چھوٹا سا چوہا بھی یہ چوہا ہاتھی نہیں بن سکتا لیکن دونوں کو پھر سے پانی میں گھول کر برابر کیا جا سکتا ہے کیونکہ مٹی دونوں کی اصل ہے، جب تک مٹی نے چوہے اور ہاتھی کی شکل اختیار کر رکھی ہے دونوں میں ہمیشہ فرق رہے گا جس ہستی کو ہم لامحدود غیر شخصی خُدا کہتے ہیں اُس کی مثال اس مٹی کی ہے جو لاکھوں کروڑوں مجسموں کی صورت

ل The Absolute.　　ے Atom.

اختیار کر لیتی ہے، آپ کی اور میری ہستی اور شخصی خدا کی ہستی مختلف مجسمے ہیں جب تک ہم اپنی اصلی حالت میں رہتے ہیں، دونوں برابر ہوتے ہیں ہم میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن جب ہم پردۂ شہود پر مجسم ہو کر نمودار ہوتے ہیں ہم دونوں کے درمیان بندے اور خدا کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری مجسم ہستی ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہے شخصی خدا مالک ہوتا ہے اور ہم غلام وہ معبود ہوتا ہے اور ہم اس کے پجاری اور یہ حسین اور مسرت انگیز رشتہ ہمیشہ قائم رہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر شخصی خدا کی ہستی کو ماننے سے شخصی خدا کا تصور مٹ نہیں جاتا بلکہ اور روشن ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی دنیا کی دوسری تمام اضافی چیزیں بھی اپنی اپنی جگہ پر بحال رہتی ہیں لیکن مذہب عقل اور منطق کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ شخصی خدا کو پانے کے لئے بھی غیر شخصی خدا کا شعور ضروری ہے، عقل اور منطق کا طریقۂ کار یہ ہے کہ محدود اور مخصوص چیزوں کو وسیع اور عام چیزوں کی نسبت سے جانا اور پرکھا جاتا ہے۔ ہمہ گیر تصورات کے شعور ہی سے مخصوص تصورات کو اپنی جگہ پر قائم کیا جاتا ہے۔ انسان اور انسان کے عظیم ترین نمونے یعنی شخصی خدا کا تصور غیر شخصی ہستی کے ہمہ گیر تصور ہی سے قائم ہو سکتا ہے، اس ہستی کے شعور سے شخصی خدا اور بندے کے تعلقات کو تقویت پہنچتی ہے یہ تعلقات ایک نیا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اُن کے معنی اُبھر آتے ہیں۔ خدا کی عبادت اب بھی ہوتی ہے لیکن ہم گڑگڑا کر دنیاوی چیزوں کے لئے دعائیں نہیں مانگتے۔ دعا مانگنے کا خیال ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھ لیتے ہیں کہ دعائیں محض دنیاوی خواہشات کا اظہار ہوتی ہیں ہم جان لیتے ہیں کہ دنیا کی قدریں اضافی ہیں، ہمارے لئے ان کی کشش ہی مٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدار مغز مذہبی راہنما خدائے تعالیٰ سے دعا مانگنے کی اجازت نہیں دیتے، دعائیں مانگنا ہو تو دیوتاؤں سے مانگیے، اولیا سے مانگیے، خدا سے دعا مانگنے کے کیا معنی مثلاً رومن کیتھولک عیسائی اولیا[ل] ہی سے دعائیں مانگتے ہیں اور یہ درست بھی ہے اور فطرت کے موافق بھی، خدا سے دعا مانگنا محض بے عقلی ہے بھلا یہ کہاں تک ٹھیک ہے کہ ہم خدا سے تازہ ہوا، بارش یا فصلوں کے لئے دعا مانگیں، ایسی دعائیں قانون قدرت کے خلاف ہوتی ہیں۔ البتہ سنت، سادھو اور اولیا جو ہماری طرح کے انسان ہیں لیکن جو ارتقا کی اعلیٰ منزلوں تک جا پہنچے ہیں اور جنھوں نے ہم سے زیادہ طاقت حاصل کر لی ہے، ہماری خواہشات کو پورا کرنے میں ہماری مدد کرنے پر راضی ہو سکتے ہیں، انسان کا انسان سے مدد طلب کرنا بجا ہے، اس لئے سنتوں اور اولیا سے دعا مانگنے کے تو معنی ہو سکتے ہیں لیکن خدائے تعالیٰ شہنشاہِ عالم سے اس قسم کی دعائیں مانگنا کہ یا اللہ میرے سر میں درد ہے اس کو دور کر دے" اپنا اور اپنے خدا کا مضحکہ اُڑانا ہے، اس دنیا میں لاکھوں کروڑوں ایسی روحیں آئیں جو یہاں سے روپوش

ل Saints.

ہونے کے بعد فرشتوں اور اولیا کے مقام تک جا پہنچیں وہ سب کی سب ہماری مدد کو موجود ہیں، اگر ہمیں اپنی دنیاوی خواہشات ہی کے لئے دُعا مانگنا ہے تو ان سے مدد طلب کی جا سکتی ہے لیکن خدا سے دُعا؟ آخر کیوں؟ خدا سے دُعا مانگنا ہے تو خدا کو مانگئے، اُن چیزوں کو مانگئے جو ہمیں اُس تک لے جا سکتی ہیں، یقیناً بیوقوف ہے وہ شخص جو گنگا کے کنارے بیٹھ کر پانی کے لئے چند قدم دُور اپنا ایک علیحدہ کنواں کھودنا چاہتا ہے، یقیناً بے عقل ہے وہ آدمی جو ہیروں کی کان میں جاکر کوئلے کی تلاش کرتا ہے، گنگا تک جاکر امرت پیجئے، ہیروں کی کان سے ہیرے دامن میں بھر لیجئے۔ خدا سے خدا کو طلب کیجئے۔ اس سے دنیا کی خواہشات کی تکمیل کی دُعا مانگنا کُفرانِ نعمت ہے آخر اس سے زیادہ اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ہم برکت و رحمت کے سر چشمہ سے، محبت و شفقت کے دریا سے آبِ حیات کے بجائے کنکر اور ریت طلب کریں جس ہستی سے ہمیں علم و آگہی کا عالمتاب نور مل سکتا ہو اُس سے خواہشات کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے مانگیں آیئے ہم خدا سے آگہی اور طاقت اور محبت کی مانگ کریں، آیئے ہم دُعا کریں کہ ہمارے دل و دماغ اُس کے نُور سے چمک اُٹھیں اور ہماری رگ رگ میں اس کی لازوال محبت جاگ اُٹھے یاد رکھیئے کہ جب تک ہم میں کمزوریاں اور خامیاں ہیں جب تک ہم خواہشات کے غلام ہیں اور اس غلامی میں ہم کو لطف آتا ہے، اس وقت تک نہ تو ہم شخصی خدا کے تصوّر سے آگے نکل سکیں گے اور نہ ہم اُس سے اپنی مُرادیں منوانا بند کریں گے لیکن اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو رُوحانی ارتقا کی اعلےٰ منزلوں تک جا پہنچے ہیں۔ یہ بلند مقام لوگ دنیاوی قدروں کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اِن کی نظر میں دنیاوی سازوسامان کی کوئی قیمت نہیں یہ تو تقریباً بھُول ہی گئے ہیں کہ خود اپنے لئے کسی چیز کی خواہش کرنا کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی خودی کو کچھ اس طرح مٹا دیا ہے کہ اُن کی اپنی کوئی ضرورت ہی نہیں ہی یہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں یہی لوگ تو غیر شخصی پُوجا کے اہل ہیں یہ وہ پُوجا ہے جس میں احساسِ کمتری کو بالکل کوئی دخل نہیں غیر شخصی خُدا کی پُوجا میں غلامی کا کوئی عنصر شامل نہیں، یہاں پجاری یہ نہیں کہتا کہ خدایا میں ہیچ ہوں۔ مجھ پر رحم کر دیہ پُوجا تو اناالحق کا نعرہ بن کر گونجتی ہے۔ آپ نے فارسی کی وہ نظم سُنی ہو گی جس میں یہ مثال بیان کی گئی ہے "میں اپنے محبوب کو ملنے آیا۔ میں نے دیکھا کہ سب دروازے بند ہیں میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟" میں نے کہا "میں فلاں شخص ہوں" لیکن دروازہ نہ کھُلا، میں دوبارہ محبُوب کے دروازے پر آیا اور دستک دی، اندر سے پھر وہی آواز آئی "تم کون ہو" میں نے پھر وہی جواب دیا "میں فلاں شخص ہوں" دروازے کے کواڑ اب بھی بند ہی رہے، میں تیسری بار پھر وہیں آیا اور اس بار بھی مجھ سے وہی پہلے والا سوال پوچھا گیا، میں نے جواب دیا "میں تو" ہوں میرے محبوب" میرا یہ کہنا تھا کہ محبوب کے محل کے سارے دروازے مجھ پر کھل گئے"۔

یہ ہے غیر شخصی خُدا کی پرستش کی صُورت جس کی بنیاد احساسِ خودی پر ہے یہ پرستش حقیقت اور آگہی

کی بنا پر کی جاتی ہے، اور وہ حقیقت یہ ہے کہ "میں وہ ہوں" اگر میں یہ کہوں کہ "میں تو نہیں ہوں" تو یہ سراسر غلط ہے، اگر میں یہ سمجھوں کہ "میں تجھ سے جُدا ہوں" تو یہ ایک خطرناک جھوٹ ہے، میں تو تمام کائنات کی وحدت ہوں، وہ وحدت جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا مجھے اس بات کا کوئی ثبوت پہنچانے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے براہِ راست اس حقیقت کا شعور و احساس ہے کہ یہ تمام کائنات اور میں ایک ہیں، یہ تمام عالمِ شہود مجھ میں ہے اور میں اس میں ہوں یہ آکاش، یہ ہوا یہ چاند سُورج، یہ ٹھنڈک اور گرمی یہ نور و جمال میں ان سب میں موجود ہوں اور میری بدولت جلوہ گر ہیں یہ تمام کائنات اور میں ایک ہیں۔ میں کسی سے جُدا نہیں اور نہ مجھ سے کوئی چیز جُدا ہے، میں وحدتِ جاوداں ہوں میں ہی کائناتی ہستی[ل] ہوں اور میں ہی عالمِ شہود بھی، میں زندگیٔ دوام بھی ہوں اور دُنیائے ناپائیدار بھی۔ دراصل مجھے ناپائیدار سمجھنا ہی غلط فہمی ہے کیونکہ میرے سوا کچھ ہے ہی نہیں تمام کاروبارِ جہاں مجھ سے رواں ہے۔ ہر فعل کا فاعل اور ہر عمل کا عامل میں ہوں ہر دل میں "میں" کا احساس مجھ ہی سے ہے میں امر ہوں۔ لازوال ہوں، لاثانی ہوں، میں زندۂ جاوید ہوں۔ میں سدا جاگتا رہتا ہوں، میرا جلال ہمیشہ قائم رہتا ہے میری طاقت اور قدرت میں کبھی کمی نہیں آسکتی میں "وہ" ہوں ؛

یہ ہے غیر شخصی خدا کی پرستش کا رنگ اس سے انسان کی تمام زندگی بدل جاتی ہے، سب کمزوریاں اور خامیاں دُور ہو جاتی ہیں اور انسان یزدانی طاقت کا مجسمہ بن جاتا ہے، اگر ہمیں زندگی میں کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ طاقت و توانائی ہے۔ آخر جس چیز کو ہم گناہ کہتے ہیں وہ اپنی کمزوری کی تلافی کی ہی ایک صورت ہے، اِس جہاں کے سارے غموں کا سبب بھی ہماری کمزوری ہے، کمزوری سے جہالت پیدا ہوتی ہے اور جہالت دکھوں کی جڑ ہے جو کمزور ہے اس میں حقیقت کو پہچاننے کی تاب نہیں، اور جو حقیقت سے واقف نہیں وہ قدرتی طور پر دُکھ درد میں مبتلا رہتا ہے (مثلاً جو رسی کو سانپ سمجھتا ہے وہ ہر وقت خوف میں ہی مبتلا رہے گا) غیر شخصی خدا کی پرستش حقیقت شناسی ہے؛ احساسِ حق سے ہم میں بے انتہا طاقت آجاتی ہے ہم دُنیا کی مصیبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں (ہمارے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں رہتا ضرورت ہو تو ہم موت کے مُنہ میں جانے سے بھی نہیں ڈرتے، دنیا جنہیں شیطان سیرت لوگ کہتی ہے ہم اُن کے کرتوتوں پر بھی مُسکرا دیتے ہیں (کیونکہ اُن کی کم مائیگی، اور کم نگاہی ارتقا کی ایک عارضی منزل ہے) ہمیں تو شیر اور چیتے کی خونخواری میں بھی اپنی واحد خودی کا جلوہ نظر آئے گا۔ سچی طاقت اُسی میں ہے جو اپنے خدا سے ایک ہو گیا ہے جو ہر طرف اُسی کو جلوہ گر دیکھتا ہے اور جس کے دل سے خوف کا نام و نشان ہی مِٹ گیا ہے، آپ اپنی انجیل مقدس کو ہی دیکھئے، یسوع مسیح کی زندگی کا مطالعہ کیجئے، اور سوچئے

ل Universal Being.

کہ آخر اُن کی بے انتہا طاقت کا کیا راز تھا؟ وہ زبردست طاقت آخر کہاں سے آئی تھی جو بائیوں کی بغاوت پر ہنس دیتی تھی، اور جس کی بدولت یسوع مسیح اپنے قاتلوں کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کرتے رہے، دیکھئے خود یسوع مسیح اس طاقت کے مصدر کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں "میں اور میرا ایزدانی باپ دراصل ایک ہیں"[۱]۔ اور پھر دیکھئے اُن کی پرارتھنا کیا ہے کہتے ہیں "میرے پتا جیسے میں اور آپ ایک ہیں۔ اسی طرح سب کو میرے ساتھ ایک کر دو"[۲]۔ یہی سچی پرارتھنا ہے، یہی سچی پوجا ہے، کائنات کو اپنے میں سمو کر اُس سے ایک ہو جاؤ، یہ کائنات جس ہستی میں بس رہی ہے اُس سے ایک ہو جاؤ اس کائناتی ہستی۔ اس غیر شخصی خدا کی حقیقت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُسی کے دم سے ہی ہم زندہ ہیں۔ ہماری زندگی اُس کی زندگی ہے، وہ ہمارے اس قدر قریب ہے کہ ہمارے اور اُس کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں وہ ہمارے حواس سے بھی زیادہ نزدیک، اور ہمارے خیالات سے بھی زیادہ قریب ہے اُسی کی بدولت تو ہم حواس سے کام لیتے ہیں، اُسی کی روشنی میں تو ہمارے خیالات پیدا ہوتے ہیں، کسی چیز کو دیکھنے سے پہلے ہم اُسے دیکھتے ہیں، یہ جو میرے سامنے دیوار کھڑی ہے، اس کو دیکھنے سے پہلے یعنی اس کا بحیثیت دیوار کے ادراک کرنے سے پیشتر مجھے اُس ایک حقیقت کو دیکھنا ہوتا ہے جس میں یہ دیوار موجود ہے، وہی تو ہر شے کی اصل ہے وہی تو ہر فعل کا واحد فاعل ہے۔ آخر کون کس کو دیکھتا ہے؟ وہی تو ہر دل میں بس رہا ہے، اجسام بدلتے رہتے ہیں ذہن اور دماغ میں تبدیلی آتی رہتی ہے، خوشی اور غمی، نیکی اور بُرائی آنے جانے کی چیزیں ہیں، زمانہ گذرتا رہتا ہے دن اور سال بیت جاتے ہیں، جنم اور مرن کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن "وہ" کبھی نہیں مرتا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی "وہ" لازوال ہے، زندۂ جاوید ہے "میں ہوں" "میں ہوں" کی واحد آواز ہمیشہ برقرار رہتی ہے، اس میں تغیر نہیں آتا۔ اُسی میں بس کر اور اُسی کے دم سے ہمیں عالمِ شہود کا شعور اور ادراک ہوتا ہے، ہماری تابِ نظر، طاقت احساس اور قوتِ فکر سب اُسی ہستی کا پرتو ہیں ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں تو اُس کی آنکھوں سے ہمارے کان سنتے ہیں تو اُس کے کانوں سے، ہمارے ہاتھ پاؤں اُسی کے ہاتھ پاؤں ہیں اور ہمارے دل و دماغ اُسی کے دل و دماغ ہیں اُس کی ہستی ہی سے ہماری ہستی قائم ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہستی ہے تو بس اُسی وجودِ واحد کی یہ "میں" کا احساس جسے ہم غلطی سے اپنی محدود انفرادی ہستی کی بنیاد سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل ہم سب میں موجود ہے مجھے بھی اُسی "میں" کا احساس ہے جس کا آپ سب کو آپ کا "میں" اور میرا "میں" ایک ہے۔ یہی واحد احساسِ خودی سب میں ہے انسان

---

[۱] I and my Father are One.

[۲] Father, just as I am one with Thee so make them all one with me.

یں بھی اور حیوانوں میں بھی فرشتوں کی ہستی بھی اُسی ایک احساسِ خودی سے قائم ہے اور زندگی کی کمترین صورت میں بھی اُسی کا جلوہ ہے، صوفی اور قاتل کے "میں" میں فرق نہیں۔ غریب کا "میں" امیر کے "میں" سے مختلف نہیں، مرد اور عورت کا احساسِ ہستی ایک ہے بچے اور بوڑھے میں وہی "میں" محرکِ حیات ہے، ہستی ہے تو اُسی ایک کی "وُہی" "میں" بن کر سب میں جلوہ گر ہے۔ اموئبہ[1] سے لے کر فرشتے تک ہر رُوح میں وہی موجود ہے ہر طرف سے ہر گھڑی یہ آواز آ رہی ہے "میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں"[2] جب ہم اس آواز کو سمجھ جائیں گے، جب ہم "میں وہ ہوں" کا مطلب ذہن نشین کر لیں گے تو کائنات کا راز ہم پر کُھل جائے گا۔ اس کے بعد کوئی چیز ہم سے چھپی نہیں رہے گی۔ ہم اُس حقیقت کو پا لینگے جس کی تلاش میں دنیا کے تمام مذہب ظہور پذیر ہوئے اور جس کو پانے کی تلقین وہ آج بھی کر رہے ہیں اس حقیقت کو پا کر ہی ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کے نقطۂ نظر سے مادّی علوم کو کیوں ثانوی حیثیت دی گئی ہے، سچا علم تو وہی ہے جو ہمیں خدا اور خدا کی کائنات سے ایک کر دے ؛

ےل Amoebа.　　ےل۲ "I am He, I am He"

مذہب کی ضرورت

(۱۹۰۱ء)

یہ لیکچر بمقام لندن دیا گیا

نسلِ انسانی کی تقدیر کے بنانے میں جو قوتیں بیشتر کام کرتی رہی ہیں۔ اور آج بھی جن کا یہ عمل جاری ہے، ان میں اس قوت سے زیادہ عظیم یقیناً اور کوئی قوت نہیں جس کے ظہور کا نام مذہب قرار دیا گیا ہے۔ تمام سماجی معنوں کے پسِ پشت کہیں نہ کہیں یہ حیرت انگیز قوت کار فرما ہوئی ہے۔ بنی نوع انسان میں باہمی تعلقات کے زبردست جذبے کا ماخذ بھی یہی مذہب کی طاقت ہے ہم سب جانتے ہیں کہ اکثر و بیشتر مذہب کا رشتہ۔ نسلی جغرافیائی، قومی اور خاندانی رشتوں کے بمقابلہ زیادہ پائیدار ثابت ہوا ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ ہم معبود و ہم مذہب لوگ بھائیوں اور خاندانی رشتہ داروں سے بھی کہیں زیادہ آپس میں مِل جُل کر رہتے آئے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے رہے ہیں، اِس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی اور کہاں سے ہوئی؟ جو قدیم مذہب آج بھی جاری ہیں اُن کا دعوےٰ تو یہ ہے کہ وہ سب مافوق الفطرت ہیں، الہامی اور غیبی ہیں۔ اُن کی پیدائش انسانی دماغ سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن کا ماخذ انسانی دماغ سے باہر کسی اور جگہ ہے۔ اس خیال سے گزر کر مذہب کے بارے میں بہت کچھ تحقیقات کی گئی ہے۔ زمانۂ حال کے عالموں میں دو نظریوں کو کسی قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے، ایک نظریہ کی رُو سے مذاہب کی ابتدا اِس خیال سے ہوئی کہ مرنے کے بعد بھی کوئی چیز یعنی رُوح باقی رہتی ہے۔ دوسرے نظریئے کے مطابق جس و محدودیت کے احساس کے دائرے سے نکل کر لامحدودیت اور آزادی کے خیال کی ارتقا ہی کا نام مذہب ہے۔ محققوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ مذہبی خیالات کا آغاز مرحوم بزرگوں کی

پرستش سے ہوا۔ دوسری جماعت کی رائے کے مطابق مذہب کی ابتدا قدرت کی غیر مرئی طاقتوں کو شخصی وجود دینے سے ہوئی۔ اِنسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے مرحوم بزرگوں کو بھولنا نہیں چاہتا، وہ اپنے بزرگوں کی یادگار قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ ان کی جسمانی فنا کے بعد اُن کی ہستی بالکل نابود ہو جاتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد بھی کوئی چیز (روح) ہے جو زندہ رہتی ہے اور اُن کی انفرادیت برقرار رکھتی ہے اس لئے وہ اُن سے اپنا تعلق قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اُن کے لئے خوراک مہیا کرنا چاہتا ہے یا کسی اور طریقے سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے جس سے آبا واجداد کی پرستش کا رواج جاری ہوتا ہے اور اسی عقیدے سے اس چیز کی نشو و نما ہوئی جسے ہم مذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مصر۔ بابل۔ چین نیز امریکہ اور دوسرے ملکوں کی بعض قوموں کے قدیم مذاہب کا مطالعہ کرنے سے نہایت واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ بزرگانِ رفتہ کی اسی پرستش سے مذہب کی ابتدا ہوئی مصر کے قدیم باشندوں کا اوّلین عقیدہ رُوح کے بارے میں یہ تھا کہ رُوح جسم ہی کا ایک نقشِ ثانی[۱] ہوتی ہے۔ ہر انسان کے جسم میں بالکل اسی سے ملتا جلتا ایک اور بھی وجود ہوتا ہے اور جب کوئی انسان مرتا ہے تو یہ دوگانہ[۲] وجود جسم سے علیٰحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی ہستی برقرار رہتی ہے۔ لیکن اُن کے خیال کے مطابق اس دوگانہ وجود کی ہستی اِتنے ہی عرصے تک قائم رہتی ہے جتنے عرصے تک مُردہ جسم صحیح وسالم طور پر برقرار رہتا ہے اِسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ مصر میں اس بات کی خاص احتیاط رکھی جاتی تھی کہ متوفّی کے جسم کو کوئی گزند نہ پہونچنے پائے۔ مصر والے ارواحِ رفتہ کے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے بڑے بڑے ہرم[۳] بنواتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر خارجی جسم کو کسی طرح کی گزند پہونچے گی تو اس کا اثر دوگانہ وجود پر بھی پڑے گا اور اس کو بھی چوٹ پہونچے گی۔ ظاہر ہے کہ اُن کا یہ خیال اور یہ عمل بزرگانِ رفتہ کی پرستش ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔ قدیم اہلِ بابل میں بھی دوگانہ وجود کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں اِس کی صورت کسی قدر مختلف ہے۔ اُن کے یہاں محبت کی جگہ خوف کام کرتا ہے مشفق اور مہربان رُوحوں کے بجائے بھوت پریت کا خیال پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق دوگانہ وجود کی حس تو بالکل رخصت ہو جاتی ہے۔ خود اپنے بچوں اور اپنی بی بی کی محبت تک اِس دوگانہ وجود کے دل سے عنقا ہو جاتی ہے۔ یہ رُوحیں زندوں کو ڈراتی ہیں اور انھیں کھانے

---

۱ اور ۲ Double.　　　۳ Pyramids.

پینے کی چیزیں مُہیا کرنے پر مجبور کرتی ہیں یا اور مختلف طریقوں سے اُن سے اپنی خدمت کراتی ہیں۔ قدیم ہندوؤں میں بھی بزرگانِ رفتہ کی پرستش کا رواج پایا جاتا ہے۔ چینیوں کے مذہب کی تو بنیاد ہی بزرگانِ رفتہ کی عبادت پر رکھی گئی ہے۔ اس وسیع مُلک کے طول وعرض میں آج بھی ہر گھر میں آبا و اجداد کی پرستش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چین میں مذہب کبھی مرحُوم بزرگوں کی عبادت سے آگے بڑھا ہی نہیں اس کی ارتقا بس اسی مقام پر آکر رُک گئی۔ اِس لئے زمانۂ حال میں بھی اُن کا مذہب محض اسی بات پر محدود و مبنی ہے۔ اِن مثالوں سے اُن لوگوں کے نظریے کا ایک بہت اچھا جواز مہیا ہو جاتا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ مذہب کی ابتدا ارواحِ رفتہ کی عبادت سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ایسے بھی علما ہیں جو آریوں کے قدیم ادب سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کی ابتدا پرکرتی پوجن یعنی قدرت کی پرستش سے ہوئی ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں بھی ہر جگہ اُن بزرگانِ رفتہ کی پرستش کے رواج کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج بعد میں پیدا ہوا کیوں کہ جو قدیم ترین یادداشتیں[۱] اب تک محفوظ ہیں۔ اُن میں اس رواج کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔ آریہ قوم کا قدیم ترین گرنتھ رِگ وید سنگھتا ہے۔ لیکن اس سنگھتا میں کہیں اس رواج کا نشان تک نہیں ملتا۔ ہاں دورِ حاضرہ کے عالموں کی معلومات کے مطابق رِگ وید سنگھتا میں پرستشِ قدرت کی مثالیں ضرور ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دماغ مناظرِ قدرت کے پسِ پردہ حقیقت کا متلاشی ہے اور اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ علی الصباح نُور کے تڑکے کا سماں۔ یہ شام کا دل فریب منظر۔ فطرت کے حسن وجمال کی یہ دلکش صُورتیں اور اس کے برعکس یہ تلاطم وطوفان کی کیفیت۔ فطرت کی یہ عظیم اور ہیبت ناک قوتیں ایسی ہی تمام چیزیں انسانی دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اُسے اپنی نوعیت کو سمجھنے کے لئے متحرک کرتی ہیں۔ اِنسان اِن مظاہرات سے گزر کر حقیقت تک پہونچ جانا چاہتا ہے۔ اسی کوشش کے دوران میں مناظرِ فطرت کے پیچھے قوتوں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ پھر انسانی تخیل اِن مختلف قوتوں کو مجسّم کرتا ہے۔ اُن کو شعور بخشتا ہے اور انھیں شخصی صفات سے منسوب کرکے جیتے جاگتے حسین وجمیل یا مہیب اور دہشت ناک دیوی دیوتا پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ غیر شخصی لامحدودیت کا تصوّر بھی قائم رکھتا ہے۔ یہ دیوی دیوتا بیک وقت انفرادی شخصیت کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ اور اس سے بالا بھی اس طرح انسانی تلاشِ حق

---

[۱] Records.

مختلف تصوّرات اختیار کرلیتی ہے۔ خواہ یہ تصوّرات شخصی ہوں خواہ غیر شخصی۔ یہی حال قدیم زمانے کے یُونانیوں کا بھی ہے۔ اُن کی تمام دیو مالا محض پرستش فطرت ہی کی ایک مجسّم صورت ہے۔ اسی طرح دوسری آریائی نسلوں مثلاً جرمنی اور اسکینڈے نیویا کے پُرانے لوگوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ گویا اِن اطراف میں اِس نظریئے کی حمایت نہایت مضبوطی کے ساتھ ہوتی ہے کہ مذہب کی ابتدا فطرت کی قوتوں کی تجسیم و تشکیل سے ہوئی۔

حالانکہ بظاہر یہ دونوں نظریئے ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں باہمی موافقت و مطابقت کی صُورت یوں پیدا ہوسکتی ہے، کہ مذہب کی اصل ماہیت تعینات حواسی سے اوپر اُٹھنے کی جدوجہد کو قرار دیا جائے یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخر انسان اپنے باپ دادا کی رُوحوں سے مدد کا متمنی کیوں ہے یا وہ قدرت کی مختلف قوتوں کو مجسّم کرکے اُن کی پُوجا کیوں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حواس کا دائرہ عمل محدود اور تنگ ہے۔ اِنسان کی فطرت بھی یہی ہے کہ وہ ہر قسم کی بندش اور محدودیت سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جھلک اس چیز کی دیکھنا چاہتا ہے جو جسم کے فنا ہونے کے بعد باقی رہ جاتی ہے یا وہ اس طاقت کے راز کو سمجھنا چاہتا ہے جو فطرت کے اِس مظاہرۂ عظیم کے پس پشت کام کررہی ہے۔ بہرحال اِن دونوں حالتوں میں وہ یقیناً حواس کی قید سے آزاد ہوکر بلند ترین منزل پر پہونچنا چاہتا ہے وہ اس قید میں مطمئن نہیں رہ سکتا اور اس سے باہر نکلنا چاہتا ہے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسان حواس کی حد میں قانع اور مطمئن کیوں نہیں رہتا۔ اِس سوال کا کوئی پیچیدہ اور پُراسرار جواب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قدرتی امر ہے۔ اِس سے زیادہ حیرت انگیز بات اور کیا ہمارے تجربے میں آسکتی ہے کہ جب ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور ہمارے جسم بظاہر بے جان پڑے ہوئے نظر آتے ہیں تو بھی ہمارا دِماغ اپنا پُرپیچ کام سرانجام دیے جاتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بچّے اور غیر تربیت یافتہ لوگ خواب اور بیداری کے تجربات میں تمیز نہیں کرسکتے۔ یہ دیکھ کر انسان قدرتی طور پر یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر خواب کی حالت میں دماغ کا کام جاری رہتا ہے تو کیا اِس جسم کی فنا کے بعد بھی اُس کی کارروائی جاری رہ سکتی ہے دوسرے الفاظ میں کیا موت کے بعد بھی زندگی ممکن ہے؟ مذہب اور روحانیت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ سپنوں (خوابوں) پر غور و خوض کرتے کرتے انسان کے دِل میں حیاتِ جاوِدانی کا خیال جنم لیتا ہے اس خیال

لے Mythology.   ٢ے Scandanavia

سے کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور اسی سے آبا و اجداد کی رُوحوں کے وجود اور مناظر قدرت کی مجسّم قوتوں (دیوی دیوتاؤں) کے تصوّر کا آغاز ہوتا ہے اِس کے علاوہ اسی کے توسّل سے مذہب اور رُوحانیت کے متعلق بلند ترین نظریئے انسانی دِماغ کی گرفت میں آجاتے ہیں اور آخر آدمی یقین اور ایمان کی منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ میرے خیال میں مذہب کی ابتدا کو واضح طور پر اسی طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ وضاحت دوسری وضاحتوں پر حاوی بھی ہے اور ان سے زیادہ معقول بھی ہے یہ اور بات ہے کہ بعد کی تحقیقات سے اکثر لوگ اس نتیجے پر پہونچے کہ جو کچھ وہ خواب میں دیکھتے ہیں اس کی تصدیق حالتِ بیداری سے نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ سپنوں (خوابوں) میں انسان کوئی نئے اور تازہ تجربے نہیں کرتا۔ حالتِ خواب کے مُدرکات و مشاہدات تو گزشتہ محسوسات کا عکس محض ہوتے ہیں۔ اِس حالت میں بس اُنھیں تجربات کا اعادہ ہوتا ہے جو حالتِ بیداری میں ہوچکے ہوتے ہیں۔

لیکن پیشتر اس کے کہ دُنیائے خواب کے متعلق اس قسم کی معلومات حاصل ہوتیں۔ خوابوں پر غور کرتے کرتے انسانی تحقیق و تلاش کا آغاز ہوچکا تھا۔ یہ تلاش اندرونی تھی۔ اِنسان اپنے دل[ل] و دماغ کی مختلف حالتوں کا نہایت گہرا مطالعہ کرتا رہا اور اس نے بیداری و خواب ان دونوں حالتوں سے بھی زیادہ بلند مدارج دریافت کئے۔ اِن مقامات کا ذکر دُنیا کے ہر مذہب میں آتا ہے کوئی اس حالت کو آنند یا مستی کہتا ہے اور کوئی اِسے الہام والقا کے نام سے پکارتا ہے۔ تمام منظم مذاہب کے بانیوں، پیغمبروں اور رسُولوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن پر ایسی ایسی دماغی کیفیات طاری ہوا کرتی تھیں جنہیں نہ بیداری کہہ سکتے ہیں نہ خواب۔ ایسی حالت میں وہ حقائق کے ایک نئے سلسلے کا مشاہدہ بچشمِ خود کرتے ہیں۔ یہ رُوحانی حقیقتیں محض خواب وخیال اور تصورات پر مبنی نہیں بلکہ مجسّم ہوکر اُن کے روبرو آجاتی ہیں اور اُن کا شعور و احساس اُنھیں پُوری شدّت سے ہوتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جاگتی حالت میں اپنے گرد وپیش رُونما ہونے والے واقعات کا احساس ہم لوگوں کو جس شدّت سے ہوتا ہے۔ اِس سے کہیں زیادہ شدّت اِن کیفیات کے احساس میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندو مذہب کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کی متبرک و مقدس کتابیں وید ہیں۔ ویدوں کے مصنف وہ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ جنہیں رُوحانی حقائق کا ذاتی اور عملی تجربہ تھا اور جنہیں ہم رشی[ے] کہتے ہیں سنسکرت

ل Mind. ے Rishi.

زبان میں لفظ رشی کے صحیح معنیٰ ہیں وہ روشن ضمیر بزرگ جن پر ویدک منتروں کے ابواب معانی[ھ۱] ہمیشہ کھُلے رہتے ہیں۔ اِن بزرگوں کی آنکھوں کے سامنے وہ حقائق مجسّم ہو کر جلوہ گر ہوتے ہیں جن کا بیان ویدوں کی مُناجاتوں[ھ۲] میں آیا ہے۔ خود اِن بزرگوں نے علانیہ کہا ہے کہ انھیں کچھ مافوق الفطرت حقائق کا عملی اور ذاتی تجربہ ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے اِن حقائق کا شدّت سے شعور و احساس کیا ہے (حالانکہ ماوراء الحس تجربات کے بیان کے لئے شعور و احساس کے الفاظ ناکافی ہیں) اور انھیں تجرباتی واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اِسی حقیقت کا اعلان دوسرے مذاہب مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کے رہنماؤں نے بھی کیا ہے۔ آپ میرے اس بیان پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ یہ کلّیۃً بُودھ مت پر عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ بُودھ تو خُدا یا رُوح کی ہستی کو مانتے ہی نہیں۔ اس لئے کم از کم اُن کے مذہب کی بنیاد فوق الحواسی حقیقت کے شعور و ادراک پر نہیں رکھی گئی۔ بظاہر یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوچا جائے تو جس لازوال اخلاقی قانون کا پرچار بُدّھ مت کرتا ہے اس کے جواز میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی۔ بلکہ خود بودھوں کے اعتقاد کے مطابق مہاتما بدُھ کو اس دوامی اخلاقی قانون کا پتہ فوق الحواس حالت ہی میں چلا۔ آپ میں سے جن حضرات نے مہاتما بدُھ کے اس مختصر سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے جو لائٹ آف ایشیا[ھ۳] ایسی حسین و جمیل نظم میں بیان کی گئی ہے۔ ان کو یاد ہوگا کہ اس میں بھگوان بدُھ کو برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے حتےّٰ کہ بیٹھے بیٹھے اُن پر استغراق یا سمادھی کی کیفیت طاری ہو گئی ان کی تمام تعلیمات ان کی اسی استغراقی کیفیت کے تحت صادر ہوئیں۔ اُن میں منطق اور دلائل نیز ذہنی غور و فکر کو ذرا بھی دخل نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ دُنیا کے سب مذاہب کا یہ زبردست دعوےٰ ہے کہ بعض لمحوں میں انسانی دماغ محض حواس کے تعینات ہی سے نہیں گزر جاتا ہے، بلکہ عِلّت و دلیل کی حدوں کو بھی پار کر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے سامنے ایسے حقائق پیش ہوتے ہیں جن کا علم ہم کو نہ کبھی حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور نہ عقل و دلیل کی مدد سے۔ دُنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد انھیں حقائق پر قائم ہے۔ ہمیں یقیناً اِن حقائق کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کو عقل و دلیل کی کسوٹی پر کسنے کا پُورا حق حاصل ہے لیکن یہ بھی امرِ مسلّمہ ہے کہ دُنیا کا ہر مذہب اِس بات کا دعوے دار ہے کہ انسانی دماغ میں حواس اور عقل کی حدوں کو پار کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت ہوتی ہے۔ اور اس

ھ۱ Seer of mantras. ھ۲ Vedic hymns.

ھ۳. Light of Asia.

صلاحیت کو سب مذاہب ایک امرِ واقعی قرار دیتے ہیں۔

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ دعوے کہاں تک صحیح ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ سب مذہبوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ فوق الحواسی حقائق جن کا پتہ سب مذہب دیتے ہیں۔ غیر مرئی ہیں[1]۔ علم طبیعات کی دریافتوں کی طرح ٹھوس اور مرئی نہیں بلکہ اُن تمام بڑے بڑے مذاہب میں جن کا فلسفہ منظم اور تفصیلی (detailed) ہے یہ حقائق خالص ترین وحدتِ مطلق کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اِس (فوق الحواس) وحدتِ مطلق کا شعور و ادراک کرنے کے لئے اس کو مختلف نام دیئے گئے ہیں جو حقیقت صفات سے بالا ہے اُسے مختلف صفات سے موصوف کیا ہے۔ کہیں اسے حاضرِ کُل[2] نرا کار کہا ہے۔ کہیں اسے غیر مرئی شخص کی صورت دے کر خُدا کا لقب دیا ہے۔ کسی نے اس کو لازوال اخلاقی قانون کہہ کر بیان کیا تو کسی نے اُسے ہستی کا وہ جوہرِ حقیقی بتایا جس کے دیدار کی کسی کو تاب نہیں۔

بہرحال سب مذہبوں کی بنیاد ان غیر مرئی فوق الحواس حقائق ہی پر قائم کی گئی ہے۔ زمانۂ حال میں کچھ لوگوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مذہب کی مافوق الحواس حقیقتوں کا سہارا نہ لیا جائے بلکہ عقل و شعور کی حدود میں رہ کر مذہب کی اشاعت کی جائے۔ لیکن ایسے لوگوں کو کسی نہ کسی صورت میں پُرانے بزرگوں کے نظریۂ وحدتِ مطلق کو اپنانا پڑتا ہے۔ اِس کے بغیر اُن کا کام چل ہی نہیں سکتا ہاں اس کے نام ضرور بدل جاتے ہیں جس چیز کو پُرانے لوگ "خُدا" کہتے تھے۔ اُسے آج اخلاقی قانون[3] یا وحدتِ عینی کہہ لیتے ہیں اور اس طرح عقل کی حدود میں رہنے کا دعوے کرنے والے بھی ان حدود سے باہر قدم رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس عقل اور حواس سے اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کے پسِ پُشت ایک معیاری[4] وحدت

---

[1] The facts of religion are abstractions.

[2] They take the purest form of Unit Abstraction either as an Abstracted Presence or as an Omnipotent Being or an Abstract Personality called God, as a Moral Law or an Abstract Essence underlying all existence.

[3] Moral Law.

[4] Ideal Unity Absolute

مُطلق ہے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس حقیقت کو مختلف مذاہب کس صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اُسے شخصی خُدا کہتے ہیں یا غیر شخصی وجود یا اخلاقی قانون یا جوہرِ حقیقی یا غیر مرئی حاضر و ناظر ہستی[1]۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک معیار رکھ دیا گیا ہے اور اس معیار تک پہنچنے کے لیئے جد وجہد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حقیقی مذہب یہی ہے۔ ہم نے آج تک کسی آدرش پرش (معیاری انسان[2]) کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تاہم اسکے وجود پر ایمان لاکر اس کے کمال کو خود حاصل کرنا ہی سچا مذہب ہے، اِس حقیقت سے کِس کو انکار ہوسکتا ہے کہ کسی آدرش یا معیار کو پیشِ نظر رکھے بغیر ہم کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتے۔ اپنے نصب العین تک پہونچنے کی جد وجہد ہی ہماری زندگی ہے۔ یہ تو ہمارے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ ہر انسان لامحدود طاقت اور بے پایاں مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر شخص طاقت اور مسرّت ابدی کے نصب العین تک پہونچنے کے لئے لگاتار کوشش کررہا ہے۔ دُنیا کا تمام کاروبار اسی جد وجہد کا نتیجہ ہے۔ ہمارے گرد و پیش کی یہ تمام سرگرمی اور مصروفیت اِسی جد وجہد سے وجود میں آئی ہے اور اسی کی بدولت انسان بڑے بڑے کام سرانجام دے پاتا ہے۔ لیکن زندگی بھر کی لگاتار محنت اور مشقّت کو دیکھ کر چند سوچ سمجھ رکھنے والے آدمی جلد ہی اِس نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں کہ جس لامحدود طاقت اور بے پایاں مسرّت (پُورن شکتی اور آنند) کی تلاش میں وہ سرگرداں ہیں وہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ حواس اور جسم بذاتِ خود محدود ہیں اور محدود کے ذریعہ غیر محدود کا ظہور ممکن نہیں۔ یہ دیکھ کر انسان محدود ذرائع سے لامحدود تک پہنچنے کی کوشش ترک کردیتا ہے۔ ترک اخلاقیات کا یہی پس منظر ہے۔ اسی سے مذہب اور روحانیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ دُنیا میں کوئی اخلاقی اور مذہبی قانون ایسا نہیں جس کی بنیاد ترک پر نہ رکھی گئی ہو، آخر تمام اخلاق کا لُبِ لباب یہی تو ہے کہ "میں نہیں" "تو" ہے اس کا اُصول خود پرستی اور خود غرضی کو مٹاتا ہے اور اسی کا نام ہے ترک۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ آپ دوسروں کو اپنے سے زیادہ اہمیت دیں۔ مقدّم سمجھیں۔ اُن کے مفاد کو اپنی اغراض پر ترجیح دیں۔ حواس کی زندگی انانیت اور خود غرضی کی زندگی ہے۔ حواس کا تقاضا ہے "پہلے میں، اور بعدہٗ کوئی اور" "اخلاق ہمیشہ "پہلے" آپ" کا سبق دیتا ہے۔ اخلاق کے تمام ضابطے اور قانون ترک پر مبنی ہیں۔

---

[1] Personal God, Impersonal Being or a Moral law or an Essence or a Presence.

[2] Ideal human being

اخلاق ترک و ایثار ہی کا دوسرا نام ہے جس انفرادیت کو حواس مادی سطح پر تعمیر کرتے ہیں۔ اُس کا انہدام ہی اخلاق کی تعلیم ہے۔ کیونکہ محدود مادی سطح پر غیر محدود ظاہر ہو ہی نہیں سکتا حتیٰ کہ اس کا قیاس تک ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لامحدودیت کے شدید احساس اور اظہار کے متلاشی انسان کو مادی سطح سے اوپر اُٹھ کر دوسرے بلند طبقوں میں جانا پڑتا ہے۔ انسان اونچے اُٹھنے کے مختلف طریقوں کو دریافت کرتا ہے، اور اسی تلاش و تجسّس سے اخلاق کے مختلف قوانین کی تخلیق و تشکیل ہوتی ہے۔ اِن سب باتوں کی تہ میں بس ایک "ترک خودی" (مرگِ انانیت) کا ہی مرکزی خیال مخفی ہوتا ہے۔ یہی "خودکشی" یہی انفرادیت کی مکمل تخریب ہی اخلاقیات کا نصب العین ہے۔ عام طور پر لوگ ایسی باتیں سُن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ترک خودی کو خارج از امکان چیز سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے کہیں کہ اپنے انفرادی وجود کو بھول جاؤ تو وہ حیرت سے آپ کا منھ تکنے لگے گا۔ لوگ اپنی محدود انفرادیت کے مٹ جانے کے خیال ہی سے گھبرا جاتے ہیں۔ انھیں تو مرگِ خودی کے خیال ہی سے خوف محسوس ہونے لگتا ہے لیکن لُطف کی بات یہ ہے کہ یہی لوگ سوچے سمجھے بغیر بڑے زور و شور سے اعلان کرتے ہیں کہ اخلاق کے بلند ترین آدرش صحیح اور قابلِ عمل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقیات کی اصل غائت خودی کی تخریب ہے نہ کہ تعمیر۔

سچ تو یہ ہے کہ جب تک اس ہستی کا اقرار نہ کیا جائے جسے مافوق الفطرت وجود کہتے ہیں اور جسے میں فوق الشعور کا احساس و مشاہدہ کہتا ہوں۔ اخلاقیات کی تخلیق کا اس وقت تک سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ محض افادیت کے معیاروں سے نہ تو انسانوں کے باہمی روابط کی وضاحت ممکن ہے۔ اور نہ کوئی اخلاقی قانون بنائے جا سکتے ہیں۔ افادیت بھی تو آخر انسانی خود غرضی کی ہی ایک صورت ہے۔ اس پر اخلاق کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کیونکہ ہر شخص افادیت کے معنی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے نکال لیتا ہے دراصل اخلاق کے پسِ پشت کوئی اور ہی طاقت کارفرما ہے۔ سچے اخلاقی معیاروں کی تفسیر ہر شخص اپنی مرضی کے مُطابق نہیں کر سکتا۔ اور یہ اعلیٰ معیار فوق الشعور لامحدودیت ہی سے منسوب ہیں۔ اخلاقی نصب العین مقرر ہی اس حالت میں ہوتے ہیں جب اِنسان لامحدودیت تک پہونچنے کے لئے جد و جہد کرنے لگتا ہے۔ افادیّت پسندوں[۵۵] کا کہنا ہے

---

۵۵ Utilitarians.

کہ کسی فوق الحس وجود کے تصور کی ضرورت ہی نہیں۔ کسی لامحدود ہستی تک پہونچنے کی کوشش کرنا دائرۂ عمل سے باہر ہے اور ایسی باتوں میں پڑنا فضول ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ہی سانس میں ہمیں اخلاقیات کی تعلیم بھی دیتے ہیں ہم سے سماج کی بھلائی کے کام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میرا یہ سوال ہے کہ آخر میں فلاح عام کے کام کیوں کروں؟ قوم اور ملت کی بہبودی کا خیال کیوں کروں؟ دُوسروں کے لئے قربانی حاصل کرنے سے آخر حاصل کیا ہے؟ ان کو کیوں فائدہ پہونچاؤں کیوں ان کے کام آؤں۔ ان کو فائدے کے بجائے نقصان کیوں نہ پہنچاؤں۔ ان کو دُکھ کیوں نہ دوں۔ اذیت کیوں نہ دوں؟ اگر بنی نوعِ انسان کا مقصد ذاتی خواہش حاصل کرنا ہے تو میں فقط اپنی خوشی کے لئے کیوں نہ جیوں۔ اپنی خواہش پر دُوسروں کی زندگی کیوں نہ قربان کردوں کوئی جئے یا مرے۔ میری بلا سے۔ اگر مجھے کسی کو دُکھ دے کر خوشی ملتی ہے تو میں اس کو عذاب میں کیوں نہ مبتلا کروں؟ اس کے لئے کلفت و آزار کا موجب کیوں نہ بنوں۔ کون مجھے ایسا کرنے سے باز رکھ سکتا ہے؟ افادیت پسندوں کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ اخلاقیات کا مسلک بذاتِ خود زندگی کا مقصد نہیں ہوسکتا البتہ کسی مقصدِ حیات کو حاصل کرنے کا ذریعہ ضرور ہوسکتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ مقصد، وہ آدرش ہے کیا؟ اخلاقیات کی اہمیت توثانوی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا نصب العین کیا ہے جو ہماری قوتوں کو متحرک کرتا ہے اور جس کے بغیر اخلاقیات ایک بے جان فلسفہ بن کر رہ جاتی ہیں۔

افادیت کے خلاف دُوسرا اعتراض یہ ہے کہ اُس کا بنیادی فلسفہ بہت تنگ ہے اور یہ مروّجہ سماج کے رسم و رواج پر محدود ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سماج اس حالت اور صورت میں ہمیشہ قائم اور برقرار رہے گا۔ جس چیز کو آج ہم سماج (سوسائٹی) کہتے ہیں۔ ہزاروں سال پیشتر اس کا کہیں وجود تک نہیں تھا اور ممکن ہے کہ آج سے ہزاروں سال بعد بھی اس کی شکل و صورت بالکل دُوسری ہو۔ انسانی ارتقار کا عمل ہمیشہ جاری ہے سماج کی تشکیل بھی اسی عمل کی ایک صورت ہے یہ صورت ہمیشہ بدلتی رہے گی۔ اس کو کسی صورت سے ثبات نہیں حاصل ہے اور کسی خاص دور کی سوسائٹی ہمیشہ کے لئے فطرت انسانی کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کرسکتی۔ کل کے اخلاقی قانون آج لازمی طور پر عائد نہیں ہوسکتے سماج کے رسم و رواج اور اور افادیت پسندی کے اصول اور نظریئے زیادہ سے زیادہ موجودہ سماجی حالات میں عمل پذیر ہوسکتے ہیں اور بس اس کے بعد ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس جن اخلاقیات اور جن اخلاقی ضوابط کا دارومدار مذہب اور رُوحانیت پر ہے ان کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہوتا ہے منفرد انسان مذہب کا موضوع ضرور ہے لیکن مذہب اور رُوحانیت انسان کی انفرادیت کو وُسعت دے کر اُس کا رشتہ وجودِ لامحدود کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ مذہب میں سماج کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ اور سماج کے کاروبار

کے متعلق ہدایات بھی مِلتی ہیں لیکن فقط اِس حیثیت سے کہ سماج افراد کے مجموعے ہی کا نام ہے بُنیادی طور پر مذہبی اخلاقیات کا اطلاق انسان اور خُدا کے دوامی روابط پر ہوتا ہے اور چونکہ آدمی سماج کا جزو ہے۔ اِس لئے اس کا اطلاق لازمًا سماج پر بھی ہوتا ہے۔ سماج کے مخصوص اور وقتی نظام سے ان بنیادی اُصولوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ سماجی اخلاقیات کے لئے بھی روحانیت اور مذہب کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان مذہب اور روحانیت کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ مادّی چیزوں کا خیال خواہ کتنا ہی مسرّت بخش کیوں نہ ہو۔ دیرپا نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ مادّیات سے دل کی تسلّی نہیں ہوتی۔ انسان کا دماغ ہر وقت مادّی چیزوں کے خیال سے خوش نہیں رہ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ روحانی معاملات کی طرف زیادہ توجہ دینے سے اس دنیا میں ہمارے عملی روابط میں خلل واقع ہونے لگتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہزاروں سال پہلے جب چین میں کنفیوشیس[ل] کا دَور دورہ تھا یہ کہا جاتا تھا "پہلے ہم اپنی اس دُنیا کی فکر کرلیں۔ اِس کے بعد جب اس دنیا سے رشتہ تعلق منقطع ہوجائے گا تو پھر دوسری دنیاؤں کی فکر کرلی جائے گی۔ اِس دُنیا کی فکر کرنا اچھی بات ہے۔" میں مانتا ہوں کہ رُوحانی معاملات کی طرف بہت زیادہ توجہ دینے سے ہمارے عملی روابط پر اثر پڑ سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف دنیوی تعلقات ہی تک اپنی توجہ مبذول رکھنے سے ہمیں دُنیا و ما فیہا میں بہت کچھ نقصان پہونچ سکتا ہے۔ ہم مادّیت پرست ہوکر رہ جاتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو سمجھنے اور ان سے محظوظ ہونے کی سعادت ہم سے چھن جاتی ہے۔ اِنسان کے لئے محض خارجی قدرت پر فتح حاصل کرلینے ہی کے عمل کو منزلِ مقصود قرار دے لینا مناسب نہیں۔ اس کی منزلِ مقصود تو اِس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

اِنسان اسی وقت تک انسان کہلائے جانے کا حقدار ہے جب تک وہ مقام فِطرت سے بلند ہونے کے لئے جدّوجہد کرتا ہے یہ فطرت باطنی بھی ہوتی ہے اور خارجی بھی۔ فطرت کے دائرے میں صرف وہی قانون داخل نہیں جن کا عمل مادّے کے جاندار یا بے جان ذرّات پر ہوتا ہے۔ اِس میں تو وہ لطیف اندرونی جوہر بھی شامل ہے جو درحقیقت خارجی دُنیا کی بھی قوتِ محرّکہ ہے خارجی فطرت کو قابو میں لانا ایک شاندار کارنامہ ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ شاندار کارنامہ ہے

ل Confucius.

اپنی اندرونی فطرت کو مسخر و مسحور کر لینا اُن قوانین پر دسترس رکھنا بہت بڑی بات ہے۔ جن کے تحت یہ ستارے اور سیارے اپنا اپنا کام کرتے ہیں لیکن اُن قوانین کا علم حاصل کر لینا تو اس سے بھی کہیں زیادہ عظیم کارنامہ ہے جن کے تحت بنی نوع انسان کے جذبات و احساسات اور ارادوں کو تحریک ہوتی ہے، یہ علم و آگہی کی نعمت مذہب کے حصّے میں آئی ہے۔ انسان کے اِس باطنی وجود پر فتح پانا۔ انسانی دماغ کے اندر جو لطیف ترین عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے پوشیدہ نکات کو سمجھنا اور اُن حیرت انگیز رازوں کو جاننا مذہب ہی کا کام ہے۔ اُن رازوں کے جاننے کا کام بس مذہب ہی کے لئے مخصوص ہے اور اس میدان میں صرف کچھ اہلِ دل ہی قدم رکھتے ہیں۔ روحانیت ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عام طور پر انسانی فطرت موٹی موٹی اور زود فہم مادّی باتوں کو سمجھنے ہی پر اکتفا کرتی ہے۔ عام لوگوں کے ذہن میں لطیف تصورات نہیں سما سکتے۔ مثلاً عام لوگ شیر کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن شیر کی طاقت اور بہادری کا مظاہرہ ہزاروں میمنوں کی موت ہے۔ عام لوگ اسی قسم کے جسمانی طاقت کے مظاہرے سے مرعوب و محظوظ ہوتے ہیں۔ عوام کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے جو خارجی ہو اور وہ جس سے لُطف اندوز ہو سکیں ہر سماج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی نظر میں صرف حواس ہی احتظاز کا ذریعہ نہیں۔ وہ ان حواس سے گزر کر اس لطیف چیز کی تلاش کرتے ہیں جو سچّی مسرّت کا سرچشمہ ہے نشاط و سرور کا منبع ہے اور یہ تلاش محض سراب نہیں یہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ایسے برگزیدہ لوگوں کو مادیّت سے کہیں زیادہ بلند اس حقیقت کی جھلک وقتاً فوقتاً نظر آجاتی ہے اور وہ اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھتے ہیں۔ جب تک اِس سے دوچار نہ ہولیں۔ اگر ہم تاریخِ اقوام کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں یہ پتا چل جائے کہ جب کسی قوم میں اس قِسم کے صاحبِ حال بزرگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو وہ قوم ترقی اور عروج کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن جب اِن خدارسیدہ بزرگوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور لامحدودیت کے شیدائی اور تلاشِ حق کے دلدادہ اشخاص آہستہ آہستہ گھٹتے چلے جاتے ہیں تو اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ افادیت پسندوں کی نظریں تلاش حق کی کوششیں کتنی ہی لاحاصل اور فضول کیوں نہ ہوں میں تو ضرور کہوں گا کہ ہر قوم کی طاقت کا سرچشمہ اس کی روحانیت ہوتی ہے اور اس قوم کا خاتمہ اسی روز سے شروع ہو جاتا ہے جب اس کی یہ رُوحانیت زائل ہونے لگتی ہے اور اس پر مادیّت غالب آنے لگتی ہے۔ اور اگر آپ کو میرے ساتھ مکمل اتفاق نہیں ہے تو چھوڑیئے اِس بات کو کہ مذہب ہمیں کیا کیا حقائق سِکھاتا ہے اور کون کون سے رُوحانی معاملات کا پتا دیتا ہے۔ اس اطمینانِ قلب سے بھی قطع نظر کیجئے جو ہمیں مذہب اور روحانیت کی

بدولت نصیب ہوتا ہے۔ لیکن اس بات سے توانکار ممکن نہیں کہ مذہب بحیثیت ایک سائنس کے مطالعہ اور تحقیقات کا ایک زبردست موضوع ہے۔ انسانی دماغ کو اپنی قوتوں کی آزمائش کے لئے مذہبی فلسفہ یعنی لامحدودیت تک پہونچنے کے طرزِ عمل سے بڑھکر اور کیاموضوع دستیاب ہو سکتا ہے لامحدود تک پہونچنے کی یہ کوشش ۔اس کو اپنی گرفت میں لانے کی جدوجہد۔ حواس کی قید سے آزاد ہونے اور مادّے کی حدود سے باہر نکلنے کے لئے یہ جاں فشانی اور اپنی ذات کے رُوحانی پہلو کو آشکارا کرنے اور آب و گِل کے اِس چھوٹے سے وجود میں مدغم کرنے کی شبانہ روز یہ کش مکش بذاتِ خود ایک ایسا نہایت عظیم اور شاندار کارنامہ ہے جس پر انسان فخر کر سکتا ہے۔ بعض اشخاص کے لئے کھانا پینا ہی زندگی کی سب سے بڑی لذّت ہے یہ لوگ بڑی خوشی سے کھائیں پئیں اور عیش کریں۔ ہمیں کوئی بھی حق نہیں کہ اُنھیں ایسا کرنے سے بازرکھیں۔ منع کریں۔ بعضوں کو دھن دولت اور دُنیا کی دوسری چیزوں کے حاصل کرنے ہی سے خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ یہ لوگ جتنی دولت چاہیں کمائیں۔ اور جتنی چیزیں چاہیں یک جا کریں۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمیں یہ کہنے کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ ایسا نہ کریں۔ لیکن دوسری طرف اُن لوگوں کو بھی تو کوئی حق نہیں کہ اگر کسی کو رُوحانی خیالات ہی سے بدرجہ انتہائی حظ حاصل ہوتا ہے تو اُس سے بار بار یہ کہتے پھریں کہ وہ ایک فضول اور بے مصرف کام میں لگا ہوا ہے اگر یہ لوگ رُوحانیت کے آدرش کو نہیں سمجھ سکتے تو کم از کم اس شخص کو تو اپنے حال پر چھوڑ سکتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اس کش مکش ہی سے اِنسان کی ارتقا ہوتی ہے اس روحانی جدوجہد سے ہی اِنسان محض حیوانوں کی سطح سے اونچا اُٹھ جاتا ہے صرف حواس سے تو حیوان ہمارے بمقابلہ کہیں زیادہ لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہماری سوسائٹی کا نظام جس قدر اسفل اور ادنےٰ ہوگا قطع نظر اس سے کہ اس کی ارتقا کا مرتبہ کس حد تک کم ہے۔ اتنا ہی دار و مدار ہماری راحت اور خوشی کا ہمارے حواس پر ہوگا مثلاً کھانے پینے کا شوق عام آدمیوں کو ہوتا ہے لیکن پھر بھی بہت کم لوگ کھانے پینے کے معاملے میں اُس جوش اور شوق کا اظہار کرتے ہیں جس کا مظاہرہ کتّے یا بھیڑیئے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتّے یا بھیڑیئے کی تمام مسرّت حواس ہی پر مبنی ہے لیکن انسان کی مسرت کے ماخذ حواس کے علاوہ اس کے دل و دماغ بھی ہیں۔ ہر قوم میں ادنیٰ طبقے کے لوگوں کی خوشیاں لذاتِ حواس ہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن جو لوگ شائستہ اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ان کو غور و فکر۔ فلسفہ اور فن وحکمت سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ جیوں جیوں اِنسان کے احساس و شعور کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس میں زندگی کی لطیف چیزوں سے لُطف اُٹھانے کی اہلیت بڑھتی جاتی

ہے۔ اپنی لامحدود ذات کے خیال سے۔ رُوح کے تصور سے زیادہ وسیع موضوع اور کون ہو سکتا ہے اسی لئے نشاطِ رُوح کی کوئی حد نہیں۔ اِس کا کوئی پایاں کار نہیں۔ رُوحانیت کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے۔ رُوحانی مسرّت اور سرور سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں۔ اِسی لئے اگر افادیت پسندوں کے اِس نقطۂ نظر کو بھی مان لیا جائے کہ انسانی زندگی کا مدّعا حصولِ راحت ہے تو بھی انسان کو مذہبی خیالات کی نشو و نما کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بلند ترین مسرّت اور راحت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مذہب کا مطالعہ ہمارے لئے اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی سی رہ جاتی ہے۔ علاوہ بریں روحانیت بذاتِ خود ایک زبردست طاقت ہے۔ اِس کا اندازہ اس کے اثرات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ زبردست ترین قوت ہے جس سے قلبِ انسانی میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور تعمیری کام کرنے کی طاقت ظہور میں آتی ہے۔ اِس لحاظ سے آج تک دُنیا میں مذہب اور روحانیت سے بڑھ کر کوئی آدرش نہیں ہوا مذہبی جذبے سے جو طاقت پیدا ہوتی آئی ہے۔ اِس سے زیادہ طاقت کسی اور خیال سے پیدا نہیں ہوئی۔ اور آج بھی مذہب کی یہ حالت بدستور قائم ہے۔ اس رُوحانی آدرش کی طاقتیں زائل نہیں ہو سکتیں۔ مجھے اِس سے انکار نہیں کہ انسان محض افادیت پسندانہ نقطۂ خیال سے بھی نیک اور با اخلاق بن سکتا ہے۔ اس دُنیا میں متعدد ایسے بڑے آدمی ہوئے ہیں جن کی نیک خصلت۔ جن کے بلند اخلاق اور جن کی پاک سیرت کی تشکیل محض افادیت کے خیالات سے ہوئی۔ لیکن جن لوگوں نے دُنیا کو ہلا دیا ہے جنہوں نے عالمِ کائنات میں دُنیا میں اپنی مقناطیسی قوت کا خزانہ بھر دیا ہے جن کی رُوحِ رواں قوموں اور نسلوں میں کارفرما ہے جن کا حوصلہ اور جوش سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں کے دِلوں کو اُبھارنے کا موجب ہوتا ہے۔ جن کی مشعلِ زندگی سے دوسروں میں رُوحانی شعلے روشن ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی عظمت اور طاقت کی اصل ہمیشہ روحانی قوت ہوتی ہے اور اِس قوتِ محرکہ کا سرچشمہ مذہب ہے۔ بنی نوع اِنسان کو اس کی اصلی فطرت کا احساس دِلاتا ہے، مذہب ہی کے ذریعہ اِنسان "ذات" کو سمجھتا ہے اور اپنی اس لامحدود اور لا انتہا قوّت کو بیدار کرتا ہے، جو خود اس کی سرشت میں داخل ہے۔ مذہب ہی وہ معمار ہے جو اِنسان کے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور اسے نیکی خوبی اور عظمت کے زیوروں سے مُزّین کرتا ہے۔ مذہب ہی امن و آشتی کی تعلیم دے کر انسان کو دوسروں کے لئے باعثِ تسکین و مسرت بناتا ہے۔ اِسی سے اطمینانِ قلب کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس زبردست قوتِ مُحرّکہ کا مطالعہ کیا جائے، جس سے بنی نوع انسان کی یہ زندگی رواں دواں ہے۔ یاد رکھیئے کہ آج مذہب کے مطالعہ کے لئے پہلے وقتوں کی نسبت زیادہ

وسعتِ نظر کی ضرورت ہے۔ سچّے مذہب میں تنگ محدود اور تفرقہ پرداز خیالات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ مذہب میں فرقہ وارانہ۔ قبائلی یا قومی خیالات کو ذرا بھی دخل نہیں۔ یہ جو چھوٹے چھوٹے قبیلے یا خاص قومیں اپنا اپنا مذہب اور اپنا اپنا خدا لئے پھرتی ہیں۔ یہ جو ہر قبیلے یا قوم کا دعوےٰ ہے کہ بس اُسی کا خدا "سچّا" ہے۔ دوسرے سب مذہبوں کے خدا جھوٹے ہیں۔ بجائے خود ایک بے بنیاد وہم ہے۔ مانا کہ پچھلے زمانے کے لوگ اس وہم میں مبتلا ہے لیکن آج اس قسم کے تمام خیالات کو ترک کر دینے ہی میں ہماری بھلائی ہے۔ اِنسانی دِماغ میں جتنی جتنی کشادگی آتی جاتی ہے اُس کا روحانی دائرہ بھی اُتنا ہی زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور اَب تو وہ زمانہ آچکا ہے کہ انسان بات پیچھے کرتا ہے اور وہ پھیل پہلے جاتی ہے۔ ہمارے خیالات معرضِ تحریر میں آتے ہی چار اطراف عالم میں نشر ہو جاتے ہیں۔ محض طبعی وسائل کی مدد سے ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہو گئے ہیں۔ اِسی لئے آجکل کی اِس دُنیا کے مذہب کو بھی وسیع اور عالم گیر ہونا پڑے گا۔

زمانہ مستقبل کے مذہبی آدرشوں کو یہاں تک وسیع اور کشادہ دامن ہونا پڑے گا کہ ان میں موجودہ خوبیاں اور صداقتیں بھی سما جائیں اور مزید ترقی کی لامحدود گنجائش بھی رہے۔ زمانۂ گزشتہ کی ہر اچھّی چیز کا تحفظ لازمی ہے۔ لیکن موجودہ ذخیرے میں اضافے کے لئے مذہب کے دروازے ہر وقت کھلے رہنا چاہئے۔ تنگ نظری مذہب کی دشمن ہے۔ کشادہ دلی اور ہمہ گیری سچے مذہب کی نشانی ہے۔ ایسے مذہب کو اپنے اندر دوسروں کو جگہ دینے اور انھیں قبول کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیے۔ مختلف مذہبوں نے خُدا کا ذکر مختلف پیرایوں سے کیا ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ نفرت سے پیش آنا اور اپنے مذہب کے مقابلے میں دوسرے مذاہب کو حقارت کی نظر سے دیکھنا کم ظرفی کا ثبوت ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں ایسے صحیح الفطرت ذہین اور پُر دماغ اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کا خدا کی ہستی پر ایمان اِن معنوں میں نہیں تھا جو ہم نے سمجھ رکھے ہیں۔ لیکن جو حقیقی معنوں میں رُوحانیت کے بلند مقام پر پہونچ چکے تھے دراصل وہ خدا کے وجود کی حقیقت کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتے تھے جو شخصی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مذہب کی تعریف بھی اتنی جامع ہونا چاہیئے کہ اس میں شخصی اور غیر شخصی خُدا کا کردار۔ لامحدودیت کا خیال۔ اخلاقی قانون کا نظریہ۔ آدرش انسان کا تصور یہ تمام باتیں سما جائیں اور جب مذاہب میں اتنی وسعت پیدا ہو جائے گی تو ان میں لوگوں کو نیکی کی راہ پر لانے کی جو طاقت اور صلاحیت ہوگی اس میں سوگنا اضافہ ہو جائے گا۔ مذہب کی طاقت ایک بڑی زبردست طاقت ہے مجھے اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اہلِ مذہب اُن کی تنگ نظری[۵]

[۵] اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

اور محدود خیالی کے سبب سے دُنیا کو فائدے کے بمقابلہ نقصان زیادہ پہونچا ہے۔ لیکن اس میں مذہبی فلسفے کا زیادہ قصور نہیں اگر ہمیں کسی سے شکایت ہے تو اپنی کم ظرفی اور تنگ دلی سے بہر حال ہمیں مذہب کے دَامن کو کشادہ کرنا ہے افسوس کا مقام ہے کہ آجکل بھی ایسے فرقے اور ایسے گروہ موجود ہیں جو بیشتر ہم خیال ہونے کے باوجود باہم دیگر برسرپیکار رہتے ہیں کیونکہ ایک فرقے یا گروہ کی طرف سے وہ خیالات بجنسہ اس صورت میں پیش نہیں کیے جاتے ہیں جس میں دوسرے فرقے یا گروہ انھیں پیش کرتے ہیں فی زمانہ اِن باتوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے مذہبوں کو اپنا دائرہ وسیع کرنا پڑے گا۔ مذہبی تصوّرات کو عالم گیر۔ وسیع المشرب اور لا محدود ہونا پڑے گا اور صرف ایسی ہی صورتِ حالات کے پیدا ہونے پر مذہب اپنا کام مکمل طور پر انجام دے سکے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زمانۂ حال میں مذہب کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔ روحانی تصوّرات آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں اور مذاہب دم توڑ رہے ہیں۔ مجھے اس سے ہرگز اتفاق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی طاقت کو ابھی پورے زور سے نمودار ہونا ہے۔ ابھی تو اس کی ارتقائی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی ہے اور اس طاقت کا اظہار شروع ہی ہوا ہے۔ مذہب کی طاقت وسیع اور منزّہ ہو کر انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سرائت کرے گی۔ جب تک مذہب کی باگ ڈور چند منتخب اشخاص یا راہبوں کی جماعت کے ہاتھوں میں رہی اس کا وجود مندروں۔ مسجدوں اور گرجاؤں میں مقید اور کتابوں۔ نظریوں رسموں اور رواجوں میں محدود رہا لیکن جب مذہب کے حقیقی رُوحانی اور عالم گیر تصوّرات ہماری سمجھ میں آجائیں گے تو مذہب میں دوبارہ جان پڑ جائے گی اور یہ ہماری فطرت میں داخل ہو جائے گا۔ ہماری ہستی کا جزو بن جائے گا۔ ہماری زندگی کے ہر لمحے میں سما جائے گا ہمارے سماج کے ہر مسام میں سرائت کر جائے گا۔ جو فوائد آج تک ہم اس سے حاصل نہیں کر سکے وہ سب کے سب ہمارے حصے میں آجائیں گے اور اس طرح مذہب واقعی صحیح معنوں میں دنیا کی بھلائی اور بہبودی کی ایک لا محدود طاقت بن جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے تفرقات

The Personal idea of God or the Impersonal, the Infinite, Moral Law or the Ideal Man, all these ideas have to coine under the definition of religion.

اور جھگڑے مٹا کر ان میں باہمی ہمدردی پیدا کی جائے۔ یہ ہمدردی اسی حالت میں پیدا ہو سکتی ہے جب تمام مذاہب کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ اُن میں سے ایک کا جو فائدہ ہے وہی دوسرے کا بھی فائدہ ہے اور اسی طرح ایک کا نقصان دوسرے کا نقصان ہے (ایک کی زندگی اور موت دوسرے کی بھی زندگی اور موت ہے)، اگر ایک مذہب والے دوسرے مذہب کو غلط اور جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ خود اپنے مذہب کو غلط اور جھوٹا بتاتے ہیں کیونکہ یہ سب مذہب خدا ہی کا راستہ تو دکھانے کا دعوےٰ کرتے ہیں اگر ایک سچا ہے تو پھر سب سچے ہیں۔ اگر ایک جھوٹا ہے تو سب جھوٹے ہیں اگر ہر مذہب والے یہ بات ذہن نشین کرلیں اور ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر کرنے لگیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے درمیان باہمی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ یہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا اور ضرور ہوگا محض دکھاوے کی باتوں سے دل نہیں ملتے۔ دوسرے مذاہب کو کمتر سمجھ کر ان پر رواداری کے طور پر عنایت کی نظر ڈالنا اور اپنی ذرّہ نوازی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر ان کی کم و بیش تعریف کرنا ہرگز ہمدردی نہیں۔ ایسا کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ناانصافی سے کام لینا ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کے سلوک کا رواج عام ہو رہا ہے ہمیں اِس طرزِ عمل سے بچنا ہے۔ اِس باہمی ہمدردی کی ضرورت نہ صرف مختلف مذاہب اور مذہبی فرقوں کو ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ یہ باہمی ہمدردی مذہب اور سائنس کے لئے لازمی ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں۔ مختلف ہونے پر بھی تمام مذاہب آخر ایک ہی چیز یعنی رُوحانیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن سائنس اور مذہب کے تو موضوع ہی مختلف ہیں اس لئے ان دونوں کے درمیان بظاہر تضاد لازمی نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل دونوں ایک ہی علم کی ایک ہی آگہی کی شاخیں ہیں۔ مذہب کے مطالعہ کا تعلق دماغی کیفیات سے ہے۔ اور سائنس کا میدانِ فکر زمین سے آسمان تک تمام مادّی چیزوں پر حاوی ہے۔ بدقسمتی سے مذہب والے سمجھتے ہیں کہ دماغی کیفیّات کے مطالعہ کا حق صرف انھیں کو حاصل ہے اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مذہب کا دار و مدار بے بنیاد توہّمات پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم ایک ہے۔ مذہب اور سائنس صرف اس کی مادّی اور غیر مادی صورتیں ہیں۔ علم بھی بذاتِ خود انکشافِ ذات کی ایک صورت ہے۔ ہر قِسم کا عِلم روحانیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اِس لئے سائنس بھی رُوحانی آگہی کا ایک جُزو ہے سائنس اور مذہب دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کی ضرورت نہیں بلکہ انسانی ارتقا اور رُوحانی ترقی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب ان دونوں کے درمیان بھی مکمل ہمدردی اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اس

ہم آہنگی اور ہمدردی کی خاطر مذہب اور سائنس دونوں کے اربابِ فکر کے لئے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا لازمی ہوگا اور اسے قبول کرنا ہوگا محض رسمی طور پر اعتراف کرنا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کو پوری طرح اپنانا ہوگا۔ اِس کے لئے دونوں کو قربانی کرنا ہوگی اپنے کئی مخصوص اور محبوب خیالات اور تعصبات کو ترک کرنا ہوگا اور میں جانتا ہوں کہ ترک اور قربانی دُکھ درد برداشت کئے بغیر ممکن نہیں لیکن میں پُورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قربانی کے دینے سے سائنس اور مذہب دونوں کی شان دوبالا ہو جائے گی اور دونوں حقیقت کے نزدیک پہونچ جائیں گے۔ آخر کار مذہبی علم اور رُوحانی آگہی جو مکان وزمان کی قیود سے باہر ہے اور سائنس کا علم جو وقت اور مقام کی حدود میں گھِرا ہوا ہے۔ دونوں یک جان ہو کر اُس "واحد حقیقت" سے واصل ہو جائیں گے جو وجودِ مطلق ہے جو لامحدود ہے اور جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ مثال جو لازوال ولاثانی ہے۔ جو مادّی اور غیر مادی دونوں قسم کے علوم سے بَری ہے اور جس تک حواس اور دماغ کی رسائی ناممکن ہے۔

ایک عالمگیر مذہب
کا
آدرش یا نصب العین

جہاں دیکھو۔ زندگی کے ہر شعبے میں دو زبردست متضاد[1] طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک طاقت سے عمل[2] کا ظہور ہوتا ہے اور دوسری سے ردِ عمل[2] کا۔ ان طاقتوں کے عمل کا شعور نہ صرف حواس کی حدود کے اندر ہوتا ہے بلکہ ہمارے دماغی تصورات اور تخیلات کی عظیم وسعتوں میں بھی یہ دونوں متضاد طاقتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ان کے متواتر تضاد سے ایک طرف تو ہمارے گرد و نواح کے مختلف مناظر[3] پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان سے ہماری دماغی کیفیات[4] کا اظہار ہوتا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہ مسلسل کھیل خارجی اور داخلی دونوں دنیاؤں میں کھیلا جا رہا ہے۔ خارجی دُنیا میں ان دونوں مثبت اور منفی طاقتوں کا عمل کشِش اور پسپائی (انجذاب[5] اور استرداد) کی شکل میں نمودار ہوتا ہے کشِش کی طاقت تعمیری ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیت ہے مرکز کی طرف رجوع کرنا اس کے عمل سے یکجائی[6] اور اجتماع کی صُورت پیدا ہوتی ہے پسپائی کی طاقت تخریبی ہوتی ہے اس کی خاصیت ہے مرکز سے گریز کرنا[7]۔ دُور ہٹنا اس کے عمل سے انتشار ظہورُ پذیر ہوتا ہے۔ یہی طاقتیں جب داخلی دُنیا میں رُونما ہوتی ہیں تو ان سے محبّت اور نفرت اور نیکی اور بدی

---

۱ Opposite forces. ۲ Action and reaction.

۳ اور ۴ Physical and mental Phenomenon.

۵ Attraction and repulsion. ۶ Centripetal. ۷ Centrifugal.

کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ قدرت کا یہ قانون ہی ایسا ہے کہ کچھ چیزیں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور کچھ چیزوں سے خود ہم دُور رہنا چاہتے ہیں اسی طرح کچھ چیزیں ہماری طرف خود بخود چلی آتی ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے نزدیک نہیں پھٹکنا چاہتیں۔ ہماری زندگی میں متعدد بار یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہم بغیر کسی وجہ کے ہی خود بخود بعض اشخاص کی طرف مائل و متوجہ ہوجاتے ہیں اور اسی طرح بعض اور اشخاص سے ہم دُور رہنا چاہتے ہیں یہ تو ایک مُسلّمہ بات ہے کہ محبت کسی سے ہوجاتی ہے۔ کی نہیں جاتی اور دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ کسی کے ساتھ نفرت از خود ہوجاتی ہے۔ ارادتاً نہیں کی جاتی۔ کشش اور پسپائی کا یہ عمل سب پر حاوی ہوتا ہے ہمارا میدانِ عمل جتنا بلند ہوتا ہے اتنے ہی زیادہ قوی اور معرکہ آرا اثرات ان متضاد اور مختلف طاقتوں کے رُونما ہوتے ہیں۔ مذہب کا مقام انسانی خیالات اور انسانی زندگی کی بلند ترین سطح پر ہے اسی لئے ہم کو قبول و رد کی یہ دونوں طاقتیں اس بلند سطح پر بہت زیادہ نمایاں طور پر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مذہب نے جہاں انسان کی گہری سے گہری محبت کو جنم دیا ہے وہاں نفرت کا شیطانی جذبہ بھی مذہب ہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جہاں مذہب دُنیا کے لئے امن اور شانتی کا پیغام لایا وہاں تمام تلخ ترین دُشنام طرازیوں اور جنگ و فساد کے رجحانات بھی مذہب ہی کی پیداوار بنے مذہب ہی نے دُنیا کے سامنے بلند ترین معیار زندگی رکھا اور انسانوں کو کارِ خیر کی تعلیم دی لیکن دوسری طرف اسی مذہب سے شرانگیز سرگرمیاں بھی وجُود میں آئیں۔ یہ مذہب کی تعلیم کا ہی نتیجہ ہے کہ نہ صرف غریبوں اور ناداروں کے لئے ہزارہا شفاخانے۔ آشرم اور خیرات گھر قائم ہو گئے بلکہ جانوروں کی بھی دیکھ بھال اور حفاظت کے سامان بھی مہیّا کئے گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ دُنیا میں جتنی خوں ریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے شاید ہی کسی اور وجہ سے ہوئی ہو۔ مذہب ہی نے ہمیں رحم اور ہمدردی کے جذبات بخش کر نرم دل بنایا اور مذہب ہی کے نام پر ہر طرح کے ظلم اور بے رحمانہ افعال کا ارتکاب ہوا ہے۔ مذہب کے ان دونوں متضاد پہلوؤں کا مشاہدہ ماضی میں بھی کیا گیا ہے اور غالباً آئندہ بھی یہی صورت حال جاری رہے گی لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظلم اور بے رحمی کا یہ سلسلہ کبھی بند نہیں ہو گا۔ اگر کچھ اُمید کی جھلک نظر آتی ہے تو اس بات سے کہ مختلف مذہبوں اور فرقوں کے اسی شور و شغب اسی دار و گیر اسی کشمکش اور نفرت و حسد کے اس عالم میں وقتاً فوقتاً ایسی پُراثر آوازیں بھی بلند ہوتی رہی ہیں جن کے سامنے یہ سارا شور و شغب ماند پڑ گیا۔ یہ آوازیں ایک قطب سے دوسرے قطب تک گونج اٹھیں جن میں امن اور اتحاد کا پیغام دیا گیا تھا۔ کیا امن و اتحاد کی یہ برکت نیز ہم سائیگی اور ہم آہنگی کی یہ دولت کبھی ہمارے نصیب میں آئے گی کیا یہ ممکن ہے کہ مذہبی زندگی کی اس کشمکش میں اتحاد و آشتی کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری ہوجائے اس صدی کے اواخر میں اتحاد و آشتی کا سوال دُنیا میں بہت زور شور سے اُٹھاتے

سوسائٹی میں اسکے متعلق طرح طرح کی تجاویز پیش کی جارہی ہیں اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ زندگی کی کشمکش میں یہ جو ہیجان کا عالم طاری ہے اس کو کم کرنا اور انسانوں میں جو زبردست اعصابی تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس کو ڈھیلا کرنا قریب قریب ناممکن ہے اس کام کے مشکل ہونے کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں تو مادی سطح پر بھی امن و آشتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اختلاف کا دور کرنا خارجی زندگی میں بھی کافی مشکل ہے اور داخلی دُنیا یعنی انسان کی باطنی فطرت میں تو شانتی اور چین کا پیدا کرنا اس سے بھی کہیں زیادہ محال ہے مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار نہیں۔ میں تو آپ سے بس اتنا ہی کہوں گا کہ اگر ہم واقعی امن و آشتی چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اپنے آپ کو اس جال سے آزاد کرنا ہو گا جس میں ہم سب جکڑے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ تو اپنے بچپن کے زمانے سے محبت۔ امن ۔خیرات ۔مساوات اور عالم گیر اخوت ایسی بیش بہا چیزوں کا ذکر سُنتے چلے آئے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ سب صداقتیں ہمارے لئے کچھ بے معنی سے الفاظ بن کر رہ گئی ہیں اور ہم ان الفاظ کو دن رات طوطے کی طرح رٹتے رہتے ہیں ہمارے لئے ایسا کرنا ایک فطری امر ہو گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روش سے گریز کرنا اب ہمارے بس کی بات نہیں رہی کتنی عظیم ہستیاں تھیں اُن بزرگوں کی جن کے دلوں میں اس قسم کے عظیم اور گراں قدر خیالات پیدا ہوئے جنھوں نے ان صداقتوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ گھڑے۔ دراصل وہی لوگ ان الفاظ کے حقیقی معنی و مفہوم سے واقف تھے۔ ان کے زمانے میں اکثر اشخاص نے انکا صحیح مفہوم قرار واقعی طور پر سمجھا بھی۔ لیکن جیوں جیوں وقت گزرتا گیا ان الفاظ کے معنی پھیکے پڑنے لگے۔ ان میں ضعف آ گیا۔ آہستہ آہستہ جاہل قسم کے لوگوں نے ان الفاظ کو ہتھیا لیا اور ان سے کھیلنا شروع کر دیا اُنھوں نے مذہب کو ایک لفظی شعبدہ بازی بنالیا۔ مذہب چیز تھی عمل کرنے کی ان لوگوں نے اسے محض ایک دکھاوے کی چیز بنا کر رکھ دیا۔ اس پر اپنی اپنی ملکیت کا دعوے کرنے لگے مذہب ایک انفرادی طرز عمل ہونے کے بجائے ایک سماجی اور قومی اثاثہ بن گیا اور لوگ "باپ دادا کے مذہب" "قومی مذہب" اور "ملکی مذہب" کی باتیں کرنے لگے اس طرح مذہب قومیت اور حب الوطنی کا ایک جزو بن کر رہ گیا چونکہ حب الوطنی ہمیشہ عصبیت کا پہلو لئے ہوتی ہے اسی لئے مختلف مذاہب کے درمیان آشتی اور اتحاد پیدا کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ اگرچہ ان حالات میں اس مشکل کا حل دستیاب ہونا آسان نہیں پھر بھی آج ہم اتحاد مذاہب کے اس مسئلے پر کچھ نہ کچھ غور ضرور کریں گے۔

ہر بڑے اور منظم مذہب کے تین اجزا ہوتے ہیں اس کا پہلا حصہ فلسفے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں اس

مذہب کے تمام خد و خال کی عکاسی کی جاتی ہے اسکے بنیادی اصُول پیش کئے جاتے ہیں اسکا مقصد اور اس مقصد کی تکمیل کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ دوسرا حصّہ ہے دیو مالا یا علم الاصنام کا جس میں فلسفے کو ٹھوس اور مادّی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں انسانوں یا ما فوق الفطرت ہستیوں کے متعلق حکایات و روایات وغیرہ شامل ہوتی ہیں اس میں فلسفے کا جوہر انسانوں اور ما فوق الطبع ہستیوں کی کم و بیش فرضی زندگیوں کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے تیسرا حصّہ ہوتا ہے شریعت یا رسم و رواج یعنی کرم کانڈ کا اس کی شکل اور بھی زیادہ مجسّم اور مادّی ہوتی ہے اور یہ مشتمل ہوتا ہے چند دستوروں اور رسموں پر انھیں میں ارکان عبادت یا پوجا پاٹ کی رسمیں بھی شامل ہوتی ہیں مثلاً خاص قسم کے خارجی ماحول میں جسم کو خاص خاص طریقوں سے طرح طرح کی ریاضتوں کی تربیت دینا یا پھولوں اور خوشبویات سے پوجا کا اہتمام کرنا۔ سارے مذہبوں میں اس قسم کی ایسی متعدد رسمیں ہیں جنھیں حواس بخوشی اور بآسانی قبول کرتے ہیں۔ یہ تینوں حصّے تمام مروّجہ مذاہب میں پائے جاتے ہیں بعضوں میں کسی ایک حصّے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بعضوں میں کسی دوسرے حصّے پر جہاں تک پہلے حصّے یعنی فلسفے کا تعلق ہے یہ بات قابلِ غور ہے کیا کوئی فلسفہ ایسا ہے جسے عالمگیر کہا جا سکتا ہو۔ ابھی تک دنیا نے کسی فلسفے کو عالمگیر نہیں تسلیم کیا۔ ہر مذہب والے اپنے اپنے اصول پیش کرتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ بس انھیں کے اصُول درست ہیں۔ وہ محض اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ باقی سب اصولوں کو غلط قرار دیں وہ تو کہتے ہیں کہ اُن کے مذہب کے علاوہ دوسرے مذہبوں کا طریقۂ کار غلط ہے اور اسی لئے وہ آخر کار کسی نرک یا جہنم میں جائیں گے بعض لوگ تو دوسروں سے اپنے عقائد کو منوانے کے لئے تلوار سے کام لینے میں بھی دریغ نہیں کرتے اور سچے دل سے یقین کرتے ہیں کہ اسی میں ان لوگوں کا بھلا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی کو جان سے مار ڈالنا یا زندہ جلا دینا ان پر ظلم کرنے کے مترادف نہیں بلکہ ایسا کرنا ان کی رُوحانی بہبودی کے لئے لازمی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے لوگ شیطان سیرت ہیں کیونکہ وہ ظلم بھی کرتے ہیں تو مذہب کے نام پر۔ دوسروں کی روحانی بہبودی کے خیال سے لیکن میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ لوگ اس دماغی بیماری میں مبتلا ہیں جسے ہم تعصب یا مذہبی دیوانگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں درحقیقت اس مرض سے بڑھ کر اور کوئی خطرناک مرض دُنیا میں ہے ہی نہیں۔ اسی مرض کے نتیجے کے طور پر فطرت انسانی کی تمام شیطنت اور خباثت اُبھر آتی ہے۔ غیظ و غضب کے شعلے مشتعل ہو جاتے ہیں اعصاب میں ایک نہایت زبردست تناؤ پیدا ہو جاتا ہے اور انسان انسان نہیں رہتے۔ درندے بن جاتے ہیں۔

اب مذہب کے دوسرے جز یعنی دیو مالا یا علم الاصنام[1] کو لیجئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس حصّے سے متعلق ان مذاہب میں کوئی یکسانیت یا کسی قسم کا اتحاد پایا جاتا ہے کیا کوئی ایسا عالمگیر علم الاصنام ہے جسے ب

[1] Mythology.

مذاہب تسلیم کرتے ہوں؟ اس سوال کا جواب بھی قطعاً نفی میں ملتا ہے کیونکہ ہر مذہب کی اپنی اپنی جداگانہ دیو مالا ہوتی ہے۔ ہر مذہب یہی کہتا ہے کہ "میری کتابیں میری حکایات محض فرضی افسانے نہیں حقیقیں ہیں"۔ اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے میں چند مثالیں پیش کروں گا ان کے بیان کرنے سے میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ کسی مذہب پر نکتہ چینی کی جائے از راہ کرم آپ اس سلسلے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں اور میری باتوں کو غلط نہ سمجھ بیٹھیں۔

ہاں تو عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے فاختہ کی شکل اختیار کی اور زمین پر نزول فرمایا۔ عیسائی حضرات اس کو ایک تاریخی حقیقت قرار دیتے ہیں محض مثالی افسانہ نہیں سمجھتے۔ ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ پرماتما گائے کے روپ میں جلوہ گر ہوا لیکن عیسائی ہندوؤں کے اس اعتقاد کو تاریخی حقیقت ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ تو اس کو محض ایک وہم یا ایک روائتی قصہ قرار دیں گے اسی طرح یہودیوں میں ایک بکس یا صندوق پر فرشتوں کی تصویر یا بُت بنا کر اور اسے اپنی متبرک[۵۱] و مقدس پرستش گاہ میں جگہ دے کر اسی کی عبادت یا پوجا کو مناسب سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ نشان جہووا[۵۲] (خدا) کی نظر میں مُقدس ہوتا ہے لیکن اگر پرستش گاہ کا مجسمہ کسی خوبصورت مرد یا عورت کی صورت میں بنا دیا جائے تو یہی یہودی حضرات اس کو ایک ہولناک بُت قرار دے کر اُسے توڑ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے حال علم الاصنام کی یکسانیت کا۔ اگر کوئی آدمی کھڑا ہو کر یہ کہنے لگے کہ "میرے پیغمبر نے فلاں فلاں حیرت انگیز معجزے دکھائے" تو دوسرے حضرات کہیں گے کہ یہ محض "وہم ہے"۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرمائیں گے کہ خود ان کے پیغمبر نے اِن سے بھی زیادہ محیر العقول کارنامے نمایاں کئے ہیں اور یہ لوگ اپنے ان پیغمبروں کے کارناموں کو تاریخی واقعہ قرار دیں گے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس قسم کے اشخاص تاریخ اور علم الاصنام کے درمیانی فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ اپنے مذاہب کے متعلق جو چاہے کہیں لیکن اس قسم کی تمام حکائتیں خواہ ان کا کسی مذہب سے بھی تعلق کیوں نہ ہو محض مثالی افسانے ہیں جن میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی تاریخی واقعات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

جب مذہبی فلسفے اور مائتھالوجی (علم الاصنام) میں اتفاق اور ہمرنگی کی کوئی صورت نہیں تو مذہب کے تیسرے جزو یعنی رسمیات (کرم کانڈ) میں تو اس کی بالکل ہی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک فرقے میں ایک قسم کی رسمیات رائج ہوتی ہیں تو دوسروں میں دوسری قسم کی۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس کی اپنی رسمیات تو مقدس ہیں مگر دوسرے فرقے کی رسمیات محض بے معنی توہمات کا درجہ رکھتی ہیں۔

---

۵۱ Holy of Holies.　　۵۲ Jehovah.

اگر ایک خاص فرقہ ایک خاص قسم کی علامت[1] یا نشان کو اپنا معبود بتاتا ہے تو دوسرے فرقے کو اس سے کراہت ہوتی ہے وہ اس کو ہولناک سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر "لنگ" کے مروجہ نشان کو لے لیجئے یہ نشان یقینی طور پر ایک جنسیاتی نشان ہے لیکن بالعموم اس کا جنسیاتی پہلو تو مٹ چکا ہے اور لوگوں کو اس کے اس پہلو کا خیال تک نہیں آتا اب تو اُسے "خالق کائنات" کا ایک نشان ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ جن قوموں میں یہ نشان رائج ہے وہ اس کو کبھی بھول کر بھی عضو تناسل نہیں سمجھتیں وہ محض ایک نشان ہے اور بس۔ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں لیکن کوئی دوسری قوم یا کسی دوسرے مذہب کا کوئی فرد اگر اس نشان کو دیکھتا ہے تو اس کو اس میں عضو تناسل کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور وہ اس کی مذمت پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن اپنے مذہب کی رسوم کے تحت خود اس شخص کی ذات سے ایسے فعل صادر ہوتے ہیں جو لنگ کے پجاریوں کی نظر میں شرمناک اور قابلِ مذمت ہوتے ہیں مثالاً میں دو چیزوں کا ذکر آپ سے کرتا ہوں ایک تو یہی لِنگ پوجا ہے جو عیسائیوں کی نظر میں نہایت شرمناک رسم ہے اور دوسری عیسائیوں کی رسم اصطباغ[2] ہے اس میں خود ان کے بانیٔ مذہب کو ذبح کرکے ان کے پیرو اس کا گوشت کھاتے اور اُس کا خون پیتے ہیں تاکہ اس رسم کے ادا کرنے سے اس عظیم الشان انسان کی خوبیاں اُن کی ذات میں آجائیں۔ غیر عیسائی حضرات پوچھ سکتے ہیں کہ اگر یہ مردم خوری نہیں تو پھر اور کیا چیز ہے یہی کام تو وحشی قومیں بھی کرتی ہیں اگر وحشی قوموں میں کوئی شخص بہت بہادر ہوتا ہے تو یہ وحشی اسے ذبح کرکے اس کا دل کھا لیتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق اس سے ان میں مذبوحہ انسان کی جرأت اور دلیری کے محاسن پیدا ہو جاتے ہیں سرجان لبک ایسے سچے عیسائی بھگت نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ عیسائیوں کے اس عبادتی نشان کی ماہیت دراصل وہی وحشیانہ فعل ہے بہرحال عیسائی لوگ اس کی ماہیت کے متعلق یہ نظریہ تسلیم نہیں کرتے۔ رہا اس کا حقیقی مفہوم۔ اس کا تو انھیں خیال تک نہیں آتا۔ ان کی نظر میں تو یہ ایک مقدس رسم ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ مذہبی رسوم میں بھی کوئی ایسا عالمگیر نشان نہیں پایا جاتا جسے عام طور پر سب منظور اور تسلیم کرلیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذہبی فلسفہ۔ مائتھا لوجی اور رسم و رواج میں سے کوئی بھی ایک ہمہ رنگی پیدا نہیں ہوسکتی تو مذہب کی کوئی عالمگیر صورت کس طرح رونما ہوسکتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان تفرقات کے باوجود مذہب کی یہ صورت اب بھی موجود ہے پہلے بھی ہمیشہ موجود تھی اور آئندہ بھی موجود رہے گی دیکھنا یہ ہے کہ اس عالمگیر مذہب کی نوعیت کیا ہے؟

---

[1] Symbol.   [2] Sacrament.

ہم سب نے عالمگیر اخوّت کا ذکر تو بہت سُنا ہے اور ہمیں بہت سی ایسی جماعتوں کا علم بھی ہے جو خاص طور پر اس عالمگیریت کا پرچار کرتی ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی عملی صورت کیا ہے؟ اس سلسلے میں مجھے ایک پُرانی کہانی یاد آگئی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں شراب نوشی بہت بُری بات سمجھی جاتی ہے اگرچہ کچھ لوگ شراب پیتے بھی ہیں تو چھپ چُھپا کر۔ کہانی یوں ہے کہ دو بھائیوں نے ایک رات چھپ کر شراب پینے کی ٹھانی ان کا چچا سخت قسم کا انسان تھا اور ان دونوں بھائیوں کے پاس والے کمرے میں سو رہا تھا اِسی لئے دونوں نے شغل شروع کرنے کے قبل ایک دوسرے سے کہا "ہم کو بہت خاموشی سے کام لینا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ چچا جان جاگ پڑیں اور سارا مزہ کرکرا ہو جائے" اس کے بعد دور چلنے لگا۔

دونوں شراب پینے میں جُٹ گئے۔ اسی دوران میں ایک بھائی مستی کے عالم میں بول اٹھا دیکھو خاموشی سے کام لو ورنہ چچا جان جاگ پڑیں گے" دوسرا بھی ترنگ میں آگیا اور چلا کر کہنے لگا "چُپ رہو یہ شور کیوں مچا رکھا ہے چچا جان کی آنکھ کھل جائے گی۔ وہ جاگ پڑیں گے۔" بس پھر کیا تھا دونوں ہی زور زور سے چلانے لگے "خاموش۔ چچا جان جاگ پڑیں گے۔" یہ شور و غل سُن کر چچا جان کی آنکھ واقعی کھُل گئی اور وہ اُٹھ کر دونوں بھائیوں کے کمرے میں جا پہونچے۔ اور سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔ بجنسہٖ یہی حال ہم سب کا ہے ہم ان شرابیوں کی طرح "عالمگیر اخوت" کا شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ہم سب برابر ہیں" اس لئے آتے ہم سب اپنے آپ کو ایک جماعت میں منسلک کرلیں۔ اس طرح ہم عملی طور پر اپنی ایک الگ جماعت کھڑی کرلیتے ہیں اور یہ بھُول جاتے ہیں کہ جماعت بندی ہی تو مساوات اور اخوّت کی دُشمن ہے اس سے ساری مساوات ختم ہو کر رہ جاتی ہے مثلاً اسلام عالمگیر اخوّت کا سبق دیتا ہے لیکن عملی طور پر مُسلمانوں نے اس اخوّت کا دائرہ محدود کر رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص مُسلمان نہیں تو اس کو اس عالم گیر برادری کی صف میں جگہ نہیں ملتی بلکہ اسے کافر قرار دے دیا جاتا ہے اسکے لئے کوئی سزا بھی واجب سمجھی جاتی ہے اسی طرح عیسائیوں میں بھی عالمگیر اخوت کا بڑا چرچا ہے لیکن جو شخص عیسائی مت کا پیرو نہیں اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ کا مستحق سمجھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ہمیں مذاہب سے عالمگیر اخوّت کا تصوّر ضرور ملتا ہے لیکن عملی طور پر یہ جنس ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے عالمگیر اخوّت کا ذکر کرتا ہے تو آپ فوراً اس کی ہاں میں ہاں نہ ملایئے پوری احتیاط سے کام لے کر اس کی ہر بات کو پرکھئے کیونکہ عموماً اس قسم کی گفتگو کے پس پردہ نہایت شدید قسم کی خود غرضی کام کرتی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں کہاوت ہے کہ "جاڑے کے بادل گرجتے ہیں برستے نہیں اور برسات میں برستے زیادہ ہیں گرجتے کم ہیں جاڑے میں زمین سوکھ جاتی ہے برسات میں ساری دنیا جل تھل ہو جاتی ہے۔" اسی طرح خلق کے سچے خادم بہت باتیں نہیں

بناتے جن کے دِل میں انسانوں کی عالمگیر برادری کیلئے سچا درد ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے فرقے بنا کر اُسے محدود نہیں کرتے وہ عالمگیر اخوّت کے نام پر اپنی اہمیّت بڑھانے کے لئے کسی قسم کی جماعت بندی نہیں کرتے بلکہ انکے افعال ان کی حرکات وسکنات اور ان کی تمام زندگی سے واضح طور پر یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ان کے دل میں بنی نوع انسان کے لئے واقعی عالمگیر اخوّت کا احساس ہے ان کو سب سے محبّت اور سب کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے تمام کائنات ان کی محبت میں بسی ہوتی ہے ایسے لوگ بولتے کم ہیں لیکن وہ فعلاً اور عملاً اخوّت کی جیتی جاگتی تصویر بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دُنیا میں ہنگامہ خیز گفتگو بہت ہوتی ہے لیکن ہمیں توضرورت اس بات کی ہے کہ عمل میں خلوصِ دل زیادہ شامل ہو اور باتیں کم ہوں۔

تو کیا ہمارے مذاہب میں ہمہ گیری کی کوئی صُورت نہیں نکل سکتی؟ کیا تمام مذاہب ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہی رہیں گے؟ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب میں عالم گیر وسعت پیدا نہیں ہوسکتی لیکن ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ عالمی اخوّت اور کائناتی محبّت کے تصورات بے معنی نہیں ہیں کہیں نہ کہیں حقیقت موجود ضرور ہے ہمیں اسی نکتے کو سمجھنا اور اس کو عمل میں لانا ہے۔ پہلی بات جو ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مساوات کا جو عام مطلب سمجھا جاتا ہے وہ بہت حد تک درست نہیں کہنے کو تو ہم سب انسان ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہم سب ہر لحاظ سے برابر ہیں ہم میں سے ہر ایک کی دماغی اور جسمانی قوتیں اور خاصیتیں دوسروں سے مختلف ہیں ایک آدمی دوسرے آدمی سے زیادہ طاقتور اور مضبُوط ہوتا ہے ایک شخص کی دماغی قوّت دوسرے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اگر ہم سب برابر ہیں تو پھر یہ نابرابری کیسی؟ اگر ہم میں سے کسی کی شخصیت زیادہ پُرزور ہے اور کسی کی کمزور اگر کسی کا دماغ زیادہ اچھا ہے اور کسی کا کم۔ یا کسی کی جسمانی صحت اچھی ہے اور کسی کی بُری یہی نہیں بلکہ اگر ہم میں جنسی نسلی۔ انفرادی قومی اور جماعتی غرضنکہ متعدد قسم کے فرق موجود ہیں کوئی مرد ہے کوئی عورت کوئی کالا ہے کوئی گورا، کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا۔ تو ظاہر ہے کہ انسان انسان کے درمیان کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ہم بار بار شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ سب انسانوں میں یکساں طور پر ایک غیر مرئی انسانیت کی جھلک پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ ہم اس غیر مرئی انسانیت کو پُوری طرح سمجھ نہ سکیں یا اس کو عملی سانچے میں نہ ڈھال سکیں پھر بھی ہمارا دل یقیناً کہتا ہے کہ اس غیر مرئی کائناتی انسانیت کا واقعی کوئی وجود ہے ضرور۔ مساوات کا اصول ہمارے دل کو کچھ اسقدر مرغوب ہے کہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ یہ اصُول بے بنیاد ہے۔ تو کیا اس مساوات کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یہ محض خیال ہی خیال ہے؟

کیا کوئی ایسی شے ہے جو مرد اور عورت ۔ کالے اور گورے چپٹے اور تیکھے ۔ چھوٹے اور بڑے سب میں یکساں طور پر موجود ہے؟ اگر ان سب کا تعلق ایک ہی نوع انسان سے ہے تو پھر یہ واحد انسانیت کہاں ہے۔ اور کیونکر نظر آسکتی ہے؟ ذاتی طور پر اگر مجھے کسی چیز کے وجود میں یقین ہے تو وہ اسی انسانیت کا وجود ہے جو سب میں مشترک ہے۔ انسانی شعور کی خاصیت ہی یہ ہے کہ کسی چیز کا انفرادی ادراک اس کی بنیادی ہستی کے تصوّر کی نسبت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً انسانیت ہی کے تصوّر کی نسبت سے میں آپ کو مرد یا عورت کی شکل میں دیکھتا ہوں اگر میرے دماغ میں ایک بنیادی انسانیت کا تصوّر موجود نہ ہو تو مجھے کسی قسم کے فرق اور اختلاف کا شعور ہو ہی نہیں سکتا۔ کثرت کا شعور وحدت کے تصوّر اور احساس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہی کیفیت ہے عالمگیر مذہب کے بنیادی تصور کی جو دُنیا کے تمام مذاہب میں بشکلِ "خدا" جاری و ساری ہے یہ تصور ازلی اور ابدی ہے اس کے بغیر مذہب اور روحانیت کا ادراک ناممکن ہے بھگوان کرشن نے گیتا میں فرمایا ہے" میں ہی وہ تار ہوں جس میں یہ تمام موتی پروئے ہوئے ہیں" چھوٹا بڑا ہر مذہب موتیوں کی اس لڑی کا جزو ہے۔ طرح طرح کے یہ موتی بھگوان روپی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں وحدتِ خدا کے رشتے میں منسلک ہیں لیکن زیادہ تر لوگ اس حقیقت سے بے بہرہ ہیں وحدت در کثرت اس عالمِ کائنات[1] کا نظام ترکیبی ہے نوع انسانی کے بُنیادی تصوّر کی نسبت سے ہم سب برابر اور یکساں ہیں لیکن انفرادی طور پر ہم کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں طبقہ انسانی کے ایک جزو کی حیثیت سے تو میں اور آپ دونوں یکساں ہیں لیکن بحیثیت جناب فلاں و فلاں ہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں مرد کی حیثیت سے تو آپ کا وجود عورت سے مختلف ہے لیکن انسانی رشتے سے آپ میں اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں یکسانیت ہے بطور انسان تو آپ کی ہستی جانور کی ہستی سے جُدا ہے لیکن ایک جاندار کی حیثیت سے مرد عورت جانور اور پودے سب یکساں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جہاں تک ہستی[2] کے احساس کا تعلق ہے وہ احساس دُنیا کی ہر شے میں موجود ہے اِس لحاظ سے ہم سب ایک کائناتی ہستی کے حصّے دار ہیں ہم سب ایک رشتۂ وحدت میں منسلک ہیں اور یہ رشتۂ وحدت یہ کائناتی ہستی خدا ہی کے وجود کا تصوّر ہے۔ وہی عالمِ کائنات کی آخری وحدت[3] ہے۔

---

[1] Unity in Variety.

[2] Existence.

[3] Ultimate Unity.

خدا کی ذات کا جزو ہو کر اس میں شامل ہو کر ہم سب ایک ہیں لیکن عالمِ ظہور میں انفرادی اور جماعتی سارے اختلافات ہمیشہ قائم رہیں گے۔ ہماری داخلی وحدت جب خارجی دُنیا میں ظاہر ہوتی ہے تو اختلافات ضرور پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاف مٹ بھی نہیں سکتے۔ فطرت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہماری طاقت مختلف کاموں میں علیحدہ علیحدہ پہلوؤں سے نمایاں ہوتی رہے خارجی دُنیا کے اختلافات ہمیشہ قائم رہیں گے اسی لئے اگر عالمگیر مذہب کا تصوّر یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے اُصول اور عقائد پر تمام بنی نوع انسان یقین لے آئیں۔ سب ایک ہی مائتھالوجی (علم الاصنام۔ دیومالا) کو ماننے لگیں اور ایک ہی دستور یا شریعت کے پابند ہو جائیں اور سب کے رسم و رواج ایک ہی ہو جائیں تو یہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا دنیا میں کبھی کوئی ایسا وقت نہیں آسکتا جب سب کے چہرے مُہرے یکساں ہو جائیں اور اگر بفرض محال کبھی ایسا ہوا بھی تو دُنیا کی ہستی مٹ جائے گی کیونکہ یہ تفریق اور یہ اختلاف ہی تو زندگی کا سنگ بُنیاد ہے یہ تفریق ہی تو ہماری تخلیق کا حقیقی راز ہے۔ وحدت کثرت کا روپ اختیار کرلیتی ہے تو یہ عالمِ کائنات ظہور میں آتا ہے۔ غیر مرئی حالت سے مجسّم صُورت میں آنا تفریق و اختلاف ہی کا تو نتیجہ ہوتا ہے اگر دُنیا میں مُکمّل توازن قائم ہو جائے تو پھر دُنیا کی یہ صُورت ہی نہ رہے گی یا یوں کہہ لیجئے کہ دُنیا تباہ ہو جائے گی۔ حرارت کا یہ طبعی اصُول ہے کہ ہر دو طرف پھیلتی ہے اگر اس کمرے کی گرمی کو اس طرح پھیلنے کا موقع مِل جائے تو اِس میں گرمی کا احساس ہی مٹ جائے گا۔ کمرے کے اندر اور باہر کے درجہٗ حرارت کے فرق ہی سے کمرے کا اپنا مخصوص ماحول قائم ہے ایک اور مثال لیجئے اس دنیا کا دار و مدار حرکت پر ہے لیکن آخر یہ حرکت کیا چیز ہے؟ توازن کے بگڑ جانے سے ہی تو حرکت پیدا ہوتی ہے اگر مُکمّل توازن قائم ہو جائے تو حرکت کہاں سے ہو گی اور دُنیا کا وجُود کہاں ہو گا۔ مکمّل یکسانیت اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب یہ دُنیا ختم ہو جائے۔ ورنہ جب تک دُنیا قائم ہے یکسانیت ناممکن العمل ہے اور صرف ناممکن العمل ہی نہیں ہے بفرض محال یہ مِمکن بھی ہو جائے تو ہمارے حق میں بڑی خطرناک ثابت ہو گی کبھی اس بات کی خواہش نہ کیجئے کہ دُنیا میں سب ہم خیال ہو جائیں پھر تو کوئی بات سوچنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے گی۔ اگر ہم سب یکساں ہو جائیں تو ہماری حالت مصریؔ ممیوں کی طرح ہو جائے گی جو عجائب گھر میں پڑی ایک دوسرے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہیں۔

ؔ Egyptian Mummies.

زندگی آپس کے فرق اور اختلاف ہی سے قائم ہے اسی میں ہماری ترقی کا راز ہے توازن کے بگڑنے کا نام ہی حرکت اور حیات ہے۔ ہماری جسمانی اور دماغی قوتیں اسی سے متحرک ہوتی ہیں یہی ہماری زندگی کی روح رواں ہیں ہمارے غور و فکر کی جان ہیں جب تک یہ عالمِ ظہور قائم ہے تفریق اور اختلاف کا ہونا لازمی ہے۔

تو پھر اس عالمگیر مذہب سے میری مُراد کیا ہے؟

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سب مذہبوں کا فلسفہ ایک ہو۔ سب کی دیومالا ایک ہو اور سب میں پوجا پاٹھ یعنی پرستش کی رسوم یکساں ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ حیرت انگیز دُنیا ایک پیچیدہ مشینری ہے جس میں پیچ در پیچ بڑے اُلجھاؤ ہیں یہاں یکسانیت کی سادگی ناممکن ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی طریقہ کار ایسا بھی ہے جس سے ہم سب تفرقات اور اختلاف کو مٹا کر اور بغض و عناد کی زنجیروں سے چھٹکارا پا کر چین اور آرام سے زندگی بسر کر سکیں میں کہتا ہوں کہ ہم یقیناً اس مشین روپی دُنیا کو آسانی سے چلا سکتے ہیں۔ اس کے پہیوں میں تیل دے کر اس کی رفتار کو قائم رکھ سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے ہم اس کی پیچیدگی کا اعتراف کرلیں اور یہ سمجھ لیں کہ زندگی تفریق اور اختلاف پر مبنی ہے یہ تمام فرق مٹائے نہیں جا سکتے۔ ان کو تسلیم کر کے ان کو سمجھ لینے ہی میں کامیاب زندگی کا راز ہے ایک طرف تو ہماری فِطرت ہم سے کہتی ہے کہ حقیقت وحدت ہے۔ دوسری طرف ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ کثرت ہی پر زندگی کا انحصار ہے۔ مکمل توازن ہم رنگی اور یکسانیت زندگی کی ضد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حقیقت کا اظہار لاکھوں صورتوں میں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے اور ان میں سے ہر صورت اپنی جگہ پر سچائی پر مبنی ہے ہمارے لئے اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایک ہی چیز ہزاروں نقطہ ہائے نظر سے دیکھی جا سکتی ہے لیکن ہر نقطۂ نظر سے مختلف نظر آنے کے باوجود وہ اپنی جگہ بدستور اپنی شکل میں قائم رہ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آفتاب کو لے لیجئے۔ طلوع کے وقت آفتاب ایک بڑا گولا سا نظر آتا ہے۔ دوپہر اور شام کے وقت اس کی صورت اور ہوتی ہے اور رات کو وہ نظر ہی نہیں آتا مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ بدستور قائم ہے یا فرض کیجئے کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ایک کیمرہ لے کر آفتاب کی طرف چل پڑتا ہے اور وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر اس کا فوٹو کھینچتا چلا جاتا ہے حتّٰی کہ وہ آفتاب تک پہونچ جاتا ہے یہ سب فوٹو ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتاب ایک ہی ہے اور یہی حال بھگوان کا ہے۔ بھگوان حقیقت کا سورج ہے ہر شخص اپنے اپنے مقامِ ارتقا سے بھگوان کو سمجھنے میں کوشاں ہے کسی کو بھگوان ایک صُورت میں نظر آتا ہے تو کسی کو دوسری صورت

ہیں۔ یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ بھگوان تو دراصل ایک ہے کوئی اسے بلند قسم کے فلسفے کی معرفت سمجھتا ہے تو کوئی ہزار ہا قسم کے من گھڑت قصّوں کے ذریعہ کہیں ارفع و اعلیٰ علم الاصنام موجود ہے تو کہیں کثیف ترین قسم کی دیو مالا۔ کسی مذہب میں پوجا پاٹھ (پرستش) کی رسمیں نفاست کی حد تک پہونچ گئی ہیں اور کسی کے یہاں نہایت ٹھوس قسم کی بُت پرستی کا رواج ہے جس کی بنیاد محض توہّمات پر ہے لیکن اِن سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان ہر فرقہ ہر قوم اور ہر مذہب دانستہ یا نادانستہ طور پر رُوحانی بلندی کی طرف گامزن ہے یہ سب ایک ہی خدا کو پانے کے لئے سر توڑ جد و جہد کر رہے ہیں[ے]۔ جس کسی کو حقیقت کا دیدار جس صورت سے بھی ہو خدا ہی کا دیدار ہے اور کسی چیز کا نہیں اِس نکتے کی وضاحت ایک اور مثال سے یوں کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم لوگ اپنے ہاتھ میں ایک برتن لے کر کسی جھیل سے پانی بھرنے جاتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں پیالہ ہے تو کسی کے پاس گلاس۔ کوئی بالٹی لے کر جاتا ہے تو کوئی گھڑا۔ بہرحال ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے برتن میں پانی بھر لیتا ہے اگرچہ یہ پانی ایک ہی جھیل کا ہے لیکن مختلف برتنوں میں بھرے جانے کی وجہ سے مختلف برتنوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ ہر برتن میں ایک ہی جھیل کا پانی ہے بالکل یہی صورت مذہبوں کی ہے۔ تمام مذاہب ان برتنوں کی مانند ہیں جن میں خدا ہی کی معرفت کا پانی بھرا ہوا ہے جن لوگوں کو اس پانی سے اپنی پیاس بجھانا ہو وہ جس برتن سے چاہے پانی پی لیں سوال تو صرف پیاس کا ہے۔ پانی پی لینے کے بعد آخر کار برتن کو عموماً پھینک ہی دیا جاتا ہے۔ ہماری غرض برتنوں سے نہیں ان کی مختلف صورتوں سے نہیں۔ ہمیں تو معرفت کا امرت پینا ہے کسی پیالے میں پی لیا تو خیر ورنہ اوک ہی سہی یہی وہ حقیقت ہے جس کو پاکر ہم عالمگیر مذہب کے تصوّر کو سمجھ سکتے ہیں۔ کائناتی وسعت یا عالمگیریت کا عرفان یہی ہے کہ تمام مذاہب کے ظاہری اختلافات کے پسِ پشت ایک خدا

[ے] Through high philosophy or low, through the most exalted mythology or the grossest, through the most refined ritualism or the arrant fetishism, every soul, every sect, every nation, every religion, consciously or unconsciously is struggling towards God, every vision of truth that man has in the vision of Him and none else.

کی حقیقت کو دیکھا جائے جو لاشریک ہے یکتا ہے واحد ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق متواتر کوشش کر رہا ہے۔

یہاں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اصولی طور پر تو یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن کیا مذہبوں کے مابین باہمی اتحاد و آشتی کے پیدا کرنے کی کوئی عملی صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ دراصل تمام مذاہب حقیقت پر مبنی ہیں یہ خیال کافی پُرانا ہے تمام مذاہب کو محبت اور باہمی اتحاد کے رشتے میں منسلک کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں ہندوستان مصر۔ یوروپ چین۔ جاپان اور تبت میں یہ کوششیں مدت سے ہوتی چلی آئی ہیں اور زمانہ حال میں امریکہ والوں نے بھی اسی بات کی متعدد بار کوشش کی ہے کہ کوئی ایسا مذہبی مسلک بنایا جائے جس کی بنیاد باہمی اتحاد و آشتی ہو۔ لیکن ان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی عملی پلان اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ متعدد اشخاص و اصحاب نے فرداً فرداً اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ راہ راست پر ہیں لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے ان مذاہب کو متحد کرنے کے لئے کوئی بھی ایسی راہ نہیں دکھائی جس پر چل کر سب مذاہب متحد بھی ہو جائیں اور ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت بھی قائم رکھ سکیں۔ اتحاد محض انفرادیت کے وجود کو مٹا دینے کا نام نہیں اتحاد کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ مختلف اجزا کو یکجا کیا جائے اِسی لئے مذہبی اتحاد کا صرف وہی عملی پلان کامیاب ہو سکتا ہے جس میں کسی بھی مذہب کے پیرؤوں کی انفرادی حیثیت منہدم نہیں ہونے پاتی لیکن ساتھ ہی ساتھ اُنہیں دوسرے مذہب والوں سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کا موقع بھی ملتا ہے دوسرے لفظوں میں قابل عمل اور کامیاب طریقۂ کار وہی ہو سکتا ہے جو ہمیں اس مقام اتصال تک پہونچا دے جہاں مختلف مذہبی خطوط ایک دوسرے کو قطع کئے بغیر مِل جائیں۔ ابھی تک مذہبی اتحاد کے جتنے پلان بنائے گئے ہیں ان میں کہنے کو تو مختلف مذاہب کے تمام نظریوں کو شامل کیا گیا ہے لیکن عملی طور پر اُن سب نظریوں پر پابندیوں اور نئے نظریوں کا ایک اور سلسلہ عاید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا رہا ہے کہ ان پابندیوں اور اِن نئے نظریوں نے بجائے خود نئے مذہبی فرقوں کی صورت اختیار کرلی اور تفرقات مٹنے کے بجائے بڑھتے گئے تفرقہ بازی زود ہی پکڑتی گئی۔

آج میں آپ کے سامنے ایک چھوٹا سا پلان پیش کر رہا ہوں میں نہیں جانتا کہ یہ پلان کہاں تک بروئے عمل لایا جا سکتا ہے میں خود یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ پلان کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو اس پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا پلان کیا ہے؟ سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ انسان کسی قسم کی بھی تخریب کے خیال کو دل سے نکال ڈالے۔ اسے بالکل ترک کر دے۔ تعمیر کے لئے تخریب

ضروری نہیں جس چیز کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔ کسی چیز کو بھی تباہ و برباد نہ کیجئے بُت شکن رفارمروں[1] سے دُنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا کیونکہ ان کی تمام قوتیں تخریب ہی کے کام میں صرف ہو جاتی ہیں کسی چیز کی شکست و ریخت نہ کیجئے ہو سکے تو تعمیری کام میں سرگرم ہو جائیے اگر آپ میں کسی کی مدد کرنے کی قوت ہے تو مدد ضرور کیجئے لیکن اگر آپ مدد نہیں کر سکتے تو چپکے سے دِل ہی دِل میں اپنی مجبوری کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگ لیجئے ہاتھ جوڑ کر ایک طرف ہو جائیے تاکہ اور لوگوں کو کام کرنے کا موقع ملے۔ اپنی مجبوری کی پردہ پوشی کے لئے شور مچانا یا کسی قسم کا مصنوعی ڈھونگ رچانا فضول سی بات ہے۔ بے فائدہ ہے اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کا نہیں۔ توڑ پھوڑ کرنے سے بہتر ہے کہ موجودہ صورتِ حالات جیسی بھی ہے اسے جاری رہنے دیجئے اگر آپ مدد نہیں کر سکتے تو نقصان تو نہ پہونچائیے کسی کے عقائد کے خلاف اسوقت تک ایک حرف بھی زبان پر نہ لائیے جب تک اُس میں خلوص کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے۔ میرے پلان کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ پہلے ہر شخص کے نجی مقامِ ارتقاء کو سمجھئے اور پھر اسی کی نسبت سے اسے بلند تر مقام تک لے جائیے اگر یہ سچ ہے کہ خدا تمام مذاہب کا مرکز ہے اور ہم میں سے ہر شخص اپنے نصف قطر پر چل کر اس مرکز کی طرف جا رہا ہے تو یہ بھی مُسلّم ہے کہ ہم سب اس مرکز تک کبھی نہ کبھی پہونچ جائیں گے جس طرح مرکز پر پہونچ کر تمام نصف قطر آپس میں مل جاتے ہیں اسی طرح خدا کو پاکر ہمارے تمام باہمی اختلافات بھی دُور ہو جائیں گے لیکن جب تک ہم مرکز پر نہیں پہونچ جاتے اس وقت تک تفرقات اور اختلافات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف ملکوں کا فطری جھکاؤ متعدد نصف قطروں کی طرح ایک ہی مرکز یعنی خدا کی طرف ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنی فطرت کے مطابق ایک راستے سے سفر کرتا ہے اور دوسرا شخص دوسرے راستے سے لیکن ہم سب اپنے اپنے راستے پر چلتے ہوئے آخر یقیناً مرکز تک پہونچ جائیں گے[2] کیونکہ تمام راستوں کی منزل ایک ہی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی فطرت کے تحت ترقی کر رہا ہے وقت آنے پر ہم سب کو ارفع ترین حقیقت کا عرفان حاصل ہو کر رہے گا۔ اصولِ ارتقا کا تقاضا یہی ہے کہ آخر انسان خود ہی اپنی ذات سے علمِ عرفان حاصل کرے گا۔ ہر انسان اپنا گرو آپ ہے کوئی کسی کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ کوئی کسی کو کیا سکھا سکتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ ایک بچے کی بھی درس و تدریس کر سکتے ہیں تو یہ خیال غلط ہے یہ آپکے بس کی بات نہیں۔ ہر بچہ اپنا آپ معلّم ہے آپ کا فرض تو یہ ہے کہ آپ اس کے لئے مواقع مہیا کریں اور اس کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دُور کر دیں جیسے آپ کوئی پودا لگاتے ہیں تو اس کے اُگنے اور بڑھنے کا عمل آپ کے اختیار میں نہیں ہوتا لیکن آپ اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ پودے کے گرد جھاڑ بندی کر دیں اور اس

[1] Reformers. [2] All roads lead to Rome.

بات کی احتیاط کریں کہ کہیں کوئی جانور اسے چر نہ جائے۔ بس آپ کا فرض یہیں ختم ہوجاتا ہے۔ پودا تو خود اُگتا اور پروان چڑھتا ہے۔ یہی حال ہے ہر انسان کی رُوحانی نشو و نما کا کوئی آپ کو اس کا درس نہیں دے سکتا کوئی آپ کو رُوحانی انسان نہیں بنا سکتا۔ آپ کو خود ہی درس لینا ہے آپ کی نشو و نما تو آپکے باطن ہی میں ہو سکتی ہے۔

کوئی خارجی معلم سکھا ہی کیا سکتا ہے وہ تو صرف رکاوٹوں کو دُور کر سکتا ہے بس اس کے آگے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو آپ کسی کی مدد کر دیجئے، لیکن تدریس و تعلیم کے پردے میں کسی چیز کو تباہ و برباد نہ کیجئے۔ اس قسم کے غلط اور بے بُنیاد خیالات کو ترک کر دیجئے کہ آپ انسانوں میں روحانیت پیدا کر سکتے ہیں یہ ناممکن ہے خود آپکے آتما کے سوا آپکا کوئی گرُو کوئی مُرشد نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا نقطۂ نظر اور طریقۂ کار ہی بدل جائے گا۔ اس اصُول کو تسلیم کر لیجئے اور پھر دیکھئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے سماج میں ہم کو مختلف مزاج کے آدمی ملتے ہیں۔ ہزاروں قسم کے دماغ اور ہزاروں قسم کے رجحانات ہوتے ہیں مکمل طور پر توان کی تعلیم نامُمکن ہے لیکن عملی مقاصد کے لئے ان رجحانات کو چار زمروں[ؔ] میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ اشخاص آتے ہیں جو ہر وقت سرگرم اور مستعد رہتے ہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ اُن کے رگوں اور پٹھوں میں بڑی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دُنیا میں بڑے بڑے کام سرانجام دیں اور انھیں لوگوں کے ہاتھوں سے عظیم الشان کام سرانجام پاتے بھی ہیں شفا خانے اور آشرم بنائے جاتے ہیں ترقی کی راہیں کھُلتی ہیں یہی لوگ منصوبے اور پلان تیار کر کے انھیں عملی جامہ پہناتے ہیں یہ تمام تنظیم و تعمیر انھیں کی بدولت ظہُور پذیر ہوتی ہے۔

دوسرے زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں جو جذبات کے تحت کام کرتے ہیں ایسے لوگوں کو بلند اور حسین چیزوں سے والہانہ محبت ہوتی ہے وہ قدرت کے جمالیاتی رُخ پر جان دیتے ہیں۔ احساسِ جمال سے محظوظ ہوتے ہیں حسن و جمال کے دیوانے عشق و محبت کی پرستش کرتے ہیں اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق وہ حسین سے حسین چیز کی متواتر تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عشق و محبت کے

لے the worker, the lover, the mystic and the philosopher or the active, the emotional, the mystic and the contemplative.

یہ پجاری آخر خدا کی محبت کو پالیتے ہیں ان کا شوقِ جمال بڑھتے بڑھتے آخر اس پیکرِ جمال کے تصوّر کو پالیتا ہے جسے ہم "خدا" کہتے ہیں۔ ان کا سر محبت کے سجدۂ شکرانہ میں جھک جاتا ہے ایسے لوگ عرفانِ محبت کی بدولت دُنیا کے مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے والے تمام زندۂ جاوید پیغمبروں اور اوتاروں کی عزّت سچے دل سے کرتے ہیں بلکہ وہ تو ان کو پُوجتے ہیں ان کے قدموں میں عقیدت اور محبّت کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور اُن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالتے ہیں ان کو اس سے غرض نہیں کہ عقل اور دلیل سے حضرت مسیح یا بھگوان بُدھ کا وجُود ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں وہ اِس پھیر میں نہیں پڑتے کہ حضرت مسیح نے سرمن[ف۱] آن دی ماؤنٹ کس تاریخ کو دیا تھا یا بھگوان کرشن کے جنم کی کون خاص ساعت تھی ان کو تو مطلب ہوتا ہے ان بزرگوں کی شخصیتوں سے۔ ان کی محبوب ہستیوں سے۔ یہ ہے نوعیت جذباتی لوگوں کے جمالیاتی نصب العین کی یہ ہے معراج عشق کی۔

تیسرا طبقہ صوفیوں یعنی اہلِ باطن[ف۲] کا ہوتا ہے جن کا دماغ خود اپنا تجزیہ نفسی کرنا چاہتا ہے وہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ تزکیہ نفس کی کیا کیا صُورتیں ہیں اور وہ کون سی طاقتیں ہیں جو پردۂ باطن میں کار فرما ہیں اور ان طاقتوں کا علم کیسے پایا جاسکتا ہے ان پر قدرت کیسے حاصل ہوسکتی ہے نیز یہ کہ انھیں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اسکے سادھن کیا ہیں۔

چوتھے زمرے میں فلاسفر آتا ہے جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے جو ہر قول کو دماغ کی ترازو میں تولتا ہے لیکن آخر کار اپنے شعور اور ادراک کو اس ماورائی مقام پر لے جانا چاہتا ہے جہاں کسی قسم کے بھی منطق اور فلسفے کا گزر نہیں۔

ظاہر ہے کہ عالمگیر مذہب وہی ہوسکتا ہے جو نوعِ انسانی کے ان تمام طبقوں کو تسکین اور آسودگی بہم پہونچا سکے۔ جو اِن مختلف قسم کے دماغوں کے لئے غذا مہیا کرسکے اور اگر کسی مذہب میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو وہ صرف کسی خاص طبقے کا مذہب ہوسکتا ہے اسے ہمہ گیری نہیں حاصل ہوسکتی اور مذہب کی اِسی تنگ دامانی ہی سے تو تعصب پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے تقریبًا سارے مذہبی فرقے تعصب کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ جذباتی طبقے کے کسی مذہبی مسلک کو لے لیجئے ان کے ہاں پریم اور بھگتی اور بھاد (جذباتِ محبت۔ حال و سرور) کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ

ف۱ Sermon on the Mount. ف۲ The mystic.

لوگ مستی کی حالت میں گاتے بجاتے اور ناچتے ہیں اور پھر شدتِ جذبات کے تحت خوشی کے آنسو بھی بہانے لگتے ہیں وہ کبھی دردِ فرقت سے بے چین ہو ہو کر روتے ہیں۔ زار نالی کرتے ہیں۔ آپ اِن میں شامِل ہونا چاہیں تو یہ لوگ آپ کو بخوشی قبول کریں گے لیکن آپ ذرا ان سے یہ کہہ کر تو دیکھئے کہ بھئی یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں کسی طور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں مجھے تو کسی طاقت بخش۔ جان پرور اور مرد ساز چیز یعنی دلیل اور فلسفے کی ضرورت ہے میں ہر چیز کو بتدریج سمجھنا چاہتا ہوں اور وہ بھی معقولات سے کام لے کر" فوراً آپ کو جواب ملے گا کہ" آپ یہاں سے تشریف لے جائیے" صرف یہی نہیں بلکہ اگر ان کا بس چلے تو وہ آپ کو جہنم واصل بھی کر دیں، میری مراد یہ ہے کہ اس مت یا عقیدے والے صرف انھیں لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں جن کا مزاج خود ان کی طرح جذباتی ہو ان کے علاوہ دوسروں کی مدد کرنا تو درکنار یہ لوگ انھیں تباہ و برباد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے کیونکہ وہ اس بات کا خیال تک نہیں کر سکتے کہ خدا کو پانے کا کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے اس تمام صورت حالات کا دردناک پہلو یہ ہے کہ خدائے تعالے کے یہ پُرخلوص بندے دوسروں کے خلوص کو نظر میں بھی نہیں لاتے اسی طرح آپ کو کچھ فلاسفر بھی ایسے ملیں گے جو ہند اور مشرق کی روحانی آگہی کے قصے بیان کریں گے اور بڑی بڑی نفسیاتی اصطلاحیں استعمال کریں گے جن کے پچاس پچاس ارکان تہجی[ف] ہوں گے لیکن اگر میری طرح کا کوئی معمولی آدمی ان کے پاس جاکر کہے کہ آپ مجھے بھی کوئی ایسی روحانیت کی بات بتا دیجئے جس سے میری زندگی سُدھر جائے تو اس کے جواب میں پہلے تو وہ مسکرائیں گے اور پھر فرمائیں گے، ہوش کی دوا کرو ابھی تمھارے پاس سمجھنے کا دماغ ہی نہیں۔ کہاں ہمارا مقام اور کہاں تم۔ روحانیت کے متعلق تمھاری سمجھ میں کیا خاک آئے گا" یہ ہے بزعم خود بلند مقام فلاسفروں کا حال آپ کو دھتکار دینے کے علاوہ ان کے بس کی کوئی بات ہی نہیں صوفی لوگ تو عالمِ وجود کے مختلف طبقوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں دماغ کی مختلف کیفیتوں اور قوتوں کا حال بتاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی معمولی آدمی ان سے کہے کہ" یہ بڑی بڑی باتیں میرے بس کی بات نہیں"۔ مجھے تو کوئی نیک صلاح دیجئے جس پر میں عمل کر سکوں۔ کوئی ایسا کام بتایئے جو میرے لائق ہو اور جسے میں نباہ سکوں" تو وہ ہنس پڑیں گے اور کہنے لگیں گے کہ" ذرا ان کی باتیں سُنئے۔ کتنی گہری جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہے ان کے دماغوں پر۔ ان کی تو زندگی ہی خراب ہو رہی ہے۔

تو یہ حال ہے مختلف فرقوں کے رہنماؤں کا جہاں دیکھو ہر طرف۔ یہی کیفیت نظر آ رہی ہے میرا

ف Alphabets.

بس چلے تو ان مت متانتروں کے کرڈ پنھتیوں کو اکٹھا کرکے ان کی تحقیر آمیز مسکراہٹوں کا فوٹو کھنچوا لوں تاکہ سند کے طور پر کام آئے ان حالات میں میں کسی خاص مذہب کی تبلیغ نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو صرف ان شرائط کا ذکر کروں گا جن کے بغیر کوئی مذہب عالمگیر نہیں ہو سکتا جس عالمگیر مذہب کا آدرش میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اسے ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر شخص کی طبیعت اُسے قبول کر سکے وہ فلسفی عاشق اور صوفی سب کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہو فلاسفر کے فلسفیانہ معیار پر پُورا اُترے جذباتی لوگوں کی جمالی ضروریات کو پُورا کرے اور صوفیوں کے لئے تصوّف اور عرفان کی مَتی دامن میں لئے ہو اور محض یہی نہیں بلکہ کالجوں کے پروفیسروں سائنسدانوں اور علم طبیعات کے ماہروں کے ہر سوال کا حل مہیا کرے۔ ان کی منطق اور ان کی دلیل کا معقول و مدلّل جواب پیش کرے لیکن یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام دلائل اور مباحثے محض اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ہوتے ہیں کہ مادّی زندگی بجائے خود مکمّل نہیں اس کے علاوہ روحانی زندگی کا بھی وجود ہے رُوحانی زندگی کا بذاتِ خود شعور عقل و خرد سے ممکن نہیں اس کا احساس منطق اور دلیل کی حدوں سے نکل کر ہی ہوتا ہے اگر مذہب درحقیقت مذہب ہے تو اس پر عمل کے دوران میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں منطق اور دلیل کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اگر کوئی پروفیسر۔ سائینس داں یا فلاسفر یہ سمجھے کہ خدا اور نجات کے تصورات محض توہمات ہیں انھیں ترک کر دیجئے تو میں تو یہی کہوں گا کہ رُوحانی زندگی کے وجود کا مدلّل ثبوت بہم پہنچانے پر بھی اگر کوئی شخص مذہبی طریقۂ عمل کو وہم قرار دے تو وہ خود تعصب اور وہم کا شکار ہو رہا ہے۔ ایسے فلاسفر یا سائینس داں کی خدمت میں تو میں یہ عرض کروں گا کہ "جناب والا۔ خود آپ کی سائینس اور فلاسفی کا نظریہ یہ ہے کہ تمام خارجی کائنات دراصل ایک ہے یہ تمام عالم ظہور اس واحد الوجود کی مختلف صورتوں کا البم ہے اس لحاظ سے خود آپ کے جسم کا وجود بھی تو توہماتی ہے اور اسے بھی ترک کر دینا چاہیئے کھانا پینا چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہر قسم کے کاروبار سے دست بردار ہو جانا چاہیئے لیکن آپ تو اس وہم کو اپنائے ہوئے ہیں جس طرح آپ اپنا کام نہیں چھوڑ سکتے۔ کھانے پینے سے دست کش نہیں ہو سکتے اسی طرح رُوحانیت کا طلبگار کسی قیمت پر بھی مذہب کو خیرباد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مذہب ہی تو ہمیں وہ عملی طریقہ بتاتا ہے جس سے آپ کے اس فلسفے کا ذاتی احساس ہوتا ہے کہ یہ دُنیا ایک ہی وجُود کی مختلف صُورتوں کا مجموعہ ہے جس چیز کا آپ کو دماغی شعور ہوتا ہے وہ اسی کا ذاتی احساس پیدا کرنا چاہتا ہے آپ اس راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے تو نہ سہی۔ دوسروں کو

توہم پرستی کا الزام نہ دیجئے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک عالمگیر مذہب میں ہر شخص کو اس کی طبیعت کے رجحان سے مطابقت رکھنے والی راہ عمل کے دکھلانے کی صلاحیت ہونی چاہیئے اگر ہم کسی ایسے مذہب کے پیرو ہیں تو ہم سائنس دانوں اور فلاسفروں کے دلائل کا جواب تو منطق سے دیں گے ہی لیکن اگر ہمارے یہاں کوئی صوفی مزاج آدمی آئے تو ہم اس کا بھی خیر مقدم کریں گے اور اس کو دماغی تجزیہ و تحلیل کا گر سکھائیں گے ہی نہیں بلکہ اس کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ بھی کر کے دکھائیں گے۔ ہمارے پاس جذباتی قسم کے لوگ آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر "شراب محبت" پئیں گے۔ ان کے ساتھ محبوب کی یاد میں روئیں گے۔ اس کے خیال سے مسرور ہو کر گائیں گے اور مستی اور حال کی کیفیات میں گم ہو کر پاگل ہو جائیں گے۔ دوسری جانب اگر کوئی مستعد اور چاق و چست کرمجاری (کارگزار) ہمارے پاس آ پہونچے تو ہم بھی اپنی پوری طاقت سے اس کے ساتھ مل کر کام کریں گے جس مذہب کی دستوں میں یہ چاروں خوبیاں پائی جاتی ہیں وہی آدرش مذہب ہوتا ہے اور جس آدمی کی سرشت میں فلسفہ جمالیات قوت عمل اور تصور کے عناصر متوازن اور مناسب مقدار میں موجود ہیں صرف یہی آدمی آدرش پرش یا مکمل انسان ہے۔ کاش تمام انسانوں کے دماغوں کی ساخت ایسی ہوتی کہ اس میں یہ چاروں اجزا پوری مقدار میں موجود ہوتے۔ ہونے کو تو ہر شخص میں یہ چاروں عناصر کم و بیش موجود ہوتے ہیں لیکن عملی صورت عموماً ایک دو ہی عنصر اختیار کرتے ہیں۔ جس شخص کے دماغ میں ان سے ایک یا دو اجزا کارفرما ہوتے ہیں میری نظر میں اس کی بھی تکمیل نہیں ہوئی! اس لحاظ سے دنیا قریب قریب تمام تر ادھورے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کا دماغ بس ایک آدھ خیال کا حامی ہو سکتا ہے وہ بس ایک ہی تنگ راہ پر چل سکتے ہیں جسے ان کی محدود فکر و نظر اختیار کر لیتی ہے اس کے علاوہ ان کی نظر میں ہر چیز خطرناک اور مہیب ہوتی ہے۔

میرا آدرش مذہب وہ ہے جس میں ان چاروں عناصر کی گنجائش ہو ہمارے ہاں اس مذہبی مسلک کو یوگ کا نام دیا گیا ہے یوگ کے معنی ہیں اتصال یعنی متحد کرنا جن لوگوں کو کام کرنے کا شوق ہے ان کی نگاہ میں یہ رشتہ اتصال ہر انسان اور تمام طبقہ انسانیت کے درمیان ہوتا ہے عشق حقیقی کے دیوانوں کی نظر میں یہ اتصال خود ان کی ذات اور "خدائے محبت" کا باہمی اتصال ہے صوفی کے خیال میں یہ اتصال روح انسانی اور روح اعظم کا اتصال ہے فلسفی اس کو تمام موجودات کا باہمی اتصال کہتے ہیں ان کا نظریہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے ان چار قسموں کے اتصال یا یوگ کے سنسکرت زبان میں چار اصطلاحی نام ہیں یعنی کرم یوگ بھگتی یوگ راجیہ یوگ اور گیان یوگ۔ جو شخص اس اتصال کا جویا ہوتا ہے اس کو یوگی کہتے ہیں۔ کام

کاج یعنی خدمت خلق کے ذریعہ خدا کو ڈھونڈنے والے کو کرم یوگی کہتے ہیں عشق و محبت (پریم اور بھگتی) کے ذریعہ محبوب حقیقی کے ساتھ وصل کے طلبگار کو بھگت یوگی کہا جاتا ہے۔ تصوّف کے ذریعہ اس کے متلاشیوں کو راج یوگی یا راج رشی کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو لوگ فلسفے کے ذریعہ اس سے ایک ہونے کے خواہاں ہوتے ہیں وہ گیان یوگی کہلاتے ہیں میں آپ کے سامنے ان چاروں یوگوں کے متعلق ابھی کچھ اور تفصیلاً عرض کروں گا لیکن اس سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ یوگ کی تھوڑی سی مزید تشریح کر دی جائے۔

آپ کے ملک میں لفظ یوگ کے ساتھ نہ جانے کیا کیا عجیب و غریب اور معقولیت سے بعید چیزیں منسوب کر دی گئی ہیں اسی لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے آپ کو یہ بتاؤں کہ یوگ کا جادو ٹونے اور ایسی ویسی اُوٹ پٹانگ باتوں سے کوئی تعلق۔ کوئی واسطہ نہیں۔ یوگ کسی ما فوق الفطرت بازی گری کا نام نہیں ہے۔ کسی قسم کے یوگ میں بھی عقل و دلیل کو ترک نہیں کیا جاتا اگر انسان اپنی عقل سے کام نہیں لے گا تو کبھی نہ کبھی ضرور دھوکا کھائے گا۔ چالاک اور دغاباز لوگ اس کا اُلّو بنا لیں گے۔ یوگ آپ سے دھوکا کھانے کو نہیں کہتا۔ یوگ یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ بغیر سوچے سمجھے اپنے آپ کو پروہتوں پنڈتوں یا راہبوں کے سپرد کر دیں یوگ کا تقاضا یہ بھی نہیں کہ آپ کسی ما فوق الطبع پیغمبر کی اندھا دھند پیروی کریں۔ یوگ کا تو اصول یہ ہے کہ جو کچھ آپ کی سمجھ میں آئے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہئے جس چیز کو آپ کی عقل قبول نہیں کرتی اسے مجبوراً قبول نہ کیجئے۔ ایسی چیز کا ترک ہی بہتر ہے۔

حصُول علم کے تین وسیلے ہوتے ہیں پہلا وسیلہ تو ہے احساس یا تحریک طبعی[۵۱] کا۔ جانوروں کا کام اسی تحریک طبعی سے چلتا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ جانوروں میں یہ تحریک طبعی کافی حد تک نشو و نما پا چکی ہے یہ حصُول علم کا ادنےٰ ترین وسیلہ ہے اس کا دوسرا وسیلہ ہے دلیل و منطق۔ انسان میں اس کا ظہور بہت زیادہ ہوتا ہے تحریک طبعی کا وسیلہ ناکافی ہوتا ہے اسی لئے جانوروں کا دائرہ عمل بہت محدود ہوتا ہے یہی تحریک طبعی انسان میں ارتقا پذیر ہو کر دلیل و منطق کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے عمل کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے لیکن دلیل و منطق کی بھی[۵۲] ایک حد ہوتی ہے اس سے مکمل طور پر مطلب براری نہیں ہوتی۔ دلیل و منطق کے قدم تھوڑی ہی دُور تک اُٹھ سکتے ہیں اور ایک مقام پر جا کر رُک جاتے ہیں اس کے آگے نہیں بڑھ سکتے اور اگر آپ زبردستی دلیل و منطق کا سلسلہ آگے جاری رکھتے ہیں تو اس

---

[۵۱] Instinct.

[۵۲] ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل ؛ لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

سے انتشار پیدا ہو جاتا ہے جس کا آپ کے پاس کوئی علاج نہیں۔ خود دلیل و منطق میں نا واجبیت آجاتی ہے۔ دلیل و منطق کا ایک بے معنی چکر پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مادہ اور طاقت ہی کو لے لیجیے جو شعور اور ادراک کی بنیاد ہے۔ مادے کی تعریف کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ مادہ وہ چیز ہے جس پر طاقت کا عمل ہوتا ہے اور طاقت کسے کہتے ہیں طاقت اس چیز کو کہتے ہیں جو مادے پر عمل کرتی ہے دیکھا آپ نے اس بات کی پیچیدگی کو؟ منطقی حضرات اس حالت کو تلون اور تذبذب کہتے ہیں اس میں ایک خیال دوسرے کا محتاج ہوتا ہے، اور دوسرا خیال پہلے کا۔ اس مقام پر پہونچ کر دلیل و منطق کے قدم رک جاتے ہیں یہ ایسی رکاوٹ ہے کہ اس کے آگے نکلنا ان کے بس کی بات نہیں پھر بھی دلیل و منطق اس سے آگے بڑھ کر لا محدودیت کے طبقے میں جانے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ یہ تمام عالم کائنات جس کو ہمارے حواس محسوس کر سکتے ہیں یا جس کا شعور ہمارے دماغ کو ہوتا ہے۔ محض ایک شمہ ہے ایک حقیر ذرہ ہے ایک ایٹم ہے اس وجود کا جو لا محدود ہے بے پایاں ہے اور جس کا ظہور بیداری یا شعور کی سطح پر ہو رہا ہے اور اس بیداری یا شعور کے تار و پود سے ترشح ہونے والی تنگ حدوں کے اندر اندر ہی رہ کر عقل اور دلیل یہ دونوں چیزیں اپنا کام کرتی ہیں اس حد سے آگے بڑھنا ان کے لئے ناممکن ہے وہاں تک اُن کا گزر نہیں۔ اسی لئے کوئی ایسا اور وسیلہ ہونا چاہیئے جس کی مدد سے ہم ان حدود کے آگے جا سکیں اور وہ وسیلہ ہے القا[1] کا۔ الہام کا۔ تو گویا علم حاصل کرنے کے تین وسیلے ٹھہرے۔ (۱) یعنی تحریکِ طبعی (۲) عقل و دلیل اور (۳) القا یا الہام۔ تحریکِ طبعی کا تعلق جانوروں سے ہے۔ عقل کا تعلق انسان سے ہے اور القا یا الہام کا تعلق خدا رسیدہ انسانوں سے ہے۔ یہاں ان دو باتوں کا یاد رکھنا لازمی ہے ایک تو یہ کہ حصول علم کے یہ تینوں وسیلے بیک وقت ہر انسان کی دسترس میں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تحریکِ طبعی انسان میں بالکل مٹ جاتی ہے یا خدا رسیدہ انسان عقل و خرد سے کام لینا ہی چھوڑ دیتے ہیں ہر انسان اپنے ارتقائی مقام کی نسبت سے بیشتر ان تینوں وسائل کو کام میں لاتا ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر وسیلہ دوسرے وسیلے کی ارتقائی صورت ہے اس کی ضد نہیں ہے تحریکِ طبعی ہی بڑھ کر عقل اور دلیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور عقل و دلیل ہی نشو و نما پا کر القا یا الہام کا مرتبہ پا لیتے ہیں اسی لئے القا یا الہام سے عقل کا استرداد نہیں ہوتا یہ تو عقل و دلیل کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ جو باتیں عقل کے ذریعہ سمجھ میں نہیں آتیں وہ القا کے ذریعہ صاف نظر آجاتی ہیں لیکن اس القا یا الہام سے عقل و دلیل کی تردید نہیں ہوتی۔ بڑھاپا عہد طفلی کا استرداد نہیں

---

[1] Inspiration.

ہوا کرتا۔ہاں اس عمر رسیدگی سے بچّے کی زندگی پایۂ تکمیل کو پہونچتی ہے لیکن جس طرح بڑھاپے اور بچپن میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے اور بچپن کی سادگی کو بڑھاپے کی تجربہ کاری کے برابر سمجھنا غلطی ہے اسی طرح ادنےٰ درجے کے وسیلے یعنی تحریکِ طبعی کو غلطی سے اعلےٰ درجے کے وسیلے یعنی الہام کے مساوی سمجھ لینا عظیم خطرات کا موجب ہوتا ہے بعض مرتبہ دُنیا میں تحریکِ طبعی کو القا کی شکل میں پیش کر کے پیغمبری اور رسالت کے جھوٹے دعوے پیش کئے جاتے ہیں بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک احمق یا نیم خبطی قسم کا آدمی اُس انتشار کو جو اس کے دماغ میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ القا یا الہام سمجھ بیٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کریں اور دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ کئی بار اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں یہ جو متضاد قسم کی لغویات مذہبی عقائد کی صورت میں پھیلی ہوئی ہیں وہ انھیں خبطیوں کے دماغ کی اختراعات ہی تو ہیں جو تحریکِ طبعی کو الہام سمجھ بیٹھے ہیں۔ حقیقی مذہب ان غیر معمولی باتوں سے بہت گھبراتا اور اُن سے کتراتا ہے۔

صحیح مذہبی تعلیم کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس سے معقولات کی مخالفت اور تردید نہیں ہوتی۔ جن چار قسم کے لوگوں کا ذکر میں نے آپ سے کیا ہے وہ سب کے سب اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ آپ راج یوگ ہی کو لے لیجئے۔ اس یوگ کی نوعیت نفسیاتی ہے یہ ہے وصلِ الٰہی کے حاصل کرنے کا نفسیاتی طریقہ یہ موضوع بہت وسیع ہے۔ میں تو آپ سے صرف یہ عرض کروں گا کہ اس یوگ کا مرکزی تصوّر کیا ہے؟ حصولِ علم کا صرف یہ ایک طریقہ یہ یوگ یکسوئی یعنی دھیان[۱] پر زور دیتا ہے۔ دُنیا میں کامیابی کا راز اور حصولِ مقصد کا واحد طریقہ یکسوئی ہے انسان کا میدانِ عمل کچھ بھی ہو یکسوئی اور دھیان کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ دھن دولت ہو یا طبعی علم یا رُوحانی آگہی کوئی چیز بھی یکسوئی کے بغیر دسترس میں نہیں آسکتی۔ ایک ادنےٰ ترین انسان سے لے کر ایک بلند مقام یوگی تک سب حصولِ مقصد کے لئے یہی طریقہ کام میں لاتے ہیں یہ عمل کیا ہے ادھر اُدھر سے سمیٹ کر تمام توجہ کو ایک مرکز پر لے آنا۔ ایک کیمیاگر جب اپنی تجربہ گاہ میں کام کرتا ہے تو اپنی ساری طاقتوں کو یکسو کر لیتا ہے وہ ان کو ایک نقطہ یا سکہ[۲] پر لے آتا ہے اور پھر اپنی مجموعی دماغی قوّتوں کی اس تیز شعاع کو اجزائے[۳] ترکیبی پر ڈالتا ہے جس سے ان اجزا کی ترکیب صاف نظر آنے لگتی ہے اور کیمیاگر کو نئی نئی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اسی طرح منجّم بھی اپنی دماغی طاقتوں کو مرکوز کر کے دُور بین کے ذریعہ آکاش کے سیّاروں کو اپنی زد میں لے آتا ہے جس سے تمام نظامِ فلکی اپنے اسرار کا خزانہ

---

۱ Concentration.　　۲ Brings them into focus.

۳ Elements.

اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ غور سے دیکھو تو ہر معاملے میں یہی صورتِ حال پیش آتی ہے پروفیسر اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا پڑھا رہا ہے تو اس کی تمام توجہ سبق پر لگی ہوگی۔ طالبِ علم اپنے ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے پڑھ رہا ہے تو وہ گرد و نواح کی ہر چیز سے بے خبر ہوگا اسی لئے جو شخص بھی کچھ حاصل کرنے کے لئے کسی کام میں مصروف ہے اس کی یہی کیفیت ہوگی آپ میرا لکچر سن رہے ہیں اور اگر آپ کو میری باتوں سے دلچسپی ہے تو آپ کی توجہ ان باتوں کی طرف مرکوز ہو جائے گی فرض کیجئے کہ اس دوران میں گھڑی کا گھنٹہ بج جائے تو آپ کو اس کی آواز اس یکسوئی کے سبب سے سنائی نہیں دے گی آپ جس قدر دھیان دے کر میری باتیں سنیں گے اتنی ہی زیادہ میری یہ باتیں آپ کی سمجھ میں آئیں گی اور جتنی لگن سے میں آپ کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کروں گا اتنی ہی اچھی طرح میں اپنا مفہوم آپ کے سامنے واضح کر سکوں گا یا یوں کہیے کہ آپ کے دل و دماغ تک پہونچنے کی جو خواہش میرے دل و دماغ میں ہے اس کی تکمیل کے لئے میں جس قدر زیادہ محبت اور باہمی تفہیم (understanding.) کے جذبات پر اپنی طاقت کو مرکوز پاؤں گا اتنا ہی میں آپ کے نزدیک ہوتا جاؤں گا اور آپ میرے مفہوم کو اچھی طرح پا سکیں گے۔ یکسوئی کی طاقت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ علم حاصل ہو سکے گا کیونکہ علم و ہنر کے حاصل کرنے کا یہی اور صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ جوتوں پر پالش کرنے والا ادنے ترین شخص بھی اگر یکسوئی سے کام لے گا تو زیادہ اچھی طرح پالش کرے گا۔ باورچی پورے دھیان سے کھانا پکائے گا تو کھانا زیادہ اچھا بنے گا خواہ روپیہ کمانا ہو خواہ خدا کی عبادت کرنا مقصود ہو خواہ کوئی اور کام درپیش ہو جتنی یکسوئی سے کام لیا جائے گا تکمیلِ مقصد میں اتنی ہی زیادہ کامیابی ہوگی یہی ایک آواز ہے یہی ایک دستک ہے، جس سے فطرت کے دروازے ہم پر کھل جاتے ہیں اور ہمارے سامنے روشنی کا سیلاب رواں دواں ہو جاتا ہے علم کے خزانے کی واحد کنجی دل و دماغ کی یکسوئی ہی ہے۔ راج یوگ میں اسی طریقۂ یکسوئی کی تعلیم دی جاتی ہے ہماری روز مرہ کی عام زندگی میں ہماری توجہ بالعموم مرکز سے ہٹی ہوتی ہے اور اس طرح دماغی طاقتیں سینکڑوں قسم کے معاملات میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ یہ ہم سب کے تجربے اور مشاہدے کی بات ہے کہ جب بھی کبھی ہم اپنے خیالات کے جزر و مد کو ساکت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے دماغ کو کسی ایک علمی موضوع پر مرکوز کر دیں تو ہمارے دماغ میں سینکڑوں غیر مطلوبہ خواہشیں خود بخود ابھرنے لگتی ہیں۔ ہزاروں قسم کے خیالات دوڑ دوڑ کر ہمارے دماغوں میں آنے لگتے ہیں اور اس طرح دماغ منتشر ہو جاتا ہے اس انتشار کے عمل کو روکنے اور دماغ پر قابو پانے کا طریقہ ہی راج یوگ کا موضوع ہے۔ راج یوگی اسی طریقۂ کار کے ذریعہ خدا کو پالیتا ہے اب کرم یوگ کو لیجئے۔ اس سے مراد ہے کرم یا عمل کے ذریعہ خدا کو پانا ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جماعت میں اکثر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگے رہنا

چاہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے دل ودماغ صرف غور وفکر کے میدان میں مرکوز نہیں کئے جا سکتے۔ ان کو تو بس ٹھوس کام کرنے کا خیال ہوتا ہے ایسے لوگ دھیان گیان کے راستے سے شعور واحساس کے مقام سے آگے نہیں جا سکتے۔ کرم یوگ کام کرنے کا وہ راز ہے جس کی بدولت کرم یوگی کی بھی معرفت کے اعلےٰ مقامات تک رسائی ہو جاتی ہے جس طرح راج یوگ انسانی قوتوں کو یکجا کر کے خدا کو پانے کا علم ہے اسی طرح کرم یوگ صحیح طریقے سے کام سرانجام دے کر خدا تک پہونچنے کی سائینس ہے ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو اپنی طاقت کا صحیح استعمال کرنا نہیں جانتے جو اپنی طاقت کے بیشتر حصے کو متعدد چھوٹی چھوٹی باتوں میں لگا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ہمیں کام کرنے کا اصلی راز ہی نہیں معلوم ہے کرم یوگ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں کیا کام کہاں کرنا ہے اور کیونکر کرنا ہے اور کس طرح اپنی طاقتوں کو اپنے کام میں لاکر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسان ہر کام کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے دوسرے یہ کہ ہر کام اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ دُکھ بھی لاتا ہے کامیابی کی خوشی کے دامن میں بھی غم کی جھلک ہوتی ہے اور ناکامیابی تو دُکھ کا باعث ہوتی ہی ہے یہ دُکھ اس موہ یا لوث سے پیدا ہوتا ہے جو ہمیں اپنے کام کے ساتھ ہو جاتا ہے مثلاً جہاں میرے دل میں دوسروں کی بھلائی کے کام کرنے کا خیال پیدا ہوا وہیں دوسروں کی شکر گزاری کی اُمید اور اپنی عزت وشہرت کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ساتھ ناکامیابی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے مخالفت کا خوف بھی۔ اگر اوّل الذکر نوعیت کے جذبات غالب آجاتے ہیں تو میں کام کرنے لگتا ہوں اور اگر یہ سوچتا ہوں کہ نوّے فی صد لوگ تو ناشکر گزار ہوتے ہیں اور اگر مخالفت کے خوف سے گھبرا جاتا ہوں تو کام شروع ہی نہیں کر پاتا بہت سے لوگ اس قسم کے خیالات سے مغلوب ہو کر عموماً کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دُکھ اور تکلیف کے ڈر سے کام نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی طاقتوں کا صحیح استعمال نہیں ہو پاتا اور بہت حد تک یہ طاقتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کرم یوگ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کام محض کام کی غرض سے کرنا چاہیئے ہمارے کام میں کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہونا چاہیئے ہمیں اس بات کا ذرا بھی خیال نہ ہونا چاہیے کہ کس کی مدد کس لئے کی جا رہی ہے کرم یوگی کام اس لئے کرتا ہے کہ کام کرنا اس کی فطرت کا جزو بن گیا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی کام کرتے رہنے ہی میں ہے اس کے علاوہ اس کے کام کرنے کا کوئی اور مدعا یا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کام سے کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتا وہ تو اپنے کام کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے وہ تو صرف دینا چاہتا ہے اس کے دل میں لینے کا خیال پیدا ہی نہیں ہوتا وہ کچھ دے کر اس کے عوض میں کسی چیز کا متمنی نہیں اسی وجہ سے وہ دُکھ اور

مصیبت کی گرفت میں آنے سے بچ جاتا ہے کیونکہ تکلیف اور دُکھ تو انسان پر اسی حالت میں نازل ہوتے ہیں جب اس کے دل میں امید وبیم کے جذبات ہوتے ہیں کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اس کے نہ ملنے کا خوف۔ رنج وغم تو امید وبیم کا ردِ عمل ہیں اگر انسان موہ یا لوبھ کو دل سے نکال دے تو پھر اس میں دُکھ درد کا گزر ہی نہیں ہو سکتا۔

بھگتی یوگ کا مسلک تیسری قسم یعنی جذباتی لوگوں کے لئے ہے۔ پریمی (عاشق) عشق ومحبت کے جذبات کو مجسّم صُورت دے کر محبوبِ حقیقی کے قدموں میں پیش کرتا ہے پُوجا پاٹھ کی مختلف رسموں سے کام لیتا ہے وہ پھول اور خوشبوئیات بھینٹ چڑھاتا ہے خوبصُورت پرستش گاہیں بناتا ہے یا موجودہ مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے جاتا ہے۔ مندر، مسجد، گرجے جہاں کہیں اسے اپنے محبُوب کا کوئی نشان ملتا ہے اس کا سر سجدے میں جُھک جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کی تمام قوتوں کو خدائے تعالےٰ کے سپرد کر دیتا ہے شاید آپ ان سب باتوں کو فضول اور غلط سمجھتے ہونگے۔ لیکن میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ کبھی یہ بات نہ بھولئے کہ دُنیا کی بڑی بڑی رُوحانی ہستیاں وہیں پیدا ہوئی ہیں جہاں مذہبی رسوم وروایات نیز دیو مالا کی بہتات رہی ہے جس مذہب میں انسانی محبت اور جمالی تصورات کے اظہار کا سامان موجود ہے اُسی کے دامن سے وقتاً فوقتاً عظیم الشان رُوحانی ہستیاں اُٹھتی رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ دُنیا کے بڑے بڑے رُوحانی مشاہیر نے اُن مذہبی فرقوں میں جنم لیا ہے جن کے پاس دیو مالا اور پُوجا پاٹھ کی رسموں کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔ جن مت متانتروں نے کسی نشان یا پوجا پاٹھ کی رسُوم کے بغیر ایشور کو پُوجنے کی کوشش کی ہے انھوں نے انسان کے حسین اور بلند خیالات کو نہایت بیدردی کے ساتھ تباہ کر کے رکھ دیا ہے ان کا مذہب ایک نہایت خشک قسم کی چیز بن کر رہ گیا ہے جس میں رسم ورواج کی بے ضرر چیزوں کی جگہ خطرناک تعصب نے لے لی ہے اس سلسلے میں مجھے کوئی مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا کی تاریخ سے اس کی مستقل شہادت ملتی ہے میری تو آپ سے یہی درخواست ہے کہ آپ ان رسُوم اور ان دیو مالائی روائیتوں کی تضحیک نہ کیجئے۔ ان کی مذمت زبان پر نہ لائیے ان کی ہنسی اُڑانا آپ ایسے مہذب آدمیوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ ان باتوں کو نہ مانئے لیکن آپ کو ہر جگہ یہ بھی کہتے پھرنے کی ضرورت نہیں کہ "یہ لوگ احمق ہیں۔ ان کو ان چیزوں سے سر مارنے دیجئے" آپ ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ یہ لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں جتنا آپ ان کو سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ رُوحانیت کے بلند ترین مقامات پر پہونچنے والی ہستیاں انھیں شرعی رسم ورواج کی پیداوار ہیں۔ کم از کم میرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں جتنے عارف اور رُوحانی بزرگ دیکھے ہیں سب کے سب ضابطہ، رسم ورواج کے قائل تھے اور ان پابندیوں سے گزر کر آئے تھے۔ میں تو خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان

کے قدموں پر سر بھی رکھ سکوں چہ جائے کہ ان کے خلاف حرف گیری کروں۔ آخر ہمیں کسی کے خلاف نکتہ چینی کا حق ہی کیونکر حاصل ہوتا ہے کیا ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رسم و رواج کی پابندی یا دیومالا پر اعتقاد کا انسانی دماغ پر کیا عمل ہوتا ہے اور اگر ان معاملات میں ہمارا علم ہی محدود ہے تو ہم کیونکر بعض خیالات کو قبول کر کے دوسروں کو مسترد کر سکتے ہیں بات یہ ہے کہ کافی جواز کے بغیر ہمیں دُنیا کی ہر چیز پر نکتہ چینی کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے میں تو آپ سے بار بار یہی درخواست کروں گا کہ جن لوگوں کو دیومالا کی روایتوں اور رواج سے لگاؤ ہے آپ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ اگر وہ حسنِ فطرت کے راز ان ذرائع سے پا سکتے ہیں ان کی مدد سے نغمات الہام کی مسرّتوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ نشاطِ روح کی شراب سے سرشار ہو سکتے ہیں تو "آمین" کہئے۔ یہ مقام حرف گیری کا نہیں ہے یاد رکھئے کہ جذبات پرست طبائع حقیقت کی خشک توضیحات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتیں خدا کی ہستی اُن کی نگاہ میں ایک ایسی ہستی ہے جسے وہ محسوس کر سکتے ہیں۔ اُن کے لئے اس کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔ وہ اس محبوبِ حقیقی کو مجسّم بنا لیتے ہیں وہ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ہاتھوں سے چھوتے ہیں اور اپنی محبت کا تمام خزانہ اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ آخر ہمیں کیا حق ہے کہ ایسے خدا کو ہم اُن سے چھیننے کی کوشش کریں۔ اُن کے محبوب کو اُن کے پاس رہنے دیجئے اپنی معقولیت پسندی کو اُن پر زبردستی مت ٹھونسئے۔ آپ جس شخص کو معقولیت پسند کہتے ہیں وہ تو اُن کی نظر میں ایک ایسا احمق ہوتا ہے جو ایک خوبصورت اور نایاب مجسمے کو یہ دیکھنے کے لئے توڑ دیتا ہے کہ وہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ بھگتی یوگ جذبات پرست لوگوں کو محبوبِ حقیقی سے بے غرضانہ محبت کرنا سکھاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خدا سے محبت کرنا بجائے خود خوب ہے وہ نیکی کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ نیکی اپنا انعام آپ ہے بھگوان کے حقیقی بھگت دُنیا کی دھن دولت یا اولاد کی خاطر بھگوان سے پریم نہیں کرتے وہ اس کی پُوجا اس لئے نہیں کرتے کہ اس کے عوض انھیں جنّت میں جگہ حاصل ہو جائے ان کے لئے تو محبّت ہی خود اپنا بلند ترین صلہ ہے۔ خدا خود ہی محبّت ہے۔ بھگتی یوگ کی تعلیم یہ ہے کہ بھگت جس نام سے چاہے بھگوان کو پُکارے۔ اس سے سچا پریم کرے جس صفت سے چاہے اس سے متّاصف کرے اس سے محبت کرے وہ اسے خالق قرار دے حاضر کُل کہے۔ ناظر کُل کے نام سے موسوم کرے اُسے حکمران مطلق کہے۔ باپ کہے ماں کہے، خدا سب کچھ ہے لیکن بھگتی یوگ کے مُطابق خدا کا بلند ترین تصوّر جو انسان کے ذہن میں آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا محبوبِ مُطلق ہے۔ جہاں محبّت ہے جہاں پریم ہے وہیں خُدا بھی ہے۔ محبّت کا اظہار جہاں کہیں بھی اور جس کسی بھی صُورت ہو خُدا کے وجود کا اظہار ہوتا ہے۔ خاوند اپنی بیوی کا بوسہ لیتا ہے تو خدا اس بوسے کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ ماں بچّے کے مکھڑے کو چومتی ہے تو اس کے پیار میں خدا ہی کا جلوہ ہوتا ہے دو دوست ملتے ہیں یا آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں تو ان کے تپاک میں بھی وہ خُدائے محبت موجود ہوتا ہے

اسی طرح جب کوئی شخص حقیقی فلاح عام کا کام کرتا ہے تو خود خدائے تعالیٰ ہی نیک کاموں کی صورت میں آشکار ہوتا ہے۔ اس کا جذبۂ محبّت ہی بنی نوع انسان پر اپنے الطاف و کرم کی آزادانہ بارش کرتا ہوتا ہے۔

~~یہ ہے بھگتی یوگ کی تعلیم یہ ہے~~ مسلک عشق کا اصل اصول اب مجھے عالمگیر مذہب کے چوتھے عنصر یعنی گیان یوگ کا ذکر کرنا ہے گیان یوگی یا سچا فلاسفر اور مفکر وہ ہے جو اس عالمِ شہود کی حدود سے بھی آگے نکل جانا چاہتا ہے یہی وہ انسان ہے جس کا دِل دُنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے آسودہ نہیں وہ روزمرہ کے معمول یعنی کھانے پینے اور اس طرح کے دُوسرے تمام مشاغل میں مصروف رہنے پر اکتفا نہیں کرتا اس کی زندگی کا نصب العین ان سے بہت دُور نکل جاتا ہے۔ ہزاروں علم حاصِل کر لینے پر بھی اس کی سیری ممکن نہیں ہوتی ایک جہاں نہیں کائنات کے لاکھوں اور کروروں نظام اس کے بس میں ہوں تو بھی اس کی تسلّی ممکن نہیں یہ سارے نظام تو اس کی نگاہ میں بالکل ایسے ہیں جیسے اِس عالم وجُود کے سمندر میں ایک قطرہ اُس کی رُوح اس تمام دنیائے آب و گل کے ماوراء قلبِ وجُود کے اندر سرایت کر جانا چاہتی ہے۔ وہ حقیقت کو اس کی اصلی صُورت میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہے وہ حقیقت کا احساس اور انکشاف اپنی ذات میں کرنا چاہتی ہے من و تو کا فرق مٹا کر وحدت الوجود کا احساس بن جانا چاہتی ہے۔ ایسے یوگی کی رُوحانی پیاس اسوقت بجھتی ہے جب اس کی رُوح رُوحِ اعظم سے واصل ہو جاتی ہے۔ ایسے یوگی کی تسلّی بس اسی حالت میں ہوتی ہے جب اس کی نجی ہستی حقیقت سے ایک ہو جاتی ہے ایسے یوگی کی نگاہ میں خُدا کو باپ یا ماں یا خالقِ کائنات یا محافظ اور رہنما کے رُوپ میں دیکھنا حقیقت کو محدود کرنے کے برابر ہے اس قسم کے تصوّرات اس ہستی مُطلق کو بیان کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اس کی نظر میں خدا اس کی زندگی کا اصلی جوہر ہے اس کی رُوح کی رُوح ہے خود اس کی ذات ہی خُدا ہے۔ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں اس کی ہستی کے تمام فانی اجزا فلسفہ اور گیان کی ضرب سے پاش پاش ہو کر کالعدم ہو جاتے ہیں اور باقی بس خود خُدا کی ذات رہ جاتی ہے۔

گیان یوگ کے اس فلسفے کو ہمارے یہاں ایک مثال سے یوں واضح کیا گیا ہے۔ ایک درخت پر دو پرندے بیٹھے ہیں ایک پرندہ درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہے اور دوسرا نیچے کی شاخ پر چوٹی کا پرندہ چپ چاپ اپنے آپ میں مست بیٹھا ہے اس کے چہرے سے ایک خاص دبدبہ اور رعب ٹپک رہا ہے دُوسرا پرندہ اِدھر اُدھر پھُدک کر پھل کھا رہا ہے کبھی کوئی میٹھا پھل اس کے کھانے میں آ جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور کبھی کڑوا پھل کھا لیتا ہے تو وہ اسکے ذائقہ کو خراب کر دیتا ہے اس کی طبیعت آزردہ ہو جاتی ہے ایک دن وہ ایک نہایت کڑوا پھل کھا لیتا ہے اور اپنی زندگی سے بے زار ہو کر چوٹی کے پرندے کی طرف دیکھنے لگتا ہے کہ وہ کس اطمینان اور سکون کے ساتھ مزے میں بیٹھا ہے نہ اس کو میٹھے پھل کھانے شوق ہے نہ کڑوے

پھل کھانے کا خوف وہ اپنے سنہری پنکھوں کے نور میں غلطاں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے اسے نہ خوشی کی فکر ہے نہ غم کا ڈر بس خاموش اور متین اپنی ہی ذات میں محو بیٹھا ہے جیسے اس کو اپنی ذات سے ماورا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یہ دیکھ کر نیچے والے پرندے کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جائے جس میں اُوپر والا پرندہ محو ہے۔ اس خواہش کے تحت وہ تھوڑا اُوپر کی جانب اُٹھتا ہے لیکن اس کی یہ خواہش دیرپا نہیں ثابت ہوتی۔ پھر جھٹ سے پھل کھانے کا شوق اس پر غالب آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک بے حد کڑوا پھل اس کے مُنہ میں آجاتا ہے جس سے اس کو سخت اذیت پہونچتی ہے وہ پھر اُوپر والے پرندے کی جانب حیرت سے دیکھنے لگتا ہے اور اس کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتا ہے اب کے بار پھر تھوڑی دور جا کر رُک جاتا ہے اور اسی طرح وہ بار بار اُوپر کی جانب اُٹھتا جاتا ہے حتّٰی کہ وہ چوٹی والے خوبصورت پرندے کے انتہائی قریب پہونچ جاتا ہے جہاں جا کر وہ کیا دیکھتا ہے کہ اسی پرندے کے پروں سے ایک نور کی شعاعیں نکل نکل کر خود اسکے اپنے جسم کے گرد گھیرا ڈال رہی ہیں۔ اس کو اپنے آپ میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس ہونے لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کا جسم بس پگھل رہا ہے پھر وہ اُوپر والے پرندے کے اور بھی قریب آجاتا ہے اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز پگھل جاتی ہے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس کی اپنی کبھی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ وہ اور اُوپر والا پرندہ دونوں دراصل ایک ہیں وہ تو چوٹی والے پرندے کا محض عکس تھا۔ یہ سایہ جو بظاہر مجسّم نظر آتا تھا اسے وہ غلطی سے اپنا علیحدہ وجود سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ میٹھے اور کھٹے پھلوں کا کھانا یہ نچلی شاخوں پر بیٹھ کر رونا یا ہنسنا محض ایک وہم باطل ایک خواب تھا حقیقت تھی تو اس چوٹی والے پرندے کی جو خاموش اور مست بیٹھا تھا جس پر اس تمام دوران میں سکون کی کیفیت طاری تھی جس کے خد و خال سے شکوہ و جلال ٹپک رہا تھا جس کے پاس رنج و ملال پھٹک نہیں پاتا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس مثال میں چوٹی والے پرندے سے مراد ہے خُدا اس عالم کائنات کا آقا اور مالک اور نچلی سطح پر بیٹھنے والے پرندے سے مُراد ہے انسانی رُوح (جیو) جو دُنیا کے میٹھے اور کڑوے پھل کھا رہی ہے جب کبھی اس کے دل پر کوئی بڑی چوٹ لگتی ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے پھلوں کا کھانا ترک کر دیتی ہے اور رنج و غم سے گھبرا کر ایسی زندگی کا خیال کرنے لگتی ہے جس میں ابدی سکون اور مُسرّت ہو وہ خود کو بھول کر اس باکمال ہستی کے متعلق سوچنے لگتی ہے جس کا پُر جلال تصور تو اس کے دماغ میں ہے لیکن جس کی حقیقت سے وہ ابھی واقف نہیں ہے اور ایسی حالت میں جب رُوح کا رُخ خدا کی نامعلوم ہستی کی طرف ہو جاتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اسکے گرد و پیش نور کا ایک سیلاب عظیم اُمڈ رہا ہے اس کو یہ تمام دُنیا محض ایک بے مصرف سا تماشا نظر آنے لگتی ہے لیکن یہ حالت دیر تک قائم

نہیں رہتی جلد ہی حواس اس کو اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں اور وہ پہلے ہی کی طرح دُنیا کے میٹھے اور کھٹے پھل کھانے لگتی ہے جب کبھی پھر اس کو کوئی سخت صدمہ پہونچتا ہے تو پھر اس کے دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کو یزدانی روشنی نظر آنے لگتی ہے اس طرح وہ رفتہ رفتہ خُدا کے قریب پہونچ جاتی ہے اور جتنی جتنی اس کی رسائی خدا کے قریب ہوتی جاتی ہے اتنی اتنی خود اس کی ذاتی ہستی مٹتی جاتی ہے جب وہ اس کے بالکل قریب پہونچ جاتی ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی اور خدا کی ہستی میں کوئی فرق ہی نہیں۔ اس منزل پر پہونچ کر وہ خوشی کا نعرہ لگاتی اور اعلان کرتی ہے کہ جس ہستی کے متعلق میں نے سُنا تھا کہ وہ اس عالم کائنات کی روحِ رواں ہے جس کے نور سے کائنات کے بے شمار سورج اور چاند روشن ہیں جس کی چمک ذرّے ذرّے میں بس رہی ہے وہی خود ہماری زندگی کی بنا اور ہماری رُوح کی رُوح ہے بلکہ ہمہ اوست ہے۔ یہ ہے تعلیم گیان یوگ کی۔ انسان کی ہستی بنیادی طور پر ربانی ہستی ہے حقیقت ہے تو بس ایک ہے۔ خُدا اور بندہ دونوں کی دو علیحدہ علیحدہ ہستیاں نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بذات خود وہ ربِّ مطلق۔ وہ پرماتما ہے جس کا ظہور صفحۂ ارض پر ہو رہا ہے۔ ہمارے پاؤں تلے رینگنے والے ادنےٰ ترین کیڑے سے لے کر اُن بلند پایہ ہستیوں تک جن کے رعب جلال۔ جن کی عظمت اور شان و شوکت کے سامنے ہم سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ان سب میں اسی ایک ایشور اُسی خداوند تعالےٰ کا جلوہ ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ زندگی واحد الوجُود ہے۔

میں نے چار مختلف رُوحانی راستوں کا ذکر کیا ہے آپ اپنی طبیعت اپنے رُجحان کے مطابق اپنا راستہ خود منتخب کر سکتے ہیں لیکن جو راستہ بھی آپ اختیار کریں اس پر پُورا عمل کرنا ہو گا۔ ان مختلف قسم کے یوگوں کی عملی مزاولت بہت ضروری ہے۔ صرف ان کے اُصولوں کو جان لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ روحانی زندگی کا پہلا قدم یہ ہے کہ ان اُصولوں کا ذکر سُنا جائے اور پھر ان کو سمجھنے کیلئے ان پر غور کیا جائے اس کے لئے ہمیں عقل و دلیل سے پورا کام لینا ہو گا تاکہ انھیں اپنے دلوں پر نقش کر لیا جائے اس کے بعد ہمیں ان پر دھیان لگانا ہو گا تاکہ ہم ان کا عرفان حاصل کر لیں۔ اور یہ خیالات ہماری رگ رگ میں سما جائیں۔

تو یہ تھا بیان ان مختصر عناصر کا جو ایک عالمگیر مذہب میں ہونے چاہئیں تاکہ اپنے اپنے ارتقائی مرحلے کے مُطابق ہر شخص اپنی پسند کا راستہ اختیار کر لے۔ گیان یوگ۔ بھگتی یوگ۔ راجیہ یوگ۔ یا کرم یوگ تو طریقۂ عمل کے اصطلاحی نام ہیں۔ میں کسی خاص مذہب کا پرچار نہیں کر رہا ہوں۔ اگر کسی مذہب کو ہمہ گیر ہونا ہے تو اس میں انسان کے ارتقائی مدارج کے لئے گنجائش پیدا کرنا ہو گی لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ مذہبی اُصولوں کو عملی جامہ پہنائے بغیر رُوحانیت کا حاصِل ہونا ممکن نہیں۔ اس مقام

پر پہونچ کر مذہب عملی صورت اختیار کرلیتا ہے وہ محض عقلی نظریوں کا سلسلہ نہیں رہتا۔ مذہبی اور رُوحانی اصُولوں کو محض ذہنی طور پر تسلیم کرنا کافی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہماری ذات میں واصِل ہوجاتے ہیں۔

عقل وخرد کے فیصلوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دلیل اور منطق کی رُو سے جس چیز کو آج ہم قبول اور تسلیم کرتے ہیں کل دوسری دلائل کے تحت اسی سے منکر بھی ہو جاتے ہیں یہی نہیں بلکہ بسا اوقات کل کی باتوں کو احمقانہ قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے ہمیں عقل اور ذہن سے کام ضرور لینا ہے لیکن یاد رہے کہ عقل کے فیصلے اٹل نہیں ہوتے۔ ان میں تغیر کا ہونا لازمی ہے عقل وخرد کام ہی تغیر کی سطح پر کرتی ہیں لیکن سچے مذہب کے بُنیادی اُصولوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ان ابدی اُصولوں کو عملی طور پر اپنانا ہی سچی رُوحانیت ہے۔ مذہب خالی باتیں بنانے کا نام نہیں رُوحانیت کسی خاص نظریئے کو تسلیم کرنے سے حاصل نہیں ہوتی خواہ وہ نظریہ کتنا ہی تسلی بخش کیوں نہ ہو مذہب انکشافِ ذات کا دوسرا نام ہے۔ رُوحانیت عرفان کے مترادف ہے۔ مذہب اور رُوحانیت کی راہِ عمل میں سُننے سنانے سے کام نہیں چلتا یہاں تو سوال زندگی کا رُخ بدل دینے کا خودی سے خُدا بننے کا ہے اگر آپ کو مذہب اور رُوحانیت مطلوب ہے، تو اس شاہراہِ عمل پر گامزن ہونا پڑے گا۔ اپنے ایمان کو مجسّم بنانا ہوگا۔ عمل ہی مذہب ہے باقی سب باتیں ہی باتیں ہیں۔

پارلیمنٹ آف ریلیجنز (مجلسِ مذاہب)

شکاگو میں خطبۂ استقبالیہ کا جواب

۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء

۱۲/۱/۸۳

امریکی بہنو اور بھائیو۔

جس گرم جوشی اور محبت سے آپ نے ہم سب کا استقبال کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے جو انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں دنیا کے قدیم ترین سنیاسیوں کی جماعت کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں اس دیش کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جہاں مذہب کا جنم ہوا اور میں وہاں کے کروڑوں ہندوؤں کی طرف سے بھی آپ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، میں اُن مقررون کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مجھ سے پہلے اپنی تقریروں میں ہم مشرقی نمائندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب اس کانفرنس سے اپنے اپنے دُور دراز ملکوں میں صلح و آشتی اور رواداری کا پیغام لے کر جائیں گے۔ اس سلسلے میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کر رہا ہوں جس نے نہ صرف تمام دنیا کو صلح و آشتی کا سبق دیا ہے بلکہ ہمیشہ دنیا کے سب مذاہب کو اصولاً اور عملاً اپنایا ہے، مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں اس قوم کا فرد ہوں جس نے ہر مذہب و ملت کے ستم زدہ پناہ گزینوں کو اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ جب روم کے مطلق العنان حکمرانوں نے عزرائیل قوم کی متبرک عبادت گاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جب اس قدیم قوم کی تہذیب کے علمبردار روم کے مظالم سے بھاگ کر ہندوستان آئے تو ہم نے اُنہیں گلے لگا کر اپنے یہاں جگہ دی یہ ہمارا ہی مذہب اور ہماری ہی قوم تھی جس نے زرتشت کے خوددار پیروؤں کو اس طرح اپنایا کہ وہ آج تک اپنے مذہب اور اپنی روایات پر چلتے ہوئے ہماری قوم کا ایک شاندار جزو بن گئے ہیں۔ دوسروں

کو اپنانا تو ہماری گھٹّی میں پڑا ہے۔ میرے بھائیو میں آپ کے سامنے ایک پرارتھنا کا چھوٹا سا حصّہ پیش کرتا ہوں جسے میں پچیس سال سے دہراتا چلا آیا ہوں اور جسے میری طرح میرے کروڑوں ہم مذہب ہر روز دُہراتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا میرا مذہب کیا ہے۔

"میرے خدا جس طرح مختلف ندیاں اپنے اپنے منبع سے نکل کر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی آخر کار سمندر میں آ کر گھُل مل جاتی ہیں اسی طرح وہ تمام رستے جو مختلف مذہبوں اور قوموں کے لوگ اپنی اپنی پسند یا روایت کے مطابق اختیار کر لیتے ہیں سب آخر تجھ ہی تک پہنچ جاتے ہیں خواہ وہ دیکھنے میں کتنے ہی عجیب و غریب اور اُلٹے سیدھے نظر آئیں"۔

ہماری یہ معتبر کانفرنس خود اس عالمگیر اصُول کی تصدیق کرتی ہے جس کا اعلان ہزاروں برس پہلے گیتا نے ان الفاظ میں کیا تھا:۔

"جو کوئی بھی میری شرن میں آتا ہے میں یقیناً اُس تک پہنچتا ہوں۔ تم جس صورت میں مجھے تلاش کرو گے میں اُسی صورت میں تمہیں ملوں گا۔ سب انسان مجھ تک آنے میں کوشاں ہیں اور آخر کار آ بھی پہنچیں گے کیونکہ میں ہی سب رستوں کی منزل ہوں[1]"۔

جماعت بندی، کینہ پروری، بُغض وعناد، مذہبی تعصب نے دنیا پر صدیوں سے تسلط جما رکھا ہے، اِن کی بدولت بارہا فساد ہوئے، جنگ وجدل تک نوبت آئی، انسان کے خون سے زمین لال ہوئی کئی قومیں تباہ ہو گئیں اور اُن کی تہذیب کا نام ونشان تک مٹ گیا اگر اُن شیطانی طاقتوں نے ہماری سوسائٹی پر غلبہ نہ پایا ہوتا تو ہماری تہذیب ارتقار کی کئی اور منزلیں طے کر چکی ہوتی، لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اِن شیطانی طاقتوں کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے، مجھے پوری امید ہے بلکہ یقین ہے کہ گھنٹوں کی جس میٹھی اور سُریلی آواز سے اِس کانفرنس کا آغاز ہوا وہی آواز ایک نعرہ بن کر تعصب اور کینہ پروری کی موت کا اعلان کرے گی۔ خواہ وہ تعصب تلوار کے زور پر قائم ہو یا قلم کے بل بوتے پر، اگر ہم سب یہ سمجھ لیں کہ ہم ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں تو ہمارے سماجی اور سیاسی نظام میں تعصب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی، تمام تفرقات مٹ جاتے ہیں۔ بُغض وعناد ختم ہو جاتا ہے اور ہم سب ایک دُوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

ابھی[2] ابھی جو آپ نے بلیغ اور شاندار تقریر سُنی اس میں مقرّر نے ہم سے پُر زور اپیل کرتے ہوئے

---

[1] میانِ کعبہ و بت خانہ ہیچ فرقے نیست۔ بہر طرف کہ نظر می کُنی برابر اوست۔ [2] اگلے صفحہ پر

کہا" آؤ ہم ایک دُوسرے کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیں"میں یہ کہوں گا کہ آؤ ہم سوچیں کہ ہمارے آپس کے تفرقات پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں، اُن کی اصل ہی کیا ہے؟ اُن سب کا باعث ہماری لاعلمی اور جہالت ہے" میں آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سُناتا ہوں جس سے میری بات واضح ہو جائے گی۔ ایک تھا کنویں کا مینڈک وہ جنم سے وہیں رہتا آیا تھا۔ ایک دن کی بات ہے ایک اور مینڈک وہاں آنکلا۔ یہ مینڈک سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ کنویں کے مینڈک نے پوچھا" بھئی کہاں سے آنا ہوا؟" اُس نے جواب دیا" سمندر سے آیا ہوں" کنویں کے مینڈک نے کنویں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھلانگ لگائی، اور کہا" سمندر؟ کیا وہ میرے اس کنویں سے بڑا ہے؟" سمندر کا مینڈک مُسکرا کر بولا" بھئی کہاں سمندر اور کہاں تمہارا کنواں؟ ان دونوں میں مقابلہ ہو ہی کیا سکتا ہے؟" کنویں کے مینڈک نے ایک اور چھلانگ لگائی اور کہا اچھا تو کیا تمہارا سمندر اتنا بڑا ہے؟" سمندر کے مینڈک نے کہا" ارے بھائی تم بھی کیا بے عقلی کی بات کرتے ہو، میں کہہ تو رہا ہوں کہ سمندر اور کنویں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں" کنویں کا مینڈک اکڑ کر بولا" تو تم جھوٹ کہتے ہو، چلو یہاں سے چلتے بنو، میرے اِس کنویں سے کوئی شے بڑی نہیں ہو سکتی"

غور سے دیکھا جائے تو ہم سب اپنے اپنے کنویں کے مینڈک ہیں۔ میں ہندو ہوں میں اپنے کنویں میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہوں کہ تمام کائنات میری اس چھوٹی سی دُنیا میں بسی ہے" اسی طرح عیسائی اور مسلمان بھی اپنے اپنے کنویں پر ہی تمام عالم کا دار و مدار سمجھنے لگتے ہیں اب آپ خود ہی بتایئے کہ ہمارے تفرقات کی بنیاد لاعلمی اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟[۵]

میرے امریکی بھائیو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہم سب کو یکجا کر کے عالمی یک جہتی کی طرف ایک زبردست قدم اُٹھایا ہے اور اُن دیواروں کو جو ہمارے درمیان حائل ہو رہی ہیں مٹانے کی ایک قابلِ قدر کوشش کی ہے میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی اس کوشش کو کامیاب بنایئے۔

15/1/88

پچھلے صفحہ کا حاشیہ:۔ سوامی جی نے یہ چھوٹی سی تقریر ۱۵ استمبر ۱۸۹۳ء کے دن کی لیکن چونکہ اس کا موضوع وہی ہے جو اُن کی پہلی تقریر کا تھا۔ اس لئے میں نے اسے پہلی تقریر سے ملا دیا ہے۔

[۵] جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ✤ چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ہندو دھرم

یہ لیکچر پارلیمنٹ آف ریلیجنز شکاگو میں ۱۹ ستمبر سنہ ۹۳ء کو پڑھا گیا

دُنیا میں تین ایسے مذہب ہیں جو ابتدائے تاریخ سے بھی پہلے چلے آتے ہیں ۔ یہ مذہب ہیں ہندو مت، زرتشت کا مذہب، اور یہودیوں کا مذہب، اِن تینوں مذہبوں کو گذشتہ صدیوں کے دوران میں کئی بار دھکے لگے ہیں لیکن اُن میں کوئی ایسی اندرُونی طاقت ہے جس نے اُنہیں آج تک بچائے رکھا لیکن یہوُدی مت عیسائیت کو اپنے میں جذب کرنے سے قاصر رہا اور عیسائی مذہب نے اُسے اپنی جنم بھُومی ہی سے نکال دیا اِسی طرح زرتشت کے شاندار مذہب کے نام لیوا بھی صرف چند پارسی رہ گئے ہیں ۔ مگر ہندو مت آج تک اپنی پوُری شان سے زندہ ہے ۔ ہندوستان کی سرزمین سے ہزاروں مذہبی فرقے اُٹھے اور کئی بار تو ویدک دھرم کی بنیادیں تک ہل گئیں لیکن آخر کار سب فرقے اِسی میں سما گئے جیسے کہ زبردست بھونچال آنے پر کچھ دیر کے لئے سمندر کی لہریں پیچھے ہٹ جاتی ہیں لیکن جلد ہی اپنی پوُری طاقت اور عظمت کے ساتھ واپس آجاتی ہیں ویسے ہی ویدک دھرم بھی ہر مذہبی زلزلے کے بعد ایک نئی شان اور نئی طاقت لئے بار بار نمودار ہوتا رہا اس طرح نہ جانے کتنے فرقے اِس پُرانے مذہب میں جذب ہو کر اسی کا جزو بن گئے ۔ یہ ہندو مت کی ہمہ گیر جامعیت ہی کی شان ہے کہ جہاں اس میں فلسفہ ویدانت کی فلک شگاف رُوحانی بلندیاں رُونما ہیں وہاں بُت پرستی کی پستیاں بھی موجود ہیں خدا کے اقرار و انکار سے بالا بدھ مت جہاں اِس مذہب کا جزو بن گیا ہے وہاں خدا کی ہستی سے مُنکر جین مت بھی اس مذہب میں شامل ہو گیا ہے جہاں علم و ہُنر کے وہ خزانے بھرے ہیں جن کا پتہ سائنس کی تمام معلومات بھی پُوری طرح دینے سے قاصر ہیں ۔ وہاں مائتھالوجی کی ایسی کہانیاں

ل Mythology دیو مالا

بھی موجود ہیں جنہیں عقلِ سلیم ماننے کے لئے تیار نہیں۔

تو آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس مذہب کا کوئی مرکز ہے جہاں یہ تمام فطرات ملتے ہیں؟ ہندو مت میں وہ کیا ایسی چیز ہے جو اِن تمام مختلف نظریوں کو یکجا کرتی ہے جو بظاہر ایک دُوسرے کو قطع کرتے دکھائی دیتے ہیں؟ یا یوں کہیئے کہ ہندو مت کے بنیادی اُصول کیا ہیں؟ آج میں اِس سوال کا جواب آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہندوؤں کا مذہب الہامی مذہب ہے۔ اِس الہام کا نام "وید" ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ "وید" لازوال اور ابدی حقیقت ہے۔ اِس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ آپ سمجھتے ہوں گے میں یہ کیسی بے تکی بات کر رہا ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کتاب کا نہ آغاز ہو نہ انجام۔ بات دراصل یہ ہے کہ ویدوں سے ہندوؤں کا مطلب محض وہ کتابیں نہیں جو اس نام سے مشہور ہیں؛ ویدوں کے معنی ہیں وہ تمام رُوحانی اُصول جو مختلف وقتوں میں مختلف رُوحانی ہستیوں نے دریافت کئے، جیسے کہ کششِ ارضی کا اُصول[1] نیوٹن کی دریافت کرنے سے پہلے بھی تھا اور اگر دُنیا پھر اِس اُصول کو بھول جائے تو بھی یہ اُصول ویسے کا ویسا ہی اٹل رہے گا، اسی طرح عالمِ رُوحانی کے اُصول بھی ازلی ہیں، رُوحوں کے آپس کے اخلاقی اور رُوحانی تعلقات اور پھر ان رُوحوں اور رُوحِ اعظم کے تعلقات ہمیشہ سے موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے[2] ہمیں ان تعلقات کا علم ہو یا نہ ہو، ہندوؤں کی مُراد ویدوں سے یہی وہ لازوال اور ابدی رُوحانی اصول ہیں۔

ہندو اِن اُصولوں کو دریافت کرنے والی ہستیوں کو رشی کے نام سے پکارتے ہیں اور اِن تمام ہستیوں کی سچے دل سے عزت کرتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ اُن کی پُوجا کرتے ہیں، مجھے اس کانفرنس کو جہاں عورتیں کافی تعداد میں موجود ہیں یہ بتاتے ہوئے بہت خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رشیوں میں بہت سی عورتیں بھی شامل ہیں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رُوحانی اصول لافانی سہی لیکن آخر کبھی تو اُن کی ابتدا ہوئی ہو گی کسی نے تو انہیں بنایا ہو گا۔ ویدوں کے مطابق کائنات کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ آج کل سائنس نے ثابت کر دیا ہے کائناتی انرجی (Universal Energy) کا حاصل ہمیشہ ایک رہتا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ناممکن ہے کہ کبھی کچھ بھی موجود نہ ہوا اور پھر یہ تمام عالم ظہور وجود میں آجائے۔ نیست سے ہست پیدا نہیں ہو سکتا بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تمام کائنات خدا کی ہستی میں ایک پوشیدہ قوت[3] کی صورت میں تھی۔ اگر اُسے سچ مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا کبھی مضمر ہوتا ہے اور کبھی آشکار کبھی خوابیدہ اور کبھی بیدار کبھی ساکن اور کبھی محرک

---

[2] ماجرائے من و معشوق مرا پایاں نیست ✽ ہرچہ آغاز نہ دارد نپذیرد انجام،

[1] Law of gravitation. [3] Potential.

کبھی چھوٹے سے بیج کی صورت میں مخفی طاقت اور کبھی شاخ و شجر کی شکل میں ظاہر عظمت یعنی کہ خُدا کی کبھی قوت پوشیدہ (potential) کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی ظاہر (Kinetic) اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا کی صورت بدل سکتی ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر خدا لازوال نہیں، ہر چیز جو تغیر پذیر ہے وہ دو یا زیادہ جُز دُوں سے مل کر بنتی ہے۔ اور ہر ایسی شے کے جزو ایک نہ ایک دن علیحدہ ہو جاتے ہیں اور ہم اس تغیر کو موت کا نام دیتے ہیں۔ اگر یہ دلیل ٹھیک ہے اور اگر خدا کی صورت بدل سکتی ہے یعنی کبھی پوشیدہ (potential) اور کبھی ظاہر (Kinetic) ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک دن خُدا کی بھی موت ہو جائیگی اور یہ بالکل بے تکی اور بے معنی بات ہے۔ اس لئے ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا[ا] یا یوں کہیئے کہ خدا اور اس کی دُنیا، خالق اور تخلیق دو متوازی لکیریں ہیں جو ہمیشہ ایک دُوسرے کے مقابل رہی ہیں اور رہیں گی، خدا ایک دائمی طاقت ہے جس کی بدولت جہان در جہان ظہور میں آتے ہیں، پردۂ غیب میں چھُپ جاتے ہیں اور پھر نمودار ہو جاتے ہیں اس خیال کو ہمارے یہاں ایک پرارتھنا میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ "چاند اور سُورج کو خالق نے پہلے یُگوں (time-cycles) کے چاند اور سُورج کی طرح تخلیق کیا ہے"

یہ ہے ہندو دھرم کا پہلا اصول۔ دُوسرا اصول یہ ہے کہ آدمی محض حواس خمسہ کا ایک مجموعہ نہیں ہے، جسم مر کھپ جاتا ہے لیکن رُوح لافانی ہے۔ دیکھئے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اگر میں اپنی آنکھیں بند کر لوں اور سوچوں کہ میں کیا ہوں تو سب سے پہلے مجھے اپنے جسم کا خیال آئے گا۔ تو کیا میں محض ہڈّی اور ماس کا پُتلا ہوں۔ اور اس کے علاوہ میری کوئی حقیقت نہیں، وید اعلان کرتے ہیں کہ میں فقط جسم نہیں ہوں میں اس مادّی جسم میں ایک زندۂ جاوید رُوح ہوں، جسم ایک دن مرجائے گا لیکن میں ازلی اور لافانی ہوں۔ نہ میری تخلیق ہوئی ہے نہ میری تخریب ہو سکتی ہے ماضی بھی میرا ہے حال اور مستقبل بھی میرا۔ مکان و زمان مجھ میں ہے میں اُن سے محدود نہیں۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ رُوح کی تخلیق ہوئی تو پھر اُس کی موت بھی لازمی ہے کیونکہ

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہیں اجزار کا پریشاں ہونا

اور اگر رُوح بھی فانی ہے اور کائنات محض مادّی اجزاء کے یکجا ہونے اور بکھرنے کا نام ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کچھ لوگ خوشی اور مسرت کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جسمانی صحت اور خوب صُورتی اُن کے

ا In that case God is sometimes potential and sometimes Kinetic which would make Him mutable. Everything mutable is a compound and everything compound must undergo that change which we call destruction. So God would die which is absurd. Therefore there never was a time when there was no creation.

حصّے میں آتی ہے وہ دماغی قوت سے مالامال ہوتے ہیں اور اُن کی ضرورت، ہر خواہش پوری ہوتی رہتی ہے اور کچھ لوگ رنج والم لئے اس دُنیا میں آتے ہیں، اُن کی ساری عمر مصیبتیں جھیلتے کٹتی ہے اور وہ جسمانی صحت سے محروم۔ دماغی توازن سے عاری، مفلسی اور غریبی کے دن کاٹتے ہیں۔

کیا فلسفۂ مادّیات کے پاس اِس سوال کا جواب ہے؟ کیا ایک رحیم و کریم خالق اس ناانصافی کو برداشت کرسکتا ہے؟ اگر خدا ہم سب کی تخلیق کرتا ہے تو آدمی آدمی میں یہ فرق کیا؟ یہ کوئی تسلّی بخش جواب نہیں کہ جو لوگ یہاں مُصیبت اور دُکھ کی زندگی کاٹتے ہیں اگلی دُنیا میں سُکھ چین پائیں گے، آخر ایک رحیم خالق کی کائنات میں یہ کیوں ضروری ہے کہ آدمی اس دُنیا میں دُکھ سہے تاکہ دُوسری دُنیا میں آرام پائے، یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ ایسا خالق جس کی دنیا میں یہ سب ناانصافی جائز ہے ایک مطلق العنان ہستی ہے جو اپنی من مانی کرتا ہے یا یہ ماننا پڑے گا کہ خالق و تخلیق کا نظریہ ہماری تسلی کے لئے ناکافی ہے اور دنیاوی غمی اور خوشی آرام اور مصیبت کا سبب کچھ اور ہی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ سبب آدمی کی پیدائش سے پہلے وجود میں آتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس جنم سے پہلے بھی ہماری کوئی زندگی تھی جس کا اثر ہم پھر اس دنیا میں لے آئے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِس نظریہ کی چنداں ضرورت نہیں، آدمی کے جسمانی اور دماغی رُجحان اُسے اپنے آبا واجداد سے ورثے میں ملتے ہیں لیکن آپ سوچیں تو یہ وضاحت کہاں تک تسلّی بخش ہے، ہمارے سامنے جسمانی اور دماغی وجود کی اپنی اپنی ہستی موجود ہے ہم اپنے تجربے کی بنا پر یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ہماری دماغی زندگی مادّی اجزا سے ہی پیدا ہوئی۔ اگر ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری قوتِ خیال، ہماری تخلیق و اختراع کی طاقت، ہماری سوال پوچھنے کی عادت، ہماری قدریں، ہمارے احساسات و جذبات، سب کے سب مادّی ہیں تو شاید مادیات کا نظریہ ہی ہمارے سب عُقدے حل کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہے، مجبوراً ہمیں مادّیات سے اُوپر اٹھنا پڑتا ہے اور ایک ایسی چیز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جس سے مادّی اور غیر مادّی دونوں اجزا وجود میں آئے جیسے سائنس داں مادّی اشیا کی اصل تک پہنچنے کے لئے ایک بنیادی جُزو کی تلاش کرتا ہے جس سے سب چیزیں مرکب ہیں اسی طرح فلسفی کو بھی اس چیز کی ضرورت پڑتی ہے جس میں مادّی اور غیر مادّی دونوں جزو سما سکیں اس دلیل کی بنا پر وحدت الوجود کا نظریہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن میں محض دلیل سے کام نہیں لینا چاہتا مجھے اس سے انکار نہیں کہ انسان کے کئی رُجحانات اسے ماں باپ سے ملتے ہیں لیکن اِن سب کا تعلق جسم سے ہوتا ہے۔ جہاں تک دماغی تاثرات کا تعلق ہے وہ جسم کی وساطت سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن یہ تمام جسمانی اور بالواسطہ دماغی رُجحانات انسانی کردار کی پوری طرح وضاحت نہیں کرتے۔ انسانی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور رُجحانات بھی ہیں جو اس کے کیرکٹر کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ رُوحانی رُجحانات جو انسان اپنے پچھلے جنم سے اپنے ساتھ

لاتا ہے[1]۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہی رُجحانات ہی اُسے خاص خاص خاندانوں میں جنم لینے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ اس خاندان کے مخصوص ماحول میں اپنے اظہار کے مواقع حاصل کر سکے اور یہ بات سائنس کے تازہ تجربات کے بھی موافق ہے سائنس داں کہتے ہیں کہ انسانی کردار میں عادت کو بہت حد تک دخل ہے اور عادت آخر ایک ہی بات کو دُہرانے سے بنتی ہے اگر ہمارے رُجحانات عادت کی ایک شکل ہیں تو یہ عادت ہم میں جنم سے پہلے ہی پڑی ہوگی کیونکہ نئے جنم کی عادتیں پڑنے میں تو وقت لگتا ہے۔

آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر یہ سب سچ ہے تو ہمیں اپنے پچھلے جنم کے حالاتِ زندگی کیوں قطعاً یاد نہیں اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ پچھلے جنموں کی یاد ہمارے تحت الشعور میں موجود ہے، مثال کے طور پر دیکھئے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے انگریزی میں تقریر کر رہا ہوں۔ انگریزی میری مادری زبان نہیں ہے لیکن اس وقت میری مادری زبان کا ایک لفظ بھی میرے شعور میں داخل نہیں ہے لیکن اگر میں اپنے خیالات کو اپنی مادری زبان میں سوچنے لگوں تو فوراً میرے شعور میں اپنی زبان کے الفاظ کا طوفان اُمڈ پڑے گا ظاہر ہے کہ ہمارا روزمرّہ کا شعور ہمارے دماغی سمندر کی سطح ہے۔ اس سمندر کی تہ میں ہمارے سب تجربات ڈوبے ہوئے ہیں۔ کوشش کرنے سے ہم اپنی گذشتہ زندگی کو بھی شعور کی سطح پر لا سکتے ہیں[2]۔ یہ کچھ محض نظریہ ہی نہیں۔ اس کے ثبوت میں نہ صرف ہمارے رشیوں کے ذاتی تجربات موجود ہیں بلکہ انہوں نے وہ طریقے بھی بتا دیئے ہیں جن پر عمل کرنے سے، ہم خود اس بات کا ثبوت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ یہ چیلنج ہم تمام دنیا والوں کو دیتے ہیں کہ آؤ اور خود آزما کر دیکھو کہ تحت الشعور کے اتھاہ سمندر میں کس طرح ہلچل مچائی جا سکتی ہے اور کس طرح جنم جنم کے حالات سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے[3]۔

ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ آدمی درحقیقت ایک لازوال رُوح ہے جسے نہ تلوار کاٹ سکتی ہے۔ نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی بھگو سکتا ہے نہ ہوا سُکھا سکتی ہے۔ ہر رُوح ایک ایسا دائرہ ہے جس کا محیط مکان و زمان کی حدود سے باہر ہے اور جس کا مرکز ہمارے جسم کے اندر ہے، موت کی حقیقت بس اتنی ہے کہ رُوح کا یہ مرکز ایک جسم سے دُوسرے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ رُوح مادّی مجبوریوں سے کسی طرح بھی پابند نہیں۔ یہ دراصل

---

[1] ما مے ببانگِ چنگ نہ امروز می خوریم ، ؛ بس دور شد کہ گنبدِ چرخ ایں صدا شنید ،
ملا تہم بخرابی مکن کہ مرشدِ عشق ، ؛ حوالتم بخرابات کرد روزِ نخست ؛

[2] بیادِ چشمِ تو خود را خراب خواہم ساخت ، ؛ بنائے عہدِ قدیم استوار خواہم کرد ؛

[3] اس سلسلے میں آجکل ہپناٹزم نے کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور ثابت کر دیا ہے کہ انسان نہ صرف بچپن بلکہ جنم سے پہلے کے حالات کو بھی شعوری سطح پر لا سکتا ہے۔

مطلقاً آزاد ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں یہ پاک ہے متبرک ہے اور ہر لحاظ سے کامل ہے[1] لیکن وہ اپنی حقیقت کو بھول کر کسی طرح سے مادہ سے متعلق ہو گئی ہے اور سمجھنے لگی ہے کہ وہ خود مادہ ہے۔ مکان و زمان سے متعلق ہو گئی ہے اور سمجھنے لگی ہے کہ وہ مکان و زمان سے محدود ہے۔

یہاں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک پاک، متبرک اور آزاد ہستی مادہ (matter) کی غلامی میں کیسے پھنس گئی۔ کامل رُوح اپنے آپ کو کیسے بھول کر خود کو نامکمل سمجھنے لگی۔ ہندوؤں کے خلاف الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے کتراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں ہے، بعض مفکر اس سوال کے جواب میں ایک آدھ کم و بیش مکمل ہستی کی اختراع کرتے ہیں اور موٹے موٹے لفظ استعمال کر کے خیالات کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی چیز کا کوئی نام رکھ دینے سے اس کی وضاحت نہیں ہو جاتی سوال ویسے کا ویسا اور وہیں کا وہیں رہتا ہے کہ ایک مکمل ہستی غیر مکمل کیسے ہو گئی۔ ایک پاک اور متبرک ہستی آلائش سے کس طرح وابستہ ہو گئی ایک سچے ہندو کا صاف جواب یہ ہے کہ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ وہ لفاظی کا سہارا لینا نہیں جانتا، وہ صداقت سے منحرف ہو کر دلیل بازی اور منطق سے کام لینا نہیں چاہتا۔ وہ دلیری سے اپنے لاجواب ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے اس کا علم نہیں[2] کہ مکمل، متبرک، پاک اور آزاد روح مادہ سے کیونکر منسلک ہو گئی اور کس طرح اپنے آپ کو بھول کر خود کو مادہ سمجھنے لگی لیکن میں اپنے ذاتی اور قومی تجربے کی بنا پر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ رُوح ہے اور مکمل، متبرک، پاک اور آزاد ہے مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ رُوح کے آزاد، مکمل اور پاک ہونے کے باوجود ہر شخص اپنے آپ کو محض جسم تصور کرتا ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے میں اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں یہ کہنا کہ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے اس سوال کا کوئی جواب نہیں، سوال سے کترانا ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسانی رُوح جسم سے منسلک ہو کر بھی لازوال ہے، زندۂ جاوید ہے، کامل ہے، لاانتہا اور لامکاں ہے، موت اس صورت کا نام ہے جب رُوح انسانی جسم کو چھوڑ دیتی ہے اور پیدائش وہ حالت ہے جب رُوح ایک نئے جسم میں جاگزیں ہو جاتی ہے، ہمارا حال ہمارے ماضی کے تاثرات کی پیداوار ہے اور ہمارے مستقبل کی تعمیر حال سے ہوتی ہے۔ رُوح اس جنم مرن کے لاانتہائی سلسلے میں ارتقا کی بلند سے بلند تر منزلیں طے کرتی جاتی ہے حالانکہ کبھی کبھی ترقی کی راہوں سے بھٹک کر تنزل کی پستیوں میں بھی گر جاتی ہے جہاں سے اُسے از سرِ نو ارتقا کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان محض ایک ہلکی پھلکی کشتی ہے

---

[1] گفتی کہ حافظ ایں ہمہ رنگِ خیال چیست ؛ نقشِ غلط مخواں کہ ہماں لوحِ سادہ ایم

[2] در رہِ عشق نشد کس بیقیں محرمِ راز ؛ ہر کسے بر حسبِ وہم گمانے دارد،

جو طوفانِ ہستی میں گھر گئی ہے جسے اچھے اور بُرے کرموں کی طُوفانی لہریں کبھی اپنے ہاتھوں میں لے کر سر سے اُوپر اُچھال دیتی ہیں اور کبھی اپنے پاؤں میں دبے پٹختی ہیں۔ کیا یہ طوفان زدہ کشتی ہمیشہ اسی طرح زندگی اور موت کی تیز و تند لہروں کا کھلونا بنی رہے گی جسے جب چاہا توڑ دیا اور جب چاہا پھر بنا کر تھپیڑوں کے حوالے کر دیا، کیا انسان اس قدر بے بس ہے؟ کیا انسان اتنا مجبور ہے؟ کیا انسان کی ہستی ایک چیونٹی کے برابر ہے جسے کرم (اعمال) کا بے پرواہ پہیہ بیدردی سے کچلتے ہوئے نکل جاتا ہے، کیا کرم کا قانون اس قدر اندھا اور بہرا ہے کہ بیواؤں کے آنسو اُس کے لئے بالکل اَن دیکھے ہیں اور یتیموں کی چیخیں اس کے لئے کُلیتاً اَن سُنی ہیں؟ کیا یہی قانونِ فطرت ہے؟ جس سے کوئی چھٹکارا نہیں؟ یہ ہے انسانی دل کی آواز جو یاوسی اور دُکھ درد کی گہرائیوں سے ہمیشہ نکلتی آئی ہے، یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب انسان کا دردبھرا دل ہمیشہ سے تلاش کرتا چلا آیا ہے، ہزاروں سال پہلے جب یہ آواز ہمارے یہاں اُٹھی۔ جب یہ سوال ہمیں پیش آیا تو ہمارے ایک دلیر رشی نے یہ الہامی اعلان کیا "نشاطِ ابدی کے برخوردارو سُنو زمین اور آسمان کے رہنے والو سُنو میں نے اُس لازوال ہستی کو پا لیا ہے جو سراپا نور ہے، سراپا حقیقت ہے، جس کے سامنے ظلمت اور جہالت ناپید ہو جاتی ہے جس کو جان کر تم موت کے ہتھکنڈوں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ پا جاؤ گے"

سُنا آپ نے، نشاطِ ابدی کے برخوردارو، کیا القاب ہے! کیا بلند پایہ نام ہے جو رشی نے بنی نوع انسان کو بخشا ہے! مسرت کی نغمگی سے لبریز اُمید کے نور سے درخشاں، یہ ہے وہ نام جو ہماری اصل کی جھلک لئے ہوئے ہے اور میں اسی نام سے آپ سب کو خطاب کروں گا آپ ہیں مسرتِ ابدی کے وارث، بحیثیت ہندو ہونے کے میں کسی بھی حالت میں آپ کو گنہ گار نہیں کہہ سکتا۔[1]

آپ ہیں خدا کی اولاد نشاط و سرور کے حصے دار، پاک وصاف ہر طرح سے مکمل اور بے عیب، آپ تو دیوتا ہیں، آپ کو کون گناہ گار کہہ سکتا ہے میں تو کہوں گا کہ انسان کو گنہگار کہنا ہی گناہ ہے، انسانی فطرت کے نُورانی ماتھے پر سیاہ دھبہ لگانا ہے، آؤ میرے بھائیو، اپنی حقیقت کو پہچانو تم شیر ہو شیر، اپنے آپ کو بُزدل و بے بس بھیڑ بکری مت سمجھو، اپنے آپ کو دھوکا مت دو، اپنے احساسِ کمتری کو جھٹک کر پھینک دو۔ تم لازوال روحیں ہو، مطلقاً آزاد ہو، پاک اور متبرک ہو تم مادی نہیں، تمہاری حقیقت تمہارے جسموں تک محدود نہیں، تم عالمِ مادی کے خدا ہو خادم نہیں۔[2]

---

[1] پیرِ ما گفت خطا بر قلمِ صنع نرفت ؛ آفریں بر نظرِ پاکِ خطا پوشش باد

[2] ترا ز کنگرهٔ عرش می زنند صفیر ؛ ندانمت که دریں دامگه چه افتاد است

یہ ہے ویدوں کا اعلان، یہ ہے نعرۂ تکبیرِ آدم، بظاہر یہ جہان جارحانہ قوانین کی مشق گاہ سہی، دیکھنے میں انسان قوانینِ فطرت کے ہاتھوں مجبور اور بے بس سہی، زندانِ موت و حیات میں پابہ زنجیر قیدی سہی، لیکن درحقیقت وہ آزاد ہے فطرت کے سارے قانونوں سے بالا کیونکہ اس تمام عالمِ شہود کے پس پردہ بس ایک ہی حقیقت ہے، اور انسان دراصل بذاتِ خود یہی ایک حقیقت ہے جس میں تمام دنیا سمائی ہے اور جو دنیا کی ہر شے میں بسی ہے اُسی کے حکم سے ہوا چلتی ہے، آگ جلتی ہے، بادل برستے ہیں اور اُسی کے اشارے پر موت دندناتی پھرتی ہے۔"

آپ پوچھیں گے اس ہستی کے خواص کیا ہیں؟ اُسے کیسے پہچانا اور پایا جا سکتا ہے[؎] ۔ یہ ہستی ہر جگہ موجود وحاضر وناظر ہے، پاک اور متبرک ہے، اس ہستی کی کوئی معین صورت نہیں - رحیم و کریم ہے، قادرِ مطلق ہے، ہمارے ویدک رشیوں نے اُسے یوں خطاب کیا ہے "تم ہی ماتا ہو تم ہی پِتا، تم ہی ہمارے پیارے دوست، تم ہی تمام طاقت کا منبع ہو، ہمیں قوت بخشو، تم ہی نے تمام کائنات کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے ہمیں طاقت دو کہ ہم اپنی زندگی کا تھوڑا سا بار اٹھا سکیں"۔

اِس ہستی کو پایا جا سکتا ہے خلوص اور محبت سے اس کی پُوجا ہوتی ہے، پریم سے رشیوں نے کہا ہے "اُس کی پُوجا کر، اُسے اپنا محبوب جان کر، اس سے پیارا محبوب دونو عالم میں نہ ملے گا[؎]"۔

یہ ہے عشقِ الٰہی (پریم بھگتی) کا مسلک جس کا پتہ ہمیں ویدوں میں ملتا ہے۔ اِس طریقۂ حیات کو سری کرشن نے جنہیں ہم بھگوان کا اوتار مانتے ہیں، اور بھی زیادہ وضاحت سے گیتا میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں کمل کے پتے کی طرح زندگی کرنا چاہیئے۔ کمل کا پتا پانی میں اگتا ہے لیکن وہ کبھی پانی میں غرق ہو کر نہیں رہتا وہ پابگِل سہی مگر ہمیشہ سربلند رہتا ہے۔ عین اسی طرح انسان کو دنیا میں رہنا چاہیئے اس کے ہاتھ پاؤں اپنا اپنا کام کرتے رہیں لیکن اس کے دل و دماغ ہمیشہ بھگوان کے چرنوں لگے رہیں[؎۳]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ اے بلند نظر شاہبازِ سدرہ نشیں ، ؎ نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد است ،

؎ من بہر آں یکے دو جہاں دادہ ام بباد ؎ عیبم مکن کہ حاصلِ ہر دو جہاں یکے ست

؎ نہ نام ہے نہ ترا رُوپ ہے مگر تو ہے ، ؎ نسیم ہے نہ چمن ہے نہ گُل مگر ۔ تُو ہے ،

؎ ترا مقام معین نہیں تو ہر سُو ہے ، ؎ تو چھپ کے آپ ہی اپنی نظر سے خود۔ جُو ہے

؎۳ غلامِ ہمتِ آنم کہ زیرِ چرخِ کبود ؎ ز ہر چہ رنگِ تعلق پزیرد آزاد است ،

اور وہ بھی اس طرح کہ پریم بھگتی میں نہ کسی دنیاوی خواہش کی لاگ ہو اور نہ ہی جنت کی آرزو کا پرتو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خدا سے کسی چیز کے لئے دعا مانگنا بُرا ہے۔ اپنی جگہ پر خدا کو اس طرح یاد کرنا بھی اچھا ہے لیکن ہمیں اس ابتدائی مرحلہ سے گزر کر (خدا سے عشق) بھگوان سے پریم محض اس لئے کرنا ہے کہ اُس سے پریم کرنا ہماری فطرت ہے اور ہمارا سچا اور پوتر پریم اُس کا حق ہے، ہمارے رشی پرماتما سے دعا بھی مانگتے ہیں تو اس طرح "بھگوان مجھے دھن دولت نہیں چاہیئے۔ مجھے اولاد نہیں چاہیئے۔ مجھے علم و ہنر کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے مکتی تک نہیں چاہیئے اگر تیری یہی رضا ہے تو مجھے یہ بھی منظور ہے کہ میں بار بار جنم لے کر اس آواگون کے چکر میں مبتلا رہوں لیکن مجھے اپنا پوتر پریم بخشو تاکہ میں صلہ کی اُمید اور انعام کی خواہش کو ترک کر کے تجھے محض تیری خاطر پوجتا رہوں۔"

بھگوان سے سچے پریم کی ایک اعلیٰ مثال خود سری کرشن کے ایک بھگت مہاراجہ یدھشٹر کی زندگی سے ملتی ہے، دشمنوں نے مہاراجہ یدھشٹر سے راج پاٹ چھین لیا اور وہ اپنی مہارانی اور اپنے بھائیوں سمیت ہمالیہ کے پہاڑوں میں جا پناہ گزیں ہُوا، محلوں کے سُکھ اور چین بس خواب و خیال ہو کر رہ گئے، ایک دن مہارانی نے پُوچھا "مہاراج میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے ایماندار اور نیک آدمی پر کیوں اتنی مصیبتیں ٹوٹ پڑی ہیں" یدھشٹر نے کہا "دیوی سامنے دیکھو ہمالیہ پربت کس شان سے سربلند کھڑا ہے۔ میں جتنا اس پربت کی شان اور سُندرتا کو دیکھتا ہوں اتنا ہی میرے دل میں مسرت کی لہریں موجزن ہوتی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اس سے پریم ہے اس پہاڑ سے مجھے کوئی خاص چیز تو نہیں ملتی لیکن میرے دل میں اس کے لئے پیار بھرا ہے۔ ہر عالیشان شے سے متاثر ہونا، ہر حسین چیز سے محظوظ ہونا میری فطرت میں داخل ہے، یہی حقیقت میں وہ جذبہ ہے جسے عشق کہتے ہیں مجھے ہر خوبصورت اور ہر عظیم شے سے عشق ہے میں بھگوان سے پریم کرتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ عظیم اور حسین دُنیا میں کوئی شے نہیں ہے۔ بلکہ وہی دُنیا کی ہر حسین شے کا حُسن ہے اور وہی ہر عظیم شے کی عظمت، حقیقی محبت بس صرف بھگوان سے ہی ہو سکتی ہے، محبت میری سرشت ہے اس لئے میں بھگوان سے والہانہ محبت کرتا ہوں، مجھے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہیئے، میں اس کے علاوہ بھگوان سے مانگوں بھی تو کیا؟ جہاں اُس کی مرضی ہو، جس حال میں وہ چاہے مجھے رکھے، میں ہر جگہ اور ہر حال میں خوش ہوں، میرا کام تو بس اسی کے چرنوں میں اپنا پریم ارپن کرنا ہے، میں عشق[۱] کا تاجر نہیں ہوں کہ بھگوان سے سودا بازی کروں، میری محبت بذاتِ خود ایک مسرت انگیز جذبہ ہے۔ اس کے بدلے میں مجھے بھگوان سے کچھ نہیں چاہیئے میرے لئے میری محبت خود اپنا انعام ہے۔"

---

[۱] تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن، که دوست خود روشِ بنده پروری داند،
[۲] حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن است و بس، در بندِ ایں مباش که نشنید یا شنید

یہ ہے ویدوں کی تعلیم کا عملی پہلو وید ہمیں بتاتے ہیں کہ رُوح درحقیقت یزدانی ہے یعنی آتما پرماتما کا جُزو ہے نہ جانے کیونکر مگر یہ مادّی زنجیروں میں جکڑ جاتی ہے تو ہم اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں[1] جونہی ہم ان بیڑیوں کو توڑ پائیں گے ہمیں اپنی مکمل آزادی کا احساس ہو جائے گا اِسی احساسِ تکمیل کا نام ویدوں نے مکتی رکھا ہے، رنج و غم سے مکتی، موت سے چھٹکارا حیاتِ جاوداں اور مکتی ہمیں مِل سکتی ہے تو بھگوان کی دَیا سے اس کی کرپا (رحمت) سے اور بھگوان کی یہ دیا صرف ان لوگوں پر ہوتی ہے جو دل کے صاف ہوں جو ہر پہلو سے پاکیزہ ہوں[2] اِن پاک دل لوگوں پر بھگوان کی دَیا یوں ہوتی ہے کہ وہ خود بھگوان کے درشن کر لیتے ہیں۔ اُن کی زندگی بدل کر راہِ راست پر آجاتی ہے اور دل کی سب میل دُور ہو جاتی ہے، سب شک مِٹ جاتے ہیں اور آواگون کا چکر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے ہندو دھرم کا بنیادی اُصول جس کے مطابق ہر ہندو اپنی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد ہندوؤں کی تمام انفرادی اور قومی زندگی گھومتی ہے، ہندو محض نظریوں پر اکتفا نہیں کرتا کھوکھلے لفظوں سے اُس کی تسلی نہیں ہوتی، اگر حواسِ خمسہ کی دُنیا کے علاوہ کوئی اور دُنیا ہے تو وہ اس دُنیا کو حاصل کرنے کے لئے ہر عملی قدم اُٹھانے کے لئے تیار ہے اگر زندگی کا کوئی پہلو ایسا بھی ہے جو حواس کی زد سے باہر ہے تو وہ زمان و مکان کی حدُود کو چیر کر اس سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے جان کی بازی تک لگانے کے لئے تیار ہے، اگر اِس مادی جسم میں غیر مادّی رُوح موجود ہے اگر اس جہانِ شہود کے پس پردہ کوئی رُوحِ اعظم کارفرما ہے تو وہ براہِ راست اُس تک جانے کی ہر کوشش کرنے کے لئے تیار ہے اور اسکے لئے ہر قربانی کو جائز سمجھتا ہے، اگر خدا ہے تو وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے وجہ یہ ہے کہ ہندو دھرم نے رُوح اور خدا کی ہستی کے ثبوت میں اپنے ذاتی تجربے کو پیش کیا ہے اور کہا ہے "میں نے خود خدا کو دیکھا ہے[4]۔

---

[1] حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنم، ؂ خوشا دمے کہ ازیں چہرہ پردہ بر فگنم

[2] چشمِ آلودہ نظر از رُخِ جاناں دُور است ؂ بر رُخِ او نظر از آئینۂ پاک انداز،

[3] او را بچشمِ پاک تواں دید چوں ہلال ؂ ہر دیدہ جائے جلوۂ آں ماہ پارہ نیست،

" غُسل در اشک زدم کاہلِ طریقت گویند ؂ پاک شو اوّل وپس دیدہ برآں پاک انداز

" صوفی بیا کہ خرقۂ سالوس بر کشیم ؂ وین نقشِ زرق را خطِ بطلان بسر کشیم

[4] گشتہ ام در جہاں و آخر کار، ؂ دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس

سوئے من لب چہ می گزی کہ بگو ؂ لب لعل گزیدہ ام کہ مپرس

اور اگر تم چاہو تو تم بھی اُسے دیکھ سکتے ہو عین اسی طرح جیسے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں یا تم مجھے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے[1]" یہ ہے تکمیلِ خودی کا وہ مقام جس کی تلقین ہندو دھرم کرتا ہے۔ یہ مذہب کسی نظریئے یا اصول پر اعتقاد لانے پر زور نہیں دیتا اس کی تعلیم بس اسی پر منحصر ہے کہ آؤ خود اپنی کوشش سے خدا کو پاؤ خدا پر محض یقین لانا کافی نہیں یقین سے بذاتِ خود تمہاری زندگی پوری طرح یزدانی نہیں ہو سکتی خدا کو پا کر ہی تمہاری زندگی مکمل اور پاک ہو سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا مقصد ہی یہی ہے[2]۔ تکمیلِ خودی اور بس مذہب کا کام ہی یہی ہے کہ انسان کو خدا تک لے جائے شروع سے آخیر تک ہندو دھرم کی تعلیم کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے انسان کو تلاشِ حق کے لئے آمادہ کرنا۔ اسے اس مشکل معیار کو حاصل کرنے کے لئے جدّ وجہد کی تلقین کرنا، اس کی مشکلات کو دور کر کے اس کی ہمت بندھانا تاکہ آخر کار یہ خاک کا پُتلا خدائے عرش نشیں کے مقام کو پالے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر کمالِ خودی کا حاصل کیا ہے اور خدا رسیدہ بندوں کو آخر روحانی جدّ وجہد سے کیا ملتا ہے؟ ہندو دھرم کہتا ہے کہ وہ چیز جو خود شناس روح کے ہاتھ آتی ہے ابدی مسرت ہے، نشاطِ روح ہے یہ ایسی خوشی ہے جس میں تمام مسرتیں سما کر رہ جاتی ہے اور انسان اس حقیقی اور بنیادی خوشی میں سدا مگن ہو جاتا ہے اپنے خدا کو پا کر، اپنے بھگوان سے لین ہو کر آدمی یزدانی مستی میں ڈوب جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نقطۂ کمال پر بندہ و خدا دونوں کی اپنی اپنی ہستی قائم رہتی ہے اور اگر ایسا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے نقطۂ کمال تو مطلق و واحد ہی ہو سکتا ہے اس میں دوئی کی گنجائش کہاں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ من و تو کا سلسلہ نقطۂ کمال پر پہنچتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ روح جب اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو خدا سے ایک ہو جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خود شناس روح اور خدا دراصل ایک ہی چیز ہیں[3]۔ بھگوان کا بھگت جب بھگوان میں لین ہو جاتا ہے تو بھگوان ہو جاتا ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) من بگوشِ خود از دہانش دوش ∴ سخنانے شنیدہ ام کہ مپرس،
" ہمچو حافظ غریب در رہِ عشق، ∴ بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس
" بے خود از شیشۂ پرتوِ ذاتم کردند ∴ بادہ از جامِ تجلیٔ صفاتم دادند

[1] آخر بچہ گویم ہست، از خود خبرم چوں نیست ∴ ور بہر چہ گویم نیست با او نظرم چوں ہست
[2] از دل و جاں شرفِ صحبتِ جاناں غرض است ∴ ہمہ آنست وگرنہ دل و جاں ایں ہمہ نیست
[3] سالہا دل طلبِ جامِ جم از ما می کرد ∴ و آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
" گوہرے کز صدفِ کون و مکاں بیرون است ∴ طلب از گم شدگانِ لبِ دریا می کرد

اور اس بھگوان کی حقیقت ہے ستیہ۔ چت آنند حقیقی علم، ابدی ہستی، ابدی مسرت جس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جو اس حدِ کمال تک پہنچ گئے ہیں، یہ کہنا کہ ایسی حالت میں انسان اپنی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے اور اُس کی حقیقت ایک بے جان پتھر سے زیادہ نہیں رہتی، محض انجان لوگوں کی باتیں ہیں جنہوں نے کبھی زخم نہ کھائے ہوں وہ دُوسروں کے داغوں پر ہنس ہی سکتے ہیں، اُن کے تجربے میں شرکت نہیں کر سکتے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وصلِ الٰہی ہرگز اس قسم کی موت نہیں ہے اگر انسان کو اس ناچیز جسم کے احساسات پاکر سرور ملتا ہے۔ تو یقیناً دو یا دو سے زیادہ جسموں کے احساسات بیک وقت پانے پر تو اور بھی زیادہ خوشی ہوگی، کیونکہ جسم ہماری اندرونی طاقت کا ایک کرشمہ ہے، جتنی ہی ہماری جسمانی قوتیں زیادہ ہوں گی اُتنا ہی شدید احساس ہمیں اپنی برتری کا ہوگا اور اس احساس کی شدت ہی ہماری خوشی کا معیار ہے اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ اگر آپ کے جسم میں ایک نہیں ہزاروں انسانوں کا شعور واحساس پیدا ہو جائے تو آپ کس قدر مسرور ہوں گے خدا رسیدہ انسان کی بس یہی حالت ہوتی ہے۔ اس کے شعور واحساس میں سب کائنات سما جاتی ہے اور وہ نشاطِ رُوح میں ڈوب جاتا ہے، اس حالت کو انفرادی موت سمجھنا لاعلمی نہیں تو اور کیا ہے، آخر جوانی آتی ہے تو بچپن مر نہیں جاتا بلکہ جوانی بذاتِ خود بچپن ہی کا ایک رنگین اور پُرلطف رُخ ہے کون ہے جو جوانی کے ولولوں کی خاطر اپنے لڑکپن کے کھیل کود سے آگے گزرنے سے گھبراتا ہے؟ اسی طرح اگر رُوح کی وسعتوں کو پانے کے لئے انفرادیت کی کال کوٹھری سے نکلنا پڑتا ہے تو یہ قطعاً ہماری موت نہیں بلکہ زندگی کی تکمیل کی صورت ہے یہ وہ مقام ہے جہاں تمام ذی حس چیزوں کا شعورِ خودی اناالحق کے نقطہ پر یکجا ہو جاتا ہے[۱]۔

ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کے احساس کو پانے کے لئے انفرادیت کا کھو دینا لازمی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ موت سے نجات تب ہی مل سکتی ہے جب انسان کو بس زندگی ہی زندگی کا احساس ہو۔ ایک اَبدی زندگی جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام اسی طرح رنج والم کا خاتمہ اُسی حالت میں ہی ہو سکتا ہے جب انسان کا وجود محض ایک شعورِ نشاط ہو جائے سراپا مسرت۔ جہالت اور غلط روی کا اختتام اُسی صورت میں ہوتا ہے جب انسان مجسّم علم ہو جائے، اب آپ خود ہی بتائیے کہ ایسی حالت کو موت سے تعبیر کیا جائے یا عین زندگی سے، انفرادی شعور جب پھیل کر کائناتی شعور بن جائے تو حیات کی تمام وسعتیں انسان کے حصے میں آتی ہیں اس کی ہستی مٹتی نہیں ہے، بڑھ کر حدِ نگاہ سے باہر ہو جاتی ہے۔

سائینس کے نقطۂ نظر سے بھی یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے۔ سائینس ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارا جسم ہر گھڑی

---

[۱] گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں ٭ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کُنم

تغیر پذیر ہے جسم جب تک زندہ ہے مُسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے ہر سانس میں ہزاروں سَل (cell.)
مرتے ہیں اور ہزاروں نئے سَل (خلیہ) پیدا ہوتے ہیں ہماری جسمانی انفرادیت بھی درحقیقت نظر کا دھوکا ہے اگر کسی
چیز کو ثبات ہے تو وہ ہے ہماری رُوح۔

دُوسرے سائنس خود بنیادی طور پر اُس چیز کی تلاش میں ہے جس سے باقی سب چیزیں مرکّب ہو کر تشکیل ہوئی ہیں۔ سائنس اس اسٹیج سے کہیں آگے نکل گئی ہے جب تمام مادّی اشیا کے بنیادی مرکّب چند عناصِر (elements) قرار دیئے جاتے تھے اب تو سائنس ایٹم سے الیکٹران تک آگئی ہے سائنس میں بے حس مادّہ کی جگہ ایک محرک قوت (energy) نے لے لی ہے۔ سائنس جب اس ایک چیز کو پالے گی جس کی اُسے تلاش ہے تو سائنس بھی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گی۔ اسی طرح مذہب بھی اپنے کمال کو اُس وقت پہنچ جائے گا جب وہ اس ہستی کو ڈھونڈ لے گا جس سے تمام عالمِ ظہور وجود میں آیا ہے وہ رُوحِ اعظم جس سے تمام ذی رُوح جانیں پیدا ہوئی ہیں[1] جو موت کی زد سے باہر ہے اور زندۂ جاوید ہے۔

سائنس اور مذہب دونو ایک واحد بنیادی چیز کی تلاش میں ہیں۔ دونو آخر اپنے اپنے راستے سے ایک ہی منزل تک آپہنچیں گے۔ آج سائنس کی دنیا میں نئے خیالات کے اظہار کے لئے نئے لفظ استعمال میں لائے جا رہے ہیں کیونکہ پُرانے لفظ بے معنی سے ہو چلے ہیں۔ مثلاً سائنسداں اب چیزوں کی تخلیق و تشکیل کی بات نہیں کرتے، اُن کے ظہور کا ذکر کرتے ہیں، میرے لئے اور میرے ہم مذہب بھائیوں کے لئے یہ مسرت کا مقام ہے کہ فلسفہ اور مذہب کے جن خیالات کو ہم صدیوں سے سینہ بہ سینہ لئے چلے آئے ہیں آج اُن کا پرچار سائنس کے پُرزور الفاظ میں ہو رہا ہے اور سائنس کے تجربات اور اُس کی روز بروز بڑھتی ہوئی معلومات کی روشنی میں یہ عظیم خیالات اَور بھی چمک رہے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ محض فلسفہ کے بلند پایہ اُصولوں کو چھوڑو۔ بھلا ان سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے، بات کرو عوام کے مذہب کی جس سے ہندو دھرم کے عملی پہلو پر بھی کچھ روشنی پڑے، اس سِلسِلہ میں ایک بات میں خصوصاً آپ کی خدمت میں عرض کروں گا اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں درحقیقت ایک سے زیادہ خدا نہ کبھی مانا گیا نہ مانا جاتا ہے، آپ کو میری بات پر آسانی سے یقین نہیں آئے گا اور بہت حد تک آپ کا شک بجا بھی ہے جس دیش کے ہر مندر میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی پُوجا ہوتی ہے اُس کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں معبود متعدد نہیں ہیں سراسر غلط معلوم ہوتا ہے، لیکن یقین مانئے میں غلط بیانی سے کام لے کر آپ کو

---

[1] حُسنِ رُوئے تو بیک جلوہ کہ در آئینہ کرد ❖ ایں ہمہ نقش در آئینۂ اوہام اُفتاد

دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ آئیے میرے ساتھ چل کر دیکھئے۔ مندر میں خواہ کسی دیوی۔ دیوتا کی مُورتی ہو بھگوان کی پرارتھنا ایک ہی ہے، سُنیئے تو ہر مندر میں پُجاری اپنے اپنے دیوتا کو حاضر و ناظر پر ماتما کہہ کر پکار رہے ہیں، وہی خالق ہے وہی رازق، وہی زندگی بخشتا ہے وہی جان لے بھی لیتا ہے۔

اب آپ خود ہی بتائیے کہ ایسی پرارتھنا کرنے والے کیا محض بُت پرست وہمی بندے ہو سکتے ہیں؟ مجھے اس سلسلے میں اپنے بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک عیسائی مشنری ایک بڑے بھاری مجمع میں تبلیغی تقریر کر رہا تھا، تقریر کے دَوران میں علاوہ اور "میٹھی" باتوں کے اُس نے سوال کیا اگر میں آپ لوگوں کے دیوتا کی مُورتی کو اپنی چھڑی سے پیٹوں تو تمہارا دیوتا میرا کیا بگاڑے گا؟ سامعین میں سے ایک دلیر آدمی جھٹ بول اُٹھا، اگر میں تمہارے خدا کو گالی دوں تو وہ میرا کیا کرے گا، مشنری نے کہا جب تم مر جاؤ گے تو خدا تمہیں سزا دے گا' اُس نے کہا کہ میرا دیوتا بھی تمہیں مرجانے کے بعد خوب سزا دے گا"۔

ظاہر ہے کہ ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، سچ تو یہ ہے کہ جیسے کسی درخت کی خوبی کا اندازہ اس کے پھل سے لگایا جاتا ہے، اسی طرح کسی مذہب کی اچھائی یا بُرائی کا اندازہ اس مذہب کے لوگوں ہی کے کردار سے لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے اُن لوگوں میں جنہیں طنز و حقارت سے بُت پرست کا نام دیا جاتا ہے ایسے ایسے انسانوں کو پایا ہے جن کا اخلاق، رُوحانیت اور پریم میں کوئی مُقابل نہیں۔ ان پاک ہستیوں کو دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے بارہا یہ سوال کیا ہے اگر بھگوان کو مُورتی کی وساطت سے پُوجنا گناہ ہے تو بھلا گناہ سے اس قدر پاکیزگی اور رُوحانیت کیوں کر نمودار ہو سکتی ہے؟ یہ سچ ہے کہ ضعیف الاعتقادی انسان کی دشمن ہے لیکن تعصب اِس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے، ذرا انصاف کی نظر سے دیکھئے کون ہے جو بُت پرست نہیں آخر عیسائی گرجا کیوں جاتے ہیں، خدا کی پرستش تو ہر جگہ ہو سکتی ہے، پرستش کے وقت آسمان کی طرف کیوں مُنہ اُٹھاتے ہیں، زمین پر بھی تو خدا موجود ہے اور پھر کیتھولک چرچ میں تو نجانے کتنی مُورتیاں لگی رہتی ہیں، رہے پروٹسٹنٹ خود اُن ہی سے پُوچھ لیجئے کہ پُوجا کے وقت اُن کے دماغ میں کتنے بُت موجود ہوتے ہیں، میرے بھائیو، حقیقت یہ ہے کہ ہماری سرشت ہی ایسی ہے کہ بغیر دماغی تصویر کے ہم کسی شے کے متعلق کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ دماغی نقشے اور تصاویر ہمارے لئے اتنے ہی ضروری ہیں جیسا جینے کے لئے سانس لینا، قانونِ فطرت یہی ہے کہ کسی مادّی چیز کو دیکھ کر اس کی دماغی تصویر اُبھر آتی ہے، یا اس کے برعکس جب ہم کسی چیز کے متعلق سوچتے ہیں تو اُس کی مادّی شکل ہماری نظر میں رکھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مادّی اور بیرونی علامتوں اور نشانوں (Symbols) کی مدد سے اپنے بھگوان کی پُوجا کرتے ہیں اگر آپ کسی ہندو سے پوچھیں کہ وہ بت کیوں پُوجتا ہے تو وہ کہے گا کہ اس کی مدد سے میں اپنے بھگوان کے خیال کو دیر تک جمائے رکھ سکتا ہوں وہ جانتا ہے کہ بُت بذاتِ خود خدا نہیں

نہ ہی وہ حاضر وناظر ہے اور اگر آپ سوچیے کہ جو آدمی خُدا کو حاضر و ناظر جان کر بغیر کسی بیرونی نشان (Symbol) کے اس کی پُوجا کرتے ہیں، اُن کے دماغ میں بھی زمین و آسمان کی حدُود کی ایک تصویر ہوتی ہے خدا کا تصوّر جیسا بھی کیوں نہ ہو ہمارے دماغ کی حدود میں گھرا ہوتا ہے۔ بُت پرستی اِن حدود کو تسلیم کرتی ہے۔ لیکن بُت شکنی بھی اِن حدود سے باہر نہیں جاسکتی خواہ وہ انہیں مانے یا نہ مانے ہماری فطرت کا تقاضا کہئے "لامکانیت" کا خیال بھی مکان کی حد تک آکر رُک جاتا ہے، جب ہم لامکاں ہستی کا خیال کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے دماغ میں نیلگوں، آسمان کی وسعتوں کی تصویر کھچ جاتی ہے، یا اُفق تک پھیلے ہوئے سمندر کی۔ اسی طرح جب ہم تبرک اور پاکیزگی کا خیال کرتے ہیں تو ہماری نظر میں مندر، مسجد یا گرجے اور کراس (cross) کی تصویریں اُبھر آتی ہیں، ہندو دھرم فطرت کے اِس قانون کو پُوری طرح سمجھتا ہے، اس لئے اس مذہب میں رُوحانیت، پاکیزگی سچائی، لامکانیت اور اس طرح کے دُوسرے خیالات کو مختلف رنگ اور رُوپ دے کر مجسّم کر دیا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندو ان بیرونی نشانوں (symbols) میں گُم ہو کر رہ جاتے ہیں، اُن کا مذہب انہیں بھگوان سے ایک ہو جانے کی دعوت دیتا ہے اور خود شناسی کی راہ بتاتا ہے جہاں دُوسرے مذاہب میں یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ دینی نظریوں کو تسلیم کر لیا جائے اور نیکی کے کام کئے جائیں، ہندو دھرم کا مرکزی مقصد خدا کو پانا ہے اپنے آپ کو پرماتما تک لے جاتا ہے مورتیاں اور مندر، مسجدیں اور گرجے محض مقاماتِ رہ گزر ہیں بلکہ یوں کہئے کہ اوائلِ رُوحانیت کے سہارے ہیں جن کی ضرورت آگے چل کر قطعاً نہیں رہتی۔ ویدوں میں لکھا ہے کہ خارجی پُوجا رُوحانیت کی راہ میں ایک ادنیٰ مقام ہے، اس سے آگے بڑھو تو دل ہی دل میں پوجا کرنے کا درجہ آتا ہے لیکن سب سے اعلیٰ مقام وہی ہے جہاں بھگوان کے درشن ہو جاتے ہیں بھگوان بھگت کے اور بھگت بھگوان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور بھگت اعلان کرتا ہے کہ "چاند سورج اور ستاروں کی روشنی اس ازلی نور کے آگے، سچ ہے بجلی کی چمک اور آگ کے شعلے بے معنی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان تمام نورانی اجسام میں وہی ایک نور جلوہ فگن ہے"۔

مگر ہندو دھرم اس بات سے بھی بخوبی واقف ہے کہ اس مقام تک آنے کے لئے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ہندو دھرم رُوحانیت کے رستے کے کسی بھی مقام کو غلط یا جھوٹا نہیں سمجھتا اس کی نظر میں سب طریقِ عمل برابر ہیں اور اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اس کی ہدایت تو بس یہی ہے کہ کسی بھی مقام پر نہ رُکو[1]۔ اگر مورتی پوجا سے کسی آدمی کو اپنی رُوحانیت پانے میں مدد ملتی ہے تو اس میں گُناہ کیا ہے[2]۔ یہ بھی رُوحانی رستے

---

[1] مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ❖ جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

کا ایک پڑاؤ بن جائے گا۔ ہندو دھرم کا کہنا ہے کہ انسان گناہ سے پاکیزگی، اندھیرے سے روشنی، جہالت سے آگہی اور جھوٹ سے سچائی کی طرف گامزن نہیں ہے بلکہ اُس کی اصل پاکیزگی، روشنی خود آگہی اور سچائی ہے، اس کی ارتقا سچائی کے ایک مقام سے دُوسرے بلند تر مقام کی طرف ہوتی ہے۔ اِس طرح اُس کی نورانی زندگی اور بھی زیادہ منور ہوتی ہے، وہ پاکیزہ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اسرارِ حقیقت سے اور زیادہ واقف و آگاہ، اِس نگاہ سے دیکھا جائے تو دُنیا کے تمام مذاہب، خواہ وہ محض توہمات پر مبنی ہوں، خواہ وحدت الوجود کے حامی ہوں، سب کے سب رُوحِ انسانی کی خود تلاشی کے وسائل نظر آتے ہیں، آدمی ارتقا کی جس منزل پر ہوتا ہے اُسی کے مطابق وہ خدا کی لا انتہا اور مطلق ہستی کو پانے کی کوشش کرتا ہے، مختلف مذہب اور اعتقاد انہیں کوششوں کا خارجی لباس ہیں۔ اِس لئے سب کے سب سچے ہیں۔ سب عزت کے قابل ہیں، ہر شخص اپنے جنم، اپنے ماحول اور اپنی بساط کے مطابق اپنا راستہ اختیار کرتا ہے، اور رُوح کے طویل سفر میں اپنی پسند کے موافق دینی پڑاؤ پر رک کر ستا لیتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے یا یوں کہیئے کہ ہر رُوح ایک شاہین ہے، جو مہرِ جہاں تاب کی طرف پرواز میں ہے، اور اپنی اُڑان میں کہیں کہیں سفید و سیاہ بادلوں میں پَر تول کر دم لیتا ہے اور پھر تیر کی طرح بادو باران کو چیرتا ہوا اپنی نورانی منزل کی طرف نکل جاتا ہے، جہاں سے دُنیا کا تاریک سے تاریک حصّہ بھی ایک روشن ستارہ نظر آتا ہے ⁂

اب آپ خود ہی بتایئے کہ جب انسان کو ایسی بصیرت مِل جائے تو وہ کسی مذہب کو کیونکر جھوٹا یا بُرا کہہ سکتا ہے، ہندو جو تمام مذاہب کی عزت کرتے ہیں، وہ محض رواداری نہیں، وہ اصولاً ہر مذہب کو سچا مانتے ہیں[۱] لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میرا مذہب آپ کے لئے یا آپ کا مذہب میرے لئے عین اسی طرح غیر مُناسب ہے جیسے میرے کپڑے آپ کے لئے غیر موزوں ہیں اور آپ کے کپڑے میرے لئے ہر انسان کا یا ہر سوسائٹی کا اپنا اپنا رستہ ہے اور وہی اس کے لئے زیادہ مُناسب ہے، خود قدرت کا اپنا اُصول بھی کثرت میں وحدت ہے جہاں دیکھئے گوناگوں تفرقات میں یگانگی کا رنگ بھر رکھا ہے، اب اگر کسی مذہب والے اپنے قالب میں دُوسروں کو زبردستی ڈھالنے کی کوشش کریں تو یہ سراسر غلطی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسی غلطی کرنے والے ہی مورتی پُوجا پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہندو دھرم یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہستی مطلق کا ادراک و بیان اضافی اور نسبتی ہے جس کا احساس رُوح کی خموشی میں ہوتا ہے اُس کا بیان کس نشان کی اضافت کے بغیر نہیں ہو سکتا[۲] مُورتی ہو یا ہلال کا چاند سب

حاشیہ صفحہ گذشتہ؛ در عشق خانقاہ و خرابات فرق نیست ⁂ ہر جا کہ ہست پرتوِ رُوئے حبیب است

[۱] میانِ کعبہ و بتخانہ ہیچ فرقے نیست ⁂ بہر طرف کہ نظر می کنم برابر اوست،

ایک ہی ہستی کے نشان (symbols) ہیں اور اس لئے ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو اِن خارجی سہاروں کی ضرورت ہو لیکن جو لوگ ان سہاروں سے بے نیاز ہو چکے ہیں اُنہیں بھی کسی حالت میں اپنے دُوسرے بھائیوں پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اِس سلسلے میں مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ ہندو دھرم میں مُورتی پُوجا لازمی نہیں ہے بلکہ بھگوان کے سچے بھگتوں کے لئے تو ایک اسٹیج پر دینی کتابوں کا مطالعہ بھی غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔ جب بھگوان سے لگن لگ جائے تو پھر اور کسی چیز کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ دُوسرے یہ کہ مُورتی پوجا بذاتِ خود کوئی خوفناک چیز نہیں ہے اور نہ ہی بُرائیوں کی جڑ، بات اصل میں یہ ہے کہ یزدانی حقیقتوں کو سمجھنے اور پانے کے لئے انسان کی اوّلیں کوشش مُورتی پوجا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور بالآخر انسان اس مرحلہ سے کہیں آگے نِکل جاتا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہندو دھرم میں کوئی خامی یا کمی نہیں، اس کے ہاں بھی کئی خامیاں اور برائیاں ہیں لیکن یہ کمزوریاں دُوسروں کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتی، ہاں خود ہندوؤں کے لئے مُضر ضرور ہیں مثلاً یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی سرپھرا ہندو چِتا پر چڑھ کر اپنے آپ کو زندہ جلا دے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کے مذہب پر ایمان نہ لائیں پکڑ پکڑ کر زندہ جلا دے اور پھر اپنے جسم کو جلانا یا اس طرح کی اور حرکات کرنا ہندو دھرم نہیں سِکھاتا اور اس کا الزام اُس کے سر نہیں تھوپا جا سکتا ایسا کرنا اتنا ہی ناجائز اور غلط ہوگا جیسے یہ کہنا کہ عیسائی مت "مبینہ چڑیلوں" کو زندہ جلانا سِکھاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ایک ہندو کی نظر میں دین اور مذہب انسانی ارتقا کے رستے ہیں جن پر سب مرد و زن اپنے اپنے حالات کے مطابق آہستہ یا تیز چل کر آخر ایک ہی منزل پر پہنچ جاتے ہیں، ہر مذہب کا مقصد آدمی کو انسان بنانا ہے اور پھر انسانیت کو بلند کر کے خدا تک لے جانا ہے اُس خدا تک جو ہر مذہب کا واحد خدا ہے جس سے سب مذہب نازل ہوئے ہیں۔

آپ پُوچھ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ہے تو یہ جھگڑے فساد کیوں یہ تمام متضاد باتیں کیا ہیں، میں یہ کہوں گا یہ سب "ہماری بے بصری کے سِوا کچھ اور نہیں" اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ سب تفرقات ایک ہی حقیقت کے مختلف حالات میں مختلف پہلو نظر آئیں گے، یا یوں کہئے کہ ایک ہی روشنی ہے جو مختلف رنگوں کے شیشوں سے چھن کر آ رہی ہے اور سچ پوچھو تو اس ست رنگی ہی سے دُنیا کی رونق ہے، اسی سے ہی کائنات کا حُسن چمکتا ہے اِسی کثرت ہی کی بدولت ہر شخص اپنی طبیعت اور طاقت کے مطابق قدرت اور خالق کچھ نہ کچھ سمجھ سکتا ہے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ، بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر (غالب)

اگر دُنیا میں ایک ہی مذہب کا بس ایک ہی راستہ سب کے لئے مقرر ہو جائے تو تیز گام مسافر اکتا جائیں اور سُست رفتار تو غریب ہار کر ہی بیٹھ جائیں اس لئے میں تو ہر مذہب کو نہ صرف اپنی جگہ پر ضروری سمجھتا ہوں بلکہ ہر مذہب کو سچا مانتا ہوں کیونکہ سب میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے۔ بھگوان کرشن نے خود گیتا میں کہا ہے "میں ہر مذہب کی بنیاد ہوں، جیسے موتیوں کی مالا کا ہر موتی ایک ہی تار پر قائم ہوتا ہے اسی طرح دنیا کا ہر مذہب مجھ سے متعلق ہے تمہارے لئے اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ تمہیں جہاں کہیں ایسی غیر معمولی پاکیزگی یا ایسی غیر معمولی قوت نظر آئے جس سے بنی نوع انسان کی اخلاقی اور رُوحانی ارتقا ہوتی ہے تو جان لو کہ میں وہاں موجود ہوں۔"

یہی تعلیم ہندو مت کی بنیادی تعلیم ہے، آپ ہندو دھرم کا تمام اتہاس اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو کہیں کوئی ایسا دعویٰ نظر نہیں آئے گا کہ فقط ہندو ہی رحمتِ حق (بھگوان کی دیا کے) مستحق ہیں۔ ہمارے ایک بڑے رشی ویاس نے کہا ہے۔ "ہمیں ہر مذہب و ملت میں مردانِ کامل ملتے ہیں، ایسے لوگ فقط ہماری ہی قوم میں پیدا نہیں ہوتے"

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندو دھرم کا مرکزی اصول خدا کی ہستی کو ماننا اور اُسے پانا ہے تو ہندوؤں کو صرف اُن مذاہب کو سچا ماننا چاہیئے جو خدا کی ہستی پر یقین رکھتے ہیں لیکن ہندو تو بدھ کی بھی پوجا کرتے ہیں اور اور بدھ مت کو بھی مانتے ہیں حالانکہ بدھ مت خدا پر یقین رکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ہندو جین مت کو بھی مانتے ہیں حالانکہ جین مت خدا کی ہستی کو نہیں مانتا آخر اس تضاد کے معنی کیا ہیں؟ میں یہ کہوں گا گو بظاہر بدھ اور جین مت خدا کی ہستی کو ماننا ضروری نہیں سمجھتے لیکن درحقیقت ان دونوں مذاہب کی مرکزی تعلیم اور اُن کا عملی پروگرام دوسرے مذاہب کی طرح انسان کے کردار کو اس قدر بلند بنا دیتا ہے کہ خود انسان میں وہ خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے مذہب کے لوگ خدا سے منسوب کرتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیے کہ ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ بدھ یا جین مت ناستکوں کے مذہب ہیں۔

مانا کہ بدھ اور جین مت والوں نے خدا کو نہیں پایا لیکن انہوں نے انسان کو تو یزدانی خوبیوں کا مرکز بنایا ہے۔ جس مذہب میں یزداں صفت انسان کا تصور موجود ہو وہ خدا کا ذکر کرے یا نہ کرے خدا کی حقیقت سے دُور نہیں یا بقولِ عیسےٰ مسیح جس نے خدا کے بیٹے کو دیکھا ہے سمجھ لیجئے کہ اُس نے خود خدا کے درشن پالئے ہیں اس لحاظ سے بدھ اور جین مت اتنے ہی سچے مذہب ہیں جتنے کوئی اور ہندوؤں کو ان مذاہب کو قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں - ہندوؤں کا مذہب ہی دوسرے مذہبوں کو اپنے مذہب جیسا سچا مان کر اُن کی عزت کرنا ہے۔

تو میرے بھائیو یہ تھا مختصر سا خاکہ ہندوؤں کے مذہبی خیالات کا جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا،

میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے آدرش کو عمل میں لانے کے دوران میں ہندوؤں سے بھی کبھی کوئی غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے آج تک اپنے معیار کو بدستور قائم رکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا میں کوئی ایک مذہب قبول ہو سکتا ہے تو وہ ہے سب مذہبوں کی قبولیت کا مذہب، ایسا عالمگیر مذہب مکان و زمان کی بندشوں سے بالا ہوگا۔ وہ جس خدا کی تبلیغ کرے گا اُس خدا کی وسعتیں بیکراں ہوں گی۔ اُس کے نور کا سورج مومن اور گنہ گار پر یکساں چمکے گا! اُس کے ہاں کرشن کے پجاریوں، عیسے کے پرستاروں، محمد کے معتقدوں، بدھ کے پیرووں ہی کے لئے نہیں بلکہ ناستکوں اور لامذہبوں کے لئے بھی جگہ ہوگی۔ ایسا مذہب فقط ہندو دھرم، بدھ مت، اسلام، عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے اصولوں کا مجموعہ نہیں ہوگا بلکہ اس میں اتنی وسعت ہوگی کہ ان سب مذہبوں کو اپنے میں جذب کر لینے پر بھی اس میں مسلسل ارتقا کے لئے ہمیشہ گنجائش رہے گی۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہوگا کہ ایک طرف تو وہ ایسے وحشی انسانوں کو بھی گلے لگائے گا جو جانوروں کے مقام سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف ایسے انسانوں کو اپنائے گا جن کی روحانی عظمت کو دیکھ کر دنیا حیران رہ جاتی ہے اور اُن کو دیوتا سمجھ کر اُن کے آگے سر جھکا دیتی ہے ایسے مذہب میں تعصب اور بیگانگی اور نفرت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ ایسا مذہب ہر مرد و زن کی بنیادی روحانیت کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرے گا اور اس کی تمام قوت اس روحانیت کو بیدار کرنے میں صرف ہوگی، اگر ہمارے پاس ایسا مذہب ہے تو تمام قومیں اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گی مہاراجہ اشوک نے ہزاروں سال پہلے دینی رہنماؤں کی کونسل بلوائی تھی مگر یہ کونسل بدھ مت کے پیرووں تک محدود تھی۔ اکبر بادشاہ نے مذہبی یکجہتی کا ذریعہ نکالنا چاہا لیکن اُن کی سکیم محض درباری فیشن بن کر رہ گئی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ آج امریکہ نے پھر ایک بار دنیا بھر کے کونے کونے میں اعلان کیا ہے کہ سب مذہبوں کا خدا ایک ہے، میں امریکہ کو مبارکباد دیتے ہوئے آمین کہتا ہوں میری دعا ہے کہ آپ کو اپنے ارادے میں کامیابی نصیب ہو، میری دعا ہے کہ وہ ہستیٔ مطلق جسے ہندو برہمہ کہتے ہیں اور جسے زرتشت کے پیرو آہر مزدہ کے نام سے پکارتے ہیں جسے بودھ مہاتما بدھ کی صورت میں پوجتے ہیں اور جسے یہودی 'جہووا' کا لقب دیتے ہیں جسے عیسائی "فادر ان ہیون" اور مسلمان اللہ کا نام دیتے ہیں وہ آپ کو اپنے نیک اور عظیم ارادوں کو کامیاب بنانے کی طاقت دے۔

مذہب اور روحانیت کا سورج مشرق سے اُبھرا تھا دنیا کی تاریخ کے پچھلے ہزاروں سالوں میں آہستہ آہستہ مغرب کی طرف چلتا رہا کبھی اس کی روشنی ایسے مدھم پڑتی ہوئی معلوم ہوئی جیسے کہ وہ گہن میں آگیا ہو یا بادلوں میں گھر گیا ہو لیکن ہر عہدِ ظلمت کے بعد وہ پھر اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ نمودار ہوتا رہا، آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تہذیب کا یہ درخشاں ستارہ دنیا کے گرد چکر پورا لگا کر عین مشرق کے اُفق پر ایک

نئی شان سے اُبھر رہا ہے اور اس کی اُٹھتی ہوئی کرنیں کہہ رہی ہیں کہ اُس کی درخشندگی پہلے سے ہزار گُنا زیادہ ہو گی۔

اے مادرِ آزادی کولمبیا، تجھے یہ شان و مرتبہ مبارک ہو، تیرے پاک ہاتھ آج تک کسی کے خون سے داغدار نہیں ہوئے، تو نے اپنے آپ کو مالا مال کرنے کے لئے کسی کو لوٹا نہیں۔ اسی وجہ سے یہ سُرخروئی تیرے حصّے میں آئی ہے کہ دورِ حاضرہ میں تہذیب و رواداری و ہم آہنگی کا عَلم تیرے ہاتھ میں سپرد کیا گیا، اے میرے علمبردار سر بلند کئے چلتا جا تمام دنیا تیرے قدموں پر چلے گی۔

دُنیا کے مذہبی رہنما[1]

ہندوؤں کے عقیدے کے مُطابق کائنات زندگی کے مدو جذر کا ایک لاانتہا سِلسلہ ہے۔ زندگی کی ایک لہر اُٹھتی ہے اور اپنے عرُوج تک پہنچ کر گِر جاتی ہے۔ اور پھر کُچھ عرصہ اس اُتار کے خلا میں رہ کر دوبارہ اُبھرتی ہے، اِس طرح یہ مدو جذر کا چکّر قائم رہتا ہے اور عروج و پستی اور پستی و عرُوج کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ عالمی تسلسُل کائنات کے ہر جزُو پر بھی عائد ہوتا ہے۔ انسانی کاروبار بھی اِسی قانونِ فطرت کے مطابق چلتا ہے، دُنیا کی مختلف قوموں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ قومیں ارتقا کے عرُوج تک پہنچ کر پستی کی گہرائیوں میں گِر جاتی ہیں لیکن گِر کر پھر اُٹھتی ہیں اور نئی آب و تاب سے سربلند اور سرفراز ہوتی ہیں زندگی کا کوئی پہلو ہو سماجی، اقتصادی یا مذہبی یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ مذہبی دُنیا میں بھی اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ قوموں کی مذہبی زندگی کا مطالعہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہر قوم پستی اور عرُوج کے مراحل سے بار بار گزرتی ہے کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گِر کر دوبارہ اُٹھنا ناممکن ہو گا۔ قوم کا شیرازہ کچھ یوں بکھر جاتا ہے کہ قوم قوم ہی نہیں رہتی لیکن پھر بھی یہ گِری ہوئی قوم سنبھل جاتی ہے اس کی رگ رگ میں طاقت و توانائی بھر جاتی ہے۔ اور قومی زندگی کی لہر پوُری عظمت اور شان سے بلند ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات یہ لہر جوار بھاٹے کی صوُرت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کبھی بھی کسی قوم کی

---

[1] یہ لیکچر سیکسپیر کلب پیسڈینا کیلیفورنیا میں ۳۔ فروری سنہ ۱۹ء کو دیا گیا۔
Shakespeare Club, Pasadena, California.

زندگی میں بلندی اور سرفرازی کا ایسا وقت آتا ہے تو عموماً اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی عظیم الشان پیغمبر کوئی اوتار جنم لیتا ہے۔ اُسی کے زور سے قومی زندگی کی لہر پھر سے متحرک ہوتی ہے اور اونچی اُٹھنے لگتی ہے، اس لہر کی چوٹی پر اس پیغمبر یا اوتار کی درخشاں رُوح نُور پاش ہوتی ہے۔ دراصل یہ بلند مرتبہ ہستی خود ہی خالق ہے اور خود ہی تخلیق اُسی کی برکت سے قوم کو تازہ زندگی نصیب ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ پیغمبر اور اوتار اپنے وقت اور ماحول کے موافق پیدا ہوتے ہیں وہ بھی اس قومی لہر کا جزو ہوتے ہیں جو اس وقت اُٹھ رہی ہوتی ہے جہاں وہ قومی زندگی کی اس لہر کو متحرک کر کے اُسے عروج پر لے جاتے ہیں وہاں وہ خود اس کی مخصوص سرشت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے پیغمبر اور اوتار کی بے حساب طاقت کا عمل سماج پر ہوتا ہے لیکن سماج کی حالت پیغمبر یا اوتار کے کردار اور لائحہ عمل کی تشکیل کرتی ہے۔ یہی ہستیاں، یہی اوتار اور پیغمبر ہی دُنیا کے عظیم ترین مفکّر بھی ہیں یہی تو وقتاً فوقتاً ایک نئی فکر اور ایک نئی نظر پیدا کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہی تو زندگی کو از سرِ نو تازگی و توانائی بخشتے ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں ایک ہی سچّا مذہب، ایک ہی کامل پیغمبر یا اوتار ہو سکتا ہے۔ ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہب اور پیغمبر یا اوتار کے متعلق یہی خیال رکھتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے، تو یہ خیال صحیح نہیں۔ دُنیا کے مذہبی رہنماؤں، پیغمبروں اور اوتاروں کی زندگی کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنا مخصوص پیغام لے کر ایک مخصوص کام کرنے آیا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ کامل تھے لیکن ہر ایک کی حیثیت راگ کی نہیں بلکہ سُر کی سی ہے۔ زندگی کی نغمگی ان سب سُروں سے مل کر بنتی ہے جنہیں ہم مختلف مذہبوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مختلف فرقوں اور قوموں سے مل کر نسلِ انسانی کا مجموعی شعور پیدا ہوتا ہے۔ کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بلند سمجھ کر دُنیا کی اچھی اچھی چیزیں سب اپنے لئے مخصوص کر دے۔ نہ کوئی قوم یا نسل فقط عیش اور آرام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور نہ کوئی دوسری قوم یا نسل غلامی اور خدمت گزاری کے لئے زندہ ہے، ہر قوم یا نسل کا ایک مخصوص مقام ہے۔ اِنسان کی مجموعی زندگی کی تکمیل کے لئے ہر قوم کا ایک خاص مقصد ہے۔ ہر قوم کا اپنا اپنا فرض مُعیّن ہے نسلِ انسانی کے سب سُروں سے مل کر ہی زندگی کا راگ پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ کوئی ایک پیغمبر یا اوتار تمام دُنیا پر ہمیشہ کے لئے اپنا سکّہ جمانے نہیں آیا۔ نہ آج تک ایسا ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ تہذیب انسانی کی تشکیل میں بھی عموماً اور رُوحانی ارتقا کی تکمیل میں خصوصاً ہر ایک دُنیا کو اپنی اپنی مخصوص نعمت عطا کر جاتا ہے۔ البتہ اِتنا ضرور ہے کہ جس خاص اصول

یا صداقت کی مثال کوئی پیغمبر یا اوتار قائم کر جاتا ہے اُس کے لئے دُنیا ہمیشہ اُسی پیغمبر یا اوتار کی ممنون رہے گی کیونکہ وہ اُسی کی بخشش ہے، اپنے خاص پیغام کے لحاظ سے اُس پیغمبر یا اوتار کو سب سے اعلیٰ مانا جا سکتا ہے! اور کہا جا سکتا ہے کہ تمام دُنیا پر اُس کا راج ہے۔ اور تمام مخلوقات اُس کے مطیع ہے۔

ہم میں سے بیشتر لوگ کسی خاص مذہبی راہنما پر ایمان لانے ہی کو مذہب کہتے ہیں جنم ہی سے ہم خاص پیغمبر یا اوتار کو اپنا لیتے ہیں اور اسی کو مذہب سمجھ لیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم اکثر اُصولوں کی باتیں کرتے ہیں عقائد اور نظریوں کا ذکر کرتے ہیں اور ایسا کرنا بہت حد تک صحیح بھی ہے اور مفید بھی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ہمارا ہر خیال اور ہر عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہم کسی اصُول یا خیال کا ادراک تب ہی کر پاتے ہیں جب وہ کسی بلند معیار شخص کی ذاتی زندگی میں مثال کے طور پر قائم ہو جاتا ہے۔ بجائے خود کسی خیال یا اُصول کا شعور ہمارے تصوّر کے لئے تقریبًا ناممکن ہے۔ ہم اُسے مجسّم دیکھ کر ہی سمجھ سکتے ہیں اور اُس پر عمل کر سکتے ہیں خُدا کرے کہ ہمارا دماغ اس مقام تک ترقی کر جائے کہ ہمیں زندگی کے غیر مرئی اُصول سمجھنے کے لئے کسی مجسّم مثال کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہم اس مقام سے بہت دُور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوع اِنسان کی اکثریت ہمیشہ پیغمبروں اور اوتاروں کی عظیم ہستیوں کے قدموں میں سر جھکائے رکھتی ہے۔ عیسائی، بودھ اور ہندو ان عظیم ہستیوں کو اوتار مان کر پوجتے ہیں، اہلِ اِسلام ہمیشہ اس قسم کی پرستش کے خلاف رہے ہیں۔ وہ کسی بھی اوتار یا پیغمبر کی پُوجا روا نہیں رکھتے۔ لیکن انسانی فطرت کا کیا کیا جائے اُن کے یہاں بھی ایک اوتار یا پیغمبر کی پُوجا کی بجائے ہزاروں پیروں اور اولیاء کی پرستش ہوتی ہے۔ مانا کہ اِسلام اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ لیکن عملی طور پر مجسّم رُوحانی طاقت کی پوجا کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اور میں تو کہوں گا کہ اس میں کوئی ہرج ہی نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب آپ کے عظیم پیغمبر حضرت عیسیٰ مسیح سے لوگوں نے کہا کہ "مالک ہمیں آسمانی باپ کے درشن کروا دیجئے"[ا؎] تو انہوں نے جواب دیا "جس نے بیٹے کو دیکھ لیا ہے۔ اُس نے باپ کو بھی پا لیا ہے"[۲؎]۔ آپ سوچئے تو ہم میں کون اس قابل ہے کہ خدا کا تصور انسان کی صورت کے علاوہ کر سکے؟ ہم تو اپنی انسانی شکل ہی میں اس کا دھیان کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ روشنی کی شعاعیں ہر طرف اور ہر وقت مرتعش ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم تو چراغ ہی کو دیکھ کر روشنی کا تصور کر سکتے ہیں۔ اِسی طرح خدا تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ہماری فطرت کی سرشت کچھ

ا؎ Lord show us the Father in Heaven.

۲؎ He that hath seen the Son hath seen the Father

ایسی ہے کہ ہمیں اُس کے وجود کا ادراک اور احساس تبھی ہوتا ہے۔ جب وہ کسی شخصی خدا کی صورت میں مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔ اسی لئے تو جب کوئی پیغمبر یا اوتار دُنیا میں آتا ہے تو عام اِنسان بھی خُدا کے وجود کو محسوس کرنے لگتے ہیں جب نُورِ خدا اِنسانی قالب میں مجسّم ہو کر ایک عالمتاب آفتاب کی طرح طلوع ہوتا ہے تو سب کی آنکھیں خُدا کے جلوے سے روشن ہو جاتی ہیں۔

عام اِنسان دُنیا میں بھکاری بن کر آتے ہیں عمر بھر کسی نہ کسی شئے کے لئے ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں، یہ عظیم الشان ہستیاں شہنشاہِ عالم ہو کر جلوہ گر ہوتی ہیں پیغمبر اور اوتاروں کی تمام کائنات پر حکومت ہوتی ہے اور وہ ہر طرف روحانیت کی بے بہا دولت بکھیرتے ہوئے اس جہان سے یوں گزر جاتے ہیں کہ صدیوں تک لوگ اس دولت کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم جیسے عام آدمی دُنیا میں یتیموں کی طرح رہتے ہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ ہماری حالت عموماً اُن لوگوں کی سی ہے جو اپنا رستہ بھول گئے ہوں لیکن جنہیں اپنی گم گشتگی کا احساس تک نہ ہو ہمیں ایسی حالت میں کچھ سُوجھتا ہی نہیں کہ کیا کریں اور کدھر جائیں زندگی ہمارے لئے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم لاکھ سر ماریں۔ زندگی کے مقصد اور مُدعا کو سمجھ نہیں سکتے ہماری سرگردانی کی یہ صورت ہوتی ہے کہ آج کچھ کرتے ہیں تو کل کچھ اور، ہماری حالت اُن تنکوں کی طرح ہوتی ہے جو متلاطم دریا کی لہروں پر اِدھر سے اُدھر ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں یا اُن ٹوٹے ہوئے پرّوں کی طرح جنہیں آندھی جہاں چاہے اُٹھا کر پھینک دے۔ اس کے برعکس تاریخ شاہد ہے کہ پیغمبر اور اوتار اپنا اپنا خاص مقصد لے کر پیدا ہوتے ہیں، اُن کے کام کا تمام نقشہ پہلے ہی سے تیار ہوتا ہے۔ اور وہ اُس سے رتی بھر منحرف نہیں ہوتے اور چونکہ اُن کا مقصد مقرر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک مشن[1] لے کر آتے ہیں۔ اِس لئے وہ عام طور پر بحث و مباحثہ میں وقت ضائع نہیں کرتے وہ دلائل اور منطق سے کام نہیں لیتے، بلکہ براہِ راست ذاتی علم و تجربہ کی بنا پر بات کرتے ہیں۔ آج تک کوئی ایسا اوتار یا پیغمبر نہیں ہوا جس نے دلائل اور منطق سے اپنے پیغام کو سمجھانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ آخر جو شخص حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو، اُسے بحث و مباحثہ اور دلائل اور منطق کے سہارے کی بھلا کیوں تلاش ہوگی۔ اوتار اور پیغمبر تو نہ صرف خود حق و صداقت کو اپنے سامنے جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ بلکہ جسے چاہیں اِس جلوہ سے فیض یاب کر سکتے ہیں، اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ کیا خدا کی واقعی کوئی ہستی ہے اور میں کہوں "ہاں ہے"، تو آپ مجھ سے کہتے ہیں اچھا ثابت کرو کہ خدا ہے اور مجھ غریب کو سارا زور لگا کر اپنی تمام دلائل پیش کرنا پڑتی ہیں۔ تاکہ کسی طرح ذہنی طور پر خدا کی ہستی کا

---

[1] Mission.

ثبوت مہیا کر سکوں لیکن اگر آپ عیسیٰ مسیح سے پوچھتے کہ کیا خدا ہے تو اُن کا جواب یہ ہوتا "ہاں ہے"۔ دیکھو خُدا تمھارے سامنے ہے" اور آپ اپنی آنکھوں سے خُدا کا جلوہ دیکھ کر اس کی ہستی کے قائل ہو جاتے اور اُس پر ایسا ایمان لے آتے کہ اُسے کوئی طاقت ہلا نہ سکتی۔ یہ ہے خدا کو براہِ راست دیکھنے کی صورت یہاں ذہنی تگ و دو کی چنداں ضرورت نہیں یہ ہے نورِ جلوہ کی چکا چوند روشنی، یہاں اندھیرا ٹھہر ہی کہاں سکتا ہے۔ یہاں دماغی کاوشوں کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ میرے سامنے یہ میز رکھی ہے، کسی قسم کے منطق سے مجھ پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کوئی میز نہیں ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہے۔ اس میز کی ہستی پر میرا ایمان ہے اُسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ یہی حال ہمارے پیغمبروں کا ہے وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اس پر ایمان لاتے ہیں یہی ایمان ہی اُن کی ہستی ہے۔ انہیں خُدا کے بتلائے ہوئے نصب العین پر اور خدا کے سوپنے ہوئے کام پر پُورا اعتبار ہوتا ہے۔ اس اعتبار کی بدولت یہ نُورانی ہستیاں اپنے آپ پر کامل یقین رکھتی ہیں۔

عام طور پر لوگ ایک دوسرے سے پُوچھتے ہیں" کیا تم خدا کو مانتے ہو؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ مرنے کے بعد ایک نئی زندگی حاصل ہوگی؟ فلاں فلاں بات کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے"؟ اس قسم کے سوال اپنے مقام پر بجا ہیں، کیونکہ اُن سے تلاشِ حق کی خواہش ظاہر ہوتی ہے لیکن اس مقام پر جس بنیادی چیز کی کمی ہے وہ ہے خود اعتمادی جس شخص کو اپنے پر اعتماد نہیں وہ بھلا کسی اور ہستی پر کیا ایمان لا سکتا ہے۔ کسی پر ایمان لانا بھی تو خود اعتمادی ہی کی ایک حسین صورت ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اکثر شش و پنج میں پڑے رہتے ہیں۔ ہمیں تو خود اپنی ہستی کا پُورا یقین نہیں ہے۔ اپنے ہی متعلق ہمارے خیالات لمحہ بہ لمحہ بدلتے رہتے ہیں ایک گھڑی تو ہم سوچتے ہیں کہ ہماری ہستی قائم و دائم ہے۔ اور ہمیں کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ لیکن دوسری گھڑی جو موت کا خیال آتا ہے تو ہم خوف سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم لازوال ہیں، اُمر ہیں، زندۂ جاوید ہیں۔ کبھی جو کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑے تو ہمارے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے کہ سوچ بچار کی طاقت ہی سلب ہو جاتی ہے اور ہمیں کچھ پتا نہیں رہتا کہ ہم ہیں تو کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا مر چکے ہیں؟ اِسی طرح کبھی تو ہم اپنے آپ کو اخلاق اور روحانیت کے پتُلے سمجھتے ہیں۔ لیکن کبھی جو کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمارے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور ہم سب رُوحانیت اور اخلاق کو بھول جاتے ہیں آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے قول و فعل میں یہ فرق کیوں ہے؟ اس سوال کا بس یہی جواب ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ رُوحانیت اور اخلاق کی پشت پناہ خود اعتمادی ہے، اگر انسان میں خود اعتمادی نہ رہے اگر اُس کا احساسِ خودی مٹ جائے تو روحانیت اور اخلاق

کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

یہی تو فرق ہے عام آدمی اور پیغمبر اور مذہبی رہنما میں، ایک کو اپنے پہ اعتبار نہیں اور دوسرے کی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ کوئی چیز اُس کے سامنے رُک نہیں سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ایمان و یقین کو جو پیغمبروں اور اوتاروں کو اپنی ذات پر ہوتا ہے ہم جیسے آدمی تو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اِن رہنماؤں کے احکام اور اعمال کی اپنے اپنے طریقے سے تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ اور اُن کے رُوحانی تجربات کے مُتعلق جنہیں وہ تمثیل و استعارے سے بیان کرتے ہیں۔ ہزاروں نظریئے اختراع کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہماری فکر و نظر ہی مختلف ہے۔ ہمارا زاویۂ نگاہ ہی دوسرا ہے۔ اِس لئے ہم اُن کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب کبھی پیغمبر اور اوتار کچھ کہتے ہیں تو دُنیا اُسے سنے بغیر نہیں رہ سکتی وہ جو کچھ کہتے ہیں ذاتی تجربہ کی بناء پر کہتے ہیں۔ اُن کا ہر لفظ دل سے نکلتا ہے! اور اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُس میں اِتنی کشش اور طاقت ہوتی ہے کہ دُنیا اُس کی تاب نہیں لاسکتی۔ وہ دُنیا پر بم کے گولے کی طرح پھٹتا ہے، آخر وہ بات ہی کیا ہوئی جس میں زور نہیں جس کے پسِ پشت روحانی طاقت نہیں؟ زبان کوئی ہو، طرزِ بیان کوئی ہو، دیکھنا تو یہ ہے کہ الفاظ کے پیچھے اور زبان او بیان کے پردے میں رُوحانی طاقت کہاں تک کار فرما ہے؟ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی گرامر کے اُصولوں کے مطابق بات کرتا ہے یا نہیں یا کسی کے بیان میں بلاغت اور فصاحت ہے یا وہ فقط سادہ سے سادہ الفاظ استعمال کرتا ہے مطلب تو اس سے ہے کہ کہنے والے کے پاس کسی کو کچھ دینے کے لئے کچھ ہے بھی سہی یا نہیں، الفاظ تو تحفہ پیش کرنے کا ذریعہ ہیں خدا کی بخشی ہوئی نعمت کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔ بعض اوقات تو الفاظ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ خاموشی ہی زبان بن جاتی ہے۔ سنسکرت کے ایک شلوک میں خموشی کی زبان کی یوں وضاحت کی گئی ہے۔ لکھا ہے" میں نے دیکھا کہ گُرو دیو درخت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کا شاگرد بیٹھا ہے۔ دونوں خاموش ہیں۔ گُرو دیو خاموشی سے چیلے کو گیان دے رہے ہیں اور چیلے کے تمام شک چپ چاپ دُور ہوتے جا رہے ہیں"۔

مطلب یہ کہ ایسے بلند مقام جگت گرو نہ بولنے پر بھی حق کی تدریس کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی خاموشی سے بھی صداقت برستی ہے اور سب کو نہال کر دیتی ہے۔ وہ بغیر الفاظ کی وساطت کے اپنے دماغ سے دوسرے کے دماغ تک براہِ راست رُوحانی مطالب پہنچا دیتے ہیں۔ وہ رُوحانیت کی یزدانی نعمت لے کر آتے ہیں۔ اور اس بے بہا دولت سے سب کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ اِس شاہانہ شان کا تقاضا ہے کہ وہ حاکمانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ہم سب کو اُن کے احکام بجالانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ یاد کیجئے کہ خود آپ کے اوتار یسوع مسیح کا لہجہ کتنا شاہانہ ہے۔ اُن کی ہر بات سے حاکمانہ شان ٹپکتی ہے۔

سُنیئے تو وہ کیا کہتے ہیں" جاؤ اور اقوامِ عالم کو میرا پیام دو۔ اجاؤ انھیں میرے احکام بجالانے کی تلقین کرو۔ وہ احکام جو میں نے تمہارے لئے صادر کئے ہیں اور جن پر عمل کرنا تمھارا فرض ہے"۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی ہر بات اسی لہجہ میں ادا ہوتی ہے، اُنھیں اپنے پر اور اپنے پیغام پر یقین کامل ہے۔ اور اس اٹل یقین سے اُن کی طاقت کا سرچشمہ پھُوٹ نکلتا ہے۔ یہی حال دوسرے پیغمبروں اور اوتاروں کا ہے۔

کیوں نہ ہو یہ پیغمبر اور اوتار بذاتِ خود خدا کا زندہ مجسمہ ہیں۔ حقیقت مجاز کی صورت اختیار کرتی ہے تو اوتار یا پیغمبر بَن کر رُوئے زمین پر نمودار ہوتی ہے، سچ پوچھیئے تو اِن کے علاوہ ہم کس کی پرستش کر سکتے ہیں؟ ہمارے دماغ کسی غیر مرئی ہستی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ہم لاکھ کوشش کریں کہ خدا کا خیال کسی نہ کسی صورت میں مجسّم ہو کر ہی ہمارے دماغ میں آسکتا ہے، اور جو چیز مجسّم ہو جاتی ہے وہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ خدا کا ایسا محدود تصوّر خدا سے کوسوں دُور ہو جاتا ہے۔ اِس لئے اگر ہمیں کسی مجسّم و محدُود شئے ہی کے تصوّر سے خدا کی ہستی کا شعور و ادراک کرنا ہے تو کیوں نہ اِن پیغمبروں اور اوتاروں ہی کے تصور کا سہارا لیا جائے۔ آخر ان کا تصور اُن تمام تصوّرات سے بلند تر ہے جو ہمارے دماغ میں آسکتے ہیں۔ ان کی عظیم الشان زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اُن کی زندہ مثال ہمارے لئے شمعِ راہ بن چکی ہے اُن کے روشن قدم ہمالے ہدایت کار اور امام ہیں۔ ذرا سوچیئے تو ہم لوگ جو کسی غریب کو روٹی کا ایک ٹکڑا جبراً لینے پر جیل بھیج دیتے ہیں، خُدا کی رحمت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں ہم جو ہر وقت ہاتھ دھو کر دوسروں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ خدا کے عفو و کرم کو کیونکر تصور میں لا سکتے ہیں ہم کو تو اپنی خود غرضی نے محدود و محبوس کر رکھا ہے۔ ہم جو جسم اور حواس کی قید میں پڑے ہیں۔ کائنات کی وسعتوں میں کیونکر سمو سکتے ہیں، اور اگر بفرضِ محال جسم کا خیال ترک بھی ہو جائے تو دماغ (من) کی حدود سے کیونکر نکل سکتے ہیں، اس دائرۂ حیات میں گھر کر جہاں ہر قدم پر خود غرضی اور لین دین کا دور دَورہ ہے۔ ہم لامحدود اور پاک یزدانی محبت کا اندازہ ہی کیونکر لگا سکتے ہیں۔ ہمارا تجربہ تو اُن تعلقات پر محدود ہے جنہیں ہماری خوش فہمی نے محبت کا نام دے رکھا ہے۔ جو بات ہمارے تجربے میں نہیں، اس کا ادراک و شعور مکمل ہی نہیں جو چیز ہم پر گزری نہیں اس کا احساس ہو ہی نہیں سکتا، اِسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ خدا کا ذہنی تصوّر پیدا کرنے کی تمام کوششیں بے سُود ہیں۔ اگر ہمیں واقعی روحانیت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو ہمیں اُن پیغمبروں اور اوتاروں کی پُوجا کرنا ہوگی جنھوں نے ذاتی تجربہ کی بنا پر خدا کو پایا ہے۔ ان کے وجود میں وہ تمام خاصیتیں مجسّم ہوگئی ہیں۔ جن کا ہمارے لئے تصور تک ممکن نہیں۔ ان کے یہاں خیالی آدرش کی بات نہیں۔ واقعی تجربے کا ذکر ہے۔ یزدانی محبت، پاکیزگی، عفو و رحمت سب انسانی قالب میں ڈھل کر ہماری آنکھوں کے سامنے

کھڑی ہیں۔ اگر میرا سر خود بخود اُن کے قدموں میں جھکا جاتا ہے تو اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے، اگر میں اِن زندۂ جاوید ہستیوں کو خدا مان کر پُوجتا ہوں تو کون سی عجیب بات ہے؟ آخر میں اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔ مجھے تو آج تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو خدا کے تصوّر کو ذہن میں لے آیا ہو البتہ باتیں ضرور بہت لوگ کرتے ہیں۔ لیکن باتوں میں واقفیت تھوڑا ہوتی ہے۔ خدا اور اس کی غیر شخصی ہستی کی باتیں اپنی جگہ پر اچھی ہیں لیکن عملی طور پر پیغمبر اور اوتار ہی دُنیا کی تمام نسلوں اور قوموں کے خدا ہیں۔ اِن یزدانی ہستیوں کی ہمیشہ پُوجا ہوتی آئی ہے اور جب تک انسان کی سرشت بدل نہیں جاتی۔ اُن کی پُوجا اسی طرح ہوتی رہے گی۔ اِسی میں نسلِ انسانی کی نجات ہے۔ اسی پُوجا کی بدولت ہمیں ایمان اور اُمید کی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں، اِسی میں ہماری ارتقا کا راز مضمر ہے۔ محض خیالی اُصولوں سے کاروبارِ جہاں نہیں چل سکتا۔

بہر حال میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ کم از کم میرے لئے تو دُنیا کے سب پیغمبر اور اوتار قابلِ پرستش ہیں۔ میں ہر ایک کی پُوجا کرتا ہوں، اور ہر آنے والے جگت گُرو کی پُوجا کرنے کے لئے تیار ہوں، بچہ چاہے جتنے بھی لباس بدل بدل کر ماں کے سامنے آئے ماں اُسے ہر صورت میں پہچان لیتی ہے۔ وہ ماں ہی کیا جو اپنے بچے کو نہ پہچان سکے۔ اگر آپ میں سے کوئی یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ روحانیت اور خدا کا جلوہ صرف آپ ہی کے مخصوص پیغمبر یا اوتار میں نظر آتا ہے۔ اور اس ہی کی معرفت حقیقت کو پایا جا سکتا ہے کسی دوسرے کی معرفت نہیں تو میں اُس کی خدمت میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ میرے دوست تم میری نظر میں ابھی یزدانیت کو پہچانتے ہی نہیں تمہیں خود اپنے پیغمبر کی عظمت اور رُوحانیت کا اندازہ نہیں۔ تم نے تو صرف کچھ فقرے رَٹ لئے ہیں۔ کچھ الفاظ کو اپنا لیا ہے اور بس، تم تو ایک مخصوص فرقے کے فرد ہو کر رہ گئے ہو۔ یہ مذہب نہیں۔ یہ تو فرقہ پرستی ہے۔ تم جیسے سیاسی پارٹی کے ممبر بن گئے۔ ویسے ہی کسی مذہبی فرقے میں شامل ہو گئے۔ میں اُسے مذہب نہیں کہتا۔ مذہب تو ذاتی تجربے کی بات ہے۔ ذہنی رائے کی نہیں۔ مذہب تو رُوحانی ارتقا کا نام ہے۔ مذہب کا تعصب سے کوئی تعلق نہیں۔ رُوحانیت کا سچا طالب ہر پیغمبر اور ہر اوتار کی تعلیم سے فائدہ اُٹھاتا ہے وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص تعلیم کے دائرے میں محدود نہیں کر لیتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں کئی ایسے بے وقوف بھی ہیں جو ہر طرف میٹھے پانی کے چشمے دیکھ کر بھی اپنے جدّی کنوئیں کا کھارا پانی ہی اس لئے پئے جاتے ہیں کہ وہ کنواں اُن کے باپ دادا کا بنایا ہوا ہے۔ مذہب میں اس قسم کے دیوانہ پن کی کوئی گنجائش نہیں۔ مذہب اِس معاملے میں بدنام ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک میرا اپنا محدود تجربہ اور علم پہونچ سکا ہے۔ باوجود اِس کے کہ مذہب کے نام سے ہر قسم کی شیطنت منسوب کی گئی ہے۔ مذہب کا کوئی قصور نہیں نہ تو مذہب نے آج تک کسی پر ظلم ڈھانے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ ہی مبتسمہ

چڑیلوں کو زندہ جلائے کو روا رکھا ہے، مذہب نے کبھی ایسی باتوں کو گوارا نہیں کیا، اگر کسی چیز نے لوگوں کو اِن شیطانی حرکتوں کے لئے اُکسایا ہے تو وہ سیاست ہے۔ مذہب نہیں، اور اگر سیاست مذہب کا نام لے کر اِن حیوانی کرتوتوں کا ارتکاب کرتی ہے تو اِس میں مذہب کا کیا قصور؟ شیطان فرشتے کے بھیس میں آ کر شیطانی کرے تو اس میں فرشتوں پر کیا الزام عائد کیا جا سکتا ہے؟

تو یاد رکھیئے کہ اگر کوئی شخص یہ دعوٰے کرتا ہے کہ فقط اُس کا مذہب سچا ہے اور اس کا پیغمبر رُوحانیت کا واحد علمبردار ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ شخص مذہب اور رُوحانیت کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔ مذہب نہ تو زبانی باتیں ہیں نہ بحث و مباحثہ نہ نظریہ بازی ہے نہ دماغی طور پر کسی خاص اعتقاد کا اعتراف، مذہب اور روحانیت تو نام ہے اِس احساسِ لطیف کا جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھتا ہے جس کی بدولت انسان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے چھُو رہا ہے، مذہب تو وہ لطیف شعور ہے جب آدمی اپنے آپ کو رُوح سمجھنے لگتا ہے اور جان جاتا ہے کہ وہ کائنات کی رُوحِ اعظم کی تمام جلوہ ریزیوں سے منسلک ہے۔ اگر آپ کو مذہب اور رُوحانیت سے واقعی لگاؤ ہے تو آپ کی نظر میں وسعت اور آپ کی فکر میں گہرائی لازمی ہوگی، آپ مذہب اور رُوحانیت کو کسی خاص پیغمبر یا اوتار کی ذاتی ملکیت شمار ہی نہیں کر سکیں گے۔ بھلا اگر آپ کی رسائی خدا کے گھر[ل] تک ہے تو کیا آپ خدا کے اِن مایۂ ناز فرزندوں کو پہچان نہیں سکیں گے جنہیں ہم پیغمبر کہتے ہیں۔ اور اگر آپ اُن کو پہچان نہیں پاتے تو آپ ابھی خدا کے گھر[ل] سے بہت دُور ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ماں اپنے بچّے کو ہر لباس میں پہچان لیتی ہے اسی طرح خدا کے سچے بندے خدا کے ہر پیغمبر میں اُسی کا جلوہ دیکھتے ہیں، یہ عظیم الشان روحانی ہستیاں جو وقتاً فوقتاً مختلف مُلکوں میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ سب ایک ہی حقیقت کا پیغام لے کر آتی رہی ہیں۔ کسی نے اس حقیقت کے ایک پہلو پر زور دیا۔ تو کسی نے دوسرے پہلو پر، مگر ان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں کوئی اختلاف نہیں۔ آؤ ہم اِن سب کو اچھی طرح پہچانیں۔ اور آپس کے ظاہری تفرقات کو مٹا کر اس بنیادی حقیقت تک جانے کی کوشش کریں۔ جس کی تعلیم ہر جگت گُرو نے دی ہے۔ یاد رکھیئے کہ جہاں کہیں اور جب کبھی بھی انسان نے عملی طور پر مذہب کے معنی کو سمجھا ہے اور سچی روحانیت کو پایا ہے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی بھی انسان نے خدا کی ہستی کے وجود کو محسوس کیا ہے۔ اور اس کی رُوح کو خدا کی قربت حاصل ہوئی ہے۔ وہاں ہمیشہ انسان کی فکر و نظر میں اتنی وسعت پیدا ہوئی ہے کہ اُسے ہر طرف

ل The House of the Father.

انوارِ جلوہ کی چمک نظر آنے لگی ہے، مثال کے طور پر اہلِ اسلام کو دیکھئے اُن کا عقیدہ ہے کہ خُدا ایک ہے، اُس کے علاوہ دوسرا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اُس کے رسول ہے لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ، اِس مقدّس کلمے کی صداقت میں کِس کو شک ہو سکتا ہے. لیکن جب اُس کا مطلب یہ لیا جانے لگا کہ انسان کو اُس واحد خدا تک صرف اِسلام ہی کا پیغمبر لے جا سکتا ہے تو مذہب نے ایک سیاسی صورت اختیار کرلی - اور اہلِ اسلام کے علاوہ سب کو کافر قرار دے دیا گیا - حالانکہ یہ بات پیغمبرِ اسلام کی تعلیم کے موافق نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحرِ الکاہل سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک مذہب کے نام پر پانچ سو سال تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا. لیکن ہر اُس مسلمان نے اِس خوں ریزی کے خلاف آواز اُٹھائی جس نے اپنے مذہب اور اپنے پیغمبر کو عملاً اپنایا اور سمجھا، اور یزدانی حقیقت کو محسوس کیا، یہ سچّے مسلمان مذہب کو سیاسی آلۂ کار بنانے سے ہمیشہ اِنکار کرتے رہے - کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہب یا روحانیت کسی کی موروثی ملکیت نہیں ہے، مذہب تو وہ راہِ عمل ہے جس پر گامزن ہو کر انسان حقیقت تک جا پہونچتا ہے - اور اس راہ پر ہر انسان کو حق ہے کہ اپنی اہلیت اور اپنے رُجحانِ طبع کے مطابق قدم اُٹھائے -

پیغمبروں اور اوتاروں کے کردار کو سمجھنے کے لئے ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے، آجکل ایک طرف تو ہم زمانۂ حال کے نظریۂ ارتقا کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف مذہب کے معاملے میں گذشتہ زمانے کے بوسیدہ نقشوں پر اپنی زندگی قائم کرنا چاہتے ہیں - یہ دو رجحانات ایک ساتھ نہیں چل سکتے - اِس لئے ہمیں عہدِ جدید کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے مذہبی خیالات کو نئے سرے سے تشکیل کرنا ہوگا - فِکر کی نئی راہ نکالنا، نظر کا نیا انداز پیدا کرنا آسان نہیں ہے ہم سے غلطیاں ہوں گی لیکن اس میں کیا مضائقہ ہے -؟ کیا ہم غلطی کے ڈر سے اپنے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیں؟ کیا ہم ٹھوکر کے خوف سے دینی منزل تک جانے کی کوشش ہی ترک کر دیں؟ آخر غلطیوں ہی سے تو آدمی سیکھتا ہے - ہمیں غلطیوں سے ڈرنا نہیں چاہیے. علم و آگہی غلطیوں کے بغیر ممکن ہی نہیں - آپ کے سامنے یہ دیوار کھڑی ہے - کیا اِس دیوار نے عمر بھر کبھی جھوٹ بولا ہے؟ یہ تو چُپ سادھے ہمیشہ اسی طرح کھڑی رہتی ہے. لیکن آخر یہ دیوار کی دیوار ہی تو رہ جاتی ہے اِسی طرح جانور کبھی جھُوٹ نہیں بولتے. لیکن کیا اس وجہ سے گائے بھینس ہم سے بلند تر ہیں؟ آدمی جھوٹ بولتا ہے. لیکن وہی جھوٹ بولنے والا آدمی ترقی کرتے کرتے دیوتاؤں اور فرشتوں کے مقام تک بھی تو پہنچ جاتا ہے. ضرورت تو عمل کی ہے اس کی پروا نہیں کہ عمل کبھی غلط راہ پر چل نکلتا ہے - چلنے والا آدمی ضرور ٹھیک رستے پر آجائے گا. قابلِ رحم تو وہ آدمی ہے جو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہے، ہمیں کچھ کرنا ہے تو دستِ بازو کو عمل کی اور دل و دماغ کو فکر کی عادت ڈالنا ہوگی - اِس سے تو ہرگز کام نہیں چلے گا کہ ہم باپ دادا

کے خیالات کی اندھا دُھند پیروی کرتے رہیں، اگر ہم اِسی پر اکتفا کریں گے اور اپنے لئے کوئی نئی راہ نہیں نکالیں گے تو ہمارے احساس اور شعور کی طاقت مٹ جائے گی۔ اِس سے تو موت ہی بہتر ہے۔ اگر ہمارے دماغ سے تر و تازہ اور زندہ خیالات پیدا نہیں ہوتے تو پھر جینے کا مزا ہی کیا ہے۔ مذہب اور رُوح کے متعلق ذاتی فکر و احساس کی بنا پر ہمارا کوئی راسخ اعتقاد ہی نہیں ہے تو ہماری زندگی زندگی ہی نہیں۔ اگر ہم محض تقلید کرنا ہی جانتے ہیں تو ہم سے ناستک بھی کہیں بہتر ہیں۔ اُنہیں ایمان والوں سے اختلاف سہی لیکن اُن میں خود سوچنے کی اہلیت تو ہے۔ آخر اسی قوتِ فکر، اِسی آزاد خیال اور جرأتِ اِنکار ہی کی بدولت اُمید کی جا سکتی ہے کہ ایک دن وہ خدا تک جا پہونچیں گے لیکن اُن لوگوں کا کیا جائے، جن میں سوچ بچار کا مادّہ ہی مِٹ گیا ہو۔ ایسے لوگوں میں تو جان ہی نہیں ہے، اُن کے لئے مذہب اور رُوحانیت کے میدانِ عمل میں ایک قدم اُٹھانا بھی مشکل ہے جو اپنے دماغ سے کام لینا ہی نہیں جانتا۔ وہ بھلا مذہب اور روحانیت کو کیا سمجھے گا۔ ہاں مُنکر اور ناستک کم از کم اپنی عقل کو استعمال میں تولاتے ہیں، وہ اِسی راستے سے رُوحانیت حاصل کر سکتے ہیں، اِسی لئے تو میں بار بار یہی کہتا ہوں عقل سے کام لیجئے خود سوچئے۔ بچارئیے۔ غور کیجئے۔ یہ دماغی کاوش یہ جدوجہد ہی تلاشِ حق میں آپ کی مددگار ہوگی۔ بیٹھے بٹھائے خُدا نہیں ملتا۔ اگر کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو کوئی بات نہیں، اپنی کوششوں کو جاری رکھیئے۔ اگر ذاتی غور و فکر سے آپ کِسی عجیب و غریب نتیجے پر پہنچتے ہیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہی غور و فکر کی قابلیت آپ کو آخر منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ اگر آپ کو اس بات کا ڈر ہے کہ دُنیا آپ پر انگلیاں اُٹھائے گی، تو اپنے خیالات کو خود اپنے تک محدود رکھیئے، انہیں اپنے ہی سینے میں ذرا اور تھام رکھیئے۔ لیکن اپنی تلاش کو جاری رکھیئے۔ اپنی جدّ و جہد کو ترک نہ کیجئے۔ آخر کامیابی ضرور ہوگی۔ روحانیت کا آفتاب آخر ضرور اپنی پوری آب و تاب سے نُور پاش ہوگا۔ یاد رکھیئے کہ اگر کسی کو روز پکّی پکائی مِل جائے وہ آرام سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے تو اُسے ہاتھ سے کام لینا ہی بھُول جائے گا، روحانی زندگی میں بھی یہی ہوتا ہے اگر ہم اِس میدان میں بس ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بھیڑ چال ہی چلتے رہیں تو آخر روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جہاں عمل نہیں وہاں موت ہی کی بے حسی رہ جاتی ہے۔ عمل کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیجئے، عمل مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ جہاں عمل ہے۔ وہاں فرق اور امتیاز بھی ضرور ہوگا۔ فرق اور اختلاف ہی تو زندگی کی نشانی ہے۔ اِسی سے تو زندگی میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔ یہی تو زندگی کا جمال ہے۔ اسی سے تو کائنات کے حسین نقش و نگار پیدا ہوتے ہیں۔ فن کارِ عالم کا ہُنر اسی سے تو آشکار ہوتا ہے۔ فرق اور اختلاف سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اس کے پسِ پشت جو ایک حقیقت ہے۔ اُس کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

مجھے آپ سے اتنی لمبی تمہید کے لئے معافی مانگنا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس کے بغیر دُنیا کے اوتاروں اور پیغمبروں کو سمجھنا مشکل تھا، اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اُن کو کسی حد تک سمجھ سکیں گے ہم نے تاریخ پر سرسری نظر ڈال کر دیکھا کہ بے جان اور بے حس آدمیوں کو چھوڑ کر جب کبھی بھی اِنسانی فکر اپنی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوئی ہے۔ جب کبھی بھی انسان کو خدا سے سچی لگن لگی ہے۔ اُسی کی رُوح خدا کے قریب تر ہوتی گئی ہے۔ اور بالآخر اُس کی روشن آنکھوں کو خدا کا براہِ راست اور مکمل جلوہ نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ احساسِ ایزدی لمحہ بھر ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔ انسان کی زندگی کا رُخ بدل دیتا ہے" سب شک ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ کے سب بَل نکل جاتے ہیں، چالاکی اور ریاکاری کا نشان تک مِٹ جاتا ہے۔ دُنیا و مافیہا کی سب بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ انسان "کرم" (عمل) کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اور اُسے اُس پرماتما کے درشن ہو جاتے ہیں جو دُور سے دُور چیز سے بھی بہت پرے ہے۔ اور نزدیک سے نزدیک شئے سے بھی بہت قریب تر ہے۔ یہی مذہب ہے یہی روحانیت ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے محض عقیدوں اور نظریوں کا سلسلہ ہے۔ اُن کی اہمیت بس یہی ہے کہ یہ شعور (ادراک اور احساس ذات) کی منزل کی راہ دکھاتے ہیں۔ لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی کم نظری کی وجہ سے میں راہ کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مقام پر رُک جاتا ہے۔ اور پھر اس بات پر تکرار ہونے لگتی ہے کہ کس کا مقام اعلیٰ ہے۔ ہماری مثال یوں ہے کہ ہم پھل کی ٹوکری کے بارے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کش مکش میں پھل بدرو میں جا گرے ہیں۔ مذہب کے نام پر لڑنے والوں سے مجھے تو یہی پُوچھنا ہے کہ کیا آپ کو اُن تمام باتوں کا ذاتی تجربہ ہے جن کے متعلق آپ اتنی باتیں کرتے ہیں؟ کیا آپ کے دعوؤں کی پشت پر ذاتی ادراک و شعور موجود ہے۔؟ مثلاً اگر کوئی کہتا ہے کہ یسوع مسیحؑ خدا کا واحد پیغمبر ہے تو میں اس سے پُوچھوں گا کہ کیا آپ نے اپنے پیغمبر کو دیکھا ہے؟ کیا آپ کے باپ دادا نے اُسے دیکھا ہے۔ کیا آپ نے دوسرے پیغمبروں کو دیکھا ہے؟ اور اگر نہیں تو یہ سب دعوے کیسے؟ یہ سب بحث و مباحثے اور تکرار کیوں؟ پہلے اپنے پیغمبر کے کہنے پر عمل کرنا سیکھو، پہلے رُوحانیت کو اپنی ذات میں پیدا کرو، موازنے اور مقابلے کا سوال ہی نہیں اُٹھے گا۔ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ کبھی اِن فضول جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔

دراصل سب اوتار اور پیغمبر سچّے ہیں۔ سب کا مقام بہت ہی بلند ہے۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک ہمیں اپنا مخصوص اُصول سکھانے کے لئے نازل ہوا اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہمیں متعدد سُنہری اُصول وراثت میں ملے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی میں تبرک اور تقدس بھر سکتے ہیں بھگوان سری کرشن کو لیجئے۔ آپ نے گیتا کو پڑھا ہوگا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے تک جس واحد اُصول کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ ہے بے تعلق ہو کر کام کرنے کا اُصول۔ دُنیا میں کنول کے پھُول کی طرح بے تعلق ہو کر رہیئے

تعلق واجب ہے تو بس ایک ہی ہستی سے۔ محبت کرنا ہے تو اُسی ایک پرماتما سے جو لازوال اور لاثانی ہے جو کبھی تغیّر پذیر نہیں ہوتا۔ دل دینا ہے تو اُسی محبوبِ واحد کو دیجئے۔ دُنیا کی کسی اور چیز سے دل لگانا دُکھ درد اور مصیبت کو مول لینا ہے۔ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ آدمی سے پیار کیا اور وہ مر گیا تو عمر بھر کا رونا دے جائے گا۔ دوست سے محبت برتی اور وہ وفادار نہ نکلا تو دُکھ ہی ملے گا اور تو اور خاوند اور بیوی کا پیار بھی ذرا سی غلط فہمی اور رنجش سے مٹ جاتا ہے۔ اور دل پر چوٹ لگتی ہے یا موت محبوب کو چھین لیتی ہے اور آدمی ایسا محسوس کرتا ہے کہ دُنیا ہی تباہ ہو گئی۔ دُنیا کا تو کاروبار ہی اسی طرح چلتا ہے، یہاں ہر چیز فانی ہے۔ یہاں کی محبت اور دوستی بھی مٹ جاتی ہے۔ اسی لئے بھگوان سری کرشن گیتا میں کہتے ہیں "پرماتما سے پیار کرو۔ وہی ایک واحد ہستی ہے جس کو ثبات حاصل ہے، اُسی کی محبت لازوال ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں، ہمارا محبوبِ ازلی ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم پر ہر وقت اُس کی عنایت ہوتی ہے۔ اُس کے دل میں ہمارے لئے محبت بھری ہے۔ اُس کے لطف و کرم کی کوئی حد ہی نہیں، اُس کی محبت میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ بھی کریں وہ ہم سے ناراض نہیں ہوتا وہ تو صرف محبت کرنا ہی جانتا ہے۔ بھلا خدا بندوں سے ناراض کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کا بچہ کوئی شرارت کرے تو کیا اُس کی وجہ سے بچے کے لئے آپ کی محبت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ کیا آپ اُس سے ناراض ہو جاتے ہیں؟ تو خدا کے ناراض ہونے کے کیا معنی؟ وہ تو دانائے کُل ہے۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ ہماری منزل کیا ہے؟ ہماری زندگی کی معراج کیا ہے؟ ہماری اصل مکمل اور پاکیزہ ہستی ہے اور آخر کار ہمیں اُسی کمال تک پہنچنا ہے۔ پرماتما صبر و تحمل کا مجسمہ ہے، وہ نہایت اطمینان اور صبر سے انتظار کر رہا ہے۔ آؤ ہم اپنی ساری محبت اُسے سونپ دیں۔ اور پھر اُس کی محبت میں سرشار ہو کر دُنیا سے پیار کریں۔ کیونکہ یہ تمام سنسار اُسی کا ہے۔ وہی اس کائنات میں بس رہا ہے۔ دُنیا کے تعلقات میں بھی اُسی کی کشش ہے آؤ ہم دُنیا سے اندھی محبت کی بجائے آنکھیں کھول کر پیار کریں۔ ہر چیز میں پرماتما کو جلوہ گر دیکھ کر اپنی محبت اس پر نچھاور کریں۔ ماں باپ سے دوستوں سے۔ بچوں سے بیوی سے سب سے پیار کریں۔ لیکن اُن تعلقات کی خاطر نہیں جو ہمیں اِن سے ہیں۔ بلکہ اُس واحد رشتہ کی خاطر جو پرماتما کو اُن سب میں دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اِسی لئے تو کہا ہے "میری محبوب خاوند سے اِس لئے پیار نہیں ہوتا کہ وہ خاوند ہے بلکہ اس لئے کہ پرماتما خاوند میں جلوہ گر ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ خاوند اور بیوی کے رشتے میں بیوی اور خاوند ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ کشش جسے ہم محبت کہتے ہیں۔ خود بھگوان کی کشش ہے۔ کیونکہ خود بھگوان ہی سے تو دونوں کا وجود قائم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عموماً ہم بھگوان کی موجودگی کو محسوس نہیں کرتے۔ اور ایک دوسرے سے دُنیاوی اور جسمانی تعلقات کی بناء پر

پیار کرتے ہیں۔ جب تک غفلت کا یہ پردہ ہماری آنکھوں پر پڑا رہتا ہے اس وقت تک ہماری محبت میں سکھ کے ساتھ دُکھ بھی لگا رہتا ہے لیکن جب ہم پرماتما کی موجودگی سے آگاہ ہو کر محبت کرتے ہیں تو محبت پاک ہو کر سراپا مسرت ہو جاتی ہے اور ہم پر نجات کے دروازے کُھل جاتے ہیں۔ ویدانت کے فلسفے کے مطابق محبت کا یہی راز ہے۔ ہماری مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ جہاں کہیں محبت کی روشنی ہے اور جہاں کہیں مسرت کا شعلہ نمودار ہوتا ہے۔ وہاں خدا خود موجود ہوتا ہے کیونکہ وہی سب نُور کا مطلع ہے اور وہی سب نشاط کا مخزن سب چیزیں اُسی کے نور سے رُوشن ہیں۔ سب مسرتیں اُسی کی خوشی سے ماخوذ ہیں۔ اُسی کی ذات کا دوسرا نام محبت متبرک اور مسرت ہے اُس کے بغیر نہ کہیں محبت مل سکتی ہے نہ مسرت۔

بھگوان سری کرشن کی تعلیم کا موضوع یہی ہے کہ اپنا سب کچھ پرماتما کے ارپن کردو۔ بے تعلق ہو کر کام کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اسے بھگوان سے متعلق کردو۔ خود سپردگی کے اس اُصول کو بھگوان سری کرشن نے اپنی قوم کے کردار کا جزو بنا دیا ہے یہ طریقۂ عمل ہندوؤں کی سرشت میں داخل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہندو پانی بھی پیتے ہیں تو یہ پرارتھنا دُہراتے ہیں کہ پربھو اگر اُس کرم" (عمل) میں کوئی خوبی ہے تو اُسے قبول کرو بُودھ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔ لیکن سری کرشن کی تعلیم کا اثر اُن پر بھی ہوا ہے۔ اگر کسی بودھ سے کوئی نیک کام سرانجام ہو پاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ "میرے کام کا ثواب اس دُنیا کو پہنچے اگر میرے "کرم" میں کوئی خوبی ہے تو اس کا پھل مجھے نہیں تمام دُنیا کو پہنچے بلکہ اگر ہو سکے تو دُنیا کے پاپوں کا پھل بے شک مجھے مل جائے تاکہ سب جہان کا تو بھلا ہو" بات وہی ہے جسے ہندوان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ اپنے کرموں کا پھل بھگوان کے اَرپن کردُ ہندو پرماتما کی ہستی میں اعتقاد رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پرماتما قادرِ کُل ہے وہی تو واحد رُوحِ اعظم ہے ہے جس سے ہر روح پردۂ شہود پر نمودار ہوتی ہے۔ وہی کائنات کی روحِ رواں ہے، وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اس لئے سب کچھ اسی کا ہے اور اُسی کو ارپن کر دینا چاہئے۔ ثواب کی اُمید اور عذاب کے خوف کو ترک کر دینا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اپنے نیک اعمال کا پھل پرماتما کو بھینٹ کر دینا ہی سب سے بڑی قربانی" ہے۔ اس سے تمام کائنات کا بھلا ہو گا کیونکہ سارا جہان پرماتما ہی کا رُوپ تو ہے۔

بھگوان سری کرشن کہتے ہیں کہ "اُس دُنیا میں رہ کر جو اپنے تمام کرموں کا پھل پرماتما کی بھینٹ کر دیتا ہے۔ اُسے دُنیا کی کوئی بُرائی چھو ہی نہیں سکتی۔ جیسے کنول کا پھول پانی کی تہ سے اُٹھتا ہے لیکن کھلتا ہمیشہ سطح پر ہے اسی طرح وہ شخص بھی دُنیا کے بندھنوں سے آزاد ہے جو دُنیا کے کاروبار میں مشغول رہ کر بھی بھگوان سے غافل نہیں رہتا اور اپنا ہر کام اُسی کے ارپن کر دیتا ہے"۔

بھگوان سری کرشن ترکِ دُنیا کی تعلیم نہیں دیتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ کام سے کنارہ کش ہو جاؤ بلکہ

اُن کی تعلیم کا لُبِ لباب تو یہ ہے کہ متواتر کام کئے جاؤ۔ دِن رات کام کرو۔ آپ پوچھیں گے کہ اس بے تحاشہ کام میں آرام کہاں ہے، اس میں سکون کیونکر ملے گا؟ بھگوان کہتے ہیں" سکون ضرور ملے گا۔ لیکن کام سے بھاگنے سے نہیں"۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کسی کو نہ سکون ملا ہے نہ ملے گا۔ اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کے دیکھ لیجئے۔ شہروں سے دُور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر بھی آدمی کا مَن تو چکر ہی میں رہتا ہے۔ اس سے تو لمحہ بھر چین نہیں، لٹّو کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ ایک سنیاسی سے جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں گھومتا رہتا تھا کسی نے پُوچھا" مہاراج کیا آپ کو ابھی تک کوئی اچھی جگہ قیام کرنے کے لئے نہیں ملی؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ یہاں ہمالیہ کے پہاڑوں میں کتنے عرصے سے گھوم رہے ہیں"۔ سنیاسی نے کہا۔ چالیس برس سے یہیں گھوم رہا ہوں۔ یہ سُن کر اُس آدمی کو حیرانی ہوئی اور اُس نے پُوچھا" مہاراج یہاں تو ایک سے ایک خوبصورت جگہ ہے۔ کیا آپ کو یہاں ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ پسند نہیں آئی"۔ سنیاسی نے جواب دیا۔" ٹھہرنے کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے۔ اِن چالیس برسوں میں میرے چنچل مَن نے مجھے رُکنے ہی نہیں دیا" دیکھا آپ نے مَن کا چین حاصل کرنا اتنا آسان نہیں سکون فقط کام چھوڑ دینے سے نہیں مل سکتا۔ آپ نے اُس سپاہی کی کہانی تو سُنی ہوگی جو تاتار ڈاکو کو پکڑ لایا تھا۔ یہ سپاہی جب اپنی بارکوں کے نزدیک پہنچا تو اُس نے زور سے آواز دی۔ دیکھو میں تاتار ڈاکو کو پکڑ لایا ہوں۔ اندر سے آواز آئی" اِسے بارک میں لے آؤ۔ سپاہی نے جواب دیا" یہ بارک میں نہیں آتا"۔

"اچھا تو تم اندر آجاؤ"۔

" یہ مجھے چھوڑتا ہی نہیں۔ میں کیسے اندر آؤں"۔

یہی حال ہمارے مَن کا ہے۔ اس پر قابو پانا مشکل ہے۔ ہم اس مَن سے کہتے ہیں" چین سے رہو صبر وتحمل سے کام لو"۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے کہنے سے ہمیں اطمینانِ قلب نصیب ہو جائے گا۔ کہنے کو تو کچھ بھی سکون اور آرام کی باتیں کر سکتے ہیں۔ لیکن دل کا سکون حاصل کرنا مشکل کام ہے۔ میں یہ بات اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال کر چاہا کہ مجھے سکونِ دل مِل جائے۔ میں بھی برسوں پہاڑوں میں گھومتا رہا۔ میں غاروں اور جنگلوں میں رہتا رہا۔ لیکن مَن کا چین کہیں نہ ملا۔ تاتار ڈاکو کی طرح میری دُنیا نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ ڈاکو ہمارے مَن کی صورت میں ہمارے ہی اندر موجود ہے۔ اِس لئے دوسروں کو دل کی بے چینی کا باعث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ کچھ حالات سکونِ قلب کے لئے موافق ہوتے ہیں اور کچھ منافق۔ اطمینان اور سکون تو داخلی چیز ہے۔ خارجی دُنیا نہ ہمیں تسکین دے سکتی ہے۔ اور نہ ہمارے سکون کو ہم سے چھین سکتی ہے۔ اگر ہم اپنے اندر کے ڈاکو کو

چُپ کرواسکتے ہیں تو ہمیں یقیناً شانتی نصیب ہوگی۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کرسکتے تو کام کاج چھوڑ دینے سے تو ہمیں سکون اور چین ملنے سے رہا۔

اِسی لئے تو بھگوان سری کرشن ہمیں کام ترک کرنے کو نہیں کہتے۔ وہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کی تعلیم ہرگز نہیں دیتے بلکہ اُن کا کہنا تو یہ ہے کہ اِن ذمہ داریوں سے مردانہ وار سُبکدوش ہونا ہمارا فرض ہے، شرط صرف یہ ہے کہ نتائج کی پرواہ نہ ہو جو کام ہمارے حصے میں آیا ہے اُسے پھل کی فکر کئے بغیر نبھانا لازمی ہے ہم تو بھگوان کے خدمت گار ہیں ہمیں بحث و مباحثہ سے کیا ہم تو اُس کے سپاہی ہیں۔ ہمارا منطق اور دلیل سے کیا واسطہ۔ ہمارا فرض بس یہی ہے کہ اپنا کام کئے جائیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہمارا حق تو محض اسی پر ہے کہ اپنے کام کی نوعیت اور درجہ کا خیال نہ کرتے ہوئے اسے پوری دیانتداری اور تندہی سے کرتے جائیں، ہمیں تو بس ایک ہی بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ ہر کام سے پہلے اپنے من سے یہ سوال ضرور پوچھ لینا چاہیئے کہ کیا وہ کام بے غرضانہ ہے۔ یا اُس میں ہماری کچھ غرض مضمر ہے۔ اگر کسی کام میں خود غرضی شامل نہیں ہے تو بے فکر ہو کر اُس کام کو کرتے جاؤ۔ جہان کی کوئی طاقت تمہیں روک نہیں سکتی ہچکچانے کی چنداں ضرورت نہیں، دریائے عمل میں غوطہ زن ہو جاؤ۔ حق و صداقت کے موتی ہمیں ضرور ملیں گے بھگوان سری کرشن کا یہی پیام ہے۔ اُن کے اپنے مبارک الفاظ کو سُنئے فرماتے ہیں" یوگی وہی ہے، کام کرنے کا راز وہی جانتا ہے جو کام کی شدّت ہی میں آرام ڈھونڈھ لیتا ہے۔ جسے شور و تلاطم میں بھی سکون و عافیت کی جھلک نظر آتی ہے اور ساتھ ہی مکمل اطمینان اور شانتی میں بھی زندگی کی تیز رفتاری اور شدّت سے غافل نہیں ہوتا۔ ایسا شخص رُوحانی ارتقا کی بلند ترین منزلوں سے ہوتا ہوا ہستی کے کمال کو حاصل کرلیتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ بھگوان سری کرشن نے یہ تعلیم دے کر عمل کا یہ راز بتا کر ہمارے سب دنیاوی فرائض کو تبرک اور تقدس بخش دیا ہے۔ اِس فلسفہ کی رُو سے دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے ہم کم درجہ کہہ سکتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں جسے ہم اس کے کام یا پیشہ کی وجہ سے نیچ کہہ سکیں۔ ہر شخص کا کام اپنی جگہ اہم اور متبرک ہے جب کام بھگوان ہی کے اَرپن کرنا ٹھہرا اور جب بھگوان سب کی بھینٹ کو برابر قبول کرتے ہیں تو فرق و امتیاز کہاں رہ جاتا ہے۔

جس دوسرے جگت گُرو کا مجھے آج ذکر کرنا ہے وہ ہیں مہاتما بدھ۔ اُن کا معرکتہ الآرا پیغام سُنیئے جنے دُنیا کو ہلا دیا جس میں آج بھی زبردست طاقت ہے۔ اور جسے سُن کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ خود ہمارے دل میں اس کا مقام ہے۔ بھگوان بُدھ کہتے ہیں خود غرضی کو کُلّیتاً مٹا دو۔ اس کو جڑ سے اُکھاڑ پھینک دو۔

ہر اُس چیز سے احتراز کرو جو خود غرضی کی طرف لے جاتی ہے۔ دُنیا کے غلام نہ بنو۔ اپنی جھوٹی خودی کو ختم کر دو مکمل طور پر بے غرض بن جاؤ۔ دُنیا دار بے غرض ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ لیکن جہاں عملی ثبوت دینے کا موقع آتا ہے۔ خود غرضی کی طرف جھک جاتے ہیں۔ مثلاً خاوند اپنی بیوی کو دیکھ کر بے غرضی کے سارے دعوے بھول جاتا ہے یا ماں اپنے بچے کو سامنے پا کر تمام دُنیا کو اس پر قربان کرنے پر تُل جاتی ہے دُنیا کی ہر شئے کا یہی حال ہے۔ مہاتما بدھ کہتے ہیں کہ جب انسان کے دل میں اپنی غرض پوری کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور اس خواہش سے محرک ہو کر انسان خود غرضی کی راہ پر چل دیتا ہے۔ تو اس کی حقیقی ہستی، اس کی سچی خودی غائب ہو جاتی ہے۔ وہ خواہشات کا غلام ہو کر وحشی حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اُسے دوسرے انسانوں سے ہمدردی نہیں رہتی وہ کبھی دوسروں کو اپنے پر ترجیح نہیں دیتا، "پہلے آپ" اس کی زبان سے نکلتا ہی نہیں۔ اس کی زندگی کا تو یہی اصول بن جاتا ہے کہ مجھے تو اپنے کام سے مطلب ہے مجھے دوسروں کی کیا پڑی وہ اپنے مفاد کا خود خیال رکھ لیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں ہمیں بھگوان سری کرشن کے قوت بخش پیام کی ضرورت ہے۔ وہاں مہاتما بُدھ کی انسانیت خیز تعلیم کے بغیر بھی ہماری زندگی بلند نہیں ہو سکتی بھگوان کرشن کے بتائے ہوئے اُصول پر عمل کرنے سے ہی دُنیا کا کاروبار ٹھیک چل سکتا ہے نہیں تو ہم ہل بھی نہیں سکتے۔ انہیں کی تعلیم کی بدولت ہم اپنے ہر فرض کی ادائیگی سے سکون اور خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہر ذمہ داری وبالِ جان بن کر رہ جائے۔ وہ کہتے ہیں اگر تمہارے کام کا کوئی پہلو اچھا نہیں تو گھبرانے کی کیا بات ہے۔ دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ بُرائی نہ ہو۔ تم بے تعلق ہو کر کام کئے جاؤ۔ کام کے نتائج بھگوان پر چھوڑ دو۔" یہ سب کچھ بجا ہے اور اس پر عمل کئے بغیر جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے دل میں سکون اور چین کی جو زبردست خواہش ہے۔ اُس کو مہاتما بُدھ کی تعلیم ہی پُورا کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ دُنیا کی ہر شئے محدود اور فانی ہے۔ ہر طرف دُکھ اور مصیبت ہے۔ اگر ایک کے پاس کھانے کو اچھا کھانا ہے، اور پہننے کو اچھا کپڑا ہے تو ہزاروں بھُوکے مرتے ہیں۔ اور لاکھوں ننگے رہتے ہیں۔ خوش حال لوگوں کو غریبوں کے دُکھ کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی تو ہر شخص کی زندگی میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے کہ چاروں طرف دُکھ ہی دُکھ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ آدمی پیدا ہی روتے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ جہان تو آہ وزاری کا مقام ہے۔ اس سے نجات کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب مہاتما بدھ دیتے ہیں اُن کا دُنیا کو یہی پیام ہے کہ اس دُکھ کا علاج چاہتے ہو تو یہ خود غرضی چھوڑ دو۔ دوسروں کے لئے جیو۔

لیکن ہماری رُوحانی تکمیل کے لئے بھگوان سری کرشن اور مہاتما بدھ کے ہی پیام کافی نہیں۔ حضرت یسوع مسیح رُوحانی زندگی کے ایک اور پہلو پر زور دیتے ہیں وہ کہتے ہیں "یزدانی دولت کی نعمت تمہارے اندر موجود ہے۔ اپنے آپ کو اس بے بہا نعمت کے قابل بناؤ"۔ ہمیں اس اُمید افزا پیام کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی بھگوان سری کرشن اور مہاتما بدھ کے پیاموں کی۔ فرض کیجیے کہ میں بھگوان سری کرشن کے اُصول کے مطابق بے تعلق ہو کر اپنے فرائض کو انجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اِس کوشش میں بسا اوقات میں اپنے معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے موقع پر جب میرے دل میں کسی چیز کے لئے خاص لگاؤ پیدا ہونے لگتا ہے تو مہاتما بدھ کا پیام آکر مجھے اپنی کمزوری سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مجھے آواز آتی ہے "خبردار، اِس دُنیا کی ہر شئے فانی ہے دُنیا سے جی لگانے سے دُکھ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا"۔ میں یہ آواز سُنتا ہوں اور کچھ سنبھل جاتا ہوں لیکن اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتا کہ دُنیا کے کام کاج میں لگا رہوں۔ یا اس سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اِس مقام پر حضرت یسوع مسیح کا پیغام بجلی کی کڑک کی طرح گونج اُٹھتا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ یزدانی دولت تمہارے ہاتھ میں آیا ہی چاہتی ہے۔ دیر مت کرو۔ کل تک کوئی بات نہ چھوڑو۔ اپنے آپ کو اس نعمت کے قابل بناؤ نہیں تو ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ اِس پیام کا اپنا مقام ہے۔ ہم اس پیام کو بھی قبول کرتے ہیں اور اس پیغمبر پر بھی بار بار سلام بھیجتے ہیں۔ ہم خدا کے اس اوتار کے آگے بھی سر جھکاتے ہیں۔

اس کے بعد رسُول خدا حضرت محمدؐ مساوات کا پیام لے کر ہمارے درمیان آتے ہیں۔ یہی مساوات کی تعلیم ہی اِسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی مساوات کی تعلیم کی بدولت ہی اِسلام دنیا کے کونے کونے میں پھیلا اور اسی کی بدولت یہ مذہب زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اور حضرت محمدؐ اس مساوات کے پیغمبر ہیں۔ اُنہوں نے دُنیا کو اِنسانی اخوت کا سبق دیا اور اس اُصول پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا۔

تو دیکھا آپ نے کِس طرح ہمارے یہ پیغمبر اور اوتار اپنا اپنا مخصوص پیغام لے کر دُنیا میں آئے اور ہماری مذہبی اور روحانی زندگی کو مالا مال کر گئے۔ اگر کوئی اِس پُوری وراثت کو سنبھال نہیں سکتا اور اس میں سے صرف کچھ حصے ہی کو قبول کرتا ہے تو یہ کم ظرفی ہے۔ مگر اس میں اس وقت تک کوئی بُرائی نہیں جب تک دوسروں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور نکتہ چینی اور جھگڑے فساد تک نوبت نہ آئے۔ لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ کم ظرف اور کم علم لوگ نہ صرف اپنے مخصوص پیغمبر یا اوتار کی تعلیم ہی تک اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں بلکہ دوسرے رہنماؤں کے پیام کو اپنے خیالات کے مطابق توڑ موڑ کر ایک ہی مرکز پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن خود ساختہ نظریوں کو ان مذہبی رہنماؤں سے منسوب کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ ہمیں دُنیا کے عظیم اوتاروں، اور پیغمبروں کو سمجھنے کے لئے تبصروں اور تفسیروں کی ضرورت

نہیں، اِن ہستیوں نے اپنے اُصولوں کو خود اپنی زندگی میں مُجسّم کرکے ہمارے سامنے مثالیں قائم کردی ہیں۔ اُن کی تعلیم کی بہترین تفسیر خود اُن کی زندگی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہی اُن کے اُصولوں کی تشریح ہوجاتی ہے۔ کسی پیغمبر کے پیام پر غور کرو اور پھر اُن کی زندگی کو دیکھو تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کا پیام اُن کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ اور اُن کی زندگی اُن کے پیام کا مُجسّم ثبوت۔ گیتا کو پڑھیئے اور پھر بھگوان سری کرشن کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی۔ اِس طرح حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی ہی میں یہ دکھا دیا کہ اہلِ اِسلام میں مکمّل مساوات اور اخوت کے کیا معنی ہیں۔ اُن کے یہاں نسل، قوم، ذات، رنگ یا جنس کا فرق روا نہیں ہے۔ مثلاً اگر ترکی کے سُلطان کا زرخرید افریقی غلام اِسلام قبول کرلیتا ہے تو یہ سب باتیں مٹ جاتی ہیں کہ وہ پابزنجیر لایا ہوا غلام ہے وہ افریقی ہے۔ سیاہ فام ہے۔ دوسری نسل کا ہے۔ مُسلمان ہوکر وہ سلطان کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس میں قابلیت ہوا ور آزاد ہو کر اس قابل ہو جائے کہ شہزادی سے شادی کرسکے تو یہ شادی بھی ممکن ہوسکتی ہے۔ اسلام کی اس مساوات کا مقابلہ کیجئے۔ اُس طرزِ عمل سے جو آپ کے مُلک میں نیگروں اور ریڈ انڈین لوگوں سے برتا جاتا ہے۔ یا جو "اُونچی ذات کے ہندو" میرے مُلک میں اُن لوگوں پر روا رکھتے ہیں جنہیں وہ ملیچھ یا نیچ ذات کے لوگ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی عیسائی کا ہاتھ ان کے کھانے کو لگ جائے تو وہ اسے ناپاک سمجھ کر پھینک دیں گے اور یہ حالت ہے ہماری باوجود ویدانت کے عظیم الشان فلسفے کے وارث ہونے کے، دُنیا میں اِنسانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ اس قسم کا سُلوک دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہلِ اسلام کی نسل اور رنگ وغیرہ سے بالا مساوات کی عظمت کیا ہے اور حضرت محمدؐ کی عملی مساوات اور اخوت کی ہمیں کس قدر ضرورت ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اِس بات سے اتفاق کرینگے کہ ہم دُنیا کے تمام اوتاروں اور پیغمبروں کے مخصوص اور بنیادی اُصولوں کو نہ صرف اپنا سکتے ہیں۔ بلکہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اُن پر عمل بھی کرسکتے ہیں اور اگر ہمیں سماجی اور مذہبی ترقی مطلوب ہے۔ اگر ہمیں انسانی تہذیب کی معراج کو پانا ہے تو ہمیں اصولاً اور عملاً سب اوتاروں اور پیغمبروں کو اپنانا ہوگا۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اس عام سوال کے بارے میں بھی کچھ کہوں کہ کیا آیندہ اور بھی اعلیٰ مقام پیغمبر پیدا ہونگے، مجھے اِس میں رتی بھر شک نہیں کہ آئندہ بھی بلند مرتبہ اوتار اور پیغمبر ہماری رہنمائی کے لئے پیدا ہونگے۔ یہ امر یقینی ہے لیکن ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں مستقبل کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ ہماری رہنمائی کے لئے گزشتہ پیغمبروں اور اوتاروں کی زندۂ جاوید روشن مثالیں موجود ہیں۔ میں آپ میں سے ہر ایک کو زمانۂ حال کے اُس نئے مذہب کا پیغمبر بننے کی تلقین کرتا ہوں

جس میں سب پُرانے پیغمبروں کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ جس کی مقدس کتاب پُرانی مقدس کتابوں کو اپنی وسعتوں میں سموئے ہوئے ہو۔ پُرانے سب اُصولوں کو اکٹھا کر لیجئے۔ اور اُن پر عمل کرکے آگہی اور عرفان کے اُس مقام پر پہونچ جائیے جہاں نہ صرف اِن اُصولوں کی حقیقت آپ کی ہستی میں مجسّم ہو جائے بلکہ اگر ضرورت ہو تو آپ اِن میں اضافہ بھی کر سکیں۔ یہی مقام پیغمبروں کا مقام ہے۔ اور آپ سب کو ایک دن اِس مقام پر پہنچنا ہے۔ پُرانے پیغمبر اور اوتار سب کے سب تعظیم اور پرستش کے قابل ہیں۔ ہمیں سب کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو اُن کا غلام سمجھتے ہیں تو بالکل بجا ہے وہ ہمارے رہنما ہیں۔ وہ ہمارے لئے رُوحانی راستے کھول گئے ہیں ہم اُنھیں اوتار اور رسول مان کر پوجتے ہیں اور پُوجنا چاہیئے بھی لیکن اس پوجا میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہماری اپنی حقیقی خودی بھی پرستش کے قابل ہے۔ اگر وہ پیغمبری کے مقام تک پہنچ سکتے تھے۔ اگر اُنھیں خدا کی قربت حاصل ہو سکتی تھی۔ اور وہ خدا کے فرزند کہلا سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سب جو اُن کی طرح انسان ہیں۔ اُن کے مقام تک نہ جا سکیں[1]۔ وہ اپنے وقت میں درجۂ کمال تک پہنچ گئے۔ آج ہمیں بھی اپنے کمال تک جانا ہے۔ حضرت یسوع مسیح کے اِن الفاظ کو یاد رکھیئے "یزدانی دولت تمہارے ہاتھ آنے والی ہے"۔ آؤ آج ہم میں سے ہر ایک اِس بات کا مصمم ارادہ کرلے کہ میں بھی خدا کا پیغمبر بن کر رہوں گا۔ میں بھی نورِ حقیقت کا عالمتاب آفتاب بن کر چمکوں گا۔ میں بھی فرزندِ خدا کا وہ مقام حاصل کرکے رہوں گا۔ جہاں قربت میں من و تو کا فاصلہ مِٹ جاتا ہے۔ اور اِنسان اور خدا ایک ہو جاتے ہیں جہاں میں میں نہیں رہوں گا۔ جہاں میرا احساسِ خودی احساسِ خدا بن جائے گا۔

---

[1] طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
ہمچناں در عملِ معدن و کان است کہ بود



پیرِ ما[۵۱]

سوامی جی نے یہ لیکچر نیویارک میں دیا تھا

بھگوان سری کرشن نے گیتا میں اعلان کیا ہے کہ "جب کبھی بھی نیکی بُرائی کے نیچے دَب جاتی ہے، تو میں بنی نوع انسان کی امداد (سہائتا) کے لئے جنم لیتا ہوں" دوسرے لفظوں میں جب کبھی ہماری دُنیا میں توازنِ حیات بگڑ جاتا ہے تو زبردست غیبی طاقت نمودار ہوتی ہے اور سچائی کا پلّہ بھاری کر دیتی ہے۔

ہماری زندگی کے دو رُخ ہیں۔ ایک مادّی اور دوسرا رُوحانی، یا یوں کہیئے کہ ہم مادّی اور رُوحانی دو سطحوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارا ہر عمل یا مادّی سطح پر واقع ہوتا ہے یا رُوحانی پر۔ ارتقائے حیات کے دَوران میں اِن دونوں سطحوں کی بلندیوں اور پستیوں کو کم و بیش کرنے کی ضرورت[۵۲] پیدا ہوتی رہتی ہے۔ بعض اوقات کچھ خاص حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اِس قِسم کی کمی بیشی اور ردّ و بدل[۵۳] کے بغیر جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ضرورت کے مطابق مادی اور رُوحانی ہر دو سطحوں پر غیبی طاقت اثر انداز ہوتی ہے اور دُنیا میں ایک نئی جان ڈال دیتی ہے۔

زمانۂ جدید کی تاریخ میں مادّی سطح پر انقلاب و تغیر کا عمل یُورپ اور امریکہ میں ہوتا آیا ہے اور رُوحانی سطح پر ارتقا و بالیدگی ایشیا کی سرزمین پر ہوتی رہی ہے۔ آج اِنسان کو پھر رُوحانی اُبھار[۵۴]

---

۵۱ My Master

۵۲-۵۳-۵۴ Adjustment.

کی سخت ضرورت ہے، آج کل مادّیت اپنے پُورے زور پر ہے ہم اپنی رُوحانی حقیقت کو بھُول رہے ہیں۔ مادّی طاقت کا لوہا سب مانتے ہیں۔ اس کی شان و شوکت کے سب قائل ہیں۔ آئے دن ہم مادّی چیزوں کے غلام بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے دِل و دماغ پر بس مادّی ترقی کا خیال چھایا ہوا ہے ہم مادّی آرام حاصل کرنے پر اس قدر تُلے ہوئے ہیں کہ پیسہ ہمارا مقصدِ حیات بن کر رہ گیا ہے اور ہم پیسہ کمانے اور جمع کرنے کی مشین بنتے چلے جا رہے ہیں۔

زمانۂ حال کی اِس رُوحانی ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے پھر سے غیبی طاقت معرضِ ظہور میں آچکی ہے اور پہلے کی طرح اب کے بھی یہ طاقت ایشیا کی سرزمین سے اُٹھی ہے۔ اس طاقت کا نعرہ فضا میں گونج رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہو رہی ہے اور وہ وقت دُور نہیں جب یہ نعرہ ہمارے کانوں میں گونجنے لگے گا، رُوحانی طاقت کا ایک زبردست طوفان حرکت میں آچکا ہے، وہ وقت جلد آنے والا ہے جب انسان پھر اپنی روحانی اصل کی یاد کو تازہ کرکے اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا۔

ہماری دُنیا میں تقسیمِ محنت[۱] کا اُصول کارگر ہے۔ اِس کارگہِ عمل میں یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی شخص یا قوم مادی اور رُوحانی دونوں طاقتوں کو بیک وقت اپنے قبضے میں لے آئے یہ سمجھنا طِفلانہ ذہنیت کا ثبوت ہے کہ ہم دُنیا کی ہر چیز کو حاصل کرسکتے ہیں۔ یا یہ سمجھنا کہ جو کچھ ہم حاصل کرسکتے ہیں وہی قابلِ حصول ہے اور اسکے علاوہ کوئی اور چیز کسی کام کی نہیں، بچّہ اپنی نادانی کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ اُس کی گڑیا سے بڑھ کر تمام دُنیا میں کوئی اچھی چیز نہیں ہوسکتی لیکن اگر بڑے بھی اِس ذہینت کا اظہار کرنے لگیں تو ہم سوا اِسکے کیا کہہ سکتے ہیں کہ ابھی وہ جہالت کے اندھیرے میں گھِرے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی قومیں جنہوں نے مقابلتاً مادّی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرلی ہیں اور زبردست مادّی طاقت حاصل کرلی ہے سمجھ بیٹھی ہیں کہ بس اگر دُنیا میں حاصل کرنے کی کوئی چیز ہے تو وہ ہے مادّی طاقت۔ ان کے خیال میں اِنسان کے ارتقا کا بس ایک ہی مفہوم ہے اور وہ ہے مادّی ترقی اور وہ اسی کو تہذیب و تمدن کا نام دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے نزدیک کسی ایسی قوم کو جینے کا حق ہی نہیں جو دنیاوی دھن دولت کی پروا نہیں کرتی یا جسے دوسروں کو غلام بنانے کی خواہش نہیں مغرب والے ایسی قوم کو ناکارہ اور بے سُود کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ بر عکس اِسکے دُنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جو مادّی تمدن کو بے بنیاد اور بے معنی

---

[۱] division of labour.

سمجھتی ہیں۔ عام طور پر مشرق کی آواز یہ ہے کہ جہان بھر کی تمام چیزیں بھی کسی شخص یا قوم کے ہاتھ لگ جائیں۔ لیکن اُسے رُوحانیت نصیب نہ ہو تو اُن سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہر دو قسم کی قوموں کی اپنی اپنی شان و شوکت ہے، آج ضرورت اِس بات کی ہے کہ دونوں میں اختلاط اور موافقت پیدا کی جائے مغرب والے حواس کی ٹھوس دُنیا کو حقیقی مانتے ہیں، لیکن اہلِ مشرق بس رُوح ہی کو حقیقی قرار دیتے ہیں۔ اپنی اپنی طبیعت اور سمجھ کی بات ہے، مشرق میں معرفت کو حاصلِ حیات سمجھا جاتا ہے، رُوحانیت ہی اُمیدوں کا مرکز اور آرزؤں کا مقصد ہے۔ اِسی سے زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں مغرب والے کہتے ہیں کہ رُوحانیت کے یہ دلدادے حقیقت سے دُور ہیں۔ خواب و خیال کی دُنیا میں پڑے اونگھتے رہتے ہیں۔ اہلِ مشرق یہ سُن کر ہنس دیتے ہیں کیونکہ اُن کی نظر میں مادیّت میں ڈوبے ہوئے مغربی لوگ بذاتِ خود خواب میں ہیں۔ اور حقیقت سے ناواقف بچوں کی طرح خیالی کھلونوں سے کھیل رہے ہیں، اُن کے نزدیک اس سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کہ عُمر رسیدہ مرد و زن سُست بنیاد اور فانی مادہ کے تودوں کو اس قدر اہمیت دے کر اُنھیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیں اور تمام عمر د روگیر میں بسر کریں جب کہ ظاہر ہے آخر میں دُنیا کی ہر چیز ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔

تو آپ نے دیکھا کہ مادیّت اور رُوحانیت کے علمبردار ایک دوسرے کو ایک غیر حقیقی خواب و خیال کی دنیا کے باسی سمجھتے ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے تو مشرق کا نصب العین انسانی ترقی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مغرب کا، بلکہ میں تو کہوں گا کہ زیادہ ضروری ہے۔ بہرحال انسانی ترقی کے دونوں اہم جُزو ہیں۔ صرف مشینوں سے بنی نوع انسان نے نہ آج تک خوشی اور اطمینان پایا ہے اور نہ آئندہ پانا ممکن ہے، انسانی خوشی کا دارومدار مشینوں پر نہیں۔ خود انسان کے دل و دماغ پر ہے۔ اگر انسان کے دل و دماغ میں خوشی نہیں تو دنیا بھر کی مشینیں اُسے مسرور نہیں کرسکتیں۔ سچی خوشی صرف اُس شخص کے حصے میں آتی ہے جسے اپنے مَن پر پُورا پورا اختیار ہو، باقی لوگ تو خوشی کے بھکاری ہیں کبھی ایک چیز کے سہارے اور کبھی دوسری کے خوشی کی تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ آخر مشین کی طاقت ہے ہی کیا؟ اگر ایک شخص تار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کو لے جاتا ہے تو اس میں کیا خاص بڑائی ہے، اُس کی ذہانت دوسروں کے مقابلہ میں کیونکر زیادہ ہے؟ ہمیں لازم نہیں کہ ہم ایسے شخصوں کے آگے سر جھکائیں اگر بڑائی کا یہی معیار ہے تو قدرت کے آگے ہر وقت سجدے کرنے چاہیئں کیوں کہ

یہاں تو ہر لمحہ بہت بڑے پیمانے پر وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو انسان مشینوں کے ذریعے سرانجام دے پاتا ہے، فرض کرلو کہ تمام دُنیا آپ کے اختیار میں ہو جائے۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ آپ کے حکم کے مطابق چلے تو بھی کیا آپ کو سچی خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، یہ حکومت اور اختیار سب بے سود ہیں۔ ان سے خوشی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک آپ کی رسائی آپ کے اپنے اندرونی سرچشمہ نشاط تک نہیں ہو پاتی، سچی خوشی وہی ہے جو اپنے آپ کو سر کرنے سے ملتی ہے، "خود اختیاری" ہی حقیقی مسرت ہے یہ سچ ہے کہ انسان کو قدرت پر فتح پانا ہے۔ لیکن یہ کہاں تک ٹھیک ہے کہ قدرت سے مُراد صرف خارجی اور مادّی قدرت سے ہی لی جائے خارجی قدرت کی عظمت و شان سے کون انکار کر سکتا ہے سربفلک پہاڑ، بیکراں سمندر تیز و تند دریا، قدرت کی لاانتہا طاقت پر شاہد ہیں۔ لیکن ہماری اس مادّی کائنات سے بھی کہیں زیادہ عظیم اور وسیع ہے، داخلی فطرت، جس کے مہر و ماہ ہمارے چاند سورج سے زیادہ روشن ہیں۔ جہاں کے ستارے ہمارے آسمان کے ٹمٹماتے چراغوں سے زیادہ درخشاں ہیں۔ جہاں زندگی کی قدریں ہماری خاکی زندگی کی قدروں سے کہیں بلند ہیں۔ جہاں مسرت و نشاط کا احساس ہماری مادّی خوشیوں کے شعور سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہ داخلی دُنیا بھی مطالعہ کا موضوع بننے کا حق رکھتی ہے۔ اہلِ مشرق نے اِس کا اتنا ہی عمیق مطالعہ کیا ہے جتنا کہ مغرب والوں نے مادی دُنیا کا، اہلِ مغرب خارجی دُنیا کے مطالعے میں بہت ترقی کر گئے ہیں مشرق کے لوگوں نے داخلی مسائل کے مطالعہ پر خاص توجہ دی ہے اور ہر طرح کی معلومات حاصل کی ہیں۔ اِس لئے جب کبھی بھی دُنیا میں مذہبی اور رُوحانی معاملات میں ردّ و بدل (adjustment) کی ضرورت پڑی ہے تو نئے مذہبی رہنما، پیغمبر اور اوتار مشرق ہی سے اُٹھے ہیں اور ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے کیونکہ ایشیا کی سرزمین ہی مذہب اور رُوحانیت کی جنم داتا ہے۔ برعکس اس کے مغرب مادّی علوم کا مخزن ہے یُورپ کے ماحول نے سیاست، اقتصادیات اور سائنس میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے ہیں اور ایشیا کے ماحول میں عظیم الشان رُوحانی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اِس لئے اگر مشرق کو مادّی ترقی کے وسائل حاصل کرنا ہے۔ مشینیں بنانا سیکھنا ہے، سائنس کی بلندیوں تک پہونچنا ہے تو اُسے مغرب کو اپنا مُعلّم تسلیم کرنا ہوگا۔ اور اگر مغرب کو رُوحانیت کے متعلق واقفیت پیدا کرنا ہے، اِس کائنات کے راز کو پانا ہے تو اُسے مشرق کے آگے زانوئے اَدب طے کرنا ہوگا۔

آج میں آپ کے سامنے ایک ایسے عظیم الشان انسان کے سوانح حیات پیش کروں گا جس نے ایک نئے رُوحانی انقلاب کو ہندوستان میں محرک کیا ہے جو ایک دِن دُنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے کر انسانی تہذیب کو بلندی کے ایک نئے مقام پر لے جائے گا۔ لیکن اِس سے پیشتر کہ میں اس عظیم

ہستی کا ذکر کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اسکے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالوں ۔ اور آپ کو ہندوستان کے متعلق چند ضروری باتیں بتاؤں ، ہندوستان ایک رازِ سربستہ ہے جس کے متعلق آپ کو آگاہ کرنا ضروری ہے ۔ ورنہ آپ بھگوان سری رامکرشن کی عظمت اور اہمیت کا پورا اندازہ نہیں لگا سکیں گے ، پہلی بات تو یہ ہے کہ مادی ترقی کے پجاری اگر ہندوستان جائیں تو انھیں غریبی ، غلاظت ، توہمات ، جہالت اور تاریکی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی نگاہ میں تہذیب کے معنی ہیں خوش وضع لباس ۔ اعلیٰ طرزِ رہائش ۔ جدید تعلیم و تربیت ، سماجی مروت و رواداری ایسے لوگ مشرق کو عموماً اور ہندوستان کو خصوصاً سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں ، اُن کی آنکھوں پر مادیت کے پردے پڑے ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اُن کی آنکھیں مادیت کی تیز روشنی سے چندھیا گئیں ہیں ۔ اُن کی تمام زندگی کھانے پینے اور عیش کرنے کے لئے وقف ہوکر رہ گئی ہے ۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی اُن کا نصب العین ہوگئی ہے ، زر اور زمین کی ملکیت اُن کے لئے مقصدِ حیات ہوگئی ہے دنیا کا عیش و آرام اُن کے لئے حاصلِ زندگی ہے ، اُن کا اُصول یہ ہے کہ جب تک زندگی ہے عیش کرو اسکے بعد تو موت ہے اور خاتمہ اُن کا دماغ حواس سے اوپر کبھی اُٹھتا ہی نہیں جن مادی چیزوں کے ماحول میں وہ بسنے والے ہیں ، اُن کے علاوہ وہ کسی اور چیز کو تصور میں ہی نہیں لا سکتے ۔ ایسے مادہ پرست لوگوں کے لئے ہندوستان کو سمجھنا بہت مشکل ہے ، کیونکہ ہندوستان کا نصب العین ہی دوسرا رہا ہے ، مغربی اقوام نے اپنی ہر کوشش طرزِ رہائش کو اعلیٰ بنانے میں صرف کی ہے اور اپنے اقتصادی معیار کو بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی لیکن ہندوستان کا طرزِ عمل اِس سے بالکل مختلف رہا ہے ۔ تمام دُنیا میں یہی ایک قطعہ ہے جس کے باشندے دوسروں کو غلام بنانے کے لئے کبھی اپنے مُلک کی حدود سے باہر نہیں گئے ، یہاں کے لوگوں نے دوسروں کے مُلک یا اُن کی دولت کو حاصل کرنے کی کوشش تو درکنار اس پر کبھی لالچ کی نظر بھی نہیں اُٹھائی ، ہاں اپنی محنت سے اپنے مُلک کو ہمیشہ سر سبز و شاداب رکھا آرام سے خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ۔ اگر اُن کا کوئی قصور ہے تو بس یہ کہ اُن کی محنت سے پیدا کی ہوئی شادابی و خوش حالی ہمیشہ دوسروں کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی اور لٹیری قومیں یہاں بار بار حملہ کرتی رہیں ، لیکن باوجود اِن حملوں کے ، باوجود غلامی کے اُدوار کی مصیبتوں کے اس ملک نے اپنا وطیرہ نہیں بدلا ۔ یہاں کے لوگوں نے اپنی رُوحانی وراثت کو برقرار رکھا ۔ اور اسی کے سہارے زندگی بسر کرتے رہے ۔ دوسری اقوام نے اُنھیں جاہل کہا تو یہ جاہل کہلائے لیکن اپنی وضع کو نہیں چھوڑا ، بلکہ اِس بدزبانی کے بدلے میں اُنھوں نے دُنیا بھر کو رُوحِ اعظم کا تصور بخشا ۔ اِنسانی فطرت کے سربستہ رازوں

کو آشکار کیا اور تمام عالم کو صلائے عام دی کہ اس پردہ کو ہٹا کر دیکھو جس نے اِنسان کی اِس حقیقی خودی کو چھُپا رکھا ہے، جو بذاتِ خود خدا ہے، اُنھوں نے اعلان کیا کہ ہماری خارجی زندگی ایک خوابِ گراں ہے، جب تک ہم اِس خواب میں ہیں اس کی ہر چیز حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن دراصل ہماری اپنی خودی کچھ اور ہی چیز ہے، اِس مادّی زندگی کے پسِ پردہ ہماری یزدانی حقیقت ہے جسے کوئی گُناہ نہیں چھُو سکتا۔ جس سے کسی جُرم کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ ہَوس جس کے پاس پھٹک نہیں سکتی، آگ جسے جلا نہیں سکتی۔ پانی جسے بھگو نہیں سکتا۔ جو گرمی سے سُوکھ نہیں سکتی۔ اَور سردی سے سُکڑ نہیں جاتی جو دوامی ہے، لازوال ہے لافانی ہے، لاثانی ہے، موت جس کے لئے ایک بے معنی لفظ ہے۔

یہ "خودی" محض ایک فلسفیانہ تصوّر یا نظریہ نہیں۔ اِس کا راز بتانے والوں نے اپنی ذات کا احساس جس شدّت سے کیا ہے وہ اُس شدّت سے بھی زیادہ ہے جس سے مادی اشیاء کا احساس و شعور حواس کو ہوتا ہے کوئی شخص محض تصوّر یا نظریئے کے سہارے نہیں جی سکتا اور نہ ہی اپنا سب کچھ محض خیالی تصویروں پر قُربان کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ جیسے آپ[1] حب الوطنی کے جذبے کے تحت اپنے مُلک کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور نعرہ لگا کر توپ کے مُنھ میں جانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اِسی طرح ہندوستان میں ایسے لوگ ہوئے ہیں اور ہیں جو خُدا کی حقیقت کو اس قدر شدّت سے محسوس کرتے ہیں کہ اسی کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔ یہ ہندوستان ہی ہے جہاں لوگ سنسار کو عالمِ خواب و خیال سمجھ کر اپنے بال بچّے، اپنی دھن دولت یہاں تک کہ تن کے کپڑے تک ترک کر کے حقیقت کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ جس چیز کو وہ حقیقت سمجھتے ہیں اُس کا وجود محض خیالی نہیں ہے، ترک محض دِماغی فتور نہیں ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تک کسی کو کوئی زیادہ اچھی اور زیادہ قیمتی چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ اس وقت تک وہ ہاتھ آئی چیز کو چھوڑتا نہیں۔ احساسِ خودی۔ معرفتِ ذات ایک ایسی حقیقت ہے جس کے آگے مادی دنیا کی سب حقیقتیں ہیچ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عارف (برہم گیانی) اپنی جسمانی زندگی کو بے دریغ خیرباد کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں آپ کو ایسے عارفوں کی بے شمار مثالیں گی جنھوں نے دریا کے کنارے یا اور کسی صاف جگہ بیٹھ کر چپکے سے اپنے جسم کو چھوڑ دیا[2]۔ ہندوستان میں کوئی مَر جاتا ہے تو کہتے ہیں اس نے چولا چھوڑ دیا مطلب ہے کہ اس نے اپنے جسم کو پُرانے کپڑوں کی طرح اُتار پھینک دیا۔ خُدا کے بندے

---

[1] خطاب اہلِ مغرب سے ہے۔

[2] خود سوامی وویکانند نے سمادھی میں جا کر اپنے جسم کو ترک کر دیا تھا، ہندوستان میں تو آئے دِن ایسے

جانؔ سے اِس طرح گزر جاتے ہیں جیسے آپ کے ہاتھ میں گھاس کا تنکا ہو اور آپ جب چاہیں اُسے پھینک دیں یہ ہے اُن کی شجاعت و دلیری کا انداز، وہ موت سے یوں گلے ملتے ہیں جیسے کوئی اپنے بھائی سے ملے، وہ جانتے ہیں کہ موت کی کوئی حقیقت نہیں ہستی ہمیشہ قائم رہی ہے اور رہے گی، وہ کبھی نیست و نابود ہو ہی نہیں سکتی پھر موت کے کیا معنی۔ اور یہی ہندوستان کی اصلی طاقت کا راز ہے جس نے ظالم حملہ آوروں کے بے شمار حملے سہے، جس نے سینکڑوں سال غلامی میں رہ کر ہر طرح کے ظلم بَرداشت کئے لیکن دَم نہیں ہارا۔ اور آج بھی ہندوستان زندہ ہے۔ غلامی اور ظلم کے تاریک سے تاریک دِنوں میں بھی ہندوستان نے عظیم الشان رُوحانی ہستیوں کو جنم دیا ہے۔ اِس صدی (اُنیسویں صدی) کے شروع میں جب مغربی حملہ آور یہاں وارد ہوئے تو مغربی تہذیب کا اثر ہندوستان کے ماحول میں داخل ہونا شروع ہوا۔ حملہ آور تیغ و تفنگ کی طاقت سے اِس مُلک پر قابض ہوتے چلے گئے اور یہاں کے رہنے والے اُن سے شکست کھاتے رہے۔ تلوار کی سیاست ہندوستان کی تہذیب پر غالب آئی، ہمارے بدیشی فاتح اور حکمران ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، اُن کی نظر میں ہماری کمزوری، ناتوانی اور جہالت کا اِس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا کہ ہم نے شکست کھائی اور اُن کے غلام ہو گئے۔ ہم اپنے آپ کو رِشیوں کی اولاد کہتے تھے، ہمیں اپنی تہذیب پر ناز تھا۔ بدیشی حکمران اِس غرور کو توڑنے کے لئے ہمیں غیر مُہذب[۱] اور جاہل کہنے لگے۔ جو ہر وقت بس خواب و خیال کی دُنیا میں اونگھتے رہتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو آدرش وادی سمجھتے تھے۔ وہ ہمیں نکمّے اور ناکارہ کہنے لگے۔ اُنہوں نے ہمیں بتانا شروع کیا کہ ہماری طاقت سلب ہو چکی ہے۔ ہمارا مذہب محض قصّے کہانیوں (دیومالا[۲]) پر مشتمل ہے۔ خدا اور روح اور غیر شخصی غیر مرئی چیزیں جن کی تلاش میں ہم ہزاروں سال سے لگے ہوئے تھے محض بے معنی الفاظ کا گورکھ دھندا ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) واقعات دیکھنے میں آتے ہیں لیکن دوسرے ممالک میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ایرانی صوفی عطّار کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دن اُن کی دوکان پر ایک فقیر خیرات مانگنے آیا۔ عطّار کام میں اتنا مصروف تھا کہ خیرات دینے کے لئے نہ اُٹھا۔ فقیر بولا "تمہیں اپنے کام سے اتنی لگن ہے، کہ تمہارے لئے ایک فقیر کو چار پیسہ دینا مشکل ہو رہے ہیں اُس دن کیا کرو گے جب ملک الموت جان لینے آئے گا۔ عطّار سے نہ رہا گیا کہنے لگا کہ "بابا جان دینا اتنا آسان نہیں۔ فقیر مُسکرایا اور وہیں لیٹ گیا۔ اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر جان دیدی عطّار نے اسی وقت اپنا سب کچھ لٹا دیا اور دنیا ترک کر دی۔

[۱] Barbarians. [۲] Mythology.

ہزار ہا سال کا ترک رائیگاں اور ریاضت بے سود ہے جب بدیشی حکمران ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی اس طرح ہنسی اُڑانے لگے تو ہمارے نوجوانوں خصوصاً یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے دلوں میں ایک زبردست شک پیدا ہوگیا، وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگے کہ کیا ہماری قومی زندگی آج تک غلط رستے پر چلتی رہی ہے کیا ہماری تمام روایتیں غلط ہیں۔ کیا ہماری تہذیب کو ناکام ہی ہونا ہے، اور کیا ہمیں اپنی قومی زندگی کو نئے سرے سے مغربی سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ کیا ہماری پرانی مذہبی اور دوسری کتابیں بس اسی قابل ہیں کہ انھیں پھاڑ کر جلا دیا جائے، کیا ہمارا فلسفۂ حیات واقعی نکمّا اور بے معنی ہے جس سے کنارہ کشی لازم ہے، کیا ہمارے گرو اور آچاریہ، ہمارے معلّم اور دینی رہبر آج تک ہمیں گمراہ کرتے رہے، کیا ہمیں اُن سے سرکش ہوکر اُن کے مندروں اور شوالوں کو گرا دینا ہوگا؟ آخر یہی تو ہمارے طاقتور حکمراں کہتے ہیں اُن کی طاقت تیغ و تفنگ میں ہے، کیا ہمیں تیغ و تفنگ کی طاقت حاصل کرنا ہوگی، کیا ہمیں سائنس پر اپنے مذہب کو قربان کر دینا ہوگا، اگر ہمارے حکمران ٹھیک کہتے ہیں تو ہمارے پرانے طریقے محض توہّمات ہیں۔ جن سے چھٹکارا پانے ہی میں ہماری نجات ہے۔ ہماری رسمیں اور روایتیں محض بُت پرستی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اُن کو خیرباد کہنے ہی میں ہماری بھلائی ہے۔

اس طرح کے شکوک کا پیدا ہونا لازمی تھا کیونکہ نئے سکولوں میں بچّوں کو مغربی طریقے پر تعلیم دی جا رہی تھی۔ انھیں وہاں یہی کچھ سکھایا جاتا تھا کہ ہمارے آبا و اجداد جاہل و غافل تھے۔ اگر انھیں سچ حقیقت کی تلاش کرنا سکھایا جاتا تو کچھ مضایقہ نہیں تھا اگر غیر معقول توہمات سے کنارہ کشی کرنے کو کہا جاتا تھا تو ٹھیک تھا لیکن ہوا یہ کہ بجائے حقیقت تک جانے کے، نئی نسل نے ترقی پسندی کا ایک آسان طریقہ نکال لیا جو بجائے خود مجسم وہم ہے، یعنی کسی چیز کو پرکھنے کا معیار بس یہ ہوگیا کہ مغرب کی اسکے متعلق کیا رائے ہے۔ اگر مغرب کہتا ہے کہ ہمارے دینی راہبر، ہمارے پنڈت اور پروہت کسی کام کے نہیں تو بس ہمیں اُن سے کچھ سروکار نہیں، اگر مغرب کی رائے ہے کہ ہمارے وید اور ہماری دوسری دینی کتابیں جلا دینے کے قابل ہیں تو ہمیں بخوشی انھیں سپردِ نار کر دینا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دماغی ہیجان سے ہندوستان بھر میں اصلاح کی تحریکیں شروع ہوگئیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ اصلاح تعمیری کم تھی اور تخریبی زیادہ۔

سچّے مصلح کے لئے تین چیزیں اشد ضروری ہیں۔ پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ آپ کے دل میں سچّا درد ہو، اپنے بھائیوں کے دُکھ درد کا پورا احساس ہو، سوال تو یہ ہے کہ کیا آپ کے دل میں واقعی دُنیا کے دُکھ درد کا، لوگوں کی مصیبتوں کا پورا پورا احساس ہے۔ کیا آپ واقعی محسوس کرتے ہیں کہ دُنیا میں ہر انسان آپ کا اپنا بھائی ہے؟ کیا یہ احساس آپ کے ہر نفس میں موجزن ہوگیا ہے۔ آپ کی

رگ رگ میں سما گیا ہے، ہمدردی کا یہ خیال آپ کی ہستی کا جزو بن گیا ہے۔ اگر اِن سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے پہلا قدم ٹھیک اُٹھا لیا۔ دوسری ضرورت ہے اصلاح کا صحیح طریقہ ڈھونڈ نکالنا، پُرانے خیالات محض توہمات سہی۔ لیکن اِس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سچائی اور حقیقت بھی کسی نہ کسی صورت میں اِن توہّمات سے وابستہ ہے۔ اِن پُرانے زنگ آلودہ آہنی ٹکڑوں میں سونے کے ذرّے بھی لپٹے ہوئے ہیں، سوال تو یہ ہے کہ کیا آپ نے سونے کو علیٰحدہ کر کے اُسے بچانے کا طریقہ نکال لیا ہے، تاکہ پُرانی بوسیدہ باتوں کو ترک کرتے وقت اپنی قومی خوبیوں کو بھی خیرباد نہ کہہ دیا جائے؟ اگر آپ نے اصلاح کا ایسا طریقہ بھی دستیاب کر لیا ہے تو آپ نے دوسرا قدم بھی ٹھیک اُٹھا لیا ہے، تیسرا سوال یہ ہے کہ آپ کی نیت کیا ہے؟ اصلاح کا کام ہاتھ میں لینے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ کیا آپ دل پر ہاتھ رکھ کر یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں، شہرت کی کوئی خواہش نہیں جاہ و مرتبہ کا کوئی خیال نہیں؟ کیا آپ کو اپنے اوپر اعتماد ہے اور اپنے نصب العین میں کامل یقین ہے، کیا آپ اِس بات پر آمادہ ہیں کہ اگر تمام دُنیا آپ کے خلاف ہو جائے اور آپ کو کچل کر رکھ دینے پر کمر باندھ لے تو بھی آپ بغیر خوف وہراس کے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا کام کئے چلے جائینگے؟ کیا آپ میں اتنی ہمت اور دلیری ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے کام سے منحرف نہ کر سکے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ جب تک آپ میں جان ہے، جب تک آپ کے دل میں ایک بھی دھڑکن ہے اُس وقت تک آپ اپنے کام سے دستبردار نہیں ہوں گے؟ اگر ایسا ہے تو آپ سچے مصلح ہیں، آپ قومی رہنما اور معلّم ہیں، آپ "میر کارواں"[1] ہیں، آپ کی ذات بنی نوع انسان کے لئے برکت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔

لیکن عام طور پر آدمی جلد باز ہوتا ہے۔ ہم میں صبر و تحمل کا مادہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ ہم دُوراندیش نہیں، ہماری نظر میں وسعت نہیں۔ ہم انتظار کی کُلفت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو کام ہم ہاتھ میں لیں اُسکے اچھے نتائج جھٹ پیدا ہو جائیں۔ ایک تو اس لئے کہ جہاں دوسرے لوگ ہمارے کام کے نتائج دیکھیں گے اور اُن سے قدرے مستفید ہونگے وہ ہمارے احسان مند ہوں گے گویا ہم دوسروں کے محسن بن کر اُن پر اپنی حکومت چلانا چاہتے ہیں۔ کسی کا ذرا سا بھلا کر کے اُسے اپنے بس میں لانا چاہتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم خود اپنے لئے جاہ و مرتبہ اور دھن دولت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اصلاح کے کام کو شہرت اور دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں، یہ خدمتِ خلق، یہ قوم کی سیوا، ہماری خود

---

[1] a master

غرضی اور خود ستائی کی ایک خوشنما صورت ہے، اس سے دیرپا نتائج نکل ہی نہیں سکتے، اگر ہم سچے دل سے قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اگر ہم واقعی اِصلاح عامہ کا کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں گیتا کا سبق یاد رکھنا ہو گا کہ ہمیں کام کرنے کا حق ضرور ہے۔ کام کے نتائج پر ہمارا کوئی حق نہیں، آخر نتائج کی فکر ہی کیوں فرض کو فرض سمجھ کر نبھاتے چلے جانا ہی تو ہمارا کام ہے، ہم اپنے فرائض کو پورا کرتے چلے جائیں۔ نتائج خود بخود نکلتے رہیں گے، کاش ہم میں اِتنا صبر و تحمل ہوتا، دُکھ کی بات تو ہے کہ زیادہ تر مصلح ہر وقت نتائج پر نظر جمائے۔ جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ اور اُن کے تعمیری کام میں بھی تخریب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا کہ ہندوستان میں جدید اصلاح کی تحریک اُس وقت شروع ہوئی جب بدیشی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی مادیت کا ایک طوفان ہمارے ساحل پر ٹوٹ پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ طوفان ہمارے رشیوں کی تعلیم کو بہا لے جائے گا۔ اِس مُلک اور قوم نے اس سے بھی زیادہ سخت انقلابی حملوں کا اِس سے پہلے بھی ہزار ہا بار کامیابی سے مقابلہ کیا تھا۔ سینکڑوں سال تک یکے بعد دیگرے حملہ آور یہاں آتے رہے اور جو چیز بھی اُن کے سامنے آئی اُسے تباہ برباد کرتے رہے، تلوار کے زور سے ہماری تہذیب اور مذہب پر بار بار حملے ہوتے رہے لیکن ہمارا قومی اثاثہ ابھی تک قائم ہے ہماری تہذیب اب بھی زندہ ہے، ہمارا مذہب اب بھی دُنیا کو روشنی دے رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی نہیں مار سکتا، ہماری قوم مٹ نہیں سکتی۔ ہم زندۂ جاوید ہیں۔ کیونکہ ہمارا نصب العین، ہمارا قومی مقصد دائمی ہے، جب تک ہندوستانی تہذیب کی پشت پر مذہب اور رُوحانیت کا ہاتھ ہے یہ تہذیب لافانی اور لازوال رہے گی۔ جب تک ہندوستانی اپنی رُوحانیت سے دست بردار نہیں ہو جاتے۔ دُنیا کی کوئی طاقت اس قوم کو مِٹا نہیں سکتی، ہم کنگال رہیں تو کوئی غم نہیں، ہماری غریبی کے ساتھ غلاظت اور گندگی بھی ہمارے گرد منڈلاتی رہے تو کوئی فکر کی بات نہیں ممکن ہے کہ ہم اپنی غریبی کا مکمل علاج کبھی بھی نہ کر پائیں۔ لیکن ہمیں اپنے بھگوان کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ہمیں کبھی بھی یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم رشیوں کی اولاد ہیں۔ رُوحانیت ہی ہماری طاقت ہے۔ یہی ہماری زندگی کا راز ہے۔ یہی "وہ کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری" اِسی میں ہماری ابدی حیات مضمر ہے۔ اس کو چھوڑ کر ہم زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھیں گے۔ جیسے مغرب میں غریب سے غریب آدمی بھی اپنا شجرہ نسب قرونِ وسطیٰ کے کسی لُٹیرے[1]

---

[1] Robber

بیرن" سے جوڑتا ہے، اِسی طرح ہندوستان میں راجے مہاراجے تک اپنے آپ کو کسی نہ کسی رشی کی اولاد کہتے ہیں وہ رشی جن کی مختصر جسمانی اور دُنیاوی ضروریات خیرات سے پُوری ہوتی تھیں جو نام و ننگ سے بے نیاز جنگلوں میں رہتے تھے اور ہمیشہ خدا سے راز و نیاز کی باتیں کرتے تھے۔ جب تک ہم اپنی نسبت اِن رشیوں اور مُنیوں سے فخریہ قائم رکھیں گے، جب تک رُوحانی پاکیزگی، تبرک اور تقدس کا احترام اِس ملک میں ہوتا رہے گا۔ اُس وقت تک ہندوستان کی ہستی نہیں مِٹ سکتی۔ اِسی حقیقت کا ثبوت خود بھگوان سری رامکرشن کی زندگی سے مِلتا ہے۔ آپ میں سے بہتوں نے پروفیسر میکس مُلر[ل] کا مضمون بعنوان "سچا مہاتما" رسالہ "اُنیسویں صدی" میں پڑھا ہوگا، سری رامکرشن کی زندگی کئی لحاظ سے دل چسپ ہے، پہلے تو یہ کہ جن خیالات کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ خود اُن کی مجسم مثال تھے۔ اُنھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے خود اپنی زندگی میں عملی طور پر کر کے نہیں دِکھایا۔ آپ لوگوں کو اُن کی زندگی کچھ عجیب و غریب بھی دکھائی دے گی کیونکہ آپ کی زندگی مغرب میں گزری ہے اور مغرب کا ماحول ہندوستانی ماحول سے بالکل جُداگانہ اور مختلف ہے مغربی زندگی کی خصوصیت تیز گامی اور مصروفیت ہے اور ہندوستان کے طور وطریق یہاں سے کلیتاً مختلف ہیں لیکن شاید اسی وجہ سے اُن کی زندگی کا تذکرہ آپ کے لئے اور بھی دل چسپ ہوگا، کیونکہ اس کے دَوران میں آپ کئی ایسی چیزوں کو جن کے متعلق آپ کا علم محض کتابی ہے، ایک نئی روشنی میں دیکھیں گے۔ سری رامکرشن کا جنم ہندوستان کی تاریخ کے اس زمانے میں ہوا جب یہاں طرح طرح کی دینی اصلاح کا سلسلہ جاری تھا۔ جب بدیشی تہذیب کے لگاتار حملوں سے ہمارے پُرانے سماج اور مذہب کی عمارت کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ لیکن اُن کی جنم بھُومی ان اثرات سے بہت دُور تھی۔ وہ اٹھارہ فروری ۱۸۳۶ء کو بنگال کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں ایک غیر معروف اور غریب برہمن کے گھر پیدا ہوئے اُن کے پتا اور ماتا دونوں پُرانی وضع کے برہمن تھے اور برہمنوں کی روایت اور تعلیم کے مطابق اُن کی زندگی ایک مسلسل ترک کی زندگی تھی۔

ایک برہمن کو روزی کمانے کے لئے اول تو صِرف چند گنتی کی چیزوں مثلاً پُوجا پاٹھ دینی تعلیم وغیرہ کی اجازت ہوتی ہے دوسرے یہ کہ دُنیاوی کاروبار اس پر روا نہیں ہوتے، علاوہ اس کے وہ ہر کسی سے خیرات بھی نہیں لے سکتا، آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایسی زندگی کِس قدر سخت اور مشکل ہو سکتی ہے۔ آپ نے براہمنوں اور اُن کی پنڈتائی کے کئی قصّے سُنے ہوں گے۔ لیکن کیا آپ نے کبھی اس بات پر

ل Max Muller

بھی غور کیا ہے کہ آخر ان میں وہ کیا خوبی ہے جس کی بدولت وہ دوسروں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سچّے برہمن کی طاقت کا راز اس کا ترک ہے، وہ اپنے لئے ساز و سامان مہیا نہیں کرتا وہ اپنی تمام زندگی غریبی اور مفلسی میں گزار دیتا ہے۔ اس کی دولت پاکیزگی، ترک اور علم الٰہی کی دولت ہے۔ اس کا کام درس و تدریس ہے، اُسے اور کوئی دھن دولت نہیں چاہیئے۔ وہ غریبی میں خوش ہے، دُنیا میں ہمارے برہمنوں سے زیادہ غریب دینی رہبر آپ کو اور کہیں نہیں ملیں گے، برہمن خواہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو اُس کے گھر والی اپنے دروازے سے کسی غریب کو کچھ کھلائے بغیر نراش نہیں جانے دے گی، ہندوستان میں ماں کا سب سے اعلیٰ فرض یہی سمجھا گیا ہے، کہ وہ سب کو کھانا کھلا کر خود کھانا کھاتی ہے، اور ہمارے ہاں ہر عورت کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اسی لئے تو ہمارے یہاں ماں کو بھگوان کا رُوپ مانا گیا ہے۔

برہمنوں کو ہندوستانی سماج میں سب سے اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ اُن کی "ذات"[ل] سب سے اونچی ذات ہے۔ لیکن ہندوستانی سماج کی روایتوں کے مطابق اُن کی ذمّہ داریاں بھی سب سے زیادہ سخت ہیں۔ ہمارے یہاں جتنی اونچی کسی کی ذات ہوتی ہے۔ اُتنی ہی زیادہ پابندیاں اُس پر عائد ہوتی ہیں۔ نیچی ذات کے لوگوں کو کھانے پینے، رہنے سہنے کار و بار کرنے کی پوری آزادی ہے۔ وہ جو چاہیں کریں لیکن اونچی ذات والوں کے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے، خصوصاً برہمنوں کی زندگی بہت ہی پابند و محدود ہے۔ مغربی نقطۂ نظر سے تو اُن کی زندگی ایک متواتر ریاضت ہے ایک لحاظ سے ہندو تمام دُنیا میں سب سے زیادہ الگ تھلگ ہیں۔ وہ جب کسی بات کو اپنا لیتے ہیں تو اُسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انگریزوں کی طرح وہ بھی پوری لگن اور تندہی سے کام میں لگ جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ اپنے آپ کو اپنے مخصوص کام ہی کے لیے وقف کر دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ نسلاً در نسلاً اسی ایک بات پر ڈٹے رہتے ہیں۔ اور اسے درجۂ کمال تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ اگر کوئی بات ایک بار اُن کے دماغ میں گھس جائے تو اُسے آسانی سے باہر نہیں نکالا جا سکتا لیکن ساتھ ہی یہ مشکل بھی ہے کہ وہ کسی نئی بات کو آسانی سے اپناتے نہیں۔ اپنے روایتی اُصولوں پر قانع و قائم رہتے ہیں۔

اِس لحاظ سے ہندو نہایت ہی قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اُن کی زندگی اُن کے مخصوص خیالات اور محسوسات کے محدود اُفق سے آگے نہیں جاتی۔ اُن کی زندگی کا نقشہ اُن کی پُرانی کتابوں میں پوری وضاحت سے کھینچ دیا گیا ہے۔ اور وہ نہایت سختی سے اس پر پابند رہتے ہیں، مثلاً اگر

ل Caste

اُنھیں اپنی ہی ذات کے کسی آدمی کے ہاتھ کا پکّا ہوا کھانا نہ ملے تو وہ فاقہ کرلیں گے لیکن کسی اور کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ ہمیں یہ باتیں پسند ہوں یا نہ لیکن اِس سے اِنکار نہیں ہو سکتا کہ ہندو ہمیشہ مذہب کی راہ میں ثابت قدم رہے ہیں، اُن کا ایمان ہمیشہ رَاسخ رہا ہے اُنْ کی بے پناہ لگن میں کبھی کمی نہیں آنے پائی۔ اُنھوں نے مذہبی حقیقتوں کو عملی طور پر ثابت کر دیا ہے اور اس کے لئے اپنا سب کچھ نثار کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قدامت پسند ہندوؤں ہی سے وقتاً فوقتاً ایمان و یقین کی یزدانی طاقت کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

دوسروں کی نظر میں اِن قدامت پسندوں کا یہ طرزِ عمل صحیح ہو یا نہ لیکن اُن کی راسخ الاعتقادی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل کو کبھی غلط نہیں مَانتے اور اُس پر سختی سے پابند رہتے ہیں۔ مثلاً ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ اِنسان کو ہر حالت میں دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینی چاہیئے۔ اُن کو سکھ کے لئے اپنے آرام کو قُربان کر دینا چاہیئے یہاں تک کہ اگر کسی کی جان بچانے کے لئے آدمی خود فاقہ کرتے کرتے مَر بھی جائے تو بھی کچھ مضائقہ نہیں، یہی تو حقیقی خیرات کا معیار ہے جس پر اِنسان کو پُورا اُترنا ہے، خصُوصًا برہمنوں کے لئے تو اس اُصول پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ہے۔ یہ اُصول دوسری سب مذہبی کتابوں میں بھی درج ہے اور سب مذاہب اِس پر عمل کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ ہندوؤں ہی کا حصّہ ہے کہ وُہ واقعی دوسروں کی خاطر جَان دے دیتے ہیں۔ آپ میں سے جن حضرات کو ہندوستان کے لٹریچر سے واقفیت ہے اُن کو مہا بھارت کی وہ کہانی اچھی طرح یاد ہوگی جس میں ایک خاندان کے ہر فرد نے بَاری باری اپنی جان دے دی تاکہ گھر آیا ہوا ایک سنیاسی بھُوکا واپس نہ لوٹ جائے۔ اور یہ کچھ مبالغہ کی بات نہیں، ہندوستان میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوتا چلا جائے گا۔ قربانی کا مَادّہ ہماری گھٹّی میں پڑا ہے ہم ہمیشہ موت کو اپنا کر زندگی کو اور بھی حسین بناتے چلے آئے ہیں۔

میرے گورو دیو کے مَاتا پِتا اِس قِسم کے قدامت پسند برہمن تھے، اُن کی مَاتا آدرش ہندو مَاں کا نمونہ تھیں۔ اُنکے پِتا ایک سچّے برہمن تھے، وہ بہت ہی غریب تھے لیکن کئی بَار اس برہمن دیوی نے کسی اور غریب آدمی کی خاطر سَارا سارا دِن بھُوکے رہ کر گزار دیا۔ قربانی کی اِس دیوی نے سری رَامکرشن کو جنم دیا۔

سری رامکرشن بچپن ہی سے عجیب و غریب طاقتوں کے مَالک تھے، مثلاً وہ اس بات سے پوری

طرح آگاہ تھے کہ جنم سے پہلے وہ کیا تھے، اور کس مقصد کے لئے اُنہوں نے جنم لیا تھا، اُن کی زندگی کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اُنہوں نے اپنی تمام رُوحانی طاقتوں کو اسی مقصد کے لئے صرف کیا ؛

سری رامکرشن ابھی بچے ہی تھے کہ اُن کے پتا سُرگباش ہو گئے ، جب گھر پر پڑھانے والا نہ رہا تو انھیں سکول بھیج دیا گیا ۔ ایک برہمن پتر کے لئے پڑھنا نہایت ضروری ہے ، کیونکہ اُس کی ذات والوں کے لئے پڑھائی لکھائی ہی کا تو کام جائز ہے ، یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پُرانا ہندوستانی طریقہ تعلیم جو ہندوستان کے کئی حصّوں میں اب بھی بدستور جاری ہے ، زمانۂ حال کے جدید طریقہ سے بہت مختلف ہے ، خصوصاً سنیاسیوں سے تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ تو بالکل ہی جُدا گانہ ہے ۔ پہلی خصوصیت اِس طریقہ تعلیم کی یہ ہے کہ طالب علم کو کوئی فیس وغیرہ نہیں ادا کرنا ہوتی ، ہمارا اصول یہ رہا ہے کہ علم ایک ایسی پاک اور مُتبرک شے ہے ، جس کی کوئی قیمت ہی نہیں اور جس کے لئے قیمت وصول کرنے کا کسی کو حق نہیں ۔ علم ہمیشہ مُفت تقسیم ہونا چاہیئے ۔ اِسی لئے ہمارے مُلک میں مُعلم ہمیشہ طالب علموں کو مفت پڑھاتے تھے ۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے کھانے پینے اور کپڑوں کا خرچ بھی اپنے ذمّے لے لیتے تھے ۔ ان مُعلموں کی مالی ضروریات کو امیر لوگ شادی بیاہ کے موقعوں پر یا دوسری مذہبی رسوم کی ادائیگی کے وقت تحفہ تحائف کی صُورت میں پُوری کر دیتے تھے ۔ اِن تحفوں پر اُن کا سب سے زیادہ حق سمجھا جاتا تھا ۔ اور اس کے بدلے میں وہ اپنے طالب علموں کا تمام خرچ اپنے سر لے لیتے تھے ۔

سری رامکرشن کے زمانے میں بھی یہ طریقہ رائج تھا ۔ چنانچہ ایک شادی کے موقع پر بہت سے عالم و فاضل مُعلم اور ودوان پنڈت اکٹھے ہوئے ، یہ تمام پنڈت اور پروہت جوتش اور منطق وغیرہ کے مختلف موضوعات پر بحث کر رہے تھے ، سری رامکرشن بھی وہاں موجود تھے ، عمر کے تقاضے سے ابھی اس قسم کے موضوع اُن کی سمجھ سے باہر تھے ۔ لیکن گرمیٔ بحث دیکھ کر اُنہوں نے دل ہی دِل میں سوچا کہ آخر پڑھے لکھے پنڈت ایک دوسرے سے کیوں بُری طرح جھڑپ رہے ہیں ۔ اِس لئے نہ کہ جو بھی بحث میں جیت جائے گا اُسے سب سے زیادہ اچھے کپڑوں کا جوڑا مل جائے گا ۔ یہ سوچ کر وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تمام بحث و مُباحثہ ، یہ علم و ہُنر کا مظاہرہ محض انعام کی خاطر ہو رہا ہے ، اگر علم کو دُنیاوی ضروریات ہی پُورا کرنے کا ذریعہ بننا ہے تو ایسا عِلم بے سود ہے ۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسا عِلم حاصل کرنے کے لئے سکول جانا فضول ہے ۔ اور اس دن کے بعد اُنہوں نے سکول جانا چھوڑ دیا یہ دیکھ کر اُن کے بڑے بھائی ، جو بڑے ودوان مُعلم تھے ۔ اُنھیں اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے ۔ تاکہ وہاں جا کر اُن کی تعلیم کو جاری رکھا جائے ۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد سری رامکرشن نے یہاں بھی پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا ، اُن کا یہ خیال یقین کی حد تک

پہنچ چکا تھا کہ دُنیاوی تعلیم محض مادّی ترقی اور روزی کمانے کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ اُنہوں نے اپنا سارا وقت رُوحانی علم حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن چونکہ اُن کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ چکا تھا اور خاندان نہایت ہی غریب تھا۔ اِس لئے اپنا پیٹ پالنے کے لئے کلکتہ سے کچھ دُور کالی دیوی کے ایک مندر میں پجاری کی نوکری قبول کر لی۔ اُس وقت اُن کی عمر ۱۹ برس کی تھی

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے یہاں خاندانی برہمنوں کے لئے پجاری کا کام کرنا اُن کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے وہ اِس میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں، ہمارے مندر آپ کے گرجوں کی طرح جماعتی پرستش کے لئے نہیں بنائے جاتے، دراصل ہمارے یہاں کسی بڑے پیمانے پر جماعتی پرستش ہوتی ہی نہیں عام طور پر ہر امیر آدمی بطور کارِ خیر مندر بنوا دیتے ہیں اور وہاں بھگوان کی مُورتی استھاپت (لگا) کر کے پُوجا کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ ہمارے مندروں میں پُوجا کا طریقہ رومن کیتھولک گرجوں میں پُوجا کے طریقوں سے مِلتا جُلتا ہے، پُوجا کے وقت ہم اپنی مُقدس کتابوں سے منتر پڑھتے ہیں اور مُورتی کے آگے روشن دِیئے گھُما کر آرتی اُتارتے ہیں۔ بس مندروں میں صُبح وشام اس طرح پُوجا ہوتی ہے لیکن مندر جانا سماجی بندش نہیں ہے۔ بلکہ ضروری نہیں کہ سماج کی نگاہ میں مندر جانے والے لوگ دوسروں سے زیادہ نیک و پارسا سمجھے جائیں۔ ہماری سوسائٹی میں پُوجا ہر اِنسان کا ذاتی معاملہ ہے، جماعتی اور سماجی فرض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تقریباً ہر گھر میں یا تو ایک چھوٹا سا مندر ہوتا ہے' یا ایک علیحدہ کمرہ یا کمرے کا ایک حِصّہ پاٹھ پُوجا کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ہر آدمی صُبح وشام چُپکے سے بیٹھ کر بھگوان کا دھیان کرتا ہے۔ یہی اُس کی پُوجا ہے۔ یہ پُوجا خاموشی سے دل ہی دِل میں کی جاتی ہے، دوسرے لوگوں کو کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ اُنھیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ساتھ میں کوئی پُوجا کر رہا ہے۔ ہاں موقع ملے تو اُسے چُپ چاپ بیٹھے دیکھ ضرور سکتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کی اُنگلیاں عجیب انداز سے حرکت میں آتی ہے یا کبھی کبھی وہ خاص طریقے سے سانس کھینچتا اور چھوڑتا ہے (لیکن یہ حرکات بھی پُوجا کے لوازمات میں شامل نہیں) اِسکے علاوہ دیکھنے والا یہ نہیں جانتا کہ اُس کا ہمسایہ کیا کر رہا ہے' یہاں تک کہ اُس کی بیوی کو بھی اُس کی پُوجا کا پورا پتہ نہیں ہوتا۔ اِس طرح ہمارے یہاں پُوجا اپنے گھر کی چار دیواری میں ذاتی طور پر کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کے مکانوں میں اتنی جگہ نہیں کہ پُوجا کے لئے الگ کمرہ رکھ سکیں وہ اپنے نزدیک کسی دریا، جھیل یا سمندر کے کنارے جا کر دھیان لگاتے ہیں' لوگ مندروں میں جاتے ضرور ہیں۔ مگر وہاں تو مُورتی کے آگے پرنام کر کے (سر جھکا کر سجدہ کر کے) واپس آ جاتے ہیں۔ اصل پُوجا یعنی بھگوان کا دھیان تو ذاتی طور پر چُپ چاپ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندر کے

پجاری کا ہماری سوسائٹی میں کوئی بلند مقام نہیں وہ تو بس ایک کارکن ہے۔ ہماری کتابوں یہاں تک کہ منوسمرتی میں بھی پجاری کے کام کو خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ بلکہ لکھا ہے کہ پجاری کا کام برہمن کو اپنے معیار سے گرا دیتا ہے۔ اور وہ اِس درجہ تعظیم و احترام کے قابل نہیں رہتا اُس کی وجہ یہ ہے کہ پجاری پاٹھشالہ (سکول) کے ادھیاپک (اُستاد) کی طرح پیسہ لے کر کام کرتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں علم بیچ کر روزی کمانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ پیسہ لے کر پُوجا کرنا اس سے بھی زیادہ گرا ہوا فعل سمجھا جاتا ہے، اب آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ ایک نوجوان برہمن کے دل کی کیا حالت ہو گی جب پیٹ پالنے کے مندر کے پجاری کی نوکری قبول کرنا پڑی۔

لیکن سری رامکرشن کوئی معمولی پجاری نہیں تھے۔ اُن کی پُوجا محض رسمی پوجا نہیں تھی انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ اگر دیوی کی کچھ حقیقت ہے تو وہ اُس کے درشن کر کے چھوڑیں گے۔ شاید آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں مذہب محض رسم و رواج کا سلسلہ نہیں، بلکہ یہاں مذہب کا مقصد خود بھگوان کو پانا ہے۔ ہمارے یہاں کوئی بھی مذہبی کتاب ایسی نہیں ملے گی جس میں زندگی کا مقصد وصلِ الٰہی کے سوا کسی اور چیز کو بتایا گیا ہو، پربھو ملن کا خیال ہمارے مذہب کا مرکزی خیال ہے مقصدِ حیات یہی نہیں کہ انسان کو خدا کا شعور ہو، اُس کی ہستی کا احساس ہو۔ کمالِ زندگی تو یہ ہے کہ انسان خدا کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس سے گفتگو کرے۔ مذہب دراصل یہی ہے، باقی تو سب رسم و رواج کا گورکھ دھندا ہے۔ ہمارے یہاں آپ کو مُلک کے کونے کونے میں ایسے ایسے سنت مہاتماؤں کی کہانیاں سُننے میں آئیں گی جنہوں نے خدا کا دیدار (پربھو درشن) پایا ہے۔ ہمارے مذہب کا بنیادی اُصول خدا کو پانا ہے۔ ہماری پُرانی مقدس دینی کتابیں اور متبرک الہامی لٹریچر خود ایسے ہی بزرگوں کی تخلیق ہے جنہوں نے رُوحانی اور مذہبی حقیقتوں کا براہِ راست تجربہ کیا تھا۔ یہ کتابیں محض دماغی تفریح کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ اور نہ ہی ان کے معنی منطق اور دلیل سے سمجھے جا سکتے ہیں، ان کتابوں میں جو کچھ درج ہے اُس کا ادراک و احساس خود اُن کے مصنفوں کو ذاتی طور پر ہوا اور اِن کو پُوری طرح وہی سمجھ سکتے ہیں جو خود ان مصنفوں کے درجہ تک اونچا اُٹھنے کی طاقت اور اہلیت رکھتے ہیں۔

ہماری یہ کتابیں کہتی ہیں کہ اسی زندگی میں خدا کا دیدار ہو سکتا ہے (بھگوان مل سکتے ہیں) اور یہ معراج ہر شخص کے لئے ممکن ہے۔ دراصل مذہبی زندگی کا آغاز ہی اس وقت ہوتا ہے۔ جب پربھو ملن کی خواہش ہمارے دل میں بیدار ہوتی ہے اور ہماری چشمِ بصیرت کھلنے لگتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام مذاہب کا مرکزی خیال یہی وصلِ الٰہی کا خیال ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں تو خاص طور

مذہب کے معنی پربھو ملن ہی کے لئے جاتے ہیں۔ یہی بنیادی خیال ہندوستان کی ہر زبان میں بھجنوں اور گیتوں کی صورت میں ہر عہد میں ظاہر ہوتا چلا آیا ہے۔ مثلاً بنگال میں سینکڑوں شاعر ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے اِس خیال کو اپنایا ہے اور جن کے بھجن آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ایک طرف کلکتہ کی گلیوں میں اور دوسری طرف گاؤں کے کھیتوں میں ہر جگہ پربھو بھگتی کے یہ بھجن گائے جاتے ہیں۔ پربھو کے درشن پانے کا خیال اس ماحول میں ہر سانس کے ساتھ نس نس میں داخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں جہاں کہیں لوگ یہ سُن پاتے ہیں کہ کوئی مہاپرش بھگوان تک پہنچ گیا ہے تو وہ مُلک کے کونے کونے سے اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اُس کی پُوجا کرنے لگ جاتے ہیں، اس کے مقابلہ میں لوگ بڑے بڑے وِدوانوں کی بات سُننے کے لئے تیار نہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بسا اوقات لوگ فصیح و بلیغ تقریروں کو نہیں سُنتے۔ بلند سے بلند نظریوں اور مُدلل منطقی فلسفہ پر غور نہیں کرتے۔ لیکن خدارسیدہ انسانوں کی ہر بات پر جان دیتے ہیں۔ خواہ وہ مفلس و نادار ہوں، اَن پڑھ ہوں اور اپنی مادری زبان میں بھی بات مشکل سے کر سکتے ہوں، بعض اوقات تو ایسے شخص کی زندگی ہی میں لوگ اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں، کیونکہ ایسا مہاتما خود اپنے تجربے اور اپنے ادراک و محسوسات کی بنا پر اُنھیں خدا کا سچّا راستہ دِکھا سکتا ہے۔ اُس کے لئے مذہب، خیال آرائیوں کا سِلسلہ نہیں ہوتا، وہ لافانی ذات (امر آتما) اور خُدا کے متعلق سُنی سُنائی یا کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں نہیں بتاتا۔ وہ اوروں کی طرح تاریکی میں ٹٹول ٹٹول کر راستہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے لئے گیان یعنی معرفت کا سُورج ہمیشہ چمکتا رہتا ہے، آتما اور پرماتما اس کی دیکھی بھالی چیزیں ہیں اور وہ اپنی رُوحانی طاقت سے دوسروں کو بھی خدا سے ملا سکتا ہے۔ ایسے شخص کے قدموں میں خود بخود سر جھک جاتے ہیں ؛

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سری رامکرشن نے کلکتہ سے کچھ دُور دکشنیشور میں کالی ماتا کے ایک نئے مندر میں پجاری کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ یہاں وہ صبح و شام ماتا کی آرتی اتارتے تھے۔ اور پُوجا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اُن کے دِل میں بس یہی ایک خیال رہنے لگا کہ کیا اس مورتی کے پسِ پردہ واقعی کوئی جگت ماتا ہے جو انسان کو رُوحانی مسرتوں سے بھرپُور کر دیتی ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ اُس جگت ماتا ہی کے اشارے سے یہ سب سنسار چل رہا ہے؟ کیا وہ زندہ ہستی ہے یا محض ایک خیال و خواب؟ کیا مذہب کی کوئی حقیقت ہے یا یہ دل کے بہلانے کا کوئی وسیلہ ہے؟

یہ سوال ایک نہ ایک وقت ہر شخص کے سامنے آتے ہیں، یہ سوال ہمارے مُلک میں ہمیشہ اُٹھائے گئے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، دیکھتے ہیں، سُنتے ہیں۔ وہ کہاں تک سچ ہے؟ عالمِ شہود کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارے

مشاہدات اور مدرکات کی اصل کیا ہے محض لفاظی سے ہماری تسلّی نہیں ہوتی، فلسفی نظریوں سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ دینی کتابوں سے یہ بنیادی شکوک دُور نہیں ہوتے، ہمارے یہاں نظریوں کی کمی نہیں دُنیا میں آج تک خدا اور رُوح کے متعلق جتنے بھی مختلف نظریئے تشکیل ہوئے ہیں، وہ سب ہمارے مُلک میں بھی موجود ہیں، مقدّس کتابیں بھی ہمارے یہاں بے شمار ہیں، لیکن ہماری فطرت میں کچھ ایسی بے چینی بھری ہے کہ ہم کتابوں اور نظریوں سے گزر کر ذاتی تجربہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہی ہماری قومی خصوصیت رہی ہے، وصلِ الہیٰ (پربھو ملن) کا خیال یا انکشافِ ذات اور حصُولِ خودی کا خیال یہاں عملی صُورت میں نمودار ہوتا رہا ہے۔ اور ہر عہد میں ہزاروں آدمی ایسے ہوتے آئے ہیں جو اپنی زندگی اسی مقصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں اور آئندہ بھی ہندوستان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو مذہب اور رُوحانیت کو عملی طور پر اپناتے رہیں گے، اس دائمی سوال کا جواب یہاں ضرور ملتا رہے گا کہ کیا خدا کی کوئی حقیقت ہے؟ اور اگر خدا واقعی ہے تو کیا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں؟ اس کی ہستی کو محسوس کر سکتا ہوں؟ کیا میں اس حقیقت کا ادراک و شعور کر سکتا ہوں؟ آپ کے مغربی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال شاید محض قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں، آپ شاید انھیں عملی امکانات کے دائرے سے باہر سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں تو مذہب اگر عملی نہیں تو کچھ بھی نہیں یہاں تو خدا کی تلاش میں لوگ جان تک دے دیتے ہیں۔ میں نے ابھی آپ کے سامنے ہندوستان کے پرانے زمانے کے اُن رشیوں اور مُنیوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اسی تلاش میں دُنیا کے تمام عیش و آرام کو خیرباد کہہ کر ترک کی راہ اختیار کی اور جنگلوں اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں زندگی گزار دی، جو محبوبِ حقیقی کی جُدائی میں خُون کے آنسو روتے رہے اور آخر اُسے پاکر ہی رہے، اِس پربھو ملن کے معنی محض دماغی ادراک و شعور کے نہیں، اِس سے مُراد بس یہی نہیں کہ ان لوگوں نے خدا کے خیال کو اپنی عقل و فراست کی گرفت میں لے لیا۔ پربھو ملن ایک ایسا شدید احساسِ حقیقت ہے جس کے مقابل ہمارے حواس کی دید و شنید خوابِ حیات بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ احساسِ ہستی اِس قدر نشاط انگیز ہے کہ تمام دُنیا کی مسرتیں اس کے آگے ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اسی احساسِ واحد کی لگن میں ہمارے مُلک میں ہزاروں آدمیوں نے اپنی جانیں لٹا دیں اور ہزاروں ایسے نکلیں گے جو اسی لگن میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں گے اس کی خاطر ہزاروں سالوں سے ہماری قوم ترک اور قربانی کے مسلک پر چلتی آئی ہے اور آج بھی ہزاروں ہندو اپنا گھر بار چھوڑ کر اسی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور کئی اس راستے کی مشکلات کی تاب نہ لا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن جان سے جانے کی کس کو پروا ہے۔ یہاں تو لگن

ہی ایسی ہے۔ جہاں جان ہی کی تو بازی لگانی پڑتی ہے۔ اہلِ مغرب شاید اس طرزِ عمل کی قدر نہ کرسکیں۔ اور میں اُن کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، کیونکہ میں مغرب میں رہ چکا ہوں لیکن میں اب بھی یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ پربھو ملن کی لگن زندگی کی سب سے زیادہ عملی چیز ہے، پربھو کو پاکر سب کچھ مِل جاتا ہے۔ لیکن اُس کے بغیر دُنیا کی سب چیزوں کو پاکر بھی انسان خود کو نادار محسوس کرتا ہے، مثلاً میں اپنے متعلق اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب کبھی بھی میرا مَن پرماتما کے خیال سے ہٹ کر کسی اور چیز کا اس طرح ادراک کرتا ہے کہ پرماتما کا شعور اس میں شامل نہیں ہوتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی کے وہ لمحات ضائع ہو رہے ہیں، مجھے ہر وہ گھڑی جو پرماتما کے دھیان میں نہیں گزرتی، رائیگاں جاتی ہوئی معلوم دیتی ہے۔ ہر لمحہ جو اُس کے خیال سے غافل ہو کر گزرتا ہے۔ بیکار محسوس ہوتا ہے یقین مانو کہ کرۂ ارض کے تمام علوم کے معجزے اور سائنس کے سارے کرشمے بھی میرے لئے بے معنی اور فضول ہیں۔ اگر اُن کی وجہ سے میری نگاہ سے حقیقی خود کی جھلک گھڑی بھر کے لئے اوجھل ہو جاتی ہے۔

ہماری زندگی مختصر اور لا فانی ہے، خواہ وہ فرشتوں کے مقام پر گزرے خواہ حیوانوں کے خواہ دیوتاؤں کا علم اور آگہی ہمارے حصے میں آئے یا جانوروں کی جہالت اور لاعلمی، زندگی مختصر اور فانی ہے خواہ مفلس و نادار کی غریبی بے کسی اور مجبوری ہماری قسمت میں ہو، یا قارون کے خزانے اور دھن دولت کی شان و شوکت اور طاقت ہمیں نصیب ہو، زندگی مختصر اور فانی ہے۔ خواہ وہ مغرب کے بڑے بڑے شہروں کی گلیوں میں امارت کے پاؤں تلے دبی دبی کس مپرسی کی حالت میں بسر ہو یا مشرق کے مطلق العنان شہنشاہوں کی صورت میں شہرت اور طاقت کا تاج پہنے، کروڑوں انسانوں پر حکومت کرتے ہوئے گزرے زندگی فانی اور مختصر ہے خواہ ہم صحت اور تندرستی کے مالک ہوں یا بیماری اور کمزوری کے غلام زندگی مختصر اور فانی ہے۔ خواہ ہماری طبیعت شاعرانہ ہو یا ہمیں شعر و ہنر سے دُور کا لگا ؤ بھی نہ ہو۔ خواہ ہمیں وسعت خیال کی بدولت دوسروں سے ہمدردی ہو یا تنگیٔ دل کی وجہ سے ہماری خود غرضی ظلم و ستم رَوا رکھے، زندگی مختصر اور فانی ہے، وقت کے بے کنار سمندر میں ایک قطرہ ہے اور عُشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" ہندوؤں کا کہنا ہے کہ زندگی کے مسائل کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ ہے مذہب اور رُوحانیت، وہ ہے وصلِ الٰہی پربھو ملن، اگر مذاہب سچے ہیں تو مذہب ہی کے بتائے ہوئے طریقۂ عمل سے کائنات کے سربستہ راز کھُلتے نظر آتے ہیں۔ زندگی پُر معنی بن کر قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ بلکہ دُکھوں اور مصیبتوں سے گزر کر مسرتوں سے بھر جاتی ہے۔ لیکن اگر مذہب غلط ہیں، تو زندگی ایک بے فائدہ بُوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا مذاہب سچے ہیں؟ منطق اور دلیل سے مذہب

کی سچائی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، ہاں اِتنا ضرور ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ یہ فلسفۂ حیات قابلِ عمل ہے۔ غیر ممکن نہیں۔ یہی ہمارے مذہب کا مرکزی خیال ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ منطق اچھی سے اچھی دلائل اس سے زیادہ آگے نہیں جا سکتیں، اور سچ تو یہ ہے کہ خود سائنس کے وہ سب اُصول جن کے متعلق ہر طرح کے ثبوت پہنچائے جا سکتے ہیں۔ دراصل ایک سلسلۂ ممکنات ہیں۔ نسبتی علم کے دائرے میں کوئی یقیناً یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے، اسی طرح خُدا کی ہستی کو منطق اور دلائل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اس کا احساس ہو سکتا ہے اور اگر ہم واقعی رُوحانی آگہی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ ذاتی احساس پیدا کرنا ہوگا، تب ہی جا کر یقین اور ایمان کی صورت پیدا ہوتی ہے اور ہم جان جاتے ہیں کہ خدا واقعی ہے، بلکہ یہ سب کائنات اسی کی بدولت ہے۔ رُوحانی باتوں کا ذاتی شعور اور احساس ہونے پر ہی اُن کی صداقت کا یقین پیدا ہو سکتا ہے، اور کوئی طریقۂ آگہی کا نہیں۔ دلائل جتنی کوئی چاہے دیتا رہے رُوحانی حقیقتیں ثابت نہیں کی جا سکتیں لیکن جب ہمارے ذاتی مدرکات و محسوسات مشاہدۂ حق کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، مذہب ایک ٹھوس حقیقت بن جاتا ہے، خُدا حاضر و ناظر ہو جاتا ہے، ہماری ہستی اس کی وسعتوں میں شامل ہو کر بے کنار ہو جاتی ہے اور دل میں احساسِ خودی کی مسرتیں موجزن ہونے لگتی ہیں۔ زندگی معنی سے بھر جاتی ہے۔ راسخ یقین چٹانوں کی طرح اُبھر کر کائنات کا تماشہ کرتا ہے[1]۔

---

[1] اِس ذاتی احساس کو انگریز شاعر ورڈز ورتھ Wordsworth نے اپنی ایک نظم Tintern Abbey. میں قلم بند کیا ہے اس کا آزاد ترجمہ یہاں درج ہے:۔

میری عقل و خرد سو گئی ہے ٭ ور نہ ایسی نہ کچھ بے ہُشی ہے
بند ہے آنکھ پر دیکھتی ہے ٭ سو گیا جسم، جاں جاگتی ہے
رُک گئی ہے مری سانس ایسے ٭ بے خودی میں ہویدا خودی ہے
خُوں رگوں میں نہیں ہے رواں اب ٭ دل کی دھڑکن میں اک شانتی ہے
کیسی حالت ہے میں کیا کہوں اب ٭ مِٹ گئے غم خوشی ہی خوشی ہے
حل ہوئے زندگی کے معمے! ٭ زیست معنی سے ایسی بھری ہے
دُور ظُلمت ہوئی نُور پھیلا ٭ ہر طرف اک نئی روشنی ہے
برکت و رحمتِ حق کی بارش ٭ مجھ گنہ گار پر ہو رہی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷ پر)

میں تو آپ کو یہی مژدہ سُنا سکتا ہوں، اور میرے مُلک کا بھی آپ کے لئے یہی پیغام خوشنودی ہے مذہب اور رُوحانیت ذاتی تجربے کی بات ہے، دِماغی خیال آرائیوں یا منطق اور دلیل کا سلسلہ نہیں۔

یہی ذاتی تجربے کا خیال تھا جو کالی ماتا کے نوجوان پجاری، سری رامکرشن، کے دماغ پر یوں چھا گیا کہ اُن کی زندگی اسی پر مرکوز ہو گئی، وہ رات دن ماتا کے سامنے رو رو کر کہتے "تمہاری واقعی کوئی ہستی ہے یا تمہارا وجود محض شاعرانہ تخیّل کی تخلیق ہے یا فریب خوردہ لوگوں کا فسونِ نظر، اگر تم واقعی زندہ ہو ماتا تو میرے ساتھ بات کیوں نہیں کرتیں؟ کیا میں سمجھ لوں کہ تم بے جان ہو؟ مُردہ ہو؟"

یہ تھا سری رامکرشن کی تلاش کا طریقہ، یہ تھا اُن کی پُوجا کا ڈھنگ، جس میں تکلف کی جھلک تک نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ سری رامکرشن تقریباً اَن پڑھ تھے، اُنہوں نے نہ تو کتابیں پڑھی تھیں اور نہ باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی، اُن کا دماغ کتابی علم اور دُنیاوی تکلفات سے بالکل بے نیاز تھا اور اس لحاظ سے نہایت سادہ، آزاد، صحت مند، پاک اور صاف تھا، اُن کے خیالات قدرتی طور پر پاکیزہ تھے کتابوں کی وساطت سے یا سکول کالج کے اُستادوں اور پروفیسروں کی معرفت دوسروں کے خیالات ان کے دماغ پر نہیں چھائے تھے وہ ہر بات کے متعلق اپنے لیے آپ ہی سوچ لیا کرتے تھے۔ پروفیسر میکس مُلر نے اپنے مضمون میں خوب لکھا ہے کہ سری رامکرشن پاک اور صاف اِنسان تھے۔ اُن کی ہر بات تازہ اور طبع زاد اور خود ساختہ[1] ہوتی تھی۔

جدّتِ فکر[2] کا راز یہ تھا کہ اُن کی تعلیم و تربیت کسی یونیورسٹی کے احاطے میں نہیں

بوجھ ہلکا ہوا زندگی کا! ناچتی کھیلتی جا رہی ہے
رُوح خوشیوں سے لبریز ہو کر ساری دُنیا کا منہ چومتی ہے
آج ہر شئے پہ چھائی ہے مستی اک مسرّت میں فطرت بسی ہے
کوہ و دریا میں شاخ و شجر میں دیکھتا ہوں کہ جاں پڑ گئی ہے
ذرّے ذرّے میں خورشید لرزاں قطرے قطرے میں دریا دلی ہے
انبساط و نشاطِ خودی کے زیست احساس سے کانپتی ہے
اصلِ توحید ہے یہ نظارہ اور یہی جانِ رنگِ دوئی ہے (ایڈیٹر)

[1] original [2] originality.

ہوئی تھی۔

سری رامکرشن کی زندگی کے جس نازک مرحلے کا ہم بیان کر رہے ہیں اُس کے متعلق اُنھوں نے خود کئی بار مجھ سے ذکر کرتے ہوئے اپنی زبانِ مبارک سے کہا کہ مجھے اُن دنوں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ سورج کب طلوع ہوا اور کب غروب ہو گیا، اپنے جسم کا رتی بھر دھیان نہیں رہا۔ یہاں تک کہ کھانا پینا بھی بھول گئے، اِن دنوں اُن کے ایک نزدیکی رشتہ دار نے اُن کی دیکھ بھال کی۔ اِس رشتہ دار کو جب کبھی موقع ملتا کچھ خوراک اُن کے منہ میں ڈال دیتا جسے وہ غیر شعوری طور پر نگل جاتے اُنھیں اپنے تن من کا ہوش نہیں تھا۔ ایسی حالت میں مندر کے پجاری کے مقررہ فرائض سرانجام دینا اُن کے لئے ناممکن ہو گیا۔ دیوی کے درشن پانے کی دُھن کچھ ایسی لگی بھگوان کی حقیقت کو آشکار کرنے کا خیال اُن کے دل و دماغ پر کچھ ایسے چھا گیا کہ اُنھیں اور کسی چیز کی سُدھ بُدھ ہی نہیں رہی یہاں تک کہ دیوی کی پُوجا بھی مقررہ طریقے سے نہ ہو پاتی تھی۔ دیوی کی مُورتی کے آگے کھڑے کھڑے ایسے مگن ہو جاتے کہ کبھی پھُول چڑھانا بھول جاتے کبھی بھوجن لگانا (خوراک بھینٹ کرنا) یاد نہ رہتا اور کبھی آرتی تک نہ اُتار پاتے۔ کبھی یہ حالت ہوتی کہ آرتی اُتارتے اُتارتے سب کچھ بھُول جاتے اور گھنٹوں دیوی کی آرتی ہی اُتارتے رہتے بس ایک ہی خیال تھا جو ہر گھڑی اُن کے دل میں سمایا تھا، اگر دیوی ماتا بے جان مُورتی ہی نہیں زندہ حقیقت ہیں تو میرے سامنے کیوں نہیں آتیں۔ مجھ سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتیں۔

سری رامکرشن کی حالت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاید ہم میں یہاں بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں اِس بات کا شعور اور احساس ہو کہ ہماری زندگی میں چند لمحات ایسے آتے ہیں جب ہم عقل و خرد کی فتنہ سازیوں سے تنگ آ جاتے ہیں۔ جب ہم منطق اور دلائل سے اُکتا جاتے ہیں۔ جب یہ تمام چیزیں بے جان اور بدمزہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ معلومات سے معمور اچھی سے اچھی کتابیں بے لطف ہو جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ لکھائی پڑھائی ایک قسم کی دماغی افیم خوری ہے جس کی مدد سے ہم ایک خوش آئند نیند میں پڑے رہتے ہیں۔ ایسے لمحات میں ہمارے دل سے ایک درد بھری آواز نکلتی ہے۔ ہم پکار پکار کر کہتے ہیں "کیا اِس تمام کائنات میں کوئی ہے جو ہمیں حقیقت کی روشنی دِکھائے"۔ ہم نادیدہ حقیقت سے براہِ راست مخاطب ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں "اگر تمھاری کوئی ہستی ہے، تو مجھے راہ دِکھاؤ۔ اگر تم زندہ ہو تو سامنے آؤ۔ میرے ساتھ ہم کلام ہو، آخر تم چھپ چھپ کر کیوں رہتے ہو، آخر پیغمبروں اور رسُولوں کی وساطت کب تک، تم خود کیوں نہیں سامنے آتے؟ اس جنگ و فساد کی دُنیا میں میرا رہبر کون ہے، میں کس پر ایمان لاؤں اپنے آپ کو سب سچّا اور دوسروں کو جھُوٹا کہتے ہیں۔ نہ جانے کون سچا ہے اور کون

جھوٹا، اگر تم سب اِنسانوں کے خدا ہو تو تم میرے بھی تو خدا ہو، پھر یہ پردہ کیا، میں بھی تو تمہارا ہی بندہ ہوں،، میری خبر کیوں نہیں لیتے۔ اگر تم سب کے جگت پتا ہو تو میں بھی تمہاری ہی اولاد ہوں، مجھے اپنا سہارا کیوں نہیں دیتے"؛

ہماری زندگی میں عموماً ایسے لمحات اس وقت آتے ہیں جب ہم کسی وجہ سے بہت اُداس ہوں۔ لیکن ہمارا ماحول کچھ ایسا ہے کہ ہم جھٹ ان خیالات کو بھول جاتے ہیں، یہاں چاروں طرف دل لُبھانے والی چیزوں کی اتنی کثرت ہے کہ ہم اپنے اندرونی جذبات اور محسوسات کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنّتِ نظارہ کے دروازے کھلتے کھلتے بند ہو جاتے ہیں، نورِ جلوہ تاریکیِ حیات میں نمودار ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے ہم ویسے کے ویسے اندھیرے میں گھرے رہتے ہیں۔ ہماری حیوانی فطرت ہماری یزدانی جبلت پر غالب آجاتی ہے اور ہم پھر سے محض حیوانی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ جانوروں کی طرح کھانا پینا اور آخر میں مرجانا ہی ہماری زندگی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ہم ہی میں سے کئی ایسے دلیر اِنسان ہیں۔ جن کے دل میں ایک بار تلاشِ حق جاگ اُٹھتی ہے تو اُن کے قدم کبھی نہیں ڈگمگاتے، دُنیا اُنھیں لاکھ لالچ دِلائے۔ وہ اپنی راہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ خور و نوش کی زندگی پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ حقیقت کے یہ دلدادے حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں، نُورِ جلوہ کے اِن پروانوں کو اپنی جان تک کی پروا نہیں ہوتی وہ جانتے ہیں کہ آخر ایک دن اِس جسم کو تو جانا ہی ہے، اُسے تلاشِ حق ہی میں کیوں نہ قربان کیا جائے۔ آخر نفس کی فتح سے زیادہ شاندار فتح اور کیا ہو سکتی ہے۔ آخر خیر و شر اور موت و حیات کے مسئلے کا حل تلاش کرنے سے زیادہ عظیم اور کیا کام ہو سکتا ہے؟

ایسے جانباز ہی سری رامکرشن کی حالت کو کسی قدر سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اُن پر جدائی کا خیال وبالِ جان ہو رہا تھا۔ ایک ایک دن کاٹنا مشکل تھا، جب شام ہوتی اور مندر کی گھنٹوں کی سُریلی آواز کان میں پڑتی اور بھجن اور آرتی کے میٹھے سُر سنائی دیتے تو سری رام کرشن کے دل پر مایوسی چھا جاتی اور وہ زور و کر کہتے "ماتا دیکھو ایک اور دن بیت گیا ہے اور تم نے ابھی مجھے درشن نہیں دئیے اس چار روزہ زندگی کا ایک اور دن گزر گیا ہے اور ابھی تک مجھے حقیقت کی جھلک نصیب نہیں ہوئی" شدتِ جذبات سے کبھی کبھی وہ اپنا ماتھا زمین پر رگڑ رگڑ کر رونے لگتے اور سچے دل سے بار بار یہی ایک دعا دہراتے رہتے "اے جگت ماتا تجھے درشن دینا ہی ہوگا۔ دیکھ تو میرا تیرے بغیر کیا حال ہو رہا ہے۔ مجھے تجھ بن کسی اور شئے کی ضرورت نہیں۔"

یہ صرف کہنے کی بات نہیں تھی، اُنہوں نے ترکِ خواہشات کے آدرش کو ہر عملی طریقہ سے اپنایا، وہ اِس آدرش کی زندہ مثال تھے، اُنہوں نے سُنا تھا کہ جگت ماتا صرف اُن کو درشن دیتی ہے جو اپنا سب کچھ اُس کے اَرپن کر دیتے ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ ماتا تو سب کو ملنے کے لئے ہر وقت تیار ہوتی ہے۔ لیکن دراصل کوئی سچّے دل سے اُسے پانے کا خواہاں ہی نہیں۔ کیونکہ لوگ تو پُوجا کرتے ہیں، دُنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لئے دُعا کرتے ہیں تو دُنیا کے سُکھ کے لئے۔ کون ہے جو خود ماتا سے ملنے کا خواہش مند ہے جو اُس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی ہمت رکھتا ہے، ماتا تو اُسی وقت درشن دے دیتی ہے، جب کوئی سچّے دِل سے اور سب خواہشیں مٹا کر فقط اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے۔ چنانچہ سری رامکرشن نے اِس پر حرف بحرف عمل کرنا شروع کیا۔ پہلے تو اُن کے پاس جو کچھ تھا اُسے پھینک دیا اور قسم اُٹھائی کہ میں پیسے کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ صرف زبانی بات نہیں تھی۔ یہ ارادہ کہ وہ روپے پیسے کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے۔ اُن کی زندگی کا جزو بن گیا۔ یہ مافوق الطبعی نہیں، میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ جاگتے ہوئے تو کیا اگر وہ سو رہے ہوتے اور میں اُن کے پاک جسم کو پیسے سے چھُو لیتا تو اُن کے ہاتھ مڑ جاتے اور اُن کا تمام جسم بے جان سا ہو جاتا جیسے کہ اُن پر فالج گر گیا ہو، دوسرے اُنہوں نے مَن میں ٹھان لی کہ نفسانی خواہشات ہی وصلِ الٰہی کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہیں نفس ہی اِنسان کا سب سے بڑا دُشمن ہے۔ اِنسان درحقیقت رُوح ہے۔ رُوح کو جنس سے کوئی تعلق نہیں، رُوح نہ مَرد ہے نہ عورت۔ زر اور زن ہی وہ دو پردے ہیں جو ہماری آنکھوں پر پڑے ہیں۔ اور جو ہمیں جگت ماتا کے درشن سے محروم رکھتے ہیں۔ وَرنہ یہ تمام کائنات خود جگت ماتا ہی کا تو رُوپ ہے۔ وہی تو ہر عورت میں جلوہ گر ہے۔ عورت سے جنسی تعلق کے کیا معنی؟ یہ تو اندھا پن ہے۔ اگر کوئی جگت ماتا سے ملنا چاہتا ہے تو اُس کے لئے لازم ہے کہ وہ جنس کے خیال کو مٹا کر اپنے دل و دماغ کو ایسے ڈھال لے کہ ہر عورت اسے ماں کے برابر معلوم ہو، ہر عورت خود جگت ماتا کی تصویر نظر آئے اور چونکہ سری رامکرشن کی زبان اور عمل میں کبھی بھی رتی بھر فرق نہیں ہوتا تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے خود اس بات پر عمل کیا اور اپنے دل و دماغ کو اُس مقام پر لے گئے جہاں جگت ماتا کے خیال کے علاوہ اور کوئی خیال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا، اور اس طرح ان کی پربھو ملن کی خواہش اپنے کمال تک پہنچ گئی۔ ماتا کے درشن کی پیاس کی شدت حد تک جا پہنچی۔ اور اُنھیں اپنی کچھ سُدھ بُدھ نہ رہی۔ بعد میں اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے خود مجھ سے کہا "میرے بچّے یوں سمجھو کہ سونے کا ایک تھیلا ایک کمرے میں رکھا ہے اور دوسرے کمرے میں چور ہے، جیسے

معلوم ہے کہ ساتھ والے کمرے میں سونے کا تھیلا ہے۔ کیا اِس چور کو ایک لمحہ کے لئے بھی آرام آئے گا؟ ہرگز نہیں، ہر گھڑی اُس کی بے چینی بڑھتی جائے گی۔ اُس کے دماغ میں دوسرے کمرے میں جاکر سونے کو حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی خیال آنے ہی نہیں پائے گا۔ اِسی طرح ہر وہ آدمی بے چین ہو جاتا ہے جسے اس بات کا پورا یقین ہو جاتا ہے کہ اس عالم شہود کے پیچھے ایک واحد حقیقت ہے۔ ایک برہم ہے، خدا ہے جو لازوال ولاثانی ولافانی ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، جو کبھی پیدا نہیں ہوا، اور جس کو کبھی موت نہیں آسکتی جس کی فطرت ہی مسرت ونشاط ہے۔ ایسی مسرت ونشاط جس کے مقابلے میں حواس خمسہ کی خوشیاں اور نفسانی عیش وعشرت ایسے ہیں جیسے کوئی مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہا ہو۔ ایسی حالت میں کیا سچا سالک ایک گھڑی کے لئے بھی وصل الٰہی کے خیال کو ترک کرسکتا ہے؟ کیا وہ اپنی کوششوں سے دست بردار ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں شوقِ دید تو اُسے پاگل بنا دیتا ہے۔"

یہی یزدانی پاگل پن تھا جو سری رام کرشن کے دل ودماغ پر چھا گیا، اس وقت اُنھیں کوئی گرو یا پیر و مرشد ایسا نہیں ملا جو اُن کی راہبری کرتا، بس وہ تھے اور جگت ماتا کے درشن کی آرزو سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ "یہ لڑکا پاگل ہوگیا ہے" یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دُنیا ہمیشہ خدا کے سچے بندوں کو بھگوان کے سچے بھگتوں کو پاگل کہتی آئی ہے اگر کوئی آدمی دُنیا کی قدروں سے اُوپر اُٹھ جاتا ہے اور دُنیاوی چیزوں سے دستبردار ہو جاتا ہے تو دُنیا ہمیشہ ایسے آدمی کو پاگل ہی کہتی آئی ہے لیکن ایسے پاگل دُنیا کی پروا نہیں کرتے، ایسے پاگل ہی دُنیا کا حاصِل ہیں وہی زندگی کو معنی بخشتے ہیں اُنہیں کی بدولت زندگی جینے کے قابل ہوتی ہے اُنہیں کے پاگل پن سے ہی وہ عظیم الشان طاقتیں ظہور میں آتی ہیں جو ہماری دُنیا کی محرک ہوتی ہیں، اور جب تک یہ دُنیا قائم ہے اس پاگل پن کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، یہی تو تمام حرکت کا سبب ہے۔ اسی سے ہماری زندگی ہے۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ سری رام کرشن جیسا "پاگل" ہمارے عہد میں پیدا ہوا، اُن کا پاگل پن روز بروز بڑھتا گیا، دن گزرتے گئے، ہفتے اور مہینے گزرتے گئے اور اُن کا جنون ترقی کرتا گیا تلاش حق کی شدت بڑھتی گئی۔ اس دوران میں انہیں عجیب وغریب تجربے حاصل ہوئے مافوق الفطرت جلوے نصیب ہوئے اور اُن کی اپنی ذات سے آہستہ آہستہ پردے اُٹھنے لگے، حقیقت کے رازِ سربستہ کھُلنے لگے، جگت ماتا خود گرو بن کر اُن کی راہبری کرتی رہیں اس نازک مرحلے پر ایک سنیاسن دکشنیشور آگزری یہ سنیاسن حسن وجمال میں اپنی مثال آپ تھی اور اس کے حسن وجمال

کو اس کی روحانی چمک نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ اُسے تمام علوم پر عبور تھا اس کے متعلق بعد میں سری رام کرشن نے خود فرمایا کہ وہ تو بذاتِ خود علم کی دیوی (سرسوتی) تھی جس نے انسانی روپ اختیار کر رکھا تھا۔ اس سنیاسن نے روحانیت کی تمام منزلیں طے کر لیں تھیں اور وہ اپنے کمال تک پہنچ چکی تھی۔

یہاں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں، ایک تو یہ کہ ایسی باکمال عورت کا ظہور باوجود اس تلخ حقیقت کے ہوا کہ ہندوستانی عورتیں عام طور پر غفلت اور جہالت کے ماحول میں زندگی گزارتی ہیں، جہاں مغربی نقطۂ نگاہ سے اُن کو کسی بات کی آزادی نہیں، دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں عورتیں بھی دُنیا کو ترک کر دیتی ہیں۔ اپنا سب گھر بار بھگوان کی راہ میں دے کر، اور گرہست کی زندگی کو خیرباد کہہ کر تمام عمر بھگوان کی سیوا اور پوجا میں صرف کر دیتی ہیں، جب یہ باکمال سنیاسن دکشینشور پہنچی اور اس نے سُنا کہ مندر کے پاس والے درختوں کے جھنڈ میں ایک لڑکا بھگوان کی بھگتی میں پاگل سا ہو رہا ہے تو وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اور اس بات پر راضی ہو گئی کہ وہ خود جا کر اس سے ملے گی اور جہاں تک ہو سکے گا۔ اس کی مدد کرے گی۔ چنانچہ وہ وہاں پہنچی اور سری رامکرشن کو دیکھتے ہی اُن کے مقام کو پہچان گئی۔ کہنے لگی "میرے بچے خوش نصیب ہے ہر وہ شخص جسے ایسا پاگل پن حاصل ہو۔ آخر یہ تمام دنیا پاگل ہی تو ہے۔ کسی کو دھن دولت حاصل کرنے کا جنون ہے تو کوئی عیش و عشرت پر مرتا ہے ایک کو شہرت وعظمت کی لگن ہے تو دوسرا دنیا کی ہزاروں چیزوں میں سے کسی نہ کسی پر جان دیتا ہے تمام دُنیا سونے چاندی کے لئے پتی پتنی کے لئے۔ بال بچوں کے لئے اور نہ جانے کون کون سی فضول چیزوں کے لئے پاگل ہو رہی ہے اور اس پاگل پن میں لوگ ایک دوسرے پر ہر قسم کے ظلم روا رکھتے ہیں یہاں تک کہ جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے بھگوان کے لئے کس کو اتنا پریم ہے، دُنیا والے تو بس اپنے ہی اس پاگل پن کو سمجھ سکتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دھن دولت اکٹھا کرنے پر تُل جاتا ہے تو دنیا والوں کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے اور وہ اُسے صحیح الفطرت سمجھتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے پاگل صرف دوسرے پاگلوں ہی کو صحیح الدماغ سمجھتے ہیں لیکن اگر کوئی آدمی بھگوان کے لئے پاگل ہو جاتا ہے تو وہ اسے ہرگز نہیں سمجھ پاتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسے آدمی کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور وہ اس سے دامن بچا کر چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بچے وہ سب لوگ تمہیں پاگل کہتے ہیں۔ اس میں گھبرانے یا فکر کرنے کوئی بات نہیں، تمہارا پاگل پن ہی عقل و خرد کا معیار ہے، تمہارا جنون سچی قسم کا جنون ہے جو آدمی بھگوان کے لئے پاگل ہو گیا ہے اس پر بھگوان کی دیا ہے۔ ایسے آدمی کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں"

اس طرح سنیاسن نے سری رامکرشن کو تسلی دلائی اور اپنی راہ پر قائم رہنے کی ہدایت کی، اس بلند مرتبہ سنیاسن نے کئی سال تک دکشنیشور میں قیام کیا اور سری رامکرشن کو ہندوستان کے مختلف مذاہب کے متعلق تعلیم دیتی رہی! اس سنیاسن نے ہی سری رام کرشن کو یوگ کے بہت سے عمل بتائے اور ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کی۔ اور اس طرح روحانیت کے اس طوفانی دریا کو اپنے پاٹ میں بہنا سکھایا۔

کچھ عرصہ بعد دکشنیشور میں ایک اور سنیاسی آنکلا۔ یہ سنیاسی بہت ہی وِدوان (عالم و فاضل) تھا وہ گیان (معرفت) کے بلند ترین مقام تک پہنچا ہوا تھا وہ کئی لحاظ سے دوسرے سنیاسیوں سے بھی مختلف تھا مثلاً اس کو یقین تھا کہ اس عالمِ شہود کی دراصل کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ سب بے بصری یا کم نگاہی کا نتیجہ ہے' اور اس بات کو عملاً دکھانے کے لئے وہ ہمیشہ کھلی فضا میں رہتا تھا کبھی کسی مکان کے اندر داخل تک نہیں ہوتا تھا۔ گرمی ہو یا سردی یا برسات کسی چھت کے نیچے آرام کے لئے کبھی نہیں رُکتا تھا، اس سنیاسی نے سری رامکرشن کا شوقِ تلاش دیکھ کر انھیں ویدوں کا فلسفہ پڑھانا شروع کردیا لیکن اُسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ چیلا کئی باتوں میں گرو سے زیادہ آگے تھا۔

سری رامکرشن میں کچھ ایسی کشش تھی کہ خلافِ معمول یہ سنیاسی وہاں کئی مہینے رُکا رہا اور درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر اُس نے اپنے ہاتھوں سری رامکرشن کو سنیاس دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

جب سری رامکرشن کے رشتہ داروں نے اُن کے عجیب و غریب پوجا کے طریقے کو دیکھا تو وہ سمجھے کہ اُن کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے، بطور علاج وہ انھیں اپنے گاؤں لے گئے اور وہاں اُن کی شادی ایک چھوٹی سی لڑکی سے کردی، اُس وقت سری رامکرشن کی عمر ۲۳ سال کے قریب تھی اور ان کی بیاہتا کی عمر تقریباً چھ سال کی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ سری رامکرشن کا مَن دوسری طرف لگ جائے گا لیکن اُن کا جنون تو روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ جلد ہی دکشنیشور واپس آگئے، اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اُن کے پاگل پن میں کوئی کمی نہیں آئی۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مُلک میں بعض اوقات لڑکے لڑکیوں کی چھوٹی عمر میں ہی شادی کردی جاتی ہے۔ اُن کی مرضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں اُن کے ماں باپ نے چاہا رشتہ کردیا۔ شادی کے بعد بھی یہ لڑکے لڑکیاں اپنے والدین کے پاس ہی رہتے ہیں۔ یہ شادی

ایک لحاظ سے محض منگنی کے برابر ہوتی ہے۔ اصلی شادی تو تب ہوتی ہے جب لڑکی بڑی ہو جاتی ہے۔ اُس وقت اس کا خاوند اُسے اپنے گھر لے آتا ہے ؛

سری رامکرشن کی حالت تو یہ تھی کہ وہ اس بات کو بالکل بھول ہی گئے تھے کہ کبھی اُن کی شادی بھی ہوئی تھی اور اُن کی ایک بیوی بھی تھی جس کی طرف اُن کے کچھ فرائض تھے۔ دُور اپنے گاؤں میں اُن کی "پتنی" جوان ہو گئی اُس نے سُنا کہ اُس کا خاوند دن رات بھگوان کی پُوجا میں لگا رہتا ہے اور سنیاس لے بیٹھا ہے، دوسرے یہ کہ لوگ اُسے پاگل کہتے ہیں اُس نے یہ سُن کر فیصلہ کیا کہ خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ دراصل بات کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے گاؤں سے پیدل چل پڑی اور کئی دن کے سفر کے بعد دکشنیشور پہنچ گئی۔ اور اپنے پتی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سری رامکرشن سنیاس اختیار کر چکے تھے اور ہمارے مُلک میں جب کوئی سنیاس لے لیتا ہے تو وہ تمام دُنیاوی فرائض سے سُبکدوش ہو جاتا ہے۔ اِس لئے اگر سری رامکرشن چاہتے تو وہ اُسے پتنی کا حق دینے سے انکار کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی پتنی کو اپنا حق طلب کرنے کا موقعہ دیا، وہ اس کے پاؤں چھُو کر کہنے لگے "جگت ماتا کی کرپا سے مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ ہر عورت میں خود ماتا براجمان ہیں، ماتا کے علاوہ مجھے تو اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا، میرے دل میں تو تمہارے متعلق اِس خیال کے علاوہ اور کچھ آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن اگر تم چاہو کہ میں پھر اس حواس کی دُنیا میں واپس آ جاؤں، تو تمہارا حق ہے چونکہ میری شادی تم سے ہو چکی ہے تم چاہو تو اپنا حق مانگ سکتی ہو"۔

سری رامکرشن کی پتنی بھی ایک پاک اور عظیم ہستی تھیں، اپنی رُوحانی پاکیزگی کی وجہ سے فوراً سمجھ گئیں کہ سری رامکرشن کی راہِ عمل کیا ہے، اور وہ روحانیت کے کس بلند مقام تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے فوراً جواب دیا کہ میرے دل میں آپ کو دُنیاداری کے بندھن میں باندھنے کی کوئی خواہش نہیں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ آپ کے پاس رہ کر آپ کی خدمت اپنے ہاتھوں سے کروں۔ اور آپ کو سمجھنے کا موقع حاصل کروں۔ چنانچہ اُنہوں نے سری رامکرشن کو اپنا گُرو دھارن کیا اور اُس دن سے انھیں بھگوان، مان کر اُن کی خدمت اور پُوجا میں لگ گئیں۔ اس طرح سے اپنی بیاہتا بیوی کی مرضی سے سری رامکرشن کا آخری دُنیاوی بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی روحانی زندگی کی معراج کے لئے آزاد ہو گئے۔

اس کے بعد سری رامکرشن کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہر مذہب کی بنیادی حقیقت کا ذاتی تجربہ کی بنا پر جائزہ لیا جائے۔ اس وقت تک اُن کی جانکاری بس اپنے ہی مذہب

تک محدود تھی اَب وہ جاننا چاہتے تھے کہ دوسرے مذاہب کی حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے باری باری ہر مذہب کو اختیار کیا، اور اُس کے اُصولوں پر عمل پیرا ہو کر دیکھا کہ وہ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہیں اُنہوں نے ہر مذہب کی تعلیم اس مذہب کے کسی خدا رسیدہ مُرشد سے حاصل کی اُن معلّموں سے نہیں جنھیں صرف کتابی علم ہوتا ہے، بلکہ اُن برگزیدہ ہستیوں سے جنہوں نے کسی کی وساطت سے نہیں بلکہ ذاتی طور پر خدا تک رسائی حاصل ہو، اِس سلسلے میں ایک مسلمان صُوفی سے اسلام کا طرزِ عمل سیکھا وہ اس فقیر کے پاس گئے اور اسکے ساتھ ہی رہنے لگے جو جو مذہبی پابندیاں اُس نے عائد کیں اُنھیں قبول کیا۔ اور اُن پر صدق دل سے عمل کیا۔ آخر اُنہوں نے دیکھا کہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں پر سچے دل سے ایمان لا کر عمل کرنے سے اُسی ایک حقیقت کا احساس ہوتا ہے جسے وہ ہندو مذہب کے طریقوں سے حاصل کر چکے تھے۔ اِسی طرح اُنہوں نے عیسائی مت کے اُصولوں کی پابندی قبول کی اور ان پر عمل کیا، اور یسوع مسیح کے مذہب کی حقیقت کو بھی اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ثابت کر دیا یہی نہیں بلکہ جتنے بھی مذہبی فرقوں کا اُنھیں علم تھا اُن سب کو اُن ہی کے مُرشدوں کی ہدایت کے مطابق اپنے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا اور اعلان کیا کہ سب کے سب سچے ہیں۔ کیونکہ سب ایک ہی خدا تک لے جانے کے مختلف طریقے ہیں۔ سب کی منزل ایک ہے، فرق اگر ہے تو زیادہ تر طریقہ عمل کا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر زبان کا فرق ہے۔ بنیادی طور پر سب مذاہب اور سب روحانی فرقوں کا مقصد صرف ایک ہے۔ اپنی رُوحانی حقیقت کو پانا۔ خدا سے ملنا، یہ جو مذہبی جنگ و فساد ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض خود غرض لوگ اپنے مفاد کی خاطر عوام کو دھوکا دے کر مختلف مذہبوں کے ظاہری سماجی تفرقات پر زور دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو حقیقت تک جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ اُنہیں تو اپنے نام کی شہرت سے غرض ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ فساد کی جڑ ہیں سب مذہب ایک ہی حقیقت کا پرچار کرتے ہیں۔ لیکن ایک کے پیرو کہتے ہیں کہ "دوسرا مذہب سچ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس پر میرا ایمان نہیں ہے۔ جب میری مُہر تصدیق اس پر ثبت نہیں تو وہ سچا ہو بھی کیسے سکتا ہے"۔ برعکس اس کے دوسرے مذہب کے پیرو کہتے ہیں کہ "ان لوگوں کی کیا سنتے ہو، بظاہر وہ بھی اسی خدا کا پرچار کرتے ہیں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں لیکن اُن کا خدا جھوٹا ہے اس لئے کہ وہ میرے نام سے منسوب نہیں۔ اس کا پرچار نہیں کرتا"۔ یہ ہے جنگ، ہفتاد و دو ملت کی اصل انسان کی خود غرضی۔ خود ستائی، خود پرستی، شہرت وطاقت کی زبردست خواہش۔ ورنہ مذہب تو آپس میں کسی کو بیر رکھنا نہیں سکھاتے۔ جب گرُودیو (پیر و مرشد) سری رامکرشن اس نتیجہ پر پہنچے تو انہوں نے سوچا کہ اگر انسان حلم (نمرتا) اختیار کرے تو سب جھگڑے مٹ سکتے ہیں۔ کیونکہ سب مذاہب

کام کرنے کا مقصد ایک ہے یعنی خدا کو پانا۔ اور سب کا بنیادی اصول اور طریقۂ عمل ہے "میں" سے گزر کر "تو" تک جانا، اِس مقام پر پہنچنا جہاں "تو ہی تو ہے" میری کوئی ہستی نہیں جب "میں" کا شعور مٹنے لگتا ہے تو "تو" کا احساس اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جب بندہ "میں" کو ترک کر دیتا ہے تو خود خدا اُس کے دل میں بس جاتا ہے، جتنا کم "میں" کا شعور ہو گا۔ اُتنا زیادہ خدا کا احساس پیدا ہوتا جائے گا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں سری رامکرشن کبھی نظریوں پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ وہ جونہی کسی خیال کو اپناتے تھے اس پر عمل کر کے اُس کی صداقت کو ثابت کر لینا چاہتے تھے۔ ہمیں اس دُنیا میں بہت سے ایسے آدمی ملتے ہیں جو سخاوت، اخوت اور مروت کے متعلق بڑی بڑی باتیں بناتے ہیں لیکن خود اُن پر عمل نہیں کر پاتے، یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میرا تعلق ایک ایسے عظیم الشان انسان سے ہوا جو ہر اُس نظریہ کو جسے وہ راستی پر مبنی سمجھتے تھے، عملی صورت دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے اور جن میں ایسا کرنے کی طاقت اور ہمت تھی۔ چنانچہ جب وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسرِ نفسی (نمرتا) ہی سے تمام تفرقات مٹ سکتے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ سماج کے نیچ سے نیچ اچھوت لوگوں کی اپنے ہاتھوں سیوا کریں گے۔ مثلاً آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں لاکھوں ایسے لوگ ہیں جنہیں اچھوت کہتے ہیں، سماج انھیں اس قدر نیچ سمجھتا ہے کہ اگر کوئی برہمن اپنے گھر سے نکلتے ہوئے کسی اچھوت کو دیکھ لے تو اُسے اُس روز برت رکھنا ہوتا ہے اور کچھ خاص پوجا پاٹھ کرنا ہوتا ہے تاکہ اُس کا تقدس بحال ہو جائے۔[1] بعض شہروں میں تو اچھوت لوگ اپنے سر پر کوے کا کالا پر لگا کر چلتے ہیں اور ساتھ ساتھ آواز بھی دیتے جاتے ہیں "اچھوت آ رہا ہے، اپنے آپ کو دُور رکھو" اور سچ مچ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگتے ہیں، کیونکہ اگر اچھوت کو چھو لیا تو انھیں کپڑے بدلنا پڑتے ہیں۔ نہانا پڑتا ہے، اور کئی ایک رسوم ادا کرنا پڑتی ہیں۔ تب جا کر وہ اپنے آپ کو دوبارہ پاک سمجھتے ہیں اور اچھوت کا یہ حال ہے کہ ہزارہا سال کے اس برتاؤ سے وہ سمجھنے لگا ہے کہ یہ سب کچھ واجب ہے اور یہ سچ ہے کہ اُسے چھونے سے لوگ ناپاک ہو جائیں گے، اچھوت کا کام شہروں کی گلیاں اور لوگوں کے گھروں میں پاخانے وغیرہ کو صاف کرنا ہے، اسے اس کام کے لئے بھی کسی گھر میں سامنے کے دروازے سے آنے کی اجازت نہیں۔ وہ پچھلے دروازے سے آ کر اپنا کام کر کے چلا جاتا ہے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا ہے لوگ اُس جگہ پر گنگا جل چھڑک کر اُسے نئے سرے سے پوتر کر لیتے ہیں، جیسے برہمن جنم سے پاک مانا جاتا ہے۔ اِسی طرح اچھوت

---

[1] یہ ساٹھ سال پہلے کی بات ہے، خود سوامی وویکانند کی کوششوں سے اور خصوصاً مہاتما گاندھی کے عملی پروگرام سے آج ہندوستان میں اچھوتوں کی حالت کہیں بہتر ہے

کو جنم سے ناپاک سمجھا جاتا ہے۔

اب آپ خود ہی اِس فیصلہ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سماج کے اِس ماحول میں رہتے ہوئے بھی سری رامکرشن جو جنم سے اونچی ذات کے برہمن تھے۔ اِس پر تُل گئے کہ وہ اچھوتوں کے گھروں میں جاکر وہی صفائی کا کام کرینگے جو اچھوت اونچی ذات والوں کے گھروں میں کرتے ہیں۔ دکشنیشور کے پاس ہی اچھوتوں کی ایک بستی تھی وہ وہاں جا پہنچے اور ایک اچھوت سے کہا کہ وہ اس کے گھر پاخانہ وغیرہ صاف کرنے آئے ہیں۔ اچھوت بھلا اُنھیں کب اِس بات کی اجازت دے سکتا تھا، وہ تو سچ مچ یہی سمجھتا تھا کہ اگر ایک برہمن کو اس قِسم کا نیچ کام کرنے دیا گیا تو اس کے سر پر پاپ چڑھ جائے گا اور کوئی نہ کوئی بلا اس کے سارے خاندان کو تباہ کر دے گی۔ سری رامکرشن واپس لوٹ آئے لیکن آدھی رات کو جب سب لوگ سو رہے تھے وہ پھر وہاں پہنچے اور اپنے لمبے لمبے بالوں کو جھاڑو کے طور پر استعمال کر کے اس اچھوت کے گھر کی صفائی کرنے لگے، اور ساتھ ساتھ جگت ماتا کو خطاب کر کے کہتے جاتے تھے "ماتا مجھے اِن اچھوتوں کا سیوا کار (خادم) بننے کی توفیق دے اور میرے دل سے برتری کے سب خیال مٹا دے اور اس میں یہ احساس بھر دے کہ میں اِن سے بھی کمتر ہوں"۔

یہ تھا اُن کا عملی طریقہ "میں" کو مٹانے کا، "میں" کی اہمیت کو ختم کرنے کا، اسی قسم کے عمل کے لئے ہماری متبرک کتابوں میں بھگوان کے الفاظ میں لکھا ہے "میری پُوجا کا سب سے اچھا طریقہ میرے پجاریوں کی پُوجا ہے یہ پُوجا مجھے سب سے اچھی لگتی ہے میرے بھگت، میرے بندے، میری اولاد ہیں تمھیں اُن کی سیوا کرنے کا حق ہے"۔

اِس طرح سری رامکرشن اپنے آپ کو راہِ عشق کے آخری مقام، وصلِ الٰہی کے لئے تیار کرتے رہے لیکن چونکہ اِن تفصیلات کا ذکر کرنے میں زیادہ وقت لگے گا اور مجھے تو اُن کی زندگی کا مختصر سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس لئے یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ وہ کئی سالوں تک ریاضت (سادھنا) میں لگے رہے، مثلاً اُن کی ایک سادھنا یہ تھی کہ جنس کا خیال دِماغ سے مِٹا دیا جائے جنس کا خیال تو جسم ہی سے متعلق ہے۔ رُوح کی کوئی جنس نہیں۔ اور رُوح کے سچے احساس کے لئے لازمی ہے کہ دِماغ میں نر مادہ کا خیال ہی نہ رہے۔ چونکہ اُن کو جنم سے مَرد کا جسم مِلا تھا۔ اِس لئے اس خیال کو مٹانے کے لئے اُنھوں نے کچھ عرصہ تک اپنی ہر بات کو عورتوں کا رنگ دینا شروع کر دیا، عورتوں کا لباس پہننا شروع کر دیا۔ بات چیت اور اُٹھنے بیٹھنے میں عورتوں کے ڈھنگ اختیار کر لئے۔ اور ایک اونچے خاندان میں عورتوں کے درمیان رہنے لگے۔ اور مُدت تک اس طرح رہنے سے دل و دماغ سے جنس کا

خیال غائب ہوگیا اور اُن کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا۔

مغرب میں بھی عورت کی پرستش ہوتی ہے لیکن یہ پرستش دراصل اس کے حُسن و شباب کی پرستش ہوتی ہے۔ سری رامکرشن بھی عورت کی پوجا کرتے تھے لیکن اُن کی پوجا کے معنی یہ تھے کہ اُن کے لئے ہر عورت جگت ماتا کا رُوپ تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ ایسی ایسی عورتوں کے چرنوں میں اپنا سر رکھ دیتے تھے جنہیں سوسائٹی حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے، وہ اُن کے پاؤں کو اپنے آنسوؤں سے دھو کر کہہ اُٹھتے تھے "جگت ماتا تم اِس رُوپ میں گلیوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہو اور تمہارے اصل رُوپ میں سب کائنات کا وجود ہے۔ ماتا میں تمہیں پرنام کرتا ہوں، بار بار پرنام کرتا ہوں۔"

آپ سوچیئے تو وہ کتنی مُبارک ہستی ہوگی جس کے لئے ہوس بالکل مِٹ چکی ہو، جس کی نظر میں ہر عورت عزت اور پرستش کے قابل ہو، جسے ہر عورت کے چہرے میں اُس جگت ماتا کے جمال کا نُور چمکتا نظر آتا ہو، جس کی قدرت سے یہ تمام جہان قائم ہے۔ جو مسرت اور نشاطِ ابدی کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہے سچّی ریاضت، جگت ماتا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا، ریاکاری اور مکّاری ماتا کی نظر سے چھپی نہیں رہ سکتی وہ اُسے جھٹ بھانپ لیتی ہے۔ جب تک ہمارے دل میں ہوس کا ہلکا سا پرتو بھی باقی ہے۔ جب تک ہم جنس کے خیال سے مکمل نجات نہیں پا لیتے اُس وقت تک رُوح کا احساس نامکمل ہے۔ جسم ہے تو روح نہیں، روح ہے تو جسم نہیں۔

اگر ہمیں جگت ماتا کے درشن پانا ہے تو ہمیں سچے پیار کی گرمی اور رُوحانی تلاش کی روشنی پیدا کرنا ہوگی۔ ہمیں اپنے دل میں صدق و صفا کو موجزن کرنا ہوگا۔ یہی چیزیں ہیں جنھیں ماتا قبول کرتی ہے۔ شردھا (یقین و ایمان) بھگتی پریم (عشقِ صادق) اور پوترتا (پاکیزگی) کے بغیر حقیقی روحانیت ناممکن ہے اور یہ سب چیزیں سری رامکرشن میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اُن کی شردھا اور بھگتی نے سخت ریاضت کو جنم دیا اور ریاضت سے پریم اور پوترتا کا سرچشمہ پھوٹ پڑا، اُن کی زندگی سراسر پاکیزگی میں ڈوب گئی۔ دُنیا کی آلائش اُن کے پاس پھٹک ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تمام جدو جہد اور کشمکش جو ہماری زندگی کا حصہ ہے سری رامکرشن کے لئے ختم ہوگئی۔ اب رُوحانیت کے وہ خزانے لٹانے کا وقت آگیا۔ جو اُنھوں نے اپنی ذات کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر نکالے تھے۔ اور جن کی خاطر اُنھوں نے اپنی زندگی کا تین چوتھائی حصہ صرف کر دیا تھا۔ اُن کی تعلیم کا طریقہ بھی خاص تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ "اگر میرے مُنہ سے کوئی کام کی بات نکلتی ہے، تو وہ دراصل

ماتا ہی کی آواز ہے، میری بساط ہی کیا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں کسی کو تعلیم دینے والا؟" اُنہوں نے ہزاروں آدمیوں پر معرفت کے دروازے کھول دیئے لیکن آخر دم تک یہی کہتے رہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ جگت ماتا خود کر رہی ہے، میرا اِس میں کیا ہے؟

شاید آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مُلک میں گُرو کا مقام بہت بلند ہے، ہم گُرو کو بھگوان مان کر اس کی پرستش کرتے ہیں جو مقام ہمارے گُرو کا ہے وہ ماتا پِتا کا بھی نہیں۔ ہم گُرو کی ماں باپ سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ ماں باپ سے ہمیں ہمارا جسم حاصل ہوتا ہے لیکن گُرو سے ہمیں مُکتی مِلتی ہے وہ ہمارا رُوحانی باپ ہے اور ہم اُس کی اولاد ہیں۔ اِس لئے جہاں کہیں کسی خُدارسیدہ گُرو کا پتہ چلتا ہے۔ لوگ دور دراز سے اس کی خدمت میں جا پہنچتے ہیں، سری رامکرشن ایسے ہی جگت گُرو تھے۔ ہزاروں لوگ اُن سے رُوحانی مدد کے لئے آتے تھے لیکن اُنہوں نے کبھی بھُول کر بھی نہیں سوچا کہ وہ بہت بڑے گُرو ہیں ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ سب ماتا ہی کی لیلا ہے اپنی شخصیت کے ساتھ کسی کام کو منسوب نہیں کیا دوسری خاص بات یہ تھی کہ اُنہوں نے کبھی کسی کو اپنے زیرِاثر لانے کی کوشش نہیں کی وہ کہا کرتے تھے کہ پہلے اپنا کیریکٹر بناؤ۔ اپنی رُوحانی طاقت کو جگاؤ پھر جو بھی کرنا چاہو گے ہو جائے گا۔ کیریکٹر (اخلاق) اور رُوحانی طاقت کے بغیر ہاتھ پیر مارنا فضول ہے۔ مثال کے طور پر وہ بارہا فرماتے تھے "جب کنول کا پھُول کھِلتا ہے تو شہد کی مکھیاں خود بخود آ موجود ہوتی ہیں، پہلے اپنے کردار کے کنول کو کھِلنے دو، لوگ تمہارے پاس خود بخود دوڑتے آئیں گے۔" اُنہوں نے یہ عظیم سبق مجھے کئی بار سکھایا لیکن میں اسے بار بار بھُولتا رہا۔ اس کی عظمت اور اہمیت کو سمجھنا آسان نہیں۔ بہت کم لوگ خیال کی طاقت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، اگر کوئی آدمی دُنیا ترک کر کے اپنے آپ کو ایک غار میں بند کر لیتا ہے اور وہاں بیٹھ کر اپنی پوری رُوحانی طاقت سے واقعی کوئی عظیم خیال سوچتا ہے اور بغیر کسی سے بات کئے وہیں مر جاتا ہے، تو بھی وہ خیال اِس غار کے پتھروں کو چیرتا ہوا باہر آئے گا اور آکاش میں مرتعش ہو کر آخر تمام بنی نوع انسان کے دل و دماغ میں بس جائے گا اور ہماری ارتقا کا محرک ہو گا یہ ہے خیال کی زبردست طاقت لیکن ایسے بلند اور زبردست خیال اعلیٰ اخلاق اور گہری روحانیت سے ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور تو اور دوسروں کی بھلائی اور اصلاح اور تعلیم و تدریس کے کام میں بھی جلدبازی کی ضرورت نہیں۔ پہلے کسی کو کچھ دینے کی طاقت پیدا کی ہمت اور تعلیم دینے کی اہلیت تو پیدا کر لو، پہلے اپنی رُوح کو تو بیدار کر لو، بس وہی آدمی کسی کو سچی تعلیم دے سکتا ہے جس کے پاس دینے کو کچھ ہے۔ تعلیم محض باتیں بنانے کا نام نہیں۔ تدریس فقط نظریہ بازی پر محدود نہیں۔ سچی تعلیم اپنی حاصل کی

ہوئی آگہی کو دوسروں میں منتقل کرنے کا نام ہے، وہی سچّا گُرو ہے جو اپنی معرفت اپنے عِلم کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے، ایسا گُرو اپنے چیلوں کو رُوحانی علم اِس طرح دے دیتا ہے، جیسے کوئی ایک پھُول اُٹھا کر کسی کے ہاتھ میں دے دے، یہ بات مثال کے طور پر نہیں حرف بحرف سچّی ہے، ہندوستان میں تو خیر یہ خیال کافی پُرانا ہے۔ لیکن مغرب میں بھی اس کی مثال رُوحانی وراثت[1] کے نظریہ اور اعتقاد میں ملتی ہے، اِس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم اپنا کیریکٹر بنائیں، ایک اعلیٰ کردار قائم کریں۔ یہی ہمارا اوّلین فرض ہے، صداقت کو پہلے خود پاؤ، اپنی خودی اور اپنی ذات کی حقیقت سے پہلے خود آگاہی حاصل کرو، پھر دوسروں کو راہ دِکھانے کا وقت بھی آجائے گا، لوگ خود بخود تمہارے پاس کھچے چلے آئیں گے۔

یہ تھی میرے گُرودیو کی تعلیم یہ تھا اُن کا نقطۂ نظر اُنہوں نے ہمیشہ حصُولِ آگہی پر زور دیا۔ ہمیشہ مثبت کی بات کی کبھی نفی کی بات اُن کی زبان پر نہیں آئی۔ اُنہوں نے کبھی کسی پر نکتہ چینی نہیں کی۔ بیس برسوں اُن کے ساتھ رہا لیکن میں نے ایک بار بھی اُن کی زبان سے کسی آدمی یا مذہبی اور سماجی فرقے کے متعلق تنقید کا کوئی لفظ نہیں سُنا۔ اُنھیں سب کے ساتھ پُوری ہمدردی تھی، اُنہوں نے سب میں موافقت ڈھونڈھ نکالی تھی۔ اُن کی نظر میں سب برابر عزت کے لائق تھے، آج تک عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آدمی یا تو دماغی طاقت حاصل کر کے گیانی ہو سکتا ہے یا بھگوان کی بھگتی میں کمال پیدا کر سکتا ہے یا صوفی بن کر معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ یا کرموں میں مصروف ہو کر کرم یوگی بن سکتا ہے۔ لیکن سری رامکرشن نے ہمیں دکھا دیا کہ اِنسان گیان، راجہ یوگ بھگتی اور کرم چاروں کو یک جا کر کے اپنی زندگی میں گھول سکتا ہے۔ اُنھوں نے کسی بھی مسلک کو بُرا نہیں کہا۔ سب کو برابر مان کر دکھا دیا۔ کہ اِنسانی ارتقا کی اگلی منزل یہی ہے۔ مستقبل کا انسان اِن تمام خوبیوں کا مالک ہوگا۔

آہستہ آہستہ سری رامکرشن کے کھُلے ہوئے رُوحانی کمل کی خوشبو چاروں طرف پھیلنے لگی، لوگ ہزاروں کی تعداد میں اُن کے درشنوں کو آنے لگے۔ سری رامکرشن سب سے ملتے اور عام فہم روزمرہ کی زبان میں گفت گو کرتے لیکن اُن کا ایک ایک لفظ روحانی طاقت سے لبریز اور نورِ حقیقت سے درخشاں ہوتا تھا۔ سُننے والے اُن کی عظیم الشان ہستی کا پائدار اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اثر محض زبان اور الفاظ کی بات نہیں۔ اس کا انحصار بولنے والے کی شخصیت پر ہوتا ہے

---

[1] Apostolic succession

جتنی عظیم کسی مقرر کی شخصیت ہوگی اور جتنا ہی وہ اس شخصیت کو اپنے الفاظ کے ذریعے سامعین تک پہنچانے میں کامیاب ہوگا۔ اُتنا ہی زیادہ وہ موثر بھی ہوگا۔ کبھی نہ کبھی ہم سب کو اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔ کئی بار ہم نہایت بلیغ تقریریں سُنتے ہیں جن کے منطق اور پُر دماغ دلیلوں میں کافی زور ہوتا ہے لیکن ہم پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور گھر آتے ہی اُن کو بھول جاتے ہیں برعکس اس کے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیدھی سادی زبان میں چند الفاظ پر مشتمل کوئی بات سن لیتے ہیں تو وہ ہماری زندگی کا جزو بن جاتی ہے اور ہمارے کاموں کی محرک ثابت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر وہ لفظ جس میں بولنے والے کی شخصیت بھری ہے۔ مؤثر ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ایسی شخصیت بھی بلند اور اعلیٰ ہو تعلیم و تدریس حقیقی معنوں میں لینے دینے کا ایک سلسلہ ہے معلم اپنے علم ہی کو نہیں بلکہ اپنی تمام شخصیت کو طالب علم کے سپرد کرتا ہے اور وُہ اسے قبول کرتا ہے۔ جہاں معلم کے پاس دینے ہی کو کچھ نہیں اور جہاں طالب علم میں قبول کرنے کی اہلیت ہی نہیں وہاں تعلیم و تدریس بے معنی ہو جاتی ہے ؎

سری رامکرشن کی روحانی دولت کا تو یہ حال تھا کہ جو جتنی چاہے لوٹ لے اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس لئے اس بیش بہا دولت کے خواہاں اُن کے ہاں آنے لگے۔ خصوصاً جب وہ کلکتہ کے نزدیک آکر رہنے لگے تو کلکتہ یونیورسٹی کے نوجوان طلبا نے بھی جن میں اکثر ناستک اور منکر تھے، اُن کے ہاں آنا شروع کر دیا اس وقت کلکتہ یونیورسٹی مُلک بھر میں سب سے بڑی تعلیمی درسگاہ مانی جاتی تھی اور یہاں کی مغربی تعلیم کے زیر اثر سینکڑوں مادیت کے پرستار، ناستک اور مُنکر ہر سال اس یونیورسٹی سے پاس ہوتے تھے، لیکن نہ جانے کیوں ان میں سے بہت سے طلبا سری رامکرشن کے پاس جاتے تھے میں بھی اس وقت کلکتہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ جب میں نے سری رامکرشن کا ذکر سُنا تو ایک دن اُن سے ملنے چلا گیا میں نے دیکھا کہ ایک عام قسم کا آدمی ہے جس میں کوئی خاص بات نمایاں نہیں، بات بھی۔ بالکل سیدھی سادی زبان میں کرتا ہے، علم وفضل کا کوئی نشان تک نہیں، یہ دیکھ کر میں نے سوچا "کیا یہ شخص اتنا بڑا گرو ہو سکتا ہے۔ جتنا کہ لوگ کہتے ہیں" یہ سوچ کر میں آگے بڑھ کر اُن کے اور قریب ہُوا۔ اور میں نے اُن سے وہ سوال کیا جو میں اس سے پہلے کئی دینی معلموں سے کر چکا تھا لیکن جس کا مجھے آج تک تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ میں نے پوچھا "مہاراج کیا آپ بھگوان پر یقین رکھتے ہیں" "ہاں" انہوں نے جواب دیا "کیا آپ بھگوان کی ہستی کو ثابت کر سکتے ہیں" میں نے سوال کیا، "ہاں" اُنہوں نے پھر کہا، "کیسے؟" میں نے سوالوں

کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا' فرمایا "میں بھگوان کو عین اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے تم میرے سامنے کھڑے ہو بلکہ مجھے بھگوان کا احساس اس سے بھی زیادہ شدّت سے ہے" اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں لاجواب ہوگیا میری زندگی میں سری رامکرشن وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اعلانیہ کہا کہ انھوں نے بھگوان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جنہوں نے یہ بتایا کہ مذہب اور روحانیت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا شعور اور احساس ہوسکتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس شعور اور احساس میں جو شدّت ہے وہ حواس کے شعور و احساس سے کہیں زیادہ ہے۔

اس دن کے بعد میں نے متواتر ان کے پاس جانا شروع کردیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دماغ سے محسوس کیا کہ رُوحانی تجربات ایک آدمی سے دوسرے کو منتقل کیے جاسکتے ہیں۔ عارف و سالک کی ایک نگاہ یا اُن کے دستِ مبارک کا لمس انسان کی زندگی کو بدل دیتا ہے، میں نے مہاتما بدھ اور یسوع مسیح اور حضرت محمد اور دوسری رُوحانی ہستیوں کے متعلق پڑھا تھا کہ اگر وہ کھڑے ہوکر کسی لنگڑے لُولے، اپاہج یا اندھے سے کہہ دیتے "اُٹھو تم تندرست ہوگئے ہو" تو وہ سچ مچ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ مجھے اس ایسی مافوق الفطرت باتوں کا یقین نہیں آیا تھا لیکن سری رامکرشن سے ملاقات کے بعد میرے سب شکوک دُور ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے پڑھا تھا وہ حرف بحرف سچ تھا۔ خدا رسیدہ بزرگوں کے لئے سب ایسی مافوق الفطرت باتیں جنہیں ہم معجزے کہتے ہیں عین ممکن ہیں خود گرُو دیو کہا کرتے تھے "جیسے دُنیا کی کوئی اور شے ایک آدمی سے دوسرے کے ہاتھ میں دی جاسکتی ہے اُسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اچھی طرح رُوحانی مشاہدات و مدرکات و تجربات بھی ایک سے دُوسرے کو منتقل کیے جاسکتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی واقعی دوسروں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے تو پہلے اُسے اپنی رُوحانی طاقت کو جگانا چاہئیے پہلے معرفت کی دولت حاصل کرو پھر خیرات بھی کرتے پھرنا مذہب محض باتوں کا سلسلہ نہیں، نظریوں اور خیال آرائیوں کا مجموعہ نہیں، اس کے معنی فرقہ بندی بھی نہیں بلکہ سماج کی قید میں مذہب زندہ نہیں رہ سکتا۔ جماعت بندی اور فرقہ پرستی کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں مذہب کا دم گھُٹتا ہے، مذہب بندے اور خدا کے تعلق کا نام ہے، رُوح اور روحِ اعظم کے رشتے ہی کو مذہب کہتے ہیں باقی جو کچھ ہے وہ سماج کی خارجی بندشیں ہیں ایک غیر مرئی نفیس تعلق کو سماج کی مختلف صُورتوں میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے تو مذہب اپنے مقام سے گر کر محض کاروباری سلسلہ بن جائے گا اور جہاں مذہب تجارت اور لین دین کے قوانین میں جکڑا گیا اس کی قوتِ محرکہ ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک بے جان سی چیز ہو کر رہ جاتا ہے، مندر، مسجد

گرجے یا اور دوسری پرستش گاہیں کھڑی کر دینا مذہب نہیں، ان جگہوں میں اکٹھا ہو کر جماعتی پوجا بھی مذہب کی اصلیت سے بہت دُور ہے۔ کتابیں پڑھنے، لیکچر سُننے یا مذہبی جماعتوں میں شامل ہونے سے آدمی مذہبی نہیں ہو جاتا۔ مذہب کا حاصِل تو ہے روحانی تجربہ، اپنی ذات کا مشاہدہ وحدت الوجود میں استغراق کا احساس جب تک ہم اس حقیقت تک نہیں پہنچ جاتے ہمارے دل کو کبھی بھی اطمینان نصیب نہیں ہوگا اگر ہم تمام عمر بحث مباحثہ کرتے رہیں۔ اور مذہبی رہنماؤں کے لیکچر سُنتے رہیں تو بھی دل کی تسلّی نہیں ہوگی، اطمینانِ قلب تو اپنے ذاتی تجربہ سے ہی مِل سکتا ہے اور مشاہدۂ حق یعنی انکشافِ ذات کا تجربہ ہم میں سے ہر ایک کی دسترس میں ہے شرط یہ ہے کہ ہم سچّے دل سے اسے حاصِل کرنے کی کوشش کرنے کے لئے تیّار ہوں۔

رُوحانی تجربات کے لئے ترک پہلی شرط ہے احساسِ رُوح ترک کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تاریکی اور روشنی۔ دُنیا کے عیش و آرام اور نشاطِ روح دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتے "خدا پرستی اور دُنیا داری بیک وقت نہیں ہو سکتی[۱]۔"

اگر کسی کو میری بات کا یقین نہیں آتا تو بخوشی کوشش کر کے دیکھ لیجئے، لیکن آپ کو اس میں کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ میں نے لاکھوں آدمیوں کو خدا پرستی اور جہانداری کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے دیکھا ہے لیکن سب بے سُود، سچّائی کی خاطر جھوٹ کو چھوڑنا پڑے گا۔ خدا کے لئے دُنیا کا ترک لازمی ہے، یہ کام نہایت مشکل ہے، اس میں کامیابی جلدی نہیں حاصِل ہوتی لیکن اس کا آغاز تو اِسی وقت اور ابھی ہو سکتا ہے، آہستہ آہستہ ہم اپنے نصب العین کے بلند ترین مقامات تک بھی جا پہنچیں گے۔ دوسری بات جو میں نے گرودیو سے پائی اور جو اُن کی تعلیم کی جان ہے، وہ یہ ہے کہ دُنیا کے تمام مذاہب ایک بنیادی اور لازوال مذہب یا طریقت کی مختلف صورتیں ہیں، اُن میں دراصل کوئی تضاد نہیں کوئی فرق نہیں، مذہب ایک ہے، ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، رُوحانیت اور معرفت کے اصُول بدل نہیں سکتے وہ اٹل ہیں، میرے اور تیرے مذہب کی باتیں، یہ قومی مذاہب کے تذکرے بے معنی ہیں۔ ہم سب کا مذہب ایک ہے، مختلف مذاہب کی دراصل کوئی حقیقت نہیں، مذاہب مختلف ہو ہی نہیں سکتے۔ ازل سے ابد تک روحانی ارتقار کا بس ایک ہی مذہب ایک ہی مسلک ہے، ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اسی ایک اصُول کی مختلف صورتیں ہیں، جب یہ ابدی اصُول زندگی

---

[۱] You cannot sense God and Mammon at the same time

کے مختلف شعبوں میں رُونما ہوتا ہے، تو اس کی مختلف صُورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جب اُصول ارتقائے حیات کے پست و بلند مدارج پر عائد ہوتا ہے تو نتائج ہر درجہ کے مطابق نکلتے ہیں جغرافیائی۔ نسلی اور شخصی فرق مذہب کو اپنا اپنا رنگ دے دیتے ہیں اور ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دُنیا میں مختلف مذاہب ہیں دراصل مذہبوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ سب مذہب ایک ہیں کسی شخص میں مذہب عشقِ الٰہی (پریم بھگتی) کی صُورت اختیار کر لیتا ہے تو کسی اور شخص میں عمل و حرکت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، کوئی صوفیانہ رنگ میں ڈوب جاتا ہے تو کوئی فلسفہ اور منطق کی درخشندگی کو اپنا لیتا ہے۔ اپنی اپنی طبیعت کی اُفتاد ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ دوسرے کے مسلک کو غلط سمجھے، اگر ایک شخص کی طبیعت میں بھگتی بھری ہے اور وہ بھگوان کی پُوجا میں خوش رہتا ہے اس کے بھجن گاتا ہے تو اس بھگتی کا مسلک اس کے لئے مناسب ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک اور شخص جو دن رات فلاحِ عام کے کاموں میں لگا رہتا ہے، مذہب اور رُوحانیت سے دُور ہے دونوں کے رستے مختلف ہیں لیکن دونوں صحیح رستے ہیں۔ دونوں کا مذہب ایک ہے۔ اسی طرح کسی فلسفی کو حق نہیں کہ وہ دوسروں کو جاہل سمجھے، اور کہتا پھرے "یہ غریب نادان کیا جانیں، خُدا کیا ہے اور خُدا سے عقیدت کے کیا معنی ہیں، انھیں تو کسی شئے کا علم ہی نہیں"، ہو سکتا ہے کہ یہی غریب اور نادان لوگ اپنی صادق اور پاک محبت کی بدولت فلسفی کے مقام سے بھی آگے نکل جائیں۔

مذہب اور رُوحانیت کا مرکزی خیال اور بنیادی اُصول یہ ہے کہ حقیقت واحد ہے لیکن بیک وقت مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہے۔ ہمیں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہمیں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق ایک ہی حقیقت کے مختلف نظارے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم اِس صداقت کو ایک بار اچھی طرح سمجھ لیں تو آپس کے سب جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ ہمیں دوسروں سے پُوری ہمدردی ہوگی۔ ہم کسی پر نکتہ چینی نہیں کرینگے، اور ایک دوسرے سے رواداری برتیں گے کیونکہ ہم جان جائیں گے کہ جب تک دُنیا میں مختلف طبیعتوں کے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے اسوقت تک مذہب اور روحانیت کی واحد حقیقت اِن مختلف طبیعتوں کے موافق صورت اختیار کرتی رہے گی۔ یہی ارتقا کے عمل کا تقاضا ہے، کائنات کا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ کثرت میں وحدت پوشیدہ ہے۔ عالمِ ظہور[1] کی بے شمار مختلف صُورتوں کے پسِ پردہ ایک غیر محدود

---

[1] Phenomena

غیر تغیر پذیر وحدتِ مُطلق ہے۔ اس طرح انسانی فطرت بھی رنگارنگ شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے لیکن اُس کی حقیقت وحدت الوجود ہے کائناتِ اصغر (microcosm) عالمِ اکبر (macrocosm) ہی کی چھوٹی سی صورت ہے، باوجود لاتعداد اختلافات کے، سب میں دائمی 'ہم آہنگی ہے'، بلکہ یہ تمام اختلافات ہی وہ سُریں ہیں جن سے نغمۂ حیات مرکب ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس نغمہ کو بہشتِ گوش کریں نقط ایک آدھ سُر پر ہی سَر نہ دُھنتے رہ جائیں۔

زمانہ حال میں خصوصًا لازمی ہے کہ مذاہب کی ہم آہنگی کے خیال کو اپنایا جائے میرے ملک کی سرزمین میں ہر قسم کے مذہبی خیالات خوب پھلتے پھولتے ہیں یہاں آئے دن نئی نئی مذہبی جماعتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ہماری خوش قسمتی سمجھو یا بدنصیبی باہر کے ملکوں سے بھی اپنے اپنے مذہب کا پرچار کرنے نہ جانے کتنے لوگ یہاں آتے رہتے ہیں، مجھے ان مذہبی تحریکوں سے اوائلِ عمر سے ہی واسطہ پڑتا رہا ہے، ہم نے سب کو لبیک کہا ہے سب کی خاطر داری کی ہے، یہاں تو مذہب ہی ہماری زندگی کا محرک ہے۔ اس لئے اگر آپ ہمیں سیاست کا سبق دینے آئیں گے تو ہم شاید ہی آپ کی بات سنیں لیکن اگر آپ کسی مذہب کا پرچار کریں گے تو ہم ہمہ تن گوش ہو جائیں گے، یہی نہیں بلکہ آپ کا مذہب کتنا ہی عجیب و غریب کیوں نہ ہو پھر بھی آپ کو فوراً ہزاروں پیرو بھی مل جائیں گے اور آپ اپنی زندگی ہی میں ایک زندہ "خدا" بن کر ان چیلے چانٹوں پر حکومت کرنے لگیں گے یہ ہماری قومی خصوصیت ہے[1] اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب کی مانگ اس درجہ تک موجود ہے۔

ہندوؤں میں بے شمار مذہبی جماعتیں اور مختلف فرقے ہیں، بسا اوقات ان میں سخت تضاد اور اختلاف ہوتا ہے مگر یہ سب فرق سطحی اور ظاہری ہے، وہ ایک ہی سناتن دھرم (قدیم و دائمی مذہب) کی مختلف صورتیں ہیں ہماری ایک پرارتھنا میں کہا گیا ہے کہ "جس طرح مختلف ندیاں مختلف پہاڑوں میں اپنے اپنے منبع سے نکل کر سیدھے ٹیڑھے راستے اختیار کئے مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی آخر سمندر میں آکر گھل مل جاتی ہیں، اسی طرح مختلف مذہبی فرقے اپنی روایات اور پسند کے مطابق آخر تجھ تک پہنچ کر تجھی میں سما جاتے ہیں"۔

---

[1] آپ اِسے ضعیف الاعتقادی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن دراصل یہ نئے مذہبی اور رُوحانی تجربات کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہونے کی ایک صورت ہے، آج یہ صورت بگڑی ہوئی سہی لیکن تجربہ کرنے کی اس سائنٹفک قومی عادت ہی کی بدولت ہندوستان میں روحانی ترقی ہوتی آئی ہے۔

یہ محض نظریہ بازی نہیں ہے۔ ہم نے عملی طور پر اس کا اعتراف کیا ہے، اور جب تک اس اس اصول پر عمل نہیں ہوگا اس سے دُنیا کو فائدہ نہیں پہنچے گا، بعض لوگ دوسرے مذاہب پر ذرّہ نوازی اور ہیچ پروری کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہتے ہیں "ہاں ٹھیک ہے۔ اِس میں بھی کچھ اچھی باتیں موجود ہیں یہ کفرِ عام ہے۔ۓ اِس قسم کے عوامی مذاہب میں کچھ خوبیاں ضرور ہوتی ہیں" بعض لوگ رواداری کی اِس حد سے ذرا آگے جا کر کہتے ہیں کہ یہ مُذاہب تو قبل از تاریخ رُوحانی ارتقا کی پہلی کڑیاں ہیں۔ مذہب اور رُوحانیت کا کمال تو ہمارے ہی مذہب میں نمودار ہوا" میں یہ کہوں گا کہ اِس قسم کی باتیں ناسمجھی اور بے بصری کی باتیں ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میرا مذہب سب سے قدیم ہے اِس لئے وہ سب سے اعلےٰ ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا مذہب سب سے جدید ہے اِس لئے وہ بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں سچے ہیں دونوں میں انسان کو نجات دینے کی قوت ہے۔ یہ جو مندر اور مسجد اور گرجے والے مذاہب کے اختلافات کی باتیں کرتے ہیں یہ تمام بے معنی اور بے بُنیاد توہمات ہیں، سب کا خُدا ایک ہی ہے ہر مذہب کے پیرو کی دُعا وہی ایک ہی خدا قبول کرتا ہے۔ کسی دینی راہنما میں خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو یا کسی ایک جماعت میں خواہ وہ کتنی ہی منظم کیوں نہ ہو کسی ایک بھی رُوح کی نجات کی ذمہ داری اپنے سر لینے کی اہلیت نہیں۔ ہم سب کے ذمہ دار تو بس صرف ایک ہی بھگوان ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کیوں کر ایک طرف تو خُدا پر یقین رکھنے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ خُدا نے کسی خاص جماعت یا فرقے کو صداقت اور حقیقت کا ٹھیکہ دار بنا دیا ہے اور بس یہی لوگ تمام بنی نوعِ انسان کے پاسبان اور سرپرست ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اس قسم کے نظریوں کو مذہب کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ اگر مذہب کے معنی انکشافِ ذات اور احساسِ خودی نہیں تو مذہب کچھ بھی نہیں، صرف باتیں بنانا، یا مذہبی صداقتوں سے سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں مدد لینا رُوحانیت نہیں خود غرضی ہے۔ خُدا کے سچّے بندے خواہ کسی بھی مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں، ہمیشہ اپنے آپ کو مٹا کر خدا کو پانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زبان پر ہمیشہ یہی دُعا ہوتی ہے کہ "اے خدا تو ہی ہم سب کا مالک ہے تو ہی ہر ایک کے دل میں بستا ہے تو ہی ہم سب کا رہنما ہے، تو ہی سب کا گُرو ہے اور تو ہی اِس دُنیا کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ جہاں تیرے بندے رہتے ہیں،، ایسے لوگ کبھی کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے، کسی کو بُرا نہیں سمجھتے اگر ہمیں

ۓ These are what we call ethnical religions.

مذہب کا راستہ اختیار کرنا ہے تو ہمارا سب سے پہلا اور اہم عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہم کسی کے ایمان اور یقین کو مسمار نہ کریں۔ اگر آپ کسی کو اوپر اٹھنے میں مدد کر سکتے ہیں تو ماشاءاللہ ضرور اس کی مدد کیجیے لیکن اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔ اس کو ایسی تعلیم دینے کی کوشش نہ کیجیے جس سے اس کے پُرانے اُصول تو مِٹ جائیں لیکن اُن سے اعلیٰ چیز اُن کی جگہ نہ لے سکے۔ ایسے خلا میں انسانیت کی موت ہو جاتی ہے۔ سچا گُرو وہ ہے جو پہلے اپنے آپ کو اپنے چیلوں کے درجے تک لے آتا ہے اور اپنی رُوح کو اُن کے قالب میں ڈال کر اُن کی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہے اُن کے ہی کانوں سے سُنتا ہے اور اُن کے دماغ سے ہر بات محسوس کرتا ہے۔ ایسا گُرو ہی سچے معنوں میں تعلیم دے سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے چیلوں کو درجہ بدرجہ بلند کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسے گُرو کے علاوہ جتنے بھی معلّم بنے پھرتے ہیں سب تخریبی قسم کی منفی تعلیم دیتے ہیں جس سے قطعی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

مجھے اپنے گُرو دیو کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ انسان بقیدِ جسم بھی کمال حاصل کر سکتا ہے، اُن کی زبان سے کبھی بھول کر بھی بددُعا نہیں نکلی۔ اُنہوں نے کبھی کسی پر نکتہ چینی نہیں کی، اُن کی آنکھوں کے لئے ممکن ہی نہ تھا کہ کسی میں کوئی خامی یا بُرائی دیکھ بھی سکیں[1]۔ اُن کے دماغ سے بُرائی سوچنے کی اہلیت مٹ چکی تھی۔ اُن کی پاک نظر میں کوئی شے بُری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اُنھیں ہر شے میں حُسن و جمال، خوبی اور نیکی ہی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ پاکیزگی کی کا یہ کمال اور اُن کا زبردست ترک ہی اُن کی لا انتہا روحانی طاقت کا راز تھا۔ ویدوں میں لکھا ہے "دھن دولت اور بال بچوں سے نہیں، بلکہ ترک سے ہی موت پر فتح پائی جا سکتی ہے"۔ ترک اور پاکیزگی کی مدد سے ہی رُوحانیت کی منزلیں طے ہو سکتی ہیں۔ یسوع مسیح نے بھی یہی کہا تھا "تیرے پاس جو کچھ بھی ہے بیچ ڈال اور مال کو غریبوں میں بانٹ دے اور میرے پیچھے پیچھے قدم بڑھاتا آ"[2]۔ حق تو یہ ہے کہ دُنیا کے سب سنتوں اور پیغمبروں نے ترک پر زور دیا ہے اور خود اپنی زندگی میں اس پر پوری طرح عمل کیا ہے، روحانی ارتقا انکشافِ ذات اور احساسِ خودی ترک کے بغیر ممکن ہی نہیں، ہر مذہبی اور رُوحانی ہدایت کا پس منظر ہمیشہ ترک رہا ہے جہاں کہیں بھی کسی مذہبی جماعت میں ترک کا خیال کم ہو جاتا ہے، وہاں ہوس پرستی بڑھ جاتی ہے اور اُسی نسبت سے رُوحانیت گھٹ کر محض دکھاوا رہ جاتی ہے۔

سری رام کرشن مجسم ترک تھے۔ ہمارے مُلک کا رواج ہے کہ اگر کوئی شخص سنیاس اختیار

---

[1] پیرِ ما گفت خطا بر قلمِ صنع نرفت   آفریں بر نظرِ پاک و خطا پوشش باد

[2] Sell all that thou hast and give to the poor and follow me

کرتا ہے تو اپنی دھن دولت اور اپنا مرتبہ ترک کر دیتا ہے۔ میرے گرودیو نے اِن چیزوں کا پورى طرح سے ترک کیا، بے شمار آدمی ایسے تھے جو اس میں اپنی خوش نصیبی سمجھتے اگر گرودیو اُن سے چھوٹا سا تحفہ بھی قبول کر لیتے کئی لوگ اُن کے ذرّہ سے اشارے پر ہزاروں روپے اُن کے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار تھے لیکن یہی لوگ اُن کے دروازے سے مایوس لوٹتے تھے۔ سری رامکرشن ترک کی زندہ اور شاندار مثال تھے۔ اُنھوں نے اپنے نفس اور دولت کی خواہش پر مکمل فتح حاصل کر لی تھی۔ اُن کے دماغ میں اس قسم کے خیالات آ بھی نہیں آسکتے تھے۔ اور زمانۂ حال میں ہمیں ایسے راہنماؤں کی ضرورت ہے کیونکہ آج جسے دیکھو اس کی "ضروریات" اِس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ایک دن بھی اپنے "لوازمات" کے بغیر جینا مشکل ہو گیا ہے اور یہ بے حساب اور بڑھتی ہوئی ضروریات آئے دن ہمیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑتی جاتی ہیں۔ آج کل خصوصاً ہمیں ضرورت ہے ایسے مہاتماؤں کی جو اپنی مثال سے دُنیا کو دکھا دیں کہ آدمی سونے چاندی اور جاہ و مرتبہ کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ زندگی بسر کر سکتا ہے ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہر عہد میں ایسی عظیم الشان ہستیاں پیدا ہوتی آئی ہیں اور آج بھی ایسے مہا پُرش موجود ہیں۔

سری رام کرشن کے ترک نے ہمہ گیر محبت کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ اُن کی زندگی کا دوسرا اُصول جس پر وہ تمام عمر عمل پیرا رہے، دوسروں کی محبت بھری خدمت کرنا تھا۔ اُنھوں نے اپنی عمر کا پہلا حصہ رُوحانی طاقت حاصل کرنے میں صرف کیا۔ اور باقی تمام عمر رُوحانیت کی یہ کبھی کم نہ ہونے والی دولت لُٹاتے رہے۔

ہمارے مُلک میں کسی سنیاسی یا رُوحانی مُرشد (گرو) سے مذہبی اور رُوحانی تعلیم اور ہدایات لینے کا طریقہ آپ کی رسوم و روایات سے مختلف ہے۔ یہاں جماعتی طور پر نہیں بلکہ انفرادی طریقے پر ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ لوگ سینکڑوں میل چل کر آتے ہیں اور اپنی مخصوص رُوحانی مشکل پیش کرکے اس کا حل مانگتے ہیں۔ بعض دُور دراز سے بس اِس لئے آتے ہیں کہ گُرودیو اُن کو "منتر" دے دیں وہ ایک لفظ جس کی مدد سے اُنھیں رازِ حقیقت مل جائے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رُوحانی گُرو کے پاس تقریباً ہر وقت لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے، لوگ بغیر کسی رُکاوٹ کے آتے رہتے ہیں۔ کوئی رسمی تکلفات اُن کے اور گُرو کے درمیان روا نہیں رکھے جاتے، گُرودیو جہاں ہوں وہیں لوگ پہنچ جاتے ہیں، ایک گروہ جاتا ہے تو دوسرا آجاتا ہے۔ یہی حال سری رامکرشن کا تھا۔ دن رات لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور وہ ہر وقت اُن سے ملتے۔ اُن کو ضروری ہدایات دیتے۔ گھنٹوں متواتر بولتے رہتے۔ اُن کے لئے آرام

ناممکن ہوگیا۔ لیکن انھوں نے کبھی کسی سے ملنے سے انکار نہیں کیا، پہروں لوگ آتے رہتے اور سری رامکرشن ان کو مل کر انھیں روحانی سبق دیتے رہتے، عموماً چوبیس۲۴ گھنٹوں میں بیس۲۰ بیس گھنٹے وہ متواتر لوگوں سے باتیں کرتے رہتے، انھیں بنی نوع انسان سے اس قدر بے پناہ محبت تھی کہ جو کوئی بھی اُن کے پاس آتا مایوس نہ لوٹتا، اُن کے دروازے امیر اور غریب اونچے اور نیچے سب کے لئے کھُلے تھے۔ اِس طرح دن گزرتے گئے۔ ہفتے بیت گئے۔ مہینے نکل گئے اور یہ سلسلۂ تعلیم و تربیت جاری رہا۔ لیکن کب تک آخر اُن کا ریاضتوں میں گھُلا ہوا جسم اِس قدر کام کی تاب نہ لا سکا" اُن کو گلے کی تکلیف ہوگئی[۱]۔ لیکن پھر بھی وہ درس و تدریس کے کام کو برابر چلاتے رہے، جب کبھی انھیں معلوم ہوتا کہ لوگ اُن سے ملنے آئے ہیں وہ بضد اِن کو اپنے پاس بلاتے اور جب تک اُن کی تسلّی نہ ہو جاتی، اُن کے ہر قسم کے سوالات کا جواب دیتے رہتے۔ جب، ہم لوگ اُن کی مِنّت سماجت کرتے اور انھیں کہتے کہ اپنی صحت کا کچھ خیال کیجئے تو وہ کہتے "مجھے کچھ پروا نہیں اگر میری مدد سے ایک بھی انسان کو روحانیت کا تجربہ حاصل ہوسکتا ہے تو میں ایک چھوڑ بیس ہزار جسم بھی اُس پر قربان کرنے سے دریغ نہیں کروں گا، کسی کی روحانی مدد کرنے میں جو لطف ہے اُسے تم ابھی نہیں جانتے"۔ اِس طرح دِن گزرتے گئے، اُن کو آرام نہ ملا۔ ایک دِن کسی نے اُن سے کہا "مہاراج آپ تو بہت بڑے یوگی ہیں۔ آپ جو چاہیں ہوسکتا ہے، آپ کے مَن میں جو خیال آئے پُورا ہوسکتا ہے، اِس لئے اپنے دِل میں اپنے جسم کی صحت کا خیال لاکر اپنی بیماری کا علاج خود ہی کیوں نہیں کرلیتے"۔ سری رامکرشن چُپ رہے۔ لیکن جب اس سوال کو دوہرایا گیا تو آہستہ سے فرمایا "میں سمجھتا تھا کہ تم بہت سیانے ہو، عارف ہو، لیکن آج تو تم بھی جہان والوں کی طرح ناسمجھی کی باتیں کر رہے ہو۔ میں نے اپنا مَن کُلّیتاً بھگوان کے سپرد کر دیا ہے، کیا تم مجھے سچ مچ رائے دوگے کہ میں اپنے مَن کو بھگوان سے واپس لے کر اس فانی جسم کا خیال کروں جو روح کا عارضی ٹھکانہ ہے اور جسے آخر ٹوٹ جانا ہے"۔

چنانچہ درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ جب یہ خبر پھیل گئی کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پائیں گے تو اور بھی زیادہ لوگ آنے شروع ہوگئے۔

آپ مغرب میں اِس بات کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ ہمارے مُلک میں ایسے بڑے روحانی مُرشد کے گرد لوگ کس طرح اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور انھیں اُن کی زندگی ہی میں دیوتاؤں کی طرح

---

[۱] بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کینسر کی بیماری تھی۔

پوجنے لگتے ہیں، ہزاروں آدمی بس اِس انتظار میں رہتے ہیں کہ اُن کے درشن ہو جائیں اُن کے دامن کو چھو لیں، اُن کے قدموں کو چھُو لینا یا اُن پر سر رکھ دینا تو خوش قسمت لوگوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ ہمارے مُلک میں رُوحانی عظمت کی یوں قدر ہوتی ہے اور اس طرح قدر اور عزت کرنے ہی سے خود ہمارے دِلوں میں بھی رُوحانیت بیدار رہتی ہے۔ یہی تو قانونِ فطرت ہے کہ جو آدمی جس چیز کی قدر کرے گا، جس کو حاصل کرنے کی خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوگی وہ چیز آخر اُسے مِل کر ہی رہے گی۔ اِسی طرح قوموں کو بھی آخر وہی چیز دستیاب ہوتی ہے، جس کے لئے وہ لگاتار کوشش کرتی ہیں ہمارے ملک میں لوگ مذہب اور رُوحانیت پر جان دیتے ہیں۔ اِس لئے ہماری قوم کو رُوحانیت ہی ورثے میں ملی ہے، جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں آپ ہندوستان میں جا کر سیاست پر لیکچر دینے لگیں تو شاید ہی لوگ اُسے سننے کے لئے آئیں لیکن مذہب اور رُوحانیت کا کوئی پیغام لے کر جائیے تو لوگ آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے اور اگر آپ کی زندگی عملی طور پر مذہبی اور رُوحانی ہے تو پھر کیا کہنے ہزاروں لوگ آپکے درشنوں کو اکٹھے ہو جائیں گے، آپ کے قدموں کو چھُوئیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب لوگوں نے سُنا کہ سری رامکرشن کی پاک ہستی اب کچھ ہی دنوں کی مہمان ہے تو پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں اُن کے پاس آنے لگے۔ اور گرُودیو تھے کہ اپنی صحت کی رتی بھر پروا نہ کرتے ہوئے اُن سب کو رُوحانیت کا سبق دیتے رہے۔ ہم نے لاکھ کوشش کی لیکن اُنھیں لوگوں سے ملنے سے نہ روک سکے۔ کئی لوگ دُور دراز سے آتے تھے۔ گرُودیو کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ لوگ انتظار کریں یا مایوس واپس لوٹ جائیں۔ اِس لئے جب تک ان لوگوں سے مِل کر اُن کے سوالوں وغیرہ کا جواب نہ دے دیتے آرام نہ کرتے، وہ کہتے تھے جب تک میں بول سکتا ہوں۔ اِن لوگوں کو سبق دیتا رہوں گا۔ آخر وہ دن آیا کہ اُنھوں نے خود ہم سے کہہ دیا کہ میں آج اس جسم کو چھوڑ دوں گا، اور ویدوں کا سب سے مقدس اور متبرک لفظ (اوم) جپتے جپتے مہا سمادھی اختیار کر لی اور جسمانی طور پر دُنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔

سری رامکرشن کے خیالات اور ان کے پیغام سے بس چند ہی ایسے لوگ واقف تھے جو اِسے دوسروں تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اِن گنتی کے لوگوں میں کچھ نوجوان تھے جنھوں نے اُن کے زیرِ اثر دُنیا کو ترک کر کے سنیاس لے لیا تھا۔ اور جو اپنے گرُودیو کے کام اور اُن کے پیغام کو پھیلانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اِن نوجوانوں کو کچلنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ لیکن گرُودیو کی صحبت کا اثر اتنا زبردست تھا کہ اُنھیں کوئی طاقت مِٹا نہیں سکتی تھی۔ وہ ثابت قدم رہے۔ اور سب نے مِل کر

گرُودیو کے کام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، حالانکہ اِن میں سے بعض کلکتہ کے اونچے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن سنیاس لینے کے بعد سب کے سب ایک ساتھ رہنے لگے اور دوسروں کی خیرات پر گزارا کرنے لگے، شروع شروع میں اُنھیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور اُن کی مخالفت بھی خوب ہوئی، لیکن اُنھوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے عظیم الشان گرُو کا پیغام ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچا دیا، اور مُلک بھر میں ایک نئی رُوح پھُونک دی۔

یہ ہے مختصر سی کہانی ایک ایسے شخص کی جو بنگال کے ایک گمنام اور دُور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوا، جس نے کسی قسم کی رسمی تعلیم نہیں پائی، لیکن جو محض اپنی قوتِ ارادی کے زور سے حقیقت کو آشکار کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس حقیقت کا پیغام دوسروں کو دیتا رہا اور آخر کار اپنے پیچھے چند نوجوان شاگرد چھوڑ گیا جنھوں نے اس کے پیغام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

آج سری رامکرشن پرم ہنس کا نام ہندوستان میں کروڑوں انسانوں کی زبان پر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی رُوحانی قوت کی شہرت ہندوستان کی حدود سے نکل کر دوسرے ممالک میں پہنچ گئی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے اگر دُنیا کے کسی حصّے میں میری زبان سے مذہب اور روحانیت سے متعلق کوئی صحیح بات نکلی ہے تو سب اُنھیں کی برکت ہے، اور اگر کوئی بات غلط ہے تو اُس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

سری رامکرشن نے دُنیا کو جو پیغام دیا اُس کا حاصل بس یہی ہے کہ نظریوں کی پروا مت کرو عقائد پر بھروسہ لازمی نہیں، فرقہ بندیوں اور گروہ بندیوں سے دُور رہو۔ مسجدوں مندروں اور گرجاؤں کی رُوحانی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ جتنا زیادہ اپنی خودی کو آشکار کروگے اُتنی ہی کارِ خیر کی طاقت نمایاں ہوتی جائے گی۔ سب سے پہلے اپنی رُوحانی طاقتوں کو جگاؤ، اپنی خودی سے واقف ہو۔ کسی پر نکتہ چینی مت کرو، سب لوگوں میں اپنی اپنی خوبیاں ہیں، ہر طریقہ عمل میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔ کسی کے مسلک کو بُرا مت کہو۔ اپنی عملی زندگی سے ثابت کردو کہ مذہب محض لفاظی نہیں۔ جماعت بندی نہیں، سچا مذہب ہے روحانیت کو پالینا۔ اس حقیقت کو بس وہی سمجھتے ہیں جنھیں خود اس کا احساس اور شعور ہو چکا ہے وہی شخص دوسروں کو روحانیت کا احساس کروا سکتا ہے جس نے خود اس کا ذاتی تجربہ کیا ہو۔ ایسے شخص ہی بنی نوع انسان کے سچے گرُو ہوتے ہیں، اُن کی فکر و نظر رُوحانی نور سے منور ہوتی ہے اور وہ جہاں جاتے ہیں نور پھیلاتے جاتے ہیں"۔

جتنے کسی مُلک میں ایسے عظیم اِنسان پیدا ہوں گے اُتنا ہی بلند مقام اس مُلک کا ہوگا۔ اگر کوئی مُلک ایسا ہے جہاں ایسے خُدا رسیدہ اِنسان سانس نہیں لے سکتے تو وہ مُلک ایک دن تباہ و برباد ہو کر رہے گا اُسے دُنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ اِسی لیے میرے گُرودیو کہتے تھے۔" رُوحانی جدوجہد کر کے حقیقت کو اپناؤ" اُن کے کہنے کے مُطابق اِس جدوجہد کا پہلا قدم یہ ہے اپنے مفاد کو دوسروں پر قربان کردو خود غرضی کو مِٹا کر دوسروں کی سچے دل سے پریم بھری سیوا کرو۔ اپنی چیزوں کو کھلے دل سے دوسروں کے کام میں لگا دو۔ اخوت اور خدمت کی باتیں ختم کر کے عملی طور پر ثابت کردو کہ ہر انسان تمہارا بھائی ہے، دست و زبان میں یکسانیت پیدا کرو، (مَن مُکھ ایک کرو) سچے ترک کے راستے اپنی رُوحانی منزل تک پہنچو، جہاں جا کر تمام مذاہب کی ہم آہنگی کا خود بخود ادراک ہو جائے گا۔ تم جان جاؤ گے کہ یہ تمام لڑائی جھگڑے فضول اور بے معنی ہیں۔ جب تک تم اس روحانی بلندی تک نہیں پہنچ جاتے تم سچے معنوں میں خدمتِ خلق کے قابل ہی نہیں۔

میرے گُرودیو کا یہی "مِشن"[1]، یہی پیغام تھا کہ تمام مذاہب بُنیادی طور پر ایک ہیں، انہوں نے نہ صرف اس کا اعلان کیا بلکہ اسی کا عملی ثبوت اپنی زندگی میں پہنچایا، اُن سے پہلے بھی رُوحانیت کے بڑے بڑے مُعلّم اور مذہبوں کے بانی گزرے ہیں جن کے نام سے دُنیا کے بڑے بڑے مذہب آج تک منسُوب ہیں لیکن انیسویں صدی کے اس عظیم الشان رُوحانی رہنما نے اپنے نام سے منسوب کسی نئے مذہب کی بُنیاد نہیں رکھی اُنہوں نے سب مذاہب کو جیسا پایا ویسا قبول کیا اور اُن سب کے پیرُوؤں کو اپنے اپنے مذہب ہی پر چلنے کی تلقین کی کیونکہ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر جانتے تھے کہ درحقیقت وہ سب ایک ہی لازوال مذہب (مسلک وحدت الوجود) کے ایسے جزو ہیں جنہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا[2]۔

---

[2] یا یوں کہیے کہ وہ شجرِ روحانیت کی شاخیں ہیں جنہیں جڑ سے جُدا نہیں کیا جا سکتا جو جس شاخ کے سایہ تلے بیٹھنا چاہے بیٹھ لے آخر درخت ایک ہی ہے۔

[1] Mission

گیان یوگ کے بارے میں

سوامی جی کے ارشادات

ادم تت ست

لفظ ادم کے معنی میں ساری کائنات کا راز مخفی ہے جس نے ادم کا مفہوم جان لیا اس نے گویا رازِ حیات پا لیا لیکن ادم کو جاننا (گیان یوگ) کوئی آسان کام نہیں۔ یہ کام ہے ہمت والوں کا بہادروں اور دلیروں کا جن کو اپنی دماغی طاقت پر یقین ہوتا ہے۔ مقصد گیان یوگ کا بھی وہی ہے جو بھگتی یوگ اور راج یوگ کا ہے لیکن طریقۂ عمل مختلف ہے بھگتی کی راہ پر چلنے والے پریم اور بھگتی سے بھگوان کو پاتے ہیں۔ راج یوگی اپنی پوشیدہ طاقتوں کو بیدار کر کے وجودِ اعلیٰ سے واصل ہوتے ہیں گیان یوگ ان لوگوں کا مسلک ہے جو نہ تو تصوف کی طرف مائل ہیں اور نہ بھگتی کی طرف بلکہ جو عقلیت پسند ہیں۔ گیان یوگ پرماتما کی حقیقت کو عقل و منطق کی طاقت سے پانے کا رستہ ہے اس راہ پر چلنے والوں کو سخت قسم کا بُت شکن ہونا پڑتا ہے۔ ان کی عقل سلیم جس چیز کو نہیں مانتی اُسے ترک کرنے

ان ارشادات کو سوامی جی کی ممتاز امریکن شاگرد مس ایس۔ ای والڈو (Miss E.E. Waldo) نے قلم بند کیا تھا۔ سوامی شردھانند جی جب ۱۸۹۶ء میں امریکہ تشریف لے گئے تو انہوں نے مس والڈو کے نوٹوں سے انہیں نقل کیا۔ ان صفحات کو پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ لیکچروں کے نوٹ ہیں پورے لیکچر نہیں ہیں۔ سوامی جی کے معنی کو واضح کرنے کے لئے کہیں کہیں میں نے ضروری اضافہ کر دیا ہے۔ (ایڈیٹر)

کے لئے انہیں ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ پُرانے عقیدے ہوں یا توہمات سب کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ اس دُنیا کے عیش و آرام کی خواہشات، دوسری دُنیا کے سُکھ چین کی آرزوئیں یہ سب باتیں ترک کرنا پڑتی ہیں بس ایک یہ عزم صمیم ہونا چاہیئے کہ ہم ان تمام بندشوں اور مجبوریوں سے جنہیں ہم ہر وقت محسوس کرتے ہیں مکمل آزادی (مکتی) حاصل کر کے ہی رہیں گے۔

گیان یعنی حقیقی علم کے بغیر مکتی نہیں مل سکتی۔ یہ گیان۔ یہ علم معرفت کیا ہے؟ یہ جان لینا ہی کہ ہم واقعی کیا ہیں؟ ہماری اصل کیا ہے۔ مکتی ہے، ہم محض جسم نہیں رُوح ہیں لازوال ولافانی ہیں ہر قسم کے خوف و ہراس سے مبرّا ہیں۔ موت اور پیدائش کے بندھن سے آزاد ہیں اور ہمارا اعلیٰ ترین مقام معرفتِ نفس[1] ہے۔ ہماری اصل حواس کی حدوں سے بالاتر ہے۔ افکار و خیالات سے پرے ہے۔ ہماری "خودی" کیا ہے سچے معنوں میں "میں" کا احساس جو وقت کے ساتھ بدلتا نہیں جو جسم کے ساتھ مرتا نہیں۔ یہ سچا "میں" گرفت میں نہیں آسکتا۔ یہ یزدانی اور ابدی فاعل مفعول نہیں بن سکتا۔ یہ داخلی موضوع خارجی علم کی زد میں نہیں آسکتا علم سے اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ علم کا مقصد نہیں۔ خارجی علم تو اضافی چیزوں کا ہوتا ہے۔ مجرد اور مطلق[2] کا علم نہیں ہوتا، خارجی علم جو حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت محدود ہوتی ہے۔ خارجی علم دراصل علت اور معلول کی ایک لاانتہا زنجیر ہے، یہ تمام عالم ایک اضافی دنیا ہے۔ حقیقت کی محض ایک پرچھائیں ہے لیکن اسی دنیا میں ہی جہاں دُکھ اور سُکھ۔ غمی اور خوشی دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں جہاں ہر سُکھ کے مقابلے میں دکھ ہے۔ اور ہر غم کے متوازی خوشی ہے۔ جہاں جنت اور دوزخ کی حدیں ملتی ہیں۔ اسی کارگاہِ عمل میں تضاد و توازن کی اس دنیا میں ہی انسان اپنی سچی خودی حاصل کر سکتا ہے اور معرفتِ نفس کے ذریعے اُس کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی ذات ہی برھم ہے اور یہ تمام دنیا۔ از نقار فطرت کی یہ تمام صورتیں۔ مجموعی طور پر اسی برھم کے مختلف مظاہر کا نام ہے یا یوں کہیئے کہ یہ دنیا اس برھم، اس حقیقت مجرد کی تاویل ہے جو ہمیں مایا کی وساطت سے حاصل ہوتی ہے۔ یا یہ کہ تمام کائنات نام اور روپ کے پردے پر ایک ہلکا عکس ہے اس حقیقتِ واحد کے نورانی جلووں کا جن کی جھلک ہمیں کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ یہ عالم محض ایک فسونِ نظر نہیں اگر خدا یا برہمہ کی ہستی ہے تو کائنات کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تمام عالم شہود اس لئے نظر آتا ہے کہ برہمہ یا خدا ہے اور یہ بالذات لازوال اور لافانی ہے۔

کیا ہم اس برہمہ کو اس دانندۂ کُل کو جان سکتے ہیں۔ ویدانت کہتا ہے کہ ہم خود "وہ"[3] ہیں۔ لیکن اس

---

[1] Realisation of self.

[2] Absolute

[3] Thou art that

کو جان نہیں سکتے کیونکہ "وہ" علم کی زد میں نہیں آتا۔ آج کل کی نئی سائنس بھی یہی سکھاتی ہے کہ "وہ" جانا نہیں جاتا البتہ ہمیں وقتاً فوقتاً اس کے جلوؤں کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے اور جب اس "وہ" کا احساس ہونے لگتا ہے تو کائنات اس میں اس طرح سما جاتی ہے کہ خود اس کی ہستی مِٹ جاتی ہے مایا کا پردہ درمیان سے اُٹھ جاتا ہے، اس قسم کے تجربے کے بعد جب "وہ" کا احساس کم ہوتا ہے تو دنیا پھر سے اُبھر آتی ہے لیکن ہمارے دل و دماغ پر اس کی گرفت باقی نہیں رہتی ہم فریبِ عالم کی حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں دنیا کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اسی سراب کی اصل کو پالینا اور اس سے بچ نکلنا ہی تمام مذہبوں کا مقصد ہے لیکن یہ سعادت کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ ویدوں کی تو مسلسل تعلیم یہی ہے کہ خدا اور انسان، پرماتما اور آتما غیب اور شہود دراصل ایک ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو حجابات نظر کو چاک کر کے اس حقیقت تک پہونچ پاتے ہیں اور وحدت الوجود کا احساس اور ادراک کر سکتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے اس منزلِ وحدت الوجود تک پہنچنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے۔ پہلا قدم ہے ڈر سے چھٹکارہ پانا جسے گیان حاصل کرنا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے خوف سے بیگانہ ہو ڈر کا شمار ہمارے بدترین دشمنوں میں ہے[1]

دُوسری ضروری بات یہ ہے کہ اس معاملے میں محض عقیدوں سے کام نہیں چلتا اس میں تو جب کسی چیز کا پورا ذاتی علم نہ ہو جائے اس پر یقین لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس میں یقین ذاتی تجربے کا دوسرا نام ہے۔ کسی کی کہی سنی بات کو مان لینا یقین نہیں وہم ہے۔ جب آپ ہر اُس چیز کو ترک کر دیں گے جس کے دوامی وجود کو آپ کی عقل تسلیم نہیں کرتی۔ صرف اسی حالت میں سچی آتما۔ حقیقی خودی کا احساس اور ادراک ممکن ہو سکے گا۔ غور کیجئے اور اپنے آپ سے بار بار کہیئے "میں یہ جسم (شریر) نہیں ہوں جسم توفانی ہے میں دماغ نہیں مَن (دِل) نہیں ہوں شعور بھی نہیں ہوں، ان کی بھی ایک حد ہے، میں تو آتما ہوں روح

---

[1] ڈر۔ سماج کا ہو یا خاندانی عزت کا، صحت بگڑ جانے کا یا دولت لُٹ جانے کا، اندھیرے میں جانے کا یا موت کا .... یہاں تک کہ خدا کا خوف بھی ہماری روحانی ارتقا میں حائل ہوتا ہے۔ ہمیں اس راہ پر سربلند کر کے اور سینہ تان کر چلنا ہے اگر ہمارے دل میں خوف کا ہلکا سا نشان بھی باقی ہے اگر ہمارے قدم کسی چیز کے ڈر کے خیال سے لمحہ بھر کے لئے بھی لڑکھڑا گئے، تو ہماری منزل ہم سے دور چلی جائے گی۔

ہوں" اس طرح سے آخر آتما ہی کا واحد احساس باقی رہ جائے گا۔ باقی سب چیزیں اسی میں سمو جائیں گی۔
گیانی کا اندازِ فکر دو قسم کا ہوتا ہے یعنی وہ جو دھیان کرتا ہے اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اولؔ اس چیز سے انکار کرنا جس سے ہماری حقیقت ہمارے احساسِ ہستی کی تائید نہیں ہوتی اور اُسے دل و دماغ سے ترک کر دینا، اس کے خیال تک کو مٹا دینا اور اسی ایک حقیقت کے وجود پر اصرار کرنا جو ہماری اصل ہے اور اسی ایک روحِ اعظم یعنی آتما کا خیال کرنا جس کی ہستی واحد ہے جو ستیہ چت آنند ہے جو احساسِ "ہست" شعورِ خودی اور نشاطِ ہستی ہے۔ علمِ معرفت کے سچے اور ثابت قدم رہرو کے لئے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ سرگرمِ سفر رہے اور متواتر آگے قدم بڑھاتا جائے۔ راستے میں رُک جانے سے کام نہیں بنتا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ انسان نڈر ہو کر آخری حد تک عقل کی پیروی کرے اگر ہماری تلاشِ حق کا مسلک یہ ہے کہ ہم ہر اس چیز سے انکار کریں جو فانی ہے تو ہمیں کائنات کی تمام چیزوں کی حقیقت سے انکار کرنا ہوگا، اور آخر اس واحد ہستی تک پہنچنا ہوگا جس سے انکار ممکن ہی نہیں اور یہ ہستی ہے حقیقی "میں" احساس "ہست" یا شعورِ خودی، یہ "میں" یہ سچی ذات عالم کائنات کی اصل ہے اس میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوتا یہ ابدی اور سرمدی ہے۔ لامحدود ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ یہ حقیقت جہالت کی تہوں کے نیچے دبی پڑی ہے۔ لیکن اس سے ہماری ذات کی نوعیت میں فرق نہیں آتا وہ ہمیشہ ویسی کی ویسی آزاد لامحدود اور پاک و متبرک رہتی ہے"۔

یہ بات میں آپ کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ دو پرندے ایک پیڑ پر بیٹھے تھے۔ ایک پرند پیڑ کی چوٹی پر بڑی شان سے خاموش اور مطمئن بیٹھا تھا، سورج کی کرنیں اس کے خوب صورت پروں میں چمک پیدا کر رہی تھیں دوسرا درخت کی نچلی گھنی شاخوں میں ایک ٹہنی پر پھدک رہا تھا۔ کبھی میٹھے پھل کھاتا اور خوش ہوتا اور کبھی کڑوے پھل پر چونچ مار بیٹھتا اور بے مزا ہو جاتا۔ ایک دن اس کے منہ میں غیر معمولی کڑوا پھل لگا جس سے منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو گیا۔ اب اس نے اوپر والے خاموش اور مطمئن پرند پر نگاہ ڈالی اور دل میں سوچا کاش میں بھی اس جیسا ہوتا" یہ سوچتے ہی وہ پھدک کر اور اونچی شاخوں میں پہنچ گیا۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی جو دوسرے پھلوں پر نظر پڑی تو چوٹی والے پرند کے مقام تک پہنچنے کی خواہش کو بھول گیا اور پہلے کی طرح کبھی میٹھے کبھی کڑوے پھل کھانے لگا اور اس طرح وہ کبھی خوش ہوتا اور کبھی بے مزہ۔ ایک دن پھر جو اس کی نظر چوٹی والے پرند پر پڑی تو اسے یاد آیا کہ میں بھی وہاں تک جانا چاہتا تھا چنانچہ وہ پھر اس خاموش اور پُروقار پرند کی جانب کچھ اور بڑھا مگر پھلوں کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ کچھ زیادہ دور نہ جا سکا اس طرح تھوڑا تھوڑا اوپر اُٹھنے کا عمل بار بار ہوا، آخر وہ چوٹی والے پرند کے

بہت قریب آگیا۔ اس کے پروں کی چمک دمک نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کردی۔ اس پر ایک محویت کا عالم طاری ہوگیا اور انجام کار اسوقت تو اس کی حیرانی کی حد ہی نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہاں پرند تو تھا ہی ایک اور وہ خود ہی اوپر والا پرند تھا لیکن ابھی تک وہ اپنی حقیقت سے غافل رہا تھا آج اس پر اس کا راز کھل گیا انسان بھی نچلی شاخوں میں پھنسے ہوئے پرند کے مشابہ ہے، اگر وہ اونچے سے اونچے اورش تک پہنچنے کی متواتر کوشش کرتا ہے تو وہ بھی ایک دن اپنی حقیقت کا یہ راز پالیتا ہے کہ وہ خود ہی وجود معنوی ہے ہمیشہ سے رہا ہے اور رہے گا اس کی خودی ہی حقیقت ہے، اس کے علاوہ اور جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا ہے ایک خواب ہے۔ طلسم ہے، فسونِ نظر ہے اس طرح اپنے آپ کو مادی دنیا سے بالکل الگ کرلینا اور مادی وجود کو حقیقی نہ سمجھنا ہی دراصل گیان یا علمِ معرفت ہے۔ گیان کے طالب کو یہ بات کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس حقیقت کو ویدانت میں "ادم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور تمام دینی فلسفہ کو "اوم تت ست" (اوم ہی حق ہے) کے تین لفظوں میں بند کردیا ہے گیانی کو "اوم تت ست" کا خیال ہمیشہ اپنے دل ودماغ میں محفوظ رکھنا چاہیئے "اوم" ہی اصل وجود اور اصل حقیقت ہے گیان یوگ کی بنیاد خیالِ وحدت ہے اسے "ادویت[1] واد" کہتے ہیں یہاں "دویت[2] واد" یعنی دوئی[3] کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ فلسفہ ویدانت کا بنیادی پتھر ہے۔ اس کا اول و آخر ہے۔ اس کی ابتدا و انتہا ہے "صرف برہمہ[4] ہی سچ ہے، برہمہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں، اور وہ برہمہ "میں" ہی ہوں" یہ ہے حقیقت کا راز، جسے ہمیں صرف جاننا ہی نہیں پانا بھی ہے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم بار بار اپنے آپ کو یہ جتاتے رہیں کہ خود ہمارا معنوی وجود ہی حقیقت ہے۔ خود ہمیں برہمہ ہیں یہاں تک کہ یہ خیال ہمارے وجود کا جزو بن جائے بلکہ ہماری زندگی اس میں ڈھل جائے جب کہیں جاکر ہم دوئی[5] کے مقام سے بلند ہو سکتے ہیں، خیر و شر سے۔ دکھ سکھ سے مسرتوں اور غموں سے اوپر اٹھ سکتے ہیں اور اپنے بارے میں یہ جان سکتے ہیں کہ ہم بذاتِ خود حقیقتِ واحد ہیں وہ حقیقت جو دوامی ہے، غیر تغیر پذیر ہے اور لامحدود ہے - وہ واحد حقیقت جو لازوال ہے لاثانی ہے "اہم برہمہ" یا اناالحق کے اس بلند مقام پر پہنچنے کے لیے گیان یوگی کو جان کی بازی لگا دینا پڑتی ہے۔ ایک لحاظ سے اُسے بھی عقیدتاً اتنا ہی کڑا اور پرجوش

ے۱ Advaitism

ے۲ Dvaitism

ے۳

ے۴ Erahma

ے۵ duality.

ہونا چاہیئے جتنا کوئی تنگ نظر گروہ بند یا فرقہ پرست ہوتا ہے۔ اسے اپنی قوتِ ادراک اور صحیح فیصلہ کرنے کی قابلیت پر تعصّب کی حد تک یقین ہونا چاہیئے تاکہ اس کے راستے میں نہ تو قدیم اعتقادات اور توہمات حائل ہوسکیں اور نہ اس کے جوشِ عمل کے مقابلے میں کوئی مشکلات ٹھہر سکیں، لیکن اس جوش وخروش کی کارگاہِ عمل آکاش کی طرح کشادہ اور وسیع ہونی چاہیئے، گیان یوگی کو اپنے آپ پر اتنا مکمّل قابو ہونا چاہیئے، اس کا دماغ قطعی طور پر اس قدر اس کے بس میں ہونا چاہیئے کہ اگر وہ بدھ مت کا عملی جائزہ لیتا ہے تو ہر لحاظ سے اپنے میں بودھ بننے کی اہلیت پیدا کرے اور بدھ کے بتائے ہوئے رستے پر سچّے دل سے چل کر دیکھے اور اس کی حقیقت کو پرکھے، یا اگر اُسے عیسائیت کا امتحان منظور ہو تو عیسائیت کے اصُولوں پر پوری طرح عمل کرکے اس کی صداقت کا اندازہ لگائے، اسی طرح وہ جس دینی خیال یا مذہبی فلسفہ کو سمجھنا چاہے اس میں اپنے آپ کو عملاً اور ارادتاً ڈھال دے، دوسرے لفظوں میں گیان یوگی کے دل و دماغ میں وہ وسعت اور کشادگی ہونی چاہیئے کہ وہ بودھوں میں سچّا بودھ عیسائیوں میں سچّا عیسائی۔ ہندوؤں میں سچّا ہندو اور مُسلمانوں میں سچّا مُسلمان بن کر رہنے کے قابل ہو، وہ اپنی شخصیت کو اِن مختلف خیالات میں باٹنے کی قوت رکھتا ہو۔ لیکن ان کی بنیادی وحدت سے کبھی غافل نہ رہے۔ وہ اِن مختلف سروں کو ایک ایک کرکے سُن سکتا ہو لیکن ساتھ ہی اِن کی سرمدی ویزدانی ہم آہنگی اس کے کانوں میں گونجتی رہے۔ وہ ان مختلف رنگوں سے اپنی زندگی رنگ سکتا ہو، لیکن اِن کی یکرنگی سے بھی آگاہ رہے۔ یہ سعادت صرف متواتر کوشش اور لگاتار محنت سے ہی ہاتھ آتی ہے، عالمِ شہود کی یہ تمام نیرنگیاں، یہ تمام نو بہ نو تبدیلیاں، یہ تمام تضاد و اختلاف، دراصل اُسی ایک "ایک" کی بدولت ہیں۔ لیکن اس "ایک" کا احساس ہمیں اسی وقت ہی ہوگا جب ہم اس کے لئے اپنی جان لگادیں اس کے سوا کسی اور چیز سے وابستگی و تعلّق نہ رکھیں اس کے نام کے سوا کوئی آواز نہ سُنیں اس کے ذکر کے سوا اور کوئی بات نہ کریں۔ اس کی ذات کے سوا ہماری نظر میں اور کسی چیز کا وجود نہ ہو۔ ہماری روح بس اسی خیال میں مست رہے ہمیں صبح وشام ہر وقت اور ہر گھڑی پُوری شدت سے ایک ہی لَو لگی ہو، اور ہم انا الحق کی رٹ لگائے جائیں اور کہیں کہ "میں وہ ہوں، میں وہ ہوں"

II

فلسفۂ ویدانت کے سب سے بڑے معلّم (گورو) شنکر آچاریہ ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی بے پناہ دماغی قوت کی مدد سے ویدوں کے ضخیم سلسلہ سے ویدانت کے حقائق اخذ کئے دلائل اور منطق سے ہر بیان کی صداقت کو پرکھا اور صرف وہ بات قبول کی جسے ان کی عقلِ سلیم نے تسلیم کیا۔ اور ان حقائق پر

اُنہوں نے فلسفہ اور گیان کی عظیم عمارتیں کھڑی کی اس فلسفۂ ویدانت کی تعلیم ان کی شرحوں میں ملتی ہے، انہوں نے برہم کے متعلق تمام متضاد بیانوں میں ترتیب قائم کی اور ثابت کر دیا کہ لامحدود اور لافانی حقیقت بس "ایک" ہی ہے، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ چونکہ ہر انسان اس قابل نہیں کہ وہ یکدم اس بلند مقام تک پہنچ سکے، اس لئے لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق مذہب اور دین کی شاہراہ کے مختلف مقامات پر رُک رُک کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حقیقت کے متعلق مذہبی بیانوں میں فرق پایا جاتا ہے، دراصل یہ فرق مسافروں کی اپنی اپنی صلاحیت کا ہے۔ رستے اور چال کا ہے منزل کا نہیں درجے کا ہے نوعیت کا نہیں اس فرق میں تضاد نہیں، یہ اختلاف ہماری طبیعتوں کی مناسبت سے ہے۔

یہی بات ہمیں حضرت عیسےٰ کی تعلیمات میں بھی ملتی ہے انہوں نے جیسی صلاحیت اپنے سامعین میں دیکھی ویسی ہی تعلیم اُن کو دی۔ اُن کے بیانات میں جو ظاہری فرق ہے وہ ان کے سامعین کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہے۔ دراصل اُن میں کوئی تضاد نہیں مثلاً پہلے انہوں نے ایسے خدا کی تعلیم دی جو عالم بالا میں رہتا ہے انہوں نے اس آسمانی باپ[1] کی عبادت کرنے کو کہا اس کے بعد انہوں نے اپنے پیروؤں کو اور اُونچا اٹھایا اور کہا "میں انگور کی بیل ہوں تم سب اس کی شاخیں ہو"[2]۔ اور آخرکار انہوں نے اناالحق کی اِس بلند ترین صداقت کا اعلان کیا کہ "میں اور میرا آسمانی باپ (خدا) ایک ہیں"[3] اور عالم بالا کی بادشاہت خود تمہارے اندر موجود ہے[4]

شنکر آچاریہ کے خیال میں سب سے بڑی تین نعمتیں جو ہمیں خدا سے مل سکتی ہیں وہ یہ ہیں۔ انسان کا قالب (شریر)۔ وصلِ الٰہی کی خواہش (بھگوان سے لگن) اور کامل مرشد (گورو) جو ہمیں یزدانی نور کی طرف لے جائے جو ہمیں علم معرفت بھی عطا کرے اور نیک عمل کی راہ بھی دکھائے اگر کسی خوش نصیب کو یہ تینوں نعمتیں حاصل ہو جائیں تو بس سمجھ لو کہ اس کو نجات ملنے میں دیر نہیں۔

ویدانت کا نچوڑ یا عطر یہ ہے کہ ہستی صرف ایک ہے اور ہر روح وہی بھرپور وجود ہے اُس وجود کا محض جزو نہیں شبنم کے چھوٹے سے چھوٹے قطرے میں سورج کا عکس مکمل ہوتا ہے اس کے کسی خاص حصے

---

[1] Father in Heaven

[2] I am the Vine, you are the branches

[3] I and my Father are one.

[4] The kingdom of Heaven is within you

کا نہیں زمان و مکان اور تمام حوادثِ کائنات میں وہی ایک ہستی جلوہ گر ہے جو انسان میں ہے، علّت و معلول کا یہ سب سلسلہ اُس کی بدولت ہے ان تمام ظاہری صورتوں کے پس پردہ بس ایک ہی حقیقت ہے صرف ہمیں اس واحد حقیقت کو آشکار کرنا ہے یا یوں کہیئے کہ ہمیں اپنے ظاہری وجود سے انکار کرنا ہے (اسی نفسِ حقیر کے انکار کو اخلاقیات کی زبان میں بے غرضی کہتے ہیں) ہمیں اس سرا پا آزار خواب سے بیدار ہونا ہے جس میں ہم خود کو بس شریر (جسم) سمجھ بیٹھے ہیں ہمیں تو علمِ معرفت حاصل کرنا ہے ہمیں خود آشنا ہونا ہے اور اپنی حقیقت پر وہ مستحکم ایمان لانا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ "میں وہ ہوں" "میں وہ ہوں"۔[ط]

"میں وہ ہوں" (انا الحق) کے معنی یہ نہیں کہ ہم چھوٹے چھوٹے قطرے ہیں جو سمندر میں مل کر اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں ہم بذاتِ خود ایک اتھاہ اور بے کنار ساگر ہیں۔ ہم سب وجودِ کُل ہیں۔ لامحدودیت کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ جو ایک ہے اُسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا جو مجرد اور لاثانی ہے جس کے سوا کوئی دوسرا وجود ہے ہی نہیں وہ کثرت میں تبدیل نہیں ہو سکتا، اس حقیقت کی معرفت ایک نہ ایک دن سب کو حاصل ہوگی کہ ہم خود خُدا ہیں۔ مایا کے یہ بندھن ایک دن ضرور ٹوٹ جائیں گے یہ تمام فسونِ نظر ایک دن مٹ جائے گا، لیکن اس علم، اس گیان کو حاصل کرنے کی پوری کوشش ہمیں ابھی اور اسی وقت کرنا چاہیئے مستقبل سے اُمید لگا کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا مردانگی نہیں ہے۔

اگر ہمیں رُوحانیت کے بجائے محض اخلاقی ترقی سے ہی دلچسپی ہے تو بھی ہمارے لئے علمِ معرفت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہم نوعِ انسانی کی مدد اس وقت تک سچے معنوں میں نہیں کر سکتے جب تک ہمیں یہ معرفت نہ حاصل ہو جائے۔ جو شخص "جیون مُکت" (آزادِ مطلق، عارف) ہے۔ بس وہی سچی محبت برت سکتا ہے، اُسی کی خیرات صحیح معنوں میں خیرات ہو سکتی ہے وہی حقیقت کو خود سمجھتا ہے اور دُوسروں کو سمجھا سکتا ہے، وہی خدمتِ خلق کرنا جانتا ہے۔ سچی خدمت، سچی محبت، سچی خیرات کسے کہتے ہیں یہ ایک آزاد آدمی ہی جان سکتا ہے، کیونکہ اس کا کوئی کام کسی مدّعا یا خواہش کے زیرِ اثر نہیں ہوتا غلام مجبور ہو کر محنت کرتا ہے اور رنج اٹھاتا ہے آزاد آدمی اپنی خوشی سے خدمتِ خلق کرتا ہے اور خُرّم و شاداں رہتا ہے۔

سچی آزادی سچے گیان سے ہاتھ آتی ہے، خواہشیں ہمیں اپنا غلام بنا لیتی ہیں نفسِ امارہ ایسا

ط I am He. I am He.

ظالم ہے جس کی پیاس کبھی بجھی ہی نہیں جو اپنے مظلوم شکار کو ایک لمحہ بھی چین نہیں لینے دیتا لیکن جیون مکت (عارف) تمام خواہشوں پر پوری فتح پالیتا ہے کیونکہ جب وہ انا الحق کے مفہوم کو سمجھ لیتا ہے اور جب اُسے ہر طرف حقیقتِ واحد ہی نظر آنے لگتی ہے تو اس کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ خواہش پیدا تب ہی ہوسکتی ہے جب ہم دُوسروں کو اپنے سے الگ سمجھ لیتے ہیں، دنیا کی چیزوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب عارف دیکھتا ہے کہ ہر چیز اس کی اپنی ہستی میں شامل ہے تو پھر خواہش ہوگی تو کِس بات کی!

لیکن وحدت الوجود کا یہ احساس قائم رکھنے کے لئے لگاتار کوشش کرنا ہوگی ہمارا من ہمیں ہمیشہ ہر قسم کے فریب میں مبتلا کئے رکھتا ہے۔ ہم بھول سے اپنے آپ کو محض جسم (شریر) سمجھنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو ہم جنسی خواہشات میں جکڑ جاتے ہیں دوسرے اس کے ساتھ ساتھ ہم مشرب و ملت ذات پات اور قوم و نسل کے تفرقات میں پھنس جاتے ہیں یہی ہماری غلامی کی دلیل ہے، یہی مایا کا طلسم ہے اس لئے ہمیں اپنے من کو بار بار یہ جتانا چاہیئے کہ حقیقت کیا ہے، یہاں تک کہ وہ شدّت سے حقیقت کو محسوس کرلے۔

ہماری اصل فطرت نشاطِ کامل (پورن آنند) ہے طمانیت اور سکون ہے، ہماری جسمانی شادکامیاں اور جمالی مسرتیں، محض ایک عکس ہیں اس طمانیت اور سکونِ دائمی کا جو ہمیں اپنی اصل فطرت کے ادراک و احساس سے حاصل ہوتا ہے، ہماری تمام خوشیاں ابدی نشاطِ روح کے مقابلے میں محض ایک ذرّے کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ حق یعنی نشاطِ رُوح دُکھ سُکھ رنج و راحت سے پرے ہے، ہماری حقیقی ہستی اس عالمِ آب و گل میں مبتلا نہیں، محدود و محبوس نہیں بلکہ ہر رنگ تعلق سے آزاد ہے، ہماری اصل خودی تمام کائنات کی شاہد ہے یا یوں کہئے کہ ہم ایک قاری ہیں جس کے آگے کتابِ زندگی کے اوراق پلٹتے جا رہے ہیں یہ احساسِ خودی متواتر کوشش سے ملتا ہے، ریاضت سے "یوگ" حاصل ہوتا ہے۔ "یوگ" سے معرفت ملتی ہے، معرفت سے سچا پریم ملتا ہے اور پریم سے نشاطِ رُوح۔ دائمی اور ابدی سکون کی دولت میسّر آتی ہے۔

یہ "مَیں اور میرا" کا سلسلہ[1] ایک وہم ہے اور ہم اس وہم میں اتنی مدت تک مبتلا رہے ہیں کہ اب

---

[1] اِس "مَیں اور میرا" کے سلسلے کو میں نے اس طرح منظوم کیا ہے۔

(ایڈیٹر)

یہ ارض و سما، حسنِ نمو، شورشِ ہستی ❊ جو کچھ نظر آیا مجھے اپنا نظر آیا،

اسے خیرباد کہنا تقریباً ناممکن سا ہوگیا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی خودی کی بلند ترین سطح تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس وہم سے جان چھڑانے کی کوشش کرنا ہوگی اس کے لئے محنت کرنا ہوگی۔ لیکن اس محنت اور ریاضت کے یہ معنی نہیں کہ ہم ہر وقت مُردنی صورت بنائے بیٹھے رہیں۔ مذہب یا روحانیت اترے ہوئے اداس چہروں کا نام نہیں محض ترکِ دُنیا یا رہبانیت سے تقدس نہیں آجاتا۔ اگر رُوحانیت واقعی دُنیا کی بہترین چیز ہے تو اُسے سب سے زیادہ مسرّت آفریں بھی ہونا چاہیئے رُوحانیت کے طالب کو ہشاش بشاش رہنا چاہیئے۔ بھلا جو آدمی پرماتما سے پریم کرتا ہے جو پاک و پوتر ہے جس کا دل صدق و صفا سے بھرپُور ہے۔ وہ غمزدہ ہو ہی کیوں؟ آخر اُسے کس بات کا رنج ہو سکتا ہے۔ اُسے تو ایک بچے کی طرح خوش خوش رہنا چاہیئے جیسے کہ وہ بھگوان کا سچ مچ بالک ہو، روحانی ارتقا کے لئے، معرفت پانے کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ تزکیۂ قلب کیا جائے۔ "آسمانی بادشاہت تو ہمارے دلوں کے اندر ہے" لیکن شرط یہ ہے کہ دل پاک اور صاف ہوں۔ جب کہیں جا کر ہم بادشاہ کو دیکھ سکتے ہیں[3]۔

جب ہم اپنے گرد و نواح پر نظر ڈالتے ہیں یا دُنیا کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں تو عموماً ہمیں اپنے مشاہدہ

ہے صحنِ چمن اپنے لئے، اپنے لئے ہے، — ہر غنچۂ بے باک جو ہنستا نظر آیا،
راتوں کو چراغاں کئے تو دن میں ضیا پاش — ہر بُت مجھے خورشید و قمر سا نظر آیا
ہے وقف مری شانِ شہنشاہی کو سب نور — ہر لعل و گہر میں جو دمکتا نظر آیا
چھایا رہا جب تک مری آنکھوں میں اندھیرا — ہر سُو مجھے "میں میں" کا تماشا نظر آیا
آخر تری رحمت نے بصیرت مجھے بخشی، — مٹنے لگا "میں" "تو" جو ابھرتا نظر آیا
یہ حُسنِ بتاں، رنگِ چمن، نورِ تماشا، — اِک مست نگاہوں کا اشارہ نظر آیا
خوشبوئے گل و مشکِ ختن، یاد بہاراں — سب میں دمِ جاں بخش تمہارا نظر آیا
اس سے بھی جو گزرا نہ رہا میں نہ تماشا — "جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا"[1]
لیکن نہ حجابِ من و تو بھی رہا قائم — اک کھیل مجھے دیدۂ بینا نظر[2] آیا
وہ بھی نہ حقیقت تھی خفیقت جسے سمجھا، — اِک خواب مجھے سارا تماشا نظر آیا
شاہد ہے نہ مشہود ہے کوئی نہ تماشہ — اب کون کہے کس کو کہاں کیا نظر آیا

[1] اصغر گونڈوی [2] "کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا" غالبؔ

[3] The pure in heart shall see God.

یا خیال کے علاوہ کسی اور زندہ ہستی کا احساس وادراک نہیں ہوتا لیکن گیان یا معرفت کے طالب کو چاہیے کہ وہ اپنے مشاہدہ وخیال کے ساتھ خدا کی ہستی کے احساس کو ہمیشہ وابستہ رکھے اور دل میں مصمم ارادہ باندھ لے۔ اور اس بات کا پختہ یقین رکھے کہ وہ خدا تک رسائی حاصل کر کے رہے گا۔ خدا کو حاضر ناظر ماننے کے یہی معنی ہیں کہ پہلے تو ہر شے سے اس کا تعلق جوڑ لیا جائے اور پھر اُسے آشکار ہونے پر مجبور کیا جائے۔ دنیاوی تعلقات میں ہمیں خصوصاً ایزدانی جھلک دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ماتا پتا، میاں بیوی۔ بہن بھائی۔ دوست اور رشتہ دار اغیار اور دُشمن تک سب میں وہی ایک بھگوان ہے، اسی کا خیال ان سب تعلّقات سے وابستہ کر دیجئے اور پھر دیکھئے۔ آپ کی دُنیا ہی بدل جائے گی، اگر ہم اپنی دُنیا کو خدا کے شعور واحساس سے بھر دیں اگر ہم ہر شے میں اُسی کا جلوہ دیکھیں تو تمام غم واندوہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے، جب بھگوان کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آئے گا، تو اس دُکھ درد، اس جدوجہد، اس رنج وغم کا نام ونشان ہی باقی نہیں رہے گا۔

سچا گیانی کسی مخصوص کیش یا طریق کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی مذہب یا مسلک کے عقیدوں وغیرہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کا تو مطلب صرف یہ ہے کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جو کیش اور طریقت سے کہیں بلند ہے گیانی کسی مروّجہ طریق کو مٹاتا نہیں بلکہ اسے ایک نئے معنی بخش کر بلند مرتبہ بنا دیتا ہے۔ گیان تخریب کی تعلیم نہیں دیتا وہ تو بذاتِ خود سراسر تعمیر ہے جس طرح ندیاں اور دریا سب سمندر میں مِل کر ایک ہو جاتے ہیں اسی طرح تمام طریقتیں، تمام مذہب معرفت (گیان) کی منزل کی مختلف راہیں ہیں۔ سب منزل پر پہنچ کر ایک ہو جاتی ہیں[1]۔ اس منزل کا نام ہے وصل الٰہی یا اپنی حقیقت کو پالنا جب ہماری نظر میں ہر طرح کے تفرّقات مٹ جاتے ہیں اور ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہر چیز کی حقیقت بر ہمہ سے ہے تو حضرت عیسےٰ کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ "میں اور میرا باپ ایک ہیں"۔

گیان کے اصُولوں کی تعلیم بھگوان سری کرشن نے بھگوت گیتا میں بہت صاف صاف دی ہے، یہ نظم ہندوستانی ادب کے جواہر پاروں کا سرتاج مانی گئی ہے یہ ایک طرح ویدوں کی تفسیر یا شرح ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوحانیت کی جنگ اِسی زندگی میں جیتنی ہے"، کسی آئندہ زندگی میں نہیں ہمیں زندگی سے فرار نہیں اختیار کرنا چاہیئے بلکہ اس کا دلیرانہ مقابلہ کر کے اسے مجبور کر دینا چاہیے کہ وہ اپنے تجربات کے خزانے اور عقل وفراست کی دولت ہمارے حوالے کر دے یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس عظیم نظم کا پس منظر

---

[1] ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں۔ (غالب)

میدانِ جنگ ہے۔ چونکہ گیتا ہمیں اعلےٰ ترین رُوحانی ترقی کے لئے جدوجہد کا سبق دیتی ہے اس لیے میدانِ جنگ کا پس منظر خاص طور پر مناسب اور شاعرانہ تخیّل کی ایک عُمدہ مثال ہے۔ پانڈوؤں کی فوج کے سپہ سالار ارجُن نے جب مخالف فوجوں کے دَل کے دَل دیکھے اور ان کو دونوں طرف اپنے ہی بھائی بند نظر آئے تو اُنکے دل پر سخت چوٹ لگی اور اُن کا دل دُکھ سے بھر گیا جس کی وجہ سے وہ جنگ کا خیال ترک کرنے کے بارے میں سوچنے لگے اس وقت بھگوان کرشن نے جو اُن کے رتھ بان بنے ہوئے تھے، ارجُن کو دھرم (فرض) کی تعلیم دی اور کہا کہ ارجُن غم نہ کرو آخر دُکھ کی بات ہی کیا ہے اپنی یا اپنے رشتہ داروں کی موت سے نہ ڈرو کیونکہ موت کی ہستی ہی نہیں ہے تم سب لافانی ہو زندگی یا موت تمہاری حقیقت کو بدل نہیں سکتی، اس طرح درجہ بدرجہ ارجُن کو دھرم اور فلسفہ کی عظیم ترین صداقتوں کا درس دیا یہاں تک کہ ویدانت کا تقریبًا تمام فلسفہ اس حیرت انگیز نظم میں سمو دیا۔ ویدانت کے مُطابق رُوح لامحدود ہے اور جسم کی موت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، روح ایک دائرہ ہے جس کا محیط لاپید ہے لیکن اس دائرے کا مرکز جسم میں چُھپا ہے جس چیز کو ہم موت کہتے ہیں اس کے معنی فقط یہ ہیں کہ اس لا محدود دائرے کے مرکز میں تبدیلی ہوگئی۔ جب ہم اس مرکز سے اپنے محیط کی طرف بڑھتے ہوئے جسم کی تنگ قبا سے نکل جاتے ہیں تو اپنی سچّی خودی کو پا لیتے ہیں یہی وصلِ الٰہی ہے۔

حال۔ ماضی اور مستقبل یہ تینوں زمانے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اس لئے یہ بات کچھ معقول نہیں کہ ہم حال ہی پر دھیان دیں اسی کی فکر کریں' ایسا کرنا اپنی فکر و نظر کو قید کرنے کے برابر ہے' اگر ہم اپنا فلسفۂ حیات اس بنا پر تعمیر کریں گے تو یقینًا وہ غلط ہوگا۔ ماضی اور مستقبل سے الگ حال کا کوئی وجُود نہیں۔ وقت ایک مکمّل "کُل" ہے جس میں یہ تینوں زمانے 'ماضی۔ حال اور مستقبل' شامل ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو جنم سے پہلے اور موت کے بعد کی صُورتوں سے الگ کر کے پُوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ زمانے اور وقت کا تصور جب تک محدود رہے گا ہمیں زندگی کا پُورا ادراک نہیں ہوسکتا۔ جتنی محدُود ہماری فکر و نظر ہوگی اُتنا ہی محدُود وقت کا تصور ہوگا۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو سمجھنے کی خاطر ان حدُود سے باہر قدم نکالیں۔

III

گیان یوگ ہمیں دُنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتا ہے لیکن یہ کنارہ کشی ترکِ دُنیا کے مترادف نہیں ہوتی۔ سنیاس دھرم یعنی مسلکِ ترک کی سچّی پہچان یہ ہے کہ انسان دُنیا میں تو رہے لیکن دُنیا کا ہو کر نہ رہے دُنیا سے کنارہ کشی کا خیال تقریبًا تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صُورت میں پایا جاتا ہے۔

گیان یوگ جس" کنارہ کشی"، یا "ترک" کی تعلیم دیتا ہے وُہ یہ ہے کہ ہم تعلقات ترک کر دیں۔ اپنے مشاہدہ و فکر و خیال میں "دُنیا" کے بجائے "خدا" کو جگہ دیں۔ دُنیا کی ہر شئے پر یکساں نظر ڈالیں تعریف و تنقیص، خیر و شر، گرمی اور سردی یہ سب چیزیں ہمارے لئے برابر ہوں نہ تعریف سے خوشی ہو نہ تنقیص سے رنج۔ بھلے اور بُرے آدمیوں میں یکساں طور پر یزدانی حقیقت کا جلوہ دیکھیں اور کسی سے نفرت نہ کریں۔ گرمی اور سردی کے فرق سے ہمارے دماغی توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ اس سلسلے میں آپ کو اطلاعاً بتادوں کہ ہندوستان میں آج بھی کئی سادھو ایسے ہیں جو ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں اور ریگستان کے ریت پر ننگ دھڑنگ پھرتے رہتے ہیں اور اُن پر گرمی سردی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

دُنیا سے کنارہ کشی یا ترک کا پہلا قدم ہے اس وہم سے چھٹکارا پانا کہ ہم محض جسم ہیں۔ اس کے بعد ہمیں اس سے بھی زیادہ ایک اور وہم سے نجات پانا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصل "من"[1] یا دماغ ہے ہمارا من ہماری حقیقت نہیں۔ یہ تو ایک "ریشمین جسم"[2] یعنی غیر مرئی وجود ہے، روح کا جزو نہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ لفظ جسم کا اطلاق تقریباً سب وجودوں پر ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو ان تمام اجسام میں مشترک ہے۔ اگر ایک جسم دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا تو "اجسام" کا تصوّر ہی نہ پیدا ہوتا۔ یہ مشترکہ شے ہے "زندگی" یا "حیات"[3] ہمارے اجسام کی تخلیق ہمارے ہی خیالات سے ہوتی ہے ہمارے غیر مرئی خیالات ٹھوس یا منجمد صُورت اختیار کر لیتے ہیں تو جسم بن جاتے ہیں۔ جسم ہمارے خیالات کا ظاہری نشان[4] ہیں اور خیالات بجائے خود اس واحد وجُود کا ایک عکس ہیں جو نہ صرف ہماری بلکہ کائنات کی روحِ رواں ہے اور جس کی بدولت ہماری زندگی قائم ہے، جو روحوں کی روح ہے اور زندگیوں کی زندگی ہے، جو ہماری سچّی خودی ہے۔

وحدت الوجُود کا احساس ہی وصل الہٰی ہے۔ من و تو کے شعور کا مٹ جانا ہی سچّی وحدت ہے۔ جب تک یہ احساس قایم ہے۔ جب تک ہم اپنے آپ کو خدا سے دور سمجھتے ہیں جب تک بھگت اپنے آپ کو بھگوان سے شمہ برابر بھی مختلف سمجھتا ہے ہم پر ہر طرح کے خوف و ہراس کا غلبہ رہے گا ہمارے دل سے ڈر نہیں خارج ہو گا لیکن جب ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم بذاتِ خود وہی "ایک" ہیں

ط[1] Mind
ط[2] Silken body
ط[3] Existence
ط[4] symbol

اور جب ہمارے احساس میں یہ معرفت سمو جاتی ہے تو خوف کا بھی وجود مٹ جاتا ہے آخر خوف ہو بھی تو کس کا؟ ایک کے سوا دوسرا تو ہے ہی نہیں۔

گیانی اپنی قوتِ ارادی کے بل سے شریر (جسم)، اور مَن (دل) کی حدوں سے اوپر اُٹھ جاتا ہے اور اس عالمِ شہود کو صفر بنا کر رکھ دیتا ہے وہ "اودیا"[۵۱] (جہالت) کو جس کی وجہ سے ہمیں یہ گوناگوں تفرقات نظر آتے ہیں مٹا دیتا ہے۔ اور اپنی حقیقی خودی یعنی آتما کا گیان پالیتا ہے۔ اِس آتما کا جو مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے، جو حوادث سے پرے ہے جو علّت و معلول کے سلسلہ سے ماوراء ہے جس کو حواس کی غمی اور خوشی چھُو تک نہیں سکتی جو لامحدود ہے۔ حاضر و ناظر ہے اور ہمہ اوست ہے۔

گیانی کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف شکل و صورت (نام رُوپ) کی حدود سے باہر نکل جائے بلکہ تمام ضابطوں اور پُستکوں (دینی کتابوں) کی بندشوں سے بھی آزاد ہو جائے۔ گیانی کو اپنی مشعلِ راہ خود بننا پڑے گا اور اپنے تجربے کی بنا پر اُس کو اپنی دینی کتاب بھی بننا پڑتا ہے جو نام رُوپ میں بندھے رہتے ہیں یا جو دینی کتابوں کو بس سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں اُن کے تجربات کو عمل سے اپناتے نہیں وہ اِن بندشوں میں جکڑے جکڑے ہی سُوکھ جاتے ہیں اور آخر مَر جاتے ہیں، اِس کے یہ معنی نہیں کہ گیانی اِن لوگوں کو بُرا بھلا کہے یا اُن کو حقارت کی نظر سے دیکھے جو اِن بندشوں سے آزاد ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ اِنسان تو گیانی ہی نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی اِس قِسم کا کوئی خیال آئے کہ میں دوسروں سے بہتر ہوں۔ اُن سے زیادہ تقدّس کا مالک ہوں، رُوح تقدسِ کامل ہے اور واحد ہے اِس کے لئے کم و بیش تقدس کے کیا معنی؟

سچّے گیان یوگی کی پہچان یہ ہے کہ اول تو وہ بجز معرفت کے کچھ چاہتا نہیں، دوسرے اُسے اپنے حواس پر مکمل طور پر قابو ہوتا ہے۔ اِس پر چاہے کتنی مصیبت پڑے وہ کبھی لب پر حرفِ شکایت نہیں لاتا۔ اس کے لئے دُکھ سُکھ برابر ہوتے ہیں، اُسے زمین پر سونا پڑے یا بادشاہوں کے محلوں میں نرم نرم بستر پر اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ایک حالت سے اسے دوسری سے کوفت نہیں ہوتی۔ دوسری سے آرام کی خواہش پیدا نہیں ہوتی وہ ہر صعوبت کو ہنسی ہنسی جھیلتا ہے، کسی ایذا سے کنارہ نہیں کرتا بلکہ اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اُسے بخوشی سہتا ہے[۵۲]۔ اس کی نگاہ میں تو اِن چیزوں کے

---

۵۱ Avidya (Ignorance)

۵۲ اجازت بیچ کے چلنے کی نہیں خارِ مغیلاں سے　　میرے رہبرے میری نگرہی دیکھی نہیں جاتی

کچھ معنی ہی نہیں ، وہ تو بس اپنی خودی کے شعور واحساس کو اپنائے رہتا ہے ، گیانی کی تیسری خاصیت یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اس ایک حقیقت کے سوا باقی سب باطل ہے ، جھوٹ ہے اور اس لئے وہ اپنی تمام توجہ پوری شدت سے اسی "ایک" پر مرکوز رکھتا ہے ، وہ پوری آزادی کا شیدائی ہے اور اپنی زبردست قوتِ ارادی سے کام لے کر نیز دل ودماغ کو روحانیت کی اعلیٰ قدروں کی منزل پرلے جاکر وہ شانتی (تسکینِ قلب) حاصل کرلیتا ہے جس کے بغیر ہماری حیثیت حیوانوں کے بمقابلہ کسی طرح سے بہتر نہیں ، وہ ہر چیز میں خُدا کا جلوہ دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کردیتا ہے ، خدمتِ خلق ہی اس کی عبادت ہوتی ہے ، وہ ہر کام دوسروں کے لئے کرتا ہے اس کی نظر میں سیوا ہی پوجا ہے وہ پوری تن دہی کے ساتھ کام کئے جاتا ہے اُسے نہ نتائج کی فکر ہے نہ صِلہ کی پروا ، نہ اس دُنیا میں نہ کسی اور جہان میں اسے کسی قسم کے انعام کی تمنا ہے ، جس کو اپنی آتما کے شعور واحساس کی دولت مل گئی ۔ بھلا اس کو یہ تمام کائنات اور دے بھی کیا سکتی ہے جسے آتما مل گئی اسے سب کچھ مل گیا ۔ اِس وحدت میں تمام کثرت شامل ہے ۔ آتما یا خودی غیر منقسم وحدت ہے ۔ آتما دماغ ، یادداشت ، خیال یہاں تک کہ شعور سے بھی پرے ہے ، ان سب چیزوں کا وجود اُسی کے سبب سے ہے ۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی ہے ۔ وہی ہمارے کانوں کی قوتِ سماعت اور وہی ہمارے احساس اور شعور کی طاقت ، تمام سنسار کا مقصد ہی یہی ہے کہ ہم اس راز کو پالیں کہ خود ہماری ذات ہی یہ وجودِ واحد (اوم) ہے ۔ گیانی نام روپ کے ہر بندھن سے آزاد ہے وہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان ، نہ بودھی ہے اور نہ عیسائی ، اِنسان کسی ایک دینی یا سماجی ضابطے میں بندھ کر سچا گیانی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن ایک سچا گیانی دراصل ہندو بھی ہے مسلمان بھی ، بودھی بھی اور عیسائی بھی اس کی وحدت میں یہ سب صورتیں شامل ہیں ۔ نام اور رُوپ کے علاوہ گیانی عِلّت ومعلول کی قید سے بھی آزاد ہے ۔ وہ کسی کام کو بھی اپنی ذات سے منسوب نہیں کرتا ۔ اس کے سب کام خدا کے نام پر ہوتے ہیں ، اور جب انسان اپنے تمام کرم (عمل) بھگوان کے ارپن (سپرد) کردیتا ہے تو وہ کرموں کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے ، وہ نہ عمل کا ذمہ دار رہتا ہے نہ ردِّ عمل کا اِس کے یہ معنیٰ نہیں کہ گیانی ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اس کے کام بھگوان کی مرضی سے ہوتے ہیں ۔ اور صلہ وستائش کی غرض سے نہیں جزا اور سزا کے خوف سے نہیں ۔

گیانی حیرت انگیز حد تک عقل پسند ہوتا ہے ۔ وہ کسی بھی چیز کو امرِ مُسلّمہ کے طور پر نہیں مان لیتا ۔ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے ۔ اگر اُس کی عقلِ سلیم کسی بات کو قبول نہیں کرتی تو وہ

اس سے انکار کرنے میں رتی بھر نہیں ہچکچاتا خواہ وہ عام اعتقاد ہو یا مقدس دینی کتابوں کا حکم، وہ ہر فانی اور تغیر پذیر شے کی حقیقت سے انکار کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ صرف جہانِ شہود کو ہی نہیں جنت و دوزخ کو بھی غیر حقیقی اور فانی سمجھتا ہے۔ وہ دن رات اپنے آپ سے کہتا ہے "عقاید بطور عقاید کچھ نہیں ہیں دینی کتابوں کے مقدس الفاظ بطور الفاظ کچھ نہیں۔ سُورگ اور نرک کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ مسلک اور طریقت کا وجود بھی بے معنی ہے، مندر اور مسجد گرجے اور شوالے کچھ بھی نہیں۔ بس ایک آتما ہی آتما ہے۔"

یہ ہے گیانی کا طرزِ عمل وہ ہر چیز کو رد کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کو اس لازوال و لافانی چیز کا شعور حاصل ہو جاتا ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اس کی اپنی حقیقی خودی ہے۔ یہی آتما ہے۔ اس طرح ہر چیز کا تجزیہ عقل و دلیل سے کرنے کے لئے گیانی ایک زبردست قوتِ ارادی سے کام لیتا ہے۔ اور آخر اس مقام پر پہونچ جاتا ہے جسے نِروان کہتے ہیں جہاں تمام اضافیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اس حالت کا بیان یا اس کا تصور تو ممکن نہیں البتہ اس کا احساس ہو سکتا ہے، گیانی کی عظمت کا اندازہ دنیوی اعمال اور نتائج کے معیار سے نہیں لگایا جا سکتا اگر آپ کے دل میں بھی معرفت حاصل کرنے کی لگن ہے تو اپنی درازیِ عمر اور آسودہ حالی کے لئے دُعا نہ مانگو، اپنے زخموں کے اندمال اور درد کے درماں کے لئے نہ گڑگڑاؤ شعورِ خودی کے لئے اپنی مطلق آزادی کے لئے جدّ و جہد کرو۔ دنیا میں گِدھ کی طرح نہ رہو جس کی نگاہ آسمان کی بلندیوں میں بھی لاشوں کی تلاش میں رہتی ہے اور جسے گوشت کا ایک لوتھڑا اُن کی آن میں اُن بلندیوں سے نیچے کھینچ لاتا ہے۔ ہماری حقیقت "ست چت آنند" ہے یعنی ہم وجودِ واحد ہیں، شعورِ مطلق ہیں، اور سراپا سُرور و نشاط ہیں۔ "ہمارا وجود ہے" اس کا ہمیں پورا یقین ہے، سُرور و نشاط (آنند) نکھرے ہوئے پاک وجود کا فطری عطیہ ہے، ہم سب کی زندگی میں گاہے گاہے ایسے لمحے آتے رہتے ہیں۔ جب ہم پر مسرّت کا عالم طاری ہو جاتا ہے ایسی حالت میں ہمارے دل میں کسی قسم کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ کسی سے کچھ مانگنا نہیں ہوتا۔ کسی کو کچھ دینا نہیں ہوتا۔ بس ایک ہستی کا ایک عمیق نشاط کا احساس رہتا ہے جو ہمارا احاطہ کئے رہتی ہے لیکن یہ یزدانی لمحے ہمیشہ قائم نہیں رہتے۔ جب ان کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر اسی سنسار کا تماشا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، لیکن ان لمحوں کی برکت سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام عالمِ شہود اس ایک پرماتما کی ہی کرشمہ سازی ہے۔ صرف وہی ان تمام چیزوں کا پسِ منظر ہے[۵]" جب ہم آنند ساگر سے دھرتی کی طرف لوٹتے ہیں تو جزو کل کو اضافی رشتوں میں دیکھتے ہیں یہی سچدانند

۵ The Universe is a mosaic work set upon God who is the background of all things.

(ست چت. آنند) ہمیں مقدس تثلیث[1] کی صورت دکھائی دیتا ہے۔ (باپ۔ بیٹا۔ اور رُوح القدس) یا یوں کہیے کہ ہم ایک سچدانند کو خالق۔ مخلوق اور رُوح القدس کی صورتوں میں دیکھنے لگتے ہیں "ست" تخلیق کی اصل ہے۔ چت اصلِ شعور و ہدایت ہے اور آنند اصلِ احساس جس کے ذریعے ہم پھر اسی ایک وجود سے واصل ہو سکتے ہیں۔ ہم مسرت کی تلاش میں گیان یا معرفت تک پہنچتے ہیں اور گیان سے ست یا وجود کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ یہی بات ہے جو حضرت عیسٰی نے یوں بیان کی ہے کہ "کوئی آدمی آسمانی باپ کو بغیر اس کے بیٹے کی وساطت کے نہیں جان سکتا"[2]

ویدانت ہمیں تعلیم دیتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ نروان یہیں اور اسی وقت اس دنیا میں اور بقیدِ حیات حاصل ہو سکتا ہے، اس کے لئے موت کا انتظار ضروری نہیں۔ اب یہ نروان کیا ہے! احساس اور شعورِ خودی جسے ایک دفعہ لمحہ بھر کے لئے پالینے کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے سے انفرادیت، علیحدگی اور کثرت کا پردہ ہمیشہ کے لئے ہٹ جاتا ہے یہ آنکھیں ظاہری مناظر کو دیکھتی ضرور ہیں لیکن ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اصلیت کیا ہے اب ہم گھڑی بھر کے لئے بھی حقیقت سے غافل نہیں رہتے، ہر لمحہ ہم اس سے آگاہ رہتے ہیں کیونکہ ہمیں اس کی صحیح نوعیت معلوم ہو چکی ہے یہ صرف تمام مناظر حجابات ہیں جو خودی کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتے ہیں ہماری خودی لافانی اور غیر تغیر پذیر ہے۔ جب کم آگہی کا حجاب اُٹھ جاتا ہے تو ہماری خودی بصد شان و شوکت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ تغیر تو صرف اس حجاب میں ہے کہیں یہ حجاب اتنا نفیس سا ہوتا ہے کہ حقیقت کا جلوہ ہر وقت نظر آتا ہے یہ حالت ہوتی ہے سنت مہاتماؤں کی رشیوں مُنیوں کی خدارسیدہ سالکوں کی اور کہیں یہ پردہ اس قدر کثیف ہوتا ہے کہ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا، یہ حالت ہوتی ہے اُن لوگوں کی جنہیں عام زبان میں گُنہ گار کہا جاتا ہے لیکن حقیقت (جسے اکثر ہم بھول جاتے ہیں) یہ ہے کہ آتما دونوں میں یکساں طور پر پورے تقدس اور پاکیزگی کے ساتھ درخشاں ہے فرق بس درجۂ اظہار کا ہے۔

عقل و خرد کی ہر دلیل وحدت کے نظریئے پر ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے ہم تجزیہ کرتے ہیں پھر

۱ؔ The Holy Trinity—the Father, the Son and the Holy Ghost.

۲ؔ No man can see the Father save through the Son.

مطابقت یہاں تک کہ وحدت کا تصوّر پیدا ہوجاتا ہے یہی عمل سائنس کی دُنیا میں بھی جاری ہے۔ سائنس قدرت کی مختلف قوتوں کو تدریجاً محدود کر کے بس اُس ایک طاقت کی تلاش میں رہتی ہے جس سے تمام کائنات کی تحریک ہوتی ہے۔ جب مادی سائنس اس آخری وحدت کو اپنی گرفت میں لے آئے گی تو وہ اپنے کمال کی انتہا کو پہنچ جائے گی اور اس کے ذوقِ تجسس کو اپنا مقصد حاصل ہوجائے گا۔ گیان یا معرفت ہی تو ہماری آخری منزل ہے۔

مذہب تمام سائنسوں سے بیش قیمت سائنس ہے آج سے سینکڑوں سال پہلے مذہب نے اس آخری وحدت کو تلاش کر لیا تھا، جس کو پانے کا طریقۂ عمل گیان یوگ بتاتا ہے۔ کائنات میں بس ایک خودی ہے، ایک ہستی ہے، اور سب چھوٹی چھوٹی ہستیاں اسی ایک ہستی کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ واحد خودی یہ ہستی ان چھوٹی ہستیوں کا محض مجموعہ نہیں یہ غیر محدود طور پر اپنے تمام مظاہر سے کہیں زیادہ ہے۔ برہم یا واحد خودی سب کچھ ہے۔ سنت مہاتما، پاپی، دُشٹ، نیک کردار اور گنہگار یہاں تک کہ قاتل بھی دراصل اس واحد خودی کے مظاہر ہیں۔ اگر ان کی کچھ حقیقت ہے تو وہ اس خودی کی بدولت کیونکہ اس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں۔ "جو کچھ ہے وہ بس" ایک" ہے گیانیوں نے اس کے مختلف نام رکھ چھوڑے ہیں[۱]"۔ اس معرفت سے بڑی چیز اور کوئی نہیں ہوسکتی اور یہ حاصل ہوتی ہے اُن خوش نصیبوں کو جو یوگ سے اپنا تزکیہ کر لیتے ہیں۔ اُن کے صاف شفاف شیشۂ دل میں یہ معرفت نور کی کرن بنکر اترتی ہے۔ جتنا جتنا یوگ اور دھیان سے دل پاکیزہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُتنے ہی معرفت کے جلوے زیادہ صاف اور روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اس حقیقت کا انکشاف چار ہزار سال پہلے ہوا تھا۔ لیکن نسلِ انسانی نے آج تک ماضی کے اس بے بہا ورثہ کو پوری طرح نہیں اپنایا اور اس پر عمل نہیں کیا یہ بنیادی صداقت بس چند محدود لوگوں کے سینے میں دب کر رہ گئی ہے۔ آج پھر ضرورت ہے کہ اس کا اعلان کیا جائے اور اُسے منظرِ عام پر لایا جائے۔

IV

دنیا میں ہر آدمی کو انسان ہونا میسر نہیں ہے[۲]۔ عام لوگ انسانیت کے اعلیٰ مقام سے ابھی بہت

---

۱ That which exists is one, sages call it variously.

۲ اگلے صفحے پر دیکھئے

دُور ہیں، ہر شخص اس دُنیا کو اپنے معیار سے جانچتا ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق اس کے متعلق من مانی رائے قائم کر لیتا ہے۔ سچی بصیرت، اور حقیقی ادراک بہت کم یاب ہے۔ اکثر لوگ دیکھی بھالی زود فہم ٹھوس چیزوں کو اَن دیکھی غیر مرئی چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور انہیں زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے، دو آدمی ایک ہندو اور دُوسرا چینی، بمبئی کے ایک امیر تاجر کے ہاں شطرنج کھیل رہے تھے، مکان سمندر کے قریب تھا۔ بازی کچھ ایسی لمبی اور سُست ہوتی چلی گئی کہ اُن کی توجہ کھڑکی سے باہر سمندر کے مدّوجزر کی طرف مبذول ہوگئی۔ ایک نے کہا کہ پانی کا یہ اُتار چڑھاؤ اس لئے ہوتا ہے کہ پچھلے زمانے میں دیوتاؤں نے یہ کھیل کھیلا کہ پانی ایک بڑے گڑھے میں پھینک دیا اور پھر اُسے باہر اُچھال دیا، اس طرح سمندر کے پانی میں یہ حرکت پیدا ہوگئی۔ دوسرے نے کہا یہ بات غلط ہے بلکہ دیوتاؤں نے تو پانی ایک بڑے پہاڑ کی چوٹی پر کھینچ لیا، اور جب استعمال کر چکے تو باقی پانی واپس پھینک دیا، اس سے مدّوجزر کی ابتدا ہوئی۔ ایک نوجوان طالب علم جو اُن کے پاس بیٹھا تھا یہ سُن کر ہنس دیا اور کہنے لگا "شاید آپ کو علم نہیں کہ سمندر میں جوار بھاٹا چاند کی کشش سے آتا ہے"۔ اس پر دونوں آدمیوں نے نوجوان کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور کہا "کیا تم ہمیں احمق سمجھتے ہو ہم تمہاری بات کا کیسے یقین کر لیں کیا چاند کے پاس اتنی لمبی رسّیاں ہیں جن سے وہ پانی تک پہنچ کر اُسے کھینچ سکتا ہے اور اس میں مدّوجزر پیدا کر سکتا ہے۔ ہم تو ایسی بے تکی بات کو ہر گز نہیں مانیں گے"۔ اتنے میں اُن کے میزبان کمرے میں داخل ہوئے دونوں، پارٹیوں نے ان کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا، وہ تعلیم یافتہ آدمی تھے اور اصلیت سے واقف لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ شطرنج کے کھلاڑیوں کو اصل بات سمجھانا بھی بہت مشکل ہے، انہوں نے نوجوان کو اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور اپنے لاعلم دوستوں کے لئے جوار بھاٹا کی یوں وضاحت کی جس سے دونوں کی تسلی ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ یہاں بہت دور سمندر کے بیچوں بیچ سپنج کا ایک بہت بڑا پہاڑ ہے۔ آپ دونوں نے اسپنج تو دیکھا ہی ہوگا، اسپنج کا یہ پہاڑ پانی کی بہت بڑی مقدار چوس لیتا ہے اور سمندر گھٹنے لگتا ہے۔ اتنے میں دیوتا پہاڑ پر آتے ہیں اور ناچنے لگتے ہیں اور ان کے بوجھ سے پانی اسپنج کے پہاڑ سے باہر نکلنے لگتا ہے اس پر سمندر چڑھنے لگتا ہے اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اصل بات کتنی سیدھی سادھی ہے"۔ یہ سُن کر وہ دونوں آدمی بالکل مطمئن ہوگئے، جو ابھی ابھی چاند کی اُس کی شکتی کا مذاق اُڑا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ (غالب)

رہے تھے جس کی کشش سے جوار بھاٹا آتا ہے انہیں یہ بات ماننے میں ذرا بھی مشکل نہیں ہوئی کہ سمندر کے درمیان میں سینچ کا ایک پہاڑ ہے اور اس پر دیوتا ناچتے ہیں، سینچ تو ان کی اپنی آنکھوں دیکھی چیز تھی۔ سینچ کا پہاڑ بھی ہو سکتا ہے اور دیوتا تو پھر دیوتا ہیں ہی ان کے ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے اگر اُن کے وزن کو سمندر محسوس کرتا ہے تو کون سی عجیب بات ہوئی۔

ہم میں سے بہت لوگ اس قسم کی طفل تسلیوں سے اپنے من کو بہلا لیتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جس بات سے کسی آدمی کے دل کی تسلی ہو جائے وہ دراصل سچ ہو۔ محض دل کا بہل جانا کسی چیز کی حقیقت کی دلیل نہیں۔ صداقت کے ثبوت اور ہوتے ہیں معیار اور ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حقیقت آرام طلبی سے کوسوں دُور ہے اگر ہمیں سچ مچ حقیقت کی تلاش ہے تو ہمیں محض آرام دہ چیزوں سے کنارہ کشی کرنا ہوگی۔ تلاشِ حق کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ آرام طلبی ہے[1] لیکن گیان کے طالب کو تن آسانیوں سے گزرنا ہی ہوگا۔ گیان آسانی سے حاصل نہیں ہوتا اس کے لیے سخت محنت اور ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ ہر چیز اپنی قیمت طلب کرتی ہے۔ قربانی کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ سچے گیان کے لیے ہمیں تن من کا بلیدان دینا ہوگا۔ حصولِ معرفت کی پہلی شرط ہے۔ پاکیزگی اور خلوص اور اس کے لئے گیانی کو اپنی دُنیاوی خواہشات سے کنارہ کش ہونا پڑے گا اور اس خیال کو پس پشت ڈال دینا پڑے گا کہ وہ بس جسم ہے۔ اور کسی حالت میں نورِ حقیقت اس کی رُوح میں اپنی پوری درخشندگی سے جلوہ گر نہ ہو سکے گا دنیاوی خواہشات کا تیاگ ضروری ہے نفسِ فاسد کی قربانی لازمی ہے۔ آپ کو تقریباً سب مذہبوں میں قربانی کا نظریہ ملتا ہے، اس کی اصل یہی بنیادی اصول ہے کہ معرفت حاصل کرنے کے لئے ترک کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ جو جانور دیوی دیوتاؤں کے مندروں میں بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ اُن کی رضا جوئی کے لئے یہ جتنے بلیدان ہوتے ہیں، خدا کے نام پر یہ جتنی قربانیاں دی جاتی ہیں، ان سب کی اصل وہ ایک قربانی ہے جس کے بغیر معرفت ناممکن ہے اور وہ قربانی ہے وجودِ ظاہر کی اپنی اس جھوٹی خودی کی اگر رسمی قربانیوں کی کچھ اہمیت ہے، کچھ قدر و قیمت ہے تو بس یہی ہے کہ وہ ہمیں سچے تیاگ کا رستہ دکھاتی ہیں اسی خود سپردگی کے راستے سے ہی ہم وجودِ اعلیٰ یعنی آتما تک پہنچ سکتے ہیں[2]۔

ہمارا جسم فانی ہے۔ جسمانی خودی کا احساس بھی فانی ہے۔ اس جسم کی جتنی بھی حفاظت کی جائے

---

[1] مہاتما بدھ نے آرام طلبی کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ (ایڈیٹر)

[2] خودی بنتے بنتے بشر جا بنی تھی ؛ بشر مٹتے مٹتے خدا بن گیا ہے (ایڈیٹر)

بیکار ہے کیونکہ آخر اسے مِٹ جانا چاہے۔ سچا گیانی اپنے جسم کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے تحفظ کی خواہش کو بھی اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا وہ اپنی پوری طاقت اور ہمت تلاشِ حق میں لگا دیتا ہے۔ سچائی کی پیروی میں خواہ جان جائے یا جہان گیانی کو اس کا غم نہیں، حصولِ معرفت زندگی کا سودا ہے، جس نے کرلیا کرلیا، ایک کیا گیان کا سچا طالب سینکڑوں جنم اس مقصد کے لئے قربان کرنے کو تیار ہے۔ گیان بچوں کا کھیل نہیں، فلسفیانہ فیشن پرستی نہیں، اس میدان میں شیروں کا کام ہے ایسے لوگ صرف گنتی کے ہیں جو اپنے اندر کے بھگوان کو پانے کی ہمت رکھتے ہیں۔ چند برگزیدہ ہستیاں ایسی نکلتی ہیں جن میں اپنے باطن کے خدا کو آشکارا کرنے کی خاطر شخصی[1] خدا سے انکار کرنے کی ہمت ہوتی ہے، یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کے آگے سر نہیں جھکاتے، کسی ایسے خدا میں یقین نہیں لاتے جو ہم سے لاکھوں کوس دُور آسمانوں پر کرسی نشین ہو۔ بہشت اور دُوزخ کو نہیں مانتے اُنہیں انعام اور جزا کی امید نہیں، اُنہیں قہر و سزا کا خوف نہیں، اُن کے تیاگ سے سُورگ اور نرگ کا تصور ہی کالعدم ہوگیا ہے۔ ان کے ارادے مستقل اور مصمم ہیں اور اُن کی نظر میں تھوڑا سا تامّل اور تذبذب بھی بہت بڑی کمزوری کی علامت ہے۔ گیان کی بے بہا دولت انہیں لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

انسان یا تو مکمل ہے، ہمیشہ مکمل رہا ہے اور رہے گا یا وہ کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا، رُوحانیت کا کمال تو یہی ہے کہ انسان اپنے کمال کو پوری شدت سے محسوس کرے۔ اگر انسان محض خارجی اسباب سے بندھا ہوا ہے اگر اس کی ہستی کا انحصار اُنہیں اسباب پر ہے تو وہ یقیناً فانی ہے، زندگیٔ دوام (غیر فانیت) صرف اُسی کے حصے میں آتی ہے جو ہر بندش سے آزاد ہو[2]۔ جو جسم میں محدود نہ ہو جو ماحول میں گھرا نہ ہو، آتما پر کسی چیز کا عمل یا ردِّ عمل ممکن ہی نہیں یہ خیال محض فریب ہے لیکن اس حقیقت سے وہی آگاہ ہو سکتا ہے جو اپنی خودی کو پرماتما میں وصل کر دے، جو اپنی ہستی کے احساس کو "اُس" ایک سے یوں وابستہ کر دے کہ شریر اور من (جسم و دماغ) کا احساس ذرا بھی باقی نہ رہے اور اپنے آپ کو جہانِ شہود کا شاہد محسوس کرنے لگے۔ ایسا انسان ہی سچے معنوں میں دُنیا کے اس حیرت انگیز تماشے سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "میں ہی کائنات ہوں میں ہی برہمہ ہوں۔"

جب انسان واقعی اس ایک آتما سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اس کے لئے ہر بات ممکن ہو جاتی ہے اور

---

۱ Personal God.

۲ Immortality can only be true of the unconditioned.

مایا (مادّی دنیا) اُس کی غلام ہو جاتی ہے جیسا کہ بھگوان سری رامکرشن نے فرمایا ہے" دُودھ پانی میں مل کر علیٰحدہ نہیں ہو سکتا لیکن جب مکھن نکال لیا جائے تو اسے پانی یا دُودھ جس میں چاہیں رکھ سکتے ہیں، وہ کبھی اِن میں نہیں مل سکتا اسی طرح انسان جب اپنی حقیقی خودی کو پالیتا ہے تو دُنیا اُسے آلُودہ نہیں کر سکتی۔" وہ دنیا کے نیک و بد سے بالا ہو جاتا ہے جیسے کہ غبارے سے سطحِ زمین پر نگاہ ڈالی جائے تو بلندی اور پستی کا معمولی فرق باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح سچی خودی کے بلند مقام سے خوب و زشت کا امتیاز مِٹ جاتا ہے، انہوں نے اسی خیال کو ایک اور مثال سے یوں ظاہر کیا ہے فرماتے ہیں" کمہار گیلی مٹّی کو جیسے چاہے توڑ موڑ سکتا ہے اور جیسی شکل چاہے دے سکتا ہے لیکن جب اسی مٹّی کے برتنوں کو ایک بار آنچ دیدی جائے تو اُن کی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ ہمارے من (دِل) کا بھی عین یہی حال ہے اسے بھی ایک بار رُوحانیت کی آگ میں[1] تپالیا جائے تو وہ ایک مستقل شکل اختیار کر لیتا ہے پھر اُسے بدلا نہیں جا سکتا جس نے بھگوان کے چرنوں کو ایک بار چھولیا جس کی ایک بار بھی خدا کی بارگاہ میں رسائی ہوگئی وہ دنیا میں رہ کر بھی خُدا کا ہو جاتا ہے۔

سنسکرت زبان میں "فلسفہ" کے معنی ہیں صفائی فکر و نظر، اور مذہب کیا ہے عملی فلسفہ، صفائی قلب و جگر کے لئے عملی جدّ و جہد، ہندوستان میں محض نظریاتی اور تخیلی فلسفہ کی آج تک قدر نہیں ہوئی اس دیس نے کبھی کسی خاص مذہبی گروہ یا دینی سماج کی اندھا دھند پیروی پر زور نہیں دیا، ہم مذہبی تعصب سے ہمیشہ دُور رہے ہیں۔ یہاں تو مذہب کو بس خُدا تک پہنچنے کا عملی ذریعہ مانا گیا ہے جس کی دو صورتیں ہیں دویت اور ادویت[2]، دویت واد کہتا ہے کہ نجات خدا کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ دنیا میں یہ جو علت و معلول کا قانون جاری ہے اُس سے گریز ممکن نہیں اُسے توڑا بھی نہیں جا سکتا لیکن خدا اس قانون کا پابند نہیں۔ اُسی کی مدد سے، اُسی کی عنایت سے ہم اس قانون کے شکنجے سے نکل سکتے ہیں"۔ ادویت واد کا کہنا ہے کہ تمام فطرت کے پس پشت کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو کہ مطلقاً آزاد ہے جو تمام قوانینِ فطرت سے ماوراء ہے اس ہستی کو پالینا ہی سچی آزادی ہے۔ اس آزادی کا دوسرا نام نجات ہے۔"

غور سے دیکھا جائے تو یہ دو مذہبی عقیدے یعنی دویت اور ادویت کے مسلک دراصل جُدا جُدا رستے نہیں ہیں۔ دویت یا دوگانگی حقیقت کا محض ایک پہلو ہے، ادویت کا اصل مسلک منتہائے تک

ے[1] Baptism of fire.

ے[2] Dvaitism and advaitism.

جاتا ہے کثرت دوئی تک پہنچ کر دویت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، دویت وحدت میں جذب ہو کر ادویت کہلاتی ہے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے یعنی مکمل و مطلق آزادی، حصولِ مقصد کا طریقہ بھی ایک ہی ہے یعنی پاکیزگی صدق و صفا، تن من کی صفائی ہی نجات کا مختصر ترین راستہ ہے۔

آپ کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ آپ کو بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بھی ہماری سچی ملکیت فقط اسی چیز پر ہوتی ہے جو خود ہماری پیدا کردہ ہوتی ہے۔ روحانیت کے میدان میں بھی ہمیں ملتا وہی کچھ ہے جس کے لیے ہم دل لگا کر کوشش کرتے ہیں، روحانیت کی بلندیاں متواتر جدّ و جہد سے حاصل ہوتی ہیں پاکیزگی اور صدق و صفا کی دولت حاصل کرنے کے لیے بھی مسلسل محنت درکار ہے نجات کسی کے دینے سے نہیں ملتی، کوئی اوتار کوئی پیغمبر کوئی پیر و مرشد ہمیں اس وقت تک بچا نہیں سکتا جب تک ہم خود اپنی نجات کے مستحق نہ ہو چکے ہوں اسی طرح کسی خاص مذہبی عقیدے پر ایمان لانے سے روحانیت نہیں مل جاتی اس سے ہم پر نجات کا رستہ نہیں کھل جاتا، ہمیں اپنے ایمان کو اپنے کردار سے زندہ بنانا ہے، اگر ایمان صرف حدِ ادراک تک محدود ہے تو یہ ایک بے معنی چیز ہے لیکن جب ہم اپنے عمل سے اس میں جان ڈال دیتے ہیں تو وہ ہمارا سچا رہبر بن جاتا ہے

اگر خدا ہے تو ہم سب اُسے پا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر حرارت کو لے لیجئے اگر حرارت کا وجود ہے تو اُسے ہر شخص خود ہی محسوس کر سکتا ہے، یہ کسی کے بتانے کی بات نہیں، یہی بات خدا کی ہستی پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہر شخص کو اس کی ہستی کا ادراک و احساس خود پیدا کرنا ہے۔ جب تک آدمی کے شعور میں خدا کی ہستی واقعتاً موجود نہیں ہے۔ اس کی کچھ حقیقت نہیں، وہ محض ایک خیال ہے، ایک افسانہ ہے۔ جو ہم نے کسی سے سن رکھا ہے۔ حقیقت تو ہمارے اپنے عمل اور کردار سے ہی اُبھر سکتی ہے کسی کی وساطت سے نہیں یہی وجہ ہے کہ گناہ کا جو مفہوم مغرب میں سمجھا جاتا ہے اس کو مدِّ نظر رکھ کر ہندو مذہب میں گناہ کی کوئی حقیقت نہیں، ہندو دھرم بھلے بُرے کرم کا ضرور قائل ہے، نیک و بد اعمال کا فرق مانتا ہے لیکن اعمال بد اس معنی میں "گناہ" نہیں ہوتے کہ ہم اُن کے ارتکاب سے کسی مطلق العنان حکمران کی حکم عدولی کر رہے ہیں، بُرے کام دینی جرم نہیں بلکہ اس غلط روی کا نتیجہ ہیں جس سے خود ہمیں نقصان پہنچتا ہے، آگ میں ہاتھ ڈالنا یقیناً پاپ نہیں لیکن اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اُس کا ہاتھ ضرور جل جائے گا۔ اس لحاظ سے بُرے کاموں کی سزا ضرور ملتی ہے کیونکہ ہر عمل کا کچھ نہ کچھ ردِّ عمل ضرور نکلتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے "ہر عمل عامل کی طرف لوٹ آتا ہے"[ك] آخر کار ہمیں اپنے اعمال کی پوری ذمہ داری اپنے سر لینا ہوگی اس لحاظ سے "تثلیث" کا تصور

ك Every deed returns to the doer.

(باپ، بیٹا اور رُوح القدس[۱]) توحیدی نظریئے سے کہیں آگے ہے کیونکہ توحید بھی ایک قسم کی تثنویت (دوگانگت[۲]) ہے جس کے مطابق خدا اور بندہ جُدا جُدا ہستیاں ہیں، جب ہم "تثلیث" تک پہنچتے ہیں اور اپنے آپ کو بھگوان کا بچہ سمجھنے لگتے ہیں تو ہم خُدا کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ بندہ اور خدا کا فاصلہ کم ہو کر باپ بیٹے کی حد تک آجاتا ہے اس سے اگلا اور آخری قدم یہ ہے کہ ہم جان لیں باپ اور بیٹا ایک ہیں پرماتما اور آتما ایک ہیں ہم ایک ہی برہمہ ہیں۔

V

"ہم برہمہ ہیں" کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے جسم بھی لافانی ہو جاتے ہیں، یہ سوال کہ جسم غیر فانی یا ابدی کیوں نہیں ہو سکتا بجائے خود غیر معقول اور غیر منطقی ہے، لفظِ جسم کا اطلاق ہی عناصر کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ ہر مجموعہ تغیر پذیر ہے اور اپنی فطری خصوصیت کی بنا پر غیر مستقل ہے جب ہم اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں قانونِ تغیر کی پابندی ہم پر لازم نہیں ہوتی تو ہم اپنے نام نہاد اجسام سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔ جس چیز کو ہم مادّی کہتے ہیں وہ زمان و مکان اور علت و معلول کی حدود سے نکل کر سرے سے "مادّی" ہی نہیں رہتی، زمان و مکان کا وجود تو ہماری ہستی سے ہے، ہماری ہستی ہی ایک لافانی اور مستقل ہستی ہے، باقی سب صورتیں تغیر پذیر یعنی فانی ہیں سب مذہب یہی کہتے ہیں کہ خدا کسی خاص شکل و شباہت کے دائرے میں محیط نہیں، بھگوان کا کوئی نام اور روپ نہیں جب ہم پرماتما کی ذات سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں تو ہمارا بھی کوئی خاص نام اور رُوپ باقی نہیں رہتا۔

اس سلسلے میں آپ کو ایک تاریخی واقعہ سناتا ہوں ۱۵۰ سال قبل مسیح کا ذکر ہے یونانی بیکٹیریا[۲] کے (ملک باختر) کے بادشاہ مینندر[۳] کو ایک نوجوان بودھی راہب نے بودھ مت میں داخل کر لیا اور اُسے میلندہ[۴] کے نام سے منسوب کر دیا اس بادشاہ نے اپنے گرُو سے پوچھا "کیا انسانِ کامل (جیسے کہ مہاتما بودھ تھے) کوئی غلطی کر سکتا ہے؟ نوجوان راہب نے جھٹ یہ صاف جواب دیدیا" انسانِ کامل کچھ چھوٹی چھوٹی باتوں سے جو اس کے تجربے میں نہ آئی ہوں بے خبر ہو سکتا ہے لیکن وہ ان باتوں کے بارے میں کبھی بھی غلطی نہیں کر سکتا جن کی بصیرت اُسے واقعی حاصل ہو چکی ہو اس کا احساسِ کمال ہر گھڑی بیدار رہتا ہے وہ رازِ حیات

۱۔ The Father, the Son and the Holy Ghost.

۲۔ Greco—Bactarian

۳۔ King, Menander.

۴۔ Milinda.

سے ہر وقت پوری طرح آشنا ہوتا ہے اور کائنات کی حقیقت سے واقف، ممکن ہے کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اس جوہرِ کائنات کی وہ تمام صورتیں کیا ہیں جو زمان و مکان کے پس منظر میں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن وہ کبھی اصل سے غافل نہیں ہوتا اگر جہانِ شہود کی مختلف صورتوں کو مٹی کے قسم قسم کے برتنوں سے تشبیہہ دی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ مردِ کامل بجائے خود مٹی کو خوب جانتا ہے اگرچہ ہوسکتا ہے کہ مٹی کے جو بے شمار برتن بنائے جاسکتے ہیں وہ سب کے سب اس کے تجربے میں نہ آئے ہوں، مطلب یہ ہے کہ انسانِ کامل بجائے خود آتما یا رُوح کو پہچانتا ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ رُوح کے سارے مظاہر سے واقف نہ ہو اور اُسے بھی عام آدمیوں کی طرح ان اضافی رشتوں کی واقفیت درکار ہو، مگر یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ اپنی زبردست اندرونی طاقت کی بدولت اضافی واقفیت بھی دُوسروں کے مقابلہ میں بہت جلد حاصل کرسکتا ہے۔ مردِ کامل کا من (دل) پوری طرح اس کے بس میں ہوتا ہے اور بس میں کئے ہوئے من کی تیز شعاعیں جہاں کہیں بھی پڑ جاتی ہیں، جہالت اور ظلمت مٹ جاتی ہے اور آگہی فوراً دسترس میں آجاتی ہے۔ پاک دل و دماغ جس چیز کی خواہش کرتا ہے وہ اُسے جھٹ مل جاتی ہے اس نکتہ کا سمجھ لینا بہت ضروری ہے اضافی علم کی کمی سے مردِ کامل کے کمال میں فرق نہیں آتا مہاتما بُدھ اور یسوع مسیح جیسی ہستیوں کے لئے بھی ہر چیز کی اضافی واقفیت ممکن نہ تھی۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے تو کوئی بھی مہاتما بُدھ اور یسوع مسیح کے اضافی علم کی خامیوں کی تلافی کرنے کی احمقانہ کوشش نہ کرے گا اگر اُن کی کوئی بات آج غلط ثابت ہوگئی ہے تو ہمیں نہ تو اُن سے مُنکر ہونا لازمی ہے۔ اور نہ اُن کے کسی ارشاد کی من مانی تاویل کرکے غلط بات کو صحیح قرار دینا ضروری ہے اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہ اُن کے چیلوں پر الزام لگایا جائے کہ انھوں نے اپنے گرو یا مرشد کے ارشاد کے صحیح اظہار میں غلطی کی ہے اس طرح کی باتیں بنانا فضول ہے یا تو آپ یہ مانیئے کہ ان بزرگوں کے چیلوں نے جو کچھ لکھا ٹھیک لکھا یا یہ کہیئے کہ انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک بات تو صحیح بیان کی اور دُوسری غلط۔ اگر کوئی بات غلط ہے تو خود اُن بزرگوں نے ہی غلط کہی ہے۔ اس لئے دُوسروں کو الزام دینا بے وقوفی اور کم ظرفی کی نشانی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر مہاتما بُدھ یا یسُوع مسیح کے اضافی علم میں کوئی غلطی یا خامی نمایاں ہوگئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ روحانیت کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا وہ بھی غلط ہے، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اضافی علم کی کمی سے مردِ کامل کے کمال میں فرق نہیں آتا رُوحانیت کے کمال یعنی معرفت کا سب سے اہم ثبوت یہ قول ہے کہ "دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد" اگر دُنیا میں ایک

بھی انسان کو معرفت کا کمال حاصل ہے تو ہر انسان اکملیت کے اسی درجے تک پہنچ سکتا ہے جو بات ایک بار ہو چکی ہو، دوبارہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم کو گیان یا معرفت کی دولت اسی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم آج اور ابھی کامل نہیں بن سکتے تو پھر کبھی اور کسی حالت میں بھی رُوحانیت ہماری دسترس میں نہیں آسکتی جو چیز آج ہماری زندگی میں ناممکن ہے۔ وہ آخر کسی اور زندگی میں کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔ چاہے وہ بہشت یا کسی اور عالمِ بالا کی زندگی ہی کیوں نہ ہو یا تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ صرف یسوع مسیح اور بُدھ ہی کامل انسان تھے اور ہر شخص کو اُن کا ایسا کمال نہیں حاصل ہو سکتا یا یہ کہنا پڑے گا کہ انسان کے لئے اکملیت ممکن ہی نہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو حضرت عیسےٰ مسیح کامل نہیں تھے تو پھر اُن کے نام پر جو مذہب رائج ہے اس کی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی اگر وہ تمام ہستیاں جنھیں ہم اوتار یا پیغمبر قرار دیتے ہیں کامل نہیں تھیں تو اُن کے بتائے ہوئے دینی راستوں کو بھی غلط ماننا پڑے گا لیکن اگر ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر اِن تمام ہستیوں کے کمال میں آپ کو شک نہیں تو پھر آپ کے لئے خود اپنی اکملیت پر بھی یقین لانا لازمی ہے۔

کامل انسان کا علم (گیان) ہماری اضافی واقفیت سے مختلف ہوتا ہے وہ منطق اور دلائل سے کام نہیں لیتا وہ علم کا اکتساب اس طرح نہیں کرتا جیسے ہم عام طور پر کرتے ہیں۔ ہماری واقفیت تو محض عمل موازنہ پر منحصر ہے اس کی تہہ میں ایک سلسلۂ استدلال جاری ہے اور مجردیت یا وجودِ مطلق میں کسی موازنہ، کسی تقسیم نیز کسی درجہ بندی کی گنجائش ہی نہیں یہ سب تو محدودیت اور عقلیت کے نقش و نگار ہیں اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ معرفت محض جبلّت کی ایک صورت ہے۔ ماناکہ جبلّت[1] عقلیت سے کم خطا کار ہوتی ہے پھر بھی عقلیت[2] کا درجہ زیادہ بلند ہے کیونکہ واقفیت اور آگاہی کے توسل ہی سے وجدان[3] کا رستہ ملتا ہے۔ جس کا درجہ واقفیت سے کہیں زیادہ اونچا ہوتا ہے۔ جیسے بسا اوقات اولاد ماں باپ سے آگے نکل جاتی ہے ویسے ہی وجدان، اضافی علم سے جنم لے کر اس سے کہیں آگے نکل جاتا ہے، وجدان کے مقام پر خطا ممکن ہی نہیں[4]۔ اِس لحاظ سے وجدان اور جبلّیت کے مابین مشابہت ضرور ہے لیکن دونوں کے مقام میں زمین آسمان کا فرق ہے جبلیت غیر شعوری چیز ہے اور وجدان شدتِ احساس و شعور کا مخزن ہوتا ہے۔

زندگی کا ظہور تین مدارج میں ہوتا ہے، یہ تین مدارج ہر جاندار میں نظر آتے ہیں۔ پہلا درجہ ہے تحت الشعور[5] کا اس مقام پر جاندار میکانکی انداز سے جیتا ہے اور اس لئے غلط روی کا امکان نہیں

---

[1] Instinct [2] Reason [3] Intuition

[4] پیرِ ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت ۔ آفریں بر نظرِ پاکِ خطا پوشش باد، (حافظ)

اس کی مثال حیوان ہیں، دُوسرا درجہ ہے شعور کا، یہاں جاندار کو احساسِ خودی ہوتا ہے، وہ وقوف حاصل کرتا ہے اور سوچ بچار سے کام لینے لگتا ہے اور اُسے ہر کام کی ذمہ داری قبول کرنا پڑتی ہے، اس لیے یہاں غلط کاری کا امکان پیدا ہو جاتا ہے اس کی مثال انسان ہے۔ تیسرا درجہ ہے فوق الشعور کا 'وجدان کا'۔ یہاں احساسِ خودی اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے یہاں علمِ معرفت کی منزل تک پہونچ کر مکمل ہو جاتا ہے۔ یہاں خطا کا سوال ہی نہیں اٹھتا اس کی مثال بھگوان ہے۔

مدارج تین ہیں لیکن زندگی ایک ہے، انسان جب زندگی کے تیسرے درجہ یعنی المکلیت تک پہونچ جاتا ہے جب وہ خدا سے واصل ہو جاتا ہے تو اسے زندگی سے اپنے لئے کچھ اور حاصل کرنا باقی نہیں رہ جاتا وہ زندہ تو رہتا ہے مگر دُوسروں کے لئے، دنیا کی بھلائی کے لئے، اپنے علم کی روشنی کو دُوسروں تک پہنچانے کے لئے اس کی ہستی کی وسعتوں میں تمام کائنات بس جاتی ہے[۱]۔ زندگی اس کے لئے ایک ہو جاتی ہے تمام تفرقات مِٹ جاتے ہیں آخر یہ تفرقات پیدا ہی ہوتے ہیں کسی چیز کی کمی کے احساس سے، جہاں زندگی بھرپور ہو جاتی ہے وہاں فرق اور تمیز کا سوال ہی نہیں اُٹھتا جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ منفی ہے جو مثبت ہے وہ ہمیشہ کشادہ سے کشادہ تر ہے ہم میں جو چیز مشترک اور سب سے زیادہ کشادہ ہے وہ ہمارا احساسِ ہستی ہمارا شعورِ وجود ہے اور جب یہ احساسِ ہستی کمال کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو ہم بے کنار ہو جاتے ہیں اور ہماری وسعتوں کے "مُحیطِ بیکراں" میں خودی کی تمام چھوٹی بڑی موجیں اٹھتی اور جذب ہوتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے آپ میں کھو جاتے ہیں۔ محو ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے پربھو ملن، وصلِ الٰہی، کمالِ خودی کا مقام جہاں وحدت ہی وحدت ہے جہاں فطرت کی رنگا رنگ کی صورتیں ایک ہو جاتی ہیں جہاں قانونِ فطرت بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے، آخر قانونِ فطرت ہے کیا چیز محض ایک قسم کی ذہنی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) جس کی مدد سے ہم مظاہرِ کائنات کا ادراک اور ان کی وضاحت و تشریح کرتے ہیں۔ قانون کی بجائے خود کوئی حقیقت نہیں، اس کا کوئی منفرد وجود نہیں۔ عالمِ شہود میں اگر کوئی بات مسلسل وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تو ہم اُسے قانون کا نام دیتے ہیں، دُوسرے الفاظ میں قانون خود ہمارے ہی مشاہدے کا ایک رُخ ہے ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ قانونِ فطرت کا ایک ایسا ہوّا بنا دیں جو ناگریز ہو اور جس کی اطاعت کئے بغیر کام ہی نہ چلے قانون مجبوری کا دُوسرا نام نہیں ہے۔ ہماری

---

[۲] Subconscious

(بقیہ حاشیہ)

[۱] بسی ہے میری محبت میں کائنات تمام ÷ دل و جگر سے مجھے چشمِ تر سے کیا نہ ملا، ایڈیٹر

فطرت آزاد ہے ہماری عقل مجبوری کو قبول نہیں کرتی ہمیں آخر تمام قوانین پر قابو پانا ہے جب ہم تحت الشعور کے مقام سے بلند ہوگئے اور ہم نے عقل و منطق کو اپنا رہنما بنا لیا تو غلطیوں کا امکان بھی پیدا ہوگیا' غلطیوں کے ڈر "یا گناہ" کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے کے کیا معنی انھیں غلطیوں پر فتح پانے کی جدّ وجہد آخر ہمیں دیوتاؤں کے مقام تک لے جاتی ہے جس طرح بیماری دراصل جسم سے مادّہ فاسد کو باہر نکال پھینکنے کی جدّ وجہد کا دوسرا نام ہے۔ اسی طرح خطا کاری یا گناہ ہماری فطری الوہیت کی جنگ ہے تاکہ بہیمیت کو نکال باہر کیا جائے۔ خطائیں ہم سے سرزد ہوں گی۔ گناہ کا ہم سے ارتکاب ہوگا اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس کے بغیر تو الوہیت کے مقام تک ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی جب تک بچہ گرے گا نہیں ٹھوکریں نہیں کھائے گا چلنا کیسے سیکھے گا گیان کا رستہ ہمت اُو دلیری شجاعت اور سرفروشی کا رستہ ہے آپ اس پر چل کر دیکھئے تو' لغزشوں کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔

گیان کی راہِ عمل کا پہلا قدم ہے سب کو برابر ماننا' کسی کو اپنے سے کم تر مت سمجھنا' اگر دنیا میں کوئی بنیادی گناہ[1] ہے تو وہ ہے نابرابری کا احساس' اپنے آپ کو اس گناہ سے بچاؤ' کسی کو اپنے سے کم سمجھ کر اُس پر نگاہِ ترحم مت ڈالو' کسی کو دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ میں اچھا ہوں۔ وہ بُرا ہے میں اسے راہِ راست پر لے آؤں گا' تم کون ہوتے ہو کسی پر رحم کرنے والے' کسی کو راہ دکھانے والے' یسوع مسیح کو دیکھو وہ عوام کے ساتھ رہے' اُن لوگوں کے ساتھ جنھیں ناپاک اور گناہ گار کہا جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو دُوسروں سے کبھی اونچا نہیں سمجھا' منبر و محراب پر بیٹھ کر دوسروں کو اپنے سے کمتر نہیں کہا' اپنے آپ کو پاک اور دُوسروں کو ناپاک نہیں بتایا' انھوں نے سب کو یہی پیغام دیا کہ یزدانیت تمہارے اندر ہے' یہی علامت ہے آزاد منش انسانوں کی' مساوات اور اخوت پاک بازوں کا شیوہ ہے' یاد رکھو کہ صرف پاپی ہی کی نظر پاپ پر پڑتی ہے۔ جو نگاہ واقعی پاک ہے اُسے ناپاکی نظر ہی کہاں آئے گی[2]۔ پاک نگاہی پیدا کرو' انسان کو محض انسان مت سمجھو' اس کی یزدانیت پر نظر ڈالو' بندے میں خدا کو دیکھو مذہب اسی کا نام ہے پرستش اسی کو کہتے ہیں یہی خلدِ بریں کا عیش و آرام (سورگ کا سکھ) ہے' یہ جان لو کہ ہم اپنی بہشت کی تخلیق خود ہی کرتے ہیں ہم جہنم کو بھی جنت بنا سکتے ہیں۔ آخر جہنم اُسی جگہ کا تو نام ہے جہاں گناہ گار رہتے ہیں' جب تک ہمیں اپنے گرد پاپی اور گناہگار نظر آتے ہیں ہماری دنیا جہنم ہے۔ لیکن جب ہماری نظر پاک ہو جاتی ہے اور ہمیں کوئی گناہ گار دکھائی نہیں دیتا' جب ہم ہر طرف خدا ہی کا جلوہ

---

[1] Primal Sin

[2] پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت ÷ آفریں بر نظرِ پاک خطا پوشش باد'
(حافظ)

دیکھتے ہیں تو یہی دُنیا جنت بن جاتی ہے۔

رُوح یا آتما۔ زمان و مکان سے باہر ہے جان لو کہ "میں وجودِ مطلق ہوں، معرفتِ مطلق ہوں، نشاطِ مطلق ہوں۔[لے] میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں" اپنی اس حقیقت کو پہچان لو زندگی ملے تو خوش رہو، موت آئے تو خوشی سے قبول کرو، نشاط و سرور تمہاری اصل ہے ہر حالت میں مسرور رہو بھگوان کے پریم میں مگن ہو احساسِ روح کو قائم کر لو، جسم کی غلامی سے چھٹکارا پاؤ۔ ہم لوگ جسم کے اس حد تک غلام ہو گئے ہیں کہ ہمیں اپنے پاؤں کی بیڑیوں سے لگاؤ سا پیدا ہو گیا ہے، ہمیں اپنی غلامی سے اُنس ہو گیا ہے۔ اور ہم اسی حالت میں رہنا چاہتے ہیں بلکہ اسے دائمی بنانے کے خواہش مند ہیں ہم نے عالمِ بالا کا جو تصوّر باندھا ہے، ہم نے بہشت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں بھی جسمانی شخصیت کو قائم رکھا ہے تم رُوح ہو، جسم کے خیال کو ترک کر دو، اگلی کسی دُنیا میں بھی جسم کی اُمید باندھو، جسم اپنا ہو خواہ اپنے عزیزوں کا، جسم سے اس قدر وابستگی ہماری روحانی خود شناسی کی راہ میں حائل ہوتی ہے اگر ہم جسم کے خیال کو ترک نہیں کریں گے تو جسم ہمیں ملتا ہی رہے گا، جب تک ہم جسمانی خودی کے احساس سے اوپر نہیں اُٹھ جاتے اُس وقت تک ایک کے بعد دُوسرا جنم پاتے رہیں گے ایک جسم ختم ہو جائیگا تو دُوسرا پیدا ہو جائے گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خود کشی کر لیں محض جسم کو غارت کر دینے سے چھٹکارا نہیں ملتا، ہمیں تو جسم کی خواہش ہی کو سرے سے مٹا دینا ہے یہ زندگی ہماری معلّم ہے جب تک ہم اپنا سبق سیکھ نہیں لیں گے ہم جہانِ نمود کی درس گاہ میں آتے رہیں گے، ایک معلّم نہیں رہے گا تو دُوسرا اس کی جگہ لے لے گا۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ کمالِ خودی حاصل کرنے کے لئے جسمانی انفرادیت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنی جسمانی شخصیت سے جلد سے جلد اُوپر اُٹھ جائیں دیکھئے بھگوان رام کے بھگت ہنومان نے اِس فلسفۂ حیات کو یوں بیان کیا ہے "میرے مالک، جب میں اپنے آپ کو جسم سمجھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ میں ابداً آپ سے الگ آپ کا سیوک ہوں، لیکن جب میں اپنے آپ کو ایک جیو سمجھتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے شعلۂ الوہیت کا ایک شرارہ ہوں اس سے بھی گزر کر جب میں اپنے آپ کو آتما سمجھتا ہوں تو میں اور آپ ایک ہو جاتے ہیں"۔

یہ ہے گیانی کا آدرش، اس کی منزلِ مقصود، اس کی معراج اپنی خودی سے آگاہی حاصل کرنا ہے جس کے لئے وہ ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔

لے I am Existence Absolute, knowledge Absolute.' Bliss Absolute. I am He. I am He.

VI

ہم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں محض اسی بات پر ہماری دنیوی اور رُوحانی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ ہم آخر وہی ہو جاتے ہیں جو ہم سوچتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے خیالات کی ہمارے لئے نہایت درجہ اہمیت ہے یہ بات آپ کو ایک کہانی سے اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی پچھلے زمانے میں ایک سنیاسی تھے، یہ پاک باز بزرگ ایک پیڑ کے نیچے رہتے تھے اور لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے خوراک کے معاملے میں بس دودھ پیتے اور پھل کھاتے تھے وہ بے شمار ریاضتیں کرتے اور اپنے آپ کو نہایت پاک اور مقدس گردانتے تھے اسی گاؤں میں ایک بدکار عورت بھی رہتی تھی سنیاسی مہاراج ہر روز اس کے یہاں جاتے اور اُسے ڈراتے کہ آخر تیری بدکاری تجھے جہنم میں لے جائے گی بے چاری غریب عورت اپنا طریق زندگی بدلنے سے لاچار تھی کیونکہ اس کا ذریعۂ معاش یہی تھا پھر بھی سنیاسی اُسے جو تصویر دکھاتے وہ اس سے لرز اٹھتی اور رورو کر دُعا مانگتی کہ یا خدا مجھے معاف کر دو میں مجبور ہوں۔ زندگی کے دن گزرتے گئے آخر پاکباز سنیاسی اور بدخصال عورت دونوں مر گئے۔ فرشتے آئے اور عورت کو بہشت میں لے گئے اور جم دوتوں نے سنیاسی کی رُوح پر قبضہ جمایا سنیاسی جی نے حیرت سے پوچھا "آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا میں نے تقدس کی زندگی نہیں بسر کی؟ کیا میں نے ہر شخص کو پاکباز ہونا نہیں سکھایا؟ آخر آپ مجھے دوزخ میں کیوں لے جا رہے ہیں اور یہ بدکار عورت جنت میں کیوں جا رہی ہے۔ جم دوتوں نے جواب دیا" یہ سچ ہے کہ یہ عورت بدکار تھی لیکن بڑی حد تک حالات سے مجبور بھی تھی تاہم اس کا دھیان ہمیشہ بھگوان کے خیال میں لگا رہا اس نے پاپ کئے لیکن اس کا دل ہمیشہ نجات کا خواہاں رہا اور آج اُسے نجات مل رہی ہے برعکس اس کے تم نے نیک اعمال ضرور کئے لیکن تمہاری نظر دوسروں کے عیوب پر جمی رہی تم نے صرف پاپ دیکھا اور پاپ کی باتیں سوچیں اس لئے تمہیں آج وہاں جانا ہے جہاں پاپ ہی پاپ ہے"۔

اس کہانی سے جو سبق ملتا ہے وہ ظاہر ہے خارجی صفائی بہت حد تک بے سُود ہے انسان کا دل پاک ہونا چاہیئے اور پاک دل وہ ہے جسے صرف اچھائی نظر آتی ہے برائی نہیں دکھائی دیتی، ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم دُوسروں کی اصلاح کا خود ساختہ کام اپنے سر لیں اور اُونچے منبر پر چڑھ کر وعظ کرتے پھریں، ہمیں بنی نوع انسان کا مربّی یا پاسبان بننے کی عادت ترک کر دینا چاہیئے ہماری کوشش تو صرف یہی ہونی چاہیئے کہ اپنے آپ کو زیادہ سے پاک بنائیں ایسا کرنے سے دوسروں کی مدد خود بخود ہو جائے گی جب ہم عملی طور پر سب کو اپنے برابر سمجھنے لگیں گے جب ہمارے قول و فعل میں پوری مطابقت پیدا ہو جائے گی تو ہم سے رسوا بھلائی کے کاموں کو کچھ اور ہو ہی نہیں سکے گا جب ہم قولاً اخوت اور فعلاً خدمت کا ثبوت بہم پہنچائیں گے تو ہماری زندگی معنی سے بھرپور اور مسرت و نشاط سے لبریز ہو جائے گی۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں زندگی کے تین مدارج ہیں آپ دیکھتے ہیں کہ مادّیات کی دنیا میں طبیعات[1] کا وجود صرف مشاہدات پر منحصر نہیں مشاہدہ سے پہلے اور بعد میں مابعد الطبیعات[2] کا وجود ہے گویا طبیعات مابعد الطبیعات سے محصُور ہے اسی طرح مدرکات کے عالم میں بھی شعور ایک طرف تحت الشعور سے اور دُوسری طرف فوق الشعور سے گھرا ہوا ہے، ہماری عقل کی ابتدا رہوتی ہے۔ غیر عقلی[3] (غیر منطقی تحت الشعوری مصدر سے اور اُسکی انتہا بھی ہوتی ہے۔ غیر عقلی (وجدانی، مافوق الشعوری) باتوں پر اگر مدرکات[4] کی دنیا میں دُور تک چھان بین کی جائے تو ہم ایک ایسی سطح پر جاتے ہیں، جو مدرکات سے پرے ہوتی ہے۔ اگر ہم خود عقل کی عقلیت پر غور کریں تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ عقل بجائے خود مدرکات کا ایک مرتب مجموعہ ہے جسے ہماری یادداشت نے محفوظ کر رکھا ہے۔ ہم اس سے آگے کسی چیز کا تصور ہی نہیں کر سکتے ہماری قوتِ ادراک ہمارے مشاہدات اور احساسات کا دُوسرا نام ہے۔ ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں وہ ہمارے مشاہدات پر منحصر ہے ہماری عقل حواسِ خمسہ میں گھری ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ عقل محدود و محصور ہونے کے باوجود ہمیں کسی ایسی شے کی جھلک بھی دکھاتی ہے جو خود اس کی حدوں سے باہر ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے پاس کوئی ایسا ہتھیار۔ کوئی ایسا وسیلہ ہے جس کی مدد سے وہ عقل کی سرحدوں کو پار کر سکتا ہے۔ تمام عالم کے رشیوں، صوفیوں، پیغمبروں اور اوتاروں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ خود اُن میں وہ شکتی، وہ طاقت موجود ہے جو عقل کی سرحدوں سے دُور جا سکتی ہے اس لئے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ایسی مافوق الفطرت طاقت کی موجودگی عین ممکن ہے لیکن یہ تو قطعی غیر ممکن ہے کہ افکار و مدرکات کی ترجمانی عقل کی زبانی کی جائے جب ہم رُوحانی طاقت کو مافوق الفطرت مانتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ طاقت عقل کے دائرہ میں سما جائے یہی وجہ ہے کہ ہر سادھو سنت نے ہر صوفی نے فرداً فرداً اور مجموعی طور پر کہا ہے کہ وہ اپنے روحانی تجربوں کو بیان کرنے سے قاصر ہے زبانِ بیان یقیناً ان کے لئے الفاظ بہم نہیں پہنچا سکتے بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعی تجربے ہیں اور ہر شخص ایسے تجربوں سے گزر سکتا ہے صرف اسی طریقہ یعنی ذاتی تجربے سے ہی اصلی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے کیوں کہ ان روحانی تجربوں کو کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا، مذہب ہی وہ طریقہ کار ہے، جس سے

۱ـ Physics

۲ـ Metaphysics.

۳ـ Non-reason

۴ـ Perceptions.

یہ تجربے حاصل ہوسکتے ہیں یہی وہ راہِ عمل ہے جس کی منزل ذاتی تجربہ ہے مذہب ایک ایسی سائنس ہے جو انسان کے ماوراکے واسطے سے فطرت کی ماورا[1] حقیقتوں کو جاننے کے راز بتاتی ہے اب تک ہمارا علم خود انسان کے بارے میں نہایت محدود رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کے بارے میں بھی ہمارا علم بہت کم ہے جب ہمیں انسان کے متعلق زیادہ واقفیت ہوجائے گی تو ہم غالباً بلکہ یقیناً کائینات سے بھی زیادہ واقف ہو جائیں گے۔ انسان ہی میں حقیقتِ کائینات کا راز مضمر ہے۔ انسان ہی تمام علم و آگہی کا سرچشمہ ہے بہت کچھ جاننے کے باوجود کائیناتِ عالم کے بارے میں ہماری واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے جیسے لاعلمی کے گھور اندھیرے میں علم کی کرن جھلکتی ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم، ہمارے حواسِ خمسہ اور ہمارے دماغ کے مدرکات[2] و مشاہدات تک محدود ہے، یا یوں کہیے کہ ہماری اپنی نظر ہی محدود ہے خود ہماری آنکھیں ہی گہری نیند کے بوجھ سے بند بند سی ہیں، ایسی حالت میں یہ امر قدرتی ہے کہ ہمارا علم کائینات کے صرف اُن اجزا لاینجزا تک ہی محدود رہے جو ہماری محدود قوتِ مدرکہ ہیں جو ہماری خواب آلود نظروں میں سما سکتے ہیں، ابھی ہم نے وہ وُسعتِ نظر و فکر پیدا نہیں کی جو اپنے آپ میں بنیادی اصولوں کو سمو سکے آج کسی چیز کے مدلل اور معقول ہونے کے معنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری عقل کے اُن مختلف خانوں میں سے کسی ایک میں فِٹ ہوجائے جو ہم نے ادراک کے لئے بنا رکھے ہیں، جب ہمیں کسی نئے واقعہ سے واسطہ پڑتا ہے تو ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اُسے کسی جانے پہچانے دماغی خانے میں ڈال دیں، یہ عمل دلیل اور غور و فکر کا عمل ہے اور یہاں تک درجہ بندی[3] مفید اور کار آمد ثابت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ہمیں تسلی ہوتی ہے، اطمینان ہوتا ہے اور خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ درجہ بندی مادی سطح سے اوپر نہیں اُٹھ سکتی، روحانی تجربات کو ہم اپنے دماغی خانوں میں نہیں ڈال سکتے، ان کے لئے ہمیں حواسِ خمسہ سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اس سطح سے بھی بلند ہوسکتے ہیں ماضی کا ہر عہد اس بات کا گواہ ہے، ہر زمانے میں ایسے انسان ہوئے ہیں جن کو حواس سے بالا ایک نئے ادراک اور احساس کا تجربہ حاصل ہوا ہے۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے اپنشدوں نے اعلان کیا تھا کہ پرماتما کو حواس کے ذریعے نہیں پایا جا سکتا، زمانہ حال کی لاادریت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ غیر مادی اشیاء کا ہمیں علم نہیں ہو سکتا۔

---

[1] Transcendental in nature through the transcenderal in man.

[2] Sense-perceptions. [3] Classification, Categorisation.

یہاں تک تو دونوں میں اتفاق ہے، لیکن جہاں لاادریت سمجھتی ہے کہ غیر مادی چیزوں کا علم ہو ہی نہیں سکتا (اور اسی بنا پر ناستک خدا کی ہستی سے انکار کر دیتے ہیں) وہاں ویدوں کا دعویٰ ہے کہ پرماتما کو پایا جا سکتا ہے، وید محض زندگی کے منفی پہلو پر بس نہیں کرتے، وہ اعلان کرتے ہیں کہ معرفت حاصل ہو سکتی ہے مگر حواس سے اُوپر اُٹھ کر وہ تمام دنیا کو صلائے عام دیتے ہیں کہ انسان حواس کی سرحدوں کے اُس پار جا سکتا ہے، وہ حواس کی اِس منجمد کائنات کو خودی کی گرمی سے پگھلا سکتا ہے، یوں سمجھئے کہ زندگی ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی سطح پر حواس کی برف جم رہی ہے، انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ اس منجمد تہ کو چیر کر زندگی کے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو جائے، ممکن ہی نہیں بلکہ عملی طور پر ہزاروں انسان حواس کے دائرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

اسی محدودیت سے نکل جانے کا نام ہے حصولِ خودی، وصلِ الٰہی۔ معرفت و آگہی۔ سچا گیان کسی صورت میں ادراکِ حواس نہیں اس لحاظ سے ہم برہمہ کو کبھی نہیں جان سکتے لیکن ہماری حقیقی خودی بذاتِ خود برہمہ ہے۔ جزداً نہیں بلکہ کلی طور پر ہم وہی لامحدود برہمہ ہیں جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی یہ جو بظاہر تنوع نظر آتا ہے، یہ جو قسم قسم کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں سب کی سب زمان و مکان کے آئینہ خانے میں ایک ہی حقیقت کا عکس ہیں عین اسی طرح جیسے سورج کا عکس شبنم کے لاکھوں کروڑوں قطروں پر پڑتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ سُورج ایک ہے، ایک سے زیادہ نہیں، سچا گیان بھی یہی ہے کہ ہماری نگاہ کثرت سے ہٹ کر وحدت کے نقطے پر جم جائے۔ یہاں تو بات ہی ایک کی ہے، نہ کوئی داخلی موضوع ہے نہ خارجی، نہ تُو ہے نہ میں، نہ وہ ہے نہ یہ، یہاں تو احساسِ وحدت ہے اور بس، یہاں علم و ادراک کا سوال ہی نہیں اُٹھتا ہے، یہاں حقیقت ہی حقیقت ہے، وحدت مطلق ازلی و ابدی لامحدود و لامنتہا ہمیشہ اور ہر وقت آزاد، قوانینِ فطرت سے بالا اور آزاد، علت و معلول کے بندھنوں سے آزاد، دکھ درد سے آزاد یہ ہے ہماری اصل، جسے ہر انسان پا سکتا ہے بلکہ ہر انسان بذاتِ خود یہی حقیقت ہے، قوانینِ فطرت کی یہ بندشیں علت و معلول یہ زنجیریں، یہ رنج و غم کی بیڑیاں سب کم نظری کا نتیجہ ہیں۔ ان کا کوئی وجود نہیں اڑتے ہوئے بادل کبھی کبھی سورج کو چھپا لیتے ہیں لیکن سورج جیوں کا تیوں قائم رہتا ہے یہی حال ہمارا ہے، ہم ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہیں۔ ہم جنم مرن سے آزاد ہیں زندگی اور موت حقیقت کے پردے ہیں، انسان پیدا نہیں ہوتا نہ وہ مرتا ہے، وہ زمان و مکان میں محدود نہیں، یہ تمام خیالات بس ہمارے ہی من کا پرتو ہیں ہم انہیں غلطی سے حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں اور اس طرح ہماری عظیم الشان حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حواس کا طریقۂ ادراک حقیقت کو محدود کر دیتا ہے، اسی سے زمان و مکان کا خیال پیدا ہوتا ہے ورنہ یہاں تو نہ ماضی ہے، نہ مستقبل، یہاں تو حال ہی حال ہے، اسی طرح

خیر و شر کا وجود بھی نسبتی ہے، خیر کا خیال شر کے خیال سے وابستہ ہے، ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناممکن ہے، ان کا الگ الگ ہونا ایک بے معنی چیز ہے، جب تک ہم تثنیویت یا دوگانگی کو مانتے ہیں بھگوان اور انسان کو، خدا اور بندہ کو الگ الگ سمجھتے ہیں، اس وقت تک ہمیں خیر و شر بھی علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں، اس کثرتِ دید سے نجات اسی وقت ملتی ہے جب ہماری رسائی مرکزِ حیات تک پہنچ جاتی ہے بھگوان سے منسلک اور واصل ہو کر ہی ہم حواس کے دھوکوں سے بچ سکتے ہیں خواہشوں کے تپِ سوزاں سے چھٹکارا پانے اور حصولِ این و آں کی پیاس کو بجھانے کے بعد ہی ہم اس نیرنگِ ہستی کے ظاہری تضاد کو مٹا سکتے ہیں جب تک ہم اس بخار میں مبتلا رہیں گے، جب تک ہم اس سوزِ دروں سے تڑپتے رہیں گے جب تک ہمارے گرم اور خشک ہونٹ پانی کے قطرے قطرے کو ترستے رہیں گے، ہمیں گرم و سرد، نیک و بد، خوب و زشت، کا شدید احساس ہوتا رہے گا ترکِ خواہشات کے بعد اچھے بُرے کا امتیاز باقی نہیں رہتا کیونکہ ہم اس منزل میں خیر و شر کے تصور ہی سے اُوپر اٹھ جاتے ہیں، خواہشیں پوری ہو کر مٹ نہیں جاتیں بلکہ اور بڑھتی ہیں. تکمیلِ آرزو سے جو تسکین ملتی ہے وہ آگ پر تیل کا کام کرتی ہے، خواہشات کی آگ خطرناک طور پر اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے، جیسے گاڑی کے پہیے پر کوئی نقطہ جتنا بھی مرکز سے دُور ہوتا ہے وہ اتنی ہی تیزی سے مرکز کے گرد گھومتا ہے، اسی طرح ہم اپنی حقیقت کے مرکز سے جتنی دور رہیں گے خواہشات کا چکر اتنی ہی تیزی سے چلتا رہے گا کبھی چین نہ ملے گا، کبھی آرام کی صورت دیکھنے میں نہ آئے گی، آؤ ہم اپنے مرکز کے قریب ہو جائیں، اپنی خواہشات کی روک تھام کریں انہیں مٹا ڈالیں، اپنی جھوٹی خودی کو ختم کر دیں، اس طرح ہماری نظر صاف ہو جائے گی، ہمیں بصیرت ملے گی، تابِ جلوہ حاصل ہوگی، خدا کا دیدار نصیب ہوگا، بھگوان کے درشن ہوں گے، اپنی خودی کے اس مقام پر پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم نہ صرف اس زندگی کے سُکھ چین کے بلکہ کسی قسم کی بہشتِ بریں کے عیش و آرام کے خیالات کو بھی یکسر ترک کر دیں، ہمارے دل میں جب تک کسی چیز کی اُمید باقی رہیگی خواہ وہ اس دنیا کی دولت ہو یا کسی اور دنیا کی نعمت، اس وقت تک ہم خواہشات کے غلام رہیں گے، آؤ آج ہم ایک لمحہ کے لئے ہی سہی خواہشات سے بالکل بے نیاز ہو جائیں. ہر خواہش کو گھڑی بھر کے لئے اپنے دل و دماغ سے نکال دیں آپ دیکھیں گے کہ اسی لمحہ اسی گھڑی سب کُہر صاف ہو جائے گا اور ہماری سچی خودی کا سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک اٹھے گا. آخر آشا کس بات کی جب ایک ہی وجود کُل ہے اور وہ خود ہم ہیں، ہمارے سوا اور چیز ہی کیا ہو سکتی ہے یہی معنی ہیں وحدت کے، لا الٰہ الا اللہ کے، جزو کے خیال سے نجات پا کر اور اپنے آپ کو کُل جان کر قانع ہو جانا ہی گیان ہے، معرفت ہے اصلی عرفان اسی قناعت کا نام ہے. جب تک آپ اپنی ہستی سے، اپنی خودی سے انکار کرتے چلے جائینگے آپ کی ہستی ہوگی ہی نہیں ہوگی. یہی کفر ہے لیکن جب آپ اپنی خودی پر یقین لے آئیں گے تو خودی

اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہو جائے گی یہی ایمان ہے معراجِ خودی ہماری منزل ہے اپنی اس سچی خودی کو جگاؤ اس کی پوجا کرو اس کے سوا اور کسی چیز کا وجود نہیں۔ یہی حقیقت ہے، باقی سب کچھ نظر کا فریب ہے۔ مایا ہے۔

VII

خودی کائنات کی ہر چیز کی شرطِ اول ہے لیکن وہ خود مشروط نہیں ہو سکتی، خودی سے ہر چیز کی تشکیل ہوتی ہے لیکن خودی کی اپنی کوئی مخصوص اور محدود شکل نہیں جوں ہی ہم اسے جان لیتے ہیں ہمیں مکتی یعنی آزادی حاصل ہو جاتی ہے فانی انسان کی حیثیت سے تو ہم مُکت یعنی آزاد ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ فنا پذیری اور آزادی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ آزاد[1] فنا پذیری ایک متضاد اصطلاح ہے، فنا کے معنی ہی تغیر کے ہیں برعکس اس کے آزاد صرف غیر متغیر ہی ہو سکتا ہے، اسی کو مکتی حاصل ہو سکتی ہے، صرف آتما آزاد ہے، اور وہی ہمارا اصل جوہر ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ بطون کی اس آزادی کو ہم محسوس کرتے ہیں، مختلف نظریات اور عقائد کے باوجود، ہر شخص کو اپنی خودی کا کم و بیش احساس ہوتا ہے اور ہمارے ہر عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اپنی خودی سے واقف ضرور ہوتے ہیں خواہ وہ واقفیت تحت الشعوری میں کیوں نہ ہو، ہماری خودی یعنی آزاد آتما اور قوتِ ارادی ایک چیز نہیں ہیں، قوتِ ارادی کی ظاہری آزادی ہماری خودی کی اصل آزادی کا ایک پرتو ہے، آتما کی آزادی پر ہی تمام کائنات قائم ہے۔ اگر دنیا محض علت و معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے تو مذہب اور اخلاق کی گنجائش کہیں باقی ہی نہیں رہتی۔ کون کس کی مدد کرے اور کیوں؟ اگر ہمارا ہر عمل علت معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اگر ہمیں کسی بات کا اختیار ہی نہیں تو ہماری ذمہ داری ہی کیا ہے، اور اخلاقیات کی بنیاد ہے ذمہ داری کا قبول کرنا، اگر کوئی کسی ڈوبتے کو سیلِ بے پناہ سے بچانا چاہتا ہے تو اس نجات دہندہ کے لئے زمین کا ایک خشک ٹکڑا تو ہونا چاہیئے جہاں وہ اس بے چارے کو کھینچ کر لا سکے ورنہ وہ اُسے بچا ہی کیسے سکتا ہے اخلاق اور سماج کے قوانین کی اصل ہماری آزادی ہے یہی سنسار ساگر کا کنارا ہے، ہم سب کو اندرونی طور پر احساس ہے کہ ہم با اختیار ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کا کاروبار ہی نہ چل سکتا روحانی ترقی کرنے کا سوال ہی نہ اٹھتا، ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو حقیر سے حقیر سمجھتا ہے، جو اپنی ہستی کو رینگنے والے کیڑے کے برابر سمجھتا ہے، جب گڑگڑا کر سجدے کرتا ہے تو دل ہی دل میں اس کو بھی یہ خیال آتا ہے کہ ایک دن وہ صوفی بن جائے گا سادھو سمت اور

---

[1] Free-mortality

مہاتما ہو جائے گا، اگر اُسے یہ یقین نہ ہو تو وہ رینگ رینگ کر زندگی بسر کرنے پر ہی قناعت کرے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ ہر جاندار کو غیر شعوری طور پر معلوم ہے کہ وہ آزادِ مطلق ہے، اسے اختیارِ کل حاصل ہے، سوال تو یہ ہے کہ اُس غیر شعوری احساس کو منظرِ عام پر کس طرح لایا جائے۔

انسانی زندگی کے دو مقصد ہیں ایک تو گیان یعنی حقیقی آگہی اور دُوسرے آنند یعنی سکونِ کامل یا نشاطِ روح احساسِ خودی یعنی یقینِ آزادی اور اختیارِ کل کے بغیر ان دونوں چیزوں کا حاصل ہونا ناممکن ہے، مگر حقیقت میں یہی دونوں تو ہماری زندگی کا نصب العین ہیں علم و آگہی کے بغیر زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں مسرت اور خوشی کے بغیر زندگی زندگی ہی نہیں کہی جاسکتی اور ان دونوں کا منتہا ہے اپنی یزدانی وحدت[1] کا احساسِ شدید جب ہمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے تو نیک و بد، خیر و شر، ثواب اور گناہ ہر چیز کا فرق اس طرح مِٹ جاتا ہے کہ ہمیں اپنے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا اگر کوئی گناہ گار ہے تو خود ہم ہیں اس احساسِ وحدت سے محرک ہو کر (عام اصطلاح میں) ہم دُوسروں کے لئے جیتے ہیں، ہم سب گناہ گاروں کے لئے آنسو بہاتے ہیں، سب غریبوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی غریبی اور مصیبت کو جھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ خدمتِ خلق ہمارا طریقہ کار ہو جاتا ہے، ہم اپنی زندگی سیوا کے لئے وقف کر دیتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کائینات کا ابدی قانون ایثارِ نفس ہے، غلبۂ نفس نہیں، آخر کون کس پر غلبہ پائے جب سب ایک ہی ہیں جب چاروں طرف ایک ہی آتما ہے تو پھر حقوق کے کچھ معنی نہیں رہتے، جب من و تو کا تصور ہی مٹ جائے تو میرا کسی پر کیا حق رہ جاتا ہے اگر ہمیں کوئی حق ہے تو خدمتِ خلق کا حق ہے، یہی سچی پُوجا ہے کیونکہ اس کا محرک پریم ہے، اور پریم ہی بنیادی حقیقت ہے، پریم ہی سب کچھ ہے۔ پریم ہی بھگوان ہے، پریم ہی پُجاری۔

اسی صداقت کی تعلیم حضرتِ عیسےٰ نے دنیا کو دی لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے، آؤ آج ہم ان کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کر کے دیکھیں۔ آؤ آج ہم محبت اور اخوت کو اپنا مسلک بنائیں پھر دیکھیں کہ دنیا کو نجات ہوتی ہے کہ نہیں، افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے محبت کے بجائے نفرت کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ یہ راہ ہمیں بربادی کی حد تک لے آئی ہے۔ یاد رکھیئے ہماری مشکلوں کا حل صرف بے غرضی ہے، خود سُپردگی ہے، خود غرضی نہیں، آؤ ہم اپنے حقوق کے خیال کو ترک کر دیں "حق کا تصور بجائے خود ہمیں محدود کر دیتا ہے "میرا" اور "تیرا" کا امتیاز ہی حق کے خیال کو جنم دیتا ہے یہ دراصل میرا تیرا کچھ نہیں ایک وحدت ہی وحدت ہے۔" میں تو ہوں[2] اور

---

[1] Eternal unity.

[2] I am thou and thou art I

تو میں ہے" پھر یہ حقوق کیسے آئے ہم اپنے اختیارِ کل کو محسوس کریں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اعلانیہ کہیں کہ ہم فلاں فلاں نام کے فرد نہیں ہمارا نام "جانؔ" نہیں "میریؔ" نہیں یہ سارے نام اور روپ ہمیں محدود کر دیتے ہیں، ہماری وسعتیں کائنات کی وسعتیں ہیں، ہمیں نام کی حد بندیوں سے فریب نہیں کھانا چاہیئے نام سے ہم اپنی آزادیٔ مطلق کو کھو کر غلام بن جاتے ہیں مثلاً اگر میں خیال کروں کہ "میں جان ہوں" تو میرا احساسِ کُلی فوراً مٹ جاتا ہے، اور پھر میں بطور ایک جزو کے بھٹکنے لگتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ یہ چیز بھی میرے قبضے میں آجائے اور وہ چیز بھی میری ملکیت بن جائے۔ سوچا جائے تو یہ اپنے بھولے ہوئے احساسِ کُل کو بیدار کرنے کی ایک صورت ہے۔ اس طرح میں دنیا کی دھن دولت وغیرہ حاصل کر کے خود کو بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں میں اپنے احساسِ کمتری کو مٹا کر اپنی ہستی کو عظیم بنانا چاہتا ہوں گویا میں اپنی بھولی ہوئی عظمت کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اور "میں" اور "میرا" کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح چل نکلتا ہے کہ پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ امتیازات اور تفرقات کی زنجیریں پاؤں میں پڑتی چلی جاتی ہیں اور "میرا" "تیرا" کے ہر نئے امتیاز اور ہر نئی تفریق کے ساتھ ساتھ میری غلامی بڑھتی جاتی ہے اور میں (اس لپیٹ میں آکر) ابدی وحدت اور غیر منقسم لامحدودیت سے دور ہوتا چلا جاتا ہوں۔

ہمیں اس بھول سے بچنا ہے، ہمیں یاد رکھنا ہے کہ الگ الگ انفرادیت کوئی شے نہیں ہستی تو بس ایک ہے، انفرادیت ہے تو یہی ایک ہے اور ہم سب "وہی" ہیں۔ یہ وحدت ہی محبت ہے، پریم ہے، اسی کا دوسرا نام بیگانگی ہے، تفریق، نفرت اور خوف پیدا کرتی ہے، جہاں ہم نے تفریق کو مٹایا محبت اور بے خوفی کا چشمہ[2] پھوٹ پڑتا ہے۔ وحدت ہمارے سب قوانین کی حد بندیوں کو مٹا کر انہیں اس قدر وسعت بخش دیتی ہے کہ زندگی

---

[1] John, Mary

[2] مثلاً اگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی فرق ہے تو میں آپ پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتا جتنا مجھے اپنے آپ پر ہوتا ہے، جہاں پورا اعتبار نہیں وہاں شک پیدا ہوتا ہے، شک خوف میں بدل جاتا ہے، خوف نفرت کو جنم دیتا ہے اور آخر یہ ظاہری تفرقات خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اگر دو بھائی اپنے آپ کو ایک سمجھتے ہیں یا دو ہم مذہب، ہم قوم، ہم نسل، ہم وطن یا ہم زبان آدمی ایک دوسرے میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تو ایسی حالت کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی اب آپ سوچیئے کہ اگر ہمارا فلسفۂ حیات ہمارا اعتقاد و ایمان اور ہمارا طریقۂ عمل یہ ہو کہ ہم سب دراصل ایک ہیں تو کیا یہ احساسِ وحدت ، محبت اور اخوت میں تبدیل نہیں ہو جائے گا۔ یہی ہے محبت اور اخوت جس کا ہر پیغمبر اور اوتار نے پرچار کیا ہے اور جس کی بنا خود اُنکے

کا بس ایک ہی ہمہ گیر قانون رہ جاتا ہے، ہم اس دھرتی پر چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا کر رہتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اپنی چار دیواری میں محفوظ ہو گئے ہم اپنے آپ کو قید کر کے خوش رہتے ہیں اور کسی کو اپنے گھر میں نہیں گھُسنے دیتے لیکن ہم آکاش کی وسعتوں کو تو محدود نہیں کر سکتے یہی وسعتیں ہماری منزل ہیں، میں جانتا ہوں کہ بعض اصحاب عالمِ بالا کو بھی اپنی خاص ملکیت بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی یہ کوشش محض بے سُود ہے مثلاً کچھ گروہ بند مذاہب کہتے ہیں کہ نجات صرف انھیں کے بتائے ہوئے راستے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے باقی سب راستے غلط ہیں لیکن کہاں تک، آخر اگر خدا سچ ہے اور اس کے پیغمبر سچے ہیں اور وہ خدا کو پانے کا سچا رستہ بتاتے ہیں تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک رستہ غلط ہے اور دُوسرا صحیح، یا تو سب راستے صحیح ہیں یا سب غلط ہیں ۔ ہمارا مقصد تو یہ ہونا چاہیئے کہ ان چھوٹے چھوٹے دینی اور دنیوی گھروندوں کو منہدم کر دیں تاکہ یہ حدیں زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جائیں حتےٰ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں اور ہمیں صاف دکھائی دینے لگے کہ تمام مذاہب ہم کو خدا تک پہنچانے والے ہیں ہمیں آخر اپنی محدود انفرادیت کے شعور سے آگے گزرنا ہو گا، ترکِ نفس ہی مذہب میں سب سے بڑی قربانی ہے عیسائیت میں یہ فلسفۂ حیات بپتسمہ[1] کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جس کے معنی درحقیقت یہ ہیں کہ انفرادیت کی موت وحدتِ حیات کی زندگی ہے، پرانی انفرادی اور محدود زندگی کو خیرباد کہہ کے نئی کائیناتی اور لامحدود زندگی کا آغاز کرنا ہی روحانیت ہے، محدود شخصی خودی کی ہلاکت سے ہی غیر شخصی لاانتہا کائناتی اور واحد عظیم خودی لیتی ہے اس احساسِ خودی کو ہی آتما کہو یا پرماتما بس تمام دنیا میں اسی ایک کی ہستی ہے باقی سب مایا ہے، فریبِ نظر ہے۔

جس بلند فلسفۂ حیات کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس کا ماخذ وید ہیں، لیکن ویدوں میں مختلف قسم کا اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ویدوں میں مذہبی افکار کی ارتقاء کے مختلف مراحل کو برقرار رکھا گیا ہے، ویدوں کے مطالعہ سے مذہبی خیالات کی درجہ بدرجہ نشوونما کا پتہ چلتا ہے یہاں ابتدائی تصورات سے لے کر اعلیٰ ترین فلسفہ سب محفوظ رکھے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رشیوں نے یہ راز بخوبی سمجھ لیا تھا کہ یہ عالمِ مخلوقات ابدی ہے اور اس میں ہمیشہ اور ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے جنہیں آگہی حاصل کرنے کے لئے ابتدائی منازل سے گزرنا ہو گا۔ بلند اور اعلیٰ فلسفہ ہر شخص کی دسترس میں نہیں آسکتا، تقریباً ہر مذہب میں حقیقت

(بقیہ حاشیہ) اپنے قائم و دائم احساسِ وحدت پر رکھی گئی ہے (ایڈیٹر)

[1] Baptism

کی صرف آخری اور ارفع منازل کا ذکر کیا گیا ہے فقط ان حقیقتوں کو محفوظ کرنے کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ابتدائی افکار و تصورات ضائع اور مسترد ہو گئے چونکہ ان بلند حقیقتوں کو سمجھنے والے کم ہی لوگ ہوا کرتے ہیں اس لئے رفتہ رفتہ اکثر اشخاص کے لئے مذہب ایک بے معنی نظریوں کا مجموعہ سا بن کر رہ گیا یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں اور خصوصاً ہمارے زمانے میں قدیم روایات اور دینی احکام کے خلاف بغاوت نظر آتی ہے آجکل کا پڑھا لکھا آدمی دینی احکام کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ بڑی جرأت اور دلیری سے ہر دینی حکم اور ہر قدیم روایت کو چیلنج کرتا ہے وہ ہر اُس چیز کے وجود سے جسے عقل تسلیم نہیں کرتی انکار کر دیتا ہے وہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر ان احکام کو کیوں قبول جائے، اُن کی پیروی کرنے کی معقول وجہ کیا ہے؟ مثلاً خود عیسائیت میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو دراصل لامذہبی کے زمانے کے تصورات اور رسُوم کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، ان پُرانے اعتقادوں کے نام بدلنے سے یا انہیں نئی صورت دینے سے اُن میں یکسر نئے معنی پیدا نہیں ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کو سمجھنے اور قبول کرنے میں دِقت پیش آتی ہے۔ اگر ان کے قدیم ماخذ محفوظ رکھے جاتے اور اُن میں عبوری تبدیلیوں کے اسباب بھی اچھی طرح بیان کر دئے جاتے تو بہت سی باتیں صاف ہو جاتیں اور لوگ انہیں بخوبی سمجھ لیتے اور بآسانی قبول بھی کر لیتے۔

ویدوں میں پرانے افکار کو جیوں کا تیوں محفوظ رکھا گیا ہے لیکن جیسا کہ رُوحانی ارتقار کا تقاضا تھا۔ ان پُرانی باتوں کی وضاحت و تفسیر کر دی گئی ہے یہاں تک کہ بے شمار موٹی موٹی شرحیں لکھی گئیں جنہوں نے کسی حد تک حقائق کو دبا بھی دیا ہے اور جن کی بدولت ایسی چیزیں بھی مذہبی رسم و رواج کا جز و بن گئیں جو بالکل بے معنی ہو چکی تھیں، آج بھی ویدک رسوم میں کچھ ایسے الفاظ دہرائے جاتے ہیں جو فقط کسی بھولی بسری زبان کی یادگار ہیں لیکن جن کے معنی سمجھنے سے ہم قاصر ہیں بہرحال میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسیحی عہد سے ہزاروں سال پہلے ارتقار کے تصور کا عملی ثبوت آپ کو ویدوں میں ملتا ہے، اگرچہ یہ ضرور ہے کہ جب تک ڈارون نے نظریہ ارتقا کی حقیقت کو دنیا کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ اُس وقت تک لوگ اُسے ہندوؤں کا محض وہم ہی سمجھتے رہے۔

ویدوں کے متعلق دُوسری ضروری بات یہ ہے کہ ان کے دو حصّے ہیں ایک کرم کانڈ یعنی وہ حصہ جس کا تعلق دینی عمل "یا کرم" سے ہے اور دُوسرا گیان کانڈ یعنی وہ حصہ جس کا تعلق معرفت یا برمھ گیان سے ہے، کرم کانڈ میں پرارتھنا اور عبادت کے تمام طریقے درج ہیں۔ ان میں خارجی چیزوں پر زور دیا گیا ہے۔ پُوجا پاٹھ، یعنی عبادت کے یہ طریقے بجائے خود سب کے سب اچھے ہیں بشرطیکہ آدمی خارجی رسوم میں ہی پھنس کر نہ رہ جائے بلکہ اُن پر بے غرضی اور بے لوثی کے جذبہ سے عمل کرے۔ بات یہ ہے کہ عبادت خواہ کسی طریقے سے کی جائے

اُس سے تزکیۂ قلب ہوتا ہے۔ ہاں اتنا ہمیشہ یاد رہنا چاہیئے کہ خارجی رسوم یا طرزِ عمل بجائے خود عبادت نہیں عبادت تو اس جذبۂ خلوص کا نام ہے جو مندر میں مُورتی کے آگے سر جُھکاتے مسجد میں نماز پڑھتے یا گرجے میں دُعا کرتے وقت دل میں پیدا ہوتا ہے۔ سچا کرم یوگی (عابد) وہی ہے جو اپنی نجات سے پہلے دُوسروں کو نجات دلانا چاہتا ہے بلکہ وہ تو دوسروں کی نجات ہی میں اپنی نجات سمجھتا ہے جیساکہ کہا گیا ہے" بھگوان کرشن کے سیوکوں کی سیوا ہی سب سے اُونچی پُوجا ہے" یعنی خدا کے بندوں کی خدمت ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے، ہمارے ایک بڑے رشی کی پرارتھنا یہ تھی کہ" دنیا بھر کے پاپوں کے پرائشچت کے لیٔے مجھے نرگ میں ڈال دو لیکن میرے بھگوان اس سنسار کو نجات دیدو" دیکھا آپ نے سچی عبادت کا بلند مقام، عابد کو تمام جہان کے گناہوں کے لئے دوزخ کی آگ میں جلنا منظور ہے تاکہ سب لوگوں پر رحمت کی بارش ہو، یہ ہے سچی عبادت جس کا نقش ایثارِ نفس کی شکل میں اُبھرتا ہے انسان محض دُوسرے انسانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ حیوانوں کے لئے بھی اپنی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے، ایک سنت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے دعا کی کہ خداوندا میرے اس وفادار کتّے کو جس نے عمر بھر میری خدمت کی ہے، اپنی جنت میں جگہ دینا میں جو کچھ بھی نیک کام اس دنیا میں کر پایا ہوں ان سب کا صلہ اسے مل جائے اور اگر اس کی خاطر مجھے دوزخ بھی جانا پڑے تو میں تیار ہوں۔

ویدوں کے دوسرے حصہ یعنی گیان کانڈ کی تعلیم یہ ہے کہ نجات فقط سچے گیان یعنی حقیقی آگہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ پوجا پاٹھ عبادت وریاضت سب اپنی جگہ پر دُرست ہیں لیکن نجات کے لئے گیان یعنی معرفت لازمی ہے۔ معرفت ہی انسان کا مقصدِ حیات ہے خود آگہی ہی عارف کا سچا علم ہے۔ خودی ہی اس کا واحد موضوع ہے وحدت کثرت میں نمایاں ہو کر اپنے آپ کو پانے میں اور اپنی وسعتوں کا احاطہ کرنے میں کوشاں ہے، حقیقت مظاہر میں منعکس ہو کر خود اپنا جلوہ دیکھ رہی ہے جتنا ہی اچھا آئینہ ہوگا اتنا ہی اچھا عکس بھی، انسان قدرت کا سب سے اچھا آئینہ ہے انسان جتنا زیادہ پاک اور صاف ہوگا اتنا ہی صاف اور پاک خدا کا جلوہ اپنے اندر دیکھ پائے گا، یہ ہماری غلطی ہے، کم نگاہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے خدا سے علیحدہ سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنی ہستی کو اپنے جسم تک محدود قرار دیتے ہیں، یہ غلطی یہ کم نگاہی "مایا" کی بدولت پیدا ہوتی ہے، اس "مایا" کی تفصیل میں پھر کبھی بیان کروں گا لیکن یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مایا دراصل کوئی فریب یا چھلاوہ نہیں، یہ اس حالت کا نام ہے جب ہم حقیقت کو حقیقت نہیں بلکہ کچھ اور سمجھ بیٹھتے ہیں بہرحال جب ہم اپنے آپ کو صرف جسم سمجھ لیتے ہیں تو مساوات و موافقت کی جگہ تفریق اور عدم مساوات لے لیتی ہے جس کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ نکلتا ہے کہ دنیا میں حسد کشمکش اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوجاتے ہیں، دُکھ درد اور غم ہماری جبلی مسرت

اور تسکین قلب کی جگہ قابض ہوجاتے ہیں اور ہم خوشی اور آرام سے محروم ہوجاتے ہیں اِسی لئے کہا ہے کہ "جہالت اور تفریق دکھوں اور غموں کے دو ماخذ ہیں۔"

جب انسان حوادثِ روزگار کے کافی طمانچے کھالیتا ہے تو اس کے دل میں اس آئے دن کی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی آرزو جاگ اٹھتی ہے۔ وہ سب بندھن توڑ کر آزاد ہونا چاہتا ہے اور دھرتی کی اس بوجھل زندگی سے بچنے کے ذرائع تلاش کرتا ہے وہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر اس محنت و مشقت اس رنج والم کے سلسلہ کے معنی کیا ہیں اس طرح اُس کے اندر گیان یعنی آگہی حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوتی ہے وہ اپنی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہی خواہش جب آہنی ارادہ بن جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو پاکر آزاد ہوجاتا ہے، دنیا کے تمام بندھن اس کے لئے ٹوٹ جاتے ہیں اس کا کوئی فرض باقی نہیں رہتا، آزادِ مطلق کو بھلا وہ کون سی طاقت ہے جو کسی چیز کے لئے مجبور کرسکتی ہے، وہ کارِ خیر کرتا ہے لیکن اس لئے کہ دُوسروں کا بھلا کرنا اس کی فطرت ہے، اس لئے نہیں کہ وہ کسی موہوم فرض سے مجبور ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی خوشی سے کرتا ہے مجبوری سے ہرگز نہیں دنیا اس کی نظر میں ایک بڑی بھاری مشین کے برابر ہے، وہ دور کھڑا اس کا تماشہ کرتا ہے وہ اس مشین کے پہیے کو چھو کر چکر میں نہیں پڑتا ہے اس کے لئے "بازی زکنارِ دریا بہتر است"۔

مکمل آزادی کا یہ مقام اُن ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے جو نفسِ فاسد کو تسخیر کرچکے ہوں، وہ لوگ اس سے بہت دور ہیں جو ابھی حواس کے غلام ہیں، آزاد منش جسم میں نہیں رُوح میں بس کر زندگی بسر کرتا ہے، وہ تمام قوانین فطرت کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے اس کے لئے سب بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ زندگی اور موت کے چکر سے نکل کر پوری طرح آزاد ہوجاتا ہے اس کے لئے کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، کوئی خامی کوئی کمی نہیں رہتی وہ ہر طرح سے کامل ہوجاتا ہے۔

فطرت ہماری اپنی ذات کا آئینہ ہے، زندگی ہماری ذات کا پرتو ہے، ہماری قوت عمل کی حد ہوتی ہے، خواہشات کی کوئی ایک حد نہیں اِس لئے ہم کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کی محنت او مشقت کا پھل بھی ہم کو مل جائے۔ ہم دُوسرے انسانوں کو غلام بناتے ہیں۔ اُن کے دست و بازو پر قبضہ پاکر خود محنت و مشقت نہیں کرنا چاہتے۔ ہم مشینیں ایجاد کرتے ہیں تاکہ محنت سے بچ جائیں لیکن یہ طریقہ ہماری بہبودی اور ترقی کا طریقہ نہیں تکمیلِ آرزو کے ساتھ ساتھ تخلیقِ آرزو کا عمل بھی جاری رہتا ہے خواہشات پوری ہوکر اور بڑھتی ہیں یہاں تک کہ اُن کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی تمام عمر ان بڑھتی ہوئی خواہشوں کو پورا کرنے میں گزر جاتی ہے، اور مرتے دم تک ہمارے دل و دماغ بے شمار ناآسودہ آرزوؤں اور ارمانوں سے بھرے رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ان خواہشات کی تکمیل کے لئے بار بار جنم لینا پڑتا ہے، اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہمیں یہ احساس نہیں ہوجاتا کہ خواہشات

کی تکمیل ایک بے سود تلاش ہے، خواہشات نہ کبھی پوری ہوئی ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہمیں انسان کا قالب چوراسی لاکھ جنم بھگتنے کے بعد ملتا ہے۔ اور یہی وہ مقامِ ارتقا ہے جہاں ہماری سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ ہماری نجات ترکِ خواہشات میں ہے تکمیلِ آرزو میں نہیں، اسی لئے تو حضرت عیسےٰ نے کہا ہے "خواہشات کو مار ڈالو اور اُن سے چھٹکارا پالو" نجات یعنی حصولِ خودی کا بس یہی واحد راستہ ہے، خواہشات کو مٹا کر علت و معلول کے چکر کو توڑ ڈالو اور آتما سے آگاہ ہو جاؤ اگر علّت و معلول کا یہ سلسلہ غیر مختتم ہے تو نجات ممکن ہی نہیں، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے، اس سلسلہ کو توڑا جا سکتا ہے، نروان حاصل ہو سکتا ہے سوال تو ہے اپنی اس ظاہری خودی کو معدوم کرنے کا جو علّت و معلول کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، آزادی، اور نجات کے معنی ہی یہی ہیں کہ حوادث کے دائرے سے نکل جاؤ دراصل تمام مذہبی، اور اخلاقی تعلیم کا لب لباب یہی ہے۔

ہماری اصل فطرت پاک ہے۔ اس کے ناپاک ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، ہماری اصل خیر ہے۔ اس میں شر کا گزر کہاں، ہم ہمیشہ آزاد ہیں، ہمارے لئے کہیں کوئی بندھن نہیں۔ ہماری حقیقت وحدت ہے، دوئی یا کثرت تو محض ایک وہم ہے، مانا کہ جب ہم اپنے حواس سے خدا کی ہستی کا ادراک کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جب ہم اپنی آنکھوں سے اس کا جلوہ دیکھنے کا تصور کرتے ہیں یا کانوں سے اس کے متعلق سنتے ہیں یا زبان سے اس کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اُسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں اور اُسے مختلف صورتوں میں ڈھال لیتے ہیں لیکن چُنیں وچناں کا یہ تمام سلسلہ دراصل ایک وحدت پر مبنی ہے، وہ تو ایک ہے، ہمیں نے اس میں رنگا رنگی اور تنوع پیدا کر رکھا ہے، دراصل یہ سب ایک ہی خواب کی تعبیریں ہیں۔ نروان یا نجات کے معنی یہ نہیں کہ ہم بدل کر کچھ اور ہو جاتے ہیں، اس کا فقط یہی مطلب ہے کہ ہم اپنی سچی خودی کو پا لیتے ہیں۔ خود آگہی کسی نئی چیز کے حاصل ہونے کا نام نہیں، ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جانے کی حالت ہی خود آگہی ہے۔ یہ وہ حالت ہے جب ہماری حقیقت اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی لئے تو مہاتما بُدھ نے کہا ہے کہ غم اور دکھ جہالت اور تفریق کا نتیجہ ہیں۔ یہی فلسفہ ہے جسے ویدانت وادیوں نے بھی قبول کیا ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی تفسیر آج تک مہیا نہیں ہوئی۔ یہ اس عظیم الشان ہستی اس مہاتما کی حیرت انگیز بصیرت کا ثبوت ہے، جس نے ہمیں ہمیشہ کے لئے نجات کا رستہ دکھا دیا، آؤ ہم بھی دماغی دلیری کا ثبوت دیں، آؤ ہم بھی جہالت کو دور کریں۔ تفریق کے توہمات کو مٹا دیں اپنی ارادت اور عقل کے مطابق ہم اظہارِ خودی کا جو بھی راستہ اختیار کریں، اس پر ثابت قدمی سے گامزن ہوں اور آخر کار منزلِ خودی پر پہنچ جائیں صرف شرط ہے تو یہی ہے کہ ہمارے ارادے اور خلوص میں کمی نہ آنے پائے، بہادروں کی طرح ہمارے

قدم کبھی نہ ڈگمگائیں آخر ہم کامیاب ہوں گے۔'

نجات کا سب سے آسان طریقہ ہے خلوص و محبت، بھگوان سے پریم، خدا سے عقیدت، خدا کو ڈھونڈ خدا تمہیں یقیناً مِل جائے گا۔ جیسے زنجیر کی ایک کڑی کو مضبوطی سے پکڑ لینے سے تمام زنجیر تدریجاً ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہے، اس طرح بھگوان کو پانے کا کوئی بھی طریقہ مصمم ارادہ سے اختیار کر لینے پر بھگوان ہمارے بس میں آجاتے ہیں۔ جس نے بھگوان کی سچے دل سے تلاش کی ہے بھگوان اُسے ضرور ملے ہیں اور بھگوان کو پا کر سب کچھ مِل جاتا ہے۔ درخت کی جڑ میں پانی دینے سے سارا درخت ہرا بھرا ہو جاتا ہے پتے پتے کو پانی دینے کی کوشش بے سود ہے۔

پربھو ملن کی لگن، وصلِ خدا کی آرزو ایک نہایت ہی نرم و نازک پودا ہے۔ مقدس مذہبی کتابیں 'ویدا ور پُران، انجیل اور قرآن' وہ چھوٹے چھوٹے خوب صورت گملے ہیں جن میں یہ پودا اُگایا جاتا ہے لیکن اِن گملوں میں یہ پودا پروان نہیں چڑھتا۔ ان سے نکل کر اُسے اپنی جڑیں کائنات کی حقیقتوں کی زمین میں پھیلانا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مندر مسجد۔ گرجے شوالے۔ فلسفیانہ نظریئے۔ مختلف دینی مسلک اس ننھے مُنے پودے کی محافظ جھاڑیاں ہیں جب یہ پودا جوانی میں قدم رکھتا ہے تو اُسے ان جھاڑیوں کی ضرورت نہیں رہتی اس درجہ میں پہونچ کر ان سب کو توڑ پھینکنا چاہیئے تاکہ اُسے کھلی ہوا اور روشنی میسر ہو اور آخر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اور اپنے توانا اور مضبوط بازوؤں میں تمام رنگ و جمال اور نور و نکہت کو سمولے۔ آخر ہم محض خاکی نہیں ہیں نوری بھی ہیں۔ ہماری یہ دھرتی ہی نہیں آسمان بھی ہمارا ہے، ہمارا مقامِ جہانِ رنگ و بو ہی نہیں ہے، ہماری رسائی چاند، سورج اور ستاروں تک بھی ہے بلکہ "ستاروں سے آگے جو جہان اور بھی ہیں" وہ بھی ہمارے ہیں، ہماری روح زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے، ہم اپنے جسم سے بھی آزاد ہیں، یہ بھی ہماری بے کنار وسعتوں کو محدود نہیں کر سکتا، آپ خود اس حقیقت کو محسوس کریں یا نہ کریں لیکن مجھے پورا یقین ہے اور میں اعلانیہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اس جہان میں ہر روشن نگاہ ہر چشمِ بینا، میری ہی نظر ہے، ہر زبان جو بھگوان کے گن گاتی ہے، میری ہی زبان ہے اور وہ قدم بھی میرے ہی قدم ہیں جو راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں، سب ہاتھ میرے ہاتھ ہیں خواہ ان سے نیک کام سرانجام ہوں یا بُرے۔ تمام کائنات میرا جسم ہے، میں بُری بھلی ہر چیز میں سمایا ہوں۔

آیئے آپ میرے ساتھ اس احساسِ خودی میں شریک ہوں، ہم سب ایک ہیں یوں سمجھئے کہ ہم ایک صاف و شفاف نگینہ ہیں جس پر تمام عالمِ کائنات کا عکس پڑ رہا ہے لیکن ہم بجائے خود قائم ہیں ایک ہیں شہود کی صورتوں سے بے نیاز، یا ہماری مثال ایک جادوگر کی سی ہے جو جادو کی چھڑی گھما کر قسم قسم

کے من مانے تماشے دکھاتا ہے، لیکن یہ نیرنگیِ تماشہ حقیقت نہیں ہمیں اس سے پرے جانا ہے اور اپنی خودی سے آگاہ ہونا ہے یہ دنیا ایسی ہے جیسے کیتلی میں پانی ڈال کر کھولنے کے لئے رکھا ہو، پہلے ایک بلبلہ آتا ہے، پھر دوسرا، پھر ایک ساتھ بہت سے بلبلے اُٹھتے ہیں یہاں تک کہ سارے پانی میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور آخرکار تمام پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے، اس دنیا میں وقتاً فوقتاً جو بڑے بڑے گرُو اور آچاریہ، پیغمبر اور اوتار نازل ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، وہ سب اُن بلبلوں کی طرح ہیں جن کی دیکھا دیکھی پانی کے دوسرے قطرے بھی جوش میں آتے ہیں اور اس طرح پانی کھولنے کی ابتدا رہوتی ہے، لیکن آخر میں تو تمام مخلوقات کو جوشِ خودی میں آکر کثرت کے پانی کی صورت کو چھوڑ دینا ہے اور وحدت کی بھاپ بن جانا ہے، احساسِ وحدت ہماری منزل ہے، یہ تخلیق و ارتقا کا سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے، تخلیقات کے سرچشمہ سے تازہ پانی پھوٹتا رہتا ہے اور دُنیا کے دُکھ سُکھ کی آگ ہر قطرے کو آخر اسے نام اور رُوپ کی مایا سے بلند و بالا کر دیتی ہے۔

اس لحاظ سے مہاتما بدھ اور حضرت عیسٰے دو عظیم الشان بلبلے ہیں ان کی روحیں عظیم روحیں تھیں وہ خود آزاد ہو گئے اور دوسروں کو آزادی کی راہ دکھا گئے یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے اگر پانی صاف نہ ہو تو کھولتے ہوئے بلبلے بھی پانی کی کثافتوں کے حامل ہوتے، اوتاروں، پیغمبروں، گرُوؤں اور آچاریوں، بزرگوں اور مرشدوں کے ساتھ ان کے گرد و نواح، ان کے سماجی ماحول کے تاثرات بھی رہتے ہیں، ان تاثرات کو بعض نکتہ بین اشخاص معائب کا نام بھی دے بیٹھتے ہیں لیکن درحقیقت اس سے اُن کی عظمت و شان میں کوئی فرق نہیں آتا، ہمیں تو اُن کے محاسن، اُن کے کمال پر نظر ڈالنا چاہیئے مثلاً حضرت عیسٰے سامی[1] النسل تھے، اس قوم میں عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ عورتوں نے ان کے لئے سب کچھ کیا انہوں نے ایک عورت کو بھی اپنے خواصین میں شامل نہیں کیا اور اپنا پیغام بر نہ بنایا، لیکن اس سے حضرت عیسٰی کی عظمت میں بحیثیت ایک دینی رہبر اور پیغمبر کے کوئی فرق نہیں آتا مانا کہ وہ سماج کی مجبوریوں سے عورتوں کو مردوں کے مساوی درجہ نہ دے سکے لیکن اُن کا درِ رحمت تو سب کے لئے برابر کھلا رہا۔ برعکس اس کے آریاؤں نے مذہبی معاملات میں کبھی بھی مرد اور عورت کی تمیز روا نہیں رکھی ویدوں اور اُپنشدوں میں خود بیشتر عورتوں نے عظیم صداقتوں کی تعلیم دی ہے اور رشیوں کا درجہ پایا ہے اُن عورتوں کا ادب اور احترام عین اسی طرح کیا گیا ہے جیسے مردوں کا کیا جاتا ہے۔ مہاتما بدھ نے بھی عورتوں کو برابر کا درجہ دیا ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر کبھی کوئی دینی رہبر کسی ایک آدھ موقع پر اپنی جسمانی

---

[1] سامی Sematic

سماجی یا قومی مجبوریوں سے خود اپنے معیار پر پورا نہیں اُتر پاتا تو اس سے اُس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا یہ عظمت بدستور برقرار رہتی ہے۔

VII

دُکھ اور سُکھ دونوں زنجیریں ہیں۔ ایک زنجیر سونے کی ہے اور دوسری لوہے کی لیکن دونوں زنجیریں ہمیں جکڑنے کے کام آتی ہیں اور دونوں یکساں طور پر مضبوط ہیں؛ دونوں ہی ہمیں اپنی اصلی فطرت، اپنے مرکز کی طرف جانے سے روکتی ہیں، آتما دکھ اور سکھ دونوں سے بالا ہے، دکھ سکھ تو صرف آنی جانی کیفیتیں ہیں جو ہر آن بدلتی رہتی ہیں روح کی خاصیت سکون اطمینان اور آنند ہے جو غیر متغیر ہے، ہمیں اس آنند کو کہیں سے حاصل کرنا نہیں، یہ تو ہماری اصل ہے، ہماری ملکیت ہے۔ آؤ ہم اپنی آنکھوں سے کثافت کے پردے ہٹا کر دیکھیں کہ ہماری حقیقت کیا ہے۔ آؤ ہم اپنی خودی کی چٹان پر کھڑے ہو کر پورے سکون و اطمینان سے اس دنیا کے تماشے پر نظر ڈالیں یہ سنسار تو محض بچوں کا کھیل[1] ہے اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر ہم اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں تو ہمیں اپنی مذمت سن کر دکھی ہونے کے لئے بھی آمادہ رہنا ہوگا۔ دکھ سکھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے، حواس کی راحتیں اور کلفتیں دونوں نقش بر آب ہیں، پیدا ہوتے ہی مٹ جاتی ہیں یہی حال دماغی مسرتوں اور کلفتوں کا ہے۔ سچی اور بے لاگ خوشی تو ہمارے اندر موجود ہے؛ اس نشاطِ داخلی کو خارجی اسباب کے سہارے کی ضرورت نہیں، "یہی وہ مسرتِ خودی ہے جسے دنیا مذہب کے نام سے پکارتی ہے" ہمارے باطن میں جتنا زیادہ آنند ہے اتنے ہی ہم روحانیت کے نزدیک ہیں ہم اس سنسار سے سکھ حاصل نہیں کر سکتے، اس سے سکون حاصل کرنے کی امید ایک خام اُمید ہے، اصلی سکھ اور چین ہمارے اندر موجود ہے، جب تک یہ بات ہماری سمجھ میں پوری طرح نہیں آجائے گی، ہم دنیا کے سکھ دکھ کے چکر میں پڑے رہیں گے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کچھ مچھیروں کے گھروندوں کو طوفان نے گھیر لیا۔ مچھیروں کی غریب عورتوں نے بھاگ کر ایک امیر آدمی کے باغ میں پناہ لی وہ امیر آدمی ان کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا اُس نے انہیں کھلایا پلایا اور آرام کرنے کے لئے اپنا خس خانہ[2] ان کے حوالے کر دیا، یہاں چاروں طرف قسم قسم کے پھول کھلے تھے جن سے پوری فضا معطر ہو رہی تھی۔ عورتیں اس مہکتی ہوئی جنت میں لیٹ گئیں مگر

---

[1] بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ❖ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے (غالبؔ)

[2] Summer house

انہیں نیند نہ آئی۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کی کوئی ایسی چیز کھو گئی ہو جس کے بغیر اُن کے لئے آرام ناممکن ہے آخر ایک عورت اٹھی اور مچھلی کی ٹوکریوں کو اٹھا کر خس خانہ میں لے آئی مچھلیوں کی جانی پہچانی بُو جب اُن کے دماغ تک پہنچی تو سب کو اطمینان کے ساتھ نیند آ گئی۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا سے اس قدر مانوس نہ ہو جانا چاہئیے کہ یہ ہمارے لئے مچھلیوں کی ٹوکری بن جائے اور ہماری تمام خوشیاں اسی پر منحصر ہو کر رہ جائیں سنسار میں اس طرح رہنا زندگی کے ادنےٰ ترین مقام پر جینا ہے۔ اس مقام کو ہمارے بزرگوں نے "تامس[1]" کا نام دیا ہے، جس کے معنی ہیں، سُستی اور کاہلی کا مقام ہر جاندار میں تین "گُن" یا خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ سب سے ادنیٰ ہے تامس کا گُن، اس گُن والے لوگ بس کھانے پینے اور آرام کرنے میں لگے رہتے ہیں، انہیں کبھی جسمانی یا دماغی ترقی کا خیال نہیں آتا اور وہ ساری زندگی جانوروں کی طرح گزار دیتے ہیں اس سے اوپر ہے۔ "راجس[2]" کا گُن" یہ خاصیت، اُن لوگوں کی جن کی طبیعت کا رُجحان عمل کی طرف ہوتا ہے اُن لوگوں میں خود پسندی کا مادہ بھرا ہوتا ہے یہ لوگ اپنی بڑائی کرتے رہتے ہیں "میں" کا لفظ ہر وقت اُن کی زبان پر رہتا ہے لیکن اسی جذبے کے تحت اُن سے دُنیا کے سب مقام طے ہوتے ہیں جب اُن لوگوں کے عمل کا رُخ اچھے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے تو اُن میں رُوحانیت پیدا ہو جاتی ہے، سب سے اعلیٰ گُن ہے "ستو[3]" یعنی داخلی معرفت کا گُن "ستوک" لوگ وحدت خودی کے احساس کو کبھی نہیں بھولتے ایسا نہیں ہے کہ تمام نسلِ انسانی تین حصوں میں منقسم ہے بلکہ یہ تینوں "گُن" کم و بیش ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ایک ہی آدمی میں مختلف اوقات پر مختلف گُن غالب آتے رہتے ہیں کسی وقت "ستوک" گُن کا غلبہ ہوتا ہے تو کبھی راجس گُن عمل میں آتا ہے اور کبھی "تامس" نمودار ہو جاتا ہے ارتقا کا تقاضا ہے کہ ہم "تامس" کو "راجس" سے مغلوب کریں اور پھر دونوں کو "ستو" میں جذب کر دیں۔

کائنات کسی عملِ تخلیق کا نام نہیں۔ کوئی چیز کسی سے بنائی نہیں گئی۔ کائنات کی ہستی قائم بالذات ہے وہ ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ زندگی ایک قسم کا توازن حاصل کرنے کی کشمکش کا نام ہے جیسے اگر کاگ کے ٹکڑے پانی کے برتن کی تہ میں ڈال دئے جائیں، تو وہ الگ الگ اور مل جل کر تیزی سے اُوپر کو اُٹھتے ہیں اور جب سطح پر آ جاتے ہیں، تو توازن قائم ہو جاتا ہے تو یہ عمل ختم ہو جاتا ہے یہی حال تخلیقاتِ عالم کا ہے، اگر ہستی میں توازن قائم ہو جائے تو ہر قسم کی حرکت رُک جائے گی تمام تغیر ختم ہو جائے گا اور جس چیز کو ہم زندگی کہتے ہیں وہ بھی ختم ہو جائے گی زندگی میں خیر و شر، دکھ سُکھ ہمیشہ وابستہ رہیں گے اسی کش مکش کا نام ہی زندگی ہے اس میں توازن قائم ہوتے ہی دُنیا ختم ہو جائے گی یکسانیت

---

[1] Tamas [2] Rajas [3] Sattva

اور تخریب دونوں دراصل ایک ہی چیز ہیں، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ دُکھ کے بغیر سُکھ اور شر کے بغیر خیر کا وجود ہو، اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں زندگی میں سُکھ ہی سُکھ مل سکتا ہے تو یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ لیکن ہاں مکمل آزادی یا نجات کی خواہش بجا ہے اور حق بجانب ہے۔ کائنات دوامی اور ابدی ہے، اس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، زندگی کا ئنات کے سمندر کی متحرک لہروں پر مشتمل ہے، اس سمندر کی کئی ایسی تہیں ہیں جن تک آج تک کوئی نہیں پہونچ سکا ہے اس میں کچھ ایسی تہیں بھی ہیں جن میں جاکر زندگی کی لہریں ساکن ہو جاتی ہیں پھر بھی سطحی لہریں تو ہمیشہ متحرک رہتی ہیں کیونکہ توازن حاصل کرنے کی کش مکش کبھی ختم نہیں ہو سکتی اس مدوجزر کا سلسلہ جاری رہے گا۔ زندگی اور موت ایک ہی واقعہ کے دو مختلف نام ہیں۔ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں دونوں "مایا" ہیں یہ مایا شہود و غیب کے مرکب کا اصطلاحی نام ہے جس کی تشریح مشکل ہے۔ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ ایک لمحہ تو ہم میں جینے کی زبردست خواہش ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں موت کی آرزو اِسی تضاد کی۔ یکجائی ہی کا نام مایا ہے، آتما مایا سے پرے ہے، آتما ہی ہماری اصل ہے، آتما ہی سے تمام زندگی ہے، ہمیں سے جہان کی تخلیق و تشکیل ہوتی ہے۔ بے جان مادہ میں احساس و حرکت کا عمل ہمیں سے ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہم اس بنیادی بات کو بھول جاتے ہیں اور ہمیں اپنی ہی تخلیق سے یا تو ڈر لگنے لگتا ہے یا ہم اس سے لطف اندوز ہو کر اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں غور سے دیکھا جائے تو دنیا نہ سچ ہے نہ جھوٹ بلکہ سچائی کا سایہ ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے "قوتِ تخیلہ سچائی کا سُنہری سایہ ہے"۔ ہم سب کو حُسنِ خیال کا تو کچھ اندازہ ہے لیکن جمالِ حقیقت سے وہی آشنا ہوتے ہیں جو خارجی دنیا کی سطح کو چھوڑ کر داخلی دنیا کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں، داخلی کائنات یعنی حقیقی کائنات غیر محدود طور پر خارجی دنیا سے عظیم تر ہے، آئینہ کا عکس خوب صورت سہی لیکن اصل جمال سے اُس کا کیا مقابلہ اور پھر خارجی اور داخلی کائنات دو چیزیں تو ہیں ہی نہیں جب ہم اپنے عکس کو دیکھتے ہیں تو اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتے اور جب ہماری نظر اپنے آپ پر ہوتی ہے تو عکس دکھائی نہیں دیتا آپ سانپ اور رسی کی مشہور مثال لے لیجئے۔ جب ہمیں رسی اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتی ہے تو سانپ کے تصوّر کا کہیں وجود نہیں رہتا اور جب ہم اُسے سانپ سمجھ بیٹھتے ہیں تو ہمیں سانپ ہی سانپ نظر آتا ہے، اس وقت رسی کا تصور تک باقی نہیں رہتا، دونوں بیک وقت موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جب ہم دنیا کا ادراک کرتے ہیں تو خودی کا احساس و شعور نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ تحت الشعور میں ایک خیالی تصور سا رہتا ہے، اور جب ہمیں برہمہ کا احساس ہوتا ہے تو شخصی "میں" اور نسبتی دُنیا کے بارے میں ہر قسم کے محسوسات ختم ہو جاتے ہیں، خود آگہی میں خود فراموشی کو دخل نہیں، بھلا روشنی کو کیا خبر کہ تاریکی کیا شئے ہے، تاریکی کا وجود روشنی میں ہو بھی کیوں کر سکتا ہے، تاریکی کی موت ہی تو روشنی ہے۔ برہم سب کچھ ہے وہی اندر ہے وہی باہر ہم جس ہستی کو خدا یا بھگوان کہتے ہیں اور اپنے سے علیحدہ جان کر پوجتے ہیں وہی ہماری حقیقی خودی ہے یعنی

برہم ہے۔ جب احساسِ خودی نہیں ہوتا تو انفرادیت اور حقیقی خودی کے درمیان علیحدگی یا جُدائی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو خُدا کے تصور کو جنم دیتا ہے، ہم خُدا کو خارجی دُنیا کی ایک ہستی مان کر پوجنے لگتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری سچی خودی ہر وقت اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے، یہی برہم ہے، بات صرف اتنی ہے کہ خارجی دُنیا کی یہ مختلف صورتیں ہی احساسِ خودی کے مختلف درجے یا مقام ہوتے ہیں، حیوان، انسان، اور بھگوان، اسی برہم کے مختلف مظہر ہیں حیوان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی حالت پر قائم رہتا ہے اور جسمانی زندگی میں محدود رہتا ہے، انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ بدی سے کنارہ کش ہو کر نیکی کی طرف گامزن ہو، تلاش اور جستجو ہی انسان کی زندگی ہے، بھگوان ہر لحاظ سے مکمل ہے، وہ بذاتِ خود آنند اور سکون ہے، وہ سرور و اطمینانِ ابدی ہے، زندگی کو ان تینوں مقاموں سے درجہ بدرجہ گزرنا پڑتا ہے، ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو ہم یزدانیت کی منزل کی طرف گامزن ہیں آؤ ہم علم و یقین کے ساتھ خدائی کے مقام تک پہنچنے کی کوشش کریں، ہمیں دیوتا یا بھگوان بننا ہے۔ ہر وقت بھگوان کے قدموں میں سر نہیں جھکانا ہے آخر ایک دن بھگوان کو گلے لگانا ہے۔ ہمیشہ سجدے ادا نہیں کرنا ہیں ہمیں تو آخر کار خدا کا ہم نشین اور ہمزبان ہونا ہے اور اس کا واحد طریقہ ہے کہ ہم اپنے دلوں میں سمندر کی وُسعت پیدا کریں، دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اوپر اٹھ جائیں۔ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے، دیکھتے جائیے، لطف اٹھائیے، لیکن یہاں اپنے آپ کو قید کرنے کی ضرورت نہیں، اس سے لگاؤ پیدا کرنا لازمی نہیں، اس دُنیا سے آخر ہمیں دستیاب کیا ہو سکتا ہے، دنیا کی اچھی چیزوں کی تلاش کرنا تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کیچڑ میں کھیلتے کھیلتے بچوں کو کانچ کے کچھ ٹکڑے مل جائیں اور وہ انہیں کھو دیں اور پھر انہیں ڈھونڈنے لگیں بڑے ہو کر بچے کیچڑ سے کھیلنا چھوڑ دیتے ہیں، لعل و جواہر پا کر کانچ کے ٹکڑوں کو بھول جاتے ہیں، آؤ ہم بھی اس دنیوی دلدل سے نکل کر، صاف اور پاک ہو کر اپنی خودی کی دولت حاصل کریں۔ اپنی عظمت اور طاقت کو محسوس کریں۔ سچا مذہب لامحدود ہی کی طاقت کا دُوسرا نام ہے خدا قادرِ مطلق ہے۔ دھرم اور ایمان کے معنی ہیں اس لاانتہا طاقت اس خدائی قدرت کو خود اپنے میں محسوس کرنا مکمل آزادی کا شعور و احساس ہمارا مذہب اور دھرم ہے۔ یہی روحانیت ہے، اس کے سوا غیر فانیت کے کچھ اور معنی نہیں، خود خدا کا تصور اسی مکمل آزادی پر منحصر ہے، ہم اگر آزادی اور رستگاری (مکتی) سے محروم ہوں تو ہم، ہم نہیں اور خدا، خدا نہیں، جب تک ہم انسانیت اور پندار کے عالم کو ترک کرکے "میں" کی حدود سے باہر نہیں آجاتے، ملکِ خدا کے دروازے ہم پر بند رہتے ہیں۔ انانیت اور احساسِ خودی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آج تک نہ ایسا ہوا اور نہ کبھی ہو گا، یہ جو ہم ترکِ دنیا کی بات کرتے ہیں اس کے معنی بس یہی ہیں کہ ہم اپنی انانیت

کو یکسر بھول جائیں اس کا شعور ہی مٹا دیں، جسم میں رہیں تو اس کے غلام ہو کر نہ رہیں، یہ جسم ہمارا ہے ہم اس کے نہیں ہیں جب تک انانیت نابود نہیں ہو جاتی نوعِ انسانی کی خدمت اور مدد کرنے کی طاقت پیدا ہونا ناممکن ہے، دنیا میں وہی لوگ سچے معنوں میں فلاحِ عام کا کام کر سکے ہیں جنھوں نے اپنی انفرادی شخصیت کے احساس کو کلیتاً مٹا دیا ہے جو مسلسل چپ چاپ خلقِ خدا کی خدمت میں لگے رہتے ہیں جو اوروں کے لئے زندہ رہتے ہیں، جن کی محبت میں تمام کائنات بس چکی ہے، جن کی زبان پر بھول کر بھی "میں" یا "میرا" نہیں آتا جو اپنے آپ کو خدمتِ خلق کا محض ایک وسیلہ یا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اُن پر حق کی رحمت ہے، اُن کی ہستی متبرک و مقدس ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے خدا کی ذات میں وصل ہو جاتے ہیں اور اس منزل پہ پہونچ جانے کے بعد اُنہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی اُن کی زبان حرفِ طلب سے نا آشنا ہو جاتی ہے، وہ شعوری طور پر کسی خاص مقصد کے لئے کچھ کام نہیں کرتے اور سچے "جیون مُکت"[1] ہوتے ہیں۔ بالکل بے غرض اور بے لوث، اُن کی جسمانی یا محدود انفرادی شخصیت معدوم ہو جاتی ہے، اُن کے دل میں کسی قسم کی خواہش اور آرزو باقی نہیں رہتی، وہ ایک ہمہ گیر اور بنیادی حقیقت بن جاتے ہیں جس میں کوئی ذاتی لگاوٹ نہیں ہوتی۔

مبارک ہیں ایسے عظیم لوگ جن کی زندگی قابلِ احترام بھی ہے اور قابلِ رشک و تقلید بھی۔ آؤ ہم بھی اپنی انانیت کو ترک کریں اور اپنی محدود جسمانی "میں" کو خیرباد کہہ دیں تاکہ ہماری حقیقی خودی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے یاد رہے کہ ہم اپنی محدود شخصیت کو خودی میں مستغرق کرنے میں جس قدر کامیاب ہوں گے ہم کو اتنا ہی حق کی قربت حاصل ہو جائے گی، ہماری خودی جب اپنی پوری آب و تاب سے چمکے گی تو ہمیں خدا کا جلوہ نظر آنے لگے گا خودی اور خدا دو مختلف چیزیں نہیں دراصل یہ ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں تو آؤ ہم اپنے آپ کو اس طرح قربان کر دیں کہ میرا اور میں کا یہ احساس ہی مٹ جائے اور بس وہی وہ باقی رہ جائے، ہم بہترین کام اِسی حالت میں کر سکیں گے جب ذات اور نفس کا خیال ترک کر دیں گے۔ ہم اپنا کچھ اثر چھوڑنا چاہتے ہیں تو پہلے "میں" کو مٹانا ہوگا، بڑے بڑے کام محض انھیں لوگوں کی ذات سے سرانجام پاتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے دل سے ہر قسم کی خواہش اور غرض کو مٹا دیا ہے۔ آؤ ہم اپنے آپ کو مٹا کر کام کریں اگر ہمیں کوئی برا بھی کہے تو اس کے لئے دُعائے خیر کریں، اسے اشیرباد دیں ہمارے نکتہ چین ہماری جھوٹی انانیت کو مٹانے

---

[1] Jivanmuktas

میں ہماری مدد کرکے ہم پر ایک بھاری احسان کرتے ہیں جس کے لئے ہمیں اُن کا شکر گزار ہونا چاہیئے کسی سے رنجش و ناراضگی کے کیا معنی جب سب اُسی ایک ہی بھگوان کے رُوپ ہیں جس کی بدولت یہ تمام کاروبارِ جہاں جاری ہے بس اُسی کا دھیان رہے، ہاتھ سے احساسِ خودی نہ چھوٹنے پائے ہم اپنی اصلی ذات کو بھولنے نہ پائیں، ہمارے دل و دماغ پاک اور نیک خیالات سے معطر اور سرشار رہیں، ہمارے دست و بازو میں، خدمتِ خلق کے مصمم ارادوں کی طاقت رواں دواں رہے، اگر ہم ایسا کر سکتے ہیں تو ہمارے ہاتھوں سے ایسے بڑے بڑے کام سرانجام پا سکیں گے جنھیں زبانی جمع خرچ کرنے والے اُپدیشکوں کے دل کے دل بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے یاد رہے کہ اخلاص اور سکوت ہی طاقت اور شکتی کا سرچشمہ ہیں۔

IX

اظہار یا بیان کبھی بھی حقیقت کے برابر نہیں ہو سکتا۔ شدتِ احساس اور وُسعتِ ادراک کا اظہار نہ کسی شاعر و ناثر کے قلم سے ممکن ہے نہ کسی مصور کے برش سے اور نہ کسی موسیقار کے ساز سے۔ اظہار یا بیان کی گرفت میں آنے کے لئے حقیقت کو اپنی بلندی سے نیچے آنا پڑتا ہے کیونکہ اظہار یا بیان کی صلاحیت اس بلندی پر ممکن نہیں، اس بلندی پر شاعر، ناثر، مصور، اور موسیقار کے لئے سانس لینا دشوار ہوتا ہے۔

سینٹ[1] پال نے کہا ہے "الفاظ ہلاکت[2] آفریں ہیں" مراد یہ ہے کہ کوئی بھی حقیقت ہو اظہار و بیان کے دائرے میں مقید ہو کر حقیقت نہیں رہتی اس میں تو حقیقت کا صرف ایک ہلکا سا پرتو بند ہو کر رہ جاتا ہے، زندگی ایک رُوحِ رواں ہے وہ حروف میں گھر نہیں سکتی وہ الفاظ میں سموئی نہیں جا سکتی لیکن اس بنیادی خامی کے باوجود اظہار اور بیان کے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے اُس کا بیان کیا جانا لازمی ہے۔ حقیقت کو سمجھنے کے لئے مجاز کا رنگ اختیار کرنا پڑتا ہے غیر مادی و غیر مرئی اصولوں کو جب تک بیان کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک نہ تو ہم انہیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں نہ اُن پر عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ مشکل بھی درپیش آتی ہے کہ ہم اظہار یا بیان کے پردے کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں بیان یا اظہار تو دراصل نشانِ راہ کا کام کرتے ہیں لیکن ہم اُسے بجائے خود منزل سمجھ لیتے ہیں، یہ ایک عالم گیر غلطی ہے جو تقریباً ہر انسان سے سرزد ہوتی ہے، ہر بڑا گرو، ہر پیغمبر

ے[1] St. Paul ے[2] The letter Killeth

اور اوتار فطرتِ انسانی کی اس کمزوری سے واقف ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن بنی نوعِ انسان عموماً غیب کے بجائے شہود کی پرستش کو ترجیح دیتے ہیں۔ جس چیز کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اسی کے آگے سر جھکانے کو تیار رہتے ہیں اور اُس حقیقت سے گریزاں رہتے ہیں جو ہر شے میں موجود ہے، جس کی بدولت ہر چیز کی ہستی ہے، لیکن جو آنکھوں سے اوجھل ہے، دنیا میں بار بار متعدد پیغمبر آئے اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا انہیں یہ بتایا کہ ہماری محدود شخصیت کے پس پردہ جو بنیادی اصول کارفرما ہے، وہی ہماری اصل ذات ہے، کسی پیغمبر کا جیسا زمانہ اور جیسا ماحول تھا اس کے مطابق اُس نے اِس حقیقت کو بیان کیا۔ انسانی ارتقا کے جس مقام پر لوگ اُس وقت پہنچ چکے تھے اُس کے لحاظ سے اس غیر تغیر پذیر صداقت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر متشکل کیا اور اس طرح صداقت اُن مختلف لباسوں میں جلوہ گر ہوئی جو عہد بہ عہد اُسے میسّر آتے رہے، ہمیں اِن تمام صورتوں سے گزر کر حقیقت کو پانا ہے۔ جب ہم نام اور رُوپ سے مُکت (آزاد) ہو جاتے ہیں، خاص طور پر جب ہمیں کسی قسم کے اچھے بُرے، نفیس یا کثیف جسم کی بھی ضرورت نہیں رہتی تو ہم صحیح معنوں میں آزاد ہو جاتے ہیں۔ ورنہ خارجی ارتقاً تو دائمی غلامی ہے۔ جب تک تفریق باقی رہتی ہے ہم حقیقت سے دُور رہتے ہیں، ہمیں تو ہر طرح کے تفرقات سے گذر کر ابدی وحدت، یکسانیت، ہم آہنگی اور ہمواری تک پہنچنا ہے یہی برہمہ ہے۔ آتما تمام شخصی اور انفرادی صورتوں کی بنیادی ایکتا کا نام ہے، وہ غیر تغیر پذیر ہے، وہ ایک ہے اُس کا کوئی ثانی نہیں، تمام زندگی اُسی سے ہے، وہ زندگی کی ہر صورت میں نمودار ہے، لیکن وہ اس پر ختم نہیں، وہ زندگی اور موت، نیک و بد، خیر و شر سے پرے ہے، وہ وحدتِ کُل ہے، اگر ہمیں حقیقی آزادی، نجات یا مکتی کی تلاش ہے تو ہمیں ان تمام ظاہری صورتوں سے گزرنا ہوگا اور اس واحد حقیقت کو ہر جگہ اور ہر چیز میں جلوہ گر ماننا ہوگا، اسی وحدت کو فقط اچھی اور خوب صورت چیزوں ہی میں نہیں بلکہ بُری اور بدصورت چیزوں میں بھی پانا ہوگا۔ جنت میں اُس کا جلوہ دیکھنا تو آسان ہے، ہمیں اپنے میں اتنی ہمت اور صلاحیت پیدا کرنا ہوگی کہ دوزخ میں بھی وہی وحدت نظر آئے۔ سکھ چین اور آرام کی زندگی میں خدا کا شکر کرنا مقابلتاً آسان ہے، مُصیبت میں مُسکرا کر خدا کو مخاطب کرنا مشکل ہے، اس کے لئے ہمت اور طاقت کی ضرورت ہے، مصیبت جھیلنا اور چیز ہے اور مصیبت میں خدا کا رنگ دیکھنا اور بات ہے، بہر حال دُکھ کی صورت ہو یا سکھ کی، نام اور روپ کے دائرے میں رہ کر مکتی ہرگز نہیں مل سکتی اضافی حد بندیوں میں لامحدودیت کیوں کر گھر سکتی ہے، بھلا کوئی صورت یہ کیوں کر کہہ سکتی ہے کہ میں آزاد اور مُکت ہوں، صورت تو ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے، اور جو چیز زندگی اور موت کے چکر میں گرفتار ہے وہ آزاد کیسے ہو سکتی ہے آزادی اور نجات تو تمام اور روپ سے گزر

جانے ہی کا نام ہے، وحدتِ کُل کے احساس میں ڈوب جانے کو ہی مکتی کہتے ہیں۔ ہمیں کوئی دوسرا یا غیر نظر نہیں آتا، کسی کو ہم سے ضرر یا تکلیف پہنچنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا جب تک فرق باقی ہے، فائدہ اور نقصان کا تصور بھی قائم ہے، جب یہ فرق مٹ جاتا ہے تو پھر کون کس کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کثرت اضافی مدرکات پر مبنی ہے، جب غیر اضافی ادراک واحد ہو جاتا ہے تو کثرت مٹ جاتی ہے۔

گیان یا آگہی کا سرچشمہ خود ہمارے اندر موجود ہے، کائنات کے ہر ذرے میں معرفت کا خورشید درخشاں ہے، ادنیٰ سی چیونٹی سے لے کر فرشتوں کے بلند مقام تک ایک ہی نورِ جلوہ پاش ہے، سچا مذہب ایک ہے اور وہ ہے اس وحدتِ کل کا شعور و احساس، باقی سب ایک کھیل ہے، صورتوں اور ڈھانچوں کا، نشانوں اور علامتوں کا، وضاحتی تمثیلوں اور تشریحی کہانیوں کا، حق تو یہ ہے کہ ہم نے حقیقت کو فراموش کر دیا ہے، اس حقیقت کو جو ہر وقت ہمارے اندر موجود ہے اور ہم سمجھنے لگے ہیں کہ ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے، جنتِ نشاط[1] تو خود ہمارے اندر ہے، اسے اور کہاں ڈھونڈنے جائیں، کھویا ہے ہم نے اپنے آپ کو اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ دُنیا کھو گئی جن کو تلاش کا سچا شوق ہے اُن کے لئے معراج ہر وقت موجود ہے۔ طالب دیدار کے لئے جلوے ہر وقت بے تاب ہیں[2]، ذرا گوشِ ہوش سے سنیئے رات دن خود ہمارے دل میں سچد آنند[3] یعنی شعور و آگہی، و نشاط کا یہ یزدانی نغمہ "سوہم۔ سوہم[4] (میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں) گونج رہا ہے۔

ہمارے لئے تصور یا واہمہ کے بغیر سوچنا ممکن ہی نہیں یہ ہماری سرشت ہے، خاصیت ہے غور و فکر اور خیال بجائے خود ایک حد بندی ہے ہر خیال کے دو حصّے ہوتے ہیں، فکر اور صَوت[5] (شبد) ان دونوں کے بغیر کسی قسم کا بھی سوچ بچار ناممکن ہے۔ انھیں دونوں چیزوں سے مربوط اور منسلک ہو کر خیالات صورت پذیر ہوتے ہیں اور جب خیال کی پیدائش محدودیت سے ہوتی ہے تو آدرش وادی ہو یا مادّہ پرست

---

[1] Millenium

[2] طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید ❖ ہمچناں در عملِ معدنِ کان است کہ بود

[3] Sachchidananda (Sat-Chit-Anand). Existence, Consciousness, Bliss.

[4] دم چیست پیام است شنیدی نشنیدی ❖ در خاکِ تو یک جلوۂ عام است ندیدی
دیدن دِگر آموز، شنیدن دِگر آموز،

[5] Thinking and the word.

اس کائنات کی تفسیر کرنے کی مجال کس میں ہے، اس سنسار کا مطلب سمجھانے کے لئے فکر اور بیان[1] دونوں کی ضرورت ہے اور جہاں یہ حدیں مقرر ہو جاتی ہیں، معنی محدود ہو جاتے ہیں اور حقیقت اپنی وسعت کھو بیٹھتی ہے۔ تمام علم و آگہی حقیقت ہی کا تو عکس ہے جسے ہم فکر و بیان کے آئینہ میں مجسم کر لیتے ہیں، اس عکس کو حقیقت سے لگاؤ ضرور ہے، لیکن وہ بذاتِ خود حقیقت نہیں ہو سکتا ہم اپنے چہرے کے عکس کو آئینے میں دیکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری حقیقت اس عکس سے کہیں زیادہ وسیع اور مختلف ہے اسی طرح محض عالمِ شہود سے واقف ہونا ہی برمھ گیان یا معرفت نہیں ہے، اس لحاظ سے کوئی اپنی خودی یا برمھ کو نہیں جان سکتا برمھ ہمارے فکر و بیان کے آئینے میں محدود نہیں ہو سکتا برمھ کو پایا جاتا ہے اسے سمجھا نہیں سکتا، ہر شخص خود برمھ ہے، وہ اپنی ذات سے آگاہ ہو سکتا ہے وہ اپنی خودی کو پا سکتا ہے لیکن اس کا پورا ادراک ناممکن ہے، ادراک کا عمل ہی حد بندی ہے، ادراک اور شعورِ خودی کے لئے لازم ہے، کہ اسے محدود کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ سے حقیقت کے عکس کو مجسم کرتا چلا آیا ہے تاکہ یہ صورت آگہی کا موضوع بن سکے جس حقیقت کو یہ آنکھیں دیکھ نہیں سکتی اس کو مثالوں کی صورت میں دیکھنے کی کوشش ہمیشہ سے انسانی ارتقار کا ذریعہ رہی ہے، جس چیز کو ہم مورتی پوجا کہتے ہیں وہ اسی کوشش کا ایک کرشمہ ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو بت پرستی فقط مندروں یا گرجاؤں تک محدود نہیں، لکڑی یا پتھروں کے بے جان بتوں سے لے کر مہاتما بدھ اور یسوع مسیح جیسی ہستیوں کی شخصیتوں کی پرستش تمام تربت پرستی میں شامل ہے، ہندوستان میں مہاتما بدھ سے پہلے مورتی پوجا نہیں ہوتی تھی، ویدوں کے زمانے میں لوگ مورتی پوجا نہیں کرتے تھے ویدوں کا بھگوان انسان کا خالق بھی ہے، اور ندیم بھی لیکن جب مہاتما بدھ نے شخصی خدا[2] کے خلاف آواز بلند کی اور لوگ ویدوں کے خدا کو بھول گئے تو انہوں نے دینی مرشدوں، کے بت بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی، اس طرح شروع شروع میں گروؤں کی مورتیاں بنیں، زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ خود مہاتما بدھ کی مورتیاں بننے لگیں اور لاکھوں کروڑوں انسان اُن کی پوجا کرنے لگے۔ جب ایک دفعہ بت پرستی کا یہ رواج جاری ہو گیا تو پھر اس کا انسداد مشکل تھا۔ اصلاح کی جو متشددانہ کوششیں کی گئیں اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور صحیح اصلاح رک گئی دراصل بات یہ ہے کہ پرستش کا جذبہ انسان کی فطرت میں رچا ہوا ہے، ہر جبین سجدوں کے لئے بے تاب ہے، غیر مرئی حقیقتوں تک ہماری رسائی صرف اعلیٰ ترین فلسفے کے ذریعہ ہی

---

[1] Idea and expression.

[2] Personal God

ممکن ہے، اس سے کم بلند مقامات پر انسان ہمیشہ خدا کو ایک شخصیت قرار دے کر اس کی پرستش کرتا ہے بھگوان کے پجاری اسے رنگ رُوپ دے کر اُس کی پُوجا کرتے ہیں اور اس میں کوئی ہرج بھی نہیں اگر نشان لے کو نشان سمجھا جائے، اور اس کو بذاتِ خود اصل نہ سمجھ لیا جائے، نشان کوئی بھی کیوں نہ ہو، مورتی ہو یا دینی کتاب یا کچھ اور، جب تک اُسے الوہیت کی علامت سمجھ کر پُوجا جاتا ہے ہمیں اس سے حقیقت تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے لیکن یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ علامت خود الوہیت نہیں بن سکتی مورتی بھگوان نہیں بن سکتی ۔ دینی کتاب خود خدا نہیں بن سکتی، مورتی کی مدد سے ہمیں بھگوان کو پانا ہے ۔ دینی کتاب کے سہارے ہمیں خدا تک پہنچنا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ بھی دینی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس پر حرف بحرف اندھا دھند ایمان لائیں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے دینی راہنما اپنے زمانے کے ماحول کے مطابق اور لوگوں کے درجۂ ادراک کے موافق انہیں حق کی تلقین کرتے ہیں اس زمانے کی ہر بات ہر وقت کے لئے موزوں نہیں ہو سکتی ۔ دُوسرے یہ کہ پیغمبروں اور اوتاروں کو حقیقت کا تو پورا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اُن کا اضافی علم بھی مکمل ہو، اضافی باتوں میں اُن سے غلطی بھی ہو سکتی ہے ۔ آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سائنس، فلسفہ، مذہب وغیرہ کے متعلق ہر بات ہمیشہ کے لئے کچھ دینی کتابوں میں لکھ کر رکھ دی گئی ہو ایسی دینی کتابوں پر آنکھ بند کر کے ایمان لانا ایک نہایت خطرناک چیز ہے، ہمیں اس وہم سے آزاد ہونا چاہیئے کہ چونکہ فلاں بات ہماری دینی کتاب میں درج ہے اس لئے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی اور اُس پر ہمیں ضرور ایمان لانا چاہیئے سائنس فلسفہ اور مذہب کی ہر بات کو ہزاروں سال پہلے قلم بند کی ہوئی دینی کتابوں سے مطابقت دینے کی کوشش کرنا اپنے آپ پر، اپنی عقل و خرد پر، اور انسانی ارتقا کے عمل پر سخت ترین ظلم کرنے کے برابر ہے، اس طرح دینی کتابوں کی پوجا کرنا بھی بد ترین قسم کی بُت پرستی ہے، ہمیں اس مقام سے گزرنا ہے، دینی کتابیں نشانِ راہ ہیں ہماری منزل ان سے کہیں آگے ہے ۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی جنگل میں ایک مغرور اور اَلّھڑ بارہ سنگا رہتا تھا ایک دن وہ اپنے بچے سے نہایت تمکنت اور شان کے ساتھ کہنے لگا " مجھے دیکھو میرے سینگ کتنے طاقت ور ہیں ایک ہی ریلے میں آدمی کا کام تمام کر سکتا ہوں بارہ سنگا ہونا بڑی بات ہے" ابھی وہ یہ کہہ رہا تھا کہ دور سے کسی شکاری کے بگل کی آواز سُنائی دی بارہ سنگا جھٹ دُم دُبا کر بھاگ کھڑا ہوا اس کے ساتھ ساتھ اس کا حیرت زدہ بچہ بھی بھاگا جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچے تو بچے نے پوچھا " ابّا جان تم تو اتنے بہادر اور دلیر ہو بہت طاقت و توانائی کے

لے Symbol

مالک ہو، پھر تم بھاگے کیوں ؟" بارہ سنگا بولا، میرے لال میں جانتا ہوں کہ میں طاقت ور اور بہادر ہوں لیکن میں جب بھی یہ آواز سنتا ہوں تو نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے، بس بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہوں :

یہی حال ہم سب کا ہے، دینی کتابوں، (دھارمک پستکوں) میں جو احکام درج ہیں اُن کا ذکر سنتے ہی ہمارے تمام توہمات جاگ اٹھتے ہیں اور ہم عادت سے مجبور ہو کر بغیر سوچے سمجھے ذہنی غلامی قبول کر لیتے ہیں اور اپنی اصلی فطرت کو بھول جاتے ہیں جس کا تقاضا مکتی یا آزادی ہے۔

آگہی یا معرفت دوامی ہے اگر کوئی آدمی روحانی صداقت کا انکشاف کر لیتا ہے تو اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ اسے الہام ہوا ہے اور جو باتیں وہ دنیا پر ظاہر کرتا ہے اسے کرامات اور مکاشفات کہتے ہیں۔ الہام ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہو گا مکاشفات ہمیشہ ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، کسی ایک دینی فلسفہ کو خاتم المذاہب سمجھ کر اس کی بغیر حیل و حجت تقلید کرنا غلط بات ہے۔ الہام یا کشف ہر ایسے آدمی کے لئے ممکن ہے جس نے اُسے قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا ہو، اس تیاری کے لئے کامل اخلاص لازم ہے، صرف صاف دل لوگ ہی بھگوان کے درشن پا سکتے ہیں، خدا صرف اسی کو ملتا ہے جس کا دل پاک و صاف ہوتا ہے۔ تمام مخلوقات میں انسان کا وجود ایک اعلیٰ ترین وجود ہے اور یہ سنسار عظیم ترین سنسار ہے کیونکہ اسی کا کاہِ عمل میں انسان کو مکتی یا نجات حاصل ہو سکتی ہے، خدا کا بلند ترین تصور خود انسان ہے ہم جتنے اوصاف سے خدا کو متصف کرتے ہیں وہ سب کے سب خود انسان سے منسوب ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ درجے میں کچھ کمی ہے، نوعیت تو ایک ہی ہے، ہم جب نام اور روپ کے مقام سے اوپر اٹھتے ہیں، تو شخصی خدا کے تصور کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جسم کا تصور ہی مٹ جاتا ہے، دماغ اور قوتِ تخیلہ کی حدود ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ یہ دنیا ہی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، جب ہم حقیقتِ مطلق کے درجہ تک پہنچتے ہیں تو یہ دنیا دنیا نہیں رہتی جب ہماری رسائی خالق تک ہو جاتی ہے تو مخلوقات باقی نہیں رہتی، فاعل فعل مفعول، شاہد، مشاہدہ و مشہود سب ایک ہو جاتے ہیں جب تک ہم اس مقام پر نہیں پہنچتے اس عالمِ موجودات کی ہستی اپنی ہستی ہے، جب انسان اپنے کمال کو پا لیتا ہے جب وہ وحدت میں بس جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ خدا سے واصل ہو گیا۔

مردِ کامل کی زندگی محبت سے بھر جاتی ہے، وحدت کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ تفریق کا شعور ناممکن ہے، اور جہاں تفریق نہیں وہاں نفرت کی گنجائش نہیں، وہاں صرف محبت زندگی کا اصول بن جاتی ہے خودی اور وحدت ہماری حقیقت ہے، محبت ہماری اصل ہے، تفریق اور کثرت خودکشی کے برابر

ہے لے، نفرت کرنا اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹنا ہے، آؤ ہم زندگی کو اپنائیں، اپنی خودی کو بیدار کریں وحدت اور محبت کے بے کنار سمندر میں غوطہ زن ہوں نفرت و تفریق موت کا گھاٹ ہے اس گھاٹ سے اُترنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

مردِ کامل کی ایک اور نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کے کاروبار میں براہِ راست کم حصہ لیتا ہے وہ جتنا ہی زیادہ کامل ہوگا اتنا ہی اپنے دست و بازو کا کم استعمال کرے گا۔ اس کی چشمِ بصیرت یہ صاف طور پر دیکھتی ہے کہ دنیا محض ایک "بازیچۂ اطفال" ہے، اُسے ہر لمحہ یہ شعور اور احساس ہوتا ہے کہ عالمِ کائنات "مایا" ہے، اس کی حقیقت اور کچھ ہے، اس لئے "غم ہائے روزگار" اُسے پریشان نہیں کرتے، وہ تو کسی اور مسرت انگیز "غم" کو اپنا لیتا ہے۔ جیسے گلی میں دو کتوں کو ایک دوسرے سے لڑتا ہوا دیکھ کر ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی اسی طرح سنسار کے متضاد عناصر کا ایک دُوسرے پر عمل اور ردِ عمل مردِ کامل کے لئے باعثِ رنج نہیں ہوتا، اگر اس کو کوئی رنج ہوتا ہے تو یہ کہ انسان اپنی حقیقت سے منحرف کیوں ہے اس لئے مردِ کامل کی تمام قوت ہمیں راہِ خودی دکھانے میں صرف ہوتی ہے، مادیت کہتی ہے، آزادی اور مکتی کی باتیں فضول ہیں آزادی محض فریب ہے" آدرش وادی کہتا ہے "بندھن اور غلامی کی بات بے معنی ہے، دھوکا ہے، ہماری اصل آزادی ہے" ویدانت اعلان کرتا ہے کہ "ہم بیک وقت آزاد بھی ہیں اور غلام بھی" اس کے معنی یہ ہیں کہ جسمانی اور خاکی سطح پر کبھی مکت یا آزاد نہیں ہو سکتے لیکن روحانی سطح پر ہم ہمیشہ آزاد ہیں، مردِ کامل اپنی مثال سے اس صداقت کا ثبوت پہنچاتا ہے، ہماری خودی غلامی اور آزادی دونوں سے پرے ہے ہم خود برہم ہیں، حواس سے پرے غیر فانی آگہی ہی ہماری اصل ہے ہم سکونِ مطلق ہیں، نشاطِ کامل ہیں، سچدانند ہیں؛

لے Killing the self by the self.



عملی ویدانت

پہلا لیکچر

یہ لیکچر نومبر ۱۸۹۶ء کی دسویں تاریخ کو لندن میں دیا گیا

مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں فلسفہ ویدانت کے عملی پہلو کے بارے میں کچھ عرض کروں میرے پچھلے لکچروں سے آپ حضرات نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ فلسفہ اصولی طور پر تو نہایت اعلےٰ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اس کو عملی جامہ کس طرح پہنا سکتے ہیں اگر کوئی اصول قطعی طور پر ناقابل عمل ہو تو اس سے ذہنی ورزش کا سامان تو مہیا ہو سکتا ہے لیکن دراصل وہ محض بیکار چیز ہے اسی لیئے اگر ویدانت کو ایک کامیاب مذہب ہونے کا دعوےٰ ہے تو اُسے نہایت درجہ قابل عمل ہونا چاہیئے اس میں اتنی صلاحیت ہونا چاہیئے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس پر عمل کیا جا سکے اور محض یہی نہیں بلکہ مذہب اور عملی زندگی کے درمیان یہ جو خیالی خلیج حائل ہو رہی ہے اس کو بھی کلیتاً نابود ہو جانا چاہیئے کیونکہ ویدانت یکتائی کی وحدت کی تعلیم دیتا ہے اس کے مطابق شروع سے آخر تک ایک زندگی جاری وساری ہے مذہب بھی اس زندگی کا ایک حصہ ہے اس لئے اگر اس کے آدرش سچے ہیں تو انھیں تمام عرصۂ حیات پر محتوی ہونا چاہیئے انھیں ہمارے تمام خیالات کے اندر سرایت کر جانا چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ قابل عمل ہونا چاہیئے میں اپنی تقریر کے دوران میں اس کے عملی پہلو پر بتدریج بحث کروں گا لیکن چونکہ لکچروں کے اس سلسلے کو بنیاد کا رہنا مقصود ہے اسی لیئے پہلے ہمیں اس کے اصولوں پر غور کرنا اور یہ سمجھنا ہے کہ جنگل کے غاروں سے لے کر مصروف کار سڑکوں اور شہروں تک ہر جگہ انھیں عملی جامہ کس طرح پہنایا گیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ویدانت محض تارکُ الدُّنیا فقیروں کا مذہب نہیں۔ اس میں ہمیں ایک خصوصیت نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دینی فلسفے کے بیشتر خیالات جنگل جا کر تارکانہ زندگی بسر کرنے کا نتیجہ نہیں بخلاف اس کے یہ ایسے اشخاص کے دماغ کی پیداوار ہیں جن کی تمام زندگی وقف عمل رہی

اور حبن سے ہمیں یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ ہماری مصروف ترین زندگی میں ہمارے خضرِ راہ بنیں گے یہاں میری مراد ہے حکمراں بادشاہوں سے۔ خود ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اس بات کی تائید کی گئی ہے مثلاً شویت کیتو کی کہانی میں یہ بات بالکل واضح طور سے بیان کی گئی ہے۔

شویت[1] کیتو ایک رشی ارنی کے فرزند ارجمند تھے اغلباً یہ رشی ایک تارک الدنیا بزرگ تھے شویت کیتو جی کی پرورش و پرداخت جنگل میں ہوئی تھی ایک مرتبہ وہ پنچالوں کے شہر میں جا پہونچے اور وہاں کے حکمراں تاجدار پرواہن[2] جے والی کے دربار میں جا نکلے۔ راجا نے اُن سے پوچھا "کیا تم جانتے ہو کہ مرکر آدمی کہاں جاتا ہے" شویت کیتو نے کہا "جی نہیں مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ پھر راجا نے سوال کیا "کیا تمھیں معلوم ہے کہ آدمی بار بار جنم کیوں لیتا ہے راجا کو اپنے سوال کا جواب پھر یہی ملا "جی نہیں"۔ پھر راجا نے پوچھا "کیا تمھیں بزرگوں اور دیوی دیوتاؤں کے طریقوں سے واقفیت ہے۔ جواب پھر "نہیں جناب" تھا پھر راجہ نے کئی اور سوال دریافت کئے اور شویت کیتو اُن میں سے کسی سوال کا بھی جواب نہ دے سکے۔ اس پر راجہ نے کہا "تمھیں کچھ آتا جاتا نہیں۔ بالکل بے بہرہ ہو" اس پر شویت کیتو اپنے باپ کے پاس واپس چلے گئے باپ کو جب راجہ کے سوالوں کا حال معلوم ہوا تو انھوں کہا کہ ان سوالوں کا جواب دینا میرے بس کی بات نہیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ ارنی رشی ان سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتے تھے ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بیٹے کو اوپدیش نہیں دینا چاہتے تھے حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی ان تمام نکات سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا دونوں باپ بیٹے اُٹھ کر سیدھے راجہ کے پاس جا پہونچے اور اُنھوں نے اُن سے ان نکات کی رمز کشائی کے لئے درخواست کی۔ راجہ نے کہا "ابھی تک ان باتوں کا علم صرف راجاؤں کو تھا، پروہتوں اور پنڈتوں کو نہیں تھا"۔ یہ کہہ کر راجہ نے سب نکات رشی ارنی کو سمجھا دیئے

نہ صرف اس مثال سے بلکہ مختلف اپنشدوں کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ویدانت فلاسفی محض جنگل میں بیٹھ کر مراقبہ کرنے سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بہترین اجزا پر غور وخوض اور اس کا اظہار ایسے دماغوں نے کیا تھا جو زندگی کے روزانہ مسائل میں نہایت مصروف و منہمک رہتے تھے۔ ہم تو کسی ایسے انسان کو تصوّر میں بھی نہیں لاسکتے جو اس حکمران مطلق کے بمقابلہ زیادہ مصروف کار رہتا ہو جس کی لاکھوں افراد پر حکومت ہو اگر ان لوگوں نے بھی ویدانت کے ارتقا میں حصہ لیا ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ حکمراں بڑے گہرے سوچ بچار والے ہوتے تھے لہٰذا ہر پہلو سے یہی معلوم ہوگا کہ ویدانت کا فلسفہ نہایت درجہ عملی ہے یہ بات بھگوت گیتا

---

[1] SHVET KAITU

[2] PRAVAHANA JAIVALI

کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوجاتی ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے بھگوت گیتا ضرور پڑھی ہوگی بھگوت گیتا ویدانت کی بہترین تفسیر ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ بھگوان کرشن نے ارجن کو اس فلسفے کی تعلیم میدانِ جنگ میں دی۔ جو اصُول گیتا کے ہر صفحہ پر موجود نظر آتا ہے وہ ہے شدید مصرُوفیت یا حرکت لیکن اس شدید مصروفیت کی نوعیت کیا ہے یہ شدید مصروفیت ایسی ہے جس کے درمیان دوامی عافیت یعنی ہمیشہ قائم رہنے والی شانتی پائی جاتی ہے یہ ہے کام کرنے کا حقیقی راز اور اسی راز کی تہہ تک پہونچنا ویدانت کا مقصد ہے عدم حرکت یا مصروفیت کا نہ ہونا ہماری نظر میں مجہولیت ہے نکمّا پن ہے اسی لئے یہ مجہولیت یہ نکمّا پن ہماری زندگی کا نصب العین نہیں ہوسکتا اگر ایسا ہوتا تو ہمارے اردگرد جو دیواریں کھڑی ہیں ان میں بہت زیادہ ذہانت و ذکاوت ہوتی کیونکہ انھیں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ ان میں حرکت نہیں ہوتی یہ مٹی کے تودے اور درختوں کے ٹھنٹھ روئے زمین پر بڑے باکمال ہوتے کیونکہ ان میں حرکت یا مستعدی بالکل نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ جو چیز میدانِ عمل میں رونما نہیں ہوسکتی وہ ارتقا کی منزلوں تک نہیں پہونچ سکتی کیونکہ بے حرکتی کا جذبہ و ہیجان سے مِل کر بھی حرکت میں منتقل ہونا ناممکن ہے حقیقی حرکت، مستعدی یا سرگرمی میں جو ویدانت کی انتہائی منزلِ مقصود ہے سکون دوامی کا عنصر ضرور شامل ہے لیکن یہ سکون بے حرکتی کا مترادف نہیں اور یہ وہ سکونِ دوامی ہوتا ہے جس کا شیرازہ کسی صورت سے درہم برہم نہیں ہوسکتا یہ سکونِ دوامی اس دماغی توازن کا دوسرا نام ہے جس میں کسی طور پر بھی فرق واقع نہیں ہوتا خود ہمارا انفرادی تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ کام کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جس میں ہمارا دماغی توازن قائم رہ سکے اور اس میں ذرا بھی فرق نہ آنے پائے۔

مجھ سے بارہا یہ دریافت کیا گیا ہے کہ اگر ہم میں وہ جذبہ ہی نہ موجود ہو جس سے ہمیں کام کرنے کی تحریک ہوتی ہے تو پھر ہم کام کسطرح کر سکتے ہیں کئی سال پیشتر میں بھی اسی انداز سے سوچا کرتا تھا لیکن جیوں جیوں میری عمر بڑھتی گئی اور میرے تجربوں میں اضافہ ہوتا گیا مجھے محسوس ہوا کہ اس خیال میں برائے نام بھی حقیقت نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے دل میں جتنا جذبہ جتنا ہیجان کم ہوگا۔ کام اتنا ہی زیادہ اچھا ہوگا ہماری طبیعت میں جسقدر سکون ہوگا۔ ہم جسقدر زیادہ شانتی سے کام لیں گے اتنی ہی ہمارے حق میں بہتری ہوگی مقدار میں اتنا ہی زیادہ کام ہماری ذات سے سرانجام پائے گا۔ ہمارے جذبات و احساسات میں جہاں ذرا سا بھی انتشار پیدا ہوجاتا ہے ان میں ڈھیل واقع ہوجاتی ہے نہ جانے ہماری کتنی قوت اور طاقت رائگاں چلی جاتی ہے سارا نظام اعصابی درہم برہم ہوجاتا ہے دماغی سکون میں فرق آجاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا بہت کم کام پایۂ تکمیل کو پہونچ پاتا ہے جتنی قوت اور طاقت کام کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیئے وہ محض طبعی انتشار میں ضائع ہوجاتی ہے اور اس سے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ جب طبیعت میں سکون ہوتا ہے اس وقت ہماری تمام قوت و طاقت اچھے کام کے سرانجام دینے میں صرف ہوتی ہے اور اگر آپ ان بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ کریں جو دنیا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں۔

اور جنھوں نے بڑے معرکہ آرا کام سرانجام دیتے ہیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ سب کے سب حیرت انگیز طور پر نہایت درجہ شانت سبھاؤ والے لوگ تھے کسی سبب سے بھی ان کے صبر و سکون کی بساط درہم برہم نہیں ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو بات بات پر غُصّہ آجاتا ہے وہ مقدار میں کبھی زیادہ کام سرانجام نہیں دے پاتے لیکن جو شخص کسی حالت میں بھی مغلوب الغضب نہیں ہوتا وہ بجائے کتنا زیادہ کام کر ڈالتا ہے غصہ نفرت یا کسی اور قسم کے جذبے کا شکار ہو جانے والا انسان کام کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اپنے ہاتھوں پاش پاش ہو جاتا ہے اور کوئی بھی کام سرانجام نہیں دے سکتا جو شخص صبر و سکون سے کام لیتا ہے جس میں خطا پوشی کا مادّہ ہے اور جس کے مزاج میں توازن ہوتا ہے جس کی طبیعت ہموار ہوتی ہے ڈانواں ڈول نہیں ہوتی صرف ایسا ہی انسان زیادہ سے زیادہ مقدار میں کام کر سکتا ہے۔

یہ ہے ویدانت کا ایک عملی پہلو لیکن یاد رہے کہ ویدانت آدرش وادی ہے عینیت[1] کی تعلیم دیتا ہے اور جیسا کہ ہم آپ سب جانتے ہیں آدرش حقیقت یا واقعیت[2] سے خواہ ہم اس کو کسی نام سے بھی کیوں نہ منسوب کریں۔ کوسوں دور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تو شاید ویدانت کو ایک عملی فلسفہ حیات قرار دینا مشکل ہو گا لیکن آدرش اور عمل میں تفاوت ہونا اور چیز ہے اور ویدانت کا ایک قابل عمل فلسفہ ہونا اور بات ہے دراصل انسانی فطرت میں دو قسم کے رجحانات[3] پائے جاتے ہیں ایک رجحان کے زیر اثر انسان آدرش کو عام زندگی کی پستی تک کھینچ لاتا ہے اور دوسرے رجحان کے تحت وہ اپنی زندگی کو بلند کر کے آدرش کی سطح پر لے آتا ہے بات ذرا مشکل سی کہہ گیا ہوں لیکن اس کا سمجھنا اور ذہن نشین کرنا نہایت ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اوّل الذکر رجحان ہمیں پستی کی طرف لے جاتا ہے ہم اپنی نفسی خواہشات کو پُورا کرنے کی غرض سے خود کو دھوکا دے کر اپنے آدرش کو گرا لیتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بس صرف ایک خاص نوعیت کا کام سرانجام دے سکتے ہیں اس کے علاوہ اور سب کاموں کو ہم اپنی بساط سے باہر سمجھنے لگتے ہیں اور اُنھیں ناقابل عمل قرار دے کر اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں مثلاً اگر مجھے کسی خاص قسم کے کام سے لگاؤ ہے تو میرا فطری رُجحان یہ ہو گا کہ میں اس کام کو (بُرا بھلا جیسا بھی ہے) کیے جاؤں یہ جان کر بھی کہ یہ کام اچھا نہیں اور اس کے بیشتر حصے کی پُشت پر جذبہ و ہیجان غصہ و حرص۔ طمع یا خود غرضی کی قوت محرکہ کام کر رہی ہے میں اسے ترک کرنے سے ہچکچاؤں گا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص مجھے کسی مخصوص آدرش یا نصب العین کا درس دے اور خود غرضی اور ذاتی عیش و آرام کو خیرباد کرنے کے لیے کہے تو بھی میں اس نئی تعلیم کو ناقابل عمل کہہ کر اس پر عمل کرنے سے انکار ہی کروں

---

[1] Idealism.

[2] Realism. [3] Tendencies.

گا لیکن اگر کوئی شخص میرے سامنے ایک ایسا پست قسم کا سہل اور آرام دہ آدرش لے کر آتا ہے جو میری ذاتی اغراض کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے اور میں اس کی طرف بڑے ذوق و شوق سے لپکتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ آدرش میرا مخصوص آدرش ہے جس طرح ہم اپنی پسند اور طبیعت کے مطابق رسم پرستی[1] اور آزاد خیالی[2] کے مختلف معنی نکال لیتے ہیں اسی طرح ہم کسی آدرش یا نصب العین کو اپنی قابلیت اور رجحان کے مطابق قابل عمل یا غیر ممکن قرار دیتے ہیں مثلاً جسے میں آزادی کا نام دیتا ہوں اُسے آپ توہم پرستی کہہ سکتے ہیں جس بات کو میں مناسب اور قابل عمل سمجھتا ہوں اسے آپ غیر مناسب اور ناواجب قرار دے سکتے ہیں۔ ہمارے لئے کیا چیز قابل عمل ہے اس کا فیصلہ ہم اپنی محدود سمجھ سے کر لیتے ہیں اگر میں ایک دکاندار ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ دُنیا میں بس دکانداری ہی ایسی چیز ہے جو قابل عمل ہے اگر میں چور ہوں تو میرے لئے چوری ہی سب سے زیادہ عملی شے ہے دوسری باتیں عملی نہیں ہیں۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ کس طرح ہم صرف انھیں چیزوں کے لئے "قابل عمل" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور جو ہم کر سکتے ہیں اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیں کہ ویدانت اس قسم کا فلسفہ نہیں جسے ہم اپنی مرضی کے مطابق توڑ مروڑ لیں ویدانت کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے اس کی وسعت ایک مطلق آدرش یا عینیت کی ہم معنی ہے ویدانت کے آدرش کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں خود کو اخلاقی اور روحانی بلندیوں تک لے جانا ہوگا یہ آدرش جھک کر ہماری سطح تک آنے والا آدرش نہیں ہے لیکن میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ویدانت کسی ایسے آدرش کی تعلیم نہیں دیتا جو نا قابل عمل ہو۔ یہ آدرش بہت بلند ضرور ہے لیکن ہماری گرفت سے باہر نہیں اس آدرش کے مطابق آپ کی ہستی ایک ربانی ہستی ہے ویدانت کا نچوڑ ان تین لفظوں میں بھرا ہے "تو وہ[3] ہے" یعنی آپ کی اصل اور خدا کی حقیقت ایک ہی ہے انا الحق ہی ویدانت ہے۔ آخر بات یہی ہے کہ انسانی رُوح پاک اور منزہ ہوتی ہے اس کو ہر بات کا علم ہوتا ہے وہ دانائے کُل[4] ہے وہ قادر مطلق ہے اور لازوال و لافانی ہے۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے پیدائش اور موت کے توہمات بالکل بے معنی اور مہمل چیزیں ہیں روح نہ کبھی پیدا ہوئی تھی نہ کبھی اسکا خاتمہ ممکن ہے موت کا خیال یا خوف وہم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہم ہر کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ہم فلاں کام کر سکتے

---

[1] Orthodoxy.
[2] Hetrodoxy.
[3] Thou art That
[4] Omniscient.

ہیں اور فلاں کام کرنا ہمارے بس کی بات نہیں نہایت فضول اور بے معنیٰ ہے۔ دُنیا کے مذاہب کا عقیدہ ہے کہ جو شخص اپنی ذات کے باہر خُدا کے وجود پر ایمان نہیں لاتا وہ مُنکر ہے۔ کافر ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں جس شخص کو اپنی ذات میں یقین وایمان نہیں وہی دراصل کافر اور مُنکر ہے۔ ویدانت سے میں نے یہی سیکھا ہے، کہ خود اپنی رُوح یا آتما کی جلالت پر ایمان نہ لانا حقیقت سے مُنکر ہونا ہے اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ تو اس قِسم کے بلند و عظیم خیال ہی سے گھبرا جاتے ہیں اور ہم سے اکثر و بیشتر اصحاب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس آدرش تک کبھی ہماری دسترس ممکن ہی نہیں لیکن ویدانت للکار کر کہتا ہے اور یقین دِلاتا ہے کہ اس آدرش تک رسائی ہوسکتی ہے اس منزل پر ہر شخص پہونچ سکتا ہے سچ پُوچھیئے تو ہم منزل سے دُور ہی کب ہیں۔ ہمارا نصب العین ہماری دسترس سے باہر ہی کب ہے۔ ہم بذاتِ خود اپنی حقیقت آپ ہیں۔ یہاں نہ کوئی مرد ہے نہ کوئی عورت نہ کوئی بچّہ نہ نسل وجنس کا کوئی امتیاز ہے۔ اور نہ کوئی اور ہی ہماری راہ میں حائل ہے ہم اپنی منزل آپ ہیں۔ ہم خود ہی اپنا معبود ہیں۔ آخر ہمیں حاصل کیا کرنا ہے۔ دُنیا کی تمام طاقتیں ہم میں بس رہی ہیں۔ یہ ہمارا ہی قصور ہے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اور خواہ مخواہ "ہائے اندھیرا ہائے اندھیرا" چلاّ رہے ہیں۔ اندھیرا تو ہمارے اِرد گرد کہیں برائے نام بھی نہیں ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہاتھ ہٹا لیجئے۔ پھر آپ کو ہر طرف روشنی ہی روشنی نظر آنے لگے گی اصل یہ ہے کہ یہ روشنی ہمیشہ سے موجود ہے۔ تاریکی کا وجود کہیں ہے ہی نہیں۔ کمزوری قطعًا ناپید ہے ہم اگر اپنے آپ کو کمزور سمجھ بیٹھے ہیں تو یہ ہماری نادانی ہے ہم اگر اپنے آپ کو ناپاک تصور کر لیتے ہیں تو یہ ہماری بے بصری ہے۔ اِس بے عملی اور کم نظری کو مِٹانے کے لیئے ویدانت نہ صرف اِسی بات پر زور دیتا ہے۔ کہ ہمارا آدرش ہمارا نصب العین عملی ہے اور ہمیشہ سے اور ہر زمانے میں عملی رہا ہے۔ بلکہ ویدانت کا دعوےٰ تو یہ ہے کہ یہ آدرش یہ حقیقت خود ہماری فطرت ہے۔ قدرتی خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ اور جو بھی چیز آپ کو نظر آتی ہے اس کا وجود محض باطل ہے۔ غیر حقیقی ہے۔ جب کبھی آپ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ آپ کا وجود فانی ہے۔ یقین مانیئے کہ آپ غیر دانستہ طور پر حقیقت کا خون کرتے ہیں۔ ایسا کہنا قطعًا غلط ہے ایسا کہہ کر آپ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اپنے اوپر ایک قسم کا ہپناٹزم[1] کا عمل کرتے ہیں۔ اور اپنی تمام دِماغی قوتوں کو گہری نیند سُلا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کو اپنی حالت کی سراپا کثافت اور رذالت کا خیال تک نہیں آتا اور آپ بے بس اور مایوس ہو کر کسی قابل نہیں رہتے۔ بس اپنی مجبوری۔ بدبختی اور حرماں

---

[1] Hypnotism.

نصیبی کا رونا روتے ہیں۔ ویدانت آپ کو اس گہری نیند سے جگاتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ گناہ کوئی چیز نہیں ہاں ویدانت کی نگاہ میں اِنسان سے غلطی تو ضرور ہو سکتی ہے اور سب سے بڑی غلطی جسکے ہم مرتکب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو کمزور سمجھ بیٹھے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہم گنہ گار ہیں۔ سوختہ بخت اور بے بس ہیں ہمیں کوئی اختیار کچھ قدرت ہی حاصل نہیں۔ ہم یہ نہیں کر سکتے ہم وہ نہیں کر سکتے ایسے خیالات بنیادی طور پر غلط ہیں۔ جب بھی آپ اس انداز سے سوچتے ہیں۔ آپ اِس زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیتے ہیں جس نے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔ آپ کے دماغ پر ہپناٹزم کا جو عمل طاری ہے۔ اُس کی ایک اور تہہ بڑھ جاتی ہے۔ لہذا اچھی طرح سمجھ لیجئے جو شخص اپنے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ کمزور ہے اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے جو شخص خود کو کثیف اور ناپاک قرار دیتا ہے وہ جھوٹ کو تقویت دیتا ہے اور دُنیا میں ایک خام خیال نشر کرتا ہے۔ آپ کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ویدانت کے مطابق ہماری روزمرّہ کی مادی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ ایک ایسی زندگی ہے جو ایک قسم کی ہپناٹزم کے زیرِعمل ہے۔ اُس جھوٹی زندگی اور ابدی حیات کے مابین جو ہمارا آدرش یا نصب العین ہے۔ کسی قسم کی مصالحت ممکن ہی نہیں۔ اگر ہمیں اپنا مقصدِ حیات حاصل کرنا ہے تو اس جھوٹی زندگی کا خاتمہ ہی کرنا پڑے گا اور جب کہیں جا کر اس کے بجائے سچّی اور حقیقی زندگی جو ہمیشہ قائم اور برقرار رہتی ہے۔ ظہور پذیر ہوگی۔ اپنی تابانی دکھائے گی اسکے یہ معنی نہیں کہ انسان روز بروز زیادہ پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ یہاں تو معاملہ خود اپنی ذات کے زیادہ سے زیادہ انکشاف کا یوں سمجھیئے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھ جاتا ہے، اور رُوح کا جوہرِ خالص ظہور پذیر ہونے لگتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ پاکیزگی مکمل آزادی لازوال اور بے لوث محبت اور لاانتہا طاقت یہ سب چیزیں ہمارے قبضے میں پہلے ہی سے ہیں۔ ہم اُن کے مالک ہیں اور یہ سب چیزیں ازل سے ہماری ملکیت ہیں۔

ویدانت کے مطابق خودی کے اس اظہار کے لئے گھنے جنگلوں اور گہری گپھاؤں میں بیٹھنا کچھ ضروری نہیں۔ ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہر انسان اس آدرش کی تکمیل کر سکتا ہے اور اس طرح اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان حقائق کے دریافت کرنے کا سہرا جن بزرگوں کے سر ہے وہ نہ تو گپھاؤں میں رہتے تھے نہ جنگلوں میں زندگی گزارتے تھے نہ یہ لوگ ایسے تھے جو زندگی کے معمولی کاروبار میں مصروف رہتے تھے ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان حقیقتوں کے دریافت کرنے والے وہ لوگ تھے جن کی زندگیاں بدرجہ اُتّم مصروف تھیں ان میں ایسے سپہ سالار تھے جن پر ملک اور قوم کے تحفظ کی سخت ذمّہ داری عاید تھی ان میں شاہ اور شہنشاہ شامل تھے جو لاکھوں افراد رعایا کی خیر و فلاح کے ذمّہ دار تھے۔ یہ باتیں اس زمانے کی ہیں جب

مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ وہ زمانہ آج کل کا زمانہ تھا جب بادشاہ کا وجود محض نمائشی ہوتا ہے اس کے باوجود وہ لوگ ان تمام مسائل پر غور و خوض کرنے ان کو عملی صورت میں لانے اور تمام بنی نوع انسان کو ان کی تعلیم دینے کے لیۓ وقت نکال لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیۓ جن کو زندگی میں ان بزرگان پیشرو کے بمقابلہ کہیں زیادہ فراغت حاصل ہوتی ہے۔ ویدانت کو عملی جامہ پہنانے کا امکان اور بھی زیادہ ہونا چاہیۓ۔ اگر ہم ایسا نہیں کرسکتے تو اس میں ہمارا ہی قصور ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کے بمقابلہ ہمارا وقت بیشتر خالی گزرتا ہے ہمیں کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔ قدیم زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں کے بمقابلہ ہماری ضروریات کی کوئی اہمیت نہیں مثال کے طور پر ہماری حاجتیں اس ارجن کے بمقابلہ کہیں زیادہ ہیچ ہیں جو کوروکھشیتر کے میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیۓ سر بکف تھا۔ جو ایک بے شمار و قطار فوج کا سالارِ اعظم تھا۔ جنگ وجدل کے شور و غل میں بھی اس نے بلند ترین فلسفے کے موضوع پر گفتگو کرنے اور پھر اس کو اپنی زندگی میں ڈھالنے کا موقع نکال لیا اسی لیۓ ہمیں بھی اپنی اس زندگی میں ایسا ہی کام کرنا چاہیۓ۔ ہماری یہ زندگی نسبتاً زیادہ با فراغت ہے ہمیں فرصت کے لمحے زیادہ میسر آتے ہیں ہماری زندگی میں بیشتر آرام ہی آرام ہے یہ محض خیال ہی خیال ہے کہ ہمارے پاس وقت کم ہے درحقیقت ہم میں سے اکثر و بیشتر اصحاب اس سے کہیں زیادہ وقت نکال سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں کسی مفید کام کرنے کی سچی لگن ہو جتنی آزادی اور فارغ البالی ہمیں میسر ہے اس کے حساب سے اگر ہم چاہیں تو اپنی زندگی میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار یقیناً خود آگہی حاصل کرسکتے ہیں اور اس طرح ظہور خودی کے آدرش کی تکمیل کرسکتے ہیں لیکن اگر ہم میں حصول خودی کی ہمت نہیں تو کم از کم ہمیں اپنے آدرش کا مرتبہ گھٹا کر اسے واقعیت کی سطح پر نہیں لے آنا چاہیۓ آدرش بلند رہے گا تو ہم کبھی نہ کبھی اس بلندی تک پہونچ ہی جائیں گے لیکن اگر ہم اپنے آپ کو دھوکا دے کر ایک سطحی آدرش قائم کرلیتے ہیں تو ترقی اور رفتار کی تمام راہیں بند ہوجاتی ہیں بلکہ ہم پستی کی طرف گرنے لگتے ہیں ہمیں اس سلسلے میں ہمیشہ چوکنا رہنا پڑتا ہے تاکہ ہمارے قدم لڑکھڑا نہ جائیں ہمیں ان اشخاص سے خصوصاً احتراز کرنا پڑتا ہے جو ہماری غلطیوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض اشخاص ہماری غلطیوں کے سلسلے میں معذرت خواہ ہوتے ہیں۔ توبہ و استغفار سے کام لیتے ہیں اور اپنی تمام احمقانہ ضرورتوں اور خواہشوں کا جواز ثابت کرنے کے لیۓ عذر تراشی کا سبق سکھاتے ہیں اور ہماری کمزوریوں کو فلسفیانہ رنگ دے کر ہمیں دنیوی اور مادی خواہشات کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے جس چیز کو ہم آدرش سمجھ لیتے ہیں وہ آدرش نہیں بلکہ اسکے بالکل برعکس ہے ویدانت کوئی

ایسا سہل اور آرام دہ رستہ نہیں دکھاتا ویدانت پر عمل کرنے والوں کو اپنی زندگی آدرش کی بلندی تک لے جانا پڑتی ہے آدرش جھک کر زندگی کی سطح تک نہیں آسکتا۔ ہمارے عمل اور آدرش یا نصب العین کے درمیان مطابقت ہونا چاہیئے تاکہ ہماری چند روزہ عارضی زندگی بقید حیات ہی دوامی زندگی سے ہم آہنگ ہوجائے یہ بات ہمیشہ یاد رکھیئے کہ توحید[۱] ہی ویدانت کا مرکزی خیال ہے کسی بھی شئے میں دوئی کا وجود نہیں ویدانت کی رُو سے زندگی کی دو صورتیں نہیں ہیں ایسا نہیں ہے کہ اس دُنیا میں زندگی کی ایک شکل ہو اور عالم بالا میں دوسری بلکہ ویدانت تو دُنیا ومافیہا میں امتیاز کا قائل ہی نہیں حیات ابدی اور لافانی ہے اس کے ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔ یہ سچ ہے کہ شروع شروع میں ویدوں میں بیکنٹھ یا بہشت وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن آگے چل کر جب انھیں ویدوں میں بلند ترین فلسفے کا ذکر ہوتا ہے تو وہ جنت و دوزخ وغیرہ کے نظریوں سے گزر کر وحدتِ حیات ہی کا سبق دیتے ہیں دُنیا صرف ایک ہے اور ہستی یا وجود صرف ایک ہے دُنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب کی سب اُسی وحدت میں جذب ہیں بظاہر ہمیں جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ محض مدارج میں ہوتا ہے نوعیت میں نہیں مثلاً ویدانت قطعی طور پر اس قسم کے خیالات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ جانوروں کا وجود انسانوں کے وجود سے کوئی علیحدہ چیز ہے۔ نیز یہ کہ خدا نے ان کو اس لئے بنایا اور پیدا کیا ہے کہ ہم انھیں اپنی غذا کے طور پر استعمال کریں۔

بعض لوگوں نے ازراہِ ترحم زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کے خلاف سوسائٹی قائم کی ہے ایک بار میں نے اس سوسائٹی کے ایک رُکن سے دریافت کیا کہ میرے دوست یہ تو سمجھایئے کہ اگر آپ کے خیال میں جانوروں کو اپنی غذا بنانے کے لئے ان کی جان لینا جائز ہے تو سائینسی تجربوں کے لیے ایک یا دو جانوروں کی چیر پھاڑ کرنا کیوں ناجائز ہے انہوں نے جواب دیا "چیر پھاڑ کا کام بڑا دردناک ہوتا ہے لیکن چونکہ جانور تو ہماری غذا کے لئے ہی پیدا کیے گئے ہیں اس لئے اُن کا مارنا حلال ہے"۔ آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ اس منطق میں کہاں تک انسانیت اور اخلاق کو دخل ہے ویدانت اس قسم کی خود غرضی اور کم نظر فلاسفی کا قائل نہیں ویدانت کے دائرے میں تمام جانور بھی شامل ہیں اگر انسان امر ہے اگر اس کی زندگی لافانی ہے تو جانوروں کی زندگی بھی لافانی ہے وہ بھی وحدتِ حیات کے حصے دار ہیں وہ بھی پرماتما کا جزو ہیں ان کی تخلیق بھی رُوحِ اعظم سے ہوتی ہے فرق صرف مراتب کا ہے نوعیت کا نہیں مثلاً ایک اموبا[۲] کی زندگی اور میری زندگی کو ایک ہی لازوال ہستی یکساں طور پر متحرک کرتی ہے دونوں میں اگر کچھ فرق ہے تو درجے کا ہے اور جب بلند ترین زندگی کا

---

[۱] Oneness.

[۲] Amoeba.

نقطہ خیال پیش نظر ہوتا ہے تو اس قسم کی تفریق کالعدم ہو جاتی ہے جیسے زمین پر کھڑے ہو کر آدمی کو ایک طرف گھاس اور دوسری طرف درخت کے درمیان بڑا فرق معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دونوں چیزوں کو بلند مقام سے دیکھئے تو زمین پر چپکی ہوئی گھاس اور سرو قد پیڑوں میں کوئی فرق نہیں باقی رہتا اسی طرح بلند ترین آدرش یا مطمح نظر سے ادنیٰ ترین جانور اور بلند ترین انسان کا ظاہری فرق مٹ جاتا ہے اور زندگی کی یکسانیت جلوہ گر ہو جاتی۔ "اگر آپ کا ایمان خدا کے وجود پر ہے تو آپ کی نظر میں جانوروں اور بلند ترین مخلوقات دونوں کو یکساں ہونا چاہئے کیونکہ خدا کی نظر سب کے لئے یکساں ہے اُس کے لئے سب برابر ہیں۔ بہر حال میں تو ایسے ہی خدا کو مانتا ہوں میں اس خدا کو ماننے کے لئے تیار نہیں جو اپنے اس مخلوق کے حق میں جسے انسان کہتے ہیں. جانب داری سے کام لیتا ہے اور دوسری طرف اُن مخلوقات کے ساتھ بے رحمی سے پیش آتا ہے جنھیں جانور کہتے ہیں. میری نظر میں ایسا خدا شیطان سے بھی زیادہ ملعون ہے میں تو ایسے خدا کو پوجنے کے بجائے سینکڑوں مرتبہ مرجانا زیادہ پسند کروں گا. میں تو زندگی بھر ایسے خدا کے ساتھ لڑتا رہونگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آدمی ہو یا جانور زندگی دونوں میں ایک ہی ہے جان سب کی برابر ہے اور جو لوگ ان دونوں کے مابین کسی قسم کا فرق سمجھتے ہیں اصلیت سے بالکل بے خبر ہیں اور اپنی کم نظری اور کم آگہی سے اپنی خود غرضی کو ایک سستے قسم کے فلسفہ حیات کا رنگ دے کر اپنے آپ کو بلکہ اوروں کو بھی دھوکا دیتے ہیں جو مشکل کام وہ کرنا نہیں چاہتے اُسے ناقابل عمل قرار دے کر اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پست فلسفے کی تبلیغ کرتے ہیں. مثال کے طور پر میں کٹر سبزی خور[1] نہیں لیکن میں گوشت خوری کی تعلیم نہیں دیتا میں ویجی ٹیرینیزم (vegetarian ism) کے مفہوم کو خوب سمجھتا ہوں میں جانتا ہوں کہ جانوروں کو ہلاک کرنا ٹھیک نہیں جب میں گوشت استعمال کرتا ہوں تو جانتا ہوں کہ میرا یہ فعل غلط ہے، مجھے اس بات کا احساس ہے کہ یہ ایک بے رحمانہ فعل ہے لیکن اس کے باوجود اگر میں گوشت کھاتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ گوشت کھانا ضروری ہے یا گوشت سے کلیتاً پرہیز دائرۂ عمل سے باہر ہے. میرے لئے یہ قطعاً مناسب نہیں کہ میں اپنے آدرش کے وقار کو گھٹا کر اسے واقعیت کی سطح پر لے آؤں اور پھر اپنے اس فعل کے جواز میں اس طرح عذر خواہی کروں کہ آدرش تو یہ ہے کہ گوشت نہ کھایا جائے میں جانتا ہوں کہ تمام ذی روح ایک ہی ہستی کا جز و ہیں اس لحاظ سے میرے بھائی بند ہیں اور مجھے کسی جاندار کو بھی ایذا نہ پہونچانا چاہئے. لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل کی زندگی میں یہ آدرش قابلِ عمل نہیں" اس طرح کی بہانہ سازی ہماری اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہے ہم عموماً واقعیت سے گزر کر عینیت تک جانے سے کتراتے ہیں. اسی لئے ہمیشہ صرف ایسے اصول تراشتے رہتے ہیں جو ہمارے طرزِ عمل سے مطابقت رکھتے

---

[1] Vegetarian.

ہوں لیکن اگر ہمیں رُوحانی ترقی کی طرف قدم اُٹھانا ہے تو ہمیں اس طرح کی خود غرضی اور بہانہ جوئی سے گریز کرنا پڑیگا۔

فطرت انسانی میں قدامت پسندی کا رُجحان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ہم ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہیں چاہتے، چاہے کھڑے کھڑے موت ہی کیوں نہ آجائے اس لحاظ سے ہماری حالت اُن لوگوں کی سی ہے جو برفانی پہاڑوں میں برف کے طوفان سے گھر جاتے ہیں آپ نے سُنا ہوگا کہ ایسے لوگ آہستہ آہستہ برف میں دب جاتے ہیں اور ان پر ایک غشی سی طاری ہو جاتی ہے اگر اُنھیں برف سے نکال کر بچانے کی کوشش کی جائے اور جگانے کے لیئے جھنجھوڑا بھی جائے تو وہ اپنی بے حسی کی حالت میں بھی کہتے جاتے ہیں" بڑے مزے کی نیند ہے ہمیں سونے دو" اور کئی بار دوسروں کی کوششوں کے باوجود ایسے لوگ برف میں دَبے مر کر رہ جاتے ہیں ہم میں سے بیشتر انسان قدامت پرستی کی برف میں منجمد ہو کر رہ گئے ہیں ہم پر آرام طلبی کی غنود گی کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ ہمیں اپنی انسانیت کی موت تک بھلی معلوم ہونے لگتی ہے ہم سعی عمل سے گریز کرنے لگتے ہیں پہلے ہمارے پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں پھر دل اور دماغ بھی منجمد ہو جاتے ہیں اور ہم آہستہ آہستہ موت کی میٹھی نیند سو جاتے ہیں میں آپ کو دعوتِ عمل دیتا ہوں ہمیں ہمیشہ اپنے آدرش کی تکمیل کے لیئے جدوجہد کرتے رہنا چاہیئے اور اگر آپ کے پاس کوئی شخص ایسا آتا ہے جو اس آدرش کو گھٹا کر خواہشات کی سطح پر لانا چاہتا ہے اور کسی ایسے دھرم یا مذہب کی تعلیم دیتا ہے جس سے آپ کے آدرش کی تکمیل ممکن نہیں تو آپ اُس کی بات نہ سنیئے اس کی طرف سے کان ہٹا لیجئے۔ میں ایسی تعلیم کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں لیکن اگر کوئی شخص کسی ایسے مذہب کی تعلیم دیتا ہے جس کا نصب العین انتہائی بلند ہے تو میں اسکے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیئے تیار ہوں۔ ہمہ تن گوش ہوں۔ بس اگر کوئی شخص حواس کے مزعومات اور اس کی کمزوریوں کا جواز پیش کرنے کیلیئے حیلہ سازی سے کام لیتا ہے تو اس سے ہوشیار رہیئے اگر کوئی شخص اس قسم کی تعلیم دیتا ہے جس کی پیروی کرنے سے ہم محض ایک تودہ خاک بن کر رہ جائیں تو یاد رکھئے کہ ایسی تعلیم ایک دھوکا ہے فریب ہے اس میں ہماری ترقی کا کوئی امکان نہیں مجھے دُنیا کا کچھ تجربہ ہے میں نے اس قسم کے بہت سے ڈھونگ دیکھے ہیں۔ میرے مُلک میں مذاہب کُکرمتّے[1] کی طرح پیدا ہوتے ہیں ہر سال کوئی نہ کوئی فرقہ معرض وجُود میں آجاتا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں وہی لوگ ترقی کرتے ہیں جو انسان کی رُوحانی بلندیوں کو مادّی ضروریات اور خواہشات کی پستیوں تک نہیں کھینچ لاتے جو ایک مہاتما پُرش کے کردار کو گوشت و پوست والے ایک عام آدمی کے درجے تک لانے کی کوشش نہیں کرتے اور جو حقیقت کے علمبردار اور سچائی کے پرستار انسان اور خواہشات کے بندوں میں مطابقت پیدا کرنے سے انکار کرتے ہیں جہاں انسانی مرغوبات اور بلند ترین آدرشوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کا غلط خیال ہوتا ہے جہاں خدا کو گھسیٹ کر انسانی سطح پر لایا جاتا ہے وہیں تباہی آتی ہے۔

ل سوامی جی کے اِس خیال کی میں نے کسی اور سلسلے میں یوں تشریح کی ہے:۔۔۔ (ایڈیٹر) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

[1] mushrooms.

انسان کو دُنیوی خواہشات کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال کرخود اپنی تحقیر کا موجب نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اپنی رُوحانی آزادی کا احساس رکھتے ہوئے یزدانی مراتب کی طرف اُٹھنا چاہیئے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں دوسروں کو حقارت کی نظر سے ہرگز نہیں دیکھنا چاہیئے۔ہم سب کی منزل ایک ہی ہے ہمیں ایک ہی سمت قدم اُٹھانا ہے۔کمزوری اور طاقت، نیکی اور بدی، زندگی اور موت دوزخ و بہشت کے درمیان جو بھی فرق ہے وہ صرف درجے کا ہے۔غرض یہ کہ دُنیا کے تمام تفرقات کا تعلق مدارج سے ہے نوعیت سے نہیں کیونکہ ہر چیز کی اصل وحدت میں مخفی ہے یہاں تو بات بس ایک کی ہے۔خیال کی غیر مرئی نزاکت ہو یا زندگی کا شدید احساس رُوح کا بیروں از ادراک تصور ہو یا جسم کی ٹھوس مادی صُورت سب کی تہ میں وحدت ہی کام کر رہی ہے۔سب دراصل ایک ہیں اور ان سب کے درمیان جو فرق ہے وہ بس درجے کا ہے اِسی لیئے ہمیں اُن لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں جنھوں نے اتنی ترقی نہیں کی ہے جتنی ہم نے کی ہے کسی کو بھی نشانۂ ملامت نہ بنایئے۔اگر آپ کسی کی طرف امداد کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں تو ضرور بڑھایئے۔اگر آپ کسی کے کام آنا چاہتے ہیں تو آپ ضرور اُس کے کام آیئے۔اگر آپ ایسا کرنے سے معذور رہیں تو ہاتھ جوڑ دیجئے۔اپنے بھائیوں کے حق میں ضرور خیر و برکت کی دُعا کیجئے اور اُن کو اپنے رستے پر چلنے دیجئے۔کسی کو ذلیل و حقیر کرنا اور بُرا بھلا کہنا کام کرنے کا صحیح ڈھنگ نہیں ہے۔کام اس طرح کبھی تکمیل نہیں پاتے ہم دوسروں کو نشانۂ ملامت بنانے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتے ہیں۔نکتہ چینی اور مذمت سے کچھ حاصل نہیں اس میں ہمیں اپنی طاقتیں ضائع کرنا نہیں چاہیئے کیونکہ آخر کار سب لوگوں کی نگاہیں ایک ہی مرکز کی طرف مائل ہیں۔اور کم و بیش ایک ہی آدرش کی طرف اٹھ رہے ہیں ہمارے باہمی اختلافات اور تفرقات ہماری انفرادی شخصیتوں کے اپنے اپنے طریقۂ اظہار سے زیادہ کچھ

(بقیہ حاشیہ) اگر ہمیں حقیقی معنوں میں رُوحانی معراج کی خواہش ہے تو ہمیں رنج و الم میں ڈوب کر بھی نشاط کا تقاضا کرنا ہوگا۔ظلمات میں گھر کر بھی نُور کی تلاش کرنا ہوگی۔

گندگی اور سڑانڈ کے ماحول میں بھی رنگ و بُو کے خیال سے وابستہ رہنا ہوگا۔بدصُورتی اور قباحت کے دائرے میں مرکزِ حُسن سے غفلت نہیں اختیار کرنا ہوگی۔شیطنت کے طوفان میں یزدانی کو محفوظ رکھنا ہوگا۔حیوانیت کے دَور میں انسانیت کا علمبردار ہونا ہوگا۔جھُوٹ کے جابرانہ عہد میں سچائی پر جان دینا ہوگی۔اور شور و غل میں نغمۂ ازلی کی سماعت کرنا ہوگی۔جب جا کر ہم موت کو شکست دے سکیں گے اور اپنی زندگی کو جاوید بنا سکیں گے۔

اور معنی نہیں رکھتے۔ گنُاہ کا معاملہ ہی لے لیجئے۔ میں ابھی ابھی آپ کے سامنے گنُاہ کے بارے میں ویدانت کا نظریہ پیش کر رہا تھا۔ اِس کے خلاف کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسان گنُہ گار ہے۔ دونو باتیں عملاً یکساں ہیں ایک کا پہلو مثبت ہے اور دوسری کا منفی ایک سے اِنسان کی طاقت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری سے اُس کی کمزوری۔ ویدانت کا تو قول ہے کہ ہم میں کمزوری ہے تو بھی کچھ مضائقہ نہیں ہمیں تو ترقی کرنا ہے اور ترقی کے لیئے یہ کہاں تک ضروری ہے کہ ہم ہر وقت اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر کرتے رہیں اپنے گنُاہوں کو مرکزِ خیال بنائے رکھیں۔ کمزوریاں اور خامیاں تو جنم سے ہمارے ساتھ ہیں۔ مانا کہ گنُاہ ازل سے ہماری گھٹی میں پڑے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں طاقت حاصل کرنا ہے اگر ہمیں پاکیزگی حاصل کرنا ہے تو ہمیں طاقت اور پاکیزگی کا خیال کرنا ہوگا جیسے ہم میں ہر شخص کو اپنے مرض کا علم ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ بار بار کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم کو کون کون مرض لاحق ہیں ہر وقت یہ سوچتے رہنے سے کہ ہم بیمار ہیں۔ مریض ہیں ہمیں شفا حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لیئے دَوا کرنا ضروری ہے۔ ہم خارجاً کوئی بھی بات بھلا سکتے ہیں، فراموش کر سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو چکمہ دے سکتے ہیں۔ دوسروں کو اُلّو بنا سکتے ہیں۔ ہم بیرونی دُنیا کے ساتھ اس طرح لاکھ مکّاری برتیں لیکن اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی نہیں کر سکتے۔ اندرونِ قلب اپنی برُائیوں کا پوُرا علم ہوتا ہے۔ اِسی لیئے ویدانت کا تو کہنا یہ ہے کہ کمزوری کا ذکر کرنے سے کچھ کام نہیں چلے گا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہو۔ لیکن طاقت اس بات سے حاصل نہیں ہوتی کہ ہم ہر وقت کمزوری کا ہی خیال کیا کریں۔ کمزوری کا یہ علاج نہیں کہ ہر وقت اُسی کی فِکر میں گھلا کریں۔ اُس کا عِلاج تو یہ ہے کہ ہم صِرف طاقت کا تصور کریں۔ اِس بے کنار طاقت کا خیال کریں جو ہم سب کے اندر موجود ہے کون کہتا ہے کہ ہم گنُہ گار ہیں اس کے برعکس ویدانت ہمیں یقین دِلاتا ہے کہ ہم پاک وصاف ہیں ہر طرح مکمل ہیں اور جس چیز کا نام ہم نے گنُاہ رکھ چھوڑا ہے اُس کا تو ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں آؤ ہم اس رُوح خیز پیغام کو اپنائیں آؤ ہم اس نئے فلسفۂ حیات پر عمل کریں اِس جاں بخش پیغام کو دوسروں تک پہونچائیں۔ آؤ ہم گنُاہ کی پست گھاٹیوں سے نِکل کر پاکیزگی کی برف پوش چوٹیوں میں سانس لینا سیکھیں وہی دراصل ہمارا مقام ہے یوں تو انسان کے ہر عمل سے اس خودی کا اظہار ہوتا ہے اور جس چیز کو ہم گنُاہ کہتے ہیں وہ بھی ایک قِسم کا عمل ہے اُصولاً گنُہ گار بھی اپنے عمل کے ذریعہ ایک نہ ایک دن اپنی ذات

سے واقف ہوسکتا ہے اور یہ ہوتا بھی ہے کہ جب گناہ اپنی حد تک پہونچ جاتا ہے تو گنہ گار کو اپنی گراوٹ کا احساس اس شدّ و مد سے ہوتا ہے کہ وہ تیزی سے اوپر اٹھنے لگتا ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس غلط راہ سے اپنی منزل کی طرف چلیں ۔ ویدانت ہمیں انکشافِ ذات کا وہ اعلیٰ اور کشادہ راستہ دکھاتا ہے جس پر ہم سب چل سکتے ہیں ۔ یاد رکھیئے کہ ہماری حقیقی ذات سے اعمالِ بد کا جنہیں ہم گناہ کا نام دیتے ہیں کوئی تعلق نہیں ۔ ہم براہِ راست اپنی ذات کا انکشاف کرسکتے ہیں ۔ صرف ضرورت ہے ایمان ویقین کی خود اعتمادی کی ۔ ویدانت کہتا ہے کہ اپنی زبان پر لفظ "نہیں" کبھی نہ لایئے ۔ ایسا کبھی نہ کہیئے کہ فلاں کام میرے بس کا نہیں ۔ آپ کی طاقتیں لامحدود ہیں ۔ آپ کی ذات کے بمقابلہ تو وقت اور مقام کی بھی کوئی وقعت نہیں ۔ آپ کوئی بھی کام کرسکتے ہیں' آپ قادرِ کُل ہیں ۔

یہ تو ہیں علم اخلاق کے بنیادی اصول ۔ آیئے اب ہم حقیقت کی سطح پر اتریں ۔ اور صورتِ حالات کا تفصیلی جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم ویدانت کو کس طرح اپنی روزمرّہ کی زندگی میں اُتار سکتے ہیں خواہ وہ زندگی شہری ہو خواہ دیہاتی ۔ انفرادی زندگی ہو یا قومی اگر کوئی دھرم کوئی مذہب انسان کی مدد ہر جگہ اور ہر حالت میں نہیں کرسکتا تو وہ بیکار محض ہے ۔ اُس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا ۔ ایسا مذہب صرف چند برگزیدہ اشخاص کے لیئے ایک اصول بن کر رہ جاتا ہے ۔ سچّا مذہب وہی ہے جو ہر حالت میں ہر مقام پر اور ہر وقت بنی نوع انسان کی مدد کرنے کے قابل ہو اور فی الواقع مدد کرے ۔ آدمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو خواہ آزاد ہو خواہ وہ پستی کی گہرائیوں میں ہو ۔ خواہ صفائی اور پاکیزگی کی بلند ترین رفعتوں پر مذہب کو ہر صورت میں انسان کا مددگار اور دوست ہونا چاہیئے کسی مذہب میں اس عظیم فرض کو سرانجام دینے کی جتنی بھی صلاحیت ہوگی اتنا ہی وہ ویدانت کے اصولوں اور مذہبی آدرش کے نزدیک ہوگا اور یہ آدرش ہے خود اعتمادی کا یہی ہمارا سچا مددگار اور رہبر ہے ۔ اگر ہمیں خود اعتمادی کی تعلیم وسیع پیمانے پر دی جاتی اور ہم اُس پر عمل پیرا ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ہماری بیشتر خرابیاں اور مصیبتیں کب کی دور ہو چکی ہوتیں ۔ آپ بنی نوع انسان کی تاریخ چھان ڈالیئے تمام عظیم مردوں اور عورتوں میں اگر کسی قوتِ محرکہ نے بہت زیادہ زور کے ساتھ کام کیا ہے تو وہ طاقت اس اعتقاد کی ہے جو اُنھیں اپنی ذات میں تھا وہ یہ شعور لے کر پیدا ہوئے تھے کہ انھیں کسی نہ کسی روز بڑا ہونا ہے اور واقعی وہ بڑے ہوگئے ان کو عظمت حاصل ہوکر رہی یوں تو کبھی کبھی انسان پستی کی گہرائیوں میں

گرنے کے باوجود بلندی کی جانب مائل ہونے لگتا ہے اور اُسے اپنی ذات میں اعتقاد حاصل ہو جاتا ہے لیکن ہم سب کے حق میں بہتر یہی ہے کہ شروع ہی سے اپنے اوپر اعتبار کرنا سیکھ لیں اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ خود اعتمادی حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے تلخ تجربات سے گزریں۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی دو شخصیتوں کے درمیان یہ جو کچھ فرق ہے اس کی اصل وجہ خود اعتمادی کا بیش یا کم ہونا ہے۔ ہمارے تمام کام خود اعتقادی ہی کے زور سے ہوتے ہیں۔ خود اعتمادی ہی کامیابی کی اصل بُنیاد ہے۔ یہ کہی سُنی بات نہیں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے خود اعتمادی سے حاصل ہوا ہے اور میں اب تک جو کچھ بھی ہوں اسی کی بدولت ہوں اور جوں جوں میری عمر بڑھتی جاتی ہے اپنی ذات میں میرا اعتقاد مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے جس شخص کو اپنی ذات میں اعتقاد نہیں وہ کافر ہے پُرانے مذہبوں کے مطابق مُنکر وہ ہے جس کو خدا کی ذات میں اعتقاد نہیں جس جدید دھرم یا مذہب کا میں پرچار کرتا ہوں جس کی میں تبلیغ کرتا ہوں اُس کی رُو سے مُنکر وہ شخص ہے جس کو خود اپنی ذات میں اعتقاد نہ ہو لیکن یاد رہے کہ ویدانت جس خود اعتقادی کی تعلیم دیتا ہے وہ خود اعتقادی خود غرضی اور خود نُمائی کے مترادف نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ ویدانت کا سدّھانت یا اُصول توحید ہے۔ یکتائی ہے۔ ایک ہی ہستی ہے جو سب میں جلوہ گر ہے۔ میری اور آپ کی اصل یہی ایک ہستی ہے۔ اِس لحاظ سے مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں یا یوں کہیئے کہ آپ ہی کی ذات کا ظہور سب لوگوں میں ہے۔ اب اگر آپ کو اپنے اوپر اعتقاد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو سب کی ذات میں اعتقاد ہے یعنی آپ کسی کو اپنے سے کم درجہ یا حقیر ماننے کے لئے تیار نہیں اسی طرح اگر آپ کو اپنی ذات سے محبت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو سب سے محبت ہے اور آپ کی اِس ہمہ گیر محبت میں چرند پرند سب شامل ہیں۔ کیونکہ تمام جانداروں کی ذات آپ ہی کی ذات ہے، یہ ہے وہ ذات عظیم جس کی طاقت ہی وہ حقیقی طاقت ہے جس سے انقلاب پیدا ہوتے ہیں اور جس میں دُنیا کی حالت بدلنے کی صلاحیت ہوتی ہے بلند ترین انسان وہی ہے جو یقیناً یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے اپنی ذات کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ کے اِس جسمانی ڈھانچے میں کتنی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ انسان کی ذات میں کیا کچھ موجود ہے۔ اِس بات کی خبر کس سائنس داں کو ہے؟ جب سے انسان نے دُنیا میں قدم رکھا ہے۔ کروڑوں سال گزر چکے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی تک اس کی پوشیدہ طاقت کے قلیل ترین حصے کا بھی اظہار

نہیں ہو پایا۔ آپ کی طاقت بے پایاں ہے۔ اِس لیئے آپ کو اپنی زبان پر یہ الفاظ لانا ہی نہیں چاہیئے کہ آپ کمزور ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ اس سطحی پستی کے پسِ پشت کتنے اِمکانات چھپے ہوئے ہیں آپ کے باطن میں کیا کچھ موجود ہے۔ آپ کے اندر کیا کیا طاقتیں کام کر رہی ہیں اس کی تو آپ کو خبر ہی نہیں۔ آپ کے پسِ پشت تو لاانتہا طاقت اور فضل و برکت کا ایک بے پایاں سمندر تلاطم خیز ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ آخر اس طاقت کے منبع تک کس طرح پہونچا جا سکتا ہے۔ ویدانت کہتا ہے کہ رُوحانی جستجو کا پہلا قدم یہ ہے کہ آتما کا ذِکر سُنا جائے اور اُس پر غور کیا جائے۔ دن رات آپ کے کانوں میں یہی آواز آنا چاہیئے کہ آپ رُوح ہیں۔ آتما ہیں۔ آپ ہر وقت بار بار یہی کلمہ زبان پر لائیے۔ اسی کا وِرد کیجیے حتےٰ کہ یہ آپ کی رگ رگ میں ریشے ریشے میں پیوست ہو جائے آپ کے خُون کے ہر قطرے میں اُس کی جھنکار ہو آپ کی ہڈی ہڈی میں یہی کلمہ سرایت کر جائے آپ کے تمام جسم میں یہی آدرش کار فرما رہے کہ نہ میری کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ میں نہ کبھی پیدا ہوا نہ کبھی مجھے موت آئے گی۔ میں جینے مرنے کی قید سے آزاد ہوں۔ میں آنند ہوں سراپا سرور ہوں۔ میں عالم کُل ہوں، قادرِ مطلق ہوں۔ میں ہی وہ آتما وہ رُوح ہوں جس کی تابانی دوامی ہے۔[۱] دن رات آپ اسی خیال میں محو و مستغرق رہیئے۔ اس وقت تک آپ یہی تصوّر کیئے جائیے حتےٰ کہ یہ آپ کا جُزوِ زندگی بن جائے۔ اسی کا دھیان کیجیے۔ بار بار یہی مراقبہ و مزاولت کیجیے اور پھر دیکھیے کہ یہ بلند آدرش کس طرح عمل میں مبدّل ہو سکتا ہے اور کیونکر آپ کے ہر کام میں محرک بنتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ:

"اِنسان کے مُنہ سے سچّی اور صاف بات اُسی وقت نکلتی ہے جب اُس کا دل خدا کے خیال سے بھرپُور ہوتا ہے۔[۲] اُس کے ہاتھ اسی حالت میں نیک کام کر پاتے ہیں جب اُس

۱؎ "I am the birthless, the deathless, the blissful, the omnicent, the omnipotent ever glorious Soul".

۲؎ "Out of the fullness of the heart the mouth speaketh"

کے دِل میں یزدانی ہدایت پُوری طرح کارفرما ہوتی ہے"۔[ل]

آپ یہ سوچ کر نہ گھبرائیں کہ اگر پرماتما کے دھیان میں لگے رہے تو دُنیا کے کام کیونکر ہوں گے کام ضرور ہو کر رہیں گے۔ آپ کے ہاتھوں سے بڑے بڑے کام سرانجام ہوں گے لیکن لازم یہ ہے کہ آپ اپنی آتما کی حقیقت سے ہرگز غافل نہ رہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ خودشناسی کا بلند آدرش آپ کی ذات میں سمو جائے۔ خواہ آپ کچھ کریں ہمیشہ اسی کا تصوّر آپ کے سامنے رہے۔ اس خیال کی طاقت ہی سے آپ کا ہر عمل معنی خیز ہو جائے گا۔ اُسے ایک نئی شان ایک نئی عظمت عطا ہو جائے گی آپ خود محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا ہے۔ آپ میں دیوتاؤں کی طاقت اور پاکیزگی آجائے گی اس خودی ساز خیال میں کتنی قوت ہے۔ اِس کا اندازہ لگانا بہت مُشکل ہے۔ آپ مادّی طاقت سے تو واقف ہیں خیال کی طاقت مادّی طاقت سے لاکھوں گُنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ طاقت قدرت مطلق ہے۔ دُنیا کے سب کام اسی طاقت کی بدولت ہوتے ہیں۔ اِسی لیئے آپ کو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اپنی آتما کی شکتی کا خیال رہنا چاہیئے۔ اپنی تمام زندگی کو اس خیال سے وابستہ کر لیجیئے اور اسے پُوری طرح اثرانداز ہونے دیجیئے۔ کبھی مت بھُولیئے کہ دراصل آپ بذاتِ خود وہ ہستی ہیں جو قادرِ مطلق ہے۔ شاہنشاہِ کائنات ہے جس کے جاہ وجلال سے جہانِ شہود کی شان وشوکت پیدا ہے جس کے نورِ تجلّی سے مہر و ماہ روشن ہیں جس کے عکسِ جمال سے نظیرِ انسان میں حُسن کی جلوہ نمائیاں ہیں۔ میری دُعا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی حقیقت سے آگاہ رہیں۔ خدا کرے کہ آپ کبھی بھی اس قِسم کے توہمات سے محصُور نہ ہوں کہ ہم کمزور ہیں۔ ناتواں ہیں۔ کم ظرف ہیں۔ حقیر ہیں۔

کاش خدا ایسا کرتا کہ انسان کو ایک ایسا سیدھا اور سہل راستہ مِل جاتا جس پر گامزن ہو کر وہ اِس حقیقت تک پہونچ جاتا اور اُسے خودیابی کی سعادت آسانی سے نصیب ہو جاتی لیکن رضائے الہٰی کو یہ منظور نہیں ہوا۔ اِنسان کو اپنی منزل پر پہونچنے کے لیئے بہت سے مشکل مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ آپ محنت سے کام لیں اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لیئے مشعلِ راہ بنا ڈالیں غلط روی

ل and out of the fullness of the heart the hand worketh also.

سے رُوحانی رستے کو اُن لوگوں کے لئے دُشوار نہ بنائیے جو آپ کے بعد آنے والے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ جس فلسفہ خیال کا پرچار میں کر رہا ہوں اُس کو سُنکر بہت سے لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں اس خیال سے ہی کہ ایک ناچیز مُشتِ خاک خُدائے ذوالجلال کے مرتبے کو اپنا سکتا ہے۔ ایک ذرّہ خورشید کی طرح درخشاں ہو سکتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو ڈر سا لگنے لگتا ہے لیکن اس دہشت کا واحد علاج یہی ہے کہ حقیقت کا سامنا بے خوف ہو کر کیا جائے۔ رُوحانی راہ پر چلنا شیروں کا کام ہے۔ بزُدلوں کا نہیں اور میرا خطاب ہمیشہ بہادروں سے ہوتا ہے۔ کائروں سے نہیں۔ اِسی لئے تو میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ بعض لوگ میری باتوں سے دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اُن پر خوف وہراس کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ میں اس دہشت انگیز اور خوفناک آدرش کا پرچار کرتا ہوں اور آپ کو اس مشکل سفر کے خطرات سے آگاہ کرتا ہوں۔ رستے کی مشکلات کو جاننے والا مُسافر منزل پر جلد پہونچ جاتا ہے۔ اگر آپ واقعی راہِ عمل میں قدم رکھنا پسند کرتے ہیں تو کبھی بھُول کر بھی نہ اپنے سے کہیں نہ دوسروں سے کہ آپ کمزور ہیں، اذھین ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی کو کمزور اور مجبور کہنا اُسے سخت ایذا پہونچانے کے برابر ہے۔ کمزوری کے احساس کو جگانے سے نہ صرف آپ کو اور آپ کے دوستوں کو بلکہ دُنیا کو گزند پہونچتا ہے آپ کو اس قِسم کی ایذا رسانی سے احتراز کرنا لازم ہے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو خود اپنے دِل کی گہرائیوں سے یہ آواز سُنائی دے گی کہ اس قِسم کے تمام محدود اور کمزور کُن خیالات کُلیتاً بے بنیاد ہیں۔ اپنے آپ کو کمزور اور حقیر سمجھنا اور خیالی خداؤں کے سامنے گڑگڑانا اور رونا دھونا محض توہّمات ہیں مجھے تو آج تک ایک بھی ایسی مثال نہیں ملی جس میں رونے اور گڑگڑانے والوں کی کوئی بھی دُعا مستجاب ہوئی ہو کوئی بھی مُراد پوری ہوئی ہو جہاں کہیں کوئی دُعا قبول ہوئی ہے وہ خود دُعا کرنے والے کی اندرونی طاقت کے بیدار ہونے سے درِقبول تک پہونچی ہے۔ کسی بیرونی دیوی دیوتا یا پیرومُرشد کی وساطت سے نہیں جب کسی کو خاطرخواہ جواب ملا ہے تو اپنے دِل ہی سے مِلا ہے۔ آپ کی اپنی آتما کی حقیقت کے سوا اور سب چیزیں محض طِلسم ہیں۔ افسوں ہیں۔ مثلاً آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ بھُوتوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن جیوں ہی آپ اندھیرے میں قدم رکھتے ہیں۔ آپ کے دل میں ایک سرسراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بچپن سے ہمارے دِل و دماغ میں اِسی قِسم کے خیالات داخل ہوتے رہے ہیں۔ اور سالوں تک اُن کی نشوونما ہوتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ یہ سب توہمات

ہماری زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ اگر ہم اِن خیالات سے رہائی نہیں پا سکتے تو نہ سہی لیکن ہمارا فرض ہے کہ کم از کم دوسروں کو اِن خیالات سے بچائے رکھیں۔ بسا اوقات اِن خیالات کو غلط جانتے ہوئے بھی رائے عامہ کے خوف سے یا اِس خیال سے کہ کہیں ہمارے دوست ہم سے منھ نہ موڑ لیں۔ ہم اِن غلط خیالوں کو اپنائے رکھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ان کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہمارے خیالوں کو ہمارا غلام ہونا چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ اِن خیالات پر قابو حاصل کرلیں اور اپنی زندگی کو اپنی ذات کی عظمت کے خیال سے بھر لیں۔ کوئی ہم کو اِس سے زیادہ بلند تعلیم نہیں دے سکتا کہ یہ ساری دُنیا یہ سارا برھمانڈ ایک ہے اور اِس وحدت کی اصل خود ہماری اپنی ذات ہے اس لیئے ہمیں اپنی ذات میں پُورا اعتماد ہونا چاہیئے۔ پچھلے ہزاروں سال سے انکشافِ ذات ہی بنی نوعِ اِنسان کی تمام سرگرمیوں کا واحد مقصد رہا ہے اور انسان آج تک اِس مقصد کی تکمیل کے لیئے کوشاں ہے۔ میں آپ کو خود یابی کی دعوت دیتا ہوں یا یوں سمجھیئے کہ آپ کو چیلنج دیتا ہوں کہ اپنے آپ کو پہچانیئے۔ آپ کو دماغی طور پر وحدتِ ہستی کا علم تو ہے ہی کیوں کہ آج کل ہر طرف اور ہر مقام پر اسی حقیقت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ صِرف فلسفہ اور رُوحانیات ہی نے نہیں بلکہ تمام مادی سائنسوں نے بھی اسی حقیقت کا اعلان کیا ہے۔ آج ایسا کون سائنس داں ہے جس کو تمام عالمِ کائنات کی وحدت کو تسلیم کرنے میں پیش و پس ہو۔ کِس میں یہ کہنے کی جرأت ہے کہ کائنات ایک نہیں اگر زمانۂ حال میں کوئی کہتا ہے کہ عالم کئی ہیں تو آپ ایسے پڑھے لوگ اس کی باتوں کو دقیانوسی توہمات سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے۔ زندگی صِرف ایک ہے اور یہی ایک زندگی، یہی ایک دُنیا۔ ہمیں کثیر التعداد شکلوں میں کام کرتی ہوئی نظر آرہی ہے یہ کثرت محض ایک خواب ہے جیسے نیند میں ایک خواب کے بعد دوسرے خواب کا سِلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اِس طرح کئی کئی خواب یکے بعد دیگرے دِکھائی دیتے ہیں۔ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ خواب کی کوئی حقیقت نہیں۔ آپ خوابوں کی دُنیا میں نہیں رہتے۔ اِس لیئے جب آنکھ کھلتی ہے تو آپ فوراً اپنی روز مرّہ کی زندگی میں لوٹ آتے ہیں۔ یہی کیفیت ہماری اِس دُنیا کی ہے۔ دراصل یہ تمام عالمِ شہود ایک طِلسم ہے۔ آج ہم جس دُنیا میں رہتے ہیں اُس میں نوّے فی صد دُکھ اور تکلیف ہے اور صِرف دس فی صد راحت پائی جاتی ہے۔ کل اسی دُنیا میں نوّے فی صد راحت نظر آسکتی ہے اور اس وقت ہم اُسے جنت قرار دینے لگیں گے۔ اصل میں دُنیا بدلتی نہیں ہے۔ یہ کبھی

جہنم اور کبھی جنت نہیں ہوتی ۔ فرق ہے تو صرف ہماری نظر کا ۔ ہم جس نظر سے دُنیا کو دیکھیں گے
ویسا ہی پائیں گے ۔ آپ پوچھیں گے کہ دُنیا کی حقیقت کیا ہے؟ میں کہوں گا آپ خود اس حقیقت
کو سمجھنے کی کوشش کریں جو لوگ پاک دِل اور روشن ضمیر ہیں اُن کے لیئے ایک ایسا وقت آتا ہے
جب یہ سارا کھیل آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور یہ دُنیا مجسم برہم بن جاتی ہے اس میں ہر طرف اور ہر شکل میں خدا
ہی خدا نظر آنے لگتا ہے ۔ ساتھ ہی اُن کو خود اپنی آتما میں بھی برہم یا خُدا نظر آنے لگتا ہے ۔ اسی لیئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نہ تو کائنات
میں عالم کثیر التعداد ہیں نہ زندگی ۔ اس تمام کثرت میں ایک ہی ہستی ایک ہی وجود کی جلوہ آرائی ہے ۔ وہی ایک ہستی مادہ
رُوح ۔ دماغ ۔ خیال اور تمام دوسری صورتوں میں نمودار ہو رہی ہے وہ ہستی وہ وجود
یکتا ہے، واحد ہے جس کا انکشاف اتنی شکلوں سے ہو رہا ہے ۔ اِس لیئے ہمیں پہلے جو قدم اُٹھانا
چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا درس خود بھی لیں اور دوسروں کو بھی دیں ۔ آیئے ہم آج تمام
دُنیا میں اِس حقیقت کا نعرہ بلند کریں تاکہ خود شناسی کے آدرش کی آواز فضا میں ہر طرف
گونج اُٹھے اور ہر قسم کے توہمات ناپید ہو جائیں ۔ آیئے ہم یہ حقیقت اُن لوگوں کو جتا دیں جو ناتواں
ہیں، کمزور ہیں اور بار بار ان کو یہی تعلیم دیں کہ آپ وحدت[۱] خالص ہیں ۔ آپ کے علاوہ اور کوئی
وجود ہے ہی نہیں، جاگیئے اُٹھیئے اپنی بے پایاں قوت، اور طاقت سے آگاہ ہو جایئے ۔ آپ میں نہ
جانے کتنی بڑی بڑی طاقتیں موجود ہیں ۔ یہ نیند آپ کو زیبا نہیں دیتی ۔ یہ سونا آپ کے لئے موزوں نہیں
ہاں ہاں جاگیئے ۔ نیند کے ماتے نہ بنیئے اُٹھیئے آپ کی یہ حالت آپ کے شایانِ شان نہیں مت
خیال کیجئے کہ آپ کمزور ہیں ۔ آپ کی حالت خراب و خستہ ہے دراصل آپ کو ہر قسم کی قدرت حاصل ہے
آپ قادر مطلق ہیں ۔ اُٹھیئے جاگیئے اور خود اپنی فطرت کا انکشاف کیجئے ۔ آپ کے لئے خود کو گنہ گار قرار
دینا مناسب نہیں ۔ آیئے اپنی حقیقت اپنے آپ کو سمجھایئے اور دوسروں کے لئے اس کا اعلان
کیجئے ۔ پھر دیکھیئے کہ اس کا عملی نتیجہ کیا نکلتا ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر چیز بجلی کی سی تیزی سے بدل کر اپنے
اصلی رُوپ میں ظہور پذیر ہو جاتی ہے ۔ بس آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ جلد از جلد خود آگہی حاصل
کریں اور پھر دوسروں کو اس حقیقت سے آگاہ کریں اور اُن کو دکھا دیں کہ ان میں کتنی زبردست
طاقت کتنی توانائی ہے ۔ جب تک ہم اس حقیقت سے بذاتِ خود روشناس نہیں ہوتے ۔ ہماری
روز مرہ کی عملی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آسکتی وویک یا قوت امتیاز سے کام

۱؎ Pure One.

لینے اور اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اپنے ہر فعل وعمل میں یہ سمجھنے کے لئے کہ کون چیز صحیح ہے اور کون غلط کون بات سچی ہے اور کون جھوٹی۔ ہمیں سچائی پرکھنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہیئے اور اس طریقۂ عمل کا علم ہمیں اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جب ہم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ جان جاتے ہیں کہ حقیقت یا سچائی جو ہر خالص ہے وُحدت ہے، ہر ایسی چیز جس سے وحدت کا ظہور ہو سچائی ہے محبت حق ہے اور نفرت باطل محبت سے وحدت پیدا ہوتی ہے نفرت سے کثرت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے محبت دو دلوں کو ملاتی ہے نفرت کا جذبہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے علیحدہ کرتا ہے اسی لیے محبت حقیقت سے وابستہ ہے نفرت ایک غلط اور جھوٹی چیز ہے یہ وہ طاقت ہے جس سے انتشار اور اختلال پیدا ہوتا ہے یہ دو چیزوں کو علیحدہ کرتی ہے محبت ہم سب کو ایک کرتی ہے ماں اور بچے کی محبت ہو یا خاوند اور بیوی کی کسی خاندان کے لوگوں کا ایک دُوسرے سے میل جول ہو یا کسی شہر کے یا ملک کے رہنے والوں کا اپنے شہر یا ملک کا پیار سب کرشمے ہیں اُس ایک وحدت کے جس کے ساتھ منسلک ہونے کے لیئے ہم سب غیر شعوری طور پر بیتاب ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم دانستہ اِس حقیقت کے اس مقام تک پہونچنے کی کوشش کریں جہاں نہ صرف انسانی اخوت موجود ہے بلکہ انسان وحیوان کی تمام کائنات گھل مل کر ایک ہو جاتی ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ محبت ہی وجود مطلق ہے محبت ہی خدا ہے محبت ہی تمام عالمِ شہود ہے محبت کے ان جلوؤں میں فرق صرف درجے کا ہے نوعیت کا نہیں یہ سارے جلوے اصل میں ایک ہیں اور اسی ایک حقیقت کو پانا ہمارے لئے حاصلِ حیات ہے اسی لئے ہمیں اپنے ہر عمل میں ہر فعل میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سے کثرت ظہور پذیر ہوتی ہے یا وحدت اگر کسی عمل کا نتیجہ اختلاف یا انتشار نظر آئے تو ہمیں اُسے خیرباد کہہ دینا چاہیئے اور اس سے وحدت ظہور پذیر ہوتی ہے تو یقیناً وہ عمل اختیار کرنے کے قابل ہے یہی حال ہمارے خیالات کا ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان خیالات سے افتراق وانتشار پیدا ہوتا ہے کثرت کو ہوا ملتی ہے یا وحدت کا ظہور ہوتا ہے انسان انسان سے جُدا ہوتے ہیں یا ایک رُوح دوسری رُوح کے ساتھ مربوط ومتحد ہوتی ہے اگر ہمارے خیالوں سے میل جول کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ہمیں ان کو قبول کرلینا چاہیئے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی تو ہمیں ایسے خیالوں کو قطعاً ترک کردینا چاہیئے۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کے درمیان جو فرق ہے اُسے واضح کردیا جائے۔

اخلاق کے بنیادی طور پر کسی ایسی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا جس کا ادراک نہ کیا جاسکے۔ اُس کی تشکیل سماجی اور انفرادی ضروریات کو مدِّنظر رکھ کر ہوتی ہے۔ اُس کا دارومدار کسی ایسی ہستی

پر نہیں ہے جو دائرۂ علم سے باہر ہو اس سے ایسی کسی چیز کا درس نہیں ملتا جو نا معلوم ہو لیکن بسبب مذ کی بنیاد ہی ایک ایسی چیز ہے جو عقل و خرد کی گرفت سے باہر ہے۔ اپنشدوں کے الفاظ میں جس خدا کی پرستش ہم یہ سمجھ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہے میں آپ کو اسی خدا کی تعلیم دیتا ہوں" آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے دماغ سے ہر چیز کا ادراک کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کو محض اپنی ذات یعنی اپنی خودی کے ذریعہ ہر چیز کا علم ہوتا ہے مثلاً میرے سامنے یہ کرسی رکھی ہے میں اُسے دیکھ رہا ہوں لیکن کرسی کو دیکھنے کے لئے پہلے مجھے خود اپنا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے مجھے خود اپنے آپ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اِس کے بعد میں کرسی کو دیکھتا ہوں۔ پہلے دیکھنے والے کی ہستی کا علم ہوتا ہے پھر کرسی اور چیز کا، شاہد پہلے اور مشہود بعد میں آتا ہے۔ کرسی مجھے اپنی ذات کے وسیلے ہی سے نظر آتی ہے۔ اُسی ذات کے وسیلے سے مجھے آپ سے واقفیت ہوتی ہے تمام دنیا کا علم ہوتا ہے جو کچھ میں دیکھتا ہوں سُنتا ہوں محسوس کرتا ہوں جانتا ہوں سب میری اپنی ہی ذات کا جزو ہے اس سے تخلیق ہوتا ہے اِسی لیئے یہ کہنا کہ یہ ذات یہ وجود یہ خودی ایک ایسی چیز ہے جس کا ہمیں علم نہیں جسے ہم جان نہیں سکتے جو ہمارے ادراک سے باہر ہے بے سمجھی اور نادانی کی علامت ہے محض فضول اور بے معنی سی بات ہے اس ذات کو اس وجود کو اس خودی کو اپنے دماغ سے اپنے تصور سے نکال دیجئے تو تمام عالم کائنات کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا اب آپ ہی بتایئے کہ اس حالت میں ہماری اپنی ذات سے نزدیک اور کون چیز ہو سکتی ہے اس سے زیادہ معروف چیز اور کوئی نہیں ہے جس چیز کو آپ "میں" کہتے ہیں وہ خود آپ کی ذات ہے۔ آپ سوچتے ہونگے کہ آخر میرا یہ "میں" آپ کا "میں" کیسے ہو سکتا ہے۔ لفظ "میں" ہم سب استعمال کرتے ہیں لیکن ہماری مُراد اپنی اپنی شخصیت سے ہوتی ہے آخر ہم سب ایک کیونکر کہلائے جا سکتے ہیں۔ اِس سے بھی زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ کس طرح یہ محدود "میں" لامحدود اور بے پایاں ہو سکتا ہے۔ ویدانت کی رُو سے ہماری ذات درحقیقت لامحدود اور بے پایاں ہے محدود" ہیں تو محض ایک نظر کا دھوکا ہے ایک بناوٹی افسانہ ہے دراصل لامحدود وجود پر تو پردہ سا پڑا ہوا ہے اور اس کا ایک جزو صغیر "میں" کی شکل میں ظہور پذیر ہے۔ محدودیت کبھی لامحدود پر غالب نہیں آسکتی۔ ایسا کہنا محض افسانہ سرائی ہے۔ اِسی لیئے غور سے دیکھا جائے تو اس ذات کا علم ہر مرد عورت اور بچے سب کو ہے حتےٰ کہ جانوروں کو بھی اس کا علم ہے۔ اُس کے جانے بغیر نہ ہم جی سکتے ہیں نہ حرکت کر سکتے ہیں نہ ہمارا وجود قائم رہ سکتا ہے اس مالکِ کُل کی معرفت حاصل کیئے بغیر تو ہم سانس بھی نہیں لے سکتے۔ لمحہ بھر کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ویدانت کے خدا کی

ہستی تو ایسی ہے جس سے زیادہ علم اور کسی چیز کا ہو ہی نہیں سکتا وہ محض تخیل کی پیداوار نہیں ہے وہ ہماری اصلیت ہے اسی کے دم سے ہم زندہ ہیں وہ ہے تو سب کچھ ہے وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اَب آپ خود ہی بتایئے کہ اس سے زیادہ عملی مذہبی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے جسے میں دیکھ رہا ہوں جو میری رگ رگ میں رواں ہے جو ہر جاندار میں موجود ہے جس کے وجود کی حقیقت سے سارے حواس قائم ہیں اگر ہمیں اپنے حواس خمسہ پر اعتبار ہے تو ہمیں خدا پر بھی ایمان لانا ہوگا کیونکہ اسی کی قدرت سے یہ حواس اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور یہ خدا کہیں دُور آسمانوں میں نہیں بستا اس کی ہستی سے ہماری خودی قائم ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اگر ہم اپنی محدود خودی سے گزر کر دیکھیں تو ہماری ہستی اور خدا کی ہستی ایک ہے انا الحق کے یہی معنی ہیں۔ آپ خود دراصل خدا ہیں وہ خدا جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے جو قادرِ مطلق ہے جو آپ کی رُوحوں کی رُوح ہے۔ جانوں کی جان ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ خُدا نہیں ہیں تو یہ بات غلط ہوگی جھوٹ ہوگا مجھے اس کی حقیقت کا علم ہے۔ خواہ مجھے ہر وقت اُس کا احساس ہو یا نہ ہو اُسی کا نام ہے وحدت وہی اتحادِ کُل ہے وہی اس تمام حیاتِ کائنات کی اصل حقیقت ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام خیالات کی تفصیلی وضاحت کی جائے جن پر ویدانت کا اُصول مبنی ہے اُسکے لئے آپ کو صبر و تامل سے کام لینا پڑے گا جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا ہے ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ غور کرینگے اس کی مکمل طور پر وضاحت کریں گے ہم دیکھیں گے کہ ان اعلیٰ خیالات کی نشو و نما معمولی آدرشوں سے کس طرح ہوئی ہے اور وحدت کا عظیم آدرش یہ گراں پایہ نصب العین کس طرح پایۂ تکمیل کو پہونچا اور کیسے اس نے عالمگیر محبت کی صُورت اختیار کرلی ۔ مذہبی زندگی کے خطرات سے بچنے کے لیئے بھی ہمیں ان سب باتوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر یہ کیا لازمی ہے کہ ادنیٰ ترین مدارج سے لے کر خودی کے اعلےٰ مقامات تک سب مدارج کا مطالعہ کیا جائے۔ ہمارے پاس اس قدر وقت بھی تو نہیں ہے میں یہ بات سمجھتا ہوں لیکن ہمارے بلند ترین مدارج پر پہونچ جانے سے حاصل کیا ہوگا؟ اگر ہم اس حقیقت سے اُن لوگوں کو روشناس نہ کرائیں جو ہمارے بعد آنے والے ہیں۔ اِس لیے تفصیلی طور پر اس کا مطالعہ کرنا زیادہ اچھا ہوگا اور سب سے پہلے تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ مذہب کے معاملے میں عقل و خرد کو کہاں تک دخل ہے سچ تو یہ ہے کہ عقل و دماغ کا یہاں زیادہ کچھ کام نہیں۔ سب سے زیادہ اہم چیز تو دل ہے، خدا کا تصور دماغ میں تو نہیں آسکتا ہاں اس کا جلوہ دل میں پایا جاسکتا ہے عقل و خرد کی اتنی اہمیت ضرور ہے کہ یہ رُوحانی راہ کو آسان بنانے میں مدد کرتی ہے۔ جیسے خاک روب سڑک صاف

کرتے ہیں یا مزدور اس کی مرمت کرتے ہیں یا پولیس اُن کی دیکھ بھال کرتی ہے اسی طرح عقل و دماغ بھی ثانوی حیثیت سے ہماری مدد کرتے ہیں لیکن جیسے سماج کا کام پولیس کے بغیر بھی چل سکتا ہے! اسی طرح دل براہِ راست خدا کو پا سکتا ہے لیکن جیسے پولیس سماج میں بدامنی اور انتشار کو روکتی ہے اور غلط کاری کی روک تھام کرتی ہے اِسی طرح عقل و دماغ کی مدد سے ہم اپنے آپ کو گمراہ ہونے سے بچا سکتے ہیں لیکن عقل و خرد ہمیں اپنی منزل تک لے جانے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ عقل و دماغ کے آنکھیں نہیں ہوتیں یہ اندھے ہوتے ہیں اور بذاتِ خود حرکت نہیں کر سکتے۔ عقل و دماغ کے نہ ہاتھ ہوتے ہیں نہ پاؤں۔ کام تو اُس وقت جاکر ہوتا ہے جب اُسے کرنے کی دل سے ٹھان لی جائے۔ ارادہ مصمم ہو تو کام بجلی کی رفتار سے بھی کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ آپ کا ارادہ مصمّم ہے یا نہیں آپ میں شدّت احساس ہے کہ نہیں آپ سچے دل سے رُوحانی ترقی کی آرزو رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو یقیناً آپ کو خدا کا دیدار حاصل ہوگا۔ آپ کے دل میں جو احساس ہے اس میں زور پیدا ہوگا اور وہ قوی سے قوی تر ہوتا ہوا آخر خودی کے اس مقام پر پہونچ جائیگا جہاں خودی اور خدا میں کسی قسم کا امتیاز نہیں رہتا۔ جہاں خالق اور تخلیق میں فرق مٹ جاتا ہے۔ آپ کو ہر چیز کا وجود محسوس ہونے لگے گا۔ ہر چیز میں وحدت نظر آنے لگے گی اور خود اپنے اندر اور دوسروں کی ہستی میں خدا کی ہستی کا اشراق ہونے لگے گا یہ عقل کے بس کی بات نہیں عقل کا میدان ہی اور ہے۔ وہاں لفاظی زیادہ ہے اور عمل کم جیسا کہ کسی نے کہا ہے "بیان کے مختلف ڈھنگ، کتابوں کے متن کو سمجھانے کے لئے جُداگانہ طور وطریق یہ سب کے سب عالموں کو محظوظ کرنے کے وسیلے ہیں ان سے رُوح کو نجات نہیں حاصل ہو سکتی"۔

آپ میں سے جن اصحاب نے ٹامس کیمپیس (
کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس نے اپنی کتاب کے تقریباً ہر صفحہ پر یہی کہا ہے کہ خدا تک رسائی دل کی ہوتی ہے عقل کی نہیں۔ دُنیا کے قریب قریب ہر مقدّس انسان نے بھی اسی بات پر زور دیا ہے۔ عقل ضروری چیز ہے کیونکہ عقل کے بغیر ہم سے بڑی بڑی کوتاہیاں سرزد ہو جاتی ہیں ہم نہ جانے کیسی کیسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں عقل سے اِن کوتاہیوں اور غلطیوں کی روک تھام ہوتی ہے لیکن عقل کا دائرہ صرف یہیں تک ہے اس کے سہارے آپ اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ اس کی بنیاد پر کوئی اور عمارت تعمیر نہیں کر سکتے۔ عقل آپ کو گرنے سے بچا سکتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے محرک نہیں ہو سکتی جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کی حیثیت ثانوی ہے آپ کا اصلی مددگار تو دل ہے اگر آپ کے احساس میں شدت ہے، آپ کے جذبۂ محبت میں گرمی ہے اگر آپ دوسروں کے دُکھ سُکھ کو اپنا دُکھ سُکھ سمجھتے ہیں تو آپ کا دل زندہ ہے اور آپ وحدت کی آب و ہوا میں نشو و نما

پا رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں دوسروں کے دُکھ سکھ کا احساس نہیں ہے۔ اگر آپ ہمدردی کے جوہر سے محروم ہیں تو آپ دُنیا کے سب سے بڑے عاقل اور دانا اِنسان تو ہو سکتے ہیں ایسے عاقل اور دانا اِنسان جو شاید ہی کبھی پیدا ہوئے ہوں مگر ان سب باتوں کے باوجود آپ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آپ کی ہستی صِفر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی آپ محض عقل خشک ہیں اور ایسے ہی رہیں گے لیکن اگر آپ کے دل میں تڑپ ہے اگر آپ حسّاس ہیں تو آپ عالِم ہوں خواہ اَن پڑھ، زباں داں ہو یا کوئی بھی زبان نہ جانتے ہوں۔ آپ صحیح راستے پر گامزن ہیں یقیناً خُدا آپ کا ہے۔

دُنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ پیغمبروں کی طاقت کا منبع کہاں تھا؟ آخر اُنھیں یہ طاقت کِس سرچشمے سے حاصل ہوئی تھی؟ کیا یہ طاقت اُنھیں عقل سے مِلی تھی؟ کیا اُن میں سے کسی نے بھی فلسفہ پر کوئی اعلیٰ کتاب لکھی تھی؟ منطق کے پیچیدہ بحث و مباحثہ پر قلم اُٹھایا تھا؟ نہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی کوئی کتاب قلم بند نہیں کی تھی اُن کی زبان سے تو چند الفاظ نکلے تھے لیکن وہ لاکھوں انسانوں کو اپنی تیز و تند لہروں میں بہا کر دُنیا میں انقلاب پیدا کر گئے۔ کیا آپ کے دل میں بھی اس شدتِ احساس کی اہلیت ہے؟ آپ بھی حضرت مسیحؑ کی طرح محسوس کیجئے آپ خود حضرت مسیح بن جائیں گے۔ آپ اپنے خیالات کو مہاتما بدھ کے خیالات کی شکل دیں تو آپ کی ہستی سے مہاتما بدھ کی شخصیت نمودار ہو جائے گی احساس ہی تو زندگی ہے۔ طاقت ہے قوتِ حیات ہے۔ اگر آپ میں قوتِ احساس نہیں تو عقل کی کسی کارفرمائی سے بھی آپ کو خُدا حاصل نہیں ہو سکتا۔ عقل تو اُن اعضا کے مانند ہے جن میں حرکت کرنے کا مادہ نہیں ہوتا اعضا میں جب قوت حاسّہ داخل ہوتی ہے اور اُن کو آمادۂ تحریک کرتی ہے اس وقت اُن میں جنبش ہوتی ہے اور اُن کا عمل دوسروں پر مترشح ہوتا ہے یہی حالت دُنیا کی ہے اور یہ وہ بات ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ ویدانت کے دائرۂ اخلاق میں یہ سب سے زیادہ قابلِ عمل سمجھی جاتی ہے۔ ویدانت تو آپ کو یہی تعلیم دیتا ہے کہ دراصل آپ پیغمبر ہیں۔ بنی ہیں۔ آپ میں بھی وہ طاقت کارفرما ہے جو پیغمبروں میں جلوہ گر ہوئی تھی آپ کی زندگی کا مقصد اسی طاقت کو بیدار کرنا ہے اُسے منظرِ عام پر لانا ہے اور آخر نبوت کے مقام پر پہونچنا ہے۔

غیب سے نازل ہوئی کتابیں آپ کے طرزِ عمل کا ثبوت نہیں خود آپ کی ذات کو ان کتابوں کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ آخر جب تک آپ اپنے عمل سے حقیقت کو نہیں پالیتے آپ کو کیسے معلوم ہو کہ فلاں کتاب سے حقیقت کا درس مِلتا ہے جب تک خود آپ کو اس بات کا یقین نہیں ہو جاتا کہ آپ بذات خود ہی حقیقت ہیں۔ آپ خود ہی مجسم سچائی ہیں۔ آپ حضرت عیسےٰ، مہاتما بدھ اور دوسرے اوتاروں اور پیغمبروں کی ذات پر یقین کیسے لا سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب کو ایسا ہی محسوس بھی ہوتا ہے لیکن آپ آج تک اس

احساس کو زبان پر نہیں لا سکے یہی وہ بات ہے جو ویدانت آپ سے علانیہ کہتا ہے۔ دُنیا میں جو حضرت مسیحؑ اور مہاتما بُدھ ایسی ہستیاں گزری ہیں اُن کے پیغام کا ثبوت آخر یہی تو ہے کہ ہم اور آپ سب یکساں طور پر اُن کے احساسات کو اپنے دل میں موجزن پاتے ہیں اُن کی ہر بات پر کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی دل کی بات ہے۔ ہم اُنکے خیالات کے ان کے احساسات کے حصّے دار ہیں اور اسی شرکت کی بدولت ہم اُنکے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اُن پر یقین لاتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ وہ لوگ حق اور صداقت کے علم بردار تھے بہ الفاظِ دیگر ہماری اپنی ذات میں جو پیغمبرانہ جھلک ہے وہی ثبوت ہے ان بزرگوں کی پیغمبری کا آپ کی ذات جسمے خدائی کا ظہور ہو رہا ہے وہی خُدا کی ہستی کا ثبوت ہے اگر آپ خود خدا کے پیغمبر نہیں ہیں تو خدا کے متعلق کسی بھی صداقت کا کبھی کوئی وجود ہو ہی نہیں سکتا یا یوں کہیئے کہ اگر آپ خود خُدا کی ہستی میں شریک نہیں تو خُدا کے نام کی کوئی چیز کبھی دُنیا میں تھی ہی نہیں اور نہ آئیندہ ہوگی۔ ویدانت کا کہنا یہ ہے کہ یہی وہ آدرش ہے یہی وہ نصب العین ہے جس کی پیروی ہمیں کرنا چاہیئے ہم میں سے ہر شخص کو پیغمبر بننا پڑے گا اور بننا کیا پڑیگا آپ اب بھی پیغمبر ہیں صرف آپ کو اُس کی معرفت اس کا علم ہونا چاہیئے۔ کبھی دل میں یہ تصور بھی نہ لائیئے کہ کوئی کام ایسا بھی ہے جسے رُوح نہیں کر سکتی۔ اِسکے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے اگر دُنیا میں گناہ کوئی چیز ہے تو وہ بس یہی ہے کہ آپ خود کو کمزور قرار دیتے ہیں یا دوسروں کو کمزور بتاتے ہیں مجھے آپ سے بس یہی کہنا ہے کہ آپ اپنی طاقت سے آگاہ ہو جایئے۔

عملی ویدانت

دوسرا لیکچر

(یہ لیکچر نومبر ۱۸۹۶ء کی بارہویں تاریخ کو لندن میں دیا گیا)

آج کا لیکچر میں چھاند وگیہ[1] اپنشد کی ایک بہت پرانی کتھا سے شروع کروں گا جس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک لڑکے کو کس طرح معرفت حاصل ہوئی۔ یہ کتھا جس ڈھنگ سے پیش کی گئی ہے وہ بھدّا ضرور ہے لیکن اس سے ایک کام کی بات نکلتی ہے اُس میں ایک اُصول مضمر ہے۔ کہانی یوں ہے کہ ایک لڑکے نے اپنی ماں سے کہا کہ میں ویدوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ مجھے میرے باپ کا نام اور میرا گوتر بتا دیجئے۔ ماں کی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی تھی اور ہندوستان میں ایک ایسی عورت کی اولاد کو جس کی باقاعدہ شادی نہ ہوئی ہو ذات باہر سمجھا جاتا ہے سماج اس کو قبول نہیں کرتا نہ اُسے وید پڑھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اِس لیے غریب ماں نے جواب دیا "جانِ جگر، مجھے تمھارے گوتر کا پتہ نہیں میں تو مُلازمہ تھی۔ کئی جگہ کام کرتی تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمھارا باپ کون ہے۔ لیکن میرا نام جابالا[2] ہے اور تمھیں لوگ ستیہ کام کہتے ہیں۔ وہ چھوٹا بچہ ایک رشی کے پاس گیا اور اُس نے اُن سے درخواست کی کہ آپ مجھے اپنا چیلا بنا لیجئے۔ رشی نے دریافت کیا "تمھارے باپ کا کیا نام ہے اور تمھارا گوتر کیا ہے؟ اِس لڑکے نے رشی جی سے "مِن وعن" وہی بات کہہ دی جو اُس کو اُس کی ماں نے بتائی تھی۔ اس پر رشی جی مہاراج نے کہا کہ ایک سچے برہمن کے علاوہ اور کوئی شخص اپنے متعلق بدنامی کی بات اِس طرح سچ سچ زبان پر نہیں لا سکتا۔ بیٹا تم برہمن ہو۔ تم سچ سے منحرف

---

[1] Chhandogya Upanishad

[2] Jabala

نہیں ہوئے میں تمھیں اپنا چیلا قبول کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر رشی جی نے لڑکے کو اپنے پاس رکھ لیا اور اُسکو تعلیم دینے لگے۔ قدیم ہندوستان میں تعلیم کا جو طریقہ[۱] رائج تھا اُسکے مطابق رشی جی نے ستیہ کام کو چار سو دُبلی پتلی اور نہایت نحیف گائیں دے کر اُن کی نگرانی کا حکم دیا اور جنگل روانہ کر دیا۔ ستیہ کام چلا گیا اور کچھ عرصے تک جنگل میں رہا۔ گُرو جی نے کہہ دیا تھا کہ جب گایوں کی تعداد بڑھ کر ایک ہزار ہو جائے تو واپس آنا۔ کئی سال بعد ستیہ کام کو مویشیوں کے گلّے میں ایک سانڈ نظر آیا جو یہ کہہ رہا تھا "اب تو ہماری تعداد ایک ہزار ہو گئی۔ اگر تم ہمیں اپنے گُرو کے پاس لے چلو تو میں تمھیں برمّھ وِدّیا سِکھاؤں گا۔" ستیہ کام نے کہا "ضرور سکھایئے مہاراج"۔ سانڈ نے جواب دیا "پُورب ایشور (خُدا) کا ایک انگ ہے اور اسی طرح پچھم دکھن اور اُتّر بھی اُس کے انگ ہیں یہ چاروں سمتیں برمھا کے چار انگ ہیں اس سے زیادہ جاننا چاہتے ہو تو اگنی سے پُوچھ لو۔ اگنی سے تمھیں برمّھ وِدیا کے بارے میں کچھ اور درس ملے گا۔"

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اُس زمانے میں آگ کو ایک بہت بڑی شکتی مان کر پُوجا جاتا تھا اور ہر برمھ چاری یعنی طالب علم کو پُوجا کے لئے آگ تیار کرنا پڑتی تھی۔ خیر۔ دوسرے روز ستّیہ کام اپنے گُرو جی کی کُٹی کی طرف چل دیا۔ راستے میں شام ہو گئی۔ ستیہ کام نے ہاتھ مُنھ دھو کر آگ جلائی اور یگیہ کرنے لگا وہ پُوجا کر رہا تھا کہ اُسے اگنی سے نکلتی ہوئی یہ آواز سُنائی دی۔ "ستیہ کام۔ ستیہ کام۔" ستیہ کام نے کہا "بھگوان کیا آگیا ہے۔ کیا حکم ہے؟" (شاید آپ کو یاد ہو گا کہ انجیل کے عہد نامۂ قدیم[۲] میں ایک روایت درج ہے جو بالکل اس روایت سے ملتی جلتی ہے اس حکایت میں سیموُل کو ایک عجیب و غریب آواز سُنائی دی تھی) جواب میں پھر آواز آئی "کہ ستیہ کام میں تم کو برمّھ وِدّیا یعنی ذات مطلق کے عرفان کی سِکھشا یعنی تعلیم دینے آیا ہوں۔ یہ زمین اِس برمّھ کا ایک جزو ہے۔ یہ آسمان بھی اُسکے جزو ہیں۔ سمندر بھی اُس کا ایک حِصّہ ہے اس سے آگے تمھیں ایک پرندہ اُپدیش دے گا۔" یہ کہہ کر اگنی دیوتا کی آواز خاموش ہو گئی۔ ستیہ کام نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دوسرے روز جب وہ شام کے وقت یگیہ سے فارغ ہوا اُس کے پاس ایک ہنس آیا۔ ہنس نے کہا "ستیہ کام مجھے برمھ وِدیا کے متعلق تمھیں یہ اُپدیش دینا ہے کہ یہ اگنی بھی جس کی تم پرستش کرتے ہو اسی برمھ کا ایک انگ ہے۔ ایک جُزو ہے۔ یہ سورج یہ

---

[۱] اِس طریقۂ تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ طالب علم سالوں تک اپنے گُرو کے ساتھ رہتا اور اُس کی خدمت کرتا تھا۔ چونکہ گُرو عموماً شہروں سے باہر جنگل میں رہتے تھے۔ اِسی لئے شاگردوں کو کھُلی فضا میں رہ کر قدرت کی وسعتوں کا بخوبی مطالعہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔

[۲] Old Testament.

چاند اور یہ بجلی بھی اسی برمّھ کا ایک جزو ہیں"۔ اب مڈگو نام کا ایک پرندہ تم کو اس بارے میں اور بھی باتیں بتائے گا"۔ دوسرے روز شام کو وہ پرندہ نمودار ہوا اور ستیہ کام کو ویسی ہی ایک آواز سُنائی دی وہ آواز کہہ رہی تھی کہ "مَیں تم کو برمّھ اُپدیش دوں گا یہ سانس بھی برمّھ کا ایک جزو ہے اور تمھاری یہ قوتِ باصرہ یہ قوتِ سامعہ اور یہ مَن بھی اسی برمھ کا ایک جزو ہے" اِس طرح وہ لڑکا اب اپنے گُرو کی کُٹی تک آ پہونچا۔ وہ گُرو جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے اُنھیں پرنام کیا۔ گُرو جی نے چیلے کو دیکھتے ہی فرمایا "تمھارا چہرہ برمّھ گیانی (عارفِ حق) کی طرح چمک رہا ہے۔ تم کو یہ برمھ گیان کی تعلیم کس نے دی۔ ستیہ کام نے کہا "کسی آدمی نے نہیں بلکہ دوسرے کئی جانداروں نے مجھے کچھ گیان دیا ہے لیکن میری خواہش تو یہ ہے کہ آپ مجھے برمھ وِدّیا کی پُوری تعلیم دیں کیونکہ مجھے آپ ہی ایسے محترم بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ جو تعلیم گُرو جی سے مِلتی ہے صِرف اسی سے پرم کلیّان ہوتا ہے"۔ اِس پر رِشی جی نے ستیّہ کام کو وہ سب تعلیم دی جو اُن کو دیوتاؤں سے حاصِل ہوئی تھی۔ گُرو جی نے کوئی راز۔ کوئی نکتہ ستیہ کام سے چھپا نہ رکھا۔

یہ ذِکر چھوڑیئے کہ سانڈ۔ آگ اور پرندے نے جو تعلیم دی اُسکے استعاروں کا مُدّعا اور مفہوم کیا ہے غور طلب بات یہ ہے کہ اِس کہانی سے ہمیں اس زمانے کے حالات اور رُجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ جس خیال کا اصل اصول اس کتھا میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب آوازیں ہماری انترآتما ہمارے اندرونِ قلب سے آتی ہیں۔ جیوں جیوں یہ حقائق ہماری سمجھ میں آتے جاتے ہیں ہمیں یہ زیادہ سے زیادہ پتہ چلتا ہے کہ یہ آواز خود ہمارے دِل کی آواز ہے۔ اِس کہانی سے ستیہ کام یہ تو خوب سمجھتا رہا کہ وہ اس تمام دَوران میں حق و صداقت کی باتیں سُن رہا ہے لیکن اس نے جو وضاحت کی تھی وہ درست نہیں تھی وہ سمجھتا رہا کہ یہ آواز کہیں باہر سے آرہی ہے۔ حالانکہ یہ آواز ہر وقت خود اُسکے اندرونِ قلب سے آرہی تھی اور یہ راز بعد میں اُس کے گُرو نے اُسے بتا دیا۔ اِس کہانی سے جو دوسری بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ برمھ وِدّیا کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جا سکتا ہے۔ دُنیا ہمیشہ مذہب کے عملی امکانات کی تلاش میں رہتی ہے اور ان حکایتوں سے ہمیں یہی پتہ چلتا ہے کہ مذہبی تعلیم کو کس طرح آہستہ آہستہ عملی رنگ دیا گیا۔ یہاں ابتدا ان سیدھی سادی باتوں سے ہوئی جو پہلے ہی سے طالب علم کے ماحول میں تھیں اور جن سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اِنھیں روزمرّہ کی چیزوں میں حقیقت کی چمک کو اُبھارا گیا مثلاً جس آگ کی پرستش کی جارہی تھی اُسے برمھ بتایا گیا پھر یہ کہا گیا کہ یہ زمین بھی برمھ ہے۔ اِسی طرح دُنیا کی ہر چیز میں اُسی ایک برمھ کے ظہور کی تعلیم دی گئی۔

اَب میں آپ کو ایک اور کہانی سُناتا ہوں۔ اِس حکایت کا تعلق ہے اُپ کوشلا کملیا نہ[1] سے۔ جو ستیہ کام کا چیلا تھا۔ اُپ کوشلا کملیا نہ ستیہ کام سے تعلیم حاصل کرنے آیا اور کچھ دِنوں اُس کے پاس رہا ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ستیہ کام کچھ دِنوں کے لئے باہر چلا گیا۔ کملیا نہ کو گروجی کی جُدائی کا بہت دُکھ ہوا اور وہ اُداس اُداس رہنے لگا۔ ایک دن گروجی کی استری نے اُس سے پوچھا کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا کہ رنج کے مارے مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا اُس کی زبان پر یہ الفاظ آئے ہی تھے کہ ہون کنڈ کی اگنی سے آواز آئی۔ یہ جیون (زندگی) برمھ ہے۔ برمھ ہی آکاش[2] ہے۔ اور برمھ ہی آنند ہے تم برمھ گیان حاصل کرو۔ اِس سے سب رنج دُور ہو جاتے ہیں۔

لڑکے نے جواب دیا "مجھے اِس بات کا پتہ ہے کہ جیون برمھ ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ برمھ آکاش بھی ہے اور آنند بھی۔ اس پر اگنی نے وضاحت کی کہ آکاش[3] اور آنند دونوں سے مُراد ہے وہ حقیقت یعنی چیتنیہ آکاش (ادراک خالص) جس کا قیام دل میں ہے۔ برمھ ہی خارجی زندگی ہے اور برمھ ہی جیون ہے وہ ستیہ ہے جو دل میں رہتا ہے یہ زمین۔ یہ غذا۔ یہ اگنی۔ یہ سورج سب کے سب برمھ ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور تمھارے دل میں برمھ کا قیام ہے جو ہستی سورج میں نظر آتی ہے وہی تم خود ہو جس شخص کو یہ معرفت حاصل ہے اور جو ہر وقت اس ذات مطلق کا دھیان کرتا ہے۔ اس کے تمام گناہ مِٹ جاتے ہیں اور اُس کی زندگی مسرت سے بھر جاتی ہے۔ اپنے مَن میں ڈوب جاؤ اور سوچو کہ جو ہستی چہار جہت کی پہنائیوں میں چاند۔ ستاروں کے نوُر میں اور سمندر کی بے کنار وسعت اور اتھاہ گہرائی میں موجود ہے وہ ہستی میں ہی ہوُں جس ہستی سے زندگی کا سوز و ساز قائم ہے جو زیست کا ذی حس مگر غیر مرئی پس منظر ہے جو شانتی بھی ہے بجلی بھی ہے وہ ہستی بس میں ہی ہوں۔ یہاں بھی ہمیں اِسی عملی مذہب کا آدرش کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جن چیزوں کی پرستش ہوتی تھی مثلاً آگ۔ سوُرج۔ چاند اور دوسری ایسی ہی چیزیں جن سے اِس زمانے کے لوگ شناسا تھے اور وہ آوازیں جن سے وہ مانوس تھے وہی ان حکایتوں کا موضوع ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اُن کی وضاحت کی گئی ہے اور ان میں بلند ترین معانی و مفاہیم پیدا کر دیئے ہیں اور یہی ہے ویدانت کا اصلی اور عملی پہلو اس سے دُنیا کی پامالی نہیں ہوتی بجائے اسکے اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دُنیا ہے کیا چیز

---

[1] Upakosla Kamalayana.

[2] Sentient Ether, Pure Intelligence.

[3] Ether

اِس سے شخصیت کا استیصال نہیں ہوتا۔ بخلاف اسکے اس سے تو شخصیت کی توضیح ہوتی ہے نہ اِس سے انفرادیت ہی نابود ہوتی ہے بلکہ اس سے تو اصل انفرادیت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ویدانت یہ نہیں کہتا کہ دُنیا ایک بیکار چیز ہے اور اُس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ویدانت کا قول تو یہ ہے کہ "یہ سمجھ لیجئے کہ دُنیا ہے کیا چیز؟ تاکہ آپ کو اس سے کوئی گزند نہ پہونچے۔ غیبی آواز نے ستیہ کام سے یہ نہیں کہا کہ جس آگ کی وہ پُوجا کرتا ہے اس کا یا سُورج ۔ چاند بجلی یا کسی دوسری چیز کا وجود بے معنیٰ ہے بجائے اسکے اِس آواز کے ذریعہ ستیہ کام کو یہ معلوم ہوا کہ جو روح چاند میں۔ سُورج میں بجلی میں آگ میں اور زمین میں سائر و دائر ہے وہی خود اس میں بھی موجود ہے گویا ستیہ کام کی نظروں میں ان تمام چیزوں کی ہیئت ہی بدل گئی ۔ اِسی آگ نے جو اس سے پیشتر مادّی آگ تھی اور جس میں یگیہ کی آہوتی دی جاتی تھی ایک نئی صورت اختیار کرلی اور وہ خدا کا مظہر بن گئی اُس نے برمھ کا رُوپ دھارن کرلیا زمین کا ہیولا ہی بدل گیا۔ زندگی کی کچھ اور ہی صُورت ہو گئی۔ سُورج چاند ستاروں اور بجلی کی طرح چیزوں کے رُوپ میں تبدیلی آگئی اُن کو خدائی کا۔ یزدانیت کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ اُن کی اصلی فطرت نمایاں ہو گئی ویدانت کا مُدّعا بھی یہی ہے۔ ایشور کو ہر چیز کے اندر دیکھنا۔ اشیائے گوناگوں کا مشاہدہ اُن کے اصلی رُوپ میں کرنا اُن کو اُن کی ظاہری شکل میں نہ دیکھنا۔ ساتھ ہی اُپنشد ہمیں بتاتے ہیں کہ ہماری بصیرت ہماری آنکھوں کی چمک بھی برمھ ہے۔ ہمارا اندازِ نظر اسی پیکرِ حُسن و جمال کا عکس ہے۔ خارجی دُنیا کی طرح داخلی دُنیا بھی اُسی کے دَم سے ہے۔ اسکے سوا اور کچھ نہیں۔ ہر طرف عین اُسی کا وجود ہے۔ ہر طرف یہ جو نُور برس رہا ہے۔ اُسی کا نور ہے تمام کائنات میں اسی کی تابانی ہے۔ ہر دو عالم اُسی سے درخشاں ہیں اور وہی روشنی ہمارے اندر موجود ہے۔ ایک مفسّر کا قول ہے کہ جو انسان پاک اور اطہر ہوتے ہیں وہ مخصوص اندرونی روشنی سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کو صفائی قلب حاصل ہو جاتی ہے تو یہ اندرونی نُور اس کی آنکھوں میں نمودار ہو جاتا ہے یہ نُور درحقیقت اُسی پرماتما کا ہے جو ہمارے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہے۔ اُس کا نُور سیاروں اور ستاروں اور آفتابوں میں ہے اور اس سے ہمارے دل و دماغ منور ہیں۔

اب میں ان قدیم اُپنشدوں کے کچھ اور عقائد بیان کروں گا جن کا تعلق پیدائش اور موت وغیرہ سے ہے اور جن سے شاید آپ کو زیادہ دلچسپی ہو یہ عقائد بھی کہانی کے رُوپ میں پیش کئے گئے ہیں۔ کہانی یوں ہے کہ ایک مرتبہ رشی پتر شویت کیتو[1] پنچالوں کے راجا کے پاس گیا۔ راجا نے اُس سے پُوچھا کہ کیا تم

[1] Shveta Ketu.

جانتے ہو کہ انسان مرکر کہاں جاتے ہیں۔ کس طرح واپس آتے ہیں اور اگر واپس نہیں آتے تو کیوں دوسری دُنیا اِن مرنے والوں سے بھر نہیں جاتی۔ لڑکے نے کہا" مجھے اِن باتوں کا کوئی عِلم نہیں مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہے۔ لڑکا اپنے باپ کے پاس پہونچا اور اس نے ان کے سامنے راجا کے سوال کو دُہرایا۔ باپ نے کہا" مجھے بھی اِن باتوں کا عِلم نہیں۔ اِس کے بعد باپ و بیٹا دونوں راجا کے پاس گئے۔ راجا نے کہا کہ ان باتوں کا عِلم تو پروہتوں اور پنڈتوں کو بھی نہیں صرف راجاؤں کا طبقہ اُن سے آگاہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ دُنیا بھر پر حکمرانی کرتے ہیں۔ شویت کیتو اور اس کا باپ دونوں کچھ دنوں راجا کے پاس ٹھہر گئے اور اُس کی خدمت کرتے رہے۔ آخر راجا نے اُن لوگوں کو یوں درس دیا" دوسری دُنیا ایک اگنی ہے سورج اُس کا ایندھن ہے۔ اُسی کی زمین دُھواں ہے اور دن اسی آگ کا شعلہ ہے۔ چاند انگارہ ہے اور ستارے اس کی چنگاریاں ہیں۔ دیوتا اُس کی آگ میں اپنی سَردھا اپنی عقیدت مندی کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اس طرح راجا نے سِلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ" جس اگنی کا میں نے بیان کیا ہے اس کے مقابلے میں تم اپنے اس ہون کی ذرا سی آگ میں یگیہ کی آہوتی کیا ڈالوگے تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تمام دُنیا بذاتِ خود ایک بہت بڑا ہون کنڈ ہے جس کی اگنی میں آہوتی ڈالنے کا عمل برابر جاری رہتا ہے، زندگی ایک مسلسل پرستش ہے۔ دیوتا اور فرشتے اور تمام ذی رُوح ہستیاں اسی اگنی کی متواتر پُوجا کر رہی ہیں اور اس عالم گیر اگنی کا سب سے اعلیٰ مجسّم نمونہ خود انسان ہے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح ہون کے طریقۂ پرستش کی رسوم کو وسعت دے کر پہلے تو تمام زندگی کو ایک مسلسل پرستش کے رُوپ میں دکھایا ہے اور پھر اُس کا رُخ انسان کی طرف موڑ کر اشارتاً ہدایت کی ہے کہ انسان کو خود اپنی ذات میں عالمی حقیقت کی تلاش کرنا چاہیئے۔ انسان کو خود اپنی تلاش کا مرکز ہونا چاہیئے اور اس طرح مذہبی نصب العین کو عملی صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تمام حکایتوں کی تہہ میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ خُدا کی پرستش کے لئے ہمارے ایجاد کردہ نشانات (Symbols) ممکن ہے اچھے ہوں اور کار آمد بھی لیکن جتنے نشانات ہم ایجاد کر سکتے ہیں ان سے کہیں زیادہ نشانات پہلے ہی سے موجود ہیں۔ آپ بھگوان کی پُوجا کے لئے مورتی بنا سکتے ہیں لیکن اس مورتی سے کہیں زیادہ اچھی مورتی یعنی انسان بقیدِ حیات پہلے ہی سے موجود ہے۔ آپ بھگوان کی پُوجا کے لئے عالی شان مندر تعمیر کرا سکتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ بلند مندر یعنی یہ انسانی قالب ہمارے سامنے پہلے ہی سے موجود ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ویدوں کے دو انگ یا حصے ہیں کرم کانڈ یا باب عمل اور گیان کانڈ یعنی باب عِلم

ایک کا تعلق شریعت یعنی پُوجا کے مختلف رسم و رواج سے ہے اور دوسرے کا معرفت سے ۔ امتدادِ وقت سے شرعی رسوم کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوگیا اور اُن میں اتنی پیچیدگی پیدا ہوگئی کہ اُن کا حل کرنا مشکل ہوگیا ۔ آخر جب اِن اُلجھنوں کو سُلجھانے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو اُپنشدوں کے خالق رشیوں نے ان رسومات سے تقریباً قطعی طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی لیکن اُن کو بُرا بھلا کہہ کر نہیں بلکہ اُن کی تشریح کرکے اُن کی جگہ بنیادی اُصولوں کو قائم کردیا ۔ آپ جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں ہندوستان میں یگیوں اور قربانیوں کا رواج عام تھا اس کے بعد رُوحانیت اور فلسفے کا دَور آیا لیکن فلاسفروں اور مفکروں نے عوام کے ہاتھوں سے اُنکے رسم و رواج اور اُسکے نشانات اُن سے چھینے نہیں اُنھوں نے کوئی منفی طرزِ عمل اختیار نہیں کیا ۔ جیساکہ بدقسمتی سے جدید اصلاحوں کے رائج کرنے میں عموماً ہوا ہے ۔ انھوں نے اِن نشانات کی ہی ایک نئی صورت نکال دی ۔ مثلاً اُنھوں نے کہا کہ "آپ اگنی کی پُوجا کرتے ہیں ۔ کیونکہ یہ ایک غیبی طاقت کا نشان ہے ۔ بہت خوب مگر ایک اور علامت کرّۂ زمین کی بھی ہے جو اس سے زیادہ شاندار اور عظیم علامت ہے ۔ آپ پُوجا کے لئے خوبصورت سے مندر میں جاتے ہیں اچھا، لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ یہ تمام عالم کائنات بھی تو ایک عالی شان مندر ہے ۔ انسان ہر جگہ پرستش کرسکتا ہے ۔ اسکے لئے کوئی مخصوص جگہ نہیں ۔ آپ زمین کو صاف کرکے خوب صورت نقش بناتے ہیں ویدی بناکر ہون کرتے ہیں پُوجا کرتے ہیں یہ سب باتیں قابلِ تعریف ہیں ۔ لیکن ہمارے اور آپ کے سامنے سب سے بڑی ویدی موجود ہے یعنی یہ زندہ باشعور جسمِ انسانی ۔ اس متبرک جگہ پر بیٹھ کر پرستش کرنا کسی بے جان نشان کو پوجنے سے کہیں زیادہ ارفع ہے ۔ آؤ ہم اس جیتی جاگتی ویدی میں بیٹھ کر پُوجا کریں ۔ اور اپنی اصل حقیقت تک پہونچ جائیں ۔

یہ ہے شریعت سے معرفت کی ارتقاء کا پہلو جس کی طرف آپ کی توجہ دلانا میں نے ضروری سمجھا آگے چل کر اس موضوع پر مجھے اور کچھ بھی کہنا ہوگا ۔ لیکن ابھی ہم اس سوال پر غور کررہے تھے کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے ۔ میں آپ کو اس سلسلے میں ابھی ایک کہانی سُنا رہا تھا ۔ یہاں ہمارے سامنے ایک عجیب و غریب بیان آتا ہے جسے میں خود بھی زیادہ نہیں سمجھ سکا ۔ بہرحال یہ بیان میں آپ کے سامنے پڑھے دیتا ہوں ۔ شاید آپ کو اس میں کچھ معنی نظر آجائیں لکھا ہے کہ جب کوئی ایسا انسان جس کو مراقبے کے ذریعہ صفائی قلب اور معرفت حاصل ہوچکی ہو دُنیا سے کوچ کرتا ہے تو وہ پہلے روشنی کی طرف رُخ کرتا ہے روشنی سے وہ دن کی جانب رجوع ہوتا ہے ۔ دِن کے بعد وہ چاند کے نصف روشن حصّے کی طرف جاتا ہے ۔ وہاں سے وہ اس چھ ماہی دَور میں داخل ہوتا ہے جس میں سُورج کا رُخ اُتّر یعنی شمال کی طرف

ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ سال کے دائرے میں پہونچتا ہے۔ سال کے دائرے سے اُس کا رُخ سُورج کی طرف ہوتا ہے پھر چاند کی جانب اور چاند سے پھر بجلی کی طرف پہونچ جاتا ہے اور جب اس کی رسائی بجلی کے طبقے میں ہو جاتی ہے تو اس کی مُلاقات ایک ایسی ہستی سے ہوتی ہے جس کا ہیولا انسانی نہیں ہوتا اور وہ ہستی اسکو برمھہ یا ذات مُطلق کی طرف لے جاتی ہے یہ طریق ہے دیوتاؤں کا۔ جب رشی مُنی اور حق شناس لوگ قالبِ خاکی ترک کرتے ہیں وہ اس راستے سے کوچ کرتے ہیں اور پھر واپس نہیں آتے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کو گیان یعنی عرفانِ حقیقت نہیں حاصل ہوا ہے لیکن جن کے اعمال نیک رہے ہیں ان کو مرنے کے بعد پہلے دُھوئیں سے گزرنا پڑتا ہے پھر وہ رات میں داخل ہوتے ہیں اور اسکے بعد وہ پندرہ تاریک دِنوں یعنی اندھیرے پاکھ میں داخل ہوتے ہیں پھر وہ چھ ماہ کے دورہ میں اس وقت پہونچتے ہیں جب سُورج کا رُخ دکھن کی طرف ہوتا ہے وہاں سے پھر وہ اپنے پتّروں کے لوک میں جاتے ہیں پھر آکاش میں اور اسکے بعد چاند میں جہاں وہ خوراک کی صورت میں دیوتاؤں کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اِس کے بعد وہ دیوتاؤں کے رُوپ میں پیدا ہوتے ہیں اور اس وقت تک اس عالم میں رہتے ہیں۔ جب تک اُنکے نیک اعمال اُن کو اس میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں اور جب اُن میں نیک اعمال کا اثر زائل ہو جاتا ہے تو پھر اسی راستے سے اس دُنیا میں واپس آجاتے ہیں اس کے بعد بارش کے قطرات کی شکل میں زمین پر نازل ہوتے ہیں اور غذائی اشیاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جنھیں انسان کھاتے ہیں اور آخر کار وہ اِنسان اِن لوگوں کے گھر میں پیدا ہو کر اُن کی اولاد بن جاتے ہیں، جن کے کرم اچھے ہوتے ہیں اُن کا جنم اچھے گھرانوں میں ہوتا ہے" اور جو بد اعمال ہوتے ہیں اُن کا جنم خراب یونیوں میں ہوتا ہے حتےٰ کہ بعض مرتبہ ان کو حیوانوں میں بھی جنم لینا پڑتا ہے یہ حیوان بھی اس خاکی دُنیا میں آتے ہیں اور یہاں سے واپس چلے جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کُرۂ خاکی نہ کبھی مکمل طور پر بھر جاتا ہے نہ یہ کبھی بالکل ہی خالی ہو جاتا ہے۔

اِس تمام سِلسلے میں دھوئیں سے کیا مُراد ہے؟ سال کسے کہتے ہیں؟ یہ تمام باتیں صاف طور پر کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتیں ہر شخص اُن کی ایک نئی تاویل کرتا ہے اُن سے ایک علاحدہ معنی اخذ کرتا ہے بعضوں کے خیال میں تو یہ سب باتیں فضول اور بے معنیٰ ہیں۔ چاند کی دُنیا اور سُورج کی دُنیا میں جانے کا کیا مطلب ہے اور اُس شخص سے کیا مُراد ہے جو رُوح کو بجلی کے طبقے میں پہونچنے کے بعد اس کی رہنمائی

کرتا ہے۔ یہ سب باتیں کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں اس تمام سلسلے لئے اور کئی خیالات بھی دل میں اُٹھتے ہیں۔ شاید وقت کبھی اس راز کو افشا کرے۔ لیکن فی الحال تو اس مسئلے پر ہم بس تھوڑا بہت ہی غور کر سکیں گے کہ آخر اِس تمام چکر سے مُراد کیا ہے؟ اِس سلسلے کا دوسرا حصّہ تو پہلے حصّے کے بمقابل تھوڑا بہت سمجھ میں آتا بھی ہے جس میں وہ لوگ جو بہشت میں رہ چکے ہیں کرۂ خاکی میں واپس آتے ہیں لیکن اس تمام سلسلے کا جو اصلی مُدعا سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب تک برمھ گیان یعنی عرفان الٰہی نہ حاصل ہو جائے دائمی بہشت کا ذکر محض بے معنی ہے جن لوگوں کو عرفانِ الٰہی کی دولت حاصل نہیں ہے لیکن جنھوں نے اسی دُنیا میں اچھے کام کئے ہیں وہ اپنے اعمال کا ثمرہ حاصل کرنے کے لئے مرنے کے بعد مختلف مقامات سے گزر کر آخر کار بہشت بریں تک پہونچ جاتے ہیں اور وہاں وہ دیوتاؤں کی اولاد کے رُوپ میں اسی طرح جنم لیتے ہیں۔ جس طرح ہم یہاں جنم لیتے ہیں اور وہ وہاں اُس وقت تک رہتے ہیں جب تک اُن کی نیک اعمالی انکو وہاں رہنے کی اجازت دیتی ہے۔ ان تمام باتوں سے ویدانت کا یہ بُنیادی خیال پیدا ہوتا ہے کہ نام اور رُوپ رکھنے والی ہر چیز کا وجود عارضی ہے یہ کرۂ خاکی بھی عارضی ہے کیونکہ اِس کا نام بھی ہے اور صُورت بھی اور اسی طرح بہشت کا وجود بھی غیر مستقل ہے کیونکہ اُس کے ساتھ بھی نام اور شکل کی قید لگی ہوئی ہے۔ جسے لوگ بہشت دوامی کہتے ہیں وہ اپنے نام کی ضِد ہے کیوں کہ جو چیز بھی نام اور شکل کی قید سے وابستہ ہے وہ ایک نہ ایک دن مٹ جائے گی اس کا آغاز اُس کی بقا اور اُس کا خاتمہ یہ سب چیزیں حدودِ وقت کے اندر ہیں۔ اسی لئے ہر چیز فانی ہے۔ دوام صرف اُسی کو ہے جو وقت کی حد سے باہر ہے۔ ویدانت کا یہ ایک اُصول مسلّمہ ہے اور اس لئے ویدانت کا ماننے والا کسی بہشت یا دوزخ میں اعتقاد نہیں رکھتا۔

سنگھتا[1] کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے متعلق تصوّر یہ ہے کہ اُس کا وجود دوامی ہے اہلِ اِسلام اور عیسائیوں کا بھی یہی خیال ہے اہلِ اسلام نے اِسکے وجود کو زیادہ تفصیل سے واضح کیا ہے ان کا بیان ہے کہ بہشت ایک ایسی جگہ ہے جہاں باغات ہیں اور جہاں دریا بہتے ہیں ریگستانِ عرب میں پانی کم یاب نعمت ہے۔ اِسی لئے مُسلمانوں کا اپنی بہشت کے متعلق تصوّر یہ ہے کہ اس میں پانی کی افراط ہوتی ہے میرا جنم ہندوستان کے ایک ایسے حصّے میں ہوا ہے، جہاں سال میں چھ مہینے بارش ہوتی ہے۔ اِس لئے میرا

---

[1] Samhita.

خیال ہے کہ اگر میں بہشت کے متعلق کوئی تصوّر باندھوں گا تو وہ ایسی بہشت کا تصوّر ہوگا جو مقابلتاً خشک ہوگی اور ایسا ہی تصوّر شاید انگریزی قوم والوں کا ہوگا۔ اِسی طرح سنگھتا میں بھی ایسی جن بہشتوں کا ذِکر ہے وہ بھی دوامی وجود رکھتی ہیں۔ جو لوگ دُنیا سے کوچ کر جاتے ہیں اُنھیں وہاں ایک خوب صورت جسم مِلتا ہے اور اُن کی مُلاقات ان کے والدین۔ ان کے بال بچوں اور اُن کے دوسرے رشتے داروں سے ہوتی ہے اور وہ وہاں بالکل ایسی ہی زندگی بسر کرتے ہیں جیسی اِس دُنیا میں بسر کرتے تھے وہاں وہ ہمیشہ خوش و خُرم رہتے ہیں یہاں حصولِ مسرّت میں جو مُشکلیں اور رُکاوٹیں درپیش آئی تھیں وہ اِس دُنیا میں جانے سے دُور ہو جاتی اور اس کے صِرف اچھے حصّے اور عیش و عشرت کے مشاغل باقی رہ جاتے ہیں مختصر یہ کہ عیسائیوں کی بہشت ہو یا مُسلمانوں کی یا ہندوؤں کی سب کے تصوّر میں دوامی عیش و آرام شامل ہے، دوسرے اس عیش و آرام کی نوعیت وہی ہے جو دُنیا کے عیش و آرام کی ہے۔ فرق صِرف اتنا ہے کہ بہشت میں عیش و آرام ہمیشہ قائم رہتا ہے اب آپ خود ہی سوچیے کہ بقول غالبؔ جنّت یا "دل کے خوش رکھنے کے اس خیال" کو انسان اور جاہے جو رنگ دے لیکن اُسے حقیقت میں نہیں بدل سکتا۔ ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جسمانی عیش و آرام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ لازوال اور مکمل نہیں ہوسکتا ورنہ اس کی خواہش کو تکمیلِ آرزو کے ساتھ ہی مٹ جانا چاہیے۔ ساتھ ہی ہمارا یہ بھی تجربہ ہے کہ حقیقت ہمیشہ اور ہر مرحلے پر آرام دہ نہیں ہوتی۔ سچائی کی خاطر ہر انسان کو بہت دُکھ سہنا پڑتے ہیں اور اس کی تسلّی اُس وقت تک نہیں ہوتی جب تک حقیقت اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو نہ پہونچ جائے۔ فطرتِ انسانی بڑی قدامت پسند واقع ہوئی ہے۔ جدّت سے کتراتی ہے اور اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کرنے میں تکلیف محسوس کرتی ہے اس لئے جس کام کی عادی ہو جاتی ہے اُسی کے شکنجے میں جکڑ جاتی ہے اور مشکل یہ ہے کہ اُسی قید کو پسند کرنے لگتی ہے جس کی وجہ سے رہائی اور بھی کٹھن ہو جاتی ہے۔ انسانی دِماغ جدید خیالات کو قبول نہیں کرتا کیونکہ ان سے اس کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اُپنشدوں نے اس قسم کی روش سے مکمل طور پر گریز کیا ہے وہ تو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ان بہشتوں کا وجود مستقل ہو ہی نہیں سکتا جن میں لوگ مرنے کے بعد اپنے پتروں یعنی مرحوم بزرگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کیونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ جس چیز کی بھی وابستگی نام اور رُوپ کے ساتھ ہے اُس کا خاتمہ کبھی نہ کبھی ضرور ہو جاتا ہے اگر بہشتوں کا کوئی متشکل وجود ہے بھی اگر ان کی کوئی مجسّم صُورت ہے بھی تو امتدادِ وقت کے ساتھ کبھی نہ کسی روز ان کا وجود عنقا ہو جائے گا ممکن ہے کہ وہ کروڑوں برس تک قائم رہیں پھر بھی ایک نہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب اُن کا وجود کالعدم ہو جائے گا۔ اُپنشدوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہشت ایک ایسی جگہ ہے جس میں جاکر مرنے والے اپنی نیک اعمالی کا ثمرہ پاتے ہیں اور جب یہ سِلسلہ ختم

ہو جاتا ہے تو پھر وہ کرّہ خاکی پر آ کر جنم لیتے ہیں اِس آواگون کے نظریہ سے ایک بات خاص طور پر واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں علت و معلول کا فلسفہ ابتدائی زمانے میں بھی موجود تھا میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ کس طرح ہمارے فلسفہ دانوں نے اِس نکتے کو فلسفے اور منطق کی زبان میں بیان کیا ہے۔ لیکن یہاں تو اس کا ذکر بچوں کی سی آسان زبان میں کیا جا رہا ہے اور یہ طرزِ بیان اِس لئے ممکن ہے کہ یہاں جو کچھ بھی بیان کیا جا رہا ہے رُوحانی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر کیا جا رہا ہے اور دروں بینی کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ یہ باتیں عملی طور پر ثابت کی جا سکتی ہیں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ یہ فلسفہ پیدا ہی عملی مشاہدے سے ہوا ہے اور اس پر ہر وقت اور ہر زمانے میں جو شخص بھی چاہے عمل پیرا ہو کر اِس حقیقت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اِن حقیقتوں کا جو مشاہدہ کیا گیا ہے دروں بینی کے ذریعہ کیا گیا ہے عملی صورت میں اُن کا احساس پہلے ہوا اور اس کے بعد انھیں معرضِ تحریر میں لایا گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کو اُپنشدوں کی دو کہانیاں سُنائی ہیں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ہمارے پراچین (قدیم) مفکروں سے دُنیا کی ہر چیز بات کرتی ہوئی نظر آتی ہے پرندے بولتے ہیں حیوانوں کی زبان اُن کے سامنے کھُلتی ہے چاند اور سُورج ان سے گفتگو کرتے ہیں رفتہ رفتہ انھیں ہر چیز کا مشاہدہ عملی طور پر ہونے لگتا ہے اور وہ فطرت کے قلب میں داخل ہو جاتے ہیں یہ بھی یاد رہے کہ ان کو یہ معراج نہ غور و خوض سے حاصل ہوئی نہ منطق کے زور سے نہ دوسروں کے دماغوں کی خوشہ چینی کر کے ایک حجیم و ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالنے سے جیسا کہ آج کل کے زمانے میں ہوتا ہے اور نہ میری طرح ان بزرگوں کی کوئی تصنیف لے کر ایک طول طویل تقریر جھاڑ دینے سے اُنھوں نے حقیقت کو پایا ہے تو مسلسل اور صبر آزما تجسّس و تحقیقات کے ذریعہ اسکے لئے اُنھیں بڑی مشق و مزاولت کرنا پڑی ہے اور کاربراری ہمیشہ اسی مشق و مزاولت سے ہوتی ہے۔ مذہب تو ہمیشہ سے ایک عملی سائنس رہا ہے۔ اب تک جتنے مذاہب پیدا ہوئے ہیں ان سب کے بانیوں نے پہلے خود اپنے اصولوں کو عملاً اپنایا ہے پھر ان کا پرچار کیا ہے علمِ الٰہی یا دینیات کے متعلق کتابی نظریوں سے نہ کبھی کوئی مذہب وجود میں آیا ہے اور نہ کبھی آئے گا پہلے عمل ہے بعد میں علم ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ہمیشہ عمل پر زور دیا گیا ہے۔ آواگون کا سلسلہ بھی محض خیال آرائی نہیں ہے بلکہ ہمارے رُوحانی رہنماؤں نے خود اپنے تجربے کی بنا پر اس اُصول کو بیان کیا ہے اُن کا کہنا ہے کہ جو لوگ ثمرے کے خیال سے کوئی نیک کام کرتے ہیں اُن کو ثمرہ مل تو جاتا ہے لیکن دیرپا نہیں ہوتا۔ علت و معلول کا اُصول یہ ہے کہ نتیجہ ہمیشہ سبب کے مطابق ہوتا ہے جیسا سبب ہوگا ویسا ہی نتیجہ بھی ہوگا۔ اگر سبب دوامی ہوگا تو نتیجہ بھی دوامی ہوگا لیکن یہ تمام اسباب یعنی نیک کام کرنا یا اسی قسم کی دوسری باتیں عمل میں لانا محض محدود اسباب ہیں۔ اور اسی لئے اُن کا جو

نتیجہ نکلتا ہے وہ کبھی لامحدود نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی رُوح بار بار جنم لیتی ہے، یہاں سے جاکر کسی دوامی جنت میں قیام نہیں کرتی اور نہ ہی کسی جہنم کی آگ میں ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ میں نے ابھی آپ کے سامنے اُپنشدوں کے دلائل پیش کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوامی جنّت کا کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح دوامی دوزخ کے ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ فرض کر لیجئے کہ میں ایک فاسق و فاجر انسان ہوں اور تمام زندگی کسی نہ کسی گُناہ کا مرتکب ہوتا رہا ہوں پھر بھی میری تمام عمر چند روزہ ہے اور دوامی زندگی کے بمقابلہ اُسکی کوئی وقعت نہیں اگر اس چند روزہ زندگی کے گناہوں کی سزا دوامی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک محدود سبب کا لامحدود نتیجہ برآمد ہوا ہے مگر ایسا ممکن نہیں اگر میں تمام عمر نیک کام کرتا رہوں تو مجھے اسکے اجر میں جو بہشت ملے گی وہ بھی دوامی نہیں ہوگی۔ ایسا خیال کرنا اتنا ہی غلط ہوگا جتنا کہ یہ کہنا کہ مجھے گُناہوں کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے جہنم میں دھکیل دیا جائے گا لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ یہ تمام کائنات عمل اور ردِّ عمل کا لاانتہا سلسلہ ہے اور بس! اُپنشد بتاتے ہیں کہ ہم دائرۂ عمل سے باہر بھی نکل سکتے ہیں۔ نیک و بد اعمال کے دوراہے سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ بھی ہے جو صرف اُن لوگوں پر کھلتا ہے جنھیں سچائی کا ذاتی علم حاصل ہو جاتا ہے جنھیں عملی طور پر حقیقت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مایا کے اس پردے سے باہر نکلنے کا ایک یہی وسیلہ ہے کہ انسان سچائی کو عملی طور پر محسوس کرے اپنے آپ کو پہچانے۔ اور حقیقت سے رُوشناس ہو۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ حقیقت شناسی حاصل کیونکر ہوسکتی ہے۔ اُپنشد کہتے ہیں کہ نیکی اور بدی کے تضاد کو مٹا دو۔ نیکی اور بدی کے دو ظاہری رنگ ہیں اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اُن کا اعتراف فسونِ نظری ہے، دراصل ہر شئے ہماری ذات یا آتما میں بسی ہوئی ہے اِسی سے اُس کا انکشاف ہو رہا ہے ہر عمل کی محرک خود آتما ہے اس کے علاوہ اور کسی شئے کی ہستی ہے ہی نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایک طرح سے سارے عالم کائنات کے وجود سے انکار کرنا ہوگا۔ اُس کی ظاہری صُورت سے آنکھیں بند کرکے اُسکے اصلی رُوپ کو دیکھنا ہوگا۔ سُورگ اور نرک۔ بہشت اور دوزخ میں ایک ہی بھگوان کو دیکھنا ہوگا۔ زندگی میں بھی اُسی کا مشاہدہ کرنا ہوگا اور موت میں بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ نیکی خوشی اور زندگی تو بھگوان کا رُوپ ہیں اور بُرائی غمی اور موت کی کوئی اور ہستی ہے یہ متضاد چیزیں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اگر حقیقت فقط آتما کی ہے تو بُری بھلی یہ کائنات بھی اُس میں شامل ہے۔ میں نے ابھی ابھی اُپنشدوں کے کچھ حصے آپ کے سامنے پڑھے تھے۔ آپ ان پر غور کریں تو اِس بیان کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گے۔ اُن میں اِس قسم کا خیال ظاہر کیا گیا ہے مثلاً لکھا ہے "یہ زمین بھگوان کے وجود کا نشان ہے۔ یہ آسمان بھگوان ہے جس جگہ ہم آباد ہیں وہ بھگوان ہے ہر چیز برہمہ ہے۔ ذات مطلق

ل ۔ ہے دیکھنے کا شوق تو آنکھوں کو بند کر ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں واقعی مشاہدہ کرنا ہے جسے ہمیں عملی طور پر جاننا اور پہچاننا ہے۔ اِس کے بارے میں محض بات چیت کرلینا یا غور وخوض سے کام لینا ہی کافی نہیں۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ جب رُوح یا جیو کو اِس بات کا اشراق ہو جاتا ہے کہ ہر چیز میں پرماتما کا جلوہ ہے برمھ کا ظہور ہے تو اُسکو اِس بات کی پروا نہیں رہتی کہ مرنے کے بعد اُس کو جنت میں جانا ہوگا کہ دوزخ میں یا کسی اور عالم میں، پھر اِس دُنیائے خاکی میں یا کسی اور آسمانی دُنیا میں پیدا ہونا پڑے گا۔ اِس رُوح یا جیو کے لئے اِن چیزوں کا وجود بے معنی ہے کیونکہ اُس کی نظر میں ہر جگہ یکساں ہے ہر جگہ بھگوان کا مندر ہے اسکے لئے ہر جگہ پاک اور متبرک ہے اُسے تو جنت اور دوزخ میں بھگوان ہی بھگوان نظر آتا ہے اس کے لئے نہ تو نیکی کا کوئی علٰحدہ وجود ہے اور نہ بدی کا اُس کی نگاہ میں زندگی اور موت کا فرق مٹ جاتا ہے اور صرف ایک لامحدود برمھ یا ذاتِ مُطلق ہی کا جلوہ ہر جگہ سائر و دائر نظر آتا ہے ؛

ویدانت کے مطابق جب انسان کو وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے جب اُس کو ہر چیز میں بھگوان کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے اُس وقت اُسکو مُکتی یا نجات حاصل ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ صرف ایسے ہی اِنسان کو دُنیا میں رہنے کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے ایسے ہی اِنسان زندگی سے مسرت اور نشاط حاصل کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے بس اُنھیں کو اس دُنیا میں رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے دوسرے لوگوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ مثلاً جس آدمی کو اس دُنیا میں بُرائی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی مصیبت سے ہر آن بھر لیتا ہے اسی طرح جس شخص کو ہر بات میں خطرہ نظر آتا ہے، اس کی زندگی بھی اجیرن ہو جاتی ہے اور جس اِنسان کی نظر موت پر رہتی ہے اُس کی زندگی بھی سراپا آفت ہو جاتی ہے جس شخص کو حقیقت کا مشاہدہ ہو چکا ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ صرف اسی کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ "مجھے اِس زندگی سے مسرت حاصل ہو رہی ہے میرے لئے یہ زندگی مجسّم نِشاط ہے" میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ باقی لوگوں کے لئے تو یہی زمین بذاتِ خود جہنّم ہے۔ دراصل نرک (جہنم) کا تصوّر ویدوں میں تو مِلتا ہی نہیں اُس کا ذِکر تو مُدتوں بعد پُرانوں میں آتا ہے۔ ویدوں کے مطابق بدترین سزا دُنیا میں بار بار جنم لینا ہے۔ اُپنشدوں کا برمھ ست چت آنند ہے۔ جو ہر اِنسان کی ذاتی حقیقت ہے یہ برمھ کوئی شخصی خدا نہیں جو نیک و بد اعمال کے سِلسلے میں انعام اور سزا دیتا ہے۔ اِس لئے ویدوں میں دُکھ سُکھ غمی اور خُوشی کے تصوّر نے بھی غیر شخصی پہلو اختیار کر لیا ہے۔ دُکھ سُکھ کسی کے دینے سے نہیں مِلتے یہ اپنی ہی دِماغی اور رُوحانی حالتوں کے مختلف نام ہیں۔ سزا و جزا کے تصوّرات مادّی ہوتے ہیں اور وہ ایک ایسے خدا کے تصوّر سے وابستہ ہوتے ہیں جس کو ہم نے اپنے کردار کے مُطابق ڈھالا ہو جس کی خاصیت اِنسانی ہو اور جو بالکل ہماری طرح ایک شخص سے محبت کرتا ہو اور دوسرے سے نفرت۔ اگر ہم کسی ایسے

شخصی[1] خُدا کے وجود کو مانتے ہیں تو ہماری دُنیا میں سزا و جزا کی گنجائش ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔ سنگھتا میں تو ایک ایسے خُدا کا تصوّر ملتا ہے لیکن اُپنشدوں کی دُنیا میں خوف کا تصوّر سرے سے ہی نہیں وہاں تو صرف ایک غیر شخصی[2] برمھ کا تصوّر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ عام انسانوں کے لیۓ اِس غیر شخصی تصوّر کا مفہوم سمجھنا نہایت درجہ مشکل ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا دِماغ فطرتاً شخصی اور مجسّم تصوّرات سے آگے نہیں بڑھ سکتا ایسے ایسے لوگ بھی غیر شخصی خُدا کے تصوّر سے محروم رہتے ہیں جنہیں دُنیا اعلیٰ پایۂ کا مفکر سمجھتی ہے لیکن مجھ سے پُوچھیے تو مجھے ایک ایسے خُدا کا تصوّر بے معنیٰ معلوم ہوتا ہے جو بقیدِ جسم ہو جس کے کردار میں انسان کی سب خوبیاں اور خامیاں ایک بڑے پیمانے پر موجود ہوں جس میں ہم سے زیادہ طاقت موجود ہو جو چاہے تو ہماری خطائیں بخش دے اور چاہے تو کڑی سے کڑی سزا دے، جسے رحم بھی آتا ہو اور غصہ بھی جس کے احکام میں ہمارے رسم و رواج کی جھلک ہو ایسا خدا میری نظر میں ایک بے جان تخیّل ہے جسے ہم نے اپنے نقش پر تخلیق کیا ہے اور جس کے کارنامے ہم روز انسانی اعمال کی صُورت میں دیکھتے ہیں۔ زندہ خدا وہ ہے جس نے ہمیں خود اپنے نقش پر بنایا ہے جس کو ہم ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے جسے ہم حواسِ خمسہ میں قید نہیں کرسکتے جس کا بلند و ارفع خیال ہمارے دِماغ سے باہر ہے، ہماری عقل و خرد سے بعید ہے، جسے میں زندہ خدا کہتا ہوں وہ ایک غیر شخصی غیر مجسّم مسلّمہ حقیقت ہے جس میں فرشتے انسان حیوان بلکہ غیر ذی رُوح چیزیں بھی سمائی ہوئی ہیں اور جو ان سب میں موجود ہے جو کائنات کا مظہر ہے۔ لیکن کائنات پر مشتمل نہیں جو لا محدود ہے۔ لازوال ہے اور جو لاثانی ہے جس طرح اگنی ایک ہے لیکن ہزاروں صورتوں میں نمایاں ہوتی ہے اور ان تمام ظاہری صورتوں کو یکجا کرنے سے بھی اگنی کا تصوّر مکمل نہیں ہو پاتا اس طرح غیر شخصی خُدا کا تصوّر تمام موجودات کی کُل جمع سے کہیں زیادہ ہے لا انتہا ہے وہ ہر طرف جلوہ گر ہے لیکن جلوؤں سے بندھا نہیں ہے، میں آپ کو اس زندہ خدا کی پرستش کی دعوت دیتا ہوں۔ مجھے تو اپنی زندگی خُدا کے سوا اور کوئی چیز نظر آتی ہی نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ بھی دراصل خُدا ہی کو ہر طرف اور ہر شئے میں دیکھتے ہیں۔ مثلاً اس کرسی کو دیکھنے کے لۓ پہلے آپ خدا کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد خُدا کی ہستی سے اُبھرتی ہوئی اور اس کے نُور سے روشن آپ کو یہ کُرسی نظر آتی ہے۔ وہی ہر جگہ موجود ہے اور کہہ رہا ہے کہ "میں ہوں"[3] جس گھڑی آپ کو "میں ہوں"

---

[1] Personal God.

[2] Impersonal God.

[3] دم چیست۔ پیام است شنیدی نشنیدی۔ درخاک تو یک جلوۂ عام است۔ ندیدی
دیدن دگر آموز و شنیدن دگر آموز

کا شعور ہوتا ہے۔ آپ کو دراصل خدا کے وجودِ مطلق کا احساس ہوتا ہے جب کبھی آپ اپنی ہستی کو محسوس کرتے ہیں تو آپ کا وہ احساس دراصل خدا کی ہی ہستی کا احساس ہوتا ہے۔ ہم اُس سے جُدا نہیں ہیں۔ اگر ہم خدا کو خود اپنی ذات میں اور ہر ذی رُوح کے اندر موجود نہیں دیکھ سکتے تو پھر اُس کو تلاش کرنے کہاں جائیں گے۔ سُنیئے میں آپ کو ایک پرارتھنا سُناتا ہوں کہا ہے:۔

"تو ہی مرد ہے تو ہی عورت ہے تو ہی لڑکی ہے اور تو ہی لڑکا ہے تو ہی وہ بوڑھا ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے اور جس کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں تو ہی وہ نوجوان ہے جو اپنی طاقت کے زعم میں اکڑ کر چلتا ہے"۔

آیئے ہم بھی یقین و ایمان سے اعلان کریں کہ دُنیا میں جو کچھ ہے "تو ہی تو ہے"۔ تجھی سے یہ ساری زندگی ہے تیرے سوا اس عالمِ کائنات میں اور کسی چیز کا بھی وجود نہیں۔ جو کچھ ہے تُو ہے اور بس۔ یہ ہے میرا خُدا جسے میں آپ سے رُوشناس کرا رہا ہوں، یہ خدا اُس روایتی خُدا کی زبردست ضد ہے، جسے پنڈتوں مُلّاؤں اور پادریوں نے ہودے میں چھپا رکھا ہے اور جو کسی کو نظر نہیں آتا ہے جس کے احکام میں ہمارے رسم و رواج کی جھلک ہے یہ لوگ ہمیں یقین دلاتے ہیں اگر ہم اُن کی پیروی کریں ان کی نصیحتوں پر کان دیں اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تو مرنے کے بعد وہ ہم کو دیدارِ الٰہی یا بھگوان کے درشنوں کے لئے پروانہ راہ داری دے دیں گے۔ یہ سیانوں کی باتیں ہیں سیانے ہی جانیں۔ انھیں باتوں سے ان کا کاروبار چلتا ہے لیکن میں تو ایسے خدا کی ہستی سے انکار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا غیر شخصی خدا کا تصوّر فی الواقع پادریوں مُلّاؤں اور پنڈتوں کے حق میں نقصان دہ ہے اس سے گرجاؤں مسجدوں اور مندروں میں ہر روز جو سودے اگلی دُنیا کے لئے ہوتے ہیں سب ختم ہو جاتے ہیں۔ میرے ہی دیش ہندوستان کو لے لیجئے آج کل وہاں قحط پڑ رہا ہے لیکن اس وقت بھی کئی مندر ایسے ہیں جہاں جواہرات اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ وہ سب مل کر کسی بادشاہ کا خوں بہا ہو سکتے ہیں اگر یہ پنڈت، پادری اور مُلّا لوگ غیر شخصی خدا کی تعلیم دینے لگیں تو اُن کو پُوچھے گا کون۔ اُن کا تو کاروبار ہی بند ہو جائے گا۔ اس لئے یہ لوگ تو حقیقت کی تعلیم دینے سے رہے۔ لیکن ہمیں اُن کے تعاون کے بغیر اور اُن کی مخالفت کے باوجود صلہ و ستائش کی تمنا ترک کر کے اس غیر شخصی خُدا کی ہستی کا پرچار (تبلیغ) کرنا ہوگا۔ آخر کب تک ہم اور آپ اپنی حقیقت سے بے بہرہ

۵ے

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ　　خُدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

رہیں گے ۔ اِس حقیقت کو جاننا ہمارا حق ہے ۔ آپ خود خدا ہیں ۔ میں خدا ہوں ۔ کون کس کا حکم مانتا ہے ۔ کون کس کی پُوجا کرتا ہے ؟ آپ ہی کی ذات خُدا کی بلند ترین عبادت گاہ ہے میں تو کسی مندر کی مُورتی یا کسی کتاب کے بجائے آپ کی پرستش کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں ۔ بعض لوگ زبانی طور پر تو میرے ساتھ تعاون کرنے کے لئے فوراً راضی ہو جائینگے ۔ لیکن وہ اِس فلسفۂ حیات پر عمل کرنا یقیناً ناممکن سمجھتے ہیں میں تو یہی کہوں گا کہ اُنکے خیالات میں تضاد ہے وہ حقیقت کے قریب پہونچ تو جاتے ہیں لیکن اس کو پانے کے لئے آخری قدم نہیں اُٹھاتے ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو عملی انسان سمجھتے ہیں ۔ اُن کی مثال ان مچھلیوں کی سی ہے جو ماہی گیر کے ہاتھ میں آجاتی ہیں لیکن پھر اُسکی اُنگلیوں سے پھسل کر مایا رُوپی سمندر میں گِر جاتی ہیں میں ان لوگوں سے خصوصاً یہ کہوں گا اس سے بڑھ کر عملی بات اور کیا ہوگی کہ خود انسان کی پرستش کی جائے ۔ آپ سب کی پُوجا کی جائے ۔ آخر میں "آپ" کو دیکھ رہا ہوں آپ کی موجودگی مجھے محسوس ہو رہی ہے ۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خُدا ہیں ۔ میرے مُسلمان بھائی کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے یہ سچ ہے لیکن ویدانت اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے کہ دُنیا میں خُدا کے سوا کسی اور شئے کا وجود ہی نہیں ہے ۔ یہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو خدا نہ ہو شاید میری اس بات سے آپ کو کچھ ڈر سا لگ رہا ہے ۔ شاید آپ ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ آپ کے پاؤں تلے کی زمین نکلی جا رہی ہے ۔ آپ سوچ رہے ہوں گے اگر دُنیا کا کوئی وجود ہی نہیں تو آخر ہمارے وجود کی کیا حقیقت ہے ۔ بات ہے بھی ڈراونی لیکن آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ آپ کو اس حقیقت کا علم ہو جائے گا کہ میں نفی کی نہیں بلکہ اثبات کی گفتگو کر رہا ہوں ۔ آپکے وجود کے نابود ہونے کا نہیں بلکہ اس کے اصلی رُوپ کا ذکر کر رہا ہوں ۔ زندہ خُدا آپ کے اندر موجود ہی ہے ۔ آپ کو گرجا مسجد اور مندر جانے کی چنداں ضرورت نہیں آپ غلطی سے ایسی چیزوں پر اعتقاد لا رہے ہیں جن کا وجود محض خیالی ہے جس خُدا کی پرستش ہمیں کرنا چاہئے جسے ہمیں پُوجنا چاہیئے وہ تو ہماری اپنی رُوح یعنی آتما ہے جو ہمارے اِس انسانی قالب میں نمودار ہو رہی ہے ۔ آیئے ہم اِس مندر رُوپی جسم میں اپنی آتما کی پُوجا کریں یوں تو تمام جاندار بھگوان کے مندر ہیں ۔ لیکن جو مندر ہمارے سامنے انسان کی شکل میں ہے وہ سب سے زیادہ بلند ہے وہ تو تاج محل ہے ۔ اگر میں اِس مندر میں بھگوان کی پُوجا نہیں کر سکتا تو پھر کسی اور مندر سے کوئی مطلب برآری نہیں ہوگی ۔ لیکن ہاں جس وقت بھی مجھے اس کا عملی طور پر احساس ہو جائے گا اور میں یہ جاننے لگوں گا کہ خدا ہر انسانی جسم میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے بلکہ اسکے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں ۔ جس وقت میں بھی ہر انسانی رُوح کے سامنے تقدّس اور احترام کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا ۔ اور مجھے اُسکے اندر خدا کا جلوہ نظر آنے لگے گا اس وقت میرے تمام بندھن کٹ جائینگے ۔ میں ہر قید سے آزاد ہو جاؤنگا اور مجھے موکھش یا نجات حاصل ہو جائے گی ۔ اس سے زیادہ عملی پُوجا اور کیا ہوگی ۔ اصل عبادت تو یہی ہے اِسکے علاوہ مختلف نظریوں

پر بحث کرنے اور فلسفہ بگھارنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اِس عملی پُوجا کا کسی خاص نظریہ یا فلسفہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود کچھ لوگوں کو اس کے ذِکر سے دہشت ہونے لگتی ہے۔ وہ اس کو دُرست نہیں سمجھتے وہ تو باپ دادا کی بتائی ہوئی پُرانی باتوں کو دُہرائے جاتے ہیں کہ خُدا دُور آسمان پر رہتا ہے اُس کے اپنے خاص آدمیوں نے خود اُس سے سُنا ہے کہ وہ خدا ہے بس یہی اثاثہ ہے ہمارے مذہبی اُصولوں اور سِدّھانتوں کا جس میں ہمارا اعتقاد ہے اور جس کو ہم حقیقت قرار دیتے ہیں جس میں ہم کوئی اضافہ کرنے کے لئے تیار نہیں نیز جس کے علاوہ اور سب کچھ غلط ہے ناممکن ہے ناقابلِ عمل ہے خیر ایسے لوگوں کو اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں ویدانت کا تو اُصول ہے کہ ہر شخص کو اپنا جُداگانہ راستہ اختیار کرنے کا حق ہے لیکن مجھے اِتنا ضرور کہنا ہے کہ راستہ کوئی بھی ہو وہ بذاتِ خود منزلِ مقصود تو نہیں ہے۔ کسی ایسے خدا پر اعتقاد رکھنا جو آسمان پر رہتا ہو اور اسی قِسم کی دوسری باتیں بُری ہرگز نہیں ہیں۔ یہ تو حق وصداقت کی منزل تک پہونچنے کا زینہ ہیں، مگر یاد رکھیئے کہ یہ بجائے خود حق وصداقت کی منزل نہیں ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان تمام باتوں میں خوبیاں بھی ہیں اور حُسنِ خیال بھی، اِن میں کئی عظیم تصوّرات بھی ہیں لیکن ویدانت آپ کو اس مقام سے بھی آگے جانے کی تلقین کرتا ہے۔ ویدانت تو ہر قدم پر آپ کو دعوت دیتا ہے کہ "میرے دوست جس کو آپ نامعلوم سمجھ کر پُوجتے ہیں میں اُسے آپ ہی کی اصل ذات سمجھ کر پُوجتا ہوں جس ہستی کی پرستش آپ کر رہے ہیں اور جسے آپ اِس عالمِ کائنات میں ڈھونڈھ رہے ہیں وہ تو ہر وقت آپ ہی کے ساتھ ہے۔ آپ کا وجود اُسی کے توسل سے ہے اور وہ اس عالمِ کائنات کا دوامی شاہد ہے جس کی پُوجا کے لئے دید ظہور میں آئے جس کی پرستش کا سب متبرک کتابیں پرچار کرتی ہیں، وہ خود "مَیں" کے لازوال احساس میں موجود ہے "مَیں" کا احساس اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی کے وجود سے تمام عالمِ کائنات کا وجود ہے۔ اس عالمِ کائنات کی روشنی اور زندگی اسی کی ہستی سے ہے۔ اگر آپ میں اِس "مَیں" کا وجود نہ ہوتا تو آپ کو سُورج تک نظر نہ آتا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی دِکھائی دیتی۔ یہ ساری دُنیا آپ کو اسی کی تابانی سے نظر آتی ہے"۔

آپ اعتراض کرسکتے ہیں کہ اس نظریہ پر عمل کرنے سے کئی قسم کی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں ہر شخص کہنے لگے گا کہ "مَیں خدا ہوں" اور جو کچھ بھی میں کرتا یا سوچتا ہوں وہ لازمی طور پر بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ خدا سے کوئی بُرائی کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ اس طرح کی غلط تاویل کا امکان ہوسکتا ہے تو کیا یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دوسری تاویلات میں اس قِسم کے اندیشے نہیں ہوسکتے۔ لوگ ایسے خُدا کی پرستش کرتے آئے ہیں جو اُن سے دُور آسمان پر رہتا ہے اور جس سے وہ اس قدر خائف ہیں کہ ڈر کے

ہمارے تمام عمر کانپتے رہتے ہیں۔ کیا ایسا کرنے سے دُنیا کی حالت میں کبھی کوئی بہتری واقع ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ ہمارے اپنے مشاہدے سے ہو سکتا ہے ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو شخصی خُدا کے قائل ہیں اور اس کو پُوجتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کا ایمان غیر شخصی خدا پر ہے وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے کس طبقے میں دُنیا بھر کو ہلا دینے والی بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے عظیم الشان طاقتوں کا ظہور ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو میرے ساتھ پُورا اتفاق ہوگا کہ ایسے لوگ اُسی طبقے میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں جو غیر شخصی خدا کا قائل ہے بھلا کہیں خوف و بیم سے بھی اخلاق کی نشو و نما ہوتی ہے ایسی توقع کرنا ہی غلط ہے۔ ایسا تو کبھی ممکن ہی نہیں۔ اخلاق محبت سے پیدا ہوتا ہے نفرت سے نہیں اور محبت کیا ہے من و تو کی تمیز کا مٹ جانا اور یہ تفریق اسی حالت میں دُور ہوتی ہے۔ جب ہماری انفرادیت غیر شخصی خُدا کے تصوّر میں ڈوب جاتی ہے۔ جب تک اِنسان ایک دوسرے کو اپنے سے الگ سمجھتے رہیں گے جب تک یہ بیگانگی موجود رہے گی حقیقی محبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے یہاں لکھا ہے "جہاں کہیں ایک شخص دوسرے شخص کو دیکھتا ہے، اُس کی باتیں سُنتا ہے۔ وہاں مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن جب ایک شخص دوسرے کو دیکھتا یا اُس کی باتوں کو سُنتا ہی نہیں جب ہر چیز آتما بن جاتی ہے تو کون کس کو دیکھتا ہے کون کس کا مشاہدہ کرتا ہے وہاں تو ہر چیز "وہ" ہے یا "مَیں"۔ بس ایک پرماتما ہے اُسے "وہ" کہہ لیجئے یا "مَیں" مطلب تو ایک ہی حقیقت سے ہے اور وہ ہے آتما کا اپنی پاکیزگی سے آگاہ ہو جانا۔ جب اِنسان اُس مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں اپنے اور غیر میں فرق نہیں رہتا اسی وقت اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ محبت ڈر یا مجبوری سے پیدا نہیں ہوتی اُس کی بنیاد تو آزادی ہے جب ہم خوشی سے اپنے آپ کو بھگوان کے سپُرد کرتے ہیں۔ جب ہم اِس دُنیا سے حقیقی محبت کرنے لگتے ہیں اور ہر شئے میں اُسی کا جلوہ دیکھتے ہیں اس وقت ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اخوت یا انانیت کا کیا مطلب ہے۔ اِس سے پہلے یہ نکتہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اِس لئے یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ غیر شخصی خدا کو ماننے سے دُنیا میں بہت بڑے پیمانے پر بُرائی پھیل جائے گی۔ کیا شخصی خدا کے نظریہ سے دُنیا میں آج تک کوئی بُرائی پیدا ہی نہیں ہوئی؟ کیا اس نے طرح طرح کی فرقہ داریوں کو جنم نہیں دیا جن کے سبب سے دُنیا میں خون کے سینکڑوں سیلاب آ چکے ہیں اور جن کے زیر اثر اِنسان ایک دوسرے کے جانی دشمن بن رہے ہیں؟ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کا مخصوص خُدا ہی سب سے اعلیٰ ہے اور اس کا ثبوت کردار سے نہیں، تلوار سے مہیا کیا جاتا ہے ہر فرقہ یہی کہتا ہے کہ میرا ہی خُدا سب سے بڑا خدا ہے اگر کوئی نہیں مانتا تو آئے کُھلے میدان میں آ کر فیصلہ کر لے یہ ہے نتیجہ تمام دُنیا میں شخصی خدا پر اعتقاد کرنے کا یہی دراصل دوئی یا شرک ہے۔ کوئی فرقہ ایک سے زیادہ خدا کو نہیں مانتا۔ لیکن اِس شخصی خُدا کو ماننے والا ہر شخص

یہ سمجھتا ہے کہ میری ہستی میرے خدا کی ہستی سے الگ ہے میرا خدا ایک بہت بڑی طاقت ہے وہ میرا حامی و مددگار ہے تمہاری ہستی اور تمہارا خدا دونوں مجھ سے الگ ہیں مجھے حق ہے کہ میں تمہیں زبردستی اپنے خدا پر ایمان لانے کے لئے مجبور کروں۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ "من و تو" کی دوئی" اور شرک کی اِن تنگ اور تاریک گلیوں سے باہر نکل کر ہمہ اوست کی کشادہ اور روشن شاہراہوں پر گامزن ہو جائیے۔ رات کی تاریکی سے نکل کر دن کی روشنی میں آئیے۔ آپ کی رُوح چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں مقید ہو کر کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔ روشنی کی اس عظیم کائنات میں قدم رکھیئے۔ عالمِ کائنات میں جو چیز بھی ہے آپ کی ہے اپنے بازو پھیلائیے اور اس کائنات کو اس برمھانڈ کو اپنے سینے سے لگائیے۔ کائنات کو اپنے ایوانِ محبت میں بسانے کا خیال ہی حقیقی عرفان کی ابتدا ہے یہی وصلِ الہٰی کے ارمان کی پہلی جھلک ہے۔ اگر آپ کے دل میں دُنیا سے بغل گیر ہونے کا خیال کبھی پیدا ہوا ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو خدا کے وجود کا احساس ہو گیا ہے۔

مہاتما بدھ کے درس کا وہ حصّہ تو آپ کو یاد ہو گا کہ کس طرح انہوں نے اپنے عالمگیر جذبۂ محبت کی لہروں کو باری باری شمال مشرق۔ مغرب اور جنوب میں اور پھر آکاش اور پاتال میں نشر کیا حتےٰ کہ تمام عالمِ کائنات اِس عظیم اور بے پناہ محبت سے بھر گیا۔ جب آپ کے دِل میں بھی ایسا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس وقت جانیئے کہ آپ نے اپنی ذات کی حقیقت کو پا لیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جانے دیجئے اِس تمام عالمِ کائنات کی ہستی اِس سارے برمھانڈ کی ہستی ایک ہے جو چیز لامحدود ہے اُسکے لئے چھوٹی چھوٹی چیزوں سے دست بردار ہو جائیے جو آنند (نشاط) لامحدود اور ابدی ہے اُسکے سامنے کم قدر عیش وعشرت سے ہاتھ اُٹھا لیجئے جب آپ اپنی ذات کی لامحدودیت کو پا لیں گے تو دیکھیں گے کہ دُنیا کی چھوٹی بڑی سب چیزیں خود آپ کے بس میں ہیں۔ غیر شخصی وجود میں شخصی وجود بھی شامل ہے غیر شخصی ہوتے ہوئے خدا شخصی بھی ہے اور انسان لامحدود اور غیر شخصی ہو کر بھی شخصی رنگ اختیار کئے ہوئے ہے ہم لامحدود ہیں۔ ہماری نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا لیکن ہم نے خود کو چھوٹے چھوٹے اجزاء میں منقسم کر رکھا ہے۔ ویدانت کہتا ہے کہ لامحدودیت ہی ہماری حقیقی فطرت ہے۔ یہ کبھی معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کا قیام اس کی بقا دوامی ہے یہ ہمیشہ برقرار رہے گی۔ ہم نے خود کو اپنے کرموں کے ذریعہ محدود کر رکھا ہے۔ یہ کرم ہماری گردن میں زنجیر کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے ہمیں اِس بندھن میں جکڑ رکھا ہے اس زنجیر کو توڑ ڈالیئے اور آزاد ہو جائیے۔ ہر اُس قانون کو اپنے پیروں سے روند ڈالیئے جو کسی طریقے سے بھی آپ کی مکمل آزادی میں خلل انداز ہوتا ہے انسانی فطرت میں نہ کسی قانون کو دخل ہے۔ نہ مشیت کو اور نہ تقدیر کو لامحدودیت میں بھی کہیں کوئی قانون چلتا ہے؟ آزادی ہماری اصل ہے۔ یہ بندھن توڑ ڈالیئے۔ اسی کا نام مکتی ہے پھر

چاہے جس رنگ میں زندگی بسر کیجئے کوئی فرق نہیں پڑے گا جیسے ایک اداکار - خواہ کوئی پارٹ ادا کر رہا ہو اپنی اصلی شخصیت کو جانتا ہے اور اُس کے پارٹ کا اس کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا - ایک ایسے اداکار کا مقابلہ جو اسٹیج پر آکر بھکاری کا پارٹ ادا کرتا ہے اُس اصلی بھکاری سے کیجئے جو گلی گلی گھومتا پھرتا ہے - سین (منظر) تو دونوں حالتوں میں یکساں ہے - لیکن اسکے باوجود یہ دیکھئے کہ دونوں میں فرق کیا ہے ایک شخص تو غریبی اور مفلسی سے لطف لے رہا ہے اور دوسرا اُسکے عذاب میں مبتلا ہے غور کیجئے ایسا کیوں ہے؟ آخر اس کا سبب کیا ہے - اِن دونوں میں ایک آزاد ہے اور دوسرا پابند - اداکار کو پتہ ہے کہ اُس کی مفلسی و ناداری درحقیقت مفلسی و ناداری نہیں ہے - بھکاری کا بھیس تو اُس نے محض ناٹک کے لئے استعمال کیا ہے اور دوسری طرف وہ شخص ہے جو سچ مچ بھکاری ہے وہ مجبور ہے اُسے ہر حالت میں اپنی مفلسی اور ناداری گوارا کرنا پڑتی ہے اپنی اس مصیبت کو برداشت کئے بغیر اُس کا گزارہ ہی نہیں اپنی حقیقت سے آشنا رہ کر دُنیا کے کاروبار میں آزادانہ شرکت کرنا نشاط و مسرت کا باعث ہوتا ہے - لیکن اپنے آپ سے غافل رہ کر زندگی بسر کرنا محض عذاب کا باعث ثابت ہوتا ہے یہ ہے فطرت کا اٹل قانون - جب تک ہم لوگوں کو اپنی ذات کا علم نہ ہو جائے ہم بھکاری ہی رہیں گے ہر قدرتی طاقت ہم سے دھکا پیل کرے گی - اور ہمیں اپنا غلام بنائے گی - ہم دُنیا بھر میں مدد کے لئے چلاتے پھرتے ہیں لیکن یہ مدد ہمیں کسی سے ملتی نہیں ہم فرضی ہستیوں سے فریاد کرتے ہیں روتے ہیں دھوتے ہیں مدد کے لئے گڑگڑاتے ہیں لیکن کوئی ہمارے آڑے نہیں آتا - کوئی ہماری مدد نہیں کرتا پھر بھی ہمیں اُمید رہتی ہے کہ کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی کے ذریعہ مدد ہم کو حاصل ہو جائے گی اور اسی لئے ہم اس قدر روتے چلاتے ہیں اور طرح طرح کی اُمیدیں باندھتے ہیں - اسی طرح ہماری ایک عمر گزر جاتی ہے اور یہ جنم مرن کا کھیل اسی طرح برابر جاری رہتا ہے - کسی کا آسرا لینا - کسی کے سہارے جینا غلامی ہے اِس غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالیئے - آزادی آپ کی اصل ہے - اپنی آزاد فطرت کو جگائیے کسی سے مدد کی اُمید کے کیا معنی، خود اپنے پر اعتماد رکھیئے - اپنی گزشتہ زندگی پر نظر دوڑائیے - یقیناً آپ دیکھیں گے کہ دوسروں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش ہمیشہ بے سود ثابت ہوئی ہے - دراصل آپ کو کبھی دوسروں سے مدد ملی ہی نہیں آپ کو ہمیشہ اپنی ہی کوششوں کا اپنی ہی جدوجہد کا پھل ملا ہے اسکے باوجود آپ ہمیشہ انجانے میں یہ توقع کرتے رہے کہ کبھی نہ کبھی کسی طرح کہیں نہ کہیں سے آپ کو سہایتا (مدد) ملے گی - اس طرح کی خام اور بے بنیاد اُمیدوں کو ترک کر دیجئے آپ نے دیکھا ہوگا - کہ امیروں کے یہاں ہمیشہ لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے ہر روز نئے بھکاری وہاں آتے ہیں لیکن سب خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں - اسی طرح ہماری زندگی محض اُمیدیں باندھنے ہی میں گزر جاتی ہے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا - ویدانت کا پیغام ہے کہ آپ اُمیدیں باندھنا چھوڑ دیجئے - آپ ایسا کریں ہی

کیوں؟ ہر چیز خود آپ کے پاس پہلے ہی سے موجود ہے بلکہ آپ تو خود ہی ہر چیز کا مخزن ہیں، اور ہم توقع بھی کس بات کی کریں اگر کوئی بادشاہ پاگل ہو جائے اور اپنے مُلک کے بادشاہ کی تلاش میں ادھر اُدھر دَوڑتا پھرے تو اُسے بادشاہ کا پتہ کبھی نہ لگے گا۔ کیونکہ بادشاہ تو خود اس کی اپنی ذات ہے وہ خواہ گاؤں گاؤں کی خاک چھانے، شہروں شہروں کا چکّر لگائے ہر گھر میں اُسے تلاش کرے۔ روئے چیخے چلاّئے لیکن اس کو بادشاہ کا پتہ نہیں لگے گا۔ کیونکہ بادشاہ تو وہ خود ہے۔ یہی حالت ہماری ہے۔ ہم جس چیز کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں وہ ہماری اپنی ذات ہے۔ آیئے ہم اپنے آپ پر ایمان لائیں۔ خدا ہم خود ہیں کسی اور خُدا کی تلاش میں اِدھر اُدھر سر گرداں پھرنا فضول ہے۔ یہ خود اعتمادی یہ اپنی خودی کی لامحدودیت کا یقین یہ خودی اور خدا کی وحدت کا ادراک ہی حقیقی نشاط و مسرت کا سرچشمہ ہے یہیں آکر ہماری پیاس بجھتی ہے تشنگی مٹتی ہے یہیں اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اور کہیں نہیں اِدھر اُدھر پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرنا چھوڑ دیجئے۔ اپنی حقیقت سے واقف ہو کر جو چاہے کیجئے۔ دُنیا سے کنارہ کش ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے اسٹیج پر اپنا پارٹ ادا کرتے وقت اپنی اصلیت کو کبھی نہ بھولیے۔

یہ ہے زندگی بسر کرنے کا وہ رَاز جسے پاکر ہمارا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے اور یہ دُنیا ایک قید خانہ نہیں رہتی بلکہ ایک کھیل کا میدان بن جاتی ہے۔ مجبوری کی جگہ آزادی لے لیتی ہے اور غم و غصّہ کی جگہ اطمینان، جہاں پہلے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے سامان ہوتے تھے وہاں اب دوسروں کی خوشی میں اپنی خوشی پیدا ہوتی ہے تمام دُنیا حقیقی آنند میں ڈوب جاتی ہے اور انسان کو وہ سرمایۂ نشاط حاصل ہو جاتا ہے جسے پاکر پھر اور کسی چیز کی خواہش رہتی ہی نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلشنِ حیات میں ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ خزاں کبھی نہ آئی تھی نہ آئے گی۔ خوشی کے مہکتے ہوئے رنگا رنگ پھُول کھِلے ہیں اور کھِلتے رہیں گے آتما نند کی سُندر (حسین) تتلیاں ناچ رہی ہیں اور ہمیشہ یونہی ناچتی رہیں گی۔ یہی وہ دُنیا ہے۔ جو پہلے دوزخ معلوم ہوتی تھی اور اب جنّت میں بدل گئی ہے۔ جو لوگ بندھنوں میں گرفتار ہیں اُنکے لئے تو یہ دُنیا عقوبت و صعوبت سے بھری ہوئی ہے لیکن جن لوگوں نے اپنے بندھن توڑ ڈالے ہیں۔ جنہوں نے اپنی سدا آزاد ذات کو پالیا ہے اُن کی نظر میں اس کی اصل کچھ اور ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر دو جہاں دائرۂ حیات میں گھرے ہوئے ہیں۔ حیات ایک ہے۔ عالم بالا

دُنیا ہی بدل جاتی ہے مری جب اُن کی عنایت ہوتی ہے
مِٹ جاتے ہیں دل کے غم سارے واحت ہی راحت ہوتی ہے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہو یا کرۂ خاکی دونوں وحدتِ حیات میں شامل ہیں۔ دیوتا ہوں یا انسان سب ایک ہی زندگی کا جزو ہیں۔ ایک ہی لڑی میں منسلک ہیں، فرشتے ہم سے دُور نہیں، دیوتا ہم سے جُدا نہیں۔ بلکہ ان سب کی تخلیق خود ہمارے ہی نقش پر ہوئی ہے۔ یہ غلط ہے کہ دیوتاؤں نے ہمیں اپنی صُورت میں ڈھالا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ہماری ذات سے دیوتاؤں کو جسم مِلا ہے۔ اندر[1]۔ ورُن[2] اور اس برھمانڈ کے دوسرے دیوتا سب ہم میں موجود ہیں اور چھوٹے پیمانے پر ہماری ہی ذات کی عکاسی کررہے ہیں۔ دراصل پُوجا کے لائق ہماری ہی ذات ہے، ہماری ذات ہی جنّ و بشر کی معبود ہے۔ سب کو چاہیئے کہ ہمیں سجدہ کریں۔ یہ ہے نظریہ ویدانت کا۔ ہماری ذات متبرّک واکبر ہے اپنی ذات کو پانا ہی وصلِ الٰہی ہے۔ یہی ہماری سچّی آزادی ہے۔ اسی میں ہماری عظمت ہے، جب تک ہم اپنے آپ سے غافل ہیں اپنی شانِ شاہنشاہی سے ناواقف ہیں ہم مجبور ہیں مُفلس و نادار ہیں۔ ہماری زندگی کا مقصد اپنی ذات کو پانا ہے۔ اس کی عملی صُورت یہ نہیں کہ ہم دُنیا کو ترک کردیں دُنیا سے آزاد ہونے کے معنی یہ نہیں کہ پاگلوں کی طرح سماج کو ٹھکرادیں اور مُکتی حاصل کرنے کے لئے جنگلوں یا ویرانوں میں چلے جائیں۔ ہمیں رہنا تو اس دُنیا میں ہے مجبوری اور آزادی کی زندگی میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم جہالت سے گزر کر آگہی کے مقام تک آجاتے ہیں اور ہر چیز کے حقیقی معنی اور مطالب ہماری سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ ہمارا ماحول نہیں بدلتا لیکن اس کے معنی بدل جاتے ہیں اِس کا ایک نیا مفہوم ہمارے ذہن میں پیدا ہوجاتا ہے، جب تک ہم مجبور ہیں ہمیں دُنیا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں جیسے ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے مجبوری سے چھٹکارا پانے کے بعد ہمیں اِس کائنات کا اصلی رُوپ نظر آتا ہے خود ہماری مجبوری جسے ہم قانونِ تقدیر یا مشیّت کہتے ہیں ہماری ہی ذات کا ایک جزوِ حقیر ہے۔ ہماری فطرت کے ایک رُخ کی جھلک ہے۔ آزادی ہماری فطرت کا دوسرا رُخ ہے۔ اِس آزادی کا دوسرا نام ہے مُکتی۔ یہی آتم

(بقیہ حاشیہ)

آتے ہیں نظر سب ہی اپنے یاں کوئی غیر نہیں رہتا

سب دل کی کدورت مٹ ... لفت ہی اُلفت ہوتی ہے

کچھ ایسا اپنی آنکھوں میں بس جاتا ہے حسنِ نورِ ازل

ہر وقت نگاہوں کے آگے اِک موہنی صورت ہوتی ہے

[1] Indra

[2] Varuna.

آنند ہے۔ نشاطِ رُوح ہے جب تک ہمیں اِس حقیقت کا علم نہیں ہوتا ہم اِدھر اُدھر سرگرداں رہتے ہیں۔ ہمارے دل میں خوف رہتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی شیطانی طاقت ہمارا پیچھا کر رہی ہے کبھی ہم اِس سے بچنے کے لئے اس خرگوش کی طرح زمین میں مُنھ چھپا لیتے ہیں جس کے پیچھے شکاری دَوڑ رہے ہوں اور کبھی ہم کسی خارجی یزدانی طاقت کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں یہ سب دھوکا ہے۔ ہم اپنی ذات کی اصلی حقیقت کو لاکھ بھلانا چاہیں پھر بھی ہم اُسے بھلا نہیں سکتے یہ حقیقت ہمیں دعوتِ وصل دے رہی ہے۔ شیطنت کے خلاف بغاوت ہو یا دیوی دیوتاؤں یعنی کسی شخصی خدا کی خارجی امداد کی تلاش سب اصل میں ہماری اپنی ہی ذات کی تلاش کے رنگ ہیں۔ خارجی جدّ وجہد کے پردے میں ہم خود کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ ہم اپنی رُوح کی آواز کو غلط سمجھتے آئے ہیں ہم نے اُسے پہچانا نہیں ہم سمجھتے رہے کہ یہ آواز اگنی یا وایو دیوتا کی آواز ہے۔ چاند سُورج اور ستاروں کی آواز ہے۔ عالمِ بالا کے فرشتوں کی آواز ہے لیکن بالآخر یہ پتہ چل گیا کہ یہ آواز تو خود ہماری ہی رُوح کی اندرونی آواز ہے یہ ہماری ہی آتما کے سنگیت کے چند سُر ہیں جو عالمِ شہود میں مجسّم ہو کر کائنات بن گئے ہیں اُنھوں نے کاروبارِ کائنات کے قانون کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اِن متعدد سُروں کے صرف جمالِ منجمد کو دیکھتے رہنا کم نظری ہے۔ اُنھیں سوزِ ارتعاش دے کر نغمۂ خودی کو بیدار کرنا ہی مقصدِ حیات ہے۔ یہ نغمۂ جاوید ہمیشہ ہماری رُوح کی گہرائیوں میں گونجتا رہتا ہے، اُسے بہشتِ گوش نہ بنانا کفرانِ نعمت ہے۔ ویدانت آپ کو اس مترنم نغمے کو جگانے کی تلقین کرتا ہے لیکن ویدانت محض مستی وحال کا مذہب نہیں ہے۔ ویدانت کی رُو سے اپنی ذات کو پانے کا مطلب صرف انفرادی طور پر رُوحانی مسرت کا حاصل کرنا نہیں ہے۔ ویدانت کے مطابق خودشناسی کے معنیٰ ہیں تمام کائنات میں اپنی ہی ذات کو جلوہ گر دیکھنا۔ عملی طور پر اپنے اور بیگانے کی تفریق کو مٹا دینا۔ ویدانت کی نظر میں کافر وہ ہے جو دوسروں کو اپنی ذات کا جزو نہیں بلکہ غیر سمجھتا ہے۔ ویدانت کا پیغام تو یہ ہے کہ اگر انسان انسان کے کام نہیں آسکتا۔ اگر آدمی اپنے بھائیوں کو خدا کا زندہ وجود سمجھ کر اُن کی پُوجا نہیں کر سکتا تو پھر اُس خُدا کی پرستش کیا خاک کرے گا جو اُس کی نظروں سے اوجھل ہے کیا آپ کو انجیلِ مُقدّس کا یہ ارشاد یاد نہیں ہے کہ اگر آپ اپنے بھائی سے محبت نہیں کر سکتے جو آپ کی نظروں کے سامنے ہے تو پھر آپ خدا کے ساتھ کیسے محبت کر سکتے ہیں جس کو آپ نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اگر آپ کو خدا کا جلوہ اِنسانی چہرے میں نظر نہیں آتا تو پھر آپ اُسکو عالمِ بالا کے تصوّرات میں آسمان کی وسعتوں میں یا بے حس اور مُردہ مادّے سے بنی ہوئی مُورتیوں یا فرضی کہانیوں کے کرداروں میں کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ میں تو اُس روز آپکو حقیقی معنوں میں ایمان والا سمجھوں گا جس روز ہر فردِ بشر میں آپ کو خدا کا جلوہ نظر آئے گا۔ کیونکہ جب آپ کو سب چیزوں میں وہی ایک ہستی نظر آئے گی جو مجسّم محبت و اُخوت ہے تو آپ کی محبت سب کے لئے یکساں

ہوگی اور آپ کے دل سے نفرت کا جذبہ بالکل مٹ جائے گا پھر آپ کی سمجھ میں خود بہ خود آجائے گا کہ یسوع مسیح کے اس قول کے کیا معنی ہیں" اگر کوئی شخص آپ کے دائیں گال پر تھپڑ لگاتا ہے تو آپ مسکرا کر اپنا بایاں گال بھی اسکے آگے کر دیجئے"۔ نہایت مبارک ہوگا وہ دن جب آپ کو انسانوں میں نہیں حیوانوں اور درندوں میں بھی خدا کا جلوہ نظر آئے گا اور آپ ہر چیز میں اور ہر طرف اس ایک خدا کو دیکھیں گے جو جا و دانی ہے۔ پاک برتر ہے جو مختلف رُوپ دھارن کر کے مختلف شکلوں میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ وہی باپ ہے وہی ماں۔ اور وہی اولاد وہی بہن ہے وہی بھائی اور وہی دوست۔ جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دنیا کا یہ تمام کاروبار ہماری ہی آتما کا کھیل ہے تو نہ صرف ہمارے سماجی تعلقات یزدانی رنگ اختیار کر لیتے ہیں بلکہ ہمارا یزدانی رشتہ ہمارا اور ہمارے خدا کا تعلق غیر مرئی حالت سے گزر کر مجسم صورت میں نمودار ہو جاتا ہے ہم کو نہ صرف باپ بھائی بہن اور محبوب میں اُس کا جلوہ نظر آتا ہے بلکہ ہم ان میں سے جس رشتے میں چاہیں خود خدا کو باندھ کر اپنا سکتے ہیں۔ مثلاً یسوع مسیح نے اُسکو "باپ" کے رشتے میں باندھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ باپ اور بیٹا دونوں دراصل ایک ہیں۔ ہندوستان میں ہم نے خدا کے ساتھ ماں کا رشتہ قائم کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ خدا کو "باپ" کہنے کے بمقابلہ اُس کو ماں کا درجہ دینا زیادہ عظیم آدرش ہے کیونکہ اس میں اور بھی نزدیکی تعلق کی جھلک نظر آتی ہے خدا کو اپنا دوست سمجھنا اِس سے بھی زیادہ عظیم ہے لیکن سب سے زیادہ عظیم وہ رشتہ ہے جس میں ہم خدا کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں عاشق اور معشوق میں کسی قسم کے فرق و امتیاز کا مٹ جانا ہی عاشقی کی بلند ترین معراج ہے اور یہی رشتہ بھگوان کے پیارے بھگتوں اور صوفیوں نے اپنایا ہے شاید آپ کو فارسی ادب کی وہ کہانی یاد ہوگی جس میں ایک عاشق نے جا کر اپنے معشوق کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اِس پر اُس سے پوچھا گیا کہ "تم کون ہو"؟ اُس نے جواب دیا "میں ہوں" دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آئی۔ دوسری مرتبہ عاشق نے پھر دروازے پر دستک دے کر کہا "میں آیا ہوں لیکن دروازہ عاشق کے لئے نہیں کھلا۔ تیسری مرتبہ جب اُس نے پھر صدا دی تو اندر سے وہی آواز آئی "کون ہے"؟ عاشق نے جواب دیا "تو خود ہے میرے محبوب" اب کے دروازہ کھل گیا۔ بالکل یہی رشتہ خدا کے اور ہمارے درمیان ہے۔ ہر چیز میں اُسی کا جلوہ ہے۔ ہر چیز "وہی" ہے۔ ہر مرد ہر عورت وہی آنند کا بھنڈار زندہ خدا ہے جس کا وجود ہم ہر صورت سے محسوس کر سکتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ خدا کو کوئی نہیں جانتا۔ کون کہتا ہے کہ کہیں جا کر اُس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے تو خدا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈھونڈھ لیا ہے۔ ہماری ہستی ہمیشہ اسی کی ہستی میں مضمر ہے وہ ہر جگہ موجود ہے اور اُسکو سب جانتے ہیں۔ ہمیشہ اس کی پرستش ہوتی ہے۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ خدا کی پرستش خواہ کسی طریقے سے کی جائے ٹھیک ہے۔ یہ بات نہیں ہے

کہ پوجا کا کوئی خاص طریقہ ٹھیک ہے اور دوسرے تمام طریقے غلط ہیں۔ خدا کو سب طریقے منظور ہیں۔ کسی میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑا نکتہ ہے جسے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے یعنی یہ کہ جو لوگ خدا کو مختلف قِسم کی رسموں یا شکلوں کے ذریعہ پُوجتے ہیں۔ خواہ ہم اُن رسموں اور شکلوں کو کِتنا ہی خام کارانہ کیوں نہ قرار دیں اُن کا مسلک بھی غلط نہیں ہے، خُدا کو پانے کی جدّوجہد تو ایک ہے یہ جدّوجہد ہے سچائی کی ایک منزل سے دوسری منزل تک پہونچنے کی سچّائی کی ہری بھری وادیوں سے سچائی کی برف پوش چوٹیوں تک رسائی حاصل کرنے کی۔ ایک مقام پر ہم دیدہ و مشام سے رنگ و بُو کو اپناتے ہیں۔ دوسری منزل پر ہم دل و دماغ کو جمالِ فطرت سے بھر لیتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر ہم بلندیوں میں سانس لینا سیکھتے ہیں اور آخر ثابت قدمی کی بدولت اس منزل پر جا پہونچتے ہیں جہاں ہمیشہ پاکیزگی کی سفیدی ہوتی ہے اور جہاں آفتابِ حقیقت کی چند کرنیں طوفانِ نور پیدا کر دیتی ہیں۔ اب کون کہتا ہے کہ اس حسین سفر کا کوئی مقام غلط تھا کسی کو کیا حق ہے کہ خود ایک مقام سے گزر کر ان دوسرے مسافروں کو غلط راستے کا راہ رو قرار دے جو ابھی اس مقام تک نہیں پہونچے ہیں ہمیں کوئی حق نہیں کہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھیں اگر ہمیں کوئی حق حاصل بھی ہے اور ہم پر کوئی فرض عائد بھی ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں، باہمی ہمدردی سے سے کام لیں۔ آخر روشنی کیا ہے؟ کم تاریکی۔ گناہ کیا ہے؟ کم ثوابی۔ کثافت کیا ہے کم پاکیزگی۔ اگر ہم تاریکی کی پستیوں سے روشنی کی بلندیوں تک پہونچ گئے ہیں اگر ہماری رسائی بدی کی وادیوں سے نکل کر نیکی کی چٹانوں تک ہو گئی ہے اگر ہم کثافت کے جنگلوں سے گزر کر پاکیزگی کی چوٹیوں تک کا فاصلہ طے کر چکے ہیں تو بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اور سب بھی اِن منزلوں سے گزر کر آخر ایک ہی منزل تک آ پہونچیں گے اور حق تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں اور اس کو بے راہ روی کا الزام لگاتے ہیں تو آپ خود اپنی منزل سے بہت دُور ہیں۔ ذرا سوچئے تو۔ اگر آپ کو واقعی پاکیزگی حاصل ہو چکی ہے تو پھر آپ کی نظر میں کوئی چیز کثیف ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ جو چیز ہمارے اندر ہوتی ہے وہی تو باہر آتی ہے۔ اگر خود ہماری ذات میں کثافت نہیں تو ہمیں کسی دوسری چیز میں کثافت نظر ہی نہیں آسکتی، یہ ہے ویدانت کا عملی پہلو کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھنا۔ سب سے محبت اور ہمدردی برتنا۔ جہاں تک ہو سکے ہم سب کو اپنی اپنی زندگی میں اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

دراصل ہماری تمام زندگی کا مقصد یہی ہے کہ اخوت اور ہمدردی کے اس اُصول کو عملی جامہ پہنایا جائے اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس طریقۂ کار سے ہماری زندگی میں کشیدگی کم ہو جائے گی۔ بے صبری اور بے اطمینانی دُور ہونے لگے گی اور ہمیں تسکینِ قلب اور قناعت کی بیش قیمت اور لازوال نعمتیں نصیب ہوں گی کیونکہ اخوت اور ہمدردی کا بُنیادی اُصول ہے سب میں ایک ہی بنیادی حقیقت کو دیکھنا اس

حقیقت کو جو ہماری اپنی ذات کے اندر ہے۔ جب اس حقیقت کا اس بُنیادِی اُصول کا عِلم ہو جاتا ہے تو انسان کو سچّا آرام نصیب ہوتا ہے۔ سچّی تسلّی اُور تسکین ملتی ہے۔ تو آیئے اِس اطمِینانِ قلب کے لئے اپنی ذات کا انکشاف کریں اور اُسے اِس طرح مُجسّم بنا دیں کہ اُسکے وجود کو محسوس کر سکیں اس حقیقتِ منتظر کو ایسا لباس مجازی پہنائیں کہ ہماری جبینِ نیاز کے سارے تڑپتے ہوئے سجدے اس کے سامنے اَدا ہو جائیں۔

عملی ویدانت

تیسرا حصّہ

یہ لکچر ۱۷ر نومبر ۱۸۹۶ء کو بمقام لندن دیا گیا

چھاندگیہ[1] اُپنشد میں ذکر آتا ہے کہ ایک مرتبہ نارد رشی سنت کمار کے پاس پہونچے اور پوچھا کہ "مہاراج۔ مذہب کو ہماری دُنیا میں کہاں تک دخل ہے اور اُس نے کہاں تک ہماری گرد و نواح کی چیزوں کو تشکیل کیا ہے؟ رشی سنت کمار نے جواب میں کہا کہ" مذہب ہی کی بدولت ہمیں زندگی کا آغاز انجام۔ اُس کا ارتقا اور اُسکے معنیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کو جن ٹھوس صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں۔ اُن کے پسِ پُشت لطیف اور غیر مرئی اجزاء کار فرما ہیں۔ ظہورِ حیات اُنھیں نفیس اجزاء کے ٹھوس صورت اختیار کرنے کا نام ہے۔ ہر جُز وبجائے خود اپنے سے زیادہ لطیف مخزن سے پیدا ہوتا ہے اور آخر کار اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ اِس طرح زندگی کے کئی درجے ہیں۔ کچھ مقام ہماری خاکی زندگی سے زیادہ بلند ہیں۔ (ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں) جہاں سے مادّی زندگی ظاہر ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا مخزن "آکاش" ہے۔ آکاش زندگی کی وہ غیر مرئی صورت ہے جس میں چاند سورج بسے ہوئے ہیں۔ جہاں بجلیاں کھیلتی ہیں اور جہاں ستارے تخلیق ہوتے ہیں۔ ہم آکاش ہی میں جیتے اور مرتے ہیں۔ لیکن آکاش سے بھی زیادہ لطیف اور بنیادی چیز ہمارے "پران" ہیں۔ آکاش زندگی کا وہ بنیادی عنصر ہے جس سے تمام

---

[1] Chhândogya Upanishad

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب ؎ موت کیا ہے اِنھیں اجزاء کا پریشاں ہونا

مادّی صورتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن پران اِن سب کا محرّک ہے۔ ویدانت کے مطابق پران ہی تمام زندگی کی تخلیق اور ارتقا، کا باعث ہے۔ پران ہی اِس کا بُنیادی اُصول ہے۔ آکاش ہی کی طرح یہ بھی ایک ایسا جوہر ہے جو ہر جگہ موجود ہے اور ہمارے جسم میں یا اور کہیں بھی جو حرکت نظر آتی ہے وہ پران ہی کی بدولت ہے اِس لحاظ سے پران کا درجہ آکاش سے بڑا ہے اور ہر چیز اُسی کی طاقت سے زندہ اور موجود ہے۔ بظاھر ہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہم سب پران ہی سے زندہ ہیں اور پران ہی میں بسے ہوئے ہیں۔ کیونکہ پران ہمارے اجسام میں محدود اور محبوس نہیں ہے۔ ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ اور ہم سب کو محیط بھی کئے ہوئے ہے پران ہی ماں میں ہے۔ پران ہی باپ میں ہے اور پران ہی بہن میں ہے۔ پران ہی گرُو میں ہے۔ بلکہ پران خود ہی گیان کا بھنڈار ہے۔

اِس موضوع پر اس اپنشد کے ایک اور حصّے میں یوں بحث کی گئی ہے۔ شویت کیتو[1] نے اپنے باپ سے پوچھا آخر اِس کائنات کی بُنیادی حقیقت کیا ہے؟ باپ نے شویت کیتو کو بہت سی باتیں بتائیں اور آخر میں کہا "شویت کیتو۔ یہ علّت جو عالمِ شہود کی ہر شئے کے پسِ پشت کارفرما ہے جو تمام کائنات کی تخلیق اور ارتقا کا باعث ہے۔ جو زندگی کی محرّک اور ہمارے اندر اور باہر ہے یہی حقیقتِ واحد ہے اور تو خود یہ حقیقت ہے جان لے کہ "تو وہ ہے[2]" اس کے بعد شویت کیتو کے باپ نے بہت سی مثالیں دے کر اس لطیف نکتے کو ذہن نشین کرایا اور فرمایا "شویت کیتو جس طرح شہد کی مکّھی مختلف پھولوں سے شہد اکٹھا کرتی ہے لیکن شہد کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کن کن مختلف درختوں اور پھولوں سے لایا گیا ہے اسی طرح ہم وجود میں تو آئے ہیں لیکن ہمیں اپنے اس وجود میں آنے کا خود پتہ نہیں۔ ہم اپنی حقیقت سے خود ہی ناواقف ہیں۔ آج میں تجھے اِس نکتے سے آگاہ کر رہا ہوں کہ وہ جوہرِ لطیف جس سے تمام عالم موجودات کا وجود ہے وہ ذاتِ واحد جس میں ہر شے بسی ہوئی ہے وہ حقیقت تُو خود ہے تو ہی وہ آتما ہے۔ جان لے کہ تو "وہ" ہے۔ مہرشی نے ایک اور مثال دیتے ہوئے کہا "مختلف دریا بہتے بہتے جاکر سمندر میں مِل جاتے ہیں اور انھیں یہ علم نہیں رہتا کہ کسی زمانے میں وہ بھی دریا تھے لیکن جب اُس سمندر سے قطرات اُٹھ کر دریا بن جاتے ہیں تو وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک کنار سمندر ہیں۔ اِسی طرح جب ہم اس وجود مطلق سے اُٹھ کر اجسام میں محدود ہو جاتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم خود ہی وہ وجود مطلق ہیں۔ آج میں تجھے اُس بھولی ہوئی بات کی یاد دلا رہا ہوں کہ "تُو خود ہی وجودِ مطلق ہے"۔ جان لے کہ "تو وہ ہے" ہاں تو اِس طرح یہ درسِ خود جاری رہتا ہے۔ میرا مقصد اسکے

---

[1] Shveta Ketu.   [2] Thou are that

چند ٹکڑے پیش کرنے سے یہ تھا کہ اِن مثالوں سے آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ حصُولِ علم کے بُنیادی اُصول (گیان کے سدّھانت) کیا ہیں۔ یہ اُصول ۲ ہیں۔ ایک اُصول کے مُطابق تو گیان حاصل ہوتا ہے کسی خاص بات سے اخذ شُدہ نتائج کا اطلاق عام باتوں پر کرنے سے اور عام باتوں سے اخذ شدہ نتائج کا اطلاق کُل آفاق پر۔ تمام دُنیا پر کرنے سے۔ دوسرا سدھانت یہ ہے کہ جو امر وضاحت طلب ہے اُس کی وضاحت حتی الامکان خود اس کی جبلّی فطرت سے کی جائے۔ پہلے اُصول کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ جتنا ہی ہمارا علم خاص معلومات کی حدود سے گزر کر بنیادی اُصولوں تک پہونچتا جاتا ہے۔ جتنا ہی ہمارا دائرۂ ادراک وسیع ہوتا جاتا ہے ہم منزل بمنزل اُتنے ہی بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی بات غیر متوقع طور پر واقع ہو جاتی ہے تو ہم بے چین سے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہی بات بار بار واقع ہوتی ہے تو ہمارا اطمینان ہو جاتا ہے اور اُس وقت ہم اِس عمل کو قانون یا دھرم کہنے لگتے ہیں۔ جب ایک سیب درخت سے گِر جاتا ہے تو ہمارے دِل میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے ہم گھبرا جاتے ہیں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایک کر کے سارے سیبوں کو گرنا ہی ہے تو ہم کو گرنے کا سبب معلوم ہو جاتا ہے اور اس سے ہماری تسلّی ہو جاتی ہے۔ ہم اِس عمل کو قانونِ کشش کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس قانون کے عمل سے نہ ہمیں خوف ہوتا ہے نہ حیرانی بلکہ ہم اِس قانون سے عملی فائدہ اُٹھانے کے طریقے ایجاد کرنے لگتے ہیں۔ مذہب کا مطالعہ کرنے میں بھی اِسی سائنسی اُصول کا اطلاق ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم ویدانت کا ہمیشہ سے یہی طریقۂ عمل رہا ہے۔ میں نے ابھی ابھی جو چند حصّے اُپنشد کے آپ کے سامنے رکھّے ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کیونکر اپنشدوں میں ہمارے مفکّروں نے اپنے مشاہدے کی مخصوص و محدود معلومات سے کائناتی اُصولوں کو آخذ کیا۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح دیوی دیوتاؤں کی نُورانی ہستیاں ذاتِ واحد میں مدغم ہو گئیں اور اسی طرح اِس عالمِ کائنات کے متعلق قدیم اربابِ فکر کے تصوّرات منزل بہ منزل اونچے ہوتے چلے گئے ٹھوس مادّی عناصر سے گزر کر لطیف اجزا تک پہونچے پھر لطیف سے لطیف تر اور زیادہ محتوی اجزا تک بڑھتے گئے اور بالآخر اُن کی رسائی اُس لطیف ترین جزو تک ہو گئی جو ہر جگہ موجود ہے اور جسے اُنہوں نے آکاش کا نام دیا لیکن یہاں تک آکاش کا تصوّر ایک غیر معروف مادی جزو کا تصور تھا۔ اِس سے زندگی کی پوری تفسیر نہیں ہوتی۔ اِس لئے یہ مُفکرانِ اعظم آکاش کے حلقے سے آگے چل کر اُس طاقت کی طرف بڑھے جو ہر طرف سائر و دائر ہوتی ہے اور جسے پران کہتے ہیں۔ لیکن پران اور آکاش یعنی انرجی ( ) اور مادّہ دو الگ اور متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ پران کے تصوّر میں آکاش شامل ہو جاتا ہے یعنی فکرِ انسانی جب پران کی حد تک پہونچتی ہے تو آکاش پران ہی کا جزو نظر آتا ہے۔ ویدانت میں یہ بات خاص طور پر

قابلِ غور ہے کہ آکاش جب اپنی بلند ترین صورت میں نمایاں ہوتا ہے تو پران کہلاتا ہے اور برعکس اس کے پران جب ذرا کم لطیف ہوتا ہے تو آکاش کے درجے تک اُتر آتا ہے اور آکاش کی لطافت میں کمی آتی ہے تو کم و بیش مجسّم اشیاء وجود میں آتی ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ عین اسی طرح ویدانت نے تحصیلِ علم کے اِس بنیادی اُصول کو شخصی خدا پر عائد کیا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح شخصی خدا کی مجازی صورت آخر کار شعورِ کُل کے لطیف تصوّر میں مبدل ہو گئی۔ لیکن جس طرح آکاش اور پران کے تصوّرات سے زندگی کے مشاہدات کی مکمّل وضاحت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شعورِ کُل کا تصور بھی نامکمّل ہے اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اُسکی تشکیل بھی ہم نے فطری حقائق کے صرف ایک رُخ یعنی شعور کا خیال رکھا ہے اور دوسرے رُخ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حصولِ علم کے اُصولِ ثانی کو ہم نے اِس تصوّر پر عائد نہیں کیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بیان کیا ہے ہر چیز کی وضاحت اس کی جبلّی فطرت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔ شخصی خُدا کے نظریئے میں یہ خامی ہے کہ وہ حدودِ فطرت سے باہر ایک مطلق العنان خالق کی صُورت میں پیش کیا جاتا ہے، اور انسانی دماغ کو اُسے قبول کرنے میں تامّل ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جن کا یہ خیال تھا کہ زمین پر جو سیب بھی گرتا ہے اُسے کوئی بھوت اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے لیکن اس کی صحیح وضاحت قانونِ کشش سے ہوتی ہے اور حالانکہ یہ وضاحت بھی مکمّل نہیں ہے تاہم کسی دوسری توضیح کے بمقابلے یہ وضاحت زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس کا ماخذ خود چیز کی فطری جبلّت ہے۔ دوسری توضیح میں قطعی طور پر خارجی علّت کا سہارا لیا گیا ہے اِسی لئے ہمارے تمام سلسلۂ علم میں شروع سے آخر تک جس وضاحت کا دار و مدار وضاحت طلب شے کی جبلّی فطرت پر ہوتا ہے وہ باقاعدہ اور سائنٹیفک ہوتی ہے اور جس وضاحت کا دار و مدار خارجی علّت پر ہوتا ہے وہ سائنٹیفک نہیں ہوتی۔ اب اگر اس نقطۂ نظر سے شخصی خُدا کے تصور کو پرکھا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ سائنٹیفک معیار پر پُورا نہیں اُترتا۔ وہ خدا دائرۂ فطرت کے باہر ہے فطرت سے تو اُس کا کوئی تعلق ہی نہیں کوئی واسطہ ہی نہیں بلکہ خود یہ فطرت اس خدا کے حکم سے کسی ایسی چیز سے پیدا ہوئی ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔

میں آپ کو کُفر کی تعلیم دینے نہیں آیا۔ میں آپ کو آپ کے ایمان سے منحرف کرنا نہیں چاہتا آپ کے سامنے اِن دلائل کو پیش کرنے سے میرا مقصد آپ کو اُس خدا سے روشناس کرانا ہے جسے دل و دماغ دونوں بخوشی قبول کرنے کے لئے تیار رہوں۔ جس کو پا کر شخصی خدا کے حقیقی معنی ہماری سمجھ میں آ جائیں لیکن شخصی خدا کا جو تصوّر ہم نے آج تک بنا رکھا ہے وہ سائنٹیفک اُصولوں کے خلاف ہے اور یہی وہ کمزوری ہے جو شروع سے آخر تک ہر زمانے میں ایسے ہر مذہب میں پائی جاتی ہے جو ایک واحد شخصی خدا کی تعلیم دیتا ہے۔ جن دو اعتراضات کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ ایسے ہر مذہب پر عائد ہوتے ہیں جو وحدانیت کا درس دیتا

ہے جس میں "ایک خدا" کی ہستی تسلیم کی جاتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو نظریہ ایسے شخصی خدا کا جس کی ذات سے وہ تمام خوبیاں جو ایک انسان میں ہو سکتی ہیں بڑھا چڑھا کر منسوب کی جاتی ہیں جس نے اپنی مرضی سے اس عالمِ کائنات کو ایک ایسی چیز سے پیدا کیا جس کا کوئی وجود ہی نہیں اور جو اس کے باوجود اس عالمِ کائنات سے علیحدہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان دو اعتراضات کو دوہرا دوں ایک تو یہ ہے کہ شخصی خدا کا نظریہ ناکافی اور نامکمل ہے۔ اِس سے تمام کائنات کے وجود کی پوری وضاحت نہیں ہوتی شخصی خدا کی ہستی کا ثبوت خود اُس کی بیان کردہ جبلّی فطرت سے نہیں ملتا اگر خدا نے کائنات کو تخلیق کیا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ نتیجہ یا معلول بذاتِ خود سبب یا علّت نہیں ہے اور علّت معلول سے بالکل علیحدہ چیز ہے لیکن جو علم ہم آج تک حاصل کر سکے ہیں اس کے مطابق معلول ہی علت کی ایک دوسری شکل ہے۔ زمانۂ حال میں سائنس کی جس قدر دریافتیں ہوئی ہیں اُن سب کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ مثلاً ارتقاء کے نظریے کو سب نے ہر جگہ تسلیم کیا ہے۔ اُس کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ معلول محض علت ہی کی دوسری شکل ہے۔ علّت ہی معلول کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ نظریہ کہ یہ تمام تخلیق کسی ایسی چیز سے ہوئی ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ زمانۂ حال کے سائنسدانوں کی نظر میں بالکل نہیں ٹھہرتا۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا مذہب کو سائنس اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے جو مذہبی نظریے ان دونوں معیاروں پر اُتر سکتے ہیں ان کو تو موجودہ زمانے کے لوگ قبول کریں گے لیکن آج کل کے بیدار مغز لوگ کسی ایسے نظریے کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے جس کی تائید میں محض پنڈتوں۔ مُلّاؤں۔ پادریوں یا ان کی کتابوں کی سند پیش کی جائے بلکہ ایسا کرنے سے نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلے گا اور لوگوں میں بے اعتقادی پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آج کل عموماً مذہب کے نام سے دُور بھاگتے ہیں اور اُسے پادریوں وغیرہ کا پاکھنڈ سمجھ لیتے ہیں یہ سچ ہے کہ بہت سے لوگ بظاہر اپنے مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن دراصل اُن کے دل میں بھی بے اعتقادی زیادہ پائی جاتی ہے اور اعتقاد کم۔ نتیجہ یہ ہے کہ مذہب محض قومی نشان بن کر رہ گیا ہے۔ اب یہ ایک ظاہری شناخت کی علامت ہے اور بس۔ یا یوں کہیے کہ پُرانے سماج کی ایک باقی ماندہ اچھی نشانی ہے اب اس سے زیادہ مذہب کی کچھ بھی وقعت نہیں رہی کیونکہ جو مذہب ہمارے آباؤ اجداد کی رُوحانی پیاس کو بجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ زمانۂ حال کے لوگوں کی رُوحانی ضرورت کو پُورا کرنے سے قاصر ہے اِس لئے نہیں کہ اُن کی رُوحانی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ اس لئے کہ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی بدل گئی ہے۔ اب انسان کی عقل اپنے باپ دادا کے مذہب کو قبول نہیں کرتی اس سے دل کی تسلّی نہیں ہوتی۔ شخصی خدا اور اُس کی آفرینش کا نظریہ جسے ہر مذہب میں وحدانیت یا خدائے واحد کا عقیدہ کہتے ہیں۔

اب زیادہ دنوں تک اپنا غلبہ جما نہیں سکتا۔ ہندوستان میں یہ نظریہ بُودھوں کے آگے نہیں ٹھہر سکا۔ اور بُودھوں نے ثابت کر دیا کہ اگر ہم اپنے مشاہدے کی بنا پر فطرت کو ہی لاانتہا طاقت کا مخزن قرار دیتے ہیں اور اگر فطرت اپنی تمام ضرورتیں خود ہی مُہیا کر لیتی ہے تو پھر اس بات پر اصرار کرنا کہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا بھی وجود ہے۔ بالکل غیر ضروری ہو جاتا ہے نہ رُوح کے وجود کی اور نہ خُدا کے وجود کی ضرورت باقی رہتی ہے یہ تھی بُودھوں کی منطق جس سے اُنھوں نے پُرانے مذہبوں کو پسپا کر دیا۔ اِس منطق سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ کیونکہ یورُوپ میں بھی قرونِ وسطیٰ میں خصوصاً اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً فلسفیانہ بحث ومباحثہ کا ایک خاص موضوع یہی رہا ہے کہ یہ جو مختلف، جوہر یا صفات مثلاً لمبائی، چوڑائی، موٹائی وغیرہ ہمیں نظر آتی ہیں۔ اُن کی وابستگی کسی عنصر کے ساتھ ہے یا نہیں یہ بحث ومباحثہ بہت پُرانا ہے اور آج کل بھی کہیں کہیں اس قسم کے توہّمات سے پالا پڑ جاتا ہے۔ اِس سوال کے جواب میں کہ کیا اُس چیز کی بھی کوئی اپنی ہستی ہے جسے ہم بے جان مادہ قرار دیتے ہیں اور کیا اِن صفات کے مِٹ جانے پر بھی جو اس سے وابستہ ہیں یہ چیز باقی رہتی ہے۔ بُدھ مت والے کہتے ہیں کہ آپ کے پاس کسی ایسے عنصر کا وجود تسلیم کرنے کے لئے کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ وجُود صرف گنُوں یا صفات کا ہے، ان کے سوا تو آپ کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اور یہی موجودہ زمانے کے ناستک بھی کہتے ہیں۔ یہی بحث آگے چل کر فطرت اور خالق کے سوال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیا اس تمام عالمِ کائنات کے سمجھنے میں جس کا ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں جس میں مُسلسل تغیّر رُونما ہوتا رہتا ہے

ع ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

کسی ایسی ہستی کا وجود ہے جسے ہم دیکھ نہیں پاتے اور جو تغیّر کی دسترس سے باہر ہے؟ بعض لوگوں کے خیال میں خالق ومخلوق[له] دونوں اپنی اپنی جگہ الگ الگ قائم ہیں۔ عالمِ شہود کا اپنا وجود ہے اور اس کے پسِ پشت ایک لازوال اور ابدی ہستی ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اس قِسم کی دوئی کی قطعاً ضرورت ہی نہیں۔ عالمِ شہود کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود ماننے کے لئے ہمارے پاس کوئی جواز ہی نہیں اور یہ طبقہ اپنے حق میں جو دلیلیں پیش کرتا ہے وہ نسبتاً بہتر ہوتی ہیں کیونکہ اس کے نظریے کے مطابق ہم جو کچھ دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور جس کا تصور کرتے ہیں وہی اصل معنی میں حقیقت ہے اور ہم اس کے قائل ہیں کہ اس کے علاوہ کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کا وجود ماننے کے لئے جو ہمارے مشاہدے

[له] Noumenon and Phenomenon.

سے باہر ہے۔ کسی کو کوئی حق ہی نہیں پہونچتا۔ بظاہر اس بات کا کوئی جواب نہیں لیکن ویدانت اِس "وحدت" اور دُوئی یعنی عالمِ شہود کے علاوہ ما فوق الفطرت شخصی خُدا کو ماننے کے جھگڑے کو نظریۂ وحدت الوجود سے سُلجھا دیتا ہے۔ ویدانت کہتا ہے کہ اِس میں شک نہیں کہ وجود صِرف ایک ہی ہستی کا ہے یہ غلط ہے کہ وجود دو چیزوں کا ہے ایک ایسی چیز کا جو بدلتی رہتی ہے اور دوسری کسی ایسی چیز کا جس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ویدانت کے مطابق دراصل یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں جو بظاہر بدلتی رہتی ہیں لیکن دراصل ان میں کوئی تغیّر واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ جسم یہ مَن اور ہماری رُوح علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ سب ایک ہی چیز ہیں اور وہی ایک ہی چیز اتنی مختلف صورتوں میں اپنا جلوہ دکھارہی ہے۔ اِس نظریہ کے ثبوت میں "وحدت الوجود" کے قائل ویدانتی سانپ اور رسّی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اگر آپ اندھیرے میں یا اور کسی دوسری وجہ سے رسّی کو سانپ سمجھ بیٹھے ہوں تو آپ کے دل میں خوف و ہراس عین اسی طرح پیدا ہوجاتا ہے جیسے آپ نے سچ مچ سانپ دیکھا ہو اور آپ ہر ممکن طریقے سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ سانپ دراصل رسّی تھی تو نہ صرف سانپ غائب ہوجاتا ہے بلکہ آپ کا خوف و ہراس بھی دُور ہوجاتا ہے۔ اور آپ مُسکرادیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب دماغ میں سانپ کا تصور پیدا ہوگیا۔ رسّی غائب ہوگئی اور جب رسّی کا وجود نظر آیا تو سانپ عنقا ہوگیا۔ اسی طرح جب ہماری نظر ظاہری اشیار پر لگی ہوئی ہے تو وہ لطیف ہستی اوجھل ہوجاتی ہے جس کی بدولت عالمِ شہود کا وجود ہے۔ لیکن جب ہمارے سامنے وہ ہستی ہوتی ہے جو کسی تغیر سے بالا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری دُنیا غائب ہوجاتی ہے۔ زندگی کے یہ دونوں رُخ ہمارے مشاہدے اور تجربے میں شامل ہیں۔ بعض لوگ ایک رُخ کو اہمیت دیتے ہیں اور بعض دوسرے کو۔ بس فرق صِرف دیکھنے کا ہے اس طرح پر تیکش واد (واقعیت)، اور آدرش واد (عینیت کی صحیح حیثیت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے واقعیت کا دلدادہ صرف ظاہری دُنیا ہی کو حقیقی سمجھتا ہے اور عینیت کے علمبرداروں کے نزدیک اس دُنیا کا دراصل کوئی وجود ہی نہیں وہ تو اس ہستی کے قائل ہیں جس کی وجہ سے یہ تمام کائنات منظرِ عام پر آتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی غلط نہیں کہہ سکتے۔ اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک ہیں۔ صحیح معنوں میں عینیت پرست (آدرش وادی)، وہ لوگ ہیں جنھیں مشاہدۂ حق کی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ ان کی نظر قدرتی طور پر تغیر پذیر دُنیا سے آگے گزر جاتی ہے اُن کے دماغوں میں تغیّر کا تصوّر تک باقی نہیں رہتا اُن کی نگاہ میں اس لحہ بہ لحہ تبدیل ہونے والی دُنیا کا کوئی وجود ہی نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں کو واقعی یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ یہ ساری دُنیا ایک فسونِ نظری ہے۔ مایا ہے۔ تبدیلی تو کبھی اور کہیں ہوتی ہی نہیں۔

یہ ایک لفظِ بے معنی ہے اِس کے برعکس ایک واقعیت پرست جو اس بصیرت سے محروم ہے اُس دُنیا کو دیکھتا ہے جو دم بہ دم بدلتی ہے۔ اُس کی نگاہ میں کسی غیر متغیر ہستی کا کوئی وجود ہی نہیں اور اُس کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ یہ جو کچھ ہماری اور آپ کی نظر کے سامنے ہے اُس کا وجود حقیقی ہے ایک امر واقعہ ہے اور اسکے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اِس تمام فلسفیانہ بحث سے میرا مطلب یہ ہے کہ شخصی خُدا کا تصوّر بجائے خود کافی نہیں ہمیں اس سے بلند تر اور زیادہ تسلّی بخش نظریئے کی ضرورت ہے اور یہ ہے غیر شخصی خدا کا تصوّر ایسے خُدا کا تصوّر جو اسم و جسم کی قید سے بلند و بالا ہے اِسکے علاوہ اور کوئی بھی تصوّر ایسا نہیں جو عقل و خرد اور سائنس اور منطق کے معیار پر پُورا اتر سکے۔

لیکن اِس سے شخصی خدا کا تصوّر منہدم نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمیں یہ ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ شخصی خدا کا وجود کہیں ہے ہی نہیں بلکہ شخصی خدا کا ثبوت خود غیر شخصی خدا کا تصوّر ہے۔ اسی سے شخصی خدا کی وضاحت ہوتی ہے۔ کیونکہ غیر شخصی خُدا کا تصور شخصی خُدا کے بمقابلہ کہیں زیادہ بلند اور وسیع ہے اس کی وسعت میں تمام شخصی تصوّرات سما جاتے ہیں۔ لامحدود تو صرف غیر شخصی خدا ہوتا ہے شخصی خدا محدود ہے۔ لیکن غیر شخصی خُدا کی ہستی میں شامل ہے اور اس بنا پر شخصی خدا پر بھی ایمان لایا جا سکتا ہے اِس طرح گویا ہم شخصی خدا کے وجود کا تحفظ کرتے ہیں اس کا استیصال اور انہدام نہیں کرتے۔ بسا اوقات ہمارے دل میں شک اُٹھتا ہے کہ غیر شخصی خدا کے تصور سے شخصی خدا کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے اور اسی طرح اگر ہم اِنسان کے حقیقی وجود کو غیر شخصی سمجھیں تو اِنسان کی انفرادیت اور شخصیت باقی نہیں رہتی لیکن ویدانت کے متعلق اس قسم کا کوئی خدشہ مناسب نہیں۔ ویدانت انفرادیت کو مِٹاتا نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اُس کا تحفظ کرتا ہے۔

جزو کا ثبوت ہمیشہ کُل سے مہیّا ہوتا ہے اگر انسان کی حقیقت کائناتی مان لی جائے تو اُس کی انفرادیت مِٹ نہیں جاتی بلکہ اور اُبھر آتی ہے۔ دریا کے تصور سے قطرہ مِٹ نہیں جاتا عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا اور اگر غور کیا جائے تو ... کا وجود دریا کے بغیر قائم ہی نہیں رہتا۔ اِسی طرح خود کا وجود بھی کائنات کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور حق تو یہ ہے کہ فرد اور کائنات دونوں کا وجود دراصل ایک ہی ہے۔ "بندہ اور خدا" "آتما اور پرماتما" ایک ہی ہیں۔ دُوئی کی نہ کبھی کوئی حقیقت تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔

یہ ہے وہ عظیم الشان فلسفہ وہ بلند خیال جس کا اظہار اپنشد کے اِن الفاظ میں ہوا ہے "تو وہ ہے" اس خیال کا سمجھنا کسی قدر دُشوار تو ضرور ہے ہر قطرے کے لئے دریا کا تصور مشکل ہوتا ہے لیکن یہ بات حصولِ علم کے دوسرے اُصول کے اطلاق سے بخوبی صاف ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کی وضاحت خود اسی کی جبلّی فطرت سے ہوتی ہے قطرے کی وضاحت پانی کے تصور یعنی دریا سے ہوتی ہے آخر ہماری جبلّی فطرت کیا ہے؟ غیر شخصی خدا کا بلند پایہ

تصور اس کلُ کے تصور سے ہماری وضاحت ہوتی ہے ہم اس کلُ کا جزُو ہیں ہم ہی "وہ" ہیں خود ہم ہی غیر شخصی خدا ہیں وہ ذاتِ مطلق ہیں جو شکل و نام کی قید سے ماورا ہے اور جس کی تلاش میں ہم ہر وقت ہر طرف سرگرداں رہتے ہیں۔ ہماری ہی ذات خدا کی ذات ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شخص خدا ہے جسے ہم جانتے ہیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کے ساتھ اسم و جسم کا تشخص وابستہ ہے میری مُراد یہ ہے کہ اُس کی غیر شخصی حقیقت جو شکل و نام کی قید سے آزاد ہے اور غیر شخصی خدا کی حقیقت دراصل ایک ہیں۔ شخصی وجود غیر شخصی وجود کا جزُو ہے جسے سمجھنے کے لئے کلُ کا تصور لازمی ہے تبھی جا کر شخصی وجود اپنی جگہ قائم و برقرار رہ سکتا ہے غیر شخصی وجود کے بغیر اُس کی کوئی حقیقت نہیں اور غیر شخصی وجود ہے خود ہماری آتما۔ ہماری اپنی ذات۔

اِس سِلسلے میں بھی کئی سوال اُٹھ سکتے ہیں اور میں آگے چل کر ان کا جواب دینے کی کوشش کروں گا اِس فلسفے کو سمجھنے میں کئی مُشکلات بھی پیش آئیں گی اور میں اُن کا حل آپ کے سامنے رکھوں گا۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ وحدت الوجود کے معنی کیا ہیں؟ عالمِ ظہور میں ہم سب کی ہستیاں بظاہر باہم دیگر علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں لیکن دراصل ہم سب کی حقیقت ایک ہے جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک غیر شخصی "کلُ" کے جزُو ہیں۔ ایک دریائے حقیقت کے قطرے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس حقیقت سے جس قدر کم علیحدہ سمجھیں گے اُتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ قطرے کو دریا ہونے کا جس قدر احساس ہوگا اتنی ہی اُس کی ہستی عظیم ہوگی جس قدر زیادہ ہم اس وجود "کلُ" سے خود کو منفرد سمجھیں گے اتنی ہی ہماری زندگی دُکھ اور مصیبت میں گرفتار رہے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہماری سماجی اور قومی زندگی کا انحصار اخلاقی قوانین پر ہوتا ہے اگر آپ اخلاقی قانون توڑنا شروع کردیں تو سماج اور مُلک میں انتشار پیدا ہو جائے۔ وحدت الوجود کا فلسفہ ہی ہمارے لئے اخلاقیات کا سنگِ بُنیاد ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ ہمیں اخلاقیات کا درس اس فلسفے کے علاوہ اور کہیں مِل ہی نہیں سکتا۔ قدیم زمانے میں اخلاقیات سے مُراد تھی کسی خاص ہستی یا کچھ خاص ہستیوں کے احکام کی تعمیل لیکن اب کم لوگ ایسے ہیں جو بغیر سوچے سمجھے مذہبی یا سماجی اور اخلاقی احکام کو ماننے کے لئے تیار ہونگے۔ جہاں تک اُن احکام کا تعلق کسی خاص مذہب یا سماج سے ہے وہ بنیادی احکام نہیں مانے جاتے اور لوگ اُن پر عمل پیرا ہونے کے لئے راضی نہیں ہوتے مثلاً ہندو کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ویدوں کی تعلیم کے مطابق فلاں کام کرنا چاہیئے اور فلاں کام نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن عیسائی ویدوں کے احکام کی متابعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے وہ تو کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے ہونے کا فیصلہ انجیلِ مقدس کے حوالے سے کرینگے۔ اب اگر ایک مذہب کسی چیز کو واجب قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر واجب تو سوچ بچار والا انسان کون سا معیار اختیار کرے گا۔ اِس لئے ہمارے مدِنظر تو ایک ایسا وسیع اُصول ایک ایسا بسیط

نظریہ ہونا چاہیئے جس میں یہ سب دلیلیں بیک وقت سمو جائیں ، دُنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو کسی حیل وحجّت کے بغیر ایک شخصی "خالق" کے وجود پر ایمان لے آتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ھزاروں روشن دماغ ایسے بھی ہیں جن کے لئے شخصی خُدا کا تصوّر ناکافی ہے ۔ یہ لوگ ہمیشہ بلند ترین چیز کی تلاش میں رہے ہیں اور جہاں کہیں بھی مذہب کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا کہ اس میں یہ تمام روشن دماغ اشخاص جگہ پا سکتے وہاں یہ لوگ مذہب کے دائرے سے باہر ہی رہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کل لوگوں کی زیادہ تعداد خصوصاً یورپ میں مذہب سے الگ تھلگ رہتی ہے ۔

اِس لئے اِن اشخاص کو بھی اپنے پہلو میں جگہ دینے کے لئے مذہب کو زیادہ وسیع النظر ہونا چاہیئے ہر مذہبی دعوے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا ۔ کسی بھی مذہب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ الہامی ہونے کی بنا پر یہ دعوے کرے کہ اُسکے احکام کو عقل کے معیار پر پُورا اُترنا لازمی نہیں اگر معقولات کا معیار پیش نظر نہ ہو تو مذہب کے معاملے میں بھی کبھی کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی ممکن ہے کہ کوئی مذہب کسی حالت میں قتل کی اجازت دیتا ہو لیکن عقل مذہب کے نام پر قتل وغارت کو کسی بھی حالت میں قبول نہیں کر سکتی ۔ اب اگر عقل کے معیار کو مذہبی معاملات سے نکال دیا جائے تو ہمارے پاس توہّمات کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا ۔ مثلاً اگر آپ قتل روا رکھنے والے مذہب کے پیرو سے کہیں کہ بھائی یہ تعلیم غلط ہے عقل اس کو نہیں مانتی تو وہ جھٹ کہہ اُٹھے گا "یہ کیسے ہو سکتا ہے" ؟ ہماری دینی کتابوں میں جو بات لکھی ہے وہ غلط کیسے ہو سکتی ہے اگر آپ یہ کہیں کہ آپ کے پاس بھی ایک دینی کتاب ہے جو اس سے بھی زیادہ پُرانی ہے اور اس میں لکھا ہے کہ کسی کو جان سے مارنا گنُاہ ہے تو مذہبی جھگڑا پیدا ہو جائے گا جس کو مذہبی کتابوں کے حوالے سے مٹایا نہیں جا سکتا ۔ کیونکہ ہر گروہ اپنی اپنی کتاب پر اعتبار کرے گا ۔ مُسلمان کہے گا کہ میری کتاب الہامی ہے اور چودہ سو سال پُرانی ہے عیسائی کہے گا کہ میری کتاب بھی الہامی ہے اور دو ہزار سال پُرانی ہے ۔ بُودھ اور ہندو اپنی اپنی کتابوں کے الہامی ہونے کا دعوے کرینگے اور کہیں گے کہ اُن کی کتابیں اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں ۔ ظاہر ہے کہ دینی کتابوں کا حوالہ دینے سے کام نہیں چلے گا تو پھر متضاد باتوں کا فیصلہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟ آخر وہ معیار کیا ہو سکتا ہے جس کی نسبت سے کسی مذہبی حکم یا اُصولی صداقت کا فیصلہ ہو ظاہر ہے کہ اس مطلب کے لئے کوئی سند ہونا چاہیئے یہ سند کسی کتاب کی نہیں ہو سکتی یہ سند تو ایسی ہونا چاہیئے کہ تمام عالم کائنات پر عاید ہو سکے ۔ ایسی آفاقی سند انسانی عقل کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی ہے ۔ لوگ کہتے ہیں عقل میں زیادہ توانائی نہیں ہوتی ۔ حقیقت کی تلاش میں اس سے ہمیشہ مدد نہیں ملتی نہ جانے کتنی بار عقل ٹھوکر کھاتی ہے اس سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے لغزش کھانے کے بجائے بہتر ہے کہ دینی اور الہامی احکام کی پابندی کی جائے مجھ سے یہ بات

ایک مرتبہ ایک رومن کیتھولک نے بھی کہی تھی۔ مگر ایسی باتوں کی تہ میں کوئی معقول منطق نہیں نظر آتی۔ بخلاف اسکے میں تو یہ کہوں گا کہ اگر عقل اتنی کمزور ہے جتنی کہ بتائی جاتی ہے تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ پادریوں، مُلّاؤں یا پنڈتوں کی عقل کمزور نہیں اگر ان کی عقل بھی میری عقل کی طرح ناقص ہے تو میرے لئے اُن کا حکم ماننا لازم نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی عقل کے فیصلے پر عمل کروں۔ آخر عقل خواہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو اسکے ذریعہ حقیقت تک رسائی کا امکان ضرور ہو سکتا ہے کسی دوسرے وسیلے سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اِس لئے ہمیں عقل کی پیروی کرنا چاہیئے اور اُن لوگوں کی قدر کرنا چاہیئے جو معقولیت پرستی سے کام لیتے ہیں خواہ مخواہ کسی بات پر ایمان نہیں لے آتے۔ انسان کے لئے خدا کی ہستی سے مُنکر ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ وہ کسی کے کہنے سے بغیر سوچے سمجھے اس کے خدا پر ایمان لے آئے۔ ہمیں ضرورت ہے ذاتی ترقی اور نشو ونما کی رُوحانی عرفان کی سینکڑوں نظریوں کے ادراک سے انسان کو زیادہ بلندی کبھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہزاروں کتابوں کے مطالعہ سے بھی دل میں صدق وصفا اور پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی۔ اصل طاقت تو حصولِ عرفاں میں ہے اور یہ طاقت خود ہم میں چھپی ہوئی ہے غور وفکر سے حاصل ہوئی ہے۔ انسان اگر اپنے دماغ سے کام نہیں لیتا تو اسے اِنسان نہیں کہہ سکتے۔ شعور ہی انسان کی خاصیت ہے۔ اس کی جبلّی فطرت ہے۔ مٹی کا تودہ غور وفکر سے عاری ہوتا ہے، اور صرف مٹّی کا تودہ ہی بنا رہتا ہے۔ انسان کی شان اس میں ہے کہ وہ غور وفکر سے کام لیتا ہے سوچتا سمجھتا ہے۔ سوچنا سمجھنا اِنسان کی فطرت میں داخل ہے اور یہی وہ بات ہے جو اسے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے میں تو عقل کا پرستار ہوں اور اسی کی پیروی کرتا ہوں میں مذہبی تقلید کی خرابیوں سے خوب واقف ہوں[لے] کیونکہ میرا جنم ایک ایسے مُلک میں ہوا ہے، جہاں لوگ دینی کتابوں اور مذہبی رہنماؤں کے احکام کی پیروی کی انتہائی حد تک پہونچ گئے تھے جہاں عقل سے کام لینا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر ویدوں کی عظمت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا محض مُبالغہ ہوگا کہ ویدوں ہی سے یہ دُنیا پیدا ہوئی یا یہ کہ ہمیں گائے کے وجود کا علم محض اس وجہ سے ہوا کہ لفظ گائے" کا استعمال ویدوں میں ہوا ہے۔ اسی طرح انسان کا وجود بھی دنیا میں اسی لئے ہے کہ ویدوں میں لفظ انسان کا استعمال ہوا ہے اگر ویدوں میں لفظ "انسان" نہ آیا ہوتا تو انسان پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ اگر لوگ اس قسم کی بے تکی باتیں کریں تو اس کا کیا علاج ہے اسے کہتے ہیں دینی کتابوں اور مذہبی احکام کی غلامانہ پیروی جس سے عقل کو کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایسی باتیں کرنے والوں میں بعض اچھے خاصے اور ذہین لوگ بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنی ذہانت کی مدد سے عجیب عجیب نظریئے پیش کئے ہیں اور نئے نئے فلسفیانہ نظام قائم کئے ہیں۔ اور انسانی فہم وفراست کا

لے تقلید کی روِش سے تو بہتر ہے خودکشی رستہ بھی چھوڑ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے (اقبالؔ)

نہایت مضحکہ خیز استعمال کیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی ارتقا کی رفتار رُک گئی۔ ایک طرف تو لوگ رسم و رواج کے کے پابند ہو کر لکیر کے فقیر بن گئے اور دوسری طرف عقل و فراست دقیانوسی نظریوں کی منطق کے سلسلے میں جکڑ گئی۔ اور کسی شخص یا قوم کے لئے اس سے زیادہ خطرناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کے دل و دماغ پر نشو و نما کا راستہ مسدود ہو جائے کیونکہ نشو و نما اور ارتقا انھیں دونوں چیزوں ہی سے تو ہماری زندگی عبارت ہے اگر ہمیں ترقی کرنا ہے اگر ہمیں بہتے ہوئے پانی کی طرح تر و تازہ رہنا ہے اور تالاب کا رُکا ہوا پانی نہیں بننا ہے تو ہمیں مذہب کے معاملے میں بھی عقل و خرد سے دست بردار ہونے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ یہاں تو عقل سے اور بھی زیادہ کام لینا ہوگا اور اگر معقولیت ہمارا معیار ہے تو ہم دیکھیں گے کہ نظریۂ وحدت الوجود[لے] ہی ایک ایسا نظریہ ہے جو دوسرے تمام نظریوں کے بمقابلہ زیادہ معقول ہے اُسے عقل قبول کرتی ہے۔ خُدا کی ہستی کے متعلق دوسرے تمام نظریئے یا اعتقاد اس لحاظ سے جزوی ہیں کہ وہ شخصی خدا کے تصوّر پر مبنی ہیں اور اتنے وسیع نہیں کہ کائنات کے تمام مشاہدات پر حاوی ہوسکیں اسی لئے عقل ان کو قبول نہیں کرتی۔ مسلک وحدت الوجود کی شان اسی میں ہے کہ خُدا کے متعلق ہر قسم کے جُزوی اعتقادات اُسکے احاطے میں آجاتے ہیں ان کو رُد کرنے یا غلط قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نظریۂ وحدت الوجود انکو آہستہ آہستہ وسیع بنا دیتا ہے۔ اکثر روشن طبع اشخاص کا کام اس اعتقاد کے بغیر نہیں چلتا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خُدا کے وجود کو شخصی قرار دینا معقولات سے بعید سہی لیکن شخصی خدا کے وجود میں یقین رکھنے سے دل کی تسلّی ضرور ہو جاتی ہے۔ عام لوگوں کو ایک ایسے ہی مذہب کی حاجت ہے جس سے ان کے دل کو تسکین حاصل ہو۔ اس زندگی میں بہت کم لوگ تیز و تند روشنی کی تاب لاسکتے ہیں اس نور سے ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اس نُور کو اپنے میں جذب کر کے زندگی کرنا تو بات ہی اور ہے۔ اس لئے دُنیا میں ہمیشہ آرام دہ اور تسلّی بخش مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ انسان کو ہمیشہ ایسے سیدھے سادے اعتقادات اور نظریوں کی تلاش رہی ہے جن کی بدولت کسی محنت کے بغیر اطمینانِ قلب میسر ہوتا رہے یہ ایک قسم کی فطری سہل پسندی اور آرام طلبی ہے جس سے گزرنے کی اہلیت ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ اگر ہم ان اعتقادات کو غلط قرار دینگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم عوام کو خُدا کی طرف سے منحرف کر دینگے حالانکہ انھیں کی مدد سے اکثر اشخاص کا میلان مذہب کی بلندیوں کی طرف کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ تو ایک ٹھوس حقیقت ہے، کہ دُنیا میں انسان ارتقا کے مختلف مراحل پر گامزن ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے دماغ کا دائرہ

لے Monoism.

بہت محدود ہے اور جن کو اپنی ترقی کے لئے ایسی زود فہم اور آسان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن پر وہ آسانی سے عمل کرسکیں ایسے لوگ رُوحانی وسعتوں میں بلند پرَوازی کرنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتے ان کے لئے تو بس دیوی دیوتاؤں کے خیالات ہی کارآمد اور مفید ہوتے ہیں لیکن آپ ایسے ذہین لوگوں کے واسطے غیر حضی خدا کے وجود کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ محض اسی کے ذریعہ دوسرے معتقدات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً شخصی خدا کے وجود ہی کو لے لیں جو شخص غیر شخصی خدا کے نکتے کو سمجھتا ہے اور اس میں ایمان رکھتا ہے نیز یہ بھی جانتا ہے کہ شخصی خدا کا وجود ناممکنات سے ہے۔ اُسے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور اس کا مظاہرہ نہیں ہوسکتا وہ اس راز سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ شخصی خدا ہی غیر شخصی خدا کی وہ بلند ترین تفسیر ہے جو اِنسانی ذہن میں آسکتی ہے۔ یہ عالم کائنات کیا ہے محض اسُی ذاتِ مطلق کی ہستی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر۔ ذاتِ مطلق ایک کتاب کی مانند ہے جو ہمارے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ ہر شخص اپنی عقل و ذہانت کے مطابق اس کا مطالعہ کرتا ہے اور جو معنی و مفہوم وہ جذب کرسکتا ہے۔ اپنے لئے اخذ کرلیتا ہے۔ یہ معنی اور مفہوم بُنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے کیونکہ تمام اِنسانوں کی عقل و ادراک میں یکسانیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر مشاہدے ایک سے ہوتے ہیں۔ مثلاً اِس کرسی کو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ اور آپ بھی۔ ہم دونوں کو یہ کرُسی ہی نظر آتی ہے۔ یہ نہیں کہ آپ کو کرسی نظر آئے اور مجھے کچھ اور چیز اِس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جو ہم دونوں کے دماغوں میں برابر کام کر رہی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری نگاہوں میں یکسانیت ہے اگر اس کرسی کو کوئی ایسا جاندار دیکھے جس کی سرشت ہم سے مختلف ہے تو عین مُمکن ہے کہ اسے یہ کرُسی نظر ہی نہ آئے یا اسکے دماغ میں اس کی تصویر اور ہی کچھ ہو[1]۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے یا اپنے کانوں سے سُنتے ہیں۔ اور ہاتھوں سے چھُوتے ہیں اس کی حقیقت ہمارے مشاہدے اور احساس پر موقوف نہیں۔ یہ حقیقت کچھ اور ہے ہمارا مشاہدہ اِس کا جزو ہے۔ اِس میں شامل ہے۔ ویدانت کہتا ہے کہ عالمِ شہود دراصل بذاتِ خود ہستی مطلق ہے جس میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ہمیں جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے محض اسی ذات مطلق کا گوناگوں محدود مظاہرہ ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے خیالات اور تصوّرات اُس ہستی مطلق کا ایک جزوی

---

[1] اِسی طرح ہمارے کان ہر آواز کو نہیں سُن سکتے سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ ہماری سُننے کی طاقت آواز کی چند لہروں تک محدود ہے۔ اس زیر دبم کی حد کے اِدھر اُدھر ہم کچھ نہیں سن سکتے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آواز بس وہی ہے جسے ہم سن سکتے ہیں۔

مشاہدہ ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ خود شخصی خُدا کا وجود بھی دراصل ہمارے محدود مشاہدات اور تصورات کی ایک صورت ہے اور اس لحاظ سے ایک محدود ہستی ہے۔ دوسرے علّت ومعلول کا قانون تو اس مظاہراتی دُنیا میں بھی کام کرتا ہے اور اسی لئے اگر خدا کو اس دُنیا کا سبب قرار دیا جائے گا تو قدرتی طور پر وہ محدود ہو جاتا ہے لیکن دراصل ہمارا شخصی خدا بھی غیر شخصی غیر محدود خدا کی صورت ہے جسے خود ہمارا ہی تصور پیدا کرتا ہے اور چونکہ فطرتاً ہمارا تصوّر محدود ہوتا ہے۔ اس لئے ہم غیر شخصی خُدا کو بھی محدود کر لیتے ہیں مگر شخصی خدا دراصل غیر شخصی خدا ہے۔ ذاتِ مطلق ہے جو شکل و نام کی حدود میں نہیں آتا۔ اِس عالمِ کائنات میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ اس غیر شخصی خدا کی ہستی ہے اور اس کی جو صورتیں ہم قرار دیتے ہیں اسکے متعلق جو تصوّر ہم قائم کرتے ہیں اس میں ہماری عقل وادراک کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ہر چیز میں حتےٰ کہ اس میز میں بھی وجود حقیقی اسی ذات مطلق کا ہے یہ نام رُوپ کا سلسلہ تو ہماری محدود عقل نے قائم کر رکھا ہے۔

یہی حال حرکت کا ہے۔ حرکت اس نام اور رُوپ کی مظاہراتی دُنیا کا ایک مشاہدہ ہے۔ ذاتِ مطلق کی کائناتی ہستی کے لئے حرکت کا تصور لازم نہیں ہماری مظاہراتی دُنیا میں جو ہر چھوٹا سے چھوٹا جز و کام کر رہا ہے۔ اُس میں ہر وقت تبدیلی اور حرکت ہوتی رہتی ہے لیکن یہ برھمانڈ یہ عالم کائنات بحیثیت کُل غیر متغیر ہے اس میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوتی کیونکہ حرکت یا تبدیلی تو ایک نسبتی چیز ہے اس کا ہونا ایک اضافی امر ہے ہم کسی چیز کو متحرک اسی حالت میں کہتے ہیں جب کوئی دوسری غیر متحرک چیز اس کے مقابل ہو حرکت کا تصوّر متحرک اور غیر متحرک کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر تمام کائنات کو ایک واحد وجود تسلیم کر لیا جائے تو اس میں حرکت نہیں ہو سکتی۔ یہ حرکت کرے گی بھی تو کسی کی نسبت سے کرے گی۔ اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں دم بدم تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ تبدیلی ہوگی تو کسی کی نسبت سے ہوگی۔ اِس لئے "یہ کُل" ہی وجودِ مطلق ہے لیکن اُس کے اندر ہر ذرے میں ہر جزو میں ہمیشہ ایک تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہر ذرّہ ہر جزو ہمیشہ رواں دواں ہے۔ بہ یک وقت غیر متغیر بھی ہے اور متغیر بھی۔ ایک ہی صورت میں غیر شخصی بھی ہے۔ اور شخصی بھی۔ یہ ہے ہمارا نظریہ اِس عالم کائنات کے بارے میں حرکت کے بارے میں اور خدا کے بارے میں اِس بات کو ویدانت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "تو وہ ہے" اس کے مطابق غیر شخصی خدا کا تصور شخصی خدا کے تصور کو رد نہیں کرتا۔ وجودِ مطلق وجودِ اضافی کو مٹاتا نہیں بلکہ اس سے ان دونوں کی وضاحت ہوتی ہے اور وہ وضاحت بھی ایسی ہوتی ہے جس سے ہماری عقل اور ہمارا دل دونوں مکمل طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں اس عالم کائنات میں جو چیز بھی نظر آتی ہے یہاں تک کہ شخصی خدا کا تصور بھی۔ درحقیقت ایک ہی غیر شخصی وجود ہے جسے ہماری خودی نے محدود کر رکھا ہے۔ جیوں ہی ہم اپنے دماغ (من)، کی حدود سے باہر نکل آئینگے۔

جیوں ہی ہم اپنی خودی کے دائرے سے باہر قدم رکھیں گے۔ ہمارا یہ حقیر وجود گم ہو جائے گا۔ ہماری انفرادیت اور شخصیت غیر شخصی خدا کی وحدت میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہی مطلب ہے "تو وہ ہے" کا۔ آخر ہمارے لئے اپنی حقیقی فطرت یعنی وجودِ مطلق کا شعور ہونا لازمی ہے۔ اس وقت ہم اپنی حقیقت سے غافل ہیں۔ ہمیں اس غفلت کو مٹانا ہے جب ہم اپنے منبع اپنے مصدر کو بھول جاتے ہیں تو اپنے وجود کو قطعی طور پر ایک علیٰحدہ وجود قرار دینے لگتے ہیں اور اس طرح ہم اسم و جسم کی قید میں آکر ایک محدود شخصی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ وحدت الوجود کا مذہب ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ ہم ان سب امتیازات کو خیر باد کہہ دیں۔ اس سے ہمیں اس بات کی تعلیم ملتی ہے کہ ہم اُن کی اصل کو سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہستی وہی غیر محدود ہستی ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا[1] اور ہماری یہ علیٰحدہ علیٰحدہ شخصیتیں وہ کثیر التعداد صورتیں ہیں جن میں ہماری اپنی لامحدود طاقت ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ اور یہ تمام تبدیلیاں جنھیں ہم نے ارتقا کا نام دے رکھا ہے۔ دراصل ظہورِ خودی کی طلسم آرائیاں ہیں۔ ہماری ہی آتما اپنی لامحدود قوت اور بے پایاں طاقت کا اظہار مختلف پیرایوں میں کر رہی ہے۔ اس وجودِ لامحدود کے اس طرف ہم کہیں ٹھیر نہیں سکتے۔ ہمارا رُکنا ناممکن ہے۔ ہماری طاقت ہماری مسرت اور ہماری عقل لامحدود ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمارا تصور مُقید نہیں رہ سکتا۔ ہمارا تبرک محض سجدوں پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ بے پایاں طاقت، جاودانہ زندگی۔ ابدی مسرت لامحدود شعور اور بے انتہا تبرک ہماری ملکیت ہیں ہمیں انھیں حاصل کرنے کے لئے کہیں جانا نہیں ہے۔

یہ ہے مرکزی تصوّر وحدت الوجود[2] کے نظریے کا اس کو سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں بچپن ہی سے ہر طرف سے کمزوری کی تعلیم ملی ہے۔ ہمیں ہماری پیدائش کے دن سے یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ ہماری ہستی کمزور اور بے بنیاد ہے۔ سالہا سال کی اس مرد شکن تعلیم کے بعد ہمارے لئے اپنی حقیقی طاقت کا احساس نہایت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ تجزیہ دتعقل کے ذریعہ ہم اپنی بے پایاں طاقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ تمام علم و آگہی کا مصدر۔ اس کا سرچشمہ خود ہمارے اندر موجود ہے۔ کوئی علم کوئی آگہی ہماری ذات سے باہر نہیں۔ علم یا شعور مادّے میں تو تھا ہی نہیں۔ اس کا وجود تو ہر وقت اِنسان ہی کے اندر تھا۔ علم کو کبھی کسی نے تخلیق نہیں کیا۔ علم تو اِنسان کو خود اپنے

---

[1] خودی بنتے بنتے بشر جا بنی تھی — بشر مٹتے مٹتے خدا ہو گیا ہے

[2] Monoism.

بطون سے حاصل ہوا ہے آپ نے برگد کا درخت دیکھا ہوگا جو کئی ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہوتا ہے اتنا بڑا درخت اِس چھوٹے سے بیج کے اندر ہوتا ہے جو رائی کے ایک دانے کے آٹھویں حصّے سے بھی زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ ساری طاقت اِس بیج کے اندر چھپی ہوتی ہے اسی طرح ہماری یہ زبردست عقل اور ذہانت تخمِ پیدائش کے ایک خانے میں سموئی ہوئی تھی۔ اگر یہ سب کچھ ممکن ہے تو کیا لاانتہا طاقت ہمارے اندر سمو نہیں سکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ امرِ حقیقت یہی ہے، چاہے بظاہر یہ بات خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہو لیکن دراصل حقیقت یہی ہے ہم میں سے ہر شخص ایک نطفے سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن ہماری ساری طاقتیں اس میں پیچ در پیچ چھپی ہوئی تھیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاقت غذا سے پیدا ہوئی یہ خیال غلط ہے۔ آپ پہاڑوں کے برابر اُونچے غذا کے ڈھیر لگا دیجئے۔ مگر اس سے اِنسانی طاقت ذکاوت اور شعور تو پیدا نہیں ہو جائیں گے طاقت تو بلاشُبہ اور حقیقتاً اس نطفے کے اندر ہی چھُپی ہوئی تھی یہ طاقت کیا ہے؟ اس کا ہمیں علم نہیں لیکن ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ہم مادی سطح پر اس پوشیدہ طاقت کو ظہور پذیر ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اسی طرح اِنسان کی آتما یا رُوح میں لاانتہا طاقت موجود ہے یہ اور بات ہے کہ وہ خود اس سے واقف ہو یا نہ ہو۔ انسان اس طاقت کے وجود کو اُس وقت محسوس کرتا ہے جب اسے آتما کا شعور ہو جاتا ہے جیوں ہی ہمیں آہستہ آہستہ اپنی آتما کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایک بے پایاں طاقت ہمارے اندر بیدار ہونے لگتی ہے جیسے کوئی سویا ہوا دیو عظیم رفتہ رفتہ جاگ اُٹھا ہو جیوں جیوں احساسِ بیداری کی شدّت بڑھتی جاتی ہے۔ غنودگی کے بندھن کھُلتے جاتے ہیں اور غفلت کی زنجیروں کی کڑیاں ٹوٹتی چلی جاتی ہیں پھر یقیناً ایک دِن ایسا آتا ہے جب ہم اپنی لامحدود طاقت اور بے کنار عقل و دانش سے مکمل طور پر آگاہ ہو کر اپنے پاؤں پر آزاد و سربلند کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آیئے ہم اپنی اِس منزل پر جلد از جلد پہونچنے کی غرض سے ہر ممکن کوشش کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

لہ Protoplasmic cell.

عملی ویدانت

چوتھا لیکچر

یہ لیکچر اٹھارہویں نومبر ۱۸۹۶ء کو بمقام لنڈن دیا گیا

ابھی تک ہم بیشتر لامحدود آفاقی[۱] ہستی کے بارے میں ذکر کر رہے تھے۔ آج میں آپ کو بتاؤں گا کہ مخصوص و محدود چیزوں کا اس ہستی سے کیا تعلق ہے اور اس کے متعلق ویدانت کا نظریہ کیا ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی زمانے کے عقیدوں کے تحت دویت[۲] واد یا دُوئی کے فلسفہ کا ذکر ویدوں میں آیا ہے اس کے مطابق ہر وجود میں ایک خاص اور لامحدود رُوح ساکن ہے اس رُوح کے معنی کی وضاحت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور کئی قسم کے نظریے پیش کئے گئے ہیں لیکن اس مسئلہ پر خاص بحث قدیم زمانے کے ویدانتیوں اور بودھوں کے درمیان رہا کرتی تھی۔ ویدوں کا قول تھا کہ ہر منفرد روح یا آتما بجائے خود منفرد ہوتی ہے اور بدھ مت کے ماننے والے روح یا آتما کے وجود ہی سے قطعاً منکر تھے بالکل ایسی ہی بحث آج یورپ میں ہستی[۳] اور صفات[۴] کے بارے میں چل رہی ہے۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ صفات کے پس پردہ کسی ایسی چیز کا وجود ہے جسے ہستی کہتے ہیں کیونکہ صفات کے لئے متصف کا ہونا ضروری ہے صفات آخر کسی چیز ہی میں ہو سکتی ہیں دُوسرا طبقہ کسی ایسی چیز یعنی ہستی کے وجود سے مُنکر ہے اُس کا خیال ہے کہ اس ہستی کا ہونا غیر ضروری ہے صفات بذاتِ خود برقرار رہ سکتی ہیں رُوح یا آتما کے متعلق قدیم نظریہ خودشناسی[۵] یا "میں" کے احساس کی دلیل پر منحصر ہے ہر انسان کو اپنی خودی کا شدید احساس ہوتا ہے "میں" کا احساس ہمیشہ قائم رہتا ہے "میں" کل بھی "میں" ہی تھا۔ آج بھی "میں" ہوں اور کل بھی "میں" ہی ہوں گا۔ جسم میں ہر وقت رُونما ہونے والی سب تبدیلیوں کے باوجود میں "وہی" میں "ہوں اس لئے "میں" کی اپنی ہستی ہے۔ یہ تھی مرکزی دلیل اُن لوگوں کی جو ایک محدود لیکن مکمل اور منفرد رُوح کے وجود پر یقین و ایمان رکھتے تھے۔ دُوسری طرف پُرانے زمانے کے بودھی لوگ اِس تصوّر

---

۱ Universal. ۲ Dualistic. ۳ Substance

۴ Quality. ۵ Self-identity.

کے خلاف تھے ان کی دلیل یہ تھی کہ جن باتوں کا ہمیں علم ہے یا ہو سکتا ہے وہ یہی تبدیلیاں ہیں کسی ایسی ہستی یا جوہر کا تصور کرنا جس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکتا ہو محض فضول بات ہے اور اگر کوئی چیز ایسی بھی جس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تو وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے ہم کو اس کا وجود تسلیم نہیں کرنا چاہیئے بالکل ایسی ہی بحث آج کل یورپ میں ایک طرف مذہب پرستوں اور آدرش وادیوں[1] اور دوسری طرف زمانہ حال کے قطعیت پرستوں اور منکروں[2] کے درمیان جاری ہے۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ ایسی چیز کا وجود ضرور ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اس مدرسۂ فکر کے تازہ ترین نمائندے ہیں ہربرٹ اسپنسر[3]۔ دوسرے مدرسۂ فکر کی نمائندگی زمانۂ حال کے کامٹسٹ ([4]) اور منکر اصحاب کر رہے ہیں آپ میں سے جن حضرات کی دلچسپی چند سال پہلے ہربرٹ اسپنسر اور فریڈرک ہیریسن[5] کے درمیان مباحثوں میں رہی ہے انھیں یاد ہوگا کہ ان دونوں کو وہی پرانی مشکل درپیش تھی جس کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ ایک طبقہ اس خیال کا حامی تھا کہ ان تبدیل ہونے والی چیزوں کے پس پردہ ایک ایسی چیز کا وجود ہے جس میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور دوسرے طبقے والے اس نظریئے کی ضرورت ہی کے قائل نہیں تھے ایک جماعت کا کہنا ہے کہ تغیر و تبدل کا اس وقت تک تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جبتک کسی ایسی چیز کا وجود نہ ہو جس میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا دوسری جماعت والے اپنی دلیل میں اس خیال کو فضول اور غیر ضروری سمجھتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہم تصور صرف اسی چیز کا کر سکتے ہیں جو تغیر پذیر ہے اور کسی غیر متغیر چیز کا ہمیں نہ علم ہو سکتا ہے نہ ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے عہد قدیم میں تو اس بحث کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکا کیونکہ ایسی چیز کا وجود جو صفات کے پس پردہ ہو اور جس کا شمار خود صفات میں نہ ہو عملی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا اس نظریئے کے حق میں صرف خود شناسی یا "میں" کے احساس کی دلیل پیش کی جاسکتی ہے یہ دلیل محض یادداشت پر مبنی ہوتی ہے یعنی یہ کہ "میں" وہی کل والا "میں" ہوں کیونکہ مجھے ایسا یاد ہے اور اسی لئے میرا وجود کوئی ایسا وجود ہے جو مسلسل ہے۔ اس سے وہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کہ صفات کے پیچھے ایک غیر متغیر وجود ہے اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری قسم کی دلیل پیش کی جاتی ہے تو اسے محض لفظوں کا ایک طلسم۔ ایک گورکھ دھندا سمجھئے مثلاً ان فقروں پر غور کیجئے "میں کرتا ہوں۔ میں جاتا ہوں۔ میں خواب دیکھتا ہوں میں سوتا ہوں میں حرکت کرتا ہوں" بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کرنے جانے اور خواب دیکھنے وغیرہ کے عمل میں تبدیلی ہو رہی ہے لیکن اس میں جو چیز قائم اور برقرار رہی ہے وہ لفظ "میں" ہے اسی لئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "میں" تو ایک ایسی چیز ہے جس کا وجود مسلسل ہے وہ بذاتِ خود ایک فرد ہے اور جتنی بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں

---

[1] Religionists and Idealists. [2] Positivists and Agnostics.

[3] Herbert Spencer. [4] Comtists. [5] Frederic Harrison.

ان کا تعلق جسم سے ہے حالانکہ بظاہر یہ بات معقول نظر آتی ہے لیکن اس کا دار و مدار دراصل لفظی گورکھ دھندے پر ہے۔ تحریر میں تو چاہے "میں" اور کرنا۔ جانا اور سونا علیحدہ علیحدہ باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ذہن میں ان چیزوں کو کوئی شخص بھی علیحدہ نہیں کر سکتا جب میں کھاتا ہوں تو میں اپنے متعلق یہ تصور کرتا ہوں کہ میں کھا رہا ہوں۔ میرا تشخص کھانے کے عمل سے ہوتا ہے میں، اسی سے پہچانا جاتا ہوں جب میں دوڑتا ہوں تو میرا وجود اور دوڑنے کا عمل یہ دونوں چیزیں جداگانہ نہیں ہوتیں اس لئے ذاتی تشخص کی دلیل بھی زیادہ مضبوط نہیں اور یادداشت کی دلیل بھی کچھ کمزور اور بودی سی ہے اگر میرے وجود کا تشخص یا اس کی شناخت کا ثبوت یادداشت ہی سے بہم پہونچتا ہو تو اکثر ایسی باتیں جو میرے ذہن سے محو ہو چکی ہیں ان کا وجود تشخص کے لحاظ سے کالعدم ہو جاتا ہے اس کی شناخت ہی نہیں ہو سکتی ہمیں معلوم ہے کہ بعض لوگ کچھ حالات میں اپنا تمام ماضی بھلا بیٹھے ہیں ساری باتیں ان کے حافظے سے محو ہو جاتی ہیں بہت سے پاگل خود کو شیشے کا بنا ہوا یا جانور سمجھنے لگتے ہیں اگر ایسے شخص کا وجود حافظے پر منحصر ہو تو اُسے واقعی شیشے کا بن جانا چاہیئے لیکن چونکہ یہ امر واقعی نہیں ہے اس لئے "خودشناسی" یا "میں" کے احساس کی دلیل ہے جس کا دار و مدار حافظے کی ایسی سُست بنیاد چیز پر ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی ایسی چیز ہے جو غیر متغیر ہے ظاہر ہے کہ اگر رُوح کو بیک وقت ایک محدود مگر مکمل وجود اور مسلسل ہستی فرض کر لیا جائے تو اُسے صفات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا روح ایک تنگ دامن اور محدود وجود بن کر رہ جاتی ہے جس کے ساتھ متعدد قسم کی صفات وابستہ ہیں اور ایسا وجود جسکے ساتھ تغیر پذیر صفات وابستہ ہوں غیر متغیر نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اس قسم قدیم بودھوں کی دلیلیں زیادہ مضبوط اور زود اثر نظر آتی ہیں یعنی یہ کہ نہ تو ہم کسی ایسی چیز کو جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں جس کا وجود صفات سے ماوراء ہو۔ ان کے نظریئے کے مطابق رُوح کے اندر کئی قسم کی صفات شامل ہیں جنھیں حسیات اور مدرکات[1] کہتے ہیں ان دونوں چیزوں کے مجموعے کا نام ہے رُوح اور اس مجموعے میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

رُوح کے متعلق ادویت واد[2] کے نظریۂ وحدت الوجود سے ان دونوں متضاد باتوں کا باہمی فرق دُور ہو جاتا ہے اور ان کے درمیان موافقت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے ادویت کہتا ہے کہ یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ ہم کسی چیز کے وجود کا تصوّر اس طرح نہیں کر سکتے کہ وہ صفات سے علاوہ اور جُداگانہ ہے ہم بیک وقت تبدیلی اور عدم تبدیلی کا تصور بھی نہیں کر سکتے یہ کبھی ممکن ہی نہیں لیکن وہی چیز جو متصف ہے۔ صفت بھی ہے وہ چیز اور اس کی صفت دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں وہی چیز جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ایک ایسی چیز نظر آتی ہے جس میں لمحہ بہ لمحہ تغیر رونما ہوتا رہتا ہے اس عالم کائنات کا غیر متغیر جوہر[3] اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ غیر متغیر جوہر۔ یہ غیر مظاہراتی حقیقت اس عالم شہود سے اسس مظاہراتی[4] دنیا سے مختلف نہیں ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور جس کے وجود کو ہر طرح سے محسوس کر سکتے ہیں دراصل غیر

---

[1] Sensations and Perceptions. [2] Advaitism. [3] Noumenon.
[4] Phenoumenon.

مظاہراتی دنیا ہی نے مظاہراتی دُنیا کی شکل اختیار کر رکھی ہے وجود ہے تو بس ایک رُوح کا ہے جو قطعاً غیر متغیر ہے ہمارے تمام محسوسات اور مشاہدات ہی نہیں بلکہ ہمارے یہ ٹھوس جسم بھی رُوح سے علیحدہ اپنی کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ یہ ہماری کم نظری ہے کہ ہم رُوح کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ ہے تو بس یہی رُوح اور ہم اپنی کم فہمی اور بے بصری کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم جسم بھی رکھتے ہیں اور رُوح بھی یہ بات دراصل غلط ہے۔ وجود صرف ایک ہے جسے ہم کبھی ایک نظر سے اور کبھی دوسری نظر سے دیکھ پاتے ہیں۔ جب مجھے بطور جسم اپنے آپ کا شعور ہوتا ہے تو میں صرف جسم ہی ہوتا ہوں اس وقت یہ کہنا بے معنی ہے کہ میں کوئی اور چیز ہوں اور جب مجھے اپنے آپ کا احساس بطور رُوح ہوتا ہے تو جسم کا تصوّر یا مشاہدہ باقی نہیں رہتا۔ بیک وقت جسم اور رُوح دونوں کا احساس نہیں ہو سکتا۔ جسم کا شعور مٹنے پر رُوح کا احساس ہوتا ہے اور رُوح کا احساس باقی نہ رہنے پر جسم کا شعور اُبھرتا ہے جب تک آدمی کے ذہن سے صفات کا تصوّر معدوم نہیں ہو جاتا اُس وقت تک اصل شے یعنی اپنے جوہر کا وجود اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ اس کا مشاہدہ اس کا اشراق نہیں کر سکتا اور اپنی ذات کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ اس بات کے ثبوت میں ادویت واد والے زمانۂ قدیم سے رسّی اور سانپ کی نظیر پیش کرتے چلے آئے ہیں اس نظیر سے اس مسئلے کی قدرے اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ جب انسان رسّی کو سانپ سمجھ لیتا ہے تو رسّی کا وجود غائب ہو جاتا ہے اور جب وہ رسّی کو رسّی سمجھتا ہے تو سانپ کی ہستی مٹ جاتی ہے اور صرف رسّی کا وجود باقی رہ جاتا ہے دوگانہ وجود کا تصوّر تو ناکافی اور بے بنیاد سے دلائل پر مبنی ہوتا ہے ہم اس نظریہ کا ذکر کتابوں میں پڑھتے ہیں یا اِدھر اُدھر اس کی بابت کچھ سُن سُنا لیتے ہیں حتّٰی کہ ہم اس وہم میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ہماری ہستی دوگانہ ہے ایک ہستی کا مظاہرہ رُوح سے ہوتا ہے اور دوسری کا جسم سے لیکن درحقیقت اس قسم کے مشاہدے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس کا کوئی وجود ہی نہیں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں آپ خود اپنے من سے (اپنی طبیعت سے) اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہ تصوّر کرنے کی کوشش کیجئے کہ آپ رُوح ہیں۔ آتما ہیں ایک ایسی چیز ہیں جو اسم و جسم کی قید سے بیگانہ ہے ہم میں سے بہتوں کے لئے اس کا تصور نہایت مشکل ہوگا لیکن چند لوگ ایسے ضرور نکل آئیں گے جن میں اس عظیم تصور کی اہلیت ہوگی جب ان لوگوں کو اپنی ہستی کا احساس رُوح کی شکل میں ہونے لگے گا اس وقت ان کے ذہن سے جسم کا شعور رخصت ہو جائے گا ممکن ہے کہ آپ نے بعض ایسے اشخاص کے بارے میں سُنا ہو یا خود انھیں دیکھا ہو جن پر خاص خاص اوقات میں یا تو گہرے مراقبے یا ذاتی ہپناٹزم کے عمل سے یا پھر سٹیریا سے یا دواؤں کے ذریعے ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ان کے تجربے سے آپ کو پتہ چلے گا کہ جب اندرونی طور پر انھیں کسی چیز کا احساس ہو رہا تھا تو ہر قسم کی خارجی شے ان کی

نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی ان کے لئے اس کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس ہستی کا وجود ہے وہ ایک اور محض ایک ہے وہی ایک ہستی اتنی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے اور انھیں مختلف صورتوں سے علّت اور معلول کا سلسلہ پیدا ہوتا ہے در اصل علّت و معلول کا سلسلہ ۔۔ یہی ارتقا کا سلسلہ ہے ایک چیز کا وجود دوسری چیز کے وجود میں منتقل ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ علّت بعض مرتبہ معلول کے نزدیک اور اس سے وابستہ نہیں ہوتی اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علّت غائب ہوگئی ہے اور اپنی جگہ معلول کو چھوڑ گئی اگر جسم کی علّت رُوح ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کچھ مُدّت کے لئے رخصت ہو جاتی ہے اور جسم باقی رہ جاتا ہے اور جب جسم غائب ہو جاتا ہے تو رُوح کا وجود باقی رہ جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ جسم اور رُوح کے دوگانہ وجود کی کچھ بھی حقیقت نہیں اس نظریئے کے خلاف بودھوں نے جو نظیریں پیش کی تھیں وہ بہت حد تک دُرست نہیں وہ رُوح اور جسم کی دوگانہ ہستی کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ شے یا جوہر[۱] اور اس کی صفات[۲] دونوں ایک ہی چیز ہیں جس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے یہاں یہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر متغیر وجود کا یہ تصوّر "کُل" پر عائد کیا جا سکتا ہے۔ "جزو" پر نہیں۔ جزو کا تصوّر تغیر یا حرکت کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے جو چیز محدود ہے۔ ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ جان سکتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر اور تبدّل کے امکانات ہوتے ہیں لیکن "جو کُل" ہے وہ تو غیر متغیر ہی ہوگا کیونکہ خود اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے ہی نہیں جس کی نسبت سے کسی قسم کی تبدیلی کا امکان ہو تغیر کا عمل تو بذاتِ خود اضافی ہے اور ہمیشہ ایسی چیز سے وابستہ ہوتا ہے جو متغیر نہیں ہوتی یا جو نسبتاً کم متغیر ہوتی ہے ظاہر ہے کہ "کُل" میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

ویدانتی نظریہ کے مُطابق رُوح ایک عالمگیر غیر متغیر اور لافانی ہستی ہے جس کی حیثیت کُل کی ہے اور اس حیثیت سے روح یا آتما کا وجود حتی الامکان عملی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ روح کو غیر متغیر جان لینے کے بعد یہ دوگانہ وجود کے نظریئے کہاں ٹھہریں گے جواب تک ہمارے دل و دماغ پر مُسلّط ہیں۔ اُن محدود اور منفرد رُوحوں کے تصور کا کیا حشر ہوگا جن کا سہارا ہم اب تک لئے بیٹھے ہیں۔

ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ جہاں تک "کُل" کا تعلق ہے ہم لافانی ہیں لیکن مُشکل تو یہ ہے کہ ہم کُل کا جزو ہو کر رہنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہماری یہ بھی خواہش رہتی ہے کہ ہم جزو کی حیثیت سے بھی لافانی رہیں ہم مانتے ہیں کہ "کُل" کی حیثیت سے نہ کہیں ہماری ابتدا ہے نہ انتہا اور یہی ہماری حقیقی "خودی" ہے لیکن ہم اپنی جزوی انفرادیت کو رُوح کا درجہ دے کر رُوح کو بھی منفرد بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں آئے دن کے تجربوں اور مشاہدوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری جزوی شخصیت ایک دُوسرے سے الگ تھلگ ہے اور یہ شخصیت ہر روز نشو و نما پاتی ہے ایک لحاظ سے یہ دُرست ہے کہ "مَیں" کا جو احساس کل

---

[۱] Substance. [۲] Qualities.

تھا وہ آج بھی ہے لیکن اِس کے باوجود کل اور آج کے 'میں' کے درمیان فرق ہے کل اور آج کے احساس خودی میں گزشتہ زمانے کے تجربات کا اضافہ ہو گیا ہے بہ الفاظ دیگر ہماری جزوی انفرادیت میں ارتقا کا عمل برابر جاری رہتا ہے ہماری شخصیت بدلتی رہتی ہے۔ اس کے وجود میں توسیع ہوتی رہتی ہے اگر ہم متواتر عمل ارتقا کو تسلیم کر لیں تو ہمیں متغیر اور غیر متغیر وجودوں کی دوگانگی کی ضرورت ہی نہیں رہتی بلکہ ایک ایسے ہی وجود کا تصور کافی ہوتا ہے جو مسلسل ارتقا کر رہا ہے اور یہ وجود ہے ہماری اپنی خُودی کا۔ ہمارے "میں" کے احساس کا جس میں ہر وقت توسیع ہوتی رہتی ہے اگر یہ سچ ہے کہ ہماری ارتقا ایک ایسے کیڑے[1] سے ہوئی ہے جس کے نہ ہڈی پسلی تھی نہ ہاتھ پاؤں اور یہ کیڑا بڑھتے بڑھتے انسان کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ ارتقا کا رُخ لامحدودیت کی طرف ہے اور خودی کی تکمیل کہیں اُس وقت جا کر ہوتی ہے جب لامحدودیت کا پُورا پُورا احساس ہو جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے منفرد رُوح کا تصور ایک ایسے انفرادی وجود کا تصوّر ہے جو مسلسل وسعت پذیر ہو کر آخر کار لامحدودیت کی منزل تک پہونچ جاتا ہے اور اگر یہ خیال صحیح ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کو ہم منفرد رُوح سمجھتے ہیں وہ دراصل خود رُوح کُل ہے کیونکہ لامحدودیت تو صرف اُس چیز میں پیدا ہو سکتی ہے جس میں لامحدودیت پہلے ہی سے موجود ہو جیسے چھوٹے سے بیج میں برگد کا درخت پوشیدہ ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو بیج سے درخت اُگ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح ہماری محدود ہستی ہی میں ہماری لامحدودیت چھپی ہوئی ہے یعنی ہماری انفرادیت اور ایک لاتغیر اور فانی ہستی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں ایک ہی چیز ہیں مکمل انفرادیت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم لامحدودیت کے مقام تک پہونچ جاتے ہیں اور یہی وحدت الوجود کے احساس کا مقام لیکن لامحدودیت کے اس طرف برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس کا رُخ ارتقا کی طرف رہتا ہے ویدانت کے اس ادویت یا توحیدی مسلک کی نمایاں خوبی تو یہی ہے کہ یہ اپنے پیش رو مسلکوں میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے جس نظریئے کو آج ہم ارتقا کا نظریہ کہتے ہیں اُس کا علم ہمارے قدیم فلاسفروں کو بھی تھا وہ جانتے تھے کہ بالیدگی آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتی ہے اور اس حقیقت کی بنا پر انھوں نے تمام پیش رو مسلکوں میں باہم دیگر ہم آہنگی پیدا کی۔ ان سے پہلے جو بھی مسلک رائج تھے ان میں سے کسی کو بھی مُسترد نہیں کیا گیا برعکس اس کے بُدھ مت نے منفرد اور غیر متغیر رُوح کے نظریئے کو تو منطقی دلائل سے رد کر دیا لیکن اس کی جگہ انھیں نظریۂ ارتقا کا ادراک نہ ہو سکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں مسلسل اور وسیع بالیدگی کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ اسی وجہ سے بودھ مت والوں نے کبھی خود کو ان مسلکوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہیں کی جو اس کے پیشتر رائج تھے ان کو غیر سود مند اور مُضر سمجھ کر نظری کر دیا گیا۔

مذہب کے معاملے میں اپنے سے پہلے کے نظریوں اور رسم و رواج کو کلیتاً مسترد کر دینا سماج کے لیے ہمیشہ سخت

---

[1] Mollusc.

نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ جہاں کہیں کوئی ایک نیا اور بزعم خود بہتر نظریہ قائم کر لیتا ہے وہ تمام گزشتہ چیزوں کو بلا دریغ، غیر ضروری اور شرانگیز تک قرار دیدیتا ہے وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ پُرانے نظرئیے خواہ اس کے موجودہ نقطۂ نظر کے بمقابلہ کتنے ہی خام کیوں نہ ہوں وہ خود اس کے لئے بہت کارآمد تھے کیونکہ خود انھیں کی بدولت وہ اپنے مقام پر پہونچتا ہے وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اسی طرح بالیدگی کے عمل سے گزرتا ہے پہلے خام تصورات میں زندگی بسر کرتا ہے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور پھر ایک بلند ترین معیار پر پہونچتا ہے اسی لئے قدیم اصولوں کے ساتھ ادویت کا سلوک ہمیشہ دوستانہ رہا ہے ادویت واد نہ صرف دوئی کے نظریہ کو بلکہ تمام گزشتہ نظریوں کو قبول کرتا ہے ایسا کرتے ہوئے وہ محض مُربیانہ عنایت سے کام نہیں لیتا بلکہ ان سب نظریوں کو حقیقت پر مبنی سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان سب میں ایک ہی حقیقت کا اظہار واقعی ہوتا ہے اور یہ سب کے سب بالآخر انہیں نتائج پر پہونچتے ہیں جن پر ادویت واد کی رسائی ہو چکی ہے۔

ویدانت کی رُو سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان سب مدارج کا تحفظ کریں جن سے بنی نوع انسان کو گزرنا پڑتا ہے ہماری زبان سے انکے حق میں کلمۂ خیر ہی نکلنا چاہیئے ان کو بُرا بھلا کہنے اور ان پر اعتراض کرنے سے تو صرف نقصان ہی پہونچتا ہے اسی لئے ویدانت نے (جو وحدت الوجود کا مذہب ہے) دوئی کے عقائد کو بھی مسترد نہیں کیا میں اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں دوئی کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ رُوح یا آتما، ایک مکمل مگر محدود اور منفرد ہستی ہے ویدانت اس کے خلاف آتما اور پرماتما میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا پھر بھی ویدانت کے وسیع دائرے میں دوئی کی منفرد رُوح کے لئے بھی جگہ ہے وہ منفرد رُوح کے نظرئیے کو قبول کرتا ہے کیونکہ آخر یہی تصور ارتقا پاکر وحدت الوجود میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوئی کا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ آدمی مرنے کے بعد دوسری دُنیاؤں میں جاتا ہے۔ ویدانت کسی جنّت یا دوزخ کا قائل نہیں لیکن اس عقیدے کو بھی ویدانت نے بحال رکھا ہاں اس کی وضاحتیں ضرور کر دی ہے کہ انسانی ارتقا کے راستے میں یہ بھی ایک مقام ہے اور بہر حال اس سے بھی حقیقت ہی کا ایک رُخ آشکارا ہے۔

دوئی کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ دُنیا کی تخلیق محض مادّہ[1] یا شکتی[2] سے ہوئی ہے اور اُسے کسی ایسے خالق نے اپنی قوتِ ارادی[3] یعنی مرضی سے تشکیل کیا ہے جو خود اس کائنات سے باہر ہے اس لحاظ سے انسان اپنے خالق سے علیحدہ ہے اور اُس کی یہ علیحدگی یا انفرادیت قائم رہے گی جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ویدانت نے اس من و تو کے نظرئیے کو بھی مسترد نہیں کیا بلکہ قبول کر کے اس سے بھی آگے اُڑان کی ہے۔ دوئی کے فلسفے کے مطابق انسان کی سرشت میں دو جُزو شامل ہیں یعنی ایک رُوح دوسرا جسم رُوح منفرد ہے مگر بذاتِ خود مکمل۔ رُوح زندۂ جاوید ہے

---

[1] Matter. [2] Will, Force.

جسم کی موت کے ساتھ اُس کی موت بھی واقع نہیں ہو جاتی۔ بخلاف اس کے جسم فانی ہے لیکن اس جسم سے وابستہ ایک غیر مرئی اور لطیف جسم[1] (سوکھشم شریر) ہوتا ہے۔ یہ جسم لطیف بھی مادّے سے بنا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بہت لطیف ہوتا ہے۔ یہ جسمِ لطیف ہمارے تمام کرموں کا مُحرِّک بھی ہے اور مسکن بھی۔ ہمارے تمام اعمال و تاثرات ہمیشہ ٹھوس صورت (لباسِ مجاز) میں نمودار ہونے کے لئے آمادہ اور بیقرار رہتے ہیں اور اسی جسمِ لطیف کے اندر لطیف صورت میں موجود ہوتے ہیں۔

جو خیال بھی ہمارے دِل میں گزرتا ہے۔ جو کام بھی ہم کرتے ہیں ایک خاص مُدّت کے بعد وہ ایک لطیف شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ بیج کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے اور جسمِ لطیف میں داخل ہو کر ایک امکانی[2] صورت اختیار کرلیتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد موافق حالات کے پیدا ہونے پر اعمال اور تاثّرات کے یہ بیج پھوٹ نکلتے ہیں۔ یہ نقوشِ اعمال پھر سے اُبھر آتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ اعمال کی یہ امکانی صورتیں اپنے اظہار کے لئے خود موافق حالات پیدا کرلیتی ہیں اسی کو کرموں کا بندھن کہتے ہیں۔ ہمارے اعمال کے نتائج ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور اُن نتائج کے مطابق ہماری زندگی بنتی یا بگڑتی ہے گویا ہم اپنی زندگی کو خود ہی اپنے اعمال کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ ہمارے یہ تمام بندھن خود ساختہ ہیں۔ ہماری مجبوریاں خود ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں، حتےٰ کہ جس چیز کو ہم قانونِ قُدرت کہتے ہیں وہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ ہم کسی اور قانون کے پابند نہیں۔ ہمارے خیالات۔ ہمارے الفاظ اور ہمارے اعمال ہی وہ دھاگے ہیں جن سے ہم خود اپنی مجبوریوں کا جال بُنا کرتے ہیں۔ بہر حال بھلا بُرا جیسا بھی ہو یہ جال ہم اپنے ارد گرد ڈال لیتے ہیں اور اس طرح اپنی قوتِ پرواز کو جکڑ دیتے ہیں۔ اپنی آزادی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ ہم کسی طاقت کو حرکت میں لے آئیں تو پھر ہمیں اُسکے تمام نتائج برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں۔ بس یہی ہے کرم کا قانون[3]۔ اِس جسمِ لطیف یا سوکھشم شریر کے پسِ پردہ جیو[4] یا منفرد رُوح کا قیام ہے۔ اس منفرد رُوح کی ہیئت اور جسامت کے متعلق طرح طرح کی دلیل آرائیاں ہوتی ہیں۔ بعضوں کے خیال میں یہ منفرد رُوح ایٹم یا جوہر کی طرح ایک بہت چھوٹی سی چیز ہے۔ بعض اس کو اتنا چھوٹا قرار نہیں دیتے۔ کچھ لوگوں کی رائے میں یہ حجم اور جسامت کے لحاظ سے بہت بڑی ہوتی ہے۔ بہر حال جیو یا منفرد رُوح کے بارے میں اسی طرح قیاس آرائیاں ہوتی رہتی

---

[1] Fine body. [2] Potential. [3] Law of Karma. [4] Jiva.

ہیں یہ جیو ایک آفاقی[1] (کائناتی) جوہر کا ایک جزو ہے اور اس جزو کا وجود بھی دوامی ہے اس کے وجود کی نہ کہیں کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ یہ اِن سب صورتوں سے اس لئے گزر رہا ہے کہ اس طریقے سے حقیقی فطرت کا اظہار ہوسکے اور یہ حقیقی فطرت ہے صدق و صفا اور پاکیزگی جس عمل اور خیال سے اس کے اظہار میں خلل واقع ہوتا ہے اسی کو گناہ یا عملِ بد کہتے ہیں اور جس عمل اور خیال سے اسکے اظہار میں مدد ملتی ہے۔ اُسے ہم نیک عمل قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان میں دویت وادیوں[2] یعنی دوگانہ وجود کے ماننے والوں اور ادویت وادیوں[3] یعنی وحدت پرستوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ رُوح کے تمام امکانات اور اس کی تمام قوتیں خود اُسی کے اندر موجود ہوتی ہیں کہیں باہر سے نہیں آتیں۔ وہ رُوح کے اندر امکانی صورت میں ہوتی ہیں اور زندگی کے تمام کاموں کا مدعا صرف اِنھیں امکانات کا اظہار ہوتا ہے، لیکن اظہارِ خودی کا یہ سِلسلہ موت سے ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس جسم کے خاتمے کے بعد رُوح دوسرا قالب اختیار کرلے گی۔ جب وہ قالب بھی خاک میں مِل جائے گا تو اس کے بعد وہ کسی اور قالب میں چلی جائے گی اور آواگون یا تناسخ کا سِلسلہ تکمیل خودی تک اسی طرح جاری رہے گا خواہ دُوسرا جسم اس دنیا میں ہو خواہ کسی دوسری دُنیا میں لیکن لکھا ہے کہ زیادہ تر جیو بار بار یہیں یعنی اسی دنیا میں جنم لیتا ہے کیونکہ حصولِ مقصد یعنی تکمیل خودی کے لئے اسی دُنیا کو سب سے زیادہ اچھا سمجھا گیا ہے۔ دوسری دنیاؤں کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہاں بلند تر مقاصد کے متعلق سوچنے کا کم موقع مِلتا ہے، اِس دُنیا میں سُکھ تھوڑا اور دُکھ بہت ہے، اِس لئے اِنسان دُکھ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ آخر یہاں اتنا دُکھ کیوں ہے اس کے اس غور سے بیداری پیدا ہوتی ہے۔ اور آخر جیو کو اپنی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ جس طرح اس دنیا میں دولت مندوں کو عیش و آرام سے فرصت نہیں ملتی اور زندگی کے بلند ترین مقاصد کے متعلق خیال کرنے کا موقع بہت کم ملتا ہے اسی طرح بیکنٹھ یا بہشت میں بھی جیو کو مزید ترقی کے مواقع شاذونادر ہی حاصل ہوتے ہیں وہاں تو عیش و آرام اور بھی زیادہ شدید صورت اختیار کرلیتے ہیں کہتے ہیں کہ وہاں انسان کا جسم نہایت درجہ لطیف ہوتا ہے جس کو بیماری تک چھو نہیں پاتی اور نہ اس پر کھانے پینے کی بندش ہوتی ہے اس کی تمام خواہشات پیدا ہوتے ہی پوری ہوجاتی ہیں اور اس طرح جیو سُکھ پر سُکھ بھوگتا چلا جاتا ہے لیکن اس چکر میں وہ اپنی صحیح فطرت کو بھلا بیٹھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بیکنٹھ سے بھی زیادہ بلند اور بھی بہت سی دنیائیں ہیں جہاں ہر قسم کی راحت کوشیوں کے باوجود

---

[1] Universal Substance. [2] Dualists. [3] Non-dualists.

مزید روحانی ترقی کے امکانات ہوتے ہیں مسلک دوئی کے بعض پیرو اپنی منزل ایک ایسی دُنیا کو بتاتے ہیں جہاں اُنھیں ہمیشہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا وہاں ان کو خوبصورت جسم میسّر آئیں گے کبھی بیماری اور موت کا نام نہیں سُننے میں آئے گا ہر طرف پاکیزگی ہی پاکیزگی برستی ہوگی اور گُناہ کا تو تصور ہی مِٹ جائے گا مکمل اطمینانِ قلب حاصل ہوگا اس عالمِ بالا سے وقتاً فوقتاً چند روحیں ہمیں خدا تک پہونچنے کا راستہ دکھانے کے لئے کُرۂ خاکی میں نزول کرتی رہی ہیں اور آئندہ بھی نزول کرتی رہیں گی۔ دُنیا کے بڑے بڑے ہادی اور رہنما اسی طرح آتے رہے ہیں عالمِ بالا کی ان آزاد اور خدا رسیدہ ہستیوں کے دل میں دُکھی انسانوں کے لئے اس قدر ہمدردی اور محبت بھری ہوتی ہے کہ وہ بار بار انسانی قالب میں ظہور پذیر ہو کر ہمیں سچا سُکھ پانے کی راہ دکھانے آتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ ادویت وادی رُوح کی بے انتہا قوت کے قائل ہیں وہ آواگون یا تناسخ کو کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ ہماری زندگی کا مقصد کسی عالمِ بالا میں سُکھ چین سے رہنا ہے وہ خدا کے حضور میں رہنے کو بھی اپنی ارتقا کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے ہیں ان کے کہنے کے مطابق ہمارا نصب العین لامحدودیت ہے۔ ہمیں آخر ایک روز جسم کی قید سے آزاد ہونا ہے کیونکہ جسم کتنا ہی لطیف کیوں نہ ہو۔ کبھی لامحدود نہیں ہو سکتا اور دُوسری طرف کوئی محدود شے ہمارا نصب العین نہیں ہو سکتی۔ جسم تو بہر حال جسم ہے ہمیں تو آخر کار خیال کی حدُود سے بھی باہر نکلنا ہے خیال کی وسعتیں بے کنار نظر آتی ہیں لیکن دراصل جسم اور خیال دونوں کا ظہور ہوتا ہے محدودیت سے ہمیں ان دونوں حدُود سے باہر قدم رکھنا ہے مکمل آزادی ہی ہمارا آدرش ہے یہ آزادی کوئی ایسی چیز نہیں جسے حاصل کرنا ہے یہ تو ہماری حقیقی فطرت ہے یہ تو پہلے ہی سے ہماری ہے ہم پہلے ہی سے اس دولت کے مالک ہیں صرف ہم اس حقیقت کو بھُول گئے ہیں اور اس سے منکر ہو بیٹھے ہیں۔ ہمارا یہ کہنا بھی ایک بھُول ہے کہ ابھی ہماری تکمیل نہیں ہوئی کمال حاصل کرنے کے لیے ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں کمال تو خود ہمارے اندر موجود ہے۔ جاودانیت اور سُرور بھی ایسی چیزیں نہیں جنہیں حاصل کرنے کی ضرورت ہو یہ دونوں چیزیں بھی پہلے ہی سے ہمارے قبضے میں ہیں ہر زمانے میں ان پر ہماری ملکیت رہی ہے مکمل آزادی مکمل ہستی اور مکمل نشاط و سُرور ہی ہماری اصل ہیں۔

اگر آپ میں بہ آوازِ بلند یہ اعلان کرنے کی جرات ہے کہ آپ آزاد ہیں تو آپ فی الفور آزاد ہو سکتے ہیں اگر آپ خود کو پابند قرار دیتے ہیں تو آپ پابند ہی رہیں گے ادویت واد دلیرانہ یہی اعلان کرتا ہے اور اپنی زندگی کو آزادی قوت اور سرور سے بھرپور کر لیتا ہے میں نے آپ کے سامنے دویت وادیوں کے اعتقاد بھی رکھ دئے ہیں اور ادویت وادیوں کا چیلنج بھی اب یہ اپنی اپنی ہمت کی بات ہے کہ کون کس مسلک کو اپناتا ہے۔

یہ بات کچھ ایسی آسان بھی نہیں ہے میں بخوبی جانتا ہوں کہ ویدانت کے بلند ترین آدرش یا نصب العین

کو سمجھنا بہت دشوار ہے اور اسے عملی طور پر اپنانا اور بھی کٹھن ہے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ دینی معاملات میں خواہ مخواہ لڑتے جھگڑتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی نظریہ ان کی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ اسے قبول کر لیتے ہیں تو پھر اور سب باتوں کو غلط سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے نظریوں کی حمایت میں لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں عملی دیدانت کا پہلا اصول یہ ہے کہ آپ جو چیز اپنے لئے موزوں سمجھتے ہیں اُسے قبول کیجئے لیکن یہی حق دوسروں کو بھی دیجئے اور انہیں وہ چیز لینے دیجئے جس کی ضرورت انہیں محسوس ہوتی ہے اگر آپ لامحدودیت کے تصور کی تاب لانے سے قاصر ہیں اور انفرادیت کو ہاتھ سے چھوڑتے آپ کو ڈر سا لگتا ہے تو شوق سے اپنی اس چھوٹی سی ہستی کے ساتھ وابستہ رہیئے اپنی خواہشات کی تکمیل کیجئے اور اسی میں خوش رہیئے اگر آپ کو اپنی انفرادی ہستی سے خوشگوار تجربات حاصل ہوتے ہیں اور ان تجربات کے دائرے میں محدود رہنے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور آپ اسی میں قیام کرنا چاہتے ہیں تو جب تک جی چاہے بخوشی اپنے اسی ماحول کو محفوظ رکھئے کوئی بھی طاقت آپ کو اپنی انفرادی ہستی ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی کیونکہ آپ کی خواہشات آپ کی انفرادی ہستی کی تشکیل کرتی ہیں۔ جب تک آپ میں اپنی محدود زندگی کی خواہش باقی رہے گی آپ کی پوشیدہ قوت غیر شعوری طور پر آپ کو محدودیت کے دائرے میں محدود رکھے گی اور جیسی زندگی بسر کرنے کی آرزو آپ کے دل میں ہوگی ویسی ہی زندگی آپ کے حصے میں آئے گی آپ کی مرضی ہو تو انسانی قالب اختیار کئے رہیئے کوئی آپ کو ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا اگر آپ فرشتہ بننا چاہیں تو فرشتہ بن سکتے ہیں یہی قانون فطرت ہے لیکن اس دُنیا میں ایسے شخص بھی ہیں جن کو فرشتہ بننا منظور نہیں وہ نام اور رُوپ کی تمام قیود سے آزاد رہنا پسند کرتے ہیں آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ ان کے نصب العین پر اعتراض کریں یا اُسے ہیبت ناک قرار دیں یہ تو اپنے اپنے آدرش کا سوال ہے ممکن ہے کہ کسی کی جان سو دو سو روپیہ کھو جانے کے خیال سے نکلتی ہو لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنا تمام سرمایۂ حیات کھو دینے پر بھی بے چین نہیں ہوتے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ دوسروں کو اپنے معیار پر جانچیں اور پرکھیں اُن کا معیار ہمارے معیاروں سے کہیں زیادہ بلند بھی ہو سکتا ہے اگر آپ ارتقا کی اس منزل میں ہیں جہاں آپ کو دنیوی خیالات اچھے معلوم ہوتے ہیں اور دنیوی تعلقات خوشگوار محسوس ہوتے ہیں اگر آپ کی خوشی اور مسرت کا باعث یہی چیزیں ہیں اور انہیں کے حصول کو آپ اپنا نصب العین سمجھتے ہیں تو شوق سے اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہیئے لیکن ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے جو ان تعلقات کو بندش سمجھتے ہیں جو انفرادیت کو ایک قید قرار دیتے ہیں جن کے معیار مختلف ہیں جو سچے معنوں میں بُت شکن ہیں۔ بُت پرست نہیں جن کا آدرش کچھ اور ہے اور جن کی خوشی حقیقت یابی اور ترک کی راہ اختیار کرنے میں مُنضمر ہے ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنی راہ خود منتخب کرلے۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے السٹریٹڈ لندن نیوز[1] میں یہ خبر پڑھی تھی کہ کچھ جہاز جنوبی سمندر کے جزیروں میں ایک طوفان میں پھنس گئے ہیں اس طوفان میں انگلستان کے ایک جہاز[2] کے علاوہ اور سب جہاز تباہ ہوگئے اخبار میں اس حادثے کی تصویر بھی چھپی تھی اس تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ڈوبتے ہوئے جہازوں کے لوگ عرشوں پر کھڑے ہیں ان کی موت نے خوفناک طوفان کی شکل میں انہیں گھیر رکھا ہے۔ اُس حالت میں بھی یہ لوگ خوشی کے نعرے لگا رہے تھے اور اس جہاز کے لوگوں کو خیر باد کہہ رہے تھے جو خوش قسمتی سے طوفان کی زد سے بچ کر جا رہا تھا۔ یہ ہے سچی بہادری اور فراخدلی آیئے ہم بھی ایسی ہی بہادری۔ حوصلہ مندی اور کُشادہ دِلی سے کام لینا سیکھیں اگر ہم سب سنسار ساگر کے طوفان میں گھرے ہوئے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں اگر ہمیں موت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو کوئی ڈر کی بات نہیں لیکن جو لوگ اس طوفان کی زد سے بچ گئے ہیں اس مصیبت کے چکر سے باہر نکل آئے ہیں انہیں دیکھ کر ہمیں خوشی ہونی چاہیئے۔ اگر سب کے سب ایک ساتھ طوفان کی زد سے بچ نہیں سکتے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ سب ایک ساتھ ڈوب جائیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے تو ہمارے اخلاق رخصت ہو جائیں گے۔ اور انسانیت کے زندہ رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی یہ خیال ہماری کم فہمی سے پیدا ہوتا ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہر شخص بہمہ وقت انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے ہی جان دے رہا ہے ماشاءاللہ اگر ہر ملک میں سچے دل سے خدمت خلق کرنے والے دو سو مرد اور عورت بھی پیدا ہو جائیں تو چند دنوں ہی میں عہدِ سعادت (ست یگ) آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدمتِ خلق کے یہ تمام تذکرے محض باتیں ہی باتیں ہیں۔ دُنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ نسلِ انسانی کے محسن وہ چند لوگ تھے جنہوں نے اپنی تمام ضروریات اور خواہشات کو ترک کر دیا اور جان تک کی پروانہ کرتے ہوئے چُپکے چُپکے خدمتِ خلق کرتے ہوئے عمر گزار دی اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنے محدود مفاد کا خیال کیا وہ دوسروں کے کام بہت کم آئے۔ ایک طرف بے غرضی کام کر رہی ہے تو دُوسری طرف خود غرضی۔ ہمیں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے اپنی انفرادیت کو قائم رکھ کر لہو و لعب کے ان چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیلتے رہنے کی خواہش محض خود غرضی ہے اگر ہم واقعی حقیقت کے طالب ہیں اگر ہمارے دل میں سچ مچ دُوسرے جانداروں کے ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آنے کا خیال ہے تو ہم کبھی بھی خود غرض نہیں ہو سکتے خود غرضی تو نتیجہ ہوتی ہے انسان کی تنگ دلی کا۔ محدود نگاہی کا۔ معاف کیجئے گا اگر میری صاف گوئی سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہونچی ہو لیکن مجھے تو کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے تمام کاموں میں عام طور پر ہماری خود غرضی

---

[1] Illustrated London News [2] انگریزی جہاز کا نام آر ایم ایس کیلیوپ H.M.S. Calliope تھا ان جہازوں میں امریکہ کا ایک جنگی جہاز بھی تھا۔

شامل ہوتی ہے اگر ہمارے دل میں فلاحِ عامہ کا خیال ہے اور ہم سچ مچ خدمتِ خلق کرنا چاہتے ہیں تو آیئے ہم اُن بزرگوں اُن عظیم ہستیوں اور اُن رشیوں اور پیغمبروں کے نقشِ قدم پر چلیں جو انسان تو انسان ایک حقیر سے حقیر جاندار کے لئے بھی ہزار بار اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے جن کی تمام زندگی دوسروں کے لئے وقف تھی اگر ہم فی الواقع ایسا کر سکتے ہیں تو ہمیں خدمتِ خلق کا ذکر زبان پر لانے کا حق حاصل ہے ورنہ خدمتِ خلق کی ڈینگیں مارنے سے کوئی فائدہ نہیں اس سے محض ہماری خودنمائی جھلکتی ہے اس کا اور کچھ بھی مُدعا نہیں۔

کم از کم میرا معیار تو یہی ہے کہ ہم میں گوتم بُدھ کا اخلاق پیدا ہو وہ کسی شخصی خدا یا شخصی رُوح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ کبھی کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی نہیں لاتے تھے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پورے ناستک تھے اس کے باوجود وہ ہمیشہ ہر شخص کے واسطے اپنی جان تک دینے کے لئے آمادہ رہتے تھے انہوں نے تمام عمر دُوسروں کی خدمت کی اور ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کا خیال رکھا ان کی زندگی کے سوانح نگار نے ان کی پیدائش کے بارے میں ٹھیک لکھا ہے کہ وہ محض دُوسروں کی بھلائی کے لئے پیدا ہوئے تھے ان کی زندگی ہنوں کے حق میں نعمت ثابت ہوئی۔ وہ خود اپنی نجات کے لیے جنگل میں مراقبہ اور ریاضت کرنے نہیں گئے ان کو محسوس ہوا کہ دُنیا میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے اور یہ کہ انہیں دنیا کو اس آگ سے بچانے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر نکالنا ہے۔ زندگی بھر ان کے دل میں یہی سوال اٹھتا رہا کہ دنیا میں اسقدر مصیبت اسقدر رنج و عذاب کیوں ہے اور اس سے انسان کس طرح نجات پا سکتا ہے؟

یہ حالت تھی اس پاک و عظیم بزرگ کی جو ہمیشہ دوسروں کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتا تھا یہ بلند اخلاق اس مہاتما کا تھا جس نے شخصی انفرادیت کو مٹا کر رکھ دیا تھا اس روشن مثال کے سامنے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی میں شخصی انفرادیت کا احساس نہ ہو وہ خدمتِ خلق کر ہی نہیں سکتا ہماری انفرادی ہستی قائم ہے لیکن کیا ہم مہاتما بُدھ کے اخلاق کو چھو بھی سکتے ہیں اگر ہمیں خدمتِ خلق کا دعویٰ ہے تو آیئے ہم مہاتما بُدھ کے اعلیٰ اخلاق کو اپنا معیار بنائیں اور خود غرضی ترک کر دیں یہی راز ہے سچے کام کرنے کا انسان جسقدر زیادہ زور انفرادیت پر دے گا اتنا ہی خود غرض بھی ہو گا اور اتنا ہی دھرم اور اخلاق سے دُور رہے گا۔ عین یہی حال قوموں کا ہے جو قومیں اپنی انفرادیت اور علاحدگی کے تنگ دائرے سے باہر نہ نکل سکیں وہ یہاں تک خود غرض ہو گئیں کہ وہ دُوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگیں انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر ظلم روا رکھے اور جنگ و جدل کو اپنا شیوہ بنا لیا انہوں نے دنیا میں بے رحمی اور قتل و غارت کی وبا پھیلائی۔ یہ قومی انفرادیت سیاسی ہو یا مذہبی ایک ہی بات ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا دونوں حالتوں میں قوم ہمدردی اور اخوت کے بلند معیار سے گر جاتی ہے۔

جہاں تک مذاہب کا تعلق ہے یہ انفرادیت اور برتری کا احساس شخصی خدا کی تعلیم دینے والے کم وبیش ہر مذہب میں پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر مذہب بجائے خود اخوت اور محبت کی تعلیم دیتا ہے لیکن پھر بھی دنیا میں مذہبی لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اور مذہب کے نام پر قتل ہوتے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم اور ویدانت میں بہت کم فرق ہے اور ان کی تعلیم بنیادی طور پر وحدت الوجود کی تعلیم ہے لیکن اس زمانے کے لوگوں کی دماغی ارتقا کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے شخصی خدا اور دُوئی کی تعلیم بھی دی تاکہ ان کو ایسی چیز حاصل ہو جائے جو ممکن اللمس ہو اور جس کے ذریعے ان کی رسائی بلند ترین نصب العین تک ہو سکے جہاں انہوں نے اس جگت پتا کی پوجا کرنے کا اُپدیش دیا جو عالمِ بالا[1] میں ہے وہاں انہوں نے یہ بھی اعلان کیا "میں" اور جگت پتا دونوں ایک ہیں"[2] (آپ کو یاد ہوگا کہ ویدانت میں اس حقیقت کو "تو وہی ہے"[3] کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔) یہ دونوں متضاد باتیں نہیں ہیں اس نبیِ اعظم کو معلوم تھا کہ "میں اور جگت پتا دونوں ایک ہیں" کے مقام تک پہونچنے کے لئے عالمِ بالا میں رہنے والے خالقِ کونین کا یعنی جگت پتا کا تصور لازمی ہے لیکن بدقستی سے لوگ بنیادی اصول کو بھلا بیٹھے اور عیسائی مذہب بڑی حد تک شخصی خدا کا مذہب بن کر رہ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں مذہب کے بانی نے صرف برکت۔ رحمت اور محبت کی تعلیم دی تھی وہاں خود پرستی اور خود غرضی داخل ہو گئی اور نہ صرف اس زندگی میں پندارِ خودی سے وابستگی پیدا ہو گئی بلکہ مرنے کے بعد بھی اسکا تصور قائم رہا اپنی جسمانی خودی کا تحفظ ہی درحقیقت خود غرضی ہے جن اخلاقیات کی بنیاد اس خودی کے تحفظ پر رکھی جائے گی وہ چاہے اور جو کچھ بھی ہو اخلاقیات نہیں ہوں گی اگر یہی ہماری اخلاقی تعلیم یہی ہمارا اخلاقی عمل ہے تو پھر خدا حافظ۔ افسوس کا مقام ہے کہ بعض بظاہر باخبر ایسے اشخاص بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری یہ حقیر شخصی انفرادیت ہی باقی نہ رہی تو تمام اخلاق کی بنیاد ہل جائے گی اگر ان سے کہا جائے کہ سچے اخلاق کی ابتدا تو وہاں سے ہوتی ہے جہاں انسان کی شخصی انفرادیت خود مٹ جاتی ہے تو وہ اس خیال کو سننے کی بھی تاب نہیں لا سکتے اور دہشت زدہ ہو جاتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر قسم کی خیر و فلاح۔ ہر قسم کے اخلاقی افادے کا تقاضا یہ ہے کہ "میں" سے پہلے "تو" ہو یعنی اپنے سے پہلے دُوسرے کا خیال کرنا چاہیئے جہاں اس اصول پر عمل ہوتا ہے وہاں حقیقی طور پر مذہب کی پیروی ہوتی ہے ورنہ مذہب ایک بے معنی چیز بن کر رہ جاتا ہے آخر عملی نقطۂ نظر سے کسی کو اس بات کی پروا کیوں ہو کہ بہشت یا دوزخ کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں۔ رُوح ہے یا نہیں کوئی شے غیر متغیر ہے یا نہیں ہمارے سامنے یہ دنیا ہے جس کی حقیقت سے ہم انکار

---

[1] Our Father in Heaven. [2] I and my Father are one.

[3] Thou art that.

نہیں کر سکتے یہ دُنیا لاکھوں دُکھوں سے بھری ہوئی ہے گھر سے باہر قدم نکال کر بھگوان بُدھ کی طرح اس دُنیا میں آیئے اور اس دُکھ کو کم کرنے کے لئے جدّ وجہد کیجئے یا پھر اسی کوشش میں اپنی جان پر کھیل جایئے۔ خود کو بھول جایئے۔ یہ ہے پہلا سبق جس کا سیکھنا آپ کے لئے ضروری ہے آپ خُدا کو مانیں یا اُس کے وجود سے مُنکر ہوں خواہ آپ ویدانتی ہوں خواہ عیسائی اور خواہ مسلمان اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر آپ سچے دل سے مذہب کے اصولوں پر چلنا چاہتے ہوں تو جو پہلا سبق آپ کو سیکھنا ہوگا وہ یہ ہے کہ اپنے پندارِ خودی کو مٹا کر اُس کی جگہ پندارِ خُدا کو دیجئے محدودیت کے قید خانہ سے نکل کر لامحدودیت کی فضا میں آجایئے۔

دُنیا میں دُو متوازی طاقتیں پہلو بہ پہلو کام کر رہی ہیں ایک ہے "میں" کی طاقت اور دُوسری "میں نہیں" کی طاقت ہے۔ جب ہم "میں" کے بل بوتے پر جیتے ہیں تو ہم صرف اپنے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور ہمیں اپنے ہی مفاد کا خیال رہتا ہے لیکن جب ہم میں دُوسری طاقت کارفرما ہوتی ہے تو ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور دُوسروں کے لئے جینے لگتے ہیں صرف انسانوں ہی میں نہیں ہر جاندار میں یہ دونوں طاقتیں کام کرتی ہیں کبھی ایک اور کبھی دُوسری مثلاً وہی شیرنی جو اپنے شکار کو بے رحمی سے مار گراتی ہے اپنے بچے کی جان بچانے کے لئے خود اپنی جان دینے کو تیار ہوجاتی ہے۔ اسی طرح وہی پست ترین انسان جس کے ذہن میں قتل و غارت اور لوٹ مار کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی یقیناً بلا دریغ اور بے تامل اپنے بھوک سے مرتے ہوئے بچوں کی جان بچانے کے لئے خود اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے آپ کو یہی دو طاقتیں تمام مخلوقات میں پہلو بہ پہلو کام کرتی ہوئی نظر آئیں گی جہاں ایک طاقت برسرِ کار نظر آئے گی وہاں دُوسری طاقت بھی ضرور موجود ہوگی۔ ایک میں اخذ و اختیار ہے دُوسرے میں ترک و ایثار ایک طاقت دُوسروں سے کچھ لیتی ہے دُوسری طاقت دُوسروں کو کچھ دیتی ہے ادنےٰ ترین جاندار سے لے کر اعلیٰ ترین مخلوق تک غرض کہ سارے عالم کائنات میں یہ سب کاروبار انہیں دونوں طاقتوں سے چل رہا ہے تمام زندگی کی محرک یہی دو طاقتیں ہیں اس نکتے کی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات تو بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ اس عالم کائنات میں یہ جو کام جاری ہے یہ جو کچھ ارتقائی عمل ظہور پذیر ہو رہا ہے انہیں دونوں طاقتوں کی بدولت چل رہا ہے اب آپ خود ہی بتایئے کہ کسی انسان یا قوم کو کیا حق ہے کہ دُنیا کے کاروبار کا محرک ان دونوں عناصر میں سے صرف ایک عنصر کو سمجھے اور کہے کہ یہ عنصر ہے تقابل اور کشمکش کا غیض و غضب کا مقابلہ اور جدّ وجہد کی خوں فشاں حقیقت سے کسی کو انکار نہیں لیکن ساتھ ہی محبت کی زبردست طاقت کو تسلیم نہ کرنا بھی تو غلط ہے سچ تو یہ ہے کہ مقابلہ اور جدّ وجہد میں خود غرضی کی طاقت کا جو مظاہرہ ہوتا ہے وہ محبّت ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے "میں نہیں" کی طاقت یہ محبّت یہ عدم پندار یہ ترکِ خودی ہی عالمِ کائنات کی مُثبت طاقت ہے اور یہی طاقت جب محدود ہوجاتی ہے یہی محبّت جب کسی خاص دائرے میں

گھر کر رہ جاتی ہے تو خود غرضی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے جب شیرنی کی محبت اپنے بچوں تک محدود ہوتی ہے تو وہ دوسرے جانوروں کو مار کر اپنے بچوں کو کھلاتی ہے جب انسان کی محبت اپنے خاندان یا اپنی قوم تک محدود ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو نقصان پہونچا کر بھی اپنے خاندان یا اپنی قوم کا بھلا کرنا چاہتا ہے۔ محبت کی طاقت کا یہ پہلو اس کے غلط استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محدود ہو کر محبت کی یہ طاقت غیض وغضب مقابلہ اور جدوجہد کی خوں فشاں صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ تقابل کی اصلی ماہیئت "محبت" ہے خود غرضی کی بنیاد ترکِ خودی ہے۔ بدی کا حقیقی مبدا نیکی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک لا محدود طاقت محدود ہو گئی ہے نیکی اور بدی محبت اور نفرت ترک اور خود غرضی کے وجود کا انحصار ہماری وسعتِ نظر پر ہے۔ یہ نظر جتنی وسیع ہوتی جائے گی۔ ہمارا دل جتنا کشادہ ہو جائے گا اتنا ہی ہمارے کردار میں نیکی محبت اور ترکِ خودی کا ظہور ہوتا جائے گا اور انجام کار نیکی ہی نیکی محبت ہی محبت کا دور دورہ ہوگا ہماری اصل محبت ہے نیکی ہے نفرت محبت ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ بدی دراصل نیکی کی طاقت کا غلط استعمال ہے اگر ایک شخص دوسرے شخص کو قتل کر ڈالتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کو قتل کی تحریک خود اپنے بچے کی محبت سے ہوئی ہو جس کو پالنے پوسنے کے لئے اسکے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے اس کی محبت تو اس کے "ننھے سے بچے" تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ دنیا میں کروڑوں انسان اور بھی ہیں جنہیں پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا جو ننگے ہیں اور جن کی پرورش کا سامان دوسروں کو قتل کر کے مہیا نہیں کیا جا سکتا اس کی نگاہ میں تو اس کے اپنے بچے کے علاوہ اور کسی چیز کی کچھ اہمیت نہیں ہے ضرورت اس بات کی ہے اسی محدود محبت کو وسعت دی جائے[ك] بہر حال محدود ہو خواہ غیر محدود محبت محبت ہی ہے اور ہمیشہ محبت رہے گی اس تمام عالم کائنات کو جو طاقت چلا رہی ہے وہ خواہ

ك نفرت یعنی محدودیتِ محبت کا علاج نفرت سے نہیں بلکہ کشادہ دلی اور وسعتِ نظر ہی سے ہو سکتا ہے آپ کی محدود محبت جب میری محبت کے مقابل آتی ہے تو ہم دونوں کے مفاد میں تصادم ہوتا ہے۔ نفرت جنم لیتی ہے جنگ وفساد کی نوبت آجاتی ہے لیکن اگر ہم دونوں اپنی اپنی محدود محبت کو وسعت دے کر ایک دوسرے میں شامل کر لیں تو نہ تو کوئی تصادم ہو سکتا ہے نہ نفرت اور جنگ وفساد ہی کا امکان رہتا ہے۔ جب خاندان کی عزت کا سوال درپیش ہوتا ہے تو آپس کے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ جب سماج کے مفاد کا خیال پیدا ہوتا ہے تو خاندانوں کے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ جب قوم کے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سماجی خانہ جنگیاں ختم ہو جاتی ہیں اور جب دنیا پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو بین الاقوامی جنگ وجدل کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی محبت کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں۔

رکسی شکل میں بھی ظہور پذیر ہو دراصل وُہ وہی ایک ہی حیرت انگیز شے ہے یعنی بے غرضی۔ ترک۔ محبت۔ وہی اور صرف وہی حقیقی زندہ طاقت ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا کام کر رہی ہے اسی لئے ویدانت اسی وحدت اسی یکتائی پر زور دیتا ہے ہمیں اس توضیح کے علاوہ اور کوئی توضیح اس لئے بھی منظور نہیں کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کر سکتے کہ اس عالمِ کائنات کی تخلیق و تحریک کے سبب دو ہیں یعنی یزدانیت اور شیطنت اگر ہم مان لیں کہ وہی حسین حیرت انگیز محبت تنگ دائروں میں محدود ہو کر نفرت اور رذالت کی صورت میں نظر آنے لگتی ہے تو ہمیں اس جہانِ رنگ و بو کی ایک معقول توضیح ہاتھ آجاتی ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ عالمِ کائنات ایک محبت کی طاقت سے جاری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس عالم کائنات کی تخلیق کے دو سبب ہیں۔ ایک سبب ہے نیکی اور دُوسرا بدی ایک سبب محبت ہے اور دوسرا نفرت۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ ان دونوں نظریوں میں کون بات زیادہ معقول اور قابل قبول ہے میں تو یقیناً محبت کی واحد طاقت کے نظریئے کا قائل ہوں میں خدا کو مانتا ہوں شیطان کو نہیں مجھے اپنی پاک طاقت کا یقین ہے کسی اور ناپاک طاقت کا نہیں۔

اب تک میں نے آپ کے سامنے دویت وادیوں کے بنیادی اعتقادوں کا ذکر کیا اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ کہاں تک شخصی خدا اور منفرد رُوح کے تصورات رُوحانی منزل تک پہونچنے میں مددگار ہو سکتے ہیں لیکن مجھے تو آپ کو ان محدود تصورات سے آگے لے جانا ہے اس لئے میں ان دویت وادیوں کے مقام پر زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کے لئے لازمی نہیں کہ ان اعتقادات کا سہارا لیا جائے سچا اخلاق حکم احکام پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ بلند ترین اخلاق کا تصور پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب انسان کی رسائی مابعدالطبیعات = Meta physics کی بلندیوں تک ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ ترین اخلاقیات فلسفہ و سائنس کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ساتھ ہی نشو و نما پا سکتی ہیں علم و آگہی سے اخلاق بلند ہوتا ہے۔ علم و آگہی ہمیں فلاح و بہبود کے کام سے روکتے نہیں بلکہ ان سے ہم میں بھلائی کے کاموں کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ علم ہی وہ چیز ہے جو ہمیں زندگی کے ہر صیغے میں غلط روی سے بچاتا ہے میری نظر میں تو علم بذاتِ خود پرستش ہے جتنا وسیع ہمارا علم ہوگا اتنا ہی بلند ہمارا اخلاق ہونا چاہئے ویدانت کی رُو سے وہ چیزیں بھی جو بظاہر بُری معلوم ہوتی ہیں۔ درحقیقت بُری نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم نے لامحدود کو محدُود کر رکھا ہے وہی محبت جو چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہ کر عذاب بن جاتی ہے اپنی بندشوں سے نکل کر بالآخر یزدانیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے ویدانت کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ تمام برائیوں اور عذابوں کے ذمہ دار ہم خود ہیں اور اس کا علاج بھی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے کسی مافوق الطبع ہستی پر تہمتیں لگانا اتنا ہی فضول اور بے معنی ہے جتنا مایوس ہو کر ہمت ہار کر بیٹھ رہنا۔ حوصلہ نہ چھوڑیئے یہ نہ سمجھئے کہ ہم ایک ایسی دُنیا میں آکر پھنس گئے ہیں جہاں سے رہائی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی شخص آکر ہماری دستگیری نہ کرے ویدانت کے مطابق ایسا نہیں ہو سکتا

ہم لوگ ریشم کے کیڑوں کی مانند ہیں اپنے ہی اندرونی مادّے سے دھاگا بناتے ہیں اُن سے کوے بُن لیتے ہیں اور پھر خود ہی ان کویوں کے اندر مقید و محبوس ہوجاتے ہیں لیکن یہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہتی اس جسمانی اور مادّی کوئے کے اندر کسی خارجی مدد کے بغیر ہمیں معرفت کی نشو و نما کرنا ہوگی اور ایک دن تتلی کی طرح قید خانہ سے باہر نکل آنا ہوگا۔ اعمال یعنی کرموں کا یہ جال ہم نے اپنے گرد خود ہی بُن رکھا ہے یہ تو ہماری کم فہمی اور کم نظری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس میں مُقید سمجھتے ہیں روتے دھوتے ہیں اور مدد کے لیے چیختے چلاتے ہیں مدد نہ کبھی باہر سے آئی ہے نہ آئے گی مدد تو خود ہمارے اندر سے ملتی ہے دنیا بھر میں جتنے دیوی دیوتا ہیں سب سے خوب فریاد کیجئے ان کی جی بھر کر دہائی دیجئے۔ آخر آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ان خارجی وسیلوں سے مدد حاصل نہیں ہوتی میں نے بھی برسوں رو رو کر دُعائیں مانگی ہیں اور آخر کار مجھے مدد بھی ملی ہے لیکن یہ مدد خود مجھے اپنے بطون سے ملی ہے۔ مجھے اپنے غلط طریقہ عمل کا احساس ہوا اور خارجی امداد کی امیدوں کو ترک کرنا پڑا اور جو جال میں نے اپنے گرد و پیش بُن رکھا تھا مجھے اس کے تار پود بکھیرنے پڑے ایسا کرنے کی طاقت مجھے اپنے اندر سے ملی ۔ مجھے قطعی طور پر یقین ہے کہ نجات کا واحد طریقہ خود اعتمادی ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں غلط یا صحیح جس چیز کی لگن سچے دل سے لگی وہ پوری ہوکر رہی بُرا بھلا جیسا بھی ہے میرا ماضی بھی میری ذاتی خواہشات سے تشکیل ہوا اور اپنے حال و مستقبل کا بھی معمار میں خود ہوں مجھ سے نہ جانے کتنی غلطیاں میری زندگی میں سرزد ہوئی ہیں لیکن ان غلطیوں کی تشکیل میں بھی میرا ہی حصہ ہے اور اگر آج میں کسی کام کا آدمی بن سکا ہوں تو مجھے اپنی غلطیوں پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو دیدہ و دانستہ غلطیاں کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ براہِ کرم ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوجائیے گا لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہر وقت یہ سوچ سوچ کر کہ آپ سے فلاں غلطی ہوگئی ہے اس ڈر سے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے اپنی زندگی کو اجیرن نہ بنائیے گھبرائیے اور مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں یاد رکھئے کہ آخر میں ہر بات دُرست ہوجائے گی اس کے علاوہ اور کوئی صورت پیدا ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ نیکی اور پاکیزگی ہماری فطرت میں داخل ہیں اور فطرت کو کوئی بھی مٹا نہیں سکتا ہماری حقیقی اور بنیادی فطرت ہمیشہ ایک رہتی ہے اُسے کوئی بدل نہیں سکتا سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی بات صرف اتنی ہے کہ ہم سے غلطی اس لئے سرزد ہوتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہیں اور یہ کمزوری کا احساس ہماری کم فہمی اور کم نظری کا نتیجہ ہے جو کام انجانے میں کیا جائے میں تو اُسے درگزشت یا غلطی کہوں گا میں اُسے گناہ کا نام نہیں دیتا یوں تو یہ لفظ نہایت معنی خیز ہے اور شروع شروع میں اس کا استعمال صحیح معنوں میں ہوتا رہا لیکن اس کا جو عام مفہوم آجکل سمجھا جاتا ہے اس سے مجھے دہشت ہوتی ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ نا سمجھی کیا ہے جس کے باعث ہم آئے دن غلطیوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں؟ یہ جہالت کا پردہ کیا ہے جو ہماری آنکھوں پر پڑا ہوا ہے اور یہ پیدا کیونکر ہوا؟ میں تو یہی کہوں گا کہ ہم خود ہی اپنی جہالت

کے ذمہ دار ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور پھر چلاتے ہیں کہ ہائے ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے اندھیرا ہی اندھیرا ہے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کو اپنے سامنے روشنی ہی روشنی نظر آئے گی روشنی کا وجود ہمیشہ ہمارے لئے ہوتا ہے۔ ہماری روح بالذات درخشاں ہے فقط میرے کہنے پر میری بات کا یقین کرنا لازمی نہیں زمانۂ حال کے سائینسدانوں کو سنیئے کیا کہتے ہیں آخر ارتقا کی علت کیا ہے؟ ارتقا کی علت ہے خواہش۔ ایک جاندار کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو اپنے موافق نہیں پاتا اس لئے وہ آہستہ آہستہ اپنے جسم کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتا ہے یہاں تک کہ کئی بار یہ جسم ایک نئے قالب کی صورت اختیار کر لیتا ہے خود کہئے کہ یہ نیا قالب اسے کہاں سے ملا اور کیوں کر ملا پہلے اس جاندار کی ضرورت خواہش بنی پھر خواہش نے ارادے کی شکل اختیار کی اور ارادے نے اُسے ایک نیا جسم عطا کیا فلسفۂ ارتقا کے مطابق خود آپ جانوروں کے مقام سے ترقی کرتے کرتے انسان کے درجے تک پہونچے ہیں تو آپ سے صرف یہی کہہ رہا ہوں کہ اس مقام پر رک مت جایئے اپنی قوتِ ارادی سے کام لیتے چلے جایئے آپ اور بھی زیادہ بلند مقام پر پہونچ جائیں گے قوتِ ارادی سب کچھ کر سکتی ہے آپ پوچھ سکتے ہیں کہ قوت ارادی 'قادر کُل' ہے تو ہم جو چاہیں وہ کیوں نہیں کر سکتے ہمارے سب کام کیوں سر انجام نہیں پاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ ہر کام پورا کر سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ عموماً آپ اپنے آپ کو ایک حقیر اور صغیر ہستی سمجھے ہوئے ہیں اور جب تک اپنے آپ کو کمزور و ناتواں سمجھتے رہیں گے آپ کی بے کنار قوت ارادی بیدار ہی نہیں ہو پائے گی۔ ذرا سوچئے تو آپ ارتقا کرتے کرتے امونبا[1] سے انسان کیسے بن گئے ذرا اس پر بھی تو نظر ڈالیے کہ یہ تمام نشو و نما کس کی طاقت سے ہوئی کس کی طاقت سے یہ ارتقائی عمل ظہور پذیر ہوا ہے یہ سب آپ ہی کی قوت ارادی کا کرشمہ تھا کیا آپ اس کے 'قادر کُل' ہونے سے انکار کر سکتے ہیں؟ جس طاقت کی مدد سے آپ کی رسائی انسانیت کے اعلیٰ مقام تک ہوئی ہے وہ آپ کو اس سے بھی زیادہ بلند مقام تک لے جا سکتی ہے آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے کردار (کیرکٹر[2]) کو بلند کرنا اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنا اسی لئے میں آپ کو یہ اپدیش ہرگز نہیں دوں گا کہ آپ کی فطرت میں بدی ہے آپ گنہگار ہیں میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ گھر بار چھوڑ کر بوریا پہن لیجئے اور بھبھوت لگا کر بیٹھ رہیئے اور زندگی بھر شور و شیون سے کام لیتے رہیئے اگر آپ سے کوئی غلطی ہوئی بھی ہے تو رونے دھونے سے اور ہر وقت اسی غلطی کا خیال کرنے سے آپ کا کام نہیں نکلے گا اس سے تو آپ میں اور بھی کمزوری آ جائے گی یہ طریقہ عمل ہمیں نیکی سے ہٹا کر برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ نیکی نیکی کے خیال پیدا ہوتی ہے برائی کے خیال سے نہیں۔ اگر یہ کمرہ مدت سے بند ہو اور اس میں تاریکی ہی تاریکی طاری ہو تو کیا آپ کے رونے چلانے

ح۱ Amoeba. ح۲ Character.

سے کمرے کی تاریکی دُور ہو جائے گی؟ دیا سلائی جلایئے اور پل بھر میں روشنی ہو جائے گی چراغ جلایئے اور چاروں طرف نور پھیل جائے گا اسی لئے عمر بھر یہی سوچتے رہنے سے آپ کو کیا حاصل ہو گا کہ آپ بڑے گناہ گار ہیں آپ سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں ہیں آپ اپنی ذات کی اپنے ارادے کی روشنی مہیا کیجئے اور گناہ اور کمزوری کی سیاہی چشم زدن میں رُخصت ہو جائے گی اپنا کیرکٹر تعمیر کیجیے اپنی سیرت بنایئے اور اپنی حقیقی فطرت کا اظہار کیجئے وہ فطرت جو روشن بالذات ہے جس میں تابانی اور درخشانی ہے جو ہمیشہ اور ہر وقت پاک و منزّہ ہے۔ آپ جہاں بھی ہوں اپنی حقیقت سے آگاہ رہیئے گناہ گاری اور کمزوری آپ کے پاس پھٹک نہیں پائے گی آپ جس طرف بھی نظر اٹھائیں اپنی ہی فطرت کو جلوہ گر دیکھیں میری دُعا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو یہ درجہ نصیب ہو کہ ہمیں پست ترین انسان میں بھی اسی ذاتِ حقیقی کا جلوہ نظر آئے اور اُس کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے ہم اس سے یوں خطاب کریں:" اے وجود تاباں اُٹھ ہاں اے وجود تاباں اُٹھ تو ہمیشہ پاک و منزّہ ہے اُٹھ تو پیدائش اور موت کی قید سے آزاد ہے۔ اے قادرِ مطلق اُٹھ اور اپنی صحیح فطرت کا اظہار کر یہ محدود اظہارِ خودی تیری شایانِ شان نہیں" یہ ہے وہ بلند ترین دُعا جس کی تعلیم ادویت دیتا ہے یہی تو واحد صحیح دُعا ہے یعنی اپنی صحیح فطرت کو۔ اُس خدا کو یاد رکھنا جو ہمیشہ ہمارے اندر موجود ہے جس کی بدولت ہم زندہ ہیں جو لا محدود ہے۔ آزادِ مطلق ہے قادرِ کُل ہے۔ جس کی طاقت کی کوئی انتہا نہیں۔ جو مجسّم نیکی اور بھلائی ہے جو مشفق و مہربان ہے جس کی محبت بے لاگ ہے جسے کسی سے نہ کوئی غرض ہے نہ کوئی خوف۔ خوف تو اس کو لگتا ہے جو خود غرض ہوتا ہے جس کو خود اپنے لئے کچھ بھی نہیں چاہیئے اس کو کس بات کا ڈر امید و بیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے جہاں امید نہیں وہاں بیم کا وجود نہیں ہو سکتا اور پھر امید یا غرض تو اس کو ہو سکتی ہے جس میں کچھ کمی ہو پرماتما ہر لحاظ سے پُورن ہے جو مکمل ہے اُسے کسی چیز کی خواہش ہو سکتی ہے؟ اور جہاں خواہش نہیں وہاں خوف نہیں جو زندۂ جاوید ہے اس کے لئے موت سے ڈرنا کیا معنی؟ جو سدا پاک ہے اس کو برائی اور گناہ سے کیا خطرہ؟ اس لئے اگر ہم ادویت واد کو مانتے ہیں اور وحدتِ حیات کے قائل ہیں تو ہمارے لئے اپنی انفرادی ہستی کا وجود باقی نہیں رہتا جس لمحہ بھی یہ بات ہمارے دل پر روشن ہو جاتی ہے اس وقت ہماری انفرادیت ختم ہو جاتی ہے چھوٹے بڑے کا فرق مٹ جاتا ہے یہاں تک کہ جنس اور قوم کے تفرقات بھی مٹ جاتے ہیں نہ کوئی مرد ہوتا ہے نہ عورت یہ تمام حواس تو مدھم ہوتے ہوتے آخر اس طرح بالکل مٹ جاتے ہیں جیسے محض نقوش و توہمات ہوں نہ کوئی میاں رہتا ہے نہ کوئی بیوی نہ ماں اور نہ بچے۔ یہ سب کے سب ایک ہی خدا کے جزو نظر آتے ہیں سب اس ہستی میں بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ہمیشہ پاک اور منزّہ ہے۔ ہمیشہ توانا و مضبوط ہے۔ قادرِ کُل ہے شاہدِ کائنات ہے۔ جب ہماری نظر میں صرف اسی کا وجود باقی رہ جاتا ہے تو پھر ہر قسم کا خوف مٹ جاتا ہے ہر قسم کی دہشت کالعدم ہو جاتی ہے۔ ہم تو حاضرِ کُل ہیں تو پھر کوئی نقصان ہمیں کیوں کر پہونچ سکتا ہے۔ ہر قسم کی کمزوری

مٹ جاتی ہے اور ہمارا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اپنے بھائیوں کے دلوں میں اسی معرفت کو بیدار کریں یہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہم سے الگ نہیں وہ سب اُسی ذاتِ اطہر کا جزو ہیں صرف ان کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ ہمیں ان لوگوں کو وہ راہ دکھانا ہے جس پر چل کر ہم آئے ہیں انھیں اپنی لا محدود فطرت کو بیدار کرنے میں ان کی امداد کرنا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کو میں تمام دنیا کے لیے قطعی طور پر ضروری سمجھتا ہوں یہ اصول یہ سدھانت ازلی ہیں۔ تخلیق عالم سے بھی پہلے یہ حقیقت موجود تھی اور تخریب عالم کے بعد بھی موجود رہے گی حقیقت جاودانی ہوتی ہے۔ حقیقت پر کسی خاص شخص یا قوم کا قبضہ نہیں۔ کوئی نسل کوئی فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ حقیقت کا علم بس اُسی کو ہے۔ حقیقت تمام رُوحوں کی فطری جبلّت ہے کون اسے کسی کی مخصوص ملکیت قرار دے سکتا ہے لیکن ضرورت ہے اس کو عملی شکل میں لانے کی رسم و رواج کے پردوں سے نکال کر اُسے اپنے سادہ لباس میں پیش کرنے کی (بلند ترین حقیقت ہمیشہ سادہ ہوتی ہے) تاکہ یہ سماج کی رگ رگ میں اس طرح سرایت کر جائے کہ اعلیٰ ترین دماغ کے عالموں سے لیکر سیدھے سادے عوام تک اس کو سمجھنے لگیں۔ ہر مرد و عورت یہاں تک کہ بچے بھی اس سے آگاہ ہو جائیں اور اپنی زندگی کی تشکیل اسی بنیادی حقیقت پر کریں۔ منطق کی یہ دلیلیں یہ بحثیں علم مافوق الطبیعات کے یہ پلندے کے پلندے۔ یہ تمام مذہبی رسوم و رواجات اپنے زمانے میں مفید ثابت ہوں گے۔ آج ہماری عقل اُن سے اُکتا گئی ہے۔ سادہ اور صاف حقیقت کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنانے کی ضرورت نہیں آیئے ہم پھر سادگی سے کام لیں اور ایک ایسے زرین زمانے کو جنم دیں جس میں ہر شخص کا دل تبرک سے بھر جائے ہر نظر نورِ جلوہ سے منور ہو جائے اور ہر پیشانی سجدے میں جھک جائے کسی ایسے خدا کے آگے نہیں جو ہم سے بے حد دُور عالمِ بالا میں کرسی نشین ہے جس کے احکام کا بجالانا ہم پر لازم ہے جس کے قہر سے ہم ڈرتے ہیں جس کی رحمت کے ہم ملتجی ہیں بلکہ ہماری آزاد اور بے باک پرستش اس وجودِ حقیقی کی پرستش ہو جو خود ہماری ذات میں جلوہ گر ہے ۞

کرم یوگ
کا
آدرش

ویدانت کا سب سے زیادہ عظیم الشان نظریہ یہ ہے کہ ہم مختلف رُوحانی راستوں پر چل کر ایک ہی منزلِ مقصود پر پہونچ سکتے ہیں۔ جیساکہ میں بتا چکا ہوں یہ مختلف راستے چار قسم کے ہیں یعنی کرم (کام)، بھگتی (عشق وعبادت)، نفسیات اور گیان (معرفت) کے راستے۔ لیکن یہ تقسیم کچھ ایسی نہیں کہ اُنھیں ایک دوسرے سے بالکل علیٰحدہ کرکے دکھایا جا سکے۔ ہر راستہ دوسرے سے مِلا جُلا ہوا ہے کبھی ایک عنصر غالب نظر آتا ہے تو کبھی دوسرا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ آپ کو یا تو صرف اس قسم کے آدمی ملیں گے جن میں کام کرنے کے علاوہ اور کوئی صلاحیت ہی نہ ہو یا ایسے لوگ ملیں گے جو صرف عقیدت مندی کے ساتھ عبادت گزاری ہی کر سکتے ہوں یا پھر وہ لوگ جن کو علم ومعرفت ہی سے واسطہ ہو۔ روحانی راستوں کی تقسیم تو انسان کے رجحانات کی نوعیت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ تقریباً ہر انسان میں کرم گیان ۔ نفسیات اور بھگتی کے عنصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ کسی میں ایک غالب ہوتا ہے تو کسی میں دوسرا کوئی دست وبازو کی قوت پر تکیہ کرتا ہے تو کوئی دماغی زور سے زندگی کو سمجھنا چاہتا ہے۔ کوئی مابعد الطبیعاتی طاقتوں کو حاصل کرتا ہے تو کوئی عشق ومحبت کی خود سپردگی سے خدا تک پہونچنا چاہتا ہے۔ جیسی جیسی کسی کی طبیعت کی اُفتاد ہوگی ویسا ہی روحانی راستہ وہ اختیار کرے گا۔ بالآخر یہ تمام راستے ایک ہی مقام پر جا کر مل جاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں۔ دُنیا میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں۔ کام کاج اور پُوجا پاٹھ کے یہ جتنے طریقے مستعمل ہیں سب کے سب ہمیں ایک ہی منزل پر لے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے میں نے اپنے لیکچروں میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ واحد منزلِ مقصود کیا ہے

جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ منزلِ مقصود ہے آزادی۔ ہمیں اپنے گردوپیش ہر چیز آزادی کے لئے جدّو جہد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک ادنےٰ سے ادنےٰ ذرّے سے لے کر ایک بلند مقام انسان تک۔ مادّے کے ایک بے جان اور بے حس ذرّے سے لے کر رُوئے زمین کی بلند ترین ہستی یعنی رُوحِ انسانی تک ہر چیز کا رُخ حصولِ آزادی کی طرف ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ تمام عالم کائناتِ نتیجہ ہے اس کشاکش کا جو حصولِ آزادی کے لئے ہر وقت جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مرکّب چیز کا ذرّہ ذرّہ دوسرے تمام اجزا سے دُور ہٹ کر اپنی آزاد راہ نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گویا وہ ظہورِ ترتیب کے خلاف بغاوت کرکے پریشان ہونا چاہتا ہے لیکن دوسرے ذرّے (جو بذاتِ خود آزادی کی جدّوجہد میں لگے ہیں) اُس کے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں اور سب کے سب مُرکّبات میں جکڑے رہتے ہیں۔ ایک طاقت اجزائے زندگی کو ترتیب دے کر اکٹھا کرتی ہے اور دوسری طاقت ترتیب و ترکیب کے بندھنوں سے آزادی کی تلقین کرتی ہے اور ان دونوں طاقتوں کے درمیان زبردست کشمکش جاری رہتی ہے۔ ہماری یہ زمین سورج سے دُور بھاگنا چاہتی ہے اور یہ چاند ہماری زمین سے دُور بھاگنا چاہتا ہے۔ ہر چیز میں لا محدود پھیلاؤ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس عالمِ کائنات میں ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اس کی بنیاد بس یہی آزادی کی جدوجہد ہے۔ اسی رجحانِ طبع (یعنی آزادی کی لگن) کے زیرِ اثر سنت اور مہاتما دُعائے خیر طلب کرتے ہیں اور ڈاکو اور لٹیرے لوٹ[1] مار کرتے ہیں۔ قوتِ محرّکہ دونوں صورتوں میں ایک ہے۔ ہم نے اسے مختلف نام

اس خیال کو میں نے اپریل ۱۹۵۵ میں اپنی ایک آزاد نظم کی صورت میں اس طرح باندھا تھا (ایڈیٹر)

[1] یہ خاک کے سینے میں مچلتے ہوئے بھونچال؛

روندی ہوئی مٹی سے پہاڑوں کا اُبھرنا

پانی کے بخارات میں بجلی کے یہ شعلے

برسات کے قطروں میں یہ دریاؤں کی شورش

جنگل میں گرج شیر کی ہاتھی کی یہ چنگھاڑ

پھیلانا یہ پھن سانپ کا شاہیں کی یہ پرواز

قاتل کا یہ دل چور اُچکّے کی یہ ہمّت

شاہوں کی جہانگیری کی بگڑی ہوئی صورت

ہوتا ہے جب احساسِ قفسِ رُوح جہاں کو (بقیہ حاشیہ

اظہارِ خودی کے لئے ہو جاتی ہے بیتاب اگلے صفحہ پر)

دے رکھے ہیں اگر کسی کا طریقِ عمل نا مناسب ہوتا ہے ہم اُسے بدکاری یا گناہ کہتے ہیں اور اگر اس طاقت کا اظہار مناسب اور بلند سطح پر ہوتا ہے تو ہم اُسے نیکی یا ثواب کہتے ہیں۔ سنتوں کو جب اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کے بندھنوں میں پھنسے ہوئے ہیں تو انھیں اس احساس جس سے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ وہ اس بندھن سے چھوٹنا چاہتے ہیں اِس لئے وہ ایشور کو پُوجنے لگتے ہیں۔ یعنی اس طاقت سے جو مطلقاً آزاد ہے اپنی نجات اور آزادی کی دُعا مانگتے ہیں۔ اُسے اپنی مدد کے لئے طلب کرتے ہیں اسی طرح چُور اور ڈاکو کو اپنی مجبوری کے احساس سے دُکھ ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کی مجبوریاں مطلوبہ چیزیں حاصل کر کے دُور ہو سکتی ہیں اِس لئے وہ اپنی محتاجی سے نجات حاصل کرنے کے لئے چوری کرتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ سنت اور مہاتما سچی آزادی کی راہ اختیار کرتے ہیں اور ڈاکو لٹیرے ابھی غلط را؟

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ)

کرتی ہے ستی اپنے کو شعلوں کے حوالے
آ آ کے مِٹے جاتے ہیں پروانے سرِ شمع
جانباز شہیدانِ وطن ہوتے ہیں قربان
سنیاسی کا یہ ترکِ جہاں۔ رام کا بن باس
چیتنیہ کا یہ پریم یہ میرا کی محبت
منصور کا یہ نعرہ یہ مجذوب کی مستی
گوتم کی تپسیّا یہ مسیحا کی ہلاکت

جب رُوح کو ہو جاتا ہے آزادی کا احساس
مِٹنے کو خودی آپ ہی ہو جاتی ہے مجبور

یکتائیٔ افراد ہر اک سمت ہے مشہود
معمور ہے نغمات میں دُنیا کی ہر اک شے
یہ عمقِ سمندر کا فضاؤں کی یہ وسعت
نغمے یہ پرندوں کے یہ پھولوں کا تبسّم
یہ نقش مصوّر کے یہ شاعر کا تخیّل
صُوفی کا تصوّف یہ مُغنّی کا ترنم

جلوے یہ ترے شوقِ نظر کے لئے بیتاب
نغمے یہ سماعت کے لئے یتری ہیں لرزاں ؛
"دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز"

پر ہیں۔ لیکن دونوں کی جدّوجہد کا محرّک جو احساس ہے اس کی نوعیت ایک ہی ہے حق تو یہ ہے کہ عالمِ کائنات میں تمام چیزوں کا مقصد ہے آزادی حاصل کرنا خواہ وہ چیزیں جاندار ہوں خواہ بے جان۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر ہر چیز حصول آزادی کے لئے جدّوجہد میں مصروف ہے سینت مہاتما دانستہ طور پر آزادی کی تلاش کرتے ہیں چور اور ڈاکو نادانستہ طور پر اس آزادی کے لئے ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن دونوں کے لئے آزادی کا مطلب مختلف ہے۔ سنتوں اور مہاتماؤں کو وہ آزادی (نجات) مطلوب ہوتی ہے جس میں اُن کو لاابتدا اور لاانتہا آنند یا سرور ملتا ہے جس کا اظہار زبان سے ممکن نہیں۔ بخلاف اس کے چوروں اور ڈاکوؤں کو جس آزادی کی تلاش ہوتی ہے وہ ان کی چند جسمانی ضرورتوں کو تو پورا کر سکتی ہے۔ لیکن اس سے ان کی رُوح کی بندشیں اور بھی کڑی ہو جاتی ہیں۔

حصُولِ آزادی (نجات) کی اِس جدّوجہد کے آثار ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں تمام اخلاقیات کا بنیادی عمل یہی جدّوجہد ہے آخر اخلاقیات خودغرضی کو مٹانے کی کوششوں کا ہی تو دوسرا نام ہے ہر خودغرض آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اس کی ہستی کی غائت اُس کے جسم پر مشتمل ہے۔ اس کے تصوّر سے گلوخلاصی کی کوشش سے اخلاقیات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس جھوٹی خودی کو مٹانے کی کشمکش اور جدوجہد میں مذہب کا قدم سب سے پہلے اُٹھتا ہے۔ جب کوئی شخص نیک کام اور دوسروں کی مدد کرتا ہوا نظر آتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اسے وسعت قلب ونظر کی تلاش ہے وہ "میں اور میرے" کے محدود دائرے میں مُقیّد نہیں رہنا چاہتا۔ وہ آزادی کی کھُلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔ خودغرضی انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے جس طرح ایک نقطہ بے شمار ہم مرکز دائروں میں گھرا ہو لیکن جب یہ نقطہ حرکت میں آتا ہے تو یکے بعد دیگرے روزافزوں رفتار کے ساتھ ان سب دائروں (اپنی ذات۔ خاندان۔ قوم۔ ملک وغیرہ) سے گزرتا چلا جاتا ہے اور حقیقت کی لاانتہا وسعتوں کو پاتا جاتا ہے۔ اخلاقیات کے جس قدر بڑے بڑے دستور رائج ہیں وہ سب کے سب خودغرضی ہی کے چکّروں سے نکل کر لامحدودیت کی منزل کا راستہ دکھاتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ جب کسی شخص کو خودغرضی سے مکمل بیگانگی کا یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی کیا صورت ہوتی ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مسٹر فلاں نہیں رہتا۔ یعنی وہ نام اور روپ کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کو تو لاانتہا وسعت حاصل ہو جاتی ہے۔ اُس کی چھوٹی سی انفرادی شخصیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو جاتی ہے۔ اس لامحدود وسعت کا حاصل کرنا ہی تمام مذاہب کا۔ تمام اخلاقیات کا۔ اور تمام فلسفیانہ تعلیمات

کا واحد منتہا و مقصد ہے اگر کسی شخصیت[لہ] پرست کے سامنے اس فلسفیانہ تصوّر کا ذکر کیا جائے تو اس پر دہشت سی طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے شخصیت پرست بھی خود غرضی کی تعلیم نہیں دیتے دوسروں کی حق تلفی نہیں سکھاتے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا سبق نہیں دیتے وہ بھی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں یعنی خود غرضی کو مٹانے اور اپنی محدود شخصیت کو وسعت دے کر اس میں دوسروں کو شامل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ عملی طور پر یہ لوگ بھی وسعتِ خودی کے قائل ہیں۔ عملاً اُن کی رسائی بھی اس تصوّر تک ہو جاتی ہے۔ آخر اُن کی اخلاقیات میں خود غرضی سے بیگانگی کی کوئی حد تو مقرّر نہیں۔ اب اگر کوئی شخصیت پرست اس نظامِ فکر کے تحت خود غرضی سے قطعاً بیگانہ ہو جاتا ہے تو بتایئے کہ ہم اس شخص کے اور ایک دوسرے شخص کے درمیان جس کو دوسرے نظامِ فکر کے تحت خود غرضی سے مکمل بیگانگی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیا حدِّ فاصل مقرر کر سکتے ہیں۔ اس کی ہستی تو تمام عالم کائنات میں مدغم ہو گئی ہے اور اسی ایک معراج کا حاصل کرنا تمام مذاہب اور اخلاقیات کی انتہائی غائت ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ شخصیت پرستوں میں خود اپنی دلیل کو صحیح نتیجے پر پہونچا دینے کی جرأت نہیں۔ بہر حال نظریے کچھ بھی ہوں بے غرضانہ عمل کے ذریعہ اس مکمل آزادی (نجات) کا حاصل کرنا ہی کرم یوگ کہلاتا ہے جو تمام انسانی فطرت کا مُنتہا و مقصد ہے یا یوں کہیے کہ ہمارا ایسا ہر عمل جو خود غرضی کے تحت ظہور میں آتا ہے حصولِ نجات میں سدِّ راہ ہوتا ہے اور ہمارا ہر بے غرضانہ فعل ہم کو اس مقصد تک پہونچانے میں دلیل راہ بن جاتا ہے۔ یا اخلاقیات کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ جس بات میں خود غرضی شامل ہوتی ہے وہ غیر اخلاقی ہوتی ہے اور جس کا دار و مدار بے غرضی پر ہوتا ہے وہ اخلاقی قرار دی جاتی ہے۔ لیکن تفصیلی جائزہ لینے پر بہر صورتِ حالات اتنی سادہ اور صاف نہیں نظر آتی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کسی کام کی اخلاقی نوعیت اس کے ماحول سے رنگ پکڑتی ہے۔ ایک ہی کام کچھ مخصوص حالات میں خود غرضانہ ہو سکتا ہے اور دوسرے مخصوص حالات میں وہی کام بے غرضانہ ہو سکتا ہے اِس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کس قسم کے کام اخلاقی معیار پر پورے اُترتے ہیں ہاں جو توضیح میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے (یعنی غیر اخلاقی کام وہ ہے جس میں خود غرضی شامل ہوتی ہے) اس کے پیشِ نظر تفصیلات پر۔ مختلف اوقات۔ مقامات اور حالات کے لحاظ سے غور کیا جاسکتا ہے۔ کئی بار

لہ Personalist.

دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک مُلک میں ایک قسم کا طرزِ عمل اخلاقی سمجھا جاتا ہے اور دوسرے ملک میں اسی طرزِ عمل کو غیر اخلاقی قرار دیا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ دونوں مُلکوں کے حالات کا فرق ہوتا ہے فطرت کا مقصد تو ہر حالت میں حصُولِ نجات یعنی آزادی ہے اور نجات حاصل کی جا سکتی ہے صرف خود غرضی سے مکمل طور پر دُور رہ کر۔ ہمارا ہر خیال ہر لفظ اور ہر عمل جو بے غرضانہ ہوتا ہے ہمیں اس منزلِ مقصود کی طرف لے جاتا ہے اور اسی لئے اس کو اخلاقی قرار دیا جاتا ہے۔ اخلاقیات کی یہ ہمہ گیر توضیح ہر مذہب اور ہر نظامِ اخلاق پر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ کوئی مذہب یا نظامِ اخلاق اخلاقیات کو کسی اعلےٰ ہستی یعنی خدا کی ذات سے وابستہ کرتا ہے یا نہیں۔ اخلاقیات کو خدا کے احکام کی صورت دینے سے اس کی نوعیت کچھ بدل نہیں جاتی۔ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ انسان کو فلاں کام کیوں کرنا چاہیئے اور فلاں کام کیوں نہیں کرنا چاہیئے۔ اب اگر اس کا یہ جواب ملے کہ "یہ خدا کا حکم ہے" تو ہمیں اس حکم کی نوعیت کو دیکھنا پڑے گا۔ سوچا جائے تو اخلاقیات کا سرچشمہ خواہ کچھ بھی ہو ہر ضابطۂ اخلاق کا یہی ایک مرکزی تصور ہے۔ یعنی اپنی پروا نہ کرنا۔ خودی کو ترک کر دینا اور حال یہ ہے کہ اس بلند اخلاقی تصور کو سب مانتے ہیں۔ ایسا کون ہے جو خود غرضی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کئی لوگوں کو اپنی شخصیت کو ترک کر دینے کے خیال ہی سے دہشت ہوتی ہے مجھے ان لوگوں سے جو اپنی ان چھوٹی چھوٹی شخصیتوں کے تصوّر سے چپٹے ہوئے ہیں۔ یہ پُوچھنا ہے کہ جب آپ خود بے غرضی کی تعلیم دیتے ہیں تو آپ کے دماغ میں ضرور کسی ایسے شخص کا تصور ہو گا جو خود غرضی سے مکمل طور پر بیگانہ ہو چکا ہو۔ جس کو اپنے متعلق کوئی فکر ہی نہ ہو جو خود اپنے لئے کچھ کرتا دھرتا نہ ہو۔ جو خود اپنے مفاد کے لئے ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاتا جسے اپنے مفاد کا احساس تک نہیں رہتا۔ اگر کسی ایسے شخص کا تصور کیا جا سکتا ہے تو آپ خود ہی بتایئے کہ اس کی انانیت کا وجود ہے ہی کیا؟ اِنسان کو اس اپنے پن کا۔ اپنی خودی کا شعور اور احساس تو بس اسی وقت تک ہوتا ہے جب تک وہ اپنی غرض کے لئے سوچتا ہے عمل کرتا ہے یا کچھ کہتا سُنتا ہے اگر اس کو اپنے پن کا احساس ہی نہ رہے اگر اس کی زندگی دوسروں کے لئے وقف ہو جائے اگر اس کی خودی پھیل کر سب کو اپنے میں سمولے۔ اگر تمام عالمِ کائنات اس کی اپنی ہستی میں مدغم ہو جائے تو پھر اس کی انفرادی شخصیت کا وجود ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ اگر اسکو ہر لحظہ کُل کا شعور اور احساس ہو تو جزو کا احساس اور شعور ہو ہی کیسے سکتا ہے اس کا اپنا پَن تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] آشنایاں نہ غریب است کہ دل سوزِ من اند ٭ چوں من از خویش برفتم ۔ دل بیگانہ بسوخت

کرم یوگ اخلاقیات اور مذہب کے اس طریقۂ کار کو کہتے ہیں جس کے تحت بے غرض اور نیک اعمالی کے ذریعہ انسان نجات یعنی مکمل آزادی حاصل کرسکتا ہے۔ کرم یوگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص سدّھانت یا مُسلّمہ اصول پر ایمان لائے اس کو اختیار ہے کہ خدا کی ہستی میں بھی یقین کرے یا نہ کرے اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنی مَاہیت دریافت کرے یا کسی قسم کی مابعدالطبیعاتی خیال آرائی سے کام لے۔ اس کا تو بس ایک خاص مقصد ہے۔ اور وہ مقصد ہے خودی یعنی خودغرضی سے بیگانہ ہو جانا۔ اپنے آپ کو مٹا دینا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کو خود ہی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اس کے لئے عرفان کی ایک منزل ہوتا ہے کیونکہ اسے تو کسی سدّھانت یا مُسلّمہ اصول یا نظریئے سے مدد لئے بغیر اس مسئلے کا حل کرم یا عمل کے ذریعہ دریافت کرتا ہے جس کی عقدہ کشائی کے لئے ایک گیانی یا عارف عقل والقار کے ذریعہ اور ایک بھگت محبت یا پریم سے کام لیتا ہے۔

یہاں سوال یہ اُٹھتا ہے کہ آخر یہ عمل یا کام ہے کیا چیز۔ دُنیا کی بھلائی کے کیا معنیٰ ہیں۔ کیا ہم واقعی دُنیا کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ قطعی نقطۂ خیال سے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ لیکن نسبتی طور پر اس کا جواب اثبات میں بھی ہو سکتا ہے دُنیا کی کوئی بھلائی مستقل طور پر نہیں کی جاسکتی اُسے ایسا کوئی فائدہ نہیں پہونچایا جا سکتا جو پائیدار ہو جو اُسے ہمیشہ کے لئے بہتر بنا کر رکھ دے، اور اگر ایسا ہو سکتا تو پھر اب تک یہ دُنیا دُنیا ہی نہ رہی ہوتی۔ ہم کسی شخص کی بھوک پانچ منٹ کے لئے دُور کر سکتے ہیں لیکن بھوک تھوڑی دیر بعد اس کو پھر لگے گی۔ انسان کو جو بھی مسرت اور راحت حاصل ہوتی ہے اس کی عمر چند لمحوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ راحت و رنج کے اس بار بار چڑھ آنے والے بخار کا مستقل علاج کوئی نہیں کرسکتا۔ دُنیا کو دَوامی مسرّت بہم پہونچانا ناممکن ہے۔ سمندر میں ایک طرف لہر اُٹھتی ہے تو دوسری طرف خول پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مدّوجزر ایک ہی کرشمے کے دو رُخ ہیں۔ دُنیا کی اچھی چیزوں کی مجموعی مقدار اور انسان کی ضرورتوں اور خواہشوں میں ایک سی نسبت قائم رہی ہے۔ اس میں نہ اضافہ ہو سکتا ہے نہ تخفیف۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں نسل انسانی کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دُنیا میں ہمیشہ اور ہر زمانے میں مصیبتیں۔ راحتیں۔ مسرّتیں اور اذیتیں برابر موجود رہی ہیں اور رہتی ہیں اور انسانوں کے مرتبے میں برابر فرق رہتا آیا ہے۔ کچھ لوگ امیر ہیں تو کچھ غریب ہیں کسی کا مرتبہ بلند ہے تو کسی کا پست۔ کوئی تندرستی کی نعمت سے مالا مال ہے تو کوئی خرابیٔ صحت سے نالاں۔ قدیم زمانے میں مصر یونان اور روم والوں کو انھیں حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ جو آج امریکہ میں درپیش ہیں۔

وقت کے لحاظ سے تفصیلات میں ضرور فرق ہے۔ لیکن اُن کی بنیادی نوعیت وہی ہے جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اِنسان کی یہ حالت ہمیشہ اسی طرح رہی ہے۔ جہاں ایک طرف راحتوں اور اذیتوں کا یہ لاعلاج سِلسلہ چل رہا ہے وہاں دوسری طرف آدمی آدمی کے فرق اور امتیاز کو کم کرنے کی بھی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ کیونکہ یہی فرق ہماری تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔ تاریخ کے ہر دَور نے ایسے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے عمر بھر زندگی کے راستے کو دوسروں کے لئے ہموار بنانے کی کوشِش کی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کو اپنی اِس کوشِش میں کامیابی کہاں تک حاصل ہوئی یہ جدّ و جہد تو ایک گیند کے کھیل کی مانند ہے ہم اس گیند کو کبھی ادھر اور کبھی اُدھر پھینک سکتے ہیں۔ کھیل تو جاری ہی رہتا ہے۔ ہم دُکھ کو جسمانی طبقے سے ہٹا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ دماغی طبقے میں پہونچ جاتا ہے۔ مٹ نہیں جاتا۔ دُنیا کے دُکھ سُکھ کی یہ حالت دوزخ کی اس تصویر کے مانند ہے جو ڈانٹے نے اپنی کتاب ڈوائن کمیڈی (Dante's Divine Comedy) (طربیہ ربّانی) میں کھینچی ہے۔ یہاں کنجوسوں کے ایک گروہ کو سونے کا ایک بڑا بھاری ڈلا دے کر حکم دیا گیا ہے کہ ان کو دھکیل کر پہاڑ کی چوٹی پر لے جائیں۔ جتنی مرتبہ وہ بے چارے اس ڈلے کو دھکیل کر اوپر لے جاتے ہیں۔ وہ نیچے کی طرف لڑھک آتا ہے۔ اس دُنیا میں رہ کر مصیبتوں اور اذیتوں سے کلیتاً چھٹکارا پانا اور کامل نشاط و مسرت کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ عہدِ سعادت کی باتیں بچوں کی کہانیاں ہیں۔ اور پھر جو قومیں عہدِ سعادت کے خوش کُن خواب دیکھا کرتی ہیں ان کا بھی تو یہی اعتقاد ہے کہ اِس عہد کی برکتوں میں خود اُن کا خاص حصّہ ہوگا۔ گویا عہدِ سعادت میں بھی آدمی آدمی میں اور مختلف قوموں کا فرق و امتیاز باقی رہے گا اگر یہی معیار ہے بے غرضی کے بلند ترین آدرش کا تو پھر ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم اس دُنیا میں نہ مسرت کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی اذیت کو بڑھا سکتے ہیں۔ رُوئے زمین پر رنج اور راحت کی قوتیں مجموعی مقداروں میں ہمیشہ یکساں رہیں گی یہ اور بات ہے کہ زندگی کی ریل پیل میں ہم اُنھیں ایک طرف سے دھکا دے کر دوسری جانب پہونچا دیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ مجموعی مقدار یکساں ہی رہتی ہے۔ کیونکہ اس طرح یکساں رہنا ہی اس کی فطرت ہے، یہ تمام مدّ و جزر۔ یہ عروج و زوال دُنیا کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جسمانی اور مادّی زندگی کے امر یعنی لافانی ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اگر نشاط و غم کو۔ عروج و زوال کو اور مدّ و جزر کو کسی صورت سے علیحدہ علیحدہ کیا جا سکتا تو ہم منطق کی رو سے یہ بھی کہہ سکتے کہ زندگی اور موت کو جدا

کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بات قطعی طور پر بے معنی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جہاں زندگی کا تصوّر ہوگا وہاں موت کا تصوّر بھی لازمی طور پر ہوگا۔ اور اسی طرح راحت کے تصور کے ساتھ رنج کا تصوّر بھی شریک ہوتا ہے۔ شمع جس طرح جل جل کر برابر گھُلتی رہتی ہے۔ جسمانی زندگی آہستہ آہستہ موت کے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اگر آپ کو یہی زندگی مطلوب ہے تو آپ کو ہر لمحہ موت کی تیاّری بھی کرنا ہوگی زندگی کا ہر قدم موت کی راہ پر پڑتا ہے۔ زندگی اور موت دراصل ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ فرق دیکھنے کا ہے وہی ایک چیز ایک زاویۂ نظر سے "زندگی" دکھائی دیتی ہے اور دوسرے نقطۂ نظر سے "موت" کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ زندگی اور موت درحقیقت ایک ہی لہر کا اُتار چڑھاؤ ہیں۔ پانی کے مدّوجزر کا نام ہی لہر ہے۔ اسی طرح زندگی اور موت کی ہمسائیگی اور ہمدمی ایک بنیادی حقیقت ہے، ان کی اپنی کوئی انفرادی ہستی نہیں ہوتی۔ سوال تو نقطۂ نظر کا ہے۔ اگر کسی آدمی کی نظر "زوال" پر ہوتی ہے تو اُسے ہر طرف دل شکستگی اور مایوسی دکھائی دیتی ہے اور ہم اسے یاس پرستا[1] کہتے ہیں۔ اور اگر کوئی دوسرا شخص عروج کی طرف دیکھتا ہے تو اُسے اُمید اور کامرانی ہی جلوہ گر نظر آتی ہے اور ہم اُسے اُمید پرست[2] کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مثلاً عہد طفلی میں یعنی جب بچہ اسکول میں تعلیم حاصل کرتا ہوتا ہے تو ماں باپ ہر وقت اس کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اُسے کسی قسم کی بھی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ہر چیز مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ اُس کی ضروریات بہت سادہ اور معمولی ہوتی ہیں۔ اُس کی زندگی اُمیدوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ لیکن آدمی بڑا ہو کر نسبتاً زیادہ شانت ہو جاتا ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات اُس کے جوش کو بہت حد تک ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم قومیں جن کی نظر سے زوال کے آثار پوشیدہ نہیں ہوتے۔ جدید قوموں کے بمقابلہ قدرتاً کم جوشیلی ہوتی ہیں۔ اُنھیں زندگی کے سنہری رُخ کا اتنا یقین نہیں ہوتا۔ جتنا نئی قوموں کو۔ ہندوستان میں ایک کہاوت مشہور ہے۔

"ہزار سال شہر ہزار سال جنگل"

مطلب یہ ہے کہ زمانے کے انقلاب سے اس دُنیا میں بارونق شہر جنگلوں میں اور جنگل شہروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور تبدیلی ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتی رہتی ہے۔ اگر آپ اس عہد میں ہوں جب جنگل میں منگل ہو رہا ہو۔ ویرانوں کی جگہ بستیاں لے رہی ہوں تو یقیناً آپ کا نقطۂ نظر پُر اُمید ہوگا۔ برعکس اس کے اگر آپ کسی تخریب و تباہی کے دَور سے گزر رہے ہیں۔ تو لازمی طور پر آپ کے فلسفۂ حیات پر قنوطیت

---

[1] Pessimist.

[2] Optimist.

کا رنگ چڑھ جائے گا۔

اب مساوات کے نظریئے کو لے لیجئے اکثر مذاہب کی تعلیم کا ایک اہم عنصر عہد سعادت کا تصور ہے جس میں خدا خود اِس عالم کائنات میں آشکار ہو کر حکومت کرے گا اور یہاں کے سب تفرقات مٹ جائیں گے۔ آدمی آدمی میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ اور سب کو برابر کا درجہ ملے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس تصور میں زبردست قوت محرکہ کام کر رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تعلیم دینے والے لوگ اکثر مذہبی دیوانے[1] ہوتے ہیں جن کے ضرب المثال خلوص اور ایمان سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جن کی دیوانگی سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اِس مذہبی دیوانگی کی کشش کو بنیاد کار بنا کر عیسائیت کی اشاعت کی گئی اور اِسی وجہ روم اور یونان کے غلاموں کے لئے اس میں بڑی جاذبیت پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ اس عہدِ سعادت میں جس کا وعدہ عیسائیت کر رہی تھی۔ غلامی کا کہیں نام بھی باقی نہیں رہے گا نیز یہ کہ اُنھیں کھانے پینے کا سامان افراط سے میسر آئے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عیسائیت کے زیرِ علم مجتمع ہونے لگے جن لوگوں نے اس تصوّر کی پہلے پہلے تبلیغ کی وہ دراصل حقیقت سے ناواقف تھے۔ ان میں بلا کا خلوص تھا جس کی وجہ سے عوام اُن پر یقین لے آئے۔ عہدِ حاضر میں عہدِ سعادت کی تمنا نے مساوات کا یعنی آزادی۔ برابری اور اخوت[2] کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی دیوانگی ہے۔ صحیح معنوں میں مساوات روئے زمین پر نہ کبھی آج تک ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی ہم سب برابر ہو ہی کیسے سکتے ہیں جس ناممکن قسم کی مساوات کا آج کل ذکر ہوتا ہے وہ تو موت کے مترادف ہے! آخر سوچا جائے کہ یہ دنیا اپنی موجودہ حالت پر کیونکر قائم ہے؟ دراصل کائناتی توازن کے بگڑنے سے ہی دنیا ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شہود سے پہلے جو حالت تھی اُس میں مکمل انتشار[3] تھا۔ ہستی عالم کے تمام اجزا میں پورا توازن تھا اور اس توازن ہی کی بدولت اِن اجزائے ہستی میں کشمکش اور تقابل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر جزو اپنی حالت پر قائم تھا۔ اس عالمِ کائنات کی ترکیبی صلاحیت رکھنے والی قوتیں پیدا ہی کشمکش تقابل اور تصادم سے ہوئیں۔ فرض کیجئے کہ مادّے کے تمام اجزار حالتِ انتشار میں اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اور ان میں مکمل توازن ہے۔ کیا ایسی حالت میں تشکیل کا عمل (جسے عام اصطلاح میں تخلیق کہتے ہیں) ظہور میں آسکتا ہے۔ سائنس کی بدولت ہمیں معلوم ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی

---

[1] Fanatics.
[2] Liberty, Equality, Fraternity.
[3] Chaos.

کی سطح کو ذرا ہلا دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ پانی کا ہر قطرہ دوبارہ سکون کی حالت میں واپس آنے کی کوشش کرنے لگتا ہے ایک لہر دوسری لہر سے ٹکرانے لگتی ہے یہی حالت عالم کائنات کے تمام مظاہر کی ہے یہاں کی ہر شئے مکمّل توازن کی حالت میں دوبارہ واپس جانے کے لئے جدوجہد کرتی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتشار اور اجتماع کا یہ سلسلہ لا انتہائی ہے۔ مکمّل سکون و توازن کے بعد اختلال پیدا ہوتا ہے اور اجزائے ہستی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے ہیں اس تصادم و اجتماع سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے عدم مساوات ہی تو تخلیق عالم کی بنیاد ہے لیکن یاد رہے کہ یہ عدم توازن یہ سکون حاصل کرنے کی کوشش ایک عارضی صورت ہے۔ مکمّل توازن اور مساوات پیدا کرنے کی قوت متواتر کام کر رہی ہے! ور تخلیقِ عالم میں اُس کا اتنا ہی حصّہ ہے جتنا اس طاقت کا جو ازلی سکون میں اختلال پیدا[1] کرتی ہے۔

مکمّل مساوات کیا ہے؟ تمام طبقات میں کام کرنے والی قوتوں کے درمیان مکمّل توازن کا ہونا اس معنیٰ میں تو مکمّل مساوات اس دُنیا میں کبھی قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسی حالت تک پہونچنے کے قبل ہی دُنیا کسی قسم کی زندگی کے قابل نہیں رہے گی۔ یہاں کسی چیز کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ ظاہر ہے کہ دَورِ سعادت اور مکمّل مساوات کے تصورات عملی طور پر ممکن ہی نہیں بلکہ اگر ہم ان کو عملی صورت دینے کی کوشش کریں گے تو یقیناً اپنی زندگی سے اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ کائنات عدم توازن ہی سے پیدا ہے توازن پیدا ہوتے ہی اس کا وجود عنقا ہو جائے گا۔ اسکے علاوہ ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی مساوات کا قائم ہونا ناممکن ہے آخر یہ جو آدمی آدمی میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس کی نوعیّت کیا ہے؟ یہ فرق تو بیشتر دماغی طاقت کا ہوتا ہے یہ کہنا کہ ہم سب یکساں دماغ لے کر پیدا ہوتے ہیں محض پاگل پَن ہے۔ ہم دُنیا میں کم و بیش دماغی اور جسمانی قوتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم جنم ہی سے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ہم اپنی عظمت اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اِس حقیقت سے پہلو تہی کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً آپ ہی کے اس مُلک میں آپ سے پہلے صرف امریکن انڈین قوم ہزاروں سال سے رہتی چلی آتی ہے پھر آپ کے بزرگ تھوڑی تعداد میں یہاں آئے اور ان کے سبب سے ملک کی صورت ہی بدل گئی۔ اگر سب لوگ ہر لحاظ سے برابر ہیں تو ہزاروں سال تک کیوں یہاں کے اصل باشندوں یعنی انڈینوں نے ترقی نہیں کی۔ بڑے بڑے شہر نہیں بنوائے حقیقت یہ ہے کہ آپ کے آبا و اجداد اپنے ساتھ ایک خاص

---

[1] پُرش اور شکتی۔ برہم اور دیوی۔ وشنو اور لکشمی۔ شنکر۔ اور پاروتی شاید انھیں دو طاقتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دراصل یہ دونوں قوتیں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ (ایڈیٹر)

دماغی قوت لے کر آئے تھے وہ ایک ممتاز قومی کردار کے مالک تھے۔ جسے ان کے اپنے مخصوص ماحول اور اُن کی گزشتہ تاریخ نے تشکیل کیا تھا اُن کی اِس دماغی طاقت نے اپنے اظہار کی صورتیں پیدا کیں۔ ان کے کردار نے اپنے جوہروں کے انکشاف کے لئے عمل کی نئی نئی شاہراہیں نکالیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ کا ملک رشکِ دو جہاں بنا ہوا ہے دراصل کسی قِسم کے فرق کا نہ ہونا موت کے مترادف ہے جب تک یہ دُنیا رہے گی یہ اختلافات اور یہ تفرقات ضرور موجود رہیں گے۔ مکمل مساوات کا عہدِ سعادت تو اس وقت آئے گا جب اس تمام سِلسلۂ شہود کا ایک چکّر ختم ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں عہدِ سعادت کا تصور اور اس عالم کائنات کا جلوہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ دونوں کا بیک وقت موجود ہونا ممکنات سے بعید ہے۔ تخریبِ عالم سے قبل مساوات کا ظہور پذیر ہونا قطعی طور پر ناممکن ہے پھر بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ عملی طور پر عہدِ سعادت کا تصور انسانی ارتقا اور ترقی کے لئے ایک بڑی زبردست قوتِ محرکہ ثابت ہوا ہے، جس طرح عالمِ کائنات کے ظہور کے لئے عدم مساوات یعنی عدم توازن کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح اس عالمِ شہود کے پس پشت۔ مساوات اور توازن یعنی وحدتِ ہستی کی تلاش بھی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے! اگر عالمِ شہود کی وسعتوں کو محدود کرنے اور فطرت کی ہمہ گیر غلامی سے آزاد ہو کر اپنے مرکز کی طرف واپس جانے کی تمنا یعنی وصلِ الہٰی کی خواہش انسان کے دل میں نہ ہوتی اگر اس نجات یا آزادی کے لئے متواتر جدّ و جہد نہ ہوئی ہوتی تو یہ سلسلۂ تخلیق شروع ہی نہ ہوتا۔ دائرۂ حیات کی وسعتوں میں پرواز کرنے کی خواہش اور اپنے مرکز کی طرف واپس جانے کی آرزو سے مل کر ہی یہ زندگی قائم ہے۔ ان دونوں طاقتوں کے درمیان جو فرق ہے اسی کے مطابق اِنسانی محرکات کی نوعیّت قرار پاتی ہے۔ جب تک دُنیا قائم ہے ان دونوں قسم کے محرکات کا عمل جاری رہے گا ایک قسم کے مُحرکات کا رُجحان قید و بند (یعنی دُنیاداری) کی جانب ہو گا۔ دوسری قِسم کے محرّکات کا رُخ نجات اور رستگاری یعنی حصولِ خودی کی طرف ہو گا۔ دُنیا کا کاروبار اسی پر مشتمل ہے۔ یہ دُنیا ایک پیچ در پیچ مشین ہے جو بلا کی سُرعت سے گھوم رہی ہے۔ اس کی میکانکی ساخت اور وضع کچھ ایسی خطرناک ہے کہ اگر کہیں اس میں ذرا بھی ہاتھ لگ جائے تو ہم اس میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ ہمارا کوئی پتہ ٹھکانا ہی نہیں رہتا۔ ہم بس اسی مشین کا جزو ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہم سب کا خیال ہے کہ جب ہم اپنے کسی فرض سے سُبکدوش ہو جاتے ہیں تو ہم کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ابھی ہم ایک فرض بھی پوری طرح انجام نہیں دے پاتے کہ کوئی دوسرا فرض ہمارے سامنے تکمیل کے لئے آجاتا ہے اور اسی طرح ہم دنیا کی اس زبردست اور پیچیدہ مشینری میں گھسٹتے چلے جاتے ہیں۔ اس چکّر سے نکلنے کے بس دو ہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اس مشینری سے کسی قسم کا تعلق ہی نہ رکھا

جائے اور تمام خواہشات سے دستکش ہو جایا جائے مگر ترک اور کنارہ کشی اِن دونوں باتوں کا ذکر زبان سے کرنا تو آسان ہے لیکن ان کو عمل میں لانا قریب قریب ناممکن ہے میرے خیال میں کروڑوں آدمیوں میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جس میں سچے معنوں میں ترک کی پوری اہلیت اور طاقت ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم دُنیا کے کاروبار میں تو ضرور لگے رہیں۔ لیکن کام کرنے کا وہ راز دریافت کرلیں جس سے کام بھی ہوتا رہے اور ہمیں کام کا غلام بھی نہ رہنا پڑے۔ یہ طریقہ ہے کرم یوگ کا۔ کرم یوگ کا مسلک ہمیں بتاتا ہے کہ دُنیا کی اِس مشینری کے چکروں میں داخل ہو کر بھی انسان کچھ اس طرح چل سکتا ہے کہ خود اس مشینری کی طاقت سے کام لیتے ہوئے باہر نکلنے کی بھی صورت نکل سکتی ہے اس مشین کے ان چکروں سے نجات حاصل کرنے کا راز خود مشین ہی میں مضمر ہے۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ راز کیا ہے؟ کرم یعنی کام اُس حرکت کا نام ہے جس سے اس تمام عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ کرم ہی پر تمام دنیا کی اساس رکھی ہوئی ہے۔ فطرت کرم ہی کے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ابدی ہے۔ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ اس نکتے کو بخوبی سمجھتے ہیں کیونکہ اُنکو یقین ہے کہ خُدا کی ہستی مکمل ہے۔ خُدا کے کام کبھی ادھورے نہیں ہوتے۔ انھیں ہر شے میں کمال کا پہلو نظر آتا ہے وہ جانتے ہیں کہ خدا کوئی ایسی نااہل ہستی نہیں ہے جس کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ انھیں معلوم ہے کہ ہر چیز میں اس کی تکمیل کا پہلو پوشیدہ ہے۔ حالانکہ اس عالم کائنات کا سلسلہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا لیکن اسی سلسلے میں "ہماری نجات" "ہماری آزادی" بھی مضمر ہے اور اس آزادی کا حاصل کرنا ہی ہمارا مقصد ہے۔ ہماری انتہائی منزل خود غرضی سے بیگانہ ہو جانا ہے۔ اور کرم یوگ وہ فلسفۂ حیات ہے جس کے مطابق خود کرم ہی کو ذریعۂ نجات بنایا جا سکتا ہے یہ وہ طریقۂ کار ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم دنیا کے کاروبار کو سرانجام دیتے ہوئے بھی آزادی کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔ نجات ہماری ارتقار کا نام ہے۔ دُنیا کا سلسلہ تو یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ یہ عہدِ سعادت کی باتیں یہ دُنیا ہی میں مکمل سرور وشادمانی کے خواب کچھ مذہبی دیوانوں کے لئے محرک تو ضرور ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ہم کو اس قسم کے خارجی محرکات کی چنداں ضرورت نہیں اس کے لئے تو آزادی کا وہ فطری شوق جو انسان کے دل میں موجود ہے۔ سب سے بڑا محرک ہے۔ عام دُنیوی محرکاتِ عمل سے بلند و بالا ہو جایئے۔ آپ کو کام کرنے کا تو اختیار حاصل ہے۔ کام کے پھل آپ کا کوئی حق نہیں[لہ]۔ کرم یوگی کہتا ہے کہ ہر آدمی اس اصول پر عمل کرنے

لہ To work, you have the right but not to the fruit thereof.

کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہے۔ جب دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنے کا خیال کسی کرم یوگی کی زندگی کا جزو بن جاتا ہے تو پھر اس کو بیرونی محرّکاتِ عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ نیکی کیجیے، کیونکہ نیکی کرنا بجائے خود اچھا ہے۔ نیکی اپنا انعام آپ ہے۔ کرم یوگی کے نقطۂ خیال سے جو شخص بیکنٹھ یا جنت میں مقام حاصل کرنے کے خیال سے نیکی کرتا ہے۔ وہ بھی اسیری یا بندھن کے عذاب میں مبتلا ہے جو کام ذرا سی بھی خود غرضی کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس سے نجات دلانے کے بجائے ہمارے پاؤں کی بیڑیوں میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اسی لئے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے ہر کام کے نتیجے یا پھل کی خواہش کا ترک کر دینا۔ صرف کام کرنا۔ اس کے نتیجے پر نظر نہ رکھنا قطعاً بے لوث رہنا۔ یاد رکھیے کہ ہماری ہستی کا دارومدار اس دنیا پر نہیں ہے۔ اس دنیا کا وجود ہمارا وجود نہیں ہے اور نہ ہمارا وجود اس دُنیا کا وجود ہے۔ درحقیقت ہم یہ جسم نہیں ہیں۔ ہم سرے سے عامل ہی نہیں ہم کچھ کرتے دھرتے نہیں۔ ہم تو آتما ہیں ہم کو دوامی راحت اور سکون حاصل ہے ہم آزاد مطلق ہیں۔ کسی چیز سے مقید و محبوس نہیں ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تعلق کا راستہ اختیار کریں۔ آپ شاید کہیں گے کہ یہ تو سب بجا ہے کہ ہم کو مکمل طور پر بے لوث اور بے غرض ہونا چاہیے لیکن اس کا عملی طریقہ کیا ہے۔ مجھ سے بہت لوگ کہتے ہیں کہ مانا کہ ہر اس نیک کام سے جو ہم کسی درپردہ غرض کے بغیر انجام دیتے ہیں ہمارے تعلقات کی اس زنجیر کی کڑیوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا جو ہمارے پیروں میں پڑی ہوئی ہے بلکہ اس طرح اس کی ایک کڑی ٹوٹ جاتی ہے مانا کہ ہر وہ نیک خیال جو ہم کسی قسم کے معاوضے کے تصور سے دور رہ کر دُنیا میں نشر کرتے ہیں۔ دوسرے خیالوں سے مل کر ہماری زنجیر کی ایک اور کڑی کو توڑ سکتا ہے مانا کہ ہم اس طرح روز بروز زیادہ سے زیادہ پاک و صاف ہوتے جائیں گے۔ حتےٰ کہ ایک دن ہم دنیا کی سب سے زیادہ پاک و صاف ہستی بن جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب باتیں محض خیالی ہی تو نہیں ہیں۔ کیا یہ فلسفیانہ نظر بازی محض قیاس آرائی پر تو منحصر نہیں ہے۔ آخر ان باتوں کا عمل سے کیا واسطہ ہے ان کی عملی صورت کیا ہے؟ مجھے اس قسم کے سوالات سے حیرانی نہیں ہوتی۔ میں نے تو بھگوت گیتا کے خلاف اس قسم کی بہت سی دلیلیں سُنی ہیں۔ اکثر اصحاب کہتے ہیں کہ کوئی کام بغیر غرض کے ہو ہی نہیں سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان اصحاب کا تجربہ محدود ہے انھوں نے مذہبی دیوانگی کے زیرِ اثر کام کرنے والوں کے علاوہ کسی بلند

ے غلام ہمّت آنم کہ زیر چرخ کبود
ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

مقام بے غرض کام کرنے والے شخص کو شاید دیکھا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اِس قسم کی باتیں بناتے ہیں۔ ان کا جواب میں دلیل سے نہیں بلکہ ایک ایسی عظیم الشان ہستی کی جیتی جاگتی مثال سے دوں گا۔ جس نے کرم یوگ کی تعلیم کو عملی جامہ پہنایا۔ میری مُراد بھگوان گوتم بُدّھ سے ہے۔ دُنیا میں صرف وہی ایک اِنسان گزرے ہیں جنہوں نے اس تعلیم پر مکمل طور پر عمل کیا ہے۔ مہاتما بُدّھ کے علاوہ جو دوسرے پیغمبر دُنیا میں ہوئے ہیں اُن کا عمل اگرچہ بالکل بے غرضانہ تھا پھر بھی ان کے اس عمل کی تہ میں خارجی محرکات کسی نہ کسی شکل میں ضرور کام کر رہے تھے۔ کچھ پیغمبر اپنے آپ کو بھگوان کا اوتار کہتے ہیں اور اوتار کی حیثیت سے روئے زمین پر نزول کرنے کا دعوےٰ کرتے ہیں دوسرے ایسے بزرگ تھے جنہوں نے خود کو صرف خدا کا رسول یا پیغمبر کہا۔ بہرحال دونوں نے جو کچھ کام دُنیا میں کیا یا جو کچھ کام کرنے کی اُنھوں نے تلقین کی اس میں خارجی محرّکات کو بہت بڑی حد تک دخل ہے۔ مثلاً وہ صلا اور سزا کے قائل تھے۔ اُنھوں نے اپنے عمل کے جواز کے لئے بہت بلند رُوحانی زبان ضرور استعمال کی لیکن خارجی محرکات کا سہارا لئے بغیر نہ رہ سکے۔ صرف بھگوان بُدّھ ہی کی ہستی ایسی گزری ہے جنھوں نے اور تو اور خدا کی ہستی کے تصوّر کو بھی لازمی نہیں سمجھا وہ کہتے تھے کہ آپ خدا کے بارے میں جو مختلف نظریئے قائم کئے بیٹھے ہیں۔ مجھ کو ان کے جاننے سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے رُوح کے بارے میں لطیف اُصولوں پر بحث بھی نہیں کرنا۔ آخر ان باتوں سے حاصل کیا ہے۔ عمل کیجئے عمل[1] نیکی کیجئے اور نیک بنیئے اسی کے ذریعہ آپ کو نجات یعنی سچی آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی کے ذریعہ آپ کی رسائی حق و صداقت کی آخری منزل تک ہو سکتی ہے۔ وہ خود اس اصول کے سختی سے پابند رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ذاتی غرض سے قطعاً مُبرّا تھا۔ یہ نہیں کہ اُنھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان سے زیادہ کام دُنیا میں اور کسی انسان نے کیا ہی نہیں۔ تمام دُنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا دوسرا کردار نہیں مِلتا جو اُن سے زیادہ بلند پرواز رہا ہو۔ تمام نسل انسانی نے صرف انھیں کی ذات میں ایک ایسا کردار پیدا کیا ہے۔ انھیں کے وجود کی بدولت فکرِ انسانی فلسفہ اور رُوحانیت کے بلند ترین مقام تک جا پہونچی۔ ان کی ذاتِ پاک میں فلسفے کی بلندی اور انسانی ہمدردی کی وسعت دونوں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اِس عظیم الشّان فلسفی نے جہاں بلند ترین فلسفے کی تعلیم دی وہاں عملی طور پر نہ صرف بنی نوع انسان کے لئے بلکہ ادنےٰ سے ادنےٰ جانور تک کے لئے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور اس بے مثال عظمت کے باوجود اُنہوں نے اپنے پیغمبر یا اوتار ہونے کا کبھی کوئی بلند بانگ دعوےٰ نہیں کیا۔ مہاتما بُدھ ہی سچے

---

[1] مہاتما بُدھ نے کاہلی اور تن آسانی کو سب گناہوں کی جڑ قرار دیا ہے۔

آدرش کرم یوگی تھے وہ جو کچھ کرتے تھے اس میں اُن کی کوئی ذاتی غرض برائے نام بھی شامل نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں ان سے زیادہ بلند انسان آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ ذہنی قوت اور دلی ہمدردی (یعنی انسانی دل ودماغ) کا اتنا عظیم اشتراک اور امتزاج کبھی کسی اور ہستی میں نہیں پایا گیا۔ دُنیا میں داخلی طاقت کا سب سے زیادہ اظہار بھگوان بُدّھ کی شخصیت سے ہوا ہے۔ دُنیا میں وہی اول ترین سچّے ریفارمر (مصلح) تھے سب سے پہلے اُنھیں کو علی الاعلان یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ "محض اس وجہ سے کسی بات پر اعتقاد نہ لے آیئے کہ قدیم دستی تحریریں اس کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں محض اس لئے یقین نہ کیجیے کہ یہ آپ کا قومی عقیدہ ہے یا یہ کہ بچپن ہی سے آپ کسی بات کو قبول کرتے چلے آئے ہیں۔ بخلاف اس کے آپ اس پر بحث ومباحثہ کر لیجیے۔ عقل ودلیل کی کسوٹی پر اُسے خوب جی بھر کر رکھتے اور جب آپ اس کا تجزیہ کر چکیں اور آپ پر یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ وہ بات سب کے بھلے کی بات ہے تو اس پر یقین لے آیئے۔ اور اپنے ایمان کا ثبوت اس پر عمل کر کے بہم پہونچایئے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کیجیے اور اس ہمہ گیر ہمدردی اور بھلائی کے اُصول پر چلنے میں اُن کی مدد کیجیے۔ تاکہ وہ اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"۔ سچّا عمل رنگِ تعلق سے عاری ہوتا ہے۔ کام وہی ہے جو کسی غرض کو پیشِ نظر نہ رکھ کر کیا جائے۔ وہ کام ہی کیا جو دولت یا شہرت کے لئے کیا جائے یا جس سے کوئی مقصد حاصل کرنا ہو۔ اگر کوئی انسان اِس طرح مکمل طور پر بے غرض کام کر سکتا ہے تو وہ مہاتما بُدّھ کے اعلیٰ مقام تک پہونچ جاتا ہے۔ ایسے ہی انسان کی ذات سے جس میں بے تعلق ہو کر کام کرنے کی صلاحیت اور قوت ہے اس عظیم طاقت کا ظہور ہوتا ہے جو دنیا کا ہیولا بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ایسا ہی انسان سچے معنوں میں کرم یوگی ہے

کرم کا سِیرت
اور
کردار پر کیا اثر پڑتا ہے

لفظ کرم کا مَاخذ ہے سنسکرت زبانؔ کا مَادّہ کری कृ جس کے معنی ہیں کرنا۔ ہر قِسم کا عمل کرم کہلاتا ہے۔ اصطلاحًا اس لفظ کے معنی اعمال کے اثرات بھی ہیں۔ فلسفہ مَابعد الطبیعات کے سِلسلے میں بسا اوقات ان سے مُراد وہ نتائج ہوتے ہیں جو ہمارے اعمال گزشتہ کے سبب سے رونما ہوئے ہیں لیکن کرم یوگ میں لفظ کرم سے ہماری مُراد محض "کام" ہوگی۔ بنی نوع انسانؔ کی منزلِ مقصود علم ہے[ط]۔ مشرقی فلسفے نے ہمارے سَامنے صرف یہی نصب العین یا آدرش پیش کیا ہے۔ انسانؔ کی غائت انتہائی عیش وعشرت نہیں۔ راحت و مسرّت نہیں۔ علم ہے۔ عیش وعشرت اور راحت و مسرّت کا پیمانہ ایک نہ ایک روز لبریز ہو جاتا ہے۔ محض راحت کو مقصودِ زندگی قرار دینا غلطی ہے۔ بھول ہے۔ دُنیا میں ہر قسم کے مصائب کا سبب محض یہ ہے کہ لوگ حماقت سے راحت و مسرت کو۔ عیش وعشرت کو وہ آدرش سمجھ بیٹھے ہیں جس کے لئے یہ تمام جدّوجہد ہر وقت جاری رہتی ہے۔ تھوڑے ہی دِنوں کے بعد انسانؔ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جس منزل کی طرف اُس کے قدم اُٹھ رہے ہیں وہ راحت و مسرّت کی منزل نہیں ہے بلکہ علم کی منزل ہے۔ نیز یہ کہ راحت اور اذیّت یہ دونوں چیزیں ہماری بہت بڑی معلّم ہیں۔ اِنسان بدی سے بھی اُتنا ہی سبق لیتا ہے جتنا نیکی سے لیتا ہے۔ راحت اور اذیّت دونوں اپنے اپنے تاثرّات انسان کے دل پر چھوڑ جاتی ہیں اور

ط The goal of mankind is knowledge.

ان مجموعی تاثرات کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ انسانی کردار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے آپ کسی شخص کے بھی کردار کو لے لیجئے وہ دراصل اُس کے رُجحانات کا اس کے دماغی میلانات کا مجموعہ ہوتا ہے اور بعض حالات میں تو اُس کی تشکیل میں سُکھ کے بمقابلہ دُکھ کا حصہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ انسان دُکھ سے سبق زیادہ لیتا ہے۔ دُنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے اِنسان گزرے ہیں اُن کے کردار کا مطالعہ کرنے کے بعد تو میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ کثیر تعداد ایسے کرداروں کی ملتی ہے جنھوں نے سُکھ کے بمقابلہ دُکھ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ دولت مندی کے بمقابلہ مفلسی نے اُن کی آنکھیں زیادہ کھولیں اور تعریف و توصیف کے بمقابلہ نکتہ چینی اور بے دردی نے اُن کی اندرونی آگ کو زیادہ چمکایا۔

عِلم ایک داخلی نعمت ہے۔ خارجی ملکیت نہیں۔ عِلم فطری ودیعت ہے انسانی دولت نہیں علم کی تحصیل نہیں ہوتی اُسے تو آشکارا کیا جاتا ہے۔ تمام عِلم کا بھنڈار خود انسان کے اندر موجود ہے بحصیلِ علم کے معنی ہیں۔ اِس خزینے کو اپنے ہاتھ میں لے آنا۔ عام زبان میں کہتے ہیں کہ انسان فلاں بات "جانتا" ہے دراصل نفسیاتی زبان میں اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اِنسان نے اُسے "دریافت کرلیا ہے"۔ جو کچھ انسان سیکھتا ہے وہ دراصل "دریافت" کرتا ہے یعنی وہ صرف اُس پردے کو اُٹھا دیتا ہے جو رُوح پر پڑا ہوا ہے۔ یہ رُوح لامحدود علم کا خزانہ ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں نیوٹن نے قانون کشش ثقل دریافت کیا یہ قانون کشش ثقل کسی گوشے میں بیٹھا ہوا نیوٹن کا انتظار نہیں کررہا تھا یہ قانون دراصل اُن کے دماغ کے اندر مخفی تھا۔ وقت آنے پر نیوٹن نے اس کو دریافت کرلیا۔ دُنیا کو جو کچھ بھی علم کسی سے حاصل ہوا ہے وہ انسانی دماغ سے حاصل ہوا ہے اس عالمِ کائنات کا لامحدود کتب خانہ آپکے دِماغ میں موجود ہے۔ خارجی دُنیا سے تو ایک تحریک ہوتی ہے۔ اِس سے آپ کو ایک موقع ملتا ہے آپ اپنے دماغ کی کتاب کا مطالعہ کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ کے مطالعہ کا موضوع آپ کا دِماغ ہی ہوتا ہے۔ سیب کے گرنے سے نیوٹن کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور اس خیال کے تحت اُنھوں نے اپنے دماغ کا مطالعہ کیا اُن کے دماغ میں خیالات کا جو سِلسلہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اِس کو اُنھوں نے دوبارہ ترتیب دی اور اس کے درمیان ایک اور نئی کڑی دریافت کی۔ اِس کڑی کو ہم قانونِ کشش کہتے ہیں یہ قانون نہ تو سیب کے اندر ہی موجود تھا۔ نہ وسطِ زمین کی کسی شئے کے اندر مخفی تھا اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ عِلم خواہ مادّی ہو خواہ روحانی۔ انسانی دماغ کے اندر ہوتا ہے۔ اکثر حالتوں میں یہ علم دریافت نہیں ہوتا بلکہ اس پر پردہ پڑا رہتا ہے اور جب یہ پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگتا ہے

توہم کہتے ہیں کہ "ہم سیکھ رہے ہیں" اس علم کی ترقی تو پردہ اُٹھانے کے عمل کی ترقی سے ہوتی ہے جس شخص کے دل سے یہ نقاب اُٹھ جاتی ہے اس کا علم زیادہ ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کے دل پر پڑے ہوئے اس پردے کی تہیں موٹی ہوتی ہیں وہ جہالت اور گمراہی کا شکار ہوتے ہیں جس شخص کے دل سے یہ پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے وہ دانندۂ کُل[1] ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں ہزاروں ایسے 'دانندۂ کُل' بزرگ گزرے ہیں اور یقیناً ہزاروں کی تعداد میں ایسے انسان مستقبل میں بھی پیدا ہونگے۔ چقماق پتھر کے اندر چھپی ہوئی آگ کی مانند علم کا قیام دماغ میں ہوتا ہے۔ خیال سے رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی رگڑ سے آگ ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہی حال ہمارے احساسات اور اعمال کا بھی ہے اگر ہم سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ اپنی ذات کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارے آنسو اور ہماری مسکراہٹیں ہماری خوشیاں اور ہمارے رنج وغم۔ ہمارا نالہ و بُکا۔ ہمارے قہقہے اور ہماری بددُعائیں اور ہماری شبھ کامنائیں۔ ہمارا کسی کی تعریف و توصیف کرنا یا کسی کے سر بدنامی کا ٹھیکرا پھوڑنا غرض کہ ہماری یہ تمام حالتیں اس داخلی ردّعمل کا نتیجہ ہوتی ہیں جو خارجی حادثات سے رونما ہوتا ہے۔ ان سب حادثات کو یکجا کرنے سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کا نام ہم نے کرم رکھا ہے۔ کرموں کے مجموعے سے ہماری انفرادیت اور جماعتی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر طبعی یا غیر طبعی جمالی یا دماغی واقعہ جس سے ہمیں اپنی لاانتہا داخلی طاقت اور اپنے لاانتہا داخلی علم کا احساس ہونے لگتا ہے "کرم کی ذیل میں آتا ہے۔ یہاں تو اس لفظ کا استعمال وسیع ترین معنوں میں کیا گیا ہے۔ ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ کرم کرتے رہتے ہیں: میں آپ سے گفتگو کر رہا ہوں یہ بھی کرم ہے۔ آپ سُن رہے ہیں یہ بھی کرم ہے۔ ہمارا سانس لینا چلنا پھرنا کھانا پینا وغیرہ اِن سب باتوں کا شمار کرم کی ذیل میں ہوتا ہے۔ ہم جو کام بھی دماغ اور جسم سے لیتے ہیں وہ کرم ہے اور اس کرم کا ایک نقش ہمارے دل و دماغ پر قائم ہو جاتا ہے۔

بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو کثیر التعداد چھوٹے چھوٹے کاموں کے مجموعے سے تشکیل پاتے ہیں مثلاً سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ساتھ ٹکراتی ہوئی لہروں کی آواز ہمیں شور کی صورت میں سُنائی دیتی ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک ایک لہر کروڑوں چھوٹی چھوٹی لہروں سے مل کر بنی ہے یہ آواز ان میں سے ہر لہر سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم اس آواز کو سُننے سے قاصر

---

[1] Omniscient.

ہیں۔ البتہ جب سب لہروں کی آواز ایک ساتھ اُٹھتی ہے تو ہمیں شور سُنائی دینے لگتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے دل کی ہر جنبش ایک کرم ہے یہ اور بات ہے کہ ہم اُسے ایسا سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ ہمیں تو کرموں کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہمیں ایک ٹھوس شکل میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بیک وقت کئی مختلف کرموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی شخص کے کردار کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے بڑے بڑے کارناموں پر نظر نہ ڈالیے کبھی نہ کسی وقت تو ایک احمق بھی ایک ہیرو[1] کے کردار کو اپنا سکتا ہے۔ دیکھنا ہے تو ایسے شخص کو اپنے روزمرہ کے معمولی کام کرتے وقت دیکھیے۔ اس وقت آپ کو اس بزرگی کا صحیح پتہ چل سکے گا۔ زندگی میں بعض ایسے عظیم مواقع آتے ہیں کہ ایک چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی جوش میں آکر بڑے بڑے کام کر گزرتا ہے لیکن بڑا آدمی حقیقت میں وہی ہوتا ہے جس کے کردار میں ہمیشہ اور ہر وقت عظمت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

کرم وہ زبردست قوت ہے جس کی وساطت سے انسان اپنے کردار کی تشکیل کرتا ہے انسان ایک ایسا مرکز ہے جو عالمِ کائنات کی ساری طاقتوں کو اپنی طرف کھینچ کر اُن کو یکجا کرتا ہے اور پھر اُنھیں بجلی کی ایک زبردست لہر کی صورت میں ایک بے پناہ قوتِ محرکہ کی شکل میں خارجی دنیا کی طرف بھیجتا ہے۔ یہی داخلی مرکز ہماری اصل ہے۔ یہی ہماری ذات ہے یہ قادرِ مطلق ہے۔ اُسے ہر چیز پر قدرت ہے یہ دانندۂ کُل ہے اس کو ہر بات کی خبر ہے اس کی کشش سے تمام عالمِ کائنات اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ نیکی اور بدی دُکھ اور سُکھ کی تمام طاقتیں کشاں کشاں اسی کی جانب دَوڑتی چلی آتی ہیں اور ہر وقت اُس کے آگے دست بستہ موجود رہتی ہیں۔ انھیں طاقتوں سے وہ رجحانات کی اس عظیم اور زبردست برقی لہر کی تخلیق کرتا ہے جسے کردار کہتے ہیں اور پھر وہ اسی برقی لہر کو خارجی دُنیا میں اُچھال دیتا ہے جس سے ساری دُنیا کا کاروبار چلتا ہے۔

دُنیا میں جتنے اعمال ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ جماعتِ انسانی میں یہ جتنی تحریکیں جاری ہیں۔ یہ جتنے کام ہمارے چاروں طرف تکمیل پا رہے ہیں۔ سب مظاہر ہیں خیال کا۔ انسانی عزم کا یہ مشینیں یہ قسم قسم کے آلات یہ شہر و بیاباں یہ جنگ و امن کے ساز و سامان یہ سب کے سب عزمِ انسانی کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ عزم کردار سے بنتا ہے اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے کرم سے۔ جیسا کرم ہوتا ہے اسی کے مطابق انسان کا عزم بھی بن جاتا ہے۔ دُنیا میں جو لوگ زبردست

---

[1] Hero.

قوّتِ ارادی اور عزمِ مُصمم کے مالک ہوئے ہیں ۔ اُنھیں کی ذات سے بڑے معرکۂ آراء کام سرانجام پائے ہیں ۔ اُن کی رُوحیں بڑی زبردست روحیں تھیں ۔ اُن میں اتنی زبردست قوّتِ ارادی تھی کہ چاہتے تو دُنیا کا تختہ ہی اُلٹ کر رکھ دیتے ۔ یہ قوّتِ ارادی اُن کو مُسلسل کئی کئی جنموں میں متواتر محنت و مشقّت کرنے سے حاصل ہوئی تھی ۔ بھگوان بُدّھ یا حضرت مسیحؑ کی زبردست قوّتِ ارادی ایک ہی جنم میں نہیں حاصل ہوئی تھی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کِس باپ کے بیٹے تھے ۔ بھگوان بُدّھ یا حضرت عیسٰیؑ کے باپ نے انسانی فلاح و بہبود کے سلسلے میں کبھی ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا ہو گا ۔ حضرت یوسف کی طرح لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں بڑھئی ہو چکے ہیں اور اس زمانے میں بھی موجود ہیں ۔ بھگوان بُدّھ کے پتا کی طرح لاکھوں اور کروڑوں چھوٹے چھوٹے راجے دُنیا میں ہو چکے ہیں ۔ اگر اُن کو یہ کردار اپنے باپ سے وراثت میں ملا ہوتا تو پھر اسی چھوٹے سے راجکمار کے یہاں ۔ جس کا حکم شاید اس کے خدامِ بارگاہ بھی نہیں مانتے تھے ۔ ایسا بیٹا کیسے پیدا ہوتا جو آج نصف دُنیا کا معبود ہے ۔ ایک بڑھئی اور اس کے بیٹے کے درمیان جس کو لاکھوں انسان خدا کی طرح پُوجتے ہیں جو فرق حائل ہے اس کی وضاحت بھی وراثت کے نظریئے سے نہیں ہو سکتی ۔ بھگوان بُدّھ اور حضرت عیسٰے مسیح نے جس قوّتِ ارادی کا اظہار دُنیا میں کیا اس کا منبع اُس کا مصدر کیا تھا؟ وہ کہاں سے آئی ؟ ان دونوں میں اس قدر زبردست طاقت کہاں سے اور کیونکر جمع ہو گئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوّتِ ارادی کو جمع ہوتے ہوتے ایک زمانہ لگا ہو گا اس کی تشکیل میں صدیاں گزری ہوں گی ۔ سالہا سال میں یہ طاقت آہستہ آہستہ وجود پذیر ہوئی ہو گی ۔ اور آخرکار یہ بڑھتے بڑھتے بھگوان بُدّھ یا حضرت مسیحؑ کی ذات میں اپنے پُورے کمال پر پہونچی ہوگی یہی طاقت پھر ایک روز دُنیا میں اس شان سے جلوہ گر ہو گئی کہ آج بھی کروڑوں انسانوں کی زندگی کی تشکیل و تخریب اسی طاقت سے ہوتی ہے ۔ اِس طرح کی زبردست طاقت کا اظہار محض اتفاقیہ ... ہوتا ۔ اور نہ ہی اس کی وضاحت وراثت کے نظریئے سے ملتی ہے اگر فی الواقع اس کی کوئی سائنٹیفک وضاحت ہے تو وہ یہ ہے کہ اتنی زبردست قوّتِ ارادی کی تشکیل کرم یا عمل سے ہوتی ہے ۔ کرم ہی سے دُنیا کی ہر چیز کا تعیّن ہوتا ہے ۔ محنت کئے بغیر ۔ کمائے بغیر کسی کو بھی کوئی شئے میسر نہیں آسکتی ۔ یہ ایک دوامی قانون ہے بعض اوقات ضرور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صُورتِ حال ایسی نہیں ہے ۔ لیکن وقت گزرنے پر ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ ملتا وہی کچھ ہے جس کا کوئی حقدار ہوتا ہے ۔ جس کے لئے کسی نے کچھ کام کیا ہوتا ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی اشخاص تمام زندگی دولت اکٹھا کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں ۔ بلکہ اپنی اس جد و جہد کے دوران وہ بسا اوقات اِس

پھیریں دوسروں کو دھوکا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن اِس کے باوجود دولت اور امارت ان کے ہاتھ نہیں آتی۔ ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا اور ایک دن ایسا آجاتا ہے جب ایسے اشخاص کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ امیر ہونا اُن کی قسمت ہی میں نہیں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ابھی ت مند ہونے کا حق نہیں حاصل ہوا۔ جس کے باعث ان کی زندگی خود اُن کی نظر میں مصیبت بن جاتی ہے۔ وبالِ جان ہو جاتی ہے ہم اپنے جسمانی تعیّش کے لئے چاہے جتنا ساز و سامان یکجا کئے چلے جائیں۔ لیکن ہماری حقیقی متاع وہی ہے۔ جو ہمیں اپنی کمائی سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک احمق دُنیا بھر کی ساری کتابیں خرید کر انھیں اپنے کتب خانہ میں رکھ لے۔ لیکن اس کے پڑھنے میں صرف وہی کتابیں آسکیں گی جن کے پڑھنے کا وہ اہل ہے اور یہ اہلیت کرم سے وجود پاتی ہے۔ ہم جس چیز کے مستحق ہوتے ہیں۔ یعنی جس کو ہم اپنا سکتے ہیں۔ اس کا تعیّن کرم ہی سے ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ ہیں اُس کی ذمہ داری ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ اور ہم جیسا بننا چاہیں ویسا بننے کی طاقت خود ہمارے ہی اندر موجود ہے۔ ہم اس وقت جس حالت میں ہیں وہ نتیجہ ہمارے گزشتہ اعمال کا ہے تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم آئندہ جو کچھ ہونا چاہیں گے وہ بھی نتیجہ ہوگا ہمارے موجودہ اعمال کا ہم اپنی قسمت اپنی تقدیر کے صانع آپ ہیں۔ اِس لئے ہمارے واسطے یہ جاننا ضروری ہے کہ کام کرنے کا صحیح انداز کیا ہے؟ کام کس طرح کرنا چاہیئے؟ آپ کہیں گے کہ یہ بھی کوئی سیکھنے کی بات ہے۔ اس دُنیا میں ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے کام کرتا ہے۔ آپ کا کہنا سر آنکھوں پر لیکن غلط طریقے سے کام کرنے سے ہماری قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح مناسب اور متوقع نتائج نہیں نکل سکتے۔ اِس لئے کام تو ٹھیک طریقے سے کیا جانا چاہیئے۔ مناسب اور صحیح طریقے سے ہی کام کرنے کو کرم یوگ کہتے ہیں۔ گیتا میں لکھا ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ سائنٹیفک طریقے سے کام کرنے کا نام کرم یوگ ہے۔ کام کرنے کا صحیح طریقہ جان لینے سے انسان کو عظیم نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کام کرنے سے فقط فوری نتائج ہی مطلوب نہیں ہوتے۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہمارے دماغ کے اندر جو طاقت در پردہ کام کر رہی ہے وہ نمایاں ہو جائے۔ ہماری رُوح بیدار ہو جائے۔ یہ مخفی طاقت ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ علم و معرفت کا خزانہ ہر شخص کے دل میں ہے۔ ہم یہ جو مختلف کام کرتے ہیں اُن کا مقصد ان خوابیدہ طاقتوں کو جھنجھوڑ کر جگانا ہے۔

انسان مختلف مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر کام کرتا ہے۔ مقصد یا غرض کے بغیر کوئی کام

ہو ہی نہیں سکتا۔ بعض اشخاص شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ شہرت اور عزّت حاصل کرنے کی غرض سے کام کرتے ہیں بعضوں کو روپے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ روپیہ کمانے کے لئے کام کرتے ہیں۔ بعضے اقتدار و اختیار کے متمنّی ہوتے ہیں۔ وہ اقتدار و اختیار کی خاطر کام کرتے ہیں کچھ لوگ جنّت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور وہ حصُولِ جنّت کے لئے نیک اعمالی سے کام لیتے ہیں۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُن کا نام زندہ رہے اور اسی لئے یہ لوگ ساری عمر کام کرتے رہتے ہیں۔ شاید آپ جانتے ہیں کہ چین میں خطاب مرنے کے بعد دیئے جاتے ہیں۔ بہر صورت یہ طریقہ ہمارے طریقے سے تو بہتر ہے۔ چین میں جب کوئی شخص بہت اچھا کام کرتا ہے تو وہ اس کے مرحوم باپ یا دادا کو خطاب دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس خاندان کا مرتبہ بلند کر دیتے ہیں۔ اس خواہش کی کہ مرنے کے بعد بھی نام باقی رہ جائے۔ ایک اور صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں کے پیرو زندگی بھر محض اس خیال سے کام کرتے ہیں کہ جب وہ دُنیا سے کوچ کریں گے تو ان کا ایک عالی شان مقبرہ بنوا دیا جائے گا۔ مجھے بعض ایسے فرقوں کا علم ہے جن میں بچّے کے پیدا ہوتے ہی اُس کی قبر بھی بنوا دی جاتی ہے۔ اِن لوگوں میں یہ کام سب سے زیادہ اہم اور مقدّم سمجھا جاتا ہے۔ اور جتنی کسی شخص کی قبر بڑی اور شاندار ہوتی ہے، وہ اتنا ہی زیادہ خوشحال سمجھا جاتا ہے۔ بعض اشخاص کفارے کے طور پر کام کرتے ہیں۔ پہلے تو طرح طرح کی بداعمالیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اس کے بعد کوئی عبادتگاہ بنوا دیتے ہیں۔۔ اور پروہتوں۔ پادریوں یا مُلاّؤں کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے لئے جنّت یا بیکنٹھ کا پروانۂ راہداری حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خیرات سے ان کے نامۂ اعمال کی کثافت دُور ہو جائے گی اور اتنی گناہگاری کے باوجود وہ بخش دیئے جائیں گے۔ مختصر یہ کہ آدمی کچھ اسی قسم کے مختلف اغراض اور مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام کرتے ہیں۔

لیکن دُنیا میں ایسے عظیم اِنسان بھی ہوتے ہیں جو محض کام کی خاطر کام کرتے ہیں اُنھیں لوگوں سے انسانیت کا معیار بنا رہتا ہے۔ ہر بیدار ملک اور ہر زندہ قوم میں ایسے آدمی ضرور نظر آئیں گے۔ نہ اُنھیں نام کی ہوس ہوتی ہے نہ شہرت کی تمنّا اور نہ ہی وہ جنّت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ وہ کام محض اس خیال سے کرتے ہیں کہ اس سے کچھ نہ کچھ خیر و فلاح کی صورت پیدا ہو گی۔ ان سے بھی بلند مقام وہ انسان ہیں جو بھلائی اور بہبودی کے کام محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں نیکی اور بھلائی خود اپنا آپ انعام ہے۔ یہ لوگ نیکی اور بھلائی ہی میں ایمان رکھتے ہیں اور اسی کو زندگی کا سب سے اعلےٰ مقصد شمار کرتے ہیں۔ یہ لوگ غریبوں کی بھلائی اور مدد محض اِس لئے نہیں کرتے

کہ ایسا کرنا نیکی میں داخل ہے بلکہ وہ دوسروں کے کام اس لئے آتے ہیں کہ بھلائی کرنا اُن کے ایمان کا جُزو ہے اور وہ بھلائی پسند کرتے ہیں ان کو اس سے محبت ہوتی ہے۔ نیکی اور بھلائی کرنا اُن کی فطرت کا جزو ہوتا ہے۔ دراصل یہی لوگ کام کے راز سے واقف ہوتے ہیں۔ باقی تو سب کام کی غلامی کرتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ذاتی اغراض سے بلند ہو کر کام کرتا ہے تو کیا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے، کہ اس کو تو بلند ترین معراج حاصل ہوتی ہے۔ خود غرضی سے بیگانہ ہو کر کام کرنے کا صلہ زیادہ ملتا ہے صرف لوگوں میں اتنا صبر نہیں ہوتا کہ بے غرضی کے ساتھ کام کرنے کی مزاولت کریں نام اور شہرت کی خواہش سے بھی تو فوری نتائج شاذونادر ہی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نام اور شہرت کی برکتیں ہمیں اسی زمانے میں حاصل ہوتی ہیں۔ جب ہم بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اور ہماری زندگی قریب قریب ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ نتائج تو ہر کام سے پیدا ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بے غرض کام کے نتائج زیادہ شاندار ہوتے ہیں اوّل تو طبعی سطح پر بے غرض کام صحت اور تندرستی کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ دوسرے محبت سچائی اور خود غرضی سے بیگانگی یہ سب چیزیں بذاتِ خود ایک نعمت ہیں۔ یاد رکھیئے کہ یہ الفاظ محض اخلاقی استعارے نہیں ہیں یہ تو ہمارے بلند ترین نصب العین یا آدرش ہیں۔ ان کی تہ میں بڑی زبردست قوت مخفی ہوتی ہے اور بے غرضی کے ساتھ کام کرنے والا اس قوت کو بیدار کر لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص پانچ دن یا پانچ منٹ بھی ہر قسم کی ذاتی غرض سے بلند ہو کر اس طرح کام کرتا ہے کہ اس کو مستقبل کی کوئی فکر کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اور نہ اُسے کوئی جنّت کی طلب ہوتی ہے نہ سزا کا خوف تو اس میں ایک نہ ایک روز اخلاقی نقطۂ خیال سے ایک نہایت عظیم الشان ہستی بن جانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ لیکن ہم دل ہی دل میں سمجھتے ہیں کہ اس کی کتنی قدر و قیمت ہے کتنی منزلت ہے۔ اور اس سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ضبطِ نفس بجائے خود ایک زبردست قوت کا مظہر ہے بلکہ ضبطِ نفس دوسرے تمام خارجی اعمال کے بمقابلہ کہیں زیادہ طاقت کا مظہر ہوتا ہے۔ ضبط میں اظہار کے مقابلے میں زیادہ طاقت ہے۔ مثال کے طور پر ایک چار گھوڑوں والی گاڑی کو لے لیجئے، اگر ان گھوڑوں کو ایک پہاڑی ڈھلوان سڑک پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سرپٹ بھاگتے چلے جاتے ہیں اس میں طاقت کا اظہار ضرور ہے لیکن اگر انھیں گھوڑوں کو ایک سائیس لگام لگا کر قابو میں رکھے اور اپنی مرضی کے مطابق چلائے، تو اس میں زیادہ طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ پہلی حالت میں بے لگام طاقت موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے دوسری حالت میں ضبط و تحمل سے طاقت کا صحیح اور مفید استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر توپ کا گولہ ہوا میں چھوڑ دیا جائے تو بڑی دُور تک اُڑتا

چلا جاتا ہے۔ لیکن آخر میں گر پڑتا ہے۔ اگر یہی گولہ اُڑ کر دیوار سے ٹکرا جاتا ہے تو اس سے نہایت زبردست حدّت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی طاقت (انرجی[لے]) کا رُخ جب ذاتی غرض کے تحت خارجی دُنیا کی طرف ہو جاتا ہے تو یہ طاقت بہت بڑی حد تک رائیگاں جاتی ہے۔ اس عمل سے اور طاقت نہیں پیدا ہوتی اگر آپ ضبط سے کام لیں گے تو اس سے طاقت کی نشو و نما ہو گی۔ اس میں اضافہ ہو گا۔ اِس ضبطِ نفس سے ایک نہایت زبردست قوت اِرادی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بالآخر مہاتما بُدّھ یا حضرت عیسٰی مسیحؑ کا کردار اُبھر آتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں اس راز کا علم ہے۔ عام طور پر لوگوں کی عقل بہت محدود ہوتی ہے، وہ طاقت کے راز کو تو سمجھ نہیں پاتے۔ لیکن دوسروں پر حکومت کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اسی لئے تو ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی محنت کرنا اور صبر وتحمل سے کام کرنا سیکھ لے اور کچھ عرصہ چُپ چاپ کام کئے جائے اور دوسروں پر حکومت کرنے کے احمقانہ خیال کو چھوڑ دے تو اُسے صبر و انتظار کا پھل ضرور ملے گا۔ دوسروں پر حکمرانی کرنے کے خیال کو ترک کر دینے سے ہی اس میں طاقت پیدا ہو جائے گی جس کے سامنے لوگوں کے سر خود بخود جھک جاتے ہیں مگر عام طور پر لوگ اتنے دُور اندیش نہیں ہوتے جس طرح کچھ جانور کچھ قدم آگے کی چیز نہیں دیکھ سکتے۔ اِسی طرح ہم میں سے بیشتر اشخاص کی نظر چند سالوں سے آگے نہیں جاتی۔ ایک طرح سے ہماری دُنیا ایک تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم میں اتنا صبر وتحمّل نہیں ہوتا۔ کہ اس دائرے سے آگے نظر اُٹھا کر دیکھیں ہماری نظر اور ہمارے دل و دماغ محدود ہو جاتے ہیں۔ اس کوتاہ نظری اور کم ظرفی کی وجہ سے ہم اخلاق کو خیر باد کہہ بیٹھتے ہیں۔ گناہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ہماری فطرت میں کمینگی آجاتی ہے یہ ہے ہماری کمزوری ہماری طاقت کا فقدان آخر اخلاق و ثواب فراخ دلی اور وسعت نظری ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ جس کام میں کم ظرفی۔ تنگ نظری اور کمزوری کا ذرا سا بھی شائبہ ہو اس کو گُناہ سمجھئے اور جس عمل کی تحریک فراخ دلی اور وسیع النظری سے ہو اُسے ثواب شمار کیجئے۔ کمینگی تو پیدا ہوتی ہے طاقت کے فقدان سے۔ دراصل گناہ کمزوری کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔

کوئی بھی کام خواہ کتنی بھی حقیر سے حقیر نوعیّت کا کیوں نہ ہو اس سے اجتناب کرنا مناسب نہیں۔ اگر عمل واقعی کردار کی تعمیر کا ذریعہ ہے تو ہمیں اس کی نوعیت سے کیا غرض؟ البتّہ جو شخص

لے Energy.

اسرارِ عمل سے باخبر نہیں اسکو غرض کے تحت کام کرنے دیجئے جسے کام کرنے کیلئے کسی تحریک کی ضرورت ہو اُسے مقصد یا غرض کے ماتحت کام کرنے سے نہ روکیئے۔ وہ نام اور شہرت کی ہوس کے زیرِ اثر خوشی سے کام کرے لیکن ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ بلند سے بلند تر اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرے اور ان کی ماہیت کو سمجھے۔ آخر کار گیتا کا یہ سبق اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ ہم کو کام کرنے کا حق ہے۔ کام کے پھل پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ حقیقی آدرش تو یہی ہے کہ ثمرے کا خیال دل سے دُور ہی رہے آخر نتائج کے لئے یہ فکر و کاہش کیوں؟ اگر آپ کسی شخص کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو یہ سوچنے کی زحمت نہ اُٹھایئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کام کرتے چلے جایئے۔

کام کے متعلق اس نصب العین کے پیشِ نظر ایک نہایت مشکل سوال ہمارے سامنے پیش آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہمیں شدید مستعدی کی ضرورت ہے اگر ہمیں ہمیشہ کام کرتے رہنا ہے تو پھر آرام کیا چیز ہے، سکون کیا ہے۔ ترک یا تیاگ کے کیا معنیٰ ہیں۔ ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ کام زندگی کی کشمکش کا ایک پہلو ہے، ہم نہایت تیز رفتاری کے ساتھ کرم کے اس چکر میں بندھے چلے جا رہے ہیں لیکن بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے یعنی سکون۔ ہر قسم کی مستعدی سے دست کشی اور ترک۔ اِدھر ہر طرف ایک پُرسکون فضا نظر آتی ہے۔ شور و نمائش کو بہت کم دخل ہوتا ہے اور قدرت ہمارے سامنے اپنے جانوروں پھولوں اور پہاڑوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے یہ دیکھ کر ہم اپنے دل میں سوچنے لگتے ہیں کہ آخر زندگی کی یہ مُسلسل کشمکش کب تک؟ ہمیں اس وقت ترک یا تیاگ کا خیال آتا ہے۔ دراصل اِن دونوں پہلوؤں میں کوئی پہلو بھی مکمل نہیں ہے۔ جو شخص تنہا نشینی کا عادی ہے اگر اُسے دُنیا کے طوفان خیز گرداب سے سابقہ پڑے گا تو وہ اس کی زد میں آکر فنا ہو جائے گا بالکل اسی طرح جیسے گہرے سمندری پانی میں رہنے والی مچھلی سطح پر آتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے کیونکہ سطح پر پانی کا بوجھ ہی نہیں رہتا جس کے دباؤ سے اس کا جسم قائم تھا۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص زندگی کی کشمکش اور بھیڑ بھاڑ میں رہنے، اور بسنے کا عادی ہو اور اس کو کسی پُرسکون مقام پر لے جایا جائے تو بھلا اس کو چین کیونکر آسکتا ہے۔ اس ماحول میں اس کو بڑی اُلجھن ہوگی ممکن ہے کہ اس فضا میں رہنے سے وہ اپنا دماغی توازن تک کھو بیٹھے۔ معیاری اِنسان تو وہی کہلائے گا جو انتہائی خاموشی اور تنہائی کے عالم میں بھی زندگی کے شور و غل سے غافل نہ رہے اور جس کو عمل کی انتہائی سرگرمی کے دوران میں جنگل کی خاموشی اور تنہائی محسوس[1] ہو۔ ایسے ہی شخص کو ضبط و تحمل کا راز معلوم ہے اسی نے خود پر قابو حاصل کر لیا ہے۔ ایسے

[1] سوامی جی نے اپنے دوسرے لیکچر میں اس کام کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ایسا شخص نیک

شخص کو بڑے سے بڑے شہروں کی آمد و رفت کی سرگرمی سے بھری ہوئی سڑکوں سے گزرتے ہوئے بھی ایسا ہی سکون میسر آتا ہے جیسا غاروں میں رہنے سے حاصل ہوتا ہے جہاں اس کے کانوں میں ایک آواز بھی نہیں پہونچ سکتی۔ ایسا شخص جنگل اور صحرا کی خاموشی میں بھی کبھی نکما نہیں بیٹھتا بلکہ ہر وقت نہایت مستعدی کے ساتھ کام میں مصروف و منہمک رہتا ہے۔

تو یہ ہے کرم یوگ کا نصب العین یا آدرش اور اگر آپ نے اِس آدرش کی تکمیل کرلی ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو کام کرنے کا راز معلوم ہوگیا۔

طریقۂ عمل تو یہ ہے لیکن اِس آدرش کی تکمیل آسان نہیں اسکے لئے ابتدائی مراحل سے گزرنا بھی لازمی ہے، جو کام بھی ہمارے سامنے آئیں ہم انھیں پوری تندہی سے سرانجام دیتے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھتے جائیں کہ کس قوتِ محرکہ کی وجہ سے ہم کام کی جانب مائل ہوئے ہیں۔ شروع میں تو ہر کام کی تہ میں بلا استثنا خود غرضی ہی کام کرتی ہوئی نظر آئے گی لیکن لگاتار کوشش سے رفتہ رفتہ یہ خود غرضی دور ہوتی چلی جائے گی۔ حتےٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا جب ہم حقیقی معنوں میں بے غرضی کے ساتھ کام کرنے لگیں گے یہی ہماری زندگی کی معراج ہے ہمیں اُمید کرنا چاہیئے کہ زندگی کی مختلف راہوں میں کشمکش کرتے ہوئے آخر ہم اس مقام پر جا پہونچیں گے جہاں خود غرضی کی گرد ہم کو چھو بھی نہ پائے گی۔ جہاں ہماری تمام طاقتیں سمٹ کر ایک مرکز پر آجائیں گی اور ہمیں اپنی پاک ذات میں تمام علم و آگہی کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔

خیالات کی زبردست لہروں کو نشر کرتا ہے جو دُنیا میں بڑے بڑے کاموں کی محرک ہوتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

کام کرنے کا راز

اِس میں شک نہیں کہ کسی کی مدد کرنا یعنی اس کی مادّی ضروریات کا پُورا کرنا نیک کام ہے۔ اس کام کی عظمت ایک تو اس ضرورت کی کمی بیشی پر منحصر ہے جس کے رفع کرنے میں ہم کسی کی مدد کرتے ہیں۔ دوسرے اُس کا انحصار ہماری مدد کی دُور رسی پر ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کی ضروریات کو ایک گھنٹہ کے لئے دُور کر دینا اُن کا سال بھر کے لئے پُورا انتظام کر دینا یا پھر اُنھیں ہمیشہ کے لئے مِٹا دینا مدد کے مختلف مدارج ہیں۔ کم و بیش مدد کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی کی ضرورت کِسی حد تک ختم ہو گئی۔ یقیناً عظیم ترین امداد وہی ہے جس سے کسی کی ضروریات کی تکمیل ہمیشہ کے لئے ہو جائے اور یہ صرف رُوحانی علم ہی کی بدولت ممکن ہو سکتا ہے۔ ہماری مصیبتیں ہمیشہ کے لئے صرف رُوحانی علم ہی سے دور ہو سکتی ہیں۔ دوسرے علوم سے تو ہماری احتیاجات کی تکمیل صرف تھوڑے عرصے کے لئے ہوتی ہے۔ احتیاج کی قوت کا قلع قمع صرف رُوحانی علم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ رُوحانی امداد ہی انسان کے لئے سب سے زیادہ مکمل اور اعلیٰ امداد ہے اور نوعِ انسانی کا سچّا اور عظیم ترین محسن وہی شخص ہوتا ہے جو انسان کو رُوحانی علم کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ یہ ہمارے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ جن لوگوں نے انسان کی رُوحانی ضرورتوں کو مُہیّا کیا ہے وہ بیش از بیش قوتوں کے مالک تھے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ ہماری زندگی کی تمام سرگرمیوں کی صحیح بنیاد رُوحانیت ہی ہے اور ہماری بنیادی ضروریات کو وہی شخص پُورا کر سکتا ہے۔ جن میں اِن بنیادوں کو ہِلا دینے کی طاقت ہو۔ یہاں یہ جتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رُوحانی طاقت کا مالک اگر چاہے تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اپنی طاقت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک انسان میں روحانی

طاقت نہ ہوگی اس کی جسمانی حاجتوں کا بھی بخوبی پورا ہونا محال ہے۔

رُوحانی امداد سے اُتر کر ذہنی معاونت کا مقام آتا ہے۔ گیان یا علم کا عطیہ غذا اور پوشاک کے عطیوں سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہوتا ہے۔ یہ عطیہ کسی مُردہ جسم میں جان ڈال دینے سے بھی بڑھ کر گراں منزلت ہوتا ہے کیونکہ انسان کی حقیقی زندگی علم ہی میں مُضمر ہے۔ جہالت موت ہے اور علم زندگی۔ اگر زندگی تاریکی میں بسر ہو جہالت اور مُصیبت کی وادیوں میں بھٹکتی ہو تو اس کی کوئی قدر قیمت نہیں۔ ذہنی معاونت کے بعد انسان کی مادّی امداد کا درجہ آتا ہے لیکن عام طور پر ہم دُوسروں کی مدد کے مدارج کو غلط سمجھتے ہیں۔ رُوحانی مدد اور ذہنی معاونت کی منزلت نہ پاکر ہم مادّی سہایتا (اعانت) ہی کو سب سے اعلیٰ مقام دیتے ہیں ہمیں چاہیئے کہ جب کبھی دوسروں کی مدد کا سوال پیش ہو تو ہم غلطی سے یہ نہ سمجھ لیں کہ انسان کو صرف مادی مدد ہی دی جاسکتی ہے۔ صرف مادّی مدد ہی آخری مدد نہیں ہوتی بلکہ اس کی اہمیت تو نہایت ہی کم ہے کیونکہ اس سے مستقل آسُودگی کا حاصِل ہونا ناممکن ہے۔ بھوک لگنے سے مُجھ کو جو اذیت ہوتی ہے اس کا عارضی دفیعہ کھانا کھانے سے ہوجاتا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد بھوک پھر لگ آتی ہے۔ کھانا کھانے کی خواہش ایک بار پیٹ بھر کھالینے سے تو مِٹ نہیں جاتی بلکہ عارضی تسلّی سے تو یہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔ میری اذیت تو صرف اُسی وقت دفع ہوسکے گی جب یہ خواہش ہی باقی نہ رہے جب مجھے اس سے مکمل طور پر آسودگی حاصِل ہوجائے اور پھر کسی قسم کی احتیاج باقی نہ رہے۔ جب میں ترکِ خواہش کے اس مقام پر پہونچ جاتا ہوں تو خالی پیٹ سے میری حالت زاوُنبوں نہیں ہوسکتی۔ یہی نہیں بلکہ کوئی بھی صعُوبت کسی قسم کا بھی رنج مجھ پر اثرانداز نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جو مدد ہمیں رُوحانی طور پر مضبُوط بناتی ہے اس سے زیادہ بلند مرتبہ اور کوئی مدد نہیں ہوتی ذہنی معاونت اور مادی اور جسمانی امداد اپنی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ہمیں ان کے مقام کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ دنیا کو مختلف قسم کی اذیتوں سے نجات صرف مادّی مدد سے حاصل نہیں ہوسکتی جب تک انسان کی فطرت میں انقلاب رونما نہیں ہوتا اسے جسمانی ضروریات پیش آتی رہتی ہیں اور تکمیل آرزو نہ ہونے پر قسم قسم کی اذیتوں کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے اس صُورت میں چاہے جتنی بھی مادی امداد سے کام لیا جائے یہ اذیتیں دفع نہیں ہوسکتیں۔ اس مسئلے کا واحد حل تو یہی ہے کہ انسان میں پاکیزگی پیدا کی جائے، اُس کو حقیقت سے آشنا اور اپنی رُوحانی طاقت سے آگاہ کیا جائے۔ یہ جتنی خرابیاں اور مصیبتیں ہمیں اپنے گرد و پیش نظر آتی ہیں سب کی سب جہالت سے پیدا ہوئی ہیں ان کا علاج بس یہی ہے کہ روحانیت کی روشنی چاروں طرف پھیلا دی جائے۔ آؤ ہم انوارِ رُوح کو آشکارا کریں تاکہ اذیتوں کے تمام سبب سائے بھاگ جائیں۔ آؤ ہم اپنے آپ کو علم اور آگہی سے روشن ضمیر اور پاک دل بنائیں تاکہ خواہشات کی ظلمتیں دُور ہوں۔ یہی طریقہ ہے دنیا سے مصیبتوں کے دُور کرنے کا۔

جب تک ہمیں معرفت نہیں حاصل ہوتی ہماری مصیبتوں کا دُور ہونا ناممکن ہے۔ چاہے ہم مُلک کے گھر گھر کو خیرات خانہ بنا دیں۔ ہر طرف اسپتالوں کی بھرمار کر دیں ہماری مصیبتوں کا خاتمہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہمارے کردار میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ فلاح عامّہ کے ان تمام کاموں سے ہمیں اپنی رُوح کو جگمگانے میں مدد ملتی ہے یہ بجائے خود ہماری اذیتوں کا علاج نہیں۔

بھگوت گیتا کے مطالعہ سے ہمیں بار بار یہی سبق ملتا ہے کہ ہم سب کو مسلسل کام کرتے رہنا چاہیئے۔ عمل میں فطرتاً نیکی اور بدی دونوں کے اجزا شامل ہوتے ہیں دنیا کا کوئی کام نہ تو کلیتاً اچھا ہوسکتا ہے اور نہ بُرا ہم کوئی بھی کام ایسا نہیں کر سکتے جس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کو کوئی فائدہ نہ پہونچے اور نہ ہی کوئی کام ایسا ہوسکتا ہے جس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہونچے۔ اس لئے ہر کام میں لازمی طور پر نیکی اور بدی دونوں چیزیں مشترک ہوں گی۔ اس کے باوجود ہم کو یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ برابر کام کرتے رہیں۔ آخر کیوں؟ جب نیکی اور بدی دونوں کا پھل ملتا ہے۔ جب یہ بات مُسلّم ہے کہ نیک اعمال کا اثر نیک ہوگا اور خراب اعمال کا اثر خراب نکلے گا۔ جب نیک و بد اعمال سے ہمارے آئندہ کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ جب نیکی اور بدی یہ دونوں چیزیں دو زنجیروں کی مانند ہماری رُوح کو جکڑے رکھتی ہیں۔ جب یہ تمام دنیا اسی بندھن میں بندھی ہوئی ہے تو پھر ہر وقت اور ہر لمحہ کام کرنے کی تلقین کے کیا معنی؟ اس سے تو بہتر یہی ہوگا کہ کام ترک کر دیا جائے۔ یہ سوال بہت اہم اور گیتا نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ کرم کی نوعیت میں تو سانس لینا بھی شامل ہے اس لئے کام کا ترک کر دینا ناممکن ہے البتہ جو کام ہم سرانجام دے رہے ہیں۔ اگر اس میں خود کو ملوّث نہ کریں اس کو بے تعلق ہو کر انجام دیئے جائیں تو اس سے ہماری رُوح پر کوئی ایسا اثر نہیں پڑتا جو ہماری قید و بند کا باعث ہو جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گیتا کے اس مرکزی تصوّر یعنی بے لوث اور بے تعلق ہو کر متواتر کام کرنے کا مفہوم کیا ہے؟

یوں تو سنسکرت زبان کے لفظ "سنسکار" کا ترجمہ کسی قدر مشکل ہے لیکن اس کا مطلب جبلّی رُجحان لیا جاسکتا ہے۔ تمثیلاً اسکے معنی یوں بیان کئے جاسکتے ہیں اگر آدمی کے مَن (دل و دماغ) کو ایک جھیل سے تشبیہ دی جائے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جو بھی چھوٹی یا بڑی لہر اس جھیل میں اُٹھتی ہے وہ پیچھے ہٹنے پر قطعی طور پر نابود نہیں ہو جاتی بلکہ اپنا ایک نشان چھوڑ جاتی ہے جس سے آئندہ اُس کے اُبھر آنے کا دوبارہ امکان ہوسکتا ہے۔ اسی نشان کو۔ لہر کے دوبارہ پیدا ہو جانے کے اسی امکان کو "سنسکار" کہتے ہیں جو کام بھی ہم کرتے ہیں جو حرکت بھی ہمارے جسم سے ہوتی ہے جو خیال ہمارے مَن میں آتا ہے اس کے کچھ نقوش دماغ[1] میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر یہ موہوم نقش دماغ کی سطح پر نمایاں نہیں

---

[1] Mind-stuff.

ہوتے۔لیکن ان میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ سطح سے نیچے تحت الشعور میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ہماری ساخت لمحہ بہ لمحہ دماغ پر پڑے ہوئے اُنھیں نقوش کی میزانِ کُل پر منحصر ہوتی ہے۔میری جو کیفیت اس وقت ہے وہ میری گزشتہ زندگی کے مجموعی سنسکاروں کا نتیجہ ہے۔کیرکٹر یا کردار سے بھی یہی مُراد ہے۔ ہر شخص کا کردار انھیں مجموعی سنسکاروں سے بنتا ہے اگر اچھے سنسکاروں کا غلبہ ہوتا ہے تو کردار اچھا ہوتا ہے اگر سنسکار خراب ہوتے ہیں تو کردار میں خرابی آجاتی ہے۔ اگر کسی شخص کے کانوں میں مُسلسل گندے الفاظ پڑتے رہیں اور اس کے دل میں خراب خیال اُٹھتے رہیں تو اس کے اطوار اور افعال بھی خراب ہو جاتے ہیں۔اس کا دماغ خراب قسم کے نقوش سے معمور رہنے لگتا ہے اور ان نقوش کا خراب اثر اس کے خیالات اور افعال پر پڑتا ہے۔ حالانکہ خود اس کو اس عمل کی خبر نہیں ہوتی۔حقیقت یہ ہے کہ یہ ناقص نقوش ہمیشہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اسی لئے اُن کا نتیجہ خراب ہو جاتا ہے جس کے باعث انسان کا کردار بھی ناقص ہو جاتا ہے اور اس سے مَفر کی کوئی صورت نہیں۔ان سنسکاروں کے مجموعہ کُل سے اس کے دل میں بدکرداری کی زبردست قوتِ محرکہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے سنسکاروں کے ہاتھ میں اس کی حیثیت بالکل ایک مشین سی ہو جاتی ہے۔اور وہ اُن کے زیرِ اثر بُرے کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر کسی انسان کے دل میں اچھے خیالات اُٹھتے ہیں اور وہ کام بھی اچھے کرتا ہے تو ان اچھے کاموں کے مجموعی تاثرات بھی اچھے ہی ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح اگر وہ خود نہ بھی چاہے تو بھی تاثرات کے تحت اُس کی ذات سے اچھے ہی کام سرانجام پاتے ہیں۔جب کوئی شخص اس قدر اچھے کام کرنے لگتا ہے اور اُسکے دل میں اتنے اچھے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں تو اس کی طبیعت زبردستی اچھے کام کرنے کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اس رُجحان طبع کے خلاف نہیں جا سکتا۔پھر وہ لاکھ خراب کام کرنا چاہے اس کے مجموعی رجحانات کی حیثیت سے اس کی طبیعت اس خراب کام کرنے سے باز رکھتی ہے۔ یہ رُجحانات اُس کا رُخ پھیر دیتے ہیں۔ایسی حالت میں وہ مکمل طور پر اچھے رُجحانات کے زیرِ اثر ہوتا ہے اور جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس وقت سمجھا جاتا ہے کہ اُس کا کردارِ حسنہ قائم ہو گیا ہے۔اس میں مضبوطی آگئی ہے۔

جس طرح ایک کچھوا اپنے پیروں اور اپنے سر کو اپنے جسمانی خول کے اندر چھُپا لیتا ہے۔ اور پھر چاہے آپ اُس کی جان ہی کیوں نہ لے لیں۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کیوں نہ کر ڈالیں وہ اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح اس شخص کے کردار میں بھی جس نے اپنے اغراض اور اعضا پر قابو پا لیا ہے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ وہ اپنی جگہ پر مستقل طور پر قائم رہتا ہے۔ اُس کو اپنی اندرونی طاقتوں پر قابو حاصل ہو جاتا ہے اور پھر کسی کی مجال نہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی طاقتوں کو استعمال کر سکے۔ان نیک خیالات اور

نیک تاثرات کا عکس دماغی سطح پر مسلسل پڑتا رہتا ہے۔ اِس عمل کے زیرِاثر نیکی کرنے کا رُجحان مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور ہم کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمیں اپنی اندریوں یعنی جُملہ ظاہری اور باطنی حواس پر قابو حاصل ہو گیا ہے سیرت یا کردار جب اس طرح قائم ہو جاتا ہے تو انسان حقیقت کو پا جاتا ہے۔ ایسا انسان ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی ذات سے کوئی بُرا کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایسے شخص کو کبھی بُری صحبت بھی مل جائے تو بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

لیکن نیک کردار کے اس مقام سے بھی بلند تر وہ مقام ہے جہاں انسان کے دل میں مکمل آزادی یعنی نجات کی خواہش جاگ اُٹھتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دُنیا کے کام دھندے کرتے ہوئے بھی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ کرم یوگ نجات کے اس مسلک کا نام ہے جس میں ترکِ عمل ضروری نہیں۔ آخر نجات دِلانا ہی تو سب یوگوں کی حقیقی غائت ہے۔ گیان یوگ ہو یا راجیہ یوگ بھگتی یوگ یا کرم یوگ سب کے نتائج کی نوعیت یکساں ہوتی ہے یہ سب ہمیں نجات کی منزل تک لے جاتے ہیں۔ جو منزل بھگوان بُدھ کو دھیان سے اور حضرت مسیح کو عبادت سے میسر آئی وہی منزل انسان کو راہِ عمل اختیار کرنے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مہاتما بُدھ ایک عامل گیانی یعنی عارف تھے اور حضرت مسیح ایک سچے بھگت تھے لیکن دونوں کی رسائی ہوئی ایک ہی منزلِ مقصود پر۔ مگر کرم کے رستے سے وہاں تک پہونچنے کا مسئلہ کسی قدر دُشوار اور وضاحت طلب ضرور ہے نجات کے معنٰی ہیں مکمل رہائی۔ اچھائی اور بُرائی پُنیہ اور پاپ۔ ثواب اور گناہ نیکی اور بدی دونوں چیزوں کے بندھنوں سے مکمل رستگاری زنجیر ہمیشہ زنجیر ہی ہوتی ہے۔ خواہ سونے کی ہو خواہ لوہے کی سونے کی زنجیر لوہے کی زنجیر سے کچھ کم نہیں جکڑتی۔ ہمیں تو دونوں سے چھٹکارہ پانا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے۔ میری اُنگلی میں کانٹا چُبھ جاتا ہے۔ اِسی کانٹے کو نکالنے کے لئے میں ایک اور کانٹا استعمال کرتا ہوں۔ اور جب پہلا چُبھا ہوا کانٹا نکل جاتا ہے تو میں دونوں کانٹوں کو پھینک دیتا ہوں پھر مجھے دوسرے کانٹے کو رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ دونوں کانٹے بہر حال کانٹے ہی تو ہیں اسی طرح بُرے رُجحانات کو اچھے رجحانات کے تقابل سے مٹایا جا سکتا ہے۔ اعمالِ بَد کے نقوش کو اچھے کاموں کے تاثرات کی مدد لے کر دل و دماغ سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ حتّٰی کہ بدی کا قریب قریب نشان ہی مٹ جاتا ہے۔ کم از کم باقی ماندہ رُجحانات مطیع ہو کر دماغ کے ایک کونے میں دبک کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن رُوحانی آزادی کے لئے تو بس یہی کافی نہیں۔ آپ کو اپنے نیک رجحانات پر بھی قابو پانا ہے ہمیں اُن کا بھی غلام نہیں ہو جانا چاہیئے۔ نیک و بد دونوں باتوں سے بلند اُٹھ کر دونوں سے بے لوث اور بے تعلق ہو کر آزادی نصیب ہوتی ہے۔ کام کیجئے لیکن اس کام یا اس خیال کا کوئی گہرا اثر دماغ پر نہ پڑنے دیجئے۔ خیال اور عمل کی چھوٹی بڑی سب لہروں کو اُٹھنے دیجئے۔ اور پھر اُن کے غائب ہونے کا

کا تماشا دیکھئے۔ اعصاب اور دماغ سے بڑے بڑے کام لیجئے۔ لیکن اُن کو اپنا کوئی گہرا نقش اپنی رُوح پر نہ چھوڑنے دیجئے۔ آپ کہیں گے یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس اُصول کی پیروی کا عملی طریقہ کیا ہے؟ یہ تو ہم سب کی دیکھی ہوئی بات ہے کہ ہمارے دماغوں پر اثر صرف اسی بات کا ہوتا ہے جس سے ہم خود کو وابستہ کرلیتے ہیں۔ مثلاً میں دِن بھر میں نہ جانے کتنے آدمیوں سے دوچار ہوتا ہوں۔ لیکن جب رات کو آرام کرنے کے لئے لیٹتا ہوں تو ان میں سے ایک شخص کا چہرہ بھی ذہن میں نہیں آتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان چیزوں کا تصور کرنے کی کوشش کروں تو بھی اُن کے نقوش اُبھرنے نہیں پاتے۔ البتہ اگر دن میں کسی ایسے شخص سے لمحہ بھر کے لئے بھی ملاقات ہوگئی ہو جس کے لئے میرے دل میں محبت ہو یا پیدا ہو جائے تو اس سے مختصر مُلاقات کے باوجود اس کا چہرہ خود بخود میری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دوسرے تمام نقوش کیوں محو ہو جاتے ہیں اور ایک خاص نقش کیوں بار بار اُبھر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ بس یہی ہے کہ میں نے اس ایک شخص سے ایک خاص اُنس ایک وابستگی پیدا کرلی جس سے اس کے چہرے کا اثر میرے دل پر دوسروں کے بمقابلہ زیادہ گہرا پڑا۔ علم اعضاء وافعال اعضا[1] کی رُو سے اُن سب چہروں کے نقوش کی تشکیل میں کوئی فرق نہیں۔ اُن تمام چہروں کے عکس فرداً فرداً میری آنکھوں کے پردوں پر یکساں طور پر نمودار ہوئے۔ میرے دماغ کو ہر عکس کا برابر شعور ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اس سے ذہن پر مختلف اثرات پیدا ہوئے۔ آخر ان ذہنی نقوش میں یکسانیت نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ جن اشخاص سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں سے اکثر تو بالکل اجنبی تھے جن کی صورت اس سے پیشتر کبھی میرے تصوّر میں بھی نہ آسکتی تھی۔ پھر بھی ایک ایسے خاص شخص کے چہرے نے میرے دل میں جگہ کرلی جسے میں اچھی طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ میرے ذہن میں اس کی تصویر سالہا سال سے کھچی چلی آئی تھی۔ اور اس کے بارے میں مجھے سینکڑوں باتوں کا علم تھا جن کی یاد ایک مختصر سی ملاقات سے از سرِ نو تازہ ہوگئی اور نہ جانے کتنے خوابیدہ خیالات دل میں انگڑائیاں لینے لگے۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ میں اس ایک ذہنی نقش کا اعادہ کرنے لگا اور اس طرح اس کا نقش دوسروں سے زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ذہنی نقش اسی حالت میں گہرا ہوتا ہے جب اس سے وابستگی ہو جاتی ہے اور اُس کا بار بار اعادہ ہونے لگتا ہے۔

اس لئے خود کو کسی چیز سے وابستہ نہ کیجئے۔ سب سے بے لوث رہیئے۔ اور دُنیا کی ہر چیز کو اپنا کام کرنے دیجئے۔ اپنی دماغی قوتوں سے خوب کام لیجئے۔ مسلسل کام کئے جائیے۔ لیکن عمل اور ردّ عمل کی

---

[1] Physiology.

لہروں کو دماغ پر غالب نہ آنے دیجئے۔ یوں سمجھئے کہ آپ اس دنیا میں ایک اجنبی ہیں ایک جہاں گرد سیاح ہیں اپنے مختصر قیام کے دوران میں دنیا کو خوب دیکھئے برابر کام میں مصروف رہیئے لیکن خود کو اس سے وابستہ نہ کیجئے۔ یہ وابستگی بڑی ہولناک چیز ہے۔ یہی ہماری غلامی کا باعث بنتی ہے، دنیا ہمارا مسکن نہیں ہے یہ تو اُن متعدد منازل میں سے ایک منزل ہے جن سے ہو کر ہمیں گزرنا پڑتا ہے سانکھیہ کا یہ عظیم قول یاد رکھیئے کہ "یہ تمام[1] کائنات رُوح کے لئے ہے رُوح کائنات کے لئے نہیں ہے" کائنات کا وجود رُوح کی تعلیم کے لئے ہوتا ہے اس کا کچھ اور مُدعا ہی نہیں یہ عالمِ شہود تو معرفت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ اسی ذریعہ سے رُوح کو نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر ہم کو یہ نکتہ یاد رہے تو ہم کبھی دُنیا سے لگاؤ نہ رکھیں گے۔ ہم جان لیں گے کہ قدرت ایک کتاب ہے جس کا ہمیں مطالعہ کرنا ہے اور جس وقت بھی ہمیں مطلوبہ علم حاصل ہو جائے گا یہ کتاب ہمارے لئے کسی کام کی نہ رہے گی مگر ایسا کرنے کے بجائے ہم خود کو قدرت سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ رُوح کا وجود جہاں کے لئے ہے ہم رُوح کو اس گوشت پوست کے ڈھانچے کا غلام سمجھنے لگتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان کھانے کے لئے جیتا ہے جینے کے لئے نہیں کھاتا ہم سے یہ غلطی برابر سرزد ہوتی رہتی ہے۔ ہم قدرت کو خود اپنی ذات سمجھ لیتے ہیں ہم عموماً یہی سمجھتے ہیں کہ ہماری ہستی کا انحصار محض خارجی قدرت پر ہے۔ اس لئے ہم خارجی دنیا سے وابستگی پیدا کر لیتے ہیں اور یہ وابستگی ہم پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوتی ہے کہ ہم پابند ہو کر رہ جاتے ہیں اس کے بعد قدرت ہمیں آزادی سے کام کرنے کا موقع نہیں دیتی بلکہ ہم سے غلاموں کی طرح کام لینے لگتی ہے۔

اس تمام درس کا خلاصہ یہ ہے کہ غلام کی حیثیت سے نہیں آقا کی حیثیت سے کام کرو۔ کام ضرور کرو۔ خوب کرو۔ برابر کرو لیکن غلام بن کر نہیں، کوئی شخص بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ کام کئے بغیر تو چارہ ہی نہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ فی صد نوّے انسان غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں جس کا خمیازہ یہ اٹھانا پڑتا ہے کہ لوگ طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا رہتے ہیں آپ پوچھیں گے کہ غلامانہ کام سے میری مُراد کیا ہے؟ میں ہر اُس عمل کو غلامانہ سمجھتا ہوں جس میں خود غرضی کا مادّہ شامل ہو۔ عام طور پر دنیا میں جتنا بھی کام ہو رہا ہے اس میں ذاتی غرض شامل ہے۔ کام کرنا ہو تو آزادی سے کرو کام وہی ہے جس سے محبت ٹپکتی ہو۔ لفظِ محبت کے معنی سمجھنا بہت مشکل ہے سچی محبت آزادی سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں آزادی نہیں وہاں محبت کہاں۔ ایک غلام کے دل میں سچی محبت کا جذبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے اگر آپ کوئی غلام خرید لیں اور اس کو زنجیروں سے جکڑ کر کام لیں تو وہ بیل کی طرح جُتا رہے گا لیکن اُس کے دل

---

[1] The whole of Nature is for the Soul, not the Soul for the Nature.

میں محبت شمہ بھر بھی نہ ہوگی اس لئے جب ہم دنیوی ساز و سامان کے لئے غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں ہم میں محبت کا جذبہ ذرا بھی نہیں ہوتا۔ جو کام بھی ہم کرتے ہیں وہ صحیح معنوں میں کام نہیں ہوتا خواہ وہ کام اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے لئے کیا جائے خواہ وہ اپنے لئے۔ اصولی بات تو یہ ہے کہ جس کام میں غرض شامل ہے وہ کام نہیں۔ غلامی ہے کسی کام کو پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے۔ محبت سے جو کام کیا جاتا ہے اس سے مسرت حاصل ہوتی ہے اور محبت کا کوئی ایسا کام نہیں ہوتا جس سے امن و سکون نہ حاصل ہو۔ محبت کے ہر کام میں برکت شامل ہوتی ہے۔ حقیقی وجود حقیقی علم اور حقیقی محبت ہستی کے یہ تینوں اجزا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں۔ دراصل یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں جہاں ایک جز موجود ہے وہاں دوسروں کا بھی ہونا لازمی ہے یہ ایک لاشریک اور لاثانی ہستی کے تین پہلو ہیں اسی کو ست چت آنند کہتے ہیں یہ حقیقی وجود حقیقی علم اور حقیقی سرور کا مجموعہ ہے۔ جب یہ حقیقی وجود اضافی ہو جاتا ہے تو عالمِ شہود بن جاتا ہے اور یہ حقیقی علم دنیوی باتوں کے علم کی صورت اختیار کر لیتا اور حقیقی آنند یا سرور محبت کی ان تمام حسین کیفیتوں میں نمودار ہوتا ہے جن سے قلبِ انسانی اب تک آشنا ہے ظاہر ہے کہ محبت کی بنیاد اگر سرورِ ازلی ہے تو محبت کا کوئی ردِ عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے عاشق یا معشوق کو کسی قسم کا دکھ یا رنج پہونچے دکھ اور درد تو محبت سے نہیں خود غرضی سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی ایسے شخص کو دیکھئے جسے اپنی محبوبہ سے والہانہ محبت ہو۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کی چہیتی عورت صرف اسی کی ہو کے رہے۔ وہ اس پر ہر لمحہ انتہائی رقیبانہ نظر رکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کی محبوبہ صرف اسی کے پاس بیٹھی رہے اسی کے پاس کھڑی رہے اور اسی کے اشارے پر چل کر کھائے پئے اور چلے پھرے۔ ایسا شخص خود ہی اپنی محبوبہ کا غلام بن جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی وہ محبوبہ بھی صرف اسی کی حلقہ بگوش ہو کر رہے۔ اسے محبت نہیں کہتے ہیں تو اسے ہرگز محبت نہیں کہوں گا۔ یہ تو ایک غلامانہ ذہنیت کا مرض ہے جس نے محبت کا بہروپ بھر رکھا ہے۔ اس تعلقِ خاطر کو کسی طرح سے بھی محبت نہیں کہا جا سکتا جس میں حسد شامل ہو جس میں دردِ دل کے اٹھنے کا امکان ہو۔ اگر ایسے عاشق کی محبوبہ اس کی معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں کرتی تو اس سے اس کو اذیت ہوتی ہے۔ سچی محبت میں کوئی ردِ عمل ایسا نہیں ہوتا جو اس طرح تکلیف دہ ثابت ہو محبت کا ردِ عمل تو ہمیشہ آنند یا مسرت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ محبت محبت نہیں ہوتی ایسی صورت میں ہم غلطی سے کسی اور چیز کو محبت سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر اپنے خاوند اپنی بیوی اپنے بچوں اور ساری دنیا ہی نہیں بلکہ سارے عالمِ کائنات کے ساتھ آپ کی محبت اس صورت سے کامیاب ہے کہ اس کے ردِ عمل سے آپ کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہونچتی۔ آپ کے دل میں کسی قسم کی رقابت کا جذبہ نہیں بھڑکتا۔ خود غرضی کا احساس بھی نہیں ہوتا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی رسائی اس مقام پر ہو گئی ہے جہاں بے تعلق ہو کر پورے انہماک کے ساتھ زندگی کی جا سکتی ہے۔ جہاں آزاد عمل کی شدت تو ہے لیکن غلامانہ کام کی بندش نہیں۔ جہاں محبت کی گرمی تو ہے لیکن وابستگی کی جلن نہیں بھگوان

کرشن نے گیتا میں فرمایا ہے" ارجن ۔ میری طرف دیکھو۔ اگر میں ایک لمحے کے لئے بھی کام کرنا چھوڑ دوں تو یہ سارا برھمانڈ سارا عالمِ کائنات فنا ہو جائے ۔ مجھے کام کا کوئی ثمرہ نہیں حاصل کرنا ہے ۔ میرے سوا اور کوئی مالکِ کُل نہیں پھر مجھے کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ؟ اگر میں کام کرتا ہوں تو فقط اسی لئے کہ مجھے دنیا سے محبت ہے ۔ تو دیکھا آپ نے بے تعلق اور بے لوث ہونے کے کیا معنی ہیں ۔ دراصل بے لوث وہی ہو سکتا ہے جسے سچّی بے غرضانہ محبت کرنا آتا ہو جو خود پرماتما کی طرح ذرّے ذرّے سے محبت کرتا ہو ۔ کرم یوگ کے راستے سے ہمیں پرماتما کے مقام پر پہونچنا ہے ۔ حقیقی محبت ہی ہمیں بے لوث بناتی ہے یاد رکھیئے جہاں وابستگی ہے ۔ جہاں اوّل دنیا سے لوث ہے وہاں محبت کے بجائے مادے کے کچھ اجزاء کے مابین ایک قسم کا طبعیاتی اور جسمانی ربط ہے ایک ایسی کشش ہے جو ہر وقت دو اجسام کو ایک دُوسرے سے زیادہ قریب لانے میں کوشاں ہے لیکن انہیں ملا نہیں سکتی ۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ مکمل تقرب حاصل نہیں ہوتا تو درد کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ بخلاف اس کے سچّی محبت کا انحصار مادّی اور جسمانی ربط وضبط ہی پر نہیں ہوتا ۔ سچی محبت کرنے والے چاہے ایک دُوسرے سے ہزاروں میل دُور ہوں پھر بھی ان کا جذبہ محبت برابر قائم رہتا ہے اسی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ۔ ایسی محبت کبھی فنا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا ردِّ عمل ہوتا ہے جو درد اور اذیت کا باعث ہو ۔

اس طرح کی بے لوثی کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں اس کے لئے ایک عُمر درکار ہے لیکن جوں ہی ہمیں عدم وابستگی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے ہماری رسائی محبت کی آخری منزلِ مقصود تک ہو جاتی ہے اور ہم ہر قید سے آزاد ہو جاتے ہیں ۔ قدرت نے ہمارے پیروں میں غلامی کی زنجیر ڈال رکھی ہے وہ ٹوٹ جاتی ہے ہم کو قدرت اپنے اصلی رُوپ میں نظر آنے لگتی ہے اب وہ ہمیں کسی زنجیر سے نہیں جکڑتی ہم بالکل آزاد ہو جاتے ہیں اور کرموں کے پھل کا ہمیں خیال بھی نہیں آتا ۔ اب کرموں کے پھل کی پرواہی کون کرتا ہے ۔

اگر آپ اپنے بچوں کو کوئی چیز دیتے ہیں تو کیا ان سے اس کا معاوضہ طلب کرتے ہیں ؟ ہر گز نہیں ۔ آپ یہی سمجھتے ہیں نا کہ ان کی خاطر کام کرنا آپ کا فرض ہے اور بس میں آپ کو یہی رائے دوں گا کہ آپ اپنے دُوسرے کاموں میں بھی یہی رویّہ اختیار کریں اگر آپ کسی شخص یا کسی شہر یا حکومت کے لئے کچھ کام کر دیتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ آپ اپنی اولاد کے لئے کام کر رہے ہیں اس کے عوض میں کسی معاوضے کی توقع نہ رکھیئے اگر آپ اپنی ہر چیز کو بلا معاوضہ دینے کی عادت ڈال لیں ۔ اگر آپ کی زندگی کا اصول اور عمل بلا معاوضہ کام کرنے کا ہو جائے تو پھر دنیا کا کوئی بھی کام آپ کو کسی قسم کے بندھن میں نہیں ڈال سکے گا ۔

آپ ہر کام سے بے لوث ہو جائیں گے ۔ بندش اور وابستگی کا سوال وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں کام کے معاوضے کی توقع ہوتی ہے ، جہاں اپنی مرضی اور خوشی سے بغیر کسی توقع اور امید کے کام کیا جائے وہاں بندھن کا

کیا سوال؟ اگر غلاموں کی طرح کام کرنے سے خود غرضی اور وابستگی پیدا ہوتی ہے تو آزادانہ کام کرنے کا نتیجہ اُس آنند کی شکل میں برآمد ہوتا ہے جو بے لوثی یا عدم وابستگی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اکثر حق و انصاف کی باتیں کرتے ہیں لیکن دراصل یہ گفتگو محض طفلانہ ہے، دُنیا میں جن چیزوں سے آدمی کے کردار اور شعار کی تکمیل ہوتی ہے وہ ہیں طاقت اور رحم۔ طاقت سے کام لینا ہمیشہ خود غرضی سے کام لینے کے مترادف ہوتا ہے ہر مرد اور عورت کو دُنیا میں تھوڑا بہت اختیار حاصل ہے، ہر شخص اس سے زیادہ سے زیادہ فائدے اُٹھانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ رحم تو سراپا جنت ہوتا ہے۔ نیک بننے کے لئے ہمیں رحم دل بننا پڑتا ہے۔ دراصل رحم ہی کو حق اور انصاف کی بنیاد بنانا چاہئے حق و انصاف کے معنی اگر مناسب معاوضہ کے لئے جائیں اور اگر ہم معاوضے کے خیال سے کام کرنے لگیں تو اس سے ہماری رُوحانی ترقی رُک جائے گی اور صرف یہی نہیں ہماری زندگی بھی بالآخر وبال جان ثابت ہو گی۔

اگر ہم دلیل اور قوت ارادی کی مدد سے بے تعلق رہ کر کام نہیں کر پاتے تو بے غرضانہ کارِ خیر کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ہم ہر کام خدا کی پرستش سمجھ کر انجام دیں اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم تشخصی خدا میں ایمان رکھتے ہوں جب ہم کام کو پرستش کا مرتبہ دینے میں کامیاب ہوتے ہیں تو اپنے کرموں (اعمال) کے پھل کو بھگوان کے ارپن یعنی خدا کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس طرح خدا کی پرستش کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا کوئی حق نہیں رہتا کہ جو کچھ کام ہم کر رہے ہیں اس کے معاوضے کی توقع دُنیا سے کریں جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہمارا معبود ہر وقت بے لوث کام میں مصروف ہے اور اُسے گھڑی بھر بھی آرام نہیں تو ہم اس کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں اور بے تعلق ہو کر کام میں جُٹ جاتے ہیں جس طرح پانی کنول کے پتے کو بھگو نہیں سکتا اسی طرح کرم یعنی کام بے غرض اشخاص کو پھل کی خواہش کے بندھن میں نہیں ڈال سکتا۔ بھلا جس شخص نے اپنی خودی ہی کو مٹا ڈالا ہو اور جو کسی بات سے ملوث ہی نہیں ہوتا ہو اس کو ثواب و گناہ سے کیا واسطہ وہ جنگل میں رہے تو آزاد ہے اور شہر کی عصیاں آلود فضا میں رہے تو پاک و صاف ہے مکمل ذاتی ایثار کی ایک اعلیٰ مثال مہابھارت کی اس کہانی میں ملتی ہے۔ جب کوروکشیتر کی لڑائی ختم ہو گئی تو پانچوں پانڈوں نے ایک بہت بڑا یگیہ کیا اور غریبوں کو بہت دان دیا۔ اس یگیہ کی عظمت اور شان و شوکت دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے اور کہنے لگے کہ اس سے پیشتر اتنا بڑا یگیہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا لیکن جب یگیہ کی تمام رسمیں ختم ہو گئیں تو اتفاقیہ طور پر کہیں سے چھوٹا سا نیولا نکل آیا جس کا آدھا بدن سنہری اور آدھا بھورے رنگ کا تھا۔ یہ نیولا آ کر یگیہ شالہ کے فرش پر لوٹنے لگا کچھ دیر بعد وہ ان لوگوں سے جو وہاں موجود تھے یوں مخاطب ہوا "آپ سب لوگ جھوٹ بولتے ہیں" "یہ یگیہ تو یگیہ ہی نہیں ہے" لوگ اس کی بات سُن کر چلا اُٹھے "کیا کہا تم نے" "کیا یہ یگیہ کوئی یگیہ ہی نہیں ہے کیا تمہیں خبر نہیں کہ اس یگیہ میں تو نجانے کتنا روپیہ پیسہ اور نہ جانے کتنے ہیرے جواہرات غریبوں پر لٹائے گئے ہیں ہر شخص مالا مال ہو گیا ہے، اور یہاں سے خوش خوش واپس گیا ہے۔ اتنا حیرت انگیز یگیہ تو شاید ہی آج تک کسی

انسان نے سرانجام دیا ہو" نیولے نے جواب میں کہا کہ "ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک برہمن اپنی بیوی۔ اپنے لڑکے اور اُس کی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ لوگ بہت غریب اور مُفلس تھے اور اُن کی بسراوقات اس دان پر ہوتی تھی جو ان کو درس و تدریس کے سِلسلے میں ملا کرتا تھا۔ اتفاق سے اس مُلک میں یکایک قحط پڑ گیا جو تین سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں غریب برہمن کو بہت مصیبت اٹھانا پڑی یہاں تک کہ ایک بار مسلسل کئی روز تک ان لوگوں کے مُنہ میں ایک دانہ بھی نہیں پڑا۔ آخر کار بے چارہ غریب باپ کہیں سے تھوڑا سا جَو کا آٹا لے آیا اس نے اُس آٹے کے چار حصّے کئے اور ایک ایک حصّہ چاروں میں بانٹ لیا اس آٹے سے انہوں نے روٹی تیار کی لیکن ابھی وہ کھانا شروع ہی کرنے والے تھے کہ کسی نے آ کر دروازے پر دستک دی۔ باپ نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سامنے ایک مہمان کھڑا ہوا ہے۔ ہندوستان میں مہمان کو بڑے تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کو دیوتاؤں کا درجہ دیا جاتا ہے اور اس کی آؤ بھگت بھی دیوتاؤں کی سی ہوتی ہے۔ اس غریب برہمن نے مہمان سے فوراً کہا "آیئے۔ مہاراج پدھاریئے۔ آپ کا آنا تو خوب ہوا" یہ کہتے ہوئے اس نے مہمان کے سامنے اپنے حصّے کا کھانا رکھ دیا۔ مہمان نے کھانا جلدی جلدی کھا لیا اور پھر کہا "ارے بھائی تم نے تو مجھے مار ڈالا۔ میں دس روز کے فاقے سے ہوں اور یہ جو تھوڑا سا کھانا تم نے مجھے کھلایا ہے اس سے تو میری بھوک اور بھی بڑھ گئی ہے"۔ اس پر بیوی نے شوہر سے کہا "انہیں میرے حصے کا کھانا دیدیجئے" لیکن خاوند نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بیوی نے اصرار کیا اور کہا کہ "یہ غریب آدمی ہے اور بطور گرہستھی ہمارا یہ دھرم ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا پیٹ پل جائے چونکہ آپ کے پاس اب اس غریب کو دینے کے لئے کچھ رہا نہیں اس لئے آپ میرے حِصّے کا کھانا اس کو کھلا دیں"۔ چنانچہ اس نے بھی اپنے حصے کا کھانا اس مہمان کو کھلا دیا مگر مہمان کی سیری اُس سے بھی نہ ہوئی اور اس نے کہا "میری بُھوک تو اور بڑھ گئی پیٹ کی آگ اور بھی تیزی سے بھڑک اٹھی ہے" اب برہمن کے لڑکے نے کہا "پتا جی اس غریب کو میرے حصے کا بھی کھانا کھلا دیجئے" ایک بیٹے کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے باپ کی ادائیگی فرائض میں مدد دے" مہمان نے اُس لڑکے کا حِصّہ بھی کھا لیا لیکن اس سے بھی اُس کی بُھوک نہ مٹی تو لڑکے کی بیوی نے بھی اس کو اپنے حِصّے کا کھانا پیش کر دیا اسی سے مہمان کا پیٹ بھر گیا اور وہ سب کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا لیکن فاقے کی وجہ یہ چاروں پرانی چل بسے۔ آٹے کا کچھ چُورا زمین پر گر پڑا تھا۔ میں جو اس زمین پر لوٹا تو جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں میرا آدھا جسم سونے کا ہو گیا اس کے بعد میں اس خیال سے تمام دُنیا کا چکر لگا رہا ہوں کہ کہیں قربانی کی ایسی کوئی نظیر مل جائے تو میرا بقیہ جسم بھی سونے کا ہو جائے میں نے بہت سر مارا لیکن مجھے ایسی قربانی کی کوئی نظیر اور نہیں ملی اور اسی لئے کسی بھی دُوسری جگہ میرا باقی نصف جسم سونے کا نہ ہو سکا۔ اس خیال سے میں کہتا ہوں کہ یہ یگیہ

تو اصل میں یگیہ ہی نہیں ہے۔" آپ نے دیکھا یہ ہے ہندوستانی ایثار اور جرأت کا بلند معیار۔ میں جانتا ہوں کہ اب اس قسم کے خیالات کچھ کچھ ہندوستان سے بھی رخصت ہو رہے ہیں اس بلند ترین معیار پر پورے اترنے والے بڑے آدمیوں کی تعداد روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے لیکن ہمارے یہاں اب بھی ایثار اور جرأت کا آدرش کافی اونچا ہے۔ جب میں نے انگریزی تعلیم شروع کی تھی تو اپنی انگریزی کی ایک کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک فرض شناس لڑکا جب برسر روزگار ہو گیا تو اس نے اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اپنی بوڑھی ماں کو نذر کر دیا اُس کے اسی عمل کی تعریف میں تین چار صفحہ لکھ دیئے گئے تھے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آخر اس قصّے سے کیا سبق اخذ کرنا مقصود تھا اور سچ پوچھئے تو اس کا مطلب کسی ہندوستانی بچے کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ تو یہی سوچتا رہ جائے گا آخر اس میں کیا بڑی بات ہوئی کہ لڑکے نے اپنی کمائی کا کچھ حصّہ ماں کو پیش کر دیا۔ اس کے لئے تو ایسا کرنا محض قدرتی بات ہے اب جو میں نے دیکھا کہ مغربی شعار کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کا وجود خود اُسی کے لئے ہوتا ہے تو میری سمجھ میں آ گیا کہ اس کہانی سے ہمیں کیا نصیحت دینا مطلوب تھا بعض لوگ اس حد تک خود غرض ہوتے ہیں کہ وہ ہر چیز کو اپنے ہی لئے مخصوص کر لینا چاہتے ہیں بس خود ہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ انہیں ماں باپ بھائی بہن اور بیوی بچوں کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ کرم یوگ کے آدرش سے بہت دُور ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اب آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کرم یوگ کیا چیز ہے۔ مرتے دم تک بغیر حیل و حجت کے اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت اور مدد کے لئے وقف کر دینا ہی کرم یوگ ہے لوگ آپ کو دھوکا دیتے ہیں تو دینے دیجئے ایک نہیں لاکھ بار دھوکا کھائیے لیکن حرفِ شکایت لب پر نہ آنے پائے کبھی بھول کر بھی یہ نہ سوچئے کہ آپ نے خدمت و ایثار کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے خاموشی سے کام کئے جائیے اپنی خیرات اور سخاوت کا ذکر تک نہ کیجئے اگر آپ کسی غریب کو کچھ دے پائے ہیں تو اس میں بڑائی کی کون سی بات ہے اس پر اترانے کی چنداں ضرورت نہیں اس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا سخت معیوب ہے میں تو کہوں گا کہ کسی کا کام کر کے اُس سے شکریہ کی اُمید تک نہ رکھیئے معاوضے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا بہرحال اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سچے کرم یوگی کی زندگی سچے سنیاسی سے زیادہ بلند نہیں تو کم از کم اُس کے برابر تو ضرور ہے۔

ویدانت کا مشن

کمبھ کونم[1] تشریف لے جانے پر سوامی جی کی خدمت میں حسبِ ذیل ایڈریس وہاں کے مقامی ہندوؤں کی طرف سے پیش کیا گیا۔

پُوجیہ سوامی جی۔

مغربی دُنیا سے اپنے اس مقدّس مُلک۔ مندروں کی اس عظیم الشّان دھرتی اور سنتوں اور مہاتماؤں کی اس جنم بھُومی میں آپ کی وَاپسی پر ہم کمبھ کونم کے اس قدیم اور اہم تیرتھ کے ہندو باشندوں کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ امریکہ اور یورُوپ میں جو کامیابی آپ کو اپنے مِشن میں ہوئی ہے اُس کے لئے ہم پرمَاتما کے بے حد شُکر گزار ہیں اسی کے لُطف وکرم سے آپ نے بڑے بڑے مذاہب کے اُن نمائندوں پر جن کا اجتماع شکاگو میں ہوا تھا یہ حقیقت کھول دی ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی فلسفے میں اسکی وسیع المشربی۔ معقول پسندی اور ہمہ گیری کے بَاعث اتنی قدرت ہے کہ خدا اور رُوحانیت سے متعلق تمام آدرشوں اور نظریوں میں بلندی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہزاروں سَال سے ہمارا یہ عقیدہ رہا ہے کہ سچّائی کا محافظ ہمیشہ پرمَاتما ہوتا ہے جس کے دم سے یہ تمام کائنات زندہ ہے جو اس عالم شہود کی رُوحِ رواں ہے۔ وہی حقیقت کا رکھوالا ہے۔ آپ کی کامیابی سے ہمارے اس ایمان کو تقویت پہونچی ہے۔ آج ہم عیسائی ممالک میں آپ کے مقدس کارناموں کے نتائج کو دیکھ کر بہت مسرور ہیں۔ آج ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر لوگوں

---

[1] Kumbhakonum.

کی آنکھیں کھُل گئی ہیں اور وہ ہندو قوم کی رُوحانی وراثت کی بے اندازہ قدروقیمت سے واقف ہوگئے ہیں۔ ہماری قوم شروع ہی سے مذہب کی دیوانی رہی ہے۔ آج ہم اس بات پر فخر کرسکتے ہیں کہ ہمارا لگاؤ ہمیشہ سے مذہب اور رُوحانیت کے ساتھ رہا ہے۔ آج ہم یہ دیکھ کر بھی خوش ہیں کہ آپ کے گرامی منزلت مُرشد (گرُو) کے مشہورِ زمانہ نام کو جو آب وتاب پیشتر سے حاصل ہے آپکے کارناموں کی کامیابی نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کی بدولت متمدّن دنیا کی نگاہ میں ہمارا مرتبہ اور بھی زیادہ بلند ہوگیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے خود ہمارے دِلوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہم بھی اپنے گزشتہ زمانے کی تکمیلات پر ناز کرنے میں حق بجانب ہیں نیز یہ کہ ہماری تہذیب میں جارحیت کا نہ ہونا اس بات کی علامت ہرگز نہیں ہے کہ یہ تہذیب ختم ہوگئی ہے یا اس میں کسی قِسم کا انحطاط پیدا ہوگیا ہے۔ ہمارے درمیان آپ ایسے صاف نظر۔ لگن رکھنے والے اور خود غرضی سے قطعی طور پر بیگانہ کام کرنے والوں کا موجود ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ ہندو قوم کا مستقبل بھی شاندار ہی ہوگا۔ ہماری دُعا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ وہ ربّ العالمین جس کے دَم سے یہ تمام کائنات پیدا ہے اور جس کی بدولت تمام اقوامِ عالم زندہ ہیں آپ کو تندرستی اور درازی عمر عطا فرمائے اور ہندو مذہب کے ایک مایۂ ناز فاضل معلّم کی حیثیت سے آپ کو اپنے بلند اور شاندار فرائض کی انجام دہی کے لئے روز بروز زیادہ سے زیادہ توانائی اور دانائی بخشے۔

کمبھ کونم کے ہندو طلبا کی طرف سے بھی سوامی جی کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس موقع پر سوامی جی نے جو تقریر "ویدانت کا مِشن" کے موضوع پر فرمائی، وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے

"گیتا میں لِکھا ہے کہ دھرم کے تھوڑے کام سے بھی بڑے بڑے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ گیتا کے اس بیان کی تصدیق خود میری ناچیز زندگی سے ہوتی ہے۔ میں نے جو تھوڑا سا کام کیا ہے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن کولمبو سے اس شہر تک جس نوازش اور خلوص دل سے میرا خیر مقدم کیا گیا ہے اس کی کوئی حد ہی نہیں۔ میں ذاتی طور پر ہرگز اس قدر عزت افزائی کا مستحق نہیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہندو قوم کی شاندار گزشتہ روایات ابھی تک زندہ ہیں۔ آپ نے ایک معمولی سنیاسی کے لئے یہ جو سب کچھ کیا ہے وہ ہماری قوم اور نسل کے شایانِ شان ہے۔ آپ نے دُنیا کو دکھا دیا کہ ہم مَر نہیں گئے ہندو قوم ابھی تک زندہ ہے اور اپنے ساتھ اپنے مذہب اور روحانی فلسفے کی عظمت اور شان کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آج بھی ہماری قوت

حیات - ہمارا جوہرِ زندگی اور ہماری رُوح مذہب اور رُوحانیت ہی میں سموئی ہوئی ہے۔

میں نے کسی حد تک تمام دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے مشرق اور مغرب کے مختلف ممالک کا سفر کیا ہے اور اس سفر کے دَوران میں مختلف اقوام کا تھوڑا بہت مشاہدہ بھی کر پایا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر قوم کا ایک مخصوص آدرش ہے جو اُس کی زندگی کا محرک ہے جو اس قوم کی پشتِ پناہ ہے بعض قوموں کا نصب العین ہے سیاست اور بعض جماعتی ثقافت کو اپنا آدرش سمجھتی ہیں بعضوں کا مطمحِ نظر ذہنی تربیت ہے اور اسی طرح ہر قوم کا ایک نہ ایک جُداگانہ پس منظر ہوتا ہے لیکن ہماری اس جنم بھوُمی میں ہماری قومیّت کی اساس اس کی پُشتِ پناہ اور اس کی زندگی کی تمام تعمیر کا سنگِ بنیاد دی دھرم اور محض دھرم ہے۔

آپ میں سے بعض حضرات کو یاد ہوگا کہ مدراس واسیوں نے جو نوازش آمیز ایڈریس مجھے امریکہ بھیجا تھا اس کے جواب میں میں نے اس بات کا ذکر خاص طور پر کیا تھا کہ ہمارے مُلک کا ایک معمولی اَن پڑھ کسان بھی مذہب کے معاملے میں مغرب کے اونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے لوگوں کے بمقابلہ کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ آج جب ہر جگہ لوگ بھاری تعداد میں مجھ جیسے سنیاسی کا خیر مقدم کرنے آتے ہیں تو میرے اس بیان کی اور بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مذہب ہی ہماری قوم کا واحد محرّک ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اپنے دیش کے عوام میں علم اور آگہی کی کمی کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوتی تھی اپنے ہم وطنوں کے دِلوں میں علم حاصل کرنے کی خواہش نہ پا کر مجھے بہت دُکھ ہوتا تھا۔ لیکن اب صورتِ حالات میری سمجھ میں آگئی ہے۔ جن معاملات سے لوگوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ انھیں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خواہش اُن کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے مُلک میں لوگوں کو مذہب اور روحانیت سے دلچسپی ہے۔ اِسی لئے ان کی معلومات کا تعلق بھی زیادہ تر مذہب ہی سے ہوتا ہے اس معاملے میں وہ ان تمام ممالک سے آگے ہیں جن کا سفر میں ابھی تک کر پایا ہوں۔ یوروپ میں جو ہنگامی سیاسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ وہاں کے سماج میں جو ہلچل مچی ہوئی ہے اس کے متعلق ہمارے وطن والوں کو خصوصاً دُور افتادہ گاؤں کے کسانوں کو کچھ معلوم نہیں اور نہ اُن کو اُن باتوں کے جاننے کی کوئی خواہش ہی ہے۔ لیکن ہندوستان تو ہندوستان ہے لنکا کے کسانوں کو بھی مذہبی معاملات سے اچھی خاصی واقفیت ہوتی ہے وہ ہم سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور اُن کو ہندوستان کے معاملات سے بالعموم کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اس بات کا علم انھیں بھی تھا کہ امریکہ میں ایک بین الاقوامی مذہبی[1] کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس میں شرکت

[1] Parliament of Religions.

کے لئے ایک ہندوستانی سنیاسی گیا ہوا ہے اور اس کو وہاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ جن معاملات میں ہم ہندوستانیوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اُن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق دوسری قوم والوں کے بمقابلہ ہم میں کہیں زیادہ ہوتا ہے اور اگر ہمیں کسی چیز سے دلچسپی ہے تو وہ صرف مذہب ہے۔ مجھے یہاں اِس بات سے بحث نہیں کہ قوموں کی قوتِ حیات کے اظہار کے لئے مذہبی آدرش بہتر ہوتے ہیں یا سیاسی نصب العین لیکن جہاں تک ہماری قوم کا تعلق ہے۔ ہماری قوتِ حیات صرف ایک چیز میں مرکوز ہے اور وہ ہے مذہب۔ بُری یا بھلی جیسی بھی ہے۔ بہرحال یہ ہماری خاصیت ہے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اِسے بدل نہیں سکتے۔ اس قومی آدرش کو مٹا کر اسکے بجائے کوئی دوسرا نصب العین ہم اپنا نہیں سکتے قوموں کے آدرش تناور درختوں کی مانند ہیں۔ آپ ایک بھاری درخت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاکر نہیں لگا سکتے وہ دوسری جگہ جڑ نہیں پکڑ سکتا۔

بھلا بُرا جیسا بھی ہے دھارمک آدرش یا مذہبی نصب العین کا سلسلہ ہمارے دیش میں ہزاروں سال پہلے سے چل رہا ہے اور ہندوستانی فضا نہ جانے کتنی تابناک صدیوں سے مذہبی آدرشوں کے نور میں غرق ہے۔ ہماری پیدائش انھیں آدرشوں کے ماحول میں ہوئی ہے ہم انھیں آدرشوں کے سائے تلے پلے پوسے اور پروان چڑھے ہیں۔ مذہب ہمارے خون میں ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا ہے۔ ہماری ترکیب اور ساخت میں مدغم ہو گیا ہے اور ہماری زندگی کی قوت نامیہ بن گیا ہے۔ کیا آپ ایسے مذہب کو ترک کر سکتے ہیں کیا آپ اِس رُوحانی دریا کا رُخ بدل سکتے ہیں جو ہماری زندگی میں ہزاروں سال سے بہتا چلا آتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ گنگا اپنے برفانی منبع میں واپس ہو کر ایک نیا راستہ نکال لے۔ بالفرضِ محال ایسا ممکن بھی ہو پھر بھی اس مُلک کے لئے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اپنی مذہبی زندگی کے امتیازی اور مخصوص راستے کو ترک کر دے اور اپنے لئے سیاسیات یا اقتصادیات وغیرہ کی جدید راہ اختیار کرے اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش بھی کریں گے تو ہمارے اس عمل سے ردِعمل کی ایسی زبردست طاقت پیدا ہو جائے گی جو ہماری تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ زندگی کم سے کم مدافعت کے قانون کے تحت چلتی ہے اور ہندوستان میں اس قانون کے عمل نے مذہبی صورت اختیار کر رکھی ہے یہاں قومی زندگی کا طریقہ عمل یہی ہے۔ اِسی پر ہماری خوش حالی کا دارومدار ہے۔ ہم رُوحانیت کی شاہراہ پر چل کر ہی اپنی منزل پر پہونچ سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں جہاں زندگی کی اور بہت سی ضروریات ہیں۔ وہاں مذہب کو بھی ان ضروریات میں شامل کرلیا

گیا ہے مثال کے طور پر گھر کی مالکہ اپنے گول کمرے میں بہت سی چیزیں سجاوٹ کے لئے لگا رکھتی ہے جیسے جیسے فیشن بدلتا جاتا ہے۔ نئی چیزیں آتی ہیں اور پرانی نکال دی جاتی ہیں اگر جاپانی گلدستے کا فیشن چل پڑا تو اس معزّز خاتون کو اس وقت تک چین نہیں آتا جبتک ایک ایسا گلدستہ ہاتھ نہیں آجاتا اس گلدستے کے بغیر اُس کو اپنی نشست گاہ بے رونق معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح سماج میں رہنے کے لئے جہاں اور چیزوں کا حاصل کرنا لازمی ہے وہاں تھوڑی سی لاگ مذہب کی بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لوگوں کی زندگی کے اور بھی بہت سے مشاغل ہیں۔ مذہب اس مشغولیت کی تکمیل کا سامان مہیا کرتا ہے۔ دُنیاوی مقاصد کے حاصل کرنے میں خدا اور روحانیت کے تصوّر کو ممدّ و معاون بنا لیا جاتا ہے۔ گویا مغرب میں سیاسیات اور سماجی ارتقا کے کام کاج زندگی کا اصل مقصد سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہاں صرف خارجی زندگی ہی پر زور دیا جاتا ہے دُنیاوی ترقی اور مادّی چیزوں کے حاصل کرنے کو ہی زندگی کا نصب العین سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک مذہب اس مقصد کے حصول میں مدد دے سکتا ہے وہاں تک لوگ مذہب کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ ان کے لئے خدا سماجی یا انفرادی آرائش کا سامان ہے یا زیادہ سے زیادہ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس کا کام یہ ہے کہ زندگی کے گول کمرے کو صاف ستھرا رکھے اور اس کے لئے نئے ساز و سامان مُہیا کرتا رہے۔ ان کی نگاہ میں خدا کی صرف اتنی ہی قدر و قیمت ہے۔ اس کا ثبوت خود مغربی مفکروں مُصنفّوں اور سیاست دانوں وغیرہ کی تقریروں اور تحریروں میں ملتا ہے۔ شاید آپ جانتے ہیں یہ عالم و فاضل لوگ جن کی معلومات بد قسمتی سے نہایت محدود ہیں۔ پچھلے دو سو سال سے ہمارے مذہب پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ہمارے خلاف یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ اس مذہب سے دُنیا کی فلاح و بہبود کی صُورت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے دھن دولت پیدا کرنے کی تحریک نہیں ہوتی یہ ہمیں دوسروں پر سبقت لے جانے کی تعلیم نہیں دیتا۔ دوسروں کو غلام بنانا نہیں سکھاتا یہ ہمیں طاقت اور توانائی بخشنے سے قاصر ہے۔ اس کے بجائے یہ ہمیں کمزور اور بُزدل بناتا ہے (یا یوں کہئے کہ یہ ہمیں دوسروں کی چھاتی پر چڑھ کر اُن کا خُون چوسنے سے باز رکھتا ہے) ہمیں بھی اِس بات سے کب انکار ہے کہ ہمارا مذہب واقعی اِن باتوں کی تعلیم نہیں دیتا یہ سچ ہے کہ ہمارے مذہب نے آج تک ہمیں یہ اجازت نہیں دی کہ دوسری قوموں کو تباہ و برباد کر کے اور ان کا مال و متاع لُوٹ کر اپنا گھر بھر لیں۔ ہمارے مُلک سے آج تک ایسے ظالم لیٹرے اور قزّاق نہیں اُٹھے جن کے خوف سے زمین کانپ جاتی ہو۔ اِس لئے ہمارے مذہب میں رکھا

ہی کیا ہے۔ اس سے نہ کوئی کام نکلتا ہے نہ کوئی مقصد پورا ہوتا ہے نہ اعصاب کو توانائی ملتی ہے اور نہ پیٹ بھر کر کھانے کا سامان مہیا ہوتا ہے مغرب کے یہ سیانے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اسی بات پر تو ہم اپنے مذہب کی عظمت کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ یہی تو دلیل ہے جس سے ہم اپنے مذہب کی اہمیت ثابت کرتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمارا مذہب دنیا داری کی تعلیم نہیں دیتا اس میں تو ترک کا عنصر غالب ہے۔ لیکن وہ مذہب ہی کیا جو محض دنیوی مقاصد کے حاصل کرنے کا وسیلہ بن کر رہ جائے۔ مذہب تو نام ہی اس طریق عمل کا ہے جو ہمیں مشاہدہ و تجربہ کی محدود دُنیا سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ہمارا ہی مذہب صحیح معنوں میں مذہب ہے، کیونکہ اس کے مطابق حواس کی یہ چھوٹی سی اور چند روزہ دنیا ہی ہمارا سب کچھ نہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کی غایتِ عظیم کچھ اور ہے۔ ہماری نگاہ میں صرف ہماری خاکی زندگی ہی۔ ہماری عنصری حیات کی آخری منزل نہیں ہے جہاں پہونچ کر ہمارے مذہب کی فلک شگاف نگاہ رک جاتی ہے ہماری نظر تو دُور بہت دُور تک جاتی ہے اس کی وسعتیں حواس کی حدود کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ مکان و زماں سے بھی آگے نکل جاتی ہے اور آخر کار ہماری نظر اس ارضی اُفق کے ماورا کچھ اس طرح پہونچ جاتی ہے کہ پھر دُنیا کی کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی۔ تمام کائنات کی ہستی مٹ سی جاتی ہے۔ اور تمام عالم شہود کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔ بس ہمارا ہی مذہب صحیح معنوں میں مذہب ہے، کیونکہ ہمیں اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ سچی ذات صرف خدا کی ذات ہے یہ دُنیا جھوٹی ہے اس کا قیام چند روزہ ہے۔ یہ دھن دولت یہ زر و جواہرات سب خاک برابر ہیں یہ تمام دُنیاوی طاقتیں جن پر ہمیں اس قدر ناز ہے۔ نہایت محدود ہیں۔ فانی ہیں۔ بسا اوقات ہماری زندگی بھی بذاتِ خود ایک عذاب ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ہمارا ہی مذہب سچا مذہب ہے۔

اگر مذہب یہ نہیں سکھاتا اگر مذہب بھی محض دُنیا داری کی تعلیم دیتا ہے تو وہ مذہب کے بجائے کوئی اور چیز ہے اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب سچا مذہب ہے۔ کیونکہ اس سے ہم کو ترک و ایثار کا سبق ملتا ہے۔ اس مذہب کو ہمارے اسی ہندوستان کے بزرگوں نے دریافت کیا تھا۔ یہی وہ سناتن دھرم ہے جس کی قدامت اور جس کے تقدس کا سب کو اعتراف ہے جس کے دامن میں صدیوں کی آگہی ہے جو اپنے خدا رسیدہ رشیوں اور مُنیوں کے اِس پیغام کا علم بردار ہے جو اُنھوں نے مسلسل ترک و ریاضت سے حاصل کیا تھا۔ آج یہی سچا اور پرانا مذہب نئی نسلوں اور جوان قوموں سے علی الاعلان یہ کہتا ہے "میرے بچو" تم تو حواس کے غلام بن رہے ہو۔ یہ حواس قطعاً محدود ہوتے

ہیں اوران سے بربادی کے سوااور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ عیش وعشرت کا یہ مختصر زمانہ انجام کارتباہی کا باعث ہوتا ہے۔ان سب باتوں سے کنارہ کش ہوجاؤ۔ حواس کی محبت کوخیرباد کہہ دو۔اِس دُنیا سے پیار کرنا چھوڑ دو"۔ تیاگ یا ترک ہی ہم کو ہماری منزل تک پہونچانے کا واحد راستہ ہے۔ دینوی لذّات کی سیری سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ صرف ترک کا مذہب صحیح معنوں میں مذہب ہے۔

اور دیکھئے یہ بھی کتنی عجیب وغریب بات ہے کہ اس دُنیا کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنی قومیں آئیں۔ اُنھوں نے چند لمحوں تک اپنا پارٹ بڑے زور وشور سے اَدا کیا اور پھر صفحۂ ہستی سے اس طرح سے نابود ہوگئیں کہ وقت کے سمندر کی سطح پر ان کی ایک چھوٹی سی لہر بھی اُٹھتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ دُنیا میں ان کا ایک نقش بھی باقی نہیں رہ گیا۔لیکن ہم ہیں کہ ابھی تک موجود ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی دوامی ہے۔ "آخر کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری" آج کل مغرب میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ زندگی کی جدوجہد میں جوسب سے زیادہ قابل اور موزوں ہے اسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے[1]۔ اِس قسم کے جدید نظریوں کے متعلق مغربی قومیں بڑھ بڑھ کے باتیں بَارا کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ جس کی رگوں اور جس کے پٹھوں میں توانائی ہے صرف اسی میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر اس قول میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو دُنیا میں مار دھاڑ کرنے والی جتنی قومیں پچھلے زمانے میں گزری ہیں وہ آج بھی نہایت شان وشوکت سے زندہ ہوتیں اور ہم ہندوستانی جنہیں ساری دُنیا کمزور اور ناتواں قرار دیتی ہے اور جنہوں نے کبھی کسی دوسری نسل کو فتح کرنے کی کوشش نہیں کی کب کے نیست ونابود ہوچکے ہوتے۔ لیکن ہم آج تک تیس کروڑ کی تعداد میں زندہ ہیں۔موجود ہیں۔ ایک نوجوان انگریز خاتون نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا ہندوؤں نے کیا ہی کیا ہے کبھی کسی قوم کو فتح تک نہیں کیا"۔ آخر اگر زندہ رہنے کا حق صرف اُنھیں لوگوں کو ہے جو زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ تو پھر یہ کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی قوم کی تمام طاقتیں زائل ہوچکی ہیں۔ اس کا جسم مفلوج ہوگیا ہے۔ یادرکھئے کہ ہم میں ابھی تک زندہ رہنے کی کافی طاقت موجود ہے۔ اورجب وقت سازگار ہوتا ہے اوراس کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ طاقت طوفان بن کرساری دنیا کو تہ آب کر دیتی ہے۔

---

[1] Survival of the fittest.

ہماری ساری طاقت ہمارے فلسفۂ حیات میں مضمر ہے جس کا اعلان ہم قدیم ترین زمانے سے کرتے آئے ہیں۔ مغرب میں لوگوں کا اندازِ فکر ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ساز و سامان کس طرح مہیا کیا جا سکتا ہے؟ بس ایک مسئلہ ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے کہ انسان کے عیش و آرام کے لئے اس کے سرمائے میں کس طرح اضافہ کیا جائے برعکس اس کے ہم اس مسئلے کو حل کرنے میں کوشاں رہے ہیں کہ انسان کم سے کم سرمائے سے اپنی زندگی کیونکر بسر کر سکتا ہے اس کی ضروریات میں کمی کیونکر کی جا سکتی ہے۔ مشرق و مغرب کے ان متضاد نظریوں میں یہ تفاوت کئی صدیوں تک تک جاری رہے گی لیکن اگر کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے اور اگر تاریخ کسی بات کی شہادت دے سکتی ہے تو وہ یہ صداقت ہے کہ بالآخر فتح انھیں لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنی ضروریات کو کم سے کم کر لیتے ہیں اور اپنے آپ پر ضبط کرنا سیکھ لیتے ہیں جو قومیں عیش و عشرت کے پیچھے سرگرداں رہتی ہیں۔ اُن کے بھی جوانی کے دن ضرور آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب اُن کی طاقت اور توانائی پورے زوروں پر ہوتی ہے لیکن یہ قوتیں آخر کار مٹ جاتی ہیں۔ انسان کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ قوموں کی تاریخ میں بھی ایک ایسا بھی وقت آتا ہے۔ جب دُنیا سے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ یہ احساس بُری طرح سے دل پر غالب آجاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کی طبیعت دُنیا سے اب کچھ اُکتا سی گئی ہے۔ اور وہاں ایسے بڑے بڑے مفکّر پیدا ہو گئے ہیں جو یہ کہنے لگے ہیں کہ زر اور زور کی تلاش ایک محض بیکار بات ہے اور یہی نہیں بلکہ مغرب کے اکثر شائستہ مرد اور عورتیں اپنی تاجرانہ تہذیب کی مقابلہ آرائی اور کش مکش سے تنگ آچکے ہیں۔ اور اب کسی بہتر چیز کے لئے چشم براہ ہیں۔ ایک طبقہ ایسا ہے جو ابھی تک سمجھتا ہے کہ یورپ میں جتنی بھی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کا واحد علاج سیاسی اور سماجی تغیّر ہے۔ لیکن بڑے بڑے مفکروں کے سامنے سماجی اصلاح سے زیادہ بلند کچھ اور بھی آدرش ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تہذیب کے موجودہ دَور میں سماجی اور سیاسی ردّ و بدل سے بنیادی خامیاں دُور نہیں ہو سکتیں۔ وہ سمجھنے لگے ہیں کہ برائی نیکی ہی سے ہٹ سکتی ہے۔ زندگی کی خرابیاں روحانی ترقی ہی سے دُور ہو سکتی ہیں۔ جابرانہ حکومت کے جبر و تشدّد اور سخت قوانین سے کسی قوم کی حالت بدل نہیں سکتی۔ صرف رُوحانی اور اخلاقی ثقافت ہی کے ذریعہ قوموں کے رجحانات میں ایسی تبدیلی ہو سکتی ہے جس سے اس کی حالت بہتر ہو جائے۔ اِسی لئے تو مغرب کی یہ قومیں اب کسی جدید خیال اور کسی نئے فلسفے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ خود ان کے اعلیٰ اور شاندار مذہب یعنی عیسائی دھرم

ہیں اُن کے مرض کا علاج موجود ہے لیکن وہ آج تک اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں پائے اور جو معنی اُنھوں نے مذہب کے سمجھ رکھے ہیں وہ ان کی تسلّی کے لئے ناکافی ہیں۔ مغرب کے اُن مفکروں کو ہمارے قدیم فلسفے اور خاص طور پر ویدانت میں خیال کی وہ نئی تحریک نظر آتی ہے جس کی انھیں مدّت سے تلاش تھی۔ ان کو اس میں وہ روحانی غذا ملتی ہے جس سے اُن کی بھوک کے مٹنے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اِس سرچشمہ سے انھیں وہ آبِ حیات ملتا ہے جس سے اُن کی روحانی پیاس دور ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ کیونکہ ویدانت ہی روحانیت کا وہ ازلی اور ابدی سرچشمہ ہے جو تمام عالم کی روحانی پیاس کو دُور کر سکتا ہے۔ دُنیا میں جتنے بھی مذاہب جاری ہیں سب کے سب اپنی اپنی جگہ عالم گیر ہونے کا دعوے کرتے ہیں اور میں اس قِسم کے بڑے بڑے دعوٰوں کو سننے کا عادی ہو چکا ہوں۔ جو آج کل لوگ اپنے اپنے مذہب کی حمایت میں پیش کرتے ہیں آپ نے بھی اُن دعووں کے بارے میں سُنا ہوگا۔ مثلاً میرے دوست ڈاکٹر بیروز (Barrows) کا دعوے ہے کہ صرف عیسائی دھرم ہی عالم گیر مذہب ہے اور کسی دوسرے مذہب کو اس قدر عالم گیر ہونے کا شرف حاصل نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ہر مذہب کی عزّت سچے دل سے کرتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ سب مذاہب برابر ہیں۔ سب سچے ہیں اور ایک ہی خدا کا راستہ دکھاتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ویدانت اور محض ویدانت ہی وہ مَسلک ہے جو عالم گیر ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے مذہب میں یہ صلاحیت نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ویدانت کے علاوہ دُنیا کے قریب قریب تمام بڑے بڑے مذہبوں کا تعلق اُن کے بانیوں کی زندگی سے رہا ہے۔ ان مذاہب کی عمارت ایک اعلیٰ شخصیت کی بنیاد پر کھڑی ہوئی ہے۔ ان کے نظریات ان کی تمام تعلیمات ان کے تمام اُصول اور تمام اخلاقیات کا سرچشمہ ان کے بانیوں کی ذات ہوتی ہے۔ اور ان نظریات و تعلیمات کا ثبوت ان کے بانیوں کے احکامات ہوتے ہیں۔ ان کی سند میں شخصی اقوال پیش کئے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان مذاہب کی صداقت کا انحصار ایک خاص شخص کی تاریخی حقیقت پر ہوتا ہے اور اگر بد قسمتی سے اِن بانیانِ مذہب کی مستند حیثیت کو ذرا سی بھی ٹھیس پہونچ جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایجاد کردہ مذہب کی ساری عمارت گری جا رہی ہے۔ زمانۂ حال میں قریب قریب ہر مذہب کے بانیوں کے سلسلے میں کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے۔ آج کل ان کی زندگی کی نصف تفصیلات پر بھی لوگ سنجیدگی سے یقین نہیں لاتے اور بقیہ نصف تفصیلات کو تو مشکوک اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ نکلا ہے کہ مذہب کے ان بانیوں کی مستند حیثیت

متزلزل ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے مذہب کی منزلت بہت بڑی حد تک کچھ اس طرح نابود ہو گئی ہے کہ دوبارہ ہاتھ نہیں آسکتی۔

تو آپ نے دیکھا کہ ویدانت کے علاوہ ہر مذہب کی عمارت تاریخی کرداروں پر تیار ہوئی ہے لیکن ہمارے مذہب کا دارومدار تو اُصول پر ہے ویدوں کی تخلیق کسی شخص کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ وید تو اُن دوامی اُصولوں کا مجسمہ ہیں جنھیں ہمارے رشیوں منیوں نے دریافت کیا۔ عموماً ہمیں ان مہاتماؤں کے نام تک معلوم نہیں۔ البتہ کہیں کہیں کچھ ناموں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ہمیں ان مہاتماؤں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ مہاتما کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ اُن کے آبا و اجداد کا تو ذکر ہی کیا۔ خود ان کے متعلق بھی ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے اُنھوں نے اپنے متعلق کچھ معلومات نہیں چھوڑیں۔ اُنھیں اپنے نام و نمود کی کوئی پروا بھی نہ تھی وہ تو بس ازلی اُصولوں کی تبلیغ کیا کرتے تھے اور اُن میں خوبی یہ تھی کہ جن اُصولوں کی وہ اشاعت کرتے تھے حتیّٰ الامکان خود بھی ان پر عمل پیرا ہو کر ایک مثال قائم کر دیتے تھے اور اس طرح اپنے اُصولوں کو مجسّم بنا دیتے تھے تو ویدانت کی پہلی خصوصیت یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد اُصولوں پر قائم ہے کسی مہاتما یا پیغمبر کی شخصیت پر نہیں۔ اُس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دائرہ مسلک میں بے شمار مہاتماؤں اور پیغمبروں کی گنجائش ہے جس طرح ویدانت کا پرماتما یا خُدا نراکار یعنی غیر متشکل ہو کر بھی ساکار یعنی متشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے مسلّمہ اصولوں اور نہایت درجہ غیر شخصی ہونے کے باوجود مذہب میں شخصیات کے اظہار کی بھی لامحدود گنجائش ہوتی ہے۔ بھلا ہندو مذہب کے علاوہ اور کس مذہب میں اتنے زیادہ اوتار پیغمبر اور نبی ہوئے ہیں۔ اور اب بھی ہم ایسی عظیم ہستیوں کی آمد آمد کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ بھاگوت کا ارشاد ہے کہ اوتاروں کی تعداد لا محدود ہوتی ہے اور یہ اوتار پیغمبر سینت اور مہاتما ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں اور آئندہ بھی ضرور پیدا ہوں گے اور ہوتے رہیں گے۔ ویدانت اور دوسرے مذہبوں میں فرق یہ ہے کہ دوسرے مذاہب پیغمبر یا اوتار کی معرفت ظہور میں آتے ہیں۔ لیکن ہماری رُوحانیت کے اُصول اٹل ہیں۔ لافانی ہیں۔ اُن کا اظہار وقتاً فوقتاً سنتوں اور مہاتماؤں کی مقدس ہستیوں سے ہوتا ہے۔ اور یہ اوتار اور پیغمبر ہمارے اُصولوں کی زندہ مثال قائم کرتے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی دوسرے مذہب کے بانی کی ہستی کو تاریخی شہادت نہ میسر آئے تو اُس مذہب کو صدمہ پہونچتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہمارے ایک نہیں بیسیوں اوتاروں اور مہاتماؤں کے متعلق تاریخی ثبوت نہ مل سکے تو بھی ہمارے مذہب کو

کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ کیونکہ اگر وہ نہیں تو نہ سہی ایسے دوسرے سینکڑوں اوتار اور مہاتما ہوئے ہیں جنہوں نے ہمارے مذہبی اصولوں کو اپنی زندگی میں مجسّم کر دکھایا اور ان کی صداقت کو اپنے عمل اور کردار سے ثابت کر دیا ہے۔ ویدانت ہر حالت میں بدستور قائم رہتا ہے کیونکہ اس کا دار و مدار کسی خاص شخص کی ہستی پر نہیں۔ اس لئے اگر کوئی مذہبی نظام عالمگیر ہو سکتا ہے تو وہ ویدانت ہے۔ یہ کوشش کرنا بے سود ہے کہ تمام دنیا کے لوگ کسی خاص اوتار یا پیغمبر کی ہستی پر ایمان لے آئیں۔ جب لوگوں کو دوامی اور عالمگیر اصولوں کے مرکز پر یک جا کرنا بھی جوئے شیر لانے کے برابر ہو تو ایسی کوشش کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر کبھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں انسانوں کو مذہب کے متعلق ایک ہی اندازِ فکر سے وابستہ کرنا ممکن بھی ہو تو بھی یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ سعادت شخصیتوں کے ذریعہ نہیں صرف اُصولوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے اور یہ ذریعہ صرف ویدانت مہیا کر سکتا ہے جس کی بنیاد ازلی اصولوں پر ہے لیکن جس میں رشیوں مہاتماؤں پیغمبروں اور اوتاروں سب کے لئے کافی گنجائش ہے۔ جو لوگ روحانی ارتقا کی ان منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ جہاں غیر مرئی اُصولوں کو سمجھنا مشکل ہے اور جہاں کسی خاص مذہبی رہنما پر ایمان لائے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ ان کے لئے ویدانت نے شخصی پُوجا کا راستہ کھول رکھا ہے۔ یہاں بنیادی اُصولوں کو ترک کئے بغیر ہر شخص اپنے مخصوص اور محبوب رُوحانی رہنما پر ایمان لا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں اشٹ دیو کا لاجواب نظریہ ہے جس کے مطابق آپ کو اپنے لئے دنیا کی عظیم مذہبی شخصیتوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔ اس معاملے میں آپ ہر طرح سے آزاد ہیں۔ آپ جس پر چاہیں ایمان لے آئیں۔ آپ کسی پیغمبر کو اپنا مرشد یا راہنما یا اپنا خاص معبود بنا سکتے ہیں۔ ویدانت میں آپ کو اس بات کی بھی آزادی ہے کہ جس ہستی کو آپ نے اپنی عبادت کے لئے منتخب کیا ہے اُسے باقی تمام پیغمبروں اور اوتاروں سے بڑا مانیں اس کو درجے میں برتر سمجھیں اسمیں کوئی ہرج نہیں واقع ہوتا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اُن بنیادی اور ازلی اُصولوں کے پس منظر کو نظر انداز نہ کریں جن کی بدولت یہ مذہبی نظام قائم ہیں جن کی مثال اپنی زندگی میں پیدا کرنے ہی سے اوتاروں اور پیغمبروں کو وہ اعلیٰ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں لوگ ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کم از کم ہمارے مذہب یعنی ویدانت میں اوتاروں کی قدر اس لئے ہوئی ہے کہ وہ ویدوں کے اُصولوں کی عملی مثال ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ کسی نئے مت کے بانی ہیں۔ بھگوان کرشن کی عظمت کا راز دراصل یہی ہے

کہ اُنھوں نے ویدوں کے سناتن دھرم کا پرچار کیا۔ خود اپنا کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا۔ اُنھوں نے ان اُصولوں کی تبلیغ کی جو دوامی ہیں۔ اُنھوں نے ویدانت کی بہترین تفسیر کی جو ان اُصولوں پر مبنی ہے اور اس کا عملی ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ اسی لئے آج ہم بھگوان کرشن کی پُوجا کرتے ہیں۔ ویدانت کو دُنیا کے عالم گیر مذہب ہونے کا حق اس وجہ سے بھی حاصل ہے کہ اس کی تعلیم اُن نتائج کے عین مطابق ہے جو دورِ حاضرہ کی سائنسی تحقیقات سے حاصل ہوئے ہیں۔ اگر انسانی ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ماضی کے دُھندلکے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ کی نشو و نما اور ارتقا ایک دوسرے سے ملتے ہوئے لیکن علیحدہ علیحدہ دو طریقوں سے ہونے لگی تھی آہستہ آہستہ انسان کی طبیعت کا رجحان کہیں خارجی ہوگیا اور کہیں داخلی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک جان نے دو قالب اختیار کرلئے اور آدمی دو زمروں میں منقسم ہوگئے۔ ان رُجحانات کی اصل اور ہیئت ایک ہے لیکن ان کی راہ جدا جُدا ہوگئی۔ داخلی رُجحان کی سب سے اعلیٰ مثال ہند و دماغ ہے اور خارجی رُجحان کا بہترین نمونہ یونانی دماغ ہے۔ اِس عالم کائنات کی حقیقت کے تجسس میں ہندوؤں نے آغازِ تاریخ سے ہی داخلی دُنیا کا تجزیہ کرنا شروع کردیا تھا اور یُونانیوں نے اپنی توجہ خارجی دُنیا کی جانب مبذول کردی تھی — دونوں ملکوں کی ان خیالی لہروں کی جو صدائے بازگشت منزلِ مقصود سے اُٹھی وہ یکساں نکلی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مختلف نتائج پر پہونچے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس حقیقت کی تلاش میں انسانی تخیل کی دو لہریں مختلف سمتوں میں منتشر ہوگئی تھیں۔ بالآخر دونوں اسی ایک حقیقت کا پتہ دے رہی ہیں۔ آج کل کی سائنس کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ مختلف سمتوں سے آئی ہوئی یہ دونوں لہریں حقیقت کی نادیدہ چٹان سے ٹکراتی ہیں تو ان میں یکساں طور پر ارتعاش پیدا ہوتا ہے یکساں آوازِ بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ دورِ حاضرہ کی مادّی سائنس کی تحقیقات کے نتائج اور فلسفۂ ویدانت کے نظریئے ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں ہندو اور یونانی دماغ مختلف راستوں سے چل کر پھر ایک نقطے پر مل رہے ہیں۔

سائنس کے نتائج کو دوسرے مذہب قبول نہیں کرسکتے ہاں ویدانت انھیں بخوشی تسلیم کرتا ہے کیونکہ اس کے اپنے فلسفۂ حیات اور سائنس کے اُصولوں میں کسی قِسم کا بھی تضاد نہیں اس طرح زمانۂ حال کی سائنس اپنے نظریات پر قائم رہ کر بھی ویدانت کے فلسفے کو قبول کرسکتی ہے۔ کیونکہ جو لوگ اہلِ نظر ہیں ان کو تو اس حقیقت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں نظر آتی کہ موجودہ زمانے میں سائنس

ـــ خارجی دُنیا کے تجربات سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ آج سے ہزاروں سال پہلے ویدانت نے داخلی دُنیا کے مشاہدے سے برآمد کرلئے تھے۔ فرق صرف طرزِ بیان کا ہے۔ موجودہ سائنس نے ان نتائج کا اظہار ریاضیات کی زبان میں کیا ہے اور ویدانت نے اظہارِ مطلب کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ فلسفے کی زبان ہے اِس لحاظ سے بھی ویدانت مغرب کے مفکروں اور سائنس دانوں کی توجہ کا مستحق ہے کیوں کہ سائنس اور ویدانت دونوں کی بُنیاد معقولات پر ہے۔ دونوں میں عقل و استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ مغرب کے بعض بہترین سائنسدانوں نے خود مجھ سے کہا ہے کہ ویدانت کا فلسفہ حیرت انگیز طور پر مُدلّل ہے جسے عقل قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان میں ایک ایسے صاحب کے متعلق مجھے ذاتی علم ہے کہ ان کو کھانا کھانے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا اور وہ اپنی تجربہ گاہ سے باہر کم ہی جاتے تھے لیکن جو گھنٹوں کھڑے ہو کر ویدانت پر میرے لکچروں کو سنتے رہتے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ لیکچر بے حد سائنٹیفک ہوتے ہیں۔ ان سے زمانۂ حال کے لوگوں کے دل و دماغ کی تسلی ہوتی ہے۔ کیونکہ جن اُصولوں پر میں زور دیتا ہوں وہ عصرِ جدید کے سائنسی نظریوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر میں آپ کی خدمت میں دو مذہبی نظریوں کا سائنٹیفک پہلو پیش کرتا ہوں مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل کے تقریباً تمام مذاہب دو اُصولوں پر زور دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مذہب یا رُوحانیت کا ثنائی ہے اور دوسرے یہ کہ اس تمام کثرت کے پسِ پشت وحدت جلوہ گر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں اُصول وجود میں کیونکر آئے۔ بابل اور اہلِ یہود کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے باشندے اور اہلِ یہود دونوں کئی قبیلوں میں منقسم تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا ایک جداگانہ خدا (معبود) تھا۔ اِن سب چھوٹے چھوٹے خداؤں کا ایک مشترکہ بُنیادی نام اور اپنا اپنا ایک مخصوص کام ہوتا تھا۔ بابل والوں کے اِن خداؤں کا مشترکہ بنیادی نام بال[1] تھا۔ اور اِن سب میں ممتاز ہستی تھی۔ بال میروداق[2] جسے معبود کا معبود سمجھا جاتا تھا۔ اِس لحاظ سے وہ دیوتاؤں کا دیوتا تھا۔ یہ قبیلے ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو جیت کر اپنے میں جذب کرتا گیا۔ آخر کار ایک قبیلہ باقی سب پر غالب آگیا چونکہ یہ سب قبیلے نسلی طور پر ایک دوسرے سے مختلف نہیں تھے۔ اِس لئے آپس میں کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان سے ایک قوم بذاتِ خود پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح قبیلے کا دیوتا دوسرے قبیلے کے دیوتاؤں پر سبقت لے گیا اور اس کا درجہ سب دیوتاؤں سے زیادہ بلند قرار دیا گیا۔ سامیوں[3] کے اُس عقیدۂ وحدانیت

لہ[1] Baal. لہ[2] Merdock. لہ[3] Semites.

کی حقیقت جس پر وہ اس قدر فخر کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح یہودیوں میں ان قبائلی دیوتاؤں کو مولوق[۱] کہتے تھے
ان دیوتاؤں میں ایک دیوتا مولوق[۲] یہوہ یا مولوق اہاوا نام کا تھا۔ اس کا تعلق فرقہ اسمٰعیلیہ سے تھا
جب اِس اسمٰعیلیہ قبیلے نے اپنے ہم نسل دوسرے قبیلوں کو جیت لیا تو ان کا فاتح مالوق ہارے ہوئے قبیلوں
کے مولوقوں سے نسبتاً کسی قدر زیادہ ممتاز قرار دیا گیا۔ اور اُسے مالوق اعظم کا درجہ دیا گیا۔ آہستہ آہستہ
لوگ دوسرے مالوقوں کو بھُول گئے اور صرف ایک مالوق یہوہ کی ہستی پر اعتقاد لے آئے اِس طرح
واحد خُدا کا نظریہ وجود میں آیا۔ بعد میں بابل والوں نے مولوق یہوا کی برتری کو ختم کرنا چاہا۔ لیکن
اُن کو اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی وحدانیت کی اس ارتقا کے دَوران میں کس قدر
خوں ریزی ہوئی۔ کتنے مظالم ڈھائے گئے اور کتنی بے رحمی کے ساتھ وحشیانہ درندگی کا اظہار کیا گیا
اس سے آپ اصحاب واقف ہیں۔

اور یہ خوُن آلود ارتقائی طریقہ دوسرے ممالک میں بھی کام کرتا رہا اور میرا خیال ہے کہ قبائلی
خانہ جنگی اور مذہبی جارحیت ہندوستان میں بھی ضرور شروع ہوئی ہوگی۔ یہاں بھی اپنے دیوتاؤں کی
برتری کو تسلیم کرانے کے لئے مختلف قبیلوں میں باہم تصادم ہوا ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی سے ہندوستان کی
تاریخ کو کچھ اور ہی رُخ اختیار کرنا تھا۔ اس کو یہودیوں کی تاریخ سے مختلف ہونا تھا۔ دُنیا بھر کے تمام
مُلکوں میں صرف ہندوستان کو روا داری اور روحانیت کی جنم بھُومی ہونے کا فخر میسر آنا تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ یہاں کے مختلف قبیلوں اور اُن کے دیوتاؤں کے درمیان کشمکش زیادہ عرصے تک نہیں رہی
ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی قبائلی خانہ جنگی کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان
نے اُمن و آشتی کا سبق اُس زمانہ بعید ہی میں سیکھ لیا تھا جو اَب تک تاریخ کی دسترس سے باہر ہے اور
جس کی تاریکی پر روایت بھی کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔ اُس زمانے میں بھی رُوحانیت کی اس جنم بھُومی
سے ایک ایسا عالی مقام رشی پیدا ہوا جس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہزاروں سال
پہلے اس عظیم ہستی نے اس حقیقت کا اعلان ان شاندار الفاظ میں کیا تھا۔ ایکم سد وپرا بہو دھا بدنت[۳]
एकं सद् विप्रा बहुधा वदन्ति یعنی وہ جو موجود ہے اس کی ہستی واحد ہے دانا اسکو
مختلف ناموں سے پُکارتے ہیں۔

---

[۱] Molock. [۲] Moloc Yehva.

[۳] He who exists is one. Sages call Him variously.

دُنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے اِنسان کئی قابل یادگار باتیں کہہ گئے ہیں لیکن آج تک جو کچھ بھی لکھا یا کہا گیا ہے کئی لحاظ سے یہ فقرہ سب پر بھاری ہے۔ دُنیا میں انسان نے کئی شاندار صداقتوں کا انکشاف کیا ہے لیکن یہ وہ لازوال صداقت ہے جس کا درجہ نہایت بلند ہے اور جس کا مقام نہایت اعلیٰ اور متبرک ہے ہم ہندوؤں کے لئے تو یہ حقیقت ہمارے قومی وجود کی پشت و پناہ رہی ہے۔ ہماری صدیوں پُرانی قومی زندگی یقیناً اس خیال سے بھرپور ہے۔ ہزاروں سال پہلے ایکم سدِ وِپرا بہودھا ودنت एकम सद् विप्रा बहुधा वदन्ति کی حقیقت ہماری قوم پر نازل ہوئی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ طاقت زور پکڑتی اور پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ ہماری قوم کی رگ و پے میں پیوست ہوگئی۔ اوائل تاریخ سے لے کر آج تک ہماری قوم کے کردار کو اس حقیقت کی طاقتِ محرکہ نے تشکیل دیا ہے اور آج بھی اِس کا اثر ہمارے خون میں سرایت کر گیا ہے حتےٰ کہ یہ آدرش ہم میں رِل گیا اور ہم اس آدرش میں گم ہوگئے اور "مُن تو شدم تو مَن شدی" کا مصداق بن گئے۔ اس عظیم آدرش سے ہمیں والہانہ عشق ہے۔ اس کی محبت ہماری رگ رگ میں دَوڑ رہی ہے اور ہمارا مُلک مذہبی رواداری کا نہایت شاندار نمونہ بن گیا ہے۔ صرف یہی وہ مُلک ہے جہاں کے باشندے اُن لوگوں کے ساتھ بھی رواداری برتتے ہیں۔ جو ہمارے مُلک میں آکر ہمارے ہی مذہب کو بُرا بھلا کہتے رہے ہیں اور اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں یہ ہمارا ہی مُلک ہے۔ جہاں ایسے لوگوں کا آنا نہ صرف گوارا کیا جاتا ہے بلکہ یہاں تو ہم خود ہی اُن کی عبادت گاہوں اور گرجا گھروں کی تعمیر میں اُن کی مالی امداد بھی کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ہیں جو مذہبی رواداری کے اس گراں پایہ اُصول پر عمل کرتے آئے ہیں۔ آج دُنیا ہم سے اس کا سبق لینے کے لئے منتظر ہے۔

غالباً آپ کو اِس بات کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے دوسرے ملکوں میں کس قدر تعصب برتا جاتا ہے۔ رواداری کا تو وہاں کہیں ذکر ہی نہیں۔ میں نے مغربی ممالک میں مذہبی رواداری اور یک جہتی کا پیغام دیا۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ سب مذہب سچے ہیں۔ میں نے کسی سے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر کے ہندو مذہب اختیار کر لے۔ پھر بھی بسا اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اِن مغربی مُلکوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا بس چلتا تو مجھے قتل کر دیتے جان سے مار دیتے مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ مذہب کے نام پر قتل کر دینا تو جیسے ان مُلکوں میں کوئی بڑی بات ہی نہیں ہے۔ وہاں تو قتل و غارت ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں یہاں تک کہ وہاں فی زمانہ بھی ایسی خوں ریزی غیر ممکن نہیں۔ مغرب والوں کو اپنی تہذیب پر ناز ہے یہ لوگ ہمارے ملک میں

اگر بڑے زور و شور سے ہمارے مذہب پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ہمارے قوانینِ ذات کے خلاف تقریریں کرتے پھرتے ہیں اور ہمارا مضحکہ اُڑاتے ہیں لیکن خود اُن کے اپنے مُلکوں میں اگر کوئی شخص اپنے تسلیم شدہ مذہب کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی جرأت کرتا ہے تو اُس کو بڑی بُری طرح ذات برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو مغربی ممالک میں جانے کا موقع ملے تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں عوام تو عوام بڑے بڑے مفکّر اور پروفیسر بھی اس معاملے میں اس قدر بُزدل واقع ہوئے ہیں کہ رائے عامہ کے خوف سے مذہبی موضوعات پر مروّجہ اعتقادات کے خلاف کوئی بات زبان پر لانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے خواہ ذاتی طور پر اُن کی رائے میں وہ بات کتنی ہی حق بجانب کیوں نہ ہو اسی لئے میں کہتا ہوں کہ دُنیا رواداری کے اس عظیم الشان تصوّر کا نہایت بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہی ہے جس پر ہم زمانۂ بعید سے عمل کرتے آئے ہیں۔ اس تصوّر سے مذہب کو ایک بہت بڑی نعمت میسّر آجائے گی اور کسی بھی تہذیب کا وجود اُس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جب تک یہ تصوّر اس میں داخل نہ ہو جائے۔ کسی قوم کی بھی نشوونما اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں تعصب۔ مذہبی دیوانگی خوں ریزی اور درندہ خصلتی کا سدِّباب نہ ہو جائے۔ کوئی تہذیب اس وقت تک فخر کے ساتھ اپنا سر اونچا نہیں کر سکتی جب تک لوگ ایک دوسرے کو ہمدردی کی نظر سے نہ دیکھنے لگیں اور اس جذبۂ ہمدردی کے پیدا کرنے کے لئے۔ جس کی دُنیا کو اس قدر ضرورت ہے۔ ہمیں سب سے پہلے ایک دوسرے کے مذہبی نظریات اور معتقدات کی عزت کرنا ہوگی خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ انھیں سچے دل سے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ بلکہ قبول بھی کرنا ہوگا۔ پھر محض ہمدردی کے جذبات سے گزر کر حقیقی معنوں میں دوسروں کی مدد کرنا پڑے گی۔ اس دیس (ہندوستان) میں ہمارا طرزِ عمل ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ ہم نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے گرجا گھر اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے ہمارے ساتھ نفرت کا برتاؤ کیا۔ ہم پر ظلم و تشدّد روا رکھا۔ ہمیں بے دردی سے بُرا بھلا کہا۔ لیکن ہم نے ہمیشہ اُن کی نفرت کا جواب محبّت ہی سے دیا اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ آخر کب تک کوئی محبّت کے مقابلے میں ٹھہر سکتا ہے۔ محبت تو سب کو جیت لیتی ہے۔ محبّت اور ہمدردی ہی وہ آبِ حیات ہے۔ جس سے زندگیِ جاوید حاصل ہوتی ہے۔ نفرت۔ ظُلم و تشدّد اور درندہ خصلتی یہ سب باتیں زندگی کو کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ خلوص اور محبّت سے زندگی پھولتی پھلتی ہے۔ اور پروان چڑھتی ہے۔

مذہبی رواداری اور خلوص و محبّت کے ساتھ ساتھ دنیا کو روحانی وحدت کے عظیم الشان

تصوّر کی بھی سخت ضرورت ہے اور اس کا سبق بھی صرف ہمیں دے سکتے ہیں۔ آج یوروپ اور امریکہ میں وہاں کا پڑھا لکھا اور سمجھ دار طبقہ اپنی دماغی تسلّی کے واسطے اس قسم کی فلسفیانہ رہنمائی کے لئے چشم براہ ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دُنیا کے ہر طبقے کو اس سچی رُوحانیت کی تلاش ہے جو مختلف مذہبی رسم و رواج سے بالاتر ہو۔ اعلیٰ درجے کے لوگوں سے زیادہ ادنیٰ درجوں کے لوگوں کو شائستہ اور متمدّن اشخاص سے زیادہ عوام النّاس کو۔ تعلیم یافتہ طبقوں سے زیادہ اَن پڑھوں کو اور تواناؤں سے زیادہ کمزوروں کو ایک ایسا جاں بخش رُوحانی فلسفہ درکار ہے جس سے ان کی عملی زندگی پُرمعنی ہو جائے اور وہ ہے دوامی اور شاندار تصوّر تمام عالم کائنات کی رُوحانی وحدت یا یکتائی کا۔ مجھے مدراس یونیورسٹی کے طلبا کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح زمانۂ حال کی مغربی تحقیقاتوں نے مادّی وسائل کے ذریعہ تمام عالم کائنات کی وحدت اور سالمیت کا ثبوت بہم پہونچا دیا ہے۔ آج علم طبیعات نے دکھا دیا ہے کہ آپ اور میں اور دوسرے جاندار۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ جنگل۔ پہاڑ۔ یہ سب چیزیں مادّے کے بے پایاں سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں ہیں۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی علم نفسیات نے قرنوں پہلے یہی بات عملی طور پر ثابت کر دکھائی تھی کہ ہمارے جسم اور دماغ (شریر اور من) مادّے یا سمشٹی[1] کے سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں ہیں جنھیں ہم مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں حقیقت دراصل ایک ہے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ویدانت نے یہ بتا دیا ہے کہ اس مادّی وحدت کے پس پشت جسے ہم نے کثرتِ تماشا سے اخذ کیا ہے۔ درحقیقت ایک رُوحِ اعظم کارفرما ہے۔ وہ پرماتما ایک ہے۔ واحد ہے۔ عالم کائنات میں اسی ایک رُوح کی جلوہ گری ہے۔ یہ سب محض ایک ہی وجود کا سلسلہ ہے۔ اس بات کو سمجھنا مشکل نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس عظیم تصوّر سے خود ہمارے مُلک میں بھی اکثر اشخاص گھبرا جاتے ہیں کہ یہ تمام دُنیا حقیقی اور بنیادی طور پر ایک ہی حقیقت کا کرشمہ ہے اور یہاں بھی اس خیال کے مؤیدوں کے بمقابلہ اس کے مخالفوں کی تعداد زیادہ ملتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہی وہ حیات بخش تصوّر ہے جو ہم سے آج دنیا کو مطلوب ہے اور جس کا مطالبہ ہندوستان کے خاموش اور بے زبان عوام اپنی اُٹھان اپنی ترقی کے لئے ہم سے کر رہے ہیں کیونکہ تمام اشیائے عالم کی وحدت کے اس تصوّر کو عملی شکل دیئے بغیر اور مؤثر طور پر بروئے کار لائے بغیر ہمارے مُلک میں دوبارہ زندگی کی لہر پیدا کرنا مشکل ہے۔

---

[1] Samashti.

(اہلِ مغرب کی معقولیت پسندی کا تقاضا ہے کہ نظریۂ وحدت الوجود کی پوری تحقیقات کی جائے) مغرب کے مفکّر جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی فلاسفی اور اس کے اخلاق کی عمارت بنیادی طور پر کہاں تک عقل و منطق پر منحصر ہے۔ آج کل یہ ماننے کے لئے تو کوئی تیار نہیں کہ اخلاقیات کسی ایک شخص کے احکام بجالانے سے وجود میں آتی ہیں کوئی بھی شخص کتنے ہی عظیم اور ربّانی اوصاف کا حامل کیوں نہ ہو اس کی ہر بات اخلاقی حکم کا درجہ نہیں رکھتی۔ اخلاقیات کے جواز سے متعلق اس قسم کی وضاحت سے دُنیا کے بلند مقام اور روشن خیال مفکّروں کی تسلّی نہیں ہوتی۔ اُن کی نظر میں اخلاقی قوانین اور ضوابط کی پابندی کے لئے محض یہی کافی نہیں کہ کسی مذہبی راہب نے ایسا کرنے کے لئے کہا ہے۔ ان کا تو مطالبہ یہ ہے کہ ان تمام اخلاقیات کا جواز ثابت کرنے کے لئے حقیقت کا کوئی دوامی اُصول پیش کیا جائے جس سے ان تمام پابندیوں کی وضاحت ہو سکے جس کی بنا پر انسان اپنی مرضی سے اخلاقی زندگی بسر کرے اور اخلاقیات میں مجبوری کا شائبہ تک نہ رہے میرے خیال میں تو اخلاقیات کا بنیادی اُصول فلسفۂ وحدت الوجود ہی ہو سکتا ہے۔ اخلاق کا جواز تو صرف وہ بے پایاں حقیقت ہے جو آپ میں اور مجھ میں اور ہر جاندار میں ہماری ذات اور ہماری روح کی صورت میں موجود ہے۔ اخلاقی قوانین کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمیں آپس میں بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنا چاہیئے۔ لیکن ان سے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیوں ہر مذہب کی مقدّس کتابوں میں یہی لکھا ہے جہاں کہیں کوئی اِنسان اپنی مجبوریوں سے گزر کر آزادی کے لئے کوشش کرتا ہے اُس کی رہنمائی کے لئے ہر مذہب اُسکو اخوت ہی کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتاتا کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف بھائی بھائی نہیں۔ درحقیقت ہم ایک ہیں۔ ہندوستانی فلسفے کی تعلیم یہ ہے۔ اگر ہماری اصل ایک ہے تو مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق ہی نہیں۔ اگر من و تو میں کچھ امتیاز ہی نہیں تو پھر خود غرضی کیسی؟ تمام اخلاقیات اور روحانیات کا عقلی جواز محض یہی نظریۂ وحدت ہے۔ آج یوروپ کو اسی اصول۔ اسی فلسفے کی تلاش ہے۔ اور یہی ہمارے ہندوستانی پس ماندہ عوام کی نجات کا واحد ذریعہ مہیا کر سکتا ہے۔ بلکہ انگلستان جرمنی فرانس اور امریکہ میں جو نئے سیاسی اور سماجی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں انکے پسِ پشت یہی عظیم اُصول غیر شعوری اور نادیدہ طور پر کام کر رہا ہے۔ آپ میری بات کا یقین مانئے کہ دُنیا کے مذہبی اور اخلاقی ادب میں جہاں کہیں بھی کائناتی آزادی یا نجات کا ذکر آیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس آزادی کو حاصل کرنے کی غرض سے جد و جہد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہاں ویدانت ہی کے فلسفۂ وحدت الوجود

سے دانستہ یا غیر شعوری طور پر کام لیا گیا ہے۔ اس قسم کے تمام خیالات میں ویدانت ہی کا عکس نظر آتا ہے۔ کچھ مصنفوں کو تو یہ پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اُن کے خیالات کا منبع اور مصدر کیا ہے۔ کئی مصنف تو اپنے خیالات کو بالکل طبع زاد بتاتے ہیں لیکن کچھ مصنف ایسے دلیر اور ایماندار ہیں۔ جو شکریہ کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ اُن کے خیالات کا سرچشمہ کہاں ہے۔

جب میں امریکہ میں تھا تو مجھ سے یہ شکایت کی گئی کہ میں ادویت (توحید) کی تعلیم زیادہ اور دوئی (ثنویت) کی تعلیم بہت کم دیتا ہوں۔ میں بھگتی کی عظمت اور شان سے ناواقف نہیں ہوں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ بندے اور خدا۔ بھگت اور بھگوان۔ عاشق اور محبوب الٰہی۔ رند اور ساقی کا تعلق کتنا لطیف اور مسرت بخش ہوتا ہے۔ بھگت جب بھگوان کے دھیان میں محو ہو جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم (محبت) کا ایک بے پایاں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ مجھے اِن وجد آور اور نشاط انگیز کیفیتوں کا بھی علم ہے۔ جو بھگتوں کے حصے میں آتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ برکت اور ربّانی رحمت کے احساس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس کی کوئی حد نہیں لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں آپ کو اس مسلک کی تعلیم نہیں دوں گا کیونکہ آج وقت کا تقاضا کچھ اور ہے یہ وقت خوشی کے آنسو بہانے کا نہیں۔ ہم کافی رو دھو چکے ہیں۔ اب نرم دلی سے بھی کام لینے کا موقع نہیں ہے۔ یہ نرم دلی ہمارے ساتھ مدتوں رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہم ایک روئی کا ڈھیر بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم میں جان نہیں رہی ہم مُردوں سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے مُلک کو ضرورت ہے آہنی عضلات[ا۵] اور فولادی اعصاب کی ایسی زبردست قوتِ ارادی کی جس کے سامنے دُنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھہر سکے جو اس عالمِ کائنات کے ہر راز اور ہر بھید کی تہ تک پہونچ سکے اور جو اپنی کامیابی کے لئے آسمان سے ٹکرانے کے لئے تیار ہو۔ جو اپنے پاک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سمندر میں غوطہ لگانے پر آمادہ ہو جو سینہ تان کر موت کا مقابلہ کرے۔ آج ہمیں ہر قسم کے خوف سے نجات پانے کی ضرورت ہے۔ آج ہمیں دلیری بہادری اور جاں نثاری کا جوہر درکار ہے۔ یہ جوہر ہم پر عالمِ غیب سے نازل نہیں ہو گا۔ ہمیں اپنے اندر خود ہی دلیری اور خودداری کا جوہر پیدا کرنا ہے اور اسکو نشو ونما دے کر مستحکم بنانا ہے۔ یاد رکھیے کہ صرف ادویت کے فلسفۂ حیات پر عمل پیرا ہونے ہی سے یہ بات ممکن ہے ہمیں ادویت کے اس نصب العین کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہے۔ ہمارے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہو گا کہ کائناتی وحدت

ا۵ What our country needs is muscles of iron and nerves of steel

کے اُصول پر اعتقاد لے آئیں۔ ہمیں اپنی زندگی کو اُسی سانچے میں ڈھالنا ہے۔ ہمیں صرف اسی پر بس نہیں کرلینا چاہیئے کہ خدا کی ہستی پر ایمان لے آئیں۔ ہمیں تو خود اپنی ذات میں یقین کرنا ہوگا جس اُفق پر خوداعتمادی اور خدا پرستی دونوں کی حدیں آپس میں ملتی ہیں وہیں سے انسانی عظمت اور شان کا ظہور ہوتا ہے۔

اِس لئے آیئے ہم خود اپنی ذات میں اعتقاد و اعتماد پیدا کریں۔ اپنی خدا پرستی کو خود اعتمادی کا رنگ دیں۔ خدا کی ہستی کے ایمان سے ہمارا دل مُنوّر ہو اور خود اعتمادی کی طاقت ہمارے دست بازو میں کام کرے۔ یہی زندگی کا راز اور حصولِ عظمت کا واحد طریقہ ہے۔ صرف خود کو خدا کے نام پر چھوڑ دینے کا نام زندگی نہیں یہ تو حد درجہ کی کاہلی اور سُستی ہے اس تن آسانی سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا۔ آپ لاکھوں دیوی دیوتاؤں کو مانتے رہیں (خواہ وہ آپکے پُرانے معبود ہوں یا ولایتی لوگوں کے بنائے ہوئے نئے خدا) لیکن اگر اپنے یقین و ایمان کے ساتھ آپ کو خود اپنی ذات میں اعتماد نہیں تو پھر آپ کی نجات کسی صورت سے بھی ممکن نہیں۔ آیئے ہم اپنی ذات میں اعتماد پیدا کریں اور اسی اعتماد کی بنیاد پر کھڑے ہوکر طاقتور اور مضبوط بنیں۔ ہمیں ضرورت ہے خود اعتمادی اور طاقت کی۔ کیا کبھی آپ نے دل میں سوچا ہے کہ آخر کیوں ہندوستان کے ہم تیس کروڑ باشندے پچھلے ایک ہزار سال سے مُٹھی بھر غیر ملکیوں کے زیرِ حکومت رہتے چلے آئے ہیں۔ جو بھی حملہ آور اُٹھا ہمیں اپنے پیروں تلے روندتا چلا آیا اُس کی وجہ بس یہی تھی کہ اُسکو اپنی ذات میں اعتماد تھا اور ہم لوگ اس خود اعتمادی کے جوہر سے محروم تھے۔ اگر میں نے مغرب کے دَورے میں کچھ سیکھا ہے تو بس یہی سیکھا ہے کہ خود اعتمادی کے بغیر زندگی موت کے برابر ہے۔ عیسائی پادری کہنے کو ایسی بے معنی باتیں ضرور کرتے ہیں کہ انسان گنہ گار ہے اور اس کی نجات مشکل ہے۔ لیکن دراصل یوروپ اور امریکہ دونوں مُلکوں کے باشندے اپنے سینے میں ایک قوم پرست دل رکھتے ہیں اور اُن کے اُس دل میں خود اعتمادی کی نہایت زبردست قُوّت کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ ایک انگریز لڑکا بھی پُورے یقین سے کہے گا۔ میں انگریز ہوں اور سب کچھ کرسکتا ہوں۔ امریکی نوجوان کی زبان پر بھی یہی الفاظ نظر آئیں گے۔ اور سرزمین یوروپ کا ایک ایک بچّہ یہی کہے گا۔ ہمارے مُلک کے بچّے تو درکنار اُن کے والدین بھی اتنی خود اعتمادی کا ثبوت مہیا نہیں کرسکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں خود اعتمادی کا جوہر ہی مفقود ہوگیا ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کو دُور کرنا ہے۔ اپنی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگانا ہے۔ اور اس کے لئے ویدانت کے ادوّیت واد کے پرچار کی ضرورت ہے۔ یہی تو وہ حیات بخش فلسفہ ہے جو ہمیں اپنی رُوح کی عظمت و شوکت سے آگاہ کرتا ہے۔ یہی تو وہ واحد طریقہ کا

ہے جس سے ہمیں جسمانی۔ دماغی اور روحانی طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی لئے تو میں اس ادویت واد کی تعلیم دیتا ہوں اور آپ یقین کیجئے کہ مجھے کسی نئے مذہبی فرقے کی تبلیغ کرنا منظور نہیں۔ میں آپ کو ایک بار پھر اُن کا شاتی اُصولوں پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہوں جن کو کسی زمانے میں وسیع پیمانے پر قبولیت کا شرف حاصل ہو چکا ہے جن کی معقولیت اور منطق کو دُنیا کے اکثر و بیشتر مفکر تسلیم کرتے ہیں اور جن کی عملی کامیابی کی شہادت بکثرت تاریخ سے ملتی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ جس ادویت واد (وحدت الوجود) کی تعلیم میں دیتا ہوں اُس کا تعلق کسی خاص فرقے سے نہیں تو دویت واد (ثنویت) کے قائل لوگوں یا وحدت کے علمبرداروں کو اس ادویت کا یقین کیونکر دلایا جا سکتا ہے میرے خیال میں مفاہمت و مصالحت کی ایک ایسی صورت نکل سکتی ہے جس کو دویت وادی اور ادویت وادی دونوں اپنی جگہ قائم رہ کر بھی خوشی سے قبول کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں ایسا کوئی بھی مسلک نہیں جس کا ایمان یہ نہ ہو کہ خُدا ہمارے اندر ہے یا یہ کہ ربانی وجود ہر چیز کے اندر سائر و دائر ہے۔ ویدانت کے جتنے بھی نظام فکری ہیں۔ یہ سب مانتے ہیں کہ پاکیزگی۔ قوت اور کمالِ حُسن یہ سب چیزیں پہلے ہی سے رُوح میں موجود ہیں۔ بات چھوٹی بڑی صورت کی نہیں بلکہ کم و بیش اظہار کی ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ جبلی کمال کبھی چھوٹی اور کبھی بڑی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن اس رُوحانی کمال کی نوعیت کسی صورت سے بھی بدلی نہیں جا سکتی دوسرے لوگوں کا کہنا ہے ہماری حقیقت ہمیشہ یک و کامل ہے۔ قادرِ کل ہے لیکن اس پر مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اِس لئے یہ حقیقت کم و بیش پوشیدہ رہتی ہے۔ جس میں دیدارِ جلوہ کی جتنی تاب ہوتی ہے اس کو اتنا ہی دیدار میسر آتا ہے۔ بات دراصل ایک ہی ہے فرق ہے تو اندازِ بیان میں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ادویت کا بیان دوسرے بیان کے مقابلے میں زیادہ معقول ہے لیکن دونوں کا عملی نتیجہ تو تقریباً یکساں ہی نکلتا ہے اور یہی وہ مرکزی تصوّر ہے جس کی دُنیا کو عموماً اور ہمارے مُلک کو خصوصاً ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم اپنے عظیم الشان مذہب کی اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ ہر انسان بذاتِ خود کامل ہے۔ قادرِ مطلق ہے۔ ہم ایک دوسرے میں امتیاز برتنے لگے ہیں۔ ہم میں چھوٹے بڑے کا زبردست احساس پیدا ہو گیا ہے۔ بڑوں کے ظلم سہنے اور چھوٹوں پر ظلم روا رکھنے کی ہم کو عادت پڑ گئی ہے اور یہی وجہ ہے ہمارے قومی تنزل کی۔ میرے دوستو اگر ہمیں قومی ترقی کرنا ہے تو تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ہمیں طاقت حاصل کرنا ہے تو اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر کے اُنھیں دور کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر ہم میں سے کسی کے ساتھ کوئی انگریز بدسلوکی کرتا ہے یا اُسے قتل تک کر دیتا ہے تو تمام مُلک کے اخباروں میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ ہر طرف واویلا مچ جاتا ہے مجھے ایسی خبریں پڑھ

کررونا آجاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر اس طرح کے حادثات کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ایک ویدانتی ہونے کی حیثیت سے یہ سوال میں خود اپنی ذات سے کرتا ہوں۔ ہم ہندو لوگ فطری طور پر درون بین[1] واقع ہوئے ہیں۔ ہم ہر چیز کو اپنی ذات کی نسبت سے دیکھتے ہیں۔ ہمارا انداز نظر داخلی ہوتا ہے اسی لئے میں بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔ کہ آخر اس صورتِ حال کے لئے ذمہ دار کون ہے؟ اور مجھے ہر بار یہی جواب ملتا ہے کہ ہماری اس زبوں حالی کی ذمہ داری انگریزوں کے سر نہیں تھوپی جاسکتی اپنے تمام مصائب اور انحطاط کے لئے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ ہمارے علاوہ اور کسی دوسرے پر ہماری اُس بری حالت کی ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے ہی امیرزادے صدیوں سے عوام پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے چلے آئے ہیں۔ انھوں نے ان بے چاروں کو اس قدر پامال کیا ہے کہ آج وہ بالکل بے بس ہو گئے ہیں ظلم سہتے سہتے یہ لوگ بھول گئے ہیں کہ ہم بھی انسان ہیں۔ ہم میں بھی جان ہے۔ ہمیں زندہ رہنے کا حق ہے۔ سالہا سال سے مزدوری اور غلامی کرتے کرتے وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ غلامی کے علاوہ اور کسی چیز کے اہل ہی نہیں ہیں۔ انھیں بار بار یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ جنم کے غلام ہیں اور ہمیشہ غلام ہی رہیں گے خود ان کی مجبوریاں اُن کے دل و دماغ پر چھا گئی ہیں۔ اس سے زیادہ غلامی اور کیا ہو سکتی ہے کہ غلامی کا خیال انسان کی تمام ہستی پر مسلّط ہو جائے۔ یہ انسانی پستی کی انتہا ہے اور بڑے دکھ کی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غریب ہم وطنوں سے ہمدردی کرتا ہے اور انھیں پستی کے گڑھے سے نکالنا چاہتا ہے تو آجکل کے تعلیم یافتہ لوگ بھی جنھیں اپنی تعلیم و تربیت پر اس قدر ناز ہے ایسے شخص کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ بسا اوقات اس کی مخالفت کرتے ہیں اور ایسی ایسی شیطانی اور بہیمانہ حرکتیں کر بیٹھتے ہیں کہ بعض مرتبہ تو ان کے انسان ہونے میں بھی شک ہونے لگتا ہے مثلاً خصوصیات کے نسلاً در نسلاً چلنے کے خام نظریوں یا اسی طرح کی اور لایعنی باتوں کی بنا پر یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ غریب مزدور لوگ تو مزدوری ہی کرنے کے قابل ہیں اور اس قسم کی منطق سے اپنے دل کو سخت بنا کر غریبوں کے ساتھ اور بھی زیادہ درندگی سے پیش آتے ہیں اور ان کو جبر و تشدد کا نشانہ بناتے ہیں یہ سب خود غرض لوگوں کے بہانے ہیں۔ ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ امریکہ میں مذاہب کی جو پارلیمنٹ[2] منعقد ہوئی تھی۔ اس میں اور لوگوں کے ساتھ ایک حبشی نژاد

---

[1] Introspective.

[2] Parliament of Religions

نوجوان بھی آیا تھا۔ یہ خاص افریقہ کا باشندہ تھا۔ اُس نے کانفرنس میں ایک نہایت شاندار تقریر کی جس کی وجہ سے مجھے اس نوجوان سے کسی قدر دلچسپی ہوگئی۔ کبھی کبھی میں اس سے گفتگو بھی کر لیتا تھا لیکن اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ معلومات نہ حاصل ہو سکیں اور ہماری ملاقات یہیں ختم ہو کر رہ گئی۔ لیکن کچھ دنوں بعد انگلستان میں میری ملاقات کچھ امریکنوں سے ہوئی اور اُن سے اس نوجوان حبشی کا ذکر آ گیا۔ ان امریکنوں نے مجھے بتایا کہ وہ نوجوان ایک حبشی سردار کا بیٹا تھا اور وسطا افریقہ میں رہتا تھا۔ ایک روز ایک اور حبشی سردار کا اس لڑکے کے باپ سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے اس کو اور لڑکے کی ماں دونوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر اس نے ان دونوں کا گوشت بھونا اور انھیں کھا گیا۔ اس نے یہ بھی حکم دے دیا کہ اس لڑکے کو بھی قتل کر کے اس کا گوشت بھونا اور کھا لیا جائے۔ لیکن اتفاق سے لڑکا بھاگ کھڑا ہوا اور ہزاروں صعوبات سے گزر کر اور کئی سو میل پا پیادہ چل کر وہ سمندر کے کنارے پہونچ گیا۔ وہاں ایک امریکی جہاز کے کپتان نے اس پر رحم کھا کر اس کو اپنے جہاز پر سوار کر لیا۔ اور اس طرح وہ لڑکا امریکہ جا پہونچا۔ یہی وہ لڑکا تھا جس نے مذہبوں کی پارلیمنٹ[ل] میں اتنی شاندار تقریر کی تھی۔ اس کے آباؤ اجداد مردم خور تھے اور اگر وہ افریقہ سے بھاگ نہ آتا تو خود بھی آدم خور ہوتا۔ لیکن تعلیم و تربیت کی بدولت وہ کچھ اور ہی بن گیا تھا۔ اِس واقعہ کو سُننے کے بعد آپ خود ہی سوچیے۔ کہ اس اصولِ وراثت کو کہاں تک تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ انسانی خصوصیات نسلاً درنسلاً چلتی ہیں۔ تو میں اس کے اس بیان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ میں پیدائشی ذات پات کا قائل نہیں ہوں۔ مثال کے طور پر برہمنوں کو لے لیجئے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ موروثی اثر سے برہمنوں میں اچھوتوں کے بمقابلے علم حاصل کرنے کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے تو بھی اُس کے یہ معنی نہیں کہ تعلیم صرف برہمنوں ہی کو دی جائے۔ اور اچھوتوں کا اس پر کوئی حق نہ ہو تو میں یہ کہوں گا کہ برہمن کی تعلیم پر ایک پیسہ نہ خرچ کیجئے وہ تو اپنی موروثی اہلیت سے کچھ نہ کچھ پڑھ نکلے گا۔ تعلیم دینا ہے تو اچھوتوں کو دیجئے اگر پیسہ خرچ کرنا ہے تو ان غریبوں پر خرچ کیجئے جو کچھ دینا ہے تو کمزور کو دیجئے۔ دان کی ضرورت اسی کو ہے۔ برہمن پیدائشی طور پر ہوشیار ہے۔ وہ تو کسی کی مدد کے بغیر ہی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اگر دوسرے لوگ پیدائشی طور پر ہوشیار نہیں تو ان کو تعلیم دیجئے۔ اُن کے لئے پڑھانے والے مہیا کیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انصاف یہی ہے کہ ہمارے غریب بھائیوں کو ہمارے دیس کے انھیں پسماندہ عوام کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع

ل Parliament of Religions.

دیا جائے تاکہ وہ اپنی اصلیت سے آگاہ ہوسکیں۔ ذات پات کے یہ تمام سلسلے سماج کے بنائے ہوئے مدارج ہیں اور اُن کی رُو سے یہ ہرگز رَوا نہیں کہ اُن کے ذریعہ عوام کو اپنے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

ہر صورت اور بچّے کا پیدائشی حق ہے کہ وہ علم و آگہی حاصل کرے کوئی برہمن ہو یا شُودر۔ کسی کا جنم اونچے خاندان میں ہوا ہو یا نیچے گھرانے میں۔ کوئی کمزور ہو یا توانا۔ سب کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ توانا اور کمزور۔ بلند اور پست غرض ہر شخص کے پسِ پشت وہ لافانی رُوح موجود ہے جو ہر صورت سے کامل ہے جس کی عظمت کے باعث ہم سب میں عظیم و کریم بننے کے بے پایاں امکانات موجود ہیں۔ اور جس کی نسبت سے ہم میں اپنی بے پایاں صلاحیت کا یقین ہوتا ہے۔ ہمیں ہر شخص سے للکار کر کہنا چاہیئے "اُٹھو[1]۔ جاگو اور اس وقت تک کہیں نہ رُکو جب تک منزلِ مقصود پر نہ پہونچ جاؤ"۔ کمزور در حقیقت کوئی نہیں ہے۔ رُوح لامحدود ہے۔ اس کی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ رُوح قادرِ کُل ہے۔ اس کو ہر بات کی خبر ہے۔ اُٹھو میرے شیرو۔ خواب غفلت سے جاگو۔ اپنی خودی کا اعلان کرو۔ خدا خود تمھارے اندر ہے۔ اس پر یقین لاؤ۔ اسے آشکار کرو۔ اس سے انکار نہ کرو۔ اپنے آپ کو کمزور پست سمجھنا ہی تو کفر ہے۔ ہماری قوم پر ایک مدّت سے کاہلی۔ کمزوری اور خوابیدگی[2] کا عالم طاری رہا ہے اور آج بھی اسی کو یہی بلائیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو مصنوعی نیند سُلا رکھا ہے۔ اُٹھو۔ جاگو۔ بہت سو چکے اب اپنی مصنوعی خوابیدگی کو دُور کر دو۔ اُس کا طریقہ خود تمہاری مقدّس کتابوں میں بیان کیا گیا ہے بس جان لو کہ تمھاری اصل فطرت کیا ہے۔ اس اصلی فطرت کا سبق خود بھی سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ۔ رُوحِ خُفتہ کو آواز دو۔ اور پھر دیکھو کہ یہ کس طرح بیدار ہوتی ہے جب یہ رُوح بیدار ہو جائیگی تو تمھیں اپنی بے پایاں طاقت کا احساس ہوگا۔ تمھاری خوبیاں آشکار ہوں گی تمھیں عظمت و شوکت میسّر آئے گی۔ پاکیزگی ملے گی اور ہر ایسی چیز نصیب ہوگی جو اعلیٰ اور ارفع ہے۔ مجھے ساری گیتا کے یہ دو اشلوک خصوصاً پسند ہیں۔ یہ سری کرشن کی تعلیمات کا عطر ہیں۔ جوہر ہیں۔ اِن میں رُوحانی قوت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بھگوان کہتے ہیں جو شخص پرماتما کو سارے ذی روحوں کے اندر ساکن دیکھتا ہے جسے فانی اشیاء میں وہی غیر فانی ہستی نظر آتی ہے درحقیقت بصیرت اسی کے حصّے میں آئی ہے کیونکہ جب وہ اس پرماتما کو جو ہر جگہ موجود ہے سب میں یکساں دیکھتا ہے تو اُسے خُدا ہی کا جلوہ ہر شئے میں نظر آتا ہے اور وہ "میں" کے شعور کے نیچے دب کر نہیں رہ جاتا۔ جھوٹا "میں" سچے "میں" پر غالب نہیں آتا۔ ایسا شخص واقعی بلند ترین

---

[1] Arise. Wake and stop not till the goal is reached.

[2] ہپناٹزم

منزلِ مقصود تک پہونچ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ویدانت کی یہ تعلیم فلاحِ عام کے کام کی زبردست محرک ہو سکتی ہے۔ خیرات کی بُنیاد اِنسانی مساوات اور اُخوت ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ ویدانت ہمیں بتاتا ہے کہ ہم سب میں وہی ایک رُوحِ اعظم حاضر و ناظر ہے۔ اس اخوت اور برابری کی بنا پر ویدانت محض ہندوستان ہی میں نہیں دوسرے ممالک میں بھی اصلاح و بہبودی کے کام سرانجام دینے میں بہت حد تک کامگار ہو سکتا ہے۔ تمام دُنیا کو اس جان بخش پیغام کی ضرورت ہے کہ ہر طرف ایک ہی روحِ اعظم (پرماتما) کے جلوے ہیں۔ یہ رُوح ہر شکل میں اور ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ یہ روح ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے جب تک ہم کو اس حقیقت کا شعور نہیں ہو جاتا۔ جب تک ہم جہالت اور لاعلمی کا شکار رہتے ہیں ہمیں ہر طرح کے اختلافات کا احساس ہوتا ہے۔ اسی جہالت کو اسی کم آگہی کو شیطنت کہتے ہیں۔ اِسی احساس کا دوسرا نام بدی ہے۔ ہماری مقدّس کتابیں ہمیں یہی بات بتاتی ہیں۔ اور میرا ذاتی تجربہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ بدی اختلافات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور نیکی کا ظہور اسی یقین اور ایمان سے ہوتا ہے کہ سب چیزوں میں باہمی مساوات ہے اور سب کی تہ میں یکسانیت اور وحدت کام کر رہی ہے۔ لیکن کسی آدرش کا ادراک اور بات ہے اور اس کو پیشِ نظر رکھ روزانہ زندگی کی تفصیلات میں اس کو عملی شکل دینا دوسری بات ہے۔ کسی آدرش کا علم ہونا بجائے خود اچھا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس آدرش کی تکمیل کے لئے عمل کیوں کر ہو سکتا ہے؟

مساوات اور وحدتِ حیات کے بارے میں یہ گفتگو سُن کر آپ کے دل میں ضرور ذات پات اور سماج سُدھار کا خیال آیا ہوگا۔ صدیوں سے یہ دشوار اور پیچیدہ سوال ہمارے باشندگانِ ملک کے سامنے ہے۔ لیکن مجھے آپ سے اِس بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں جو بات آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ذات پات کے رواج کو توڑنے کی تعلیم بجائے خود ناکافی ہے۔ تخریب کبھی تعمیر کی جگہ نہیں لے سکتی۔ میں نہ تو ذات پات کے سِلسلے کو توڑنے کا قائل ہوں اور نہ محض ایک سوشل ریفارمر[1] ہوں۔ مجھے آپ کی ذاتوں اور آپ کے سماج سُدھار سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ذاتیں باقی رہیں یا مٹ جائیں میرے لئے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کا تعلق چاہے

---

[1] Social Reformer.

جس ذات سے ہو میرے لئے سب برابر ہے۔ مجھے تو آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ ذات پات کے اِس فرق سے آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ آپ دوسرے لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھ کر ان سے نفرت برتیں۔ میں تو صرف محبّت کی تعلیم دیتا ہوں اور میری تعلیم کی بنیاد ویدانت کی وہ عظیم صداقت ہے جس کے مطابق رُوح کائنات ایک ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ یکساں صورت میں موجود ہے۔ تفرقات کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

قریب قریب پچھلے سو سال سے ہمارے مُلک میں سوشل رفارمروں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور سماج سُدھار کی اسکیموں کا ایک سیلاب سا اُمڈ پڑا ہے مجھے ذاتی طور پر ان سوشل رفارمروں سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر حضرات نیک خصلت انسان ہیں۔ اُن کی نیّت اچھی ہے اور بعض معاملات میں ان کے مقاصد بھی بدرجۂ اُتم قابلِ تعریف ہیں لیکن یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سوشل رفارم کی اس صد سالہ مُدّت میں کوئی ایسا مستقل اور قابلِ قدر نتیجہ نہیں رُونما ہوا۔ جس کی اہمیت ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک محسوس کی جاسکے۔ ہزاروں مُقرروں نے پلیٹ فارم سے تقریریں جھاڑی ہیں۔ اور ہندو قوم اور اس کی تہذیب کے مُخلص بزرگوں پر دشنام طرازیوں کی بوچھار ہوتی رہی ہے پھر بھی اس کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے۔ میرے خیال میں اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اب تک سماج سُدھار کا طریقۂ عمل تعمیری نہیں بلکہ تخریبی رہا ہے۔ اپنے مذہب اور اپنی قوم کی ہر پُرانی چیز کو بُرا قرار دے کر اس پر ہر وقت طرح طرح کے اعتراضات اُٹھانے سے کبھی اصلاح نہیں ہوسکتی اگر ہمیں واقعی اپنی قوم کو اونچا اُٹھانا ہے تو سب سے پہلی بات جو ہمیں کرنا ہوگی وہ یہ ہے کہ قومی حیثیت سے اپنے اس کیرکٹر (کردار) کو برقرار رکھیں جو ہم نے اپنی تمام تاریخ کے دَوران میں تیّار کیا ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں بہت سی باتیں دوسری قوموں سے سیکھنا ہیں ہمیں بیرونجات سے بہت سے سبق حاصل کرنا ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم دوسروں کی اندھا دُھند نقل کرنے لگیں۔ مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ زمانۂ حال میں جتنی بھی اصلاحی تحریکیں اٹھی ہیں۔ اُن میں سے بیشتر تو مغربی ذرائع اور مغربی طریقۂ کار کی محض نقل ہیں اور اُن سے ہندوستان کا مقصد کبھی پُورا نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال کی کسی بھی اصلاحی تحریک کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عیب بینی نکتہ چینی اور دشنام طرازی سے کسی کو بھی کبھی کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سماج میں بُرائیاں موجود ہیں۔ لیکن بُرائیاں

بھلا کِس سماج میں نہیں ہوتیں۔ مجھے دُنیا کی مختلف نسلوں اور قوموں کو دیکھنے اور اُن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔ اِن سے مقابلہ کرنے پر میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مجموعی طور پر ہمارے مُلک کے باشندے نہایت درجہ نیک چلن اور خدا پرست ہیں اور ہیں اور ہمارے دستور اور ہمارے رواج اپنی ترکیب اور مقصد کے لحاظ سے نہ صرف ہمیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کو خوش حال بنانے کے لئے نہایت درجہ موزوں ہیں۔ اسی لئے میں کِسی اصلاح کی۔کِسی سُدھار کی ضرورت کا قائل نہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ ہمارا مُلک پھلے پھُولے اور ہماری قوم ترقی کرے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہماری نشوونما ہماری توسیع اور ترقی صرف ہمارے طریقۂ کار کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔ دوسروں کی نقل سے نہیں۔ جب میں اپنے ملک کی پچھلی تاریخ پر غور کرتا ہوں تو میں یہ دعوےٰ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے مُلک کے علاوہ تمام دُنیا میں کوئی اور ایسا مُلک نہیں ہے جس نے انسانی دماغ کی ارتقا کے لئے اِس قدر زیادہ کارنمایاں انجام دئے ہوں۔ اِسی لئے اپنی قوم کی مذمت میں میری زبان پر ایک حرف بھی نہیں آسکتا۔ میں تو اپنے ہم وطنوں سے کہتا ہوں کہ تم اچھے تو ہو ہی صرف زیادہ اچھے بننے کی کوشش کرو۔ ماضی میں اِسی مُلک نے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں اور اب ان سے بھی زیادہ کارنمایاں انجام دینے کے لئے وقت بھی ہے اور گنجائش بھی۔ یقیناً آپ جانتے ہیں کہ ہم خاموش اور بےحرکت کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم خاموش اور ساکت کھڑے رہیں گے تو مَر جائیں گے۔ کوئی کبھی کسی ایک مقام پر نہیں رک سکا۔ اگر ہم آگے قدم نہیں بڑھا سکتے تو ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ہمیں ترقی کرنا ہوگا نہیں تو ہم پستی اور انحطاط کا شکار ہو جائیں گے۔ ہمارے قدیم بزرگوں نے مَاضی میں بڑے بڑے کارنمایاں سرانجام دئے ہیں۔ لیکن ارتقا اور نشوونما کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اور بھی پُرمعنی بنالیں ہمیں اپنے بزرگوں کی عظیم تکمیلات سے بھی آگے قدم بڑھانا ہے قانونِ حرکت ہمیں رُکنے کی اجازت نہیں دیتا۔ رُکنے کے معنی ہیں پیچھے ہٹ کر قعرِ مذلت میں گرنا ایسا نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہیئے۔ پیچھے ہٹنے سے ہماری قوم تنزّل اور انحطاط کے دائرے میں گھر کر دم توڑ دے گی اس لئے ہمیں صِرف آگے کی جانب قدم بڑھانا چاہئے۔ اور پہلے سے بھی زیادہ۔ بڑے کام سرانجام دینا چاہیئے۔ بس یہی مجھے آپ سے کہنا ہے۔

میں محض وقتی جماعتی اصلاح کی تعلیم نہیں دیتا۔ میں بُرائیوں کا دفعیہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ میرا تو آپ سے بس یہی کہنا ہے کہ آگے بڑھیئے اور انسانی ترقی کی اِس اسکیم کو عملاً مکمل کیجئے جو ہمارے قدیم ترین بزرگوں نے نہایت درجہ مکمّل ضابطے اور تنظیم کے ساتھ ہمارے لئے بنا

رکھی ہے۔ میں تو آپ کو اس طرح کام کرنے کی دعوت دیتا ہوں جس سے آپ کو انسان کی وحدت اور اس کی پیدائشی ربانی فطرت کا عملی طور سے زیادہ سے زیادہ احساس ہونے لگے۔ یہی تو ویدانت کا آدرش یا نصب العین ہے اگر فرصت ہوتی تو میں بخوشی آپ کو بتاتا کہ جو کوئی بھی کام ہمیں آج کرنا ہے اس کا خاکہ آج سے ہزاروں سال پیشتر ہمارے قدیم شاستر کاروں (آئین سازوں) نے کس طرح تیار کر لیا تھا۔ اور کیونکر ہمارے قومی اور سماجی نظام میں اُن تبدیلیوں کا اندازہ بھی لگا لیا تھا جو اب تک رونما ہوتی رہی ہیں یا آئیدہ جن کے رونما ہونے کا امکان ہے، مثال کے طور پر ہمارے بزرگ بھی ذات کے سلسلے کو توڑنے کے قائل تھے اور اس کی تعلیم بھی دیتے رہتے تھے۔ لیکن اُن کا طریقِ عمل آج کل کے ریفارمروں سے مختلف تھا۔ ذات پات کے بندھن توڑنے سے اُن کی مُراد یہ نہ تھی کہ کسی شہر کے تمام باشندے ایک جگہ بیٹھ کر شراب پئیں اور کھانا کھائیں۔ اس طرح وہ آزادئ عمل کے قائل ضرور تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہر مرد اور عورت کو (خواہ اس میں اپنے مفاد کو سمجھنے کی اہلیت ہو یا نہ ہو) اِس بات کی کھُلی اجازت ہو کہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے اور جس کے ساتھ جی چاہے شادی کرلے، اور نہ ہی ان کا یہ ایمان تھا کہ کسی قوم کی خوش حالی کا انحصار بیوہ عورتوں کو خاوند میسر ہونے پر ہے۔ پچھلے سو سال سے آج کل کے ریفارمر ان باتوں پر زور دے رہے ہیں۔ لیکن اب تک تو اس سے کسی قِسم کی قومی خوش حالی پیدا نہیں ہو سکی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سماج سُدھار کے مغربی طریقے ہمارے ملک میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہمارے اور مغربی فلسفۂ حیات میں بنیادی فرق ہے ہمارے بزرگوں کی نظر میں معیاری انسان برہمن تھا۔ ہمارے تمام گرنتھوں میں برہمن کا یہ آدرش نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ برہمن وہ ہے جو اپنی تمام زندگی حصولِ علم اور درس و تدریس کے لئے وقف کردے جو دوسروں کی خیرات سے اپنی مختصر ضروریاتِ زندگی پوری کرے۔ برعکس اس کے یُوروپ میں بڑے بڑے مذہبی رہنما بھی اپنی بڑائی اس بات میں سمجھتے ہیں کہ ان کا شجرۂ نسب کسی لارڈ یا نواب سے جا ملتا ہے۔ اور وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے نہ جانے کیا کیا نہیں کر اُٹھاتے۔ اور نہ جانے کتنا پیسہ اس پر خرچ کر دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو حقیقت میں یہی لارڈ یا نواب کبھی روز ڈاکو اور لٹیرے تھے۔ عام طور پر یہ ظالم اور جابر لوگ پہاڑیوں پر قلعے بنا کر رہتے تھے۔ اور جب بھی ان کو موقع ملتا تھا غریب مسافروں وغیرہ پر ٹوٹ پڑتے اور اُن کو لُوٹ لیتے تھے۔ یہ مشغلہ تھا آج کل کے مذہبی رہنماؤں کے آبا و اجداد کا جن سے رشتہ جوڑے بغیر ان کو چین نہیں آتا۔ بخلاف اِسکے ہندوستان میں بڑے بڑے راج کمار بڑے بڑے شاہزادے

بھی اپنا خاندانی سلسلہ زمانۂ قدیم کے کسی نہ کسی رشی کے ساتھ ملاتے ہیں اپنی شان سمجھتے آئے ہیں۔
اور آج بھی سب ہندو فخریہ اپنے آپ کو ان رشیوں کی اولاد کہتے ہیں جن کے ترک کا یہ حال تھا کہ تن پر
صرف ایک لنگوٹی رکھتے تھے۔ جنگلوں میں رہتے تھے کند مول پھل کھاتے اور ویدوں کے مطالعہ میں
مصروف رہا کرتے تھے۔

تمام راجے مہاراجے اپنا شجرۂ نسب ان رشیوں سے ملا کر ہی اپنی خاندانی شان و شوکت
کا ثبوت پیش کرتے آئے ہیں۔ ان سے تعلق پیدا کر کے اونچی ذات والے اپنی برتری کا اعلان کرتے آئے
ہیں۔ ظاہر ہے کہ خاندانی شرافت اور بزرگی کا معیار ہمارے یہاں مغرب سے مختلف ہے۔ مغرب میں
لوگ طاقت کے پجاری ہیں۔ خواہ اس کا اظہار خوں ریزی اور ظلم تشدد کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو
اور ہمارا آدرش ترک و ریاضت ہے۔ خواہ اس سے ہمیں غریبی اور ناداری ہی کیوں نہ نصیب ہو
ہمارے یہاں معیاری انسان روحانیت اور ترک و ریاضت کا دل دادہ برہمن ہے۔ اور میری نگاہ
میں وہی شخص سچے معنوں میں برہمن ہے جو تمام دنیوی باتوں سے کنارہ کش ہو کر سچے گیان کا بھنڈار
بن جاتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا یا اپنی مذہبی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ برہمن پر کوئی قاعدہ کوئی
قانون عائد نہیں ہوتا۔ وہ ہر قانون سے ہر آئین سے بالاتر ہوتا ہے۔ نیز اس پر حکمرانِ وقت کی اطاعت
بھی لازمی نہیں اور اس کو کسی قسم کا بھی جسمانی نقصان پہونچانا جرم اور گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب
بالکل صحیح ہے قطعاً درست ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو بھی برہمن کے گھر پیدا ہوتا ہے وہ قانون
اور قاعدے کی زد میں نہیں آتا۔ اِس قسم کی باتیں خود غرضی اور ذاتی مفاد پر مبنی ہوتی ہیں۔ ایسی
باتوں سے خود غرض کمینے لوگ عوام کو گمراہ کر کے اُن کو اپنا غلام بنانا اور اُن کی جہالت سے فائدہ
اُٹھا کر اپنا گھر بھرنا چاہتے ہیں۔ ایسی باتوں پر ہرگز دھیان نہ دیجئے۔ اِس نکتے کو کہ برہمن قانون اور
قاعدے کی قید سے مبرّا ہے۔ ویدانت کے فلسفے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ویدانت کے نقطۂ
نظر سے اس کے بنیادی عقیدے کے مطابق برہمن کہلانے کا حق صرف اُس کو ہے جس نے خود غرضی
کے جذبے کو مٹا ڈالا ہو اور جو صرف گیان حاصل کرنے اور اس کی اشاعت کرنے کے لئے زندہ ہو
جس نے محبت اور اخوت کا پرچار کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہو۔ اور جو صرف ایک مقصد
کی تکمیل کے لئے کام کرتا ہے۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ ایسے برہمنوں کے لئے ایسے برگزیدہ اور ممتاز مردو
اور عورتوں کے لئے کسی قانون اور قاعدے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جن بزرگوں کے خیالات پر
روحانیت چھائی ہوئی ہو۔ جن کا اخلاق پاکیزہ اور جن کی سیرت نیک ہو اگر ان کے بارے میں

یہ کہا جائے کہ وہ قانون کے دائرے سے بلند و بالا ہیں تو اس میں تعجب کی کون بات ہے۔ ان کے لئے پولس اور فوج کی کیا ضرورت ہے۔ اُن پر کسی بالا دست حاکم کو مقرر کرنے کی کیا حاجت ہے۔ یہ لوگ فطرتاً اور عملاً نیک اور شریف ہوتے ہیں۔ یہ خُدا کو مانتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے بندوں کی خدمت۔ اُن کی زندگی بھگوان کی بھگتی اور بھگتوں کی سیوا میں گزرتی ہے۔ یہی لوگ تو ہمارے آدرش برہمن ہوتے ہیں۔ خود ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ ست یُگ میں ہر شخص کا معیار زندگی بلند تھا۔ سب کی صرف ایک ذات تھی۔ سب برہمن تھے۔ مہا بھارت میں بھی ذکر آیا ہے کہ شروع شروع میں ساری دُنیا برہمنوں سے آباد تھی اور جیوں جیوں اُن میں گراوٹ آتی گئی یہ لوگ مختلف ذاتوں میں منقسم ہوتے چلے گئے اور جب یہ دَور پلٹے گا تو پھر سب لوگ پہلے کی طرح معیاری زندگی بسر کرنے لگیں گے اور برہمن کے درجے تک پہونچ جائیں گے۔

یہ دَور اپنا رُخ پلٹ رہا ہے یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ہمارے ذات پات کے مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ عالی مقام یعنی اونچی ذات والوں کو ذلیل کیا جائے نہ اس کا یہ حل ہے کہ ہم کھانے پینے میں احتیاط برتنا چھوڑ دیں یا عیش و عشرت ہی میں تمام زندگی گزار دیں۔ اس مسئلے کے حل کی تو ایک ہی صورت ہے کہ ہم ویدانت کے احکام کی تعمیل کریں اور ان اُصولوں کی پابندی کرتے ہوئے رُوحانی ترقی حاصل کریں اور برہمن بن جائیں۔ ہمارے بزرگوں نے اس مُلک کی نیچی سے نیچی ذات والوں سے لے کر برہمنوں اور رشیوں مُنیوں تک سب کے لئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ ترقی کی راہ پر برابر گامزن رہو۔ کہیں رکو نہیں۔ اس طرح متواتر کوشش کرنے سے ہر شخص آدرش برہمن کا مقام حاصل کرلے گا۔ نیز ویدانت کا یہ آدرش صرف اسی ملک پر نہیں۔ تمام دُنیا پر یکسانیت کے ساتھ عائد ہو سکتا ہے۔

یہ ہے سماج کو مختلف ذاتوں میں منقسم ہونے کی وضاحت۔ اِن ذاتوں کو تو روحانی ارتقا کے مختلف مراحل سمجھئے۔ ہمارا آدرش تو رُوحانیت کے اعلےٰ اور بلند ترین مقام پر پہونچنا ہے۔ ذاتوں کا مقصد یہ ہے کہ تمام بنی نوع اِنسان کو رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ اوپر اُٹھایا جائے اور ہر شخص کو تکمیلِ خودی کے قابل بنایا جائے۔ ہمارا آدرش اِنسان تو وہ ہے جس کو کسی سے بھی عداوت نہ ہو ایسا انسان فطرتاً سکون پسند مستقل مزاج عبادت گزار اور پاک وصاف ہوتا ہے۔ نیز وہ ہر وقت بھگوان کے دھیان میں محو رہتا ہے۔ ایسا آدرش اِنسان خود ہی پرماتما کا رُوپ ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس آدرش کو عملی صورت کس طرح دی جا سکتی ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ اسکے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ دوسروں

پرخواہ مخواہ نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیا جائے۔ کسی کی تحقیر و تذلیل کرنے سے کوئی قابلِ قدر نتیجہ نہیں نکلتا۔ دُنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اچھے نتائج صرف محبّت اور ہمدردی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے اس کی تشریح اور اُس تمام لائحۂ عمل کی وضاحت کے لئے جو میرے پیش نظر ہیں اور ان خیالات کے اظہار کے لئے جو میرے ذہن میں روز بروز آتے رہتے ہیں۔ کئی لکچروں کی ضرورت ہے کبھی موقع ہوا تو ان سوالوں پر مفصل بحث کی جائے گی۔ اے میرے ہم ملت بھائیو آج تو مجھے آپ کو بس اتنا ہی یاد دلانا ہے کہ ہماری قوم کا جہاز سالہا سال سے زندگی کے سمندر میں اپنی مخصوص شان و شوکت کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اُس نے اب تک ہمیں ہر طوفان سے بچایا ہے لیکن آج شاید اس جہاز میں کہیں کوئی سوراخ ہو گیا ہے ایسی حالت میں ہم سب کے لئے لازمی ہے کہ اس سوراخ کو بند کرنے کی حتی الامکان زیادہ سے زیادہ کوشش کریں اور اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچائیں اور ہمارے جو ساتھی اس خطرے سے آگاہ نہیں ہم انہیں آگاہ کریں اس طرح ہم سب مل کر ایک دُوسرے کی مدد کریں اور قوم کو موت کے منہ میں جانے سے بچائیں۔ لوگوں کو اس صورت حالات سے آگاہ کرنے اور اُن کو اپنے فرائض کا احساس کرانے کے لئے میں تو اس ملک کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک بہ آوازِ بلند اعلان کروں گا کہ ملک اور قوم کو خطرے سے بچائیے۔ مان لیجئے کہ لوگ میری باتوں پر کان نہیں دیتے پھر بھی مجھے ان لوگوں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں کسی کو بُرا بھلا نہ کہوں گا۔ نہ تو میں ان لوگوں کو کسی قسم کی گالیاں دوں گا اور نہ ان کے حق میں کسی قسم کی بد دُعا کروں گا اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو پھر بزدلوں کی طرح شور مچا کر کیوں جان دیں گزشتہ زمانے میں ہماری قوم نے بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیئے ہیں لیکن اگر بفرضِ محال مستقبل میں ہم ان کے بمقابلہ زیادہ کارنمایاں سر انجام نہیں دے سکتے تو پھر کم از کم اپنی کم زوری کا مظاہرہ کرنے سے تو گریز کر سکتے ہیں۔ اگر ہم میں ارتقاء کی قوت نہیں رہی ہے اگر ہماری توانائی یا طاقت جواب دے چکی ہے اور اگر ہم اپنے آپ کو طوفانوں سے نہیں بچا سکتے تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کو کوسے بغیر چُپ چاپ شانتی سے جان دیدیں گے ہمیں ڈوبنا ہی ہے تو چیخ پکار کئے بغیر تو ڈوب سکتے ہیں لیکن یقین مانیئے ایسا ہرگز ہونے نہیں پائے گا ہمیں دنیا کی کوئی طاقت صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتی۔ ہم میں وہ طاقت ہے جو ہر مصیبت اور ہر کم زوری کا کامیاب مقابلہ کرتی آئی ہے اس لئے اے میرے دیش بھائیو اپنے دیش سے پریم کرنا سیکھو۔ اس قوم سے پیار کرو جس نے زمانۂ گذشتہ میں بڑے بڑے کام سر انجام دیئے ہیں اپنے وطن کے ماضی کو دیکھ کر اسی کے مستقبل پر ایمان لاؤ۔ اپنی قوم کی گذشتہ عظمت کو دیکھ کر اُس کی آئندہ شان و شوکت کیلئے جان

لڑادو۔ میرے بھائیو میں نے آپ کا مقابلہ مغرب کے لوگوں سے کرکے دیکھا ہے۔ جیوں جیوں میں آپ کی عظمت اور طاقت کو سمجھتا گیا میرے دل میں آپ کے لئے محبت اور عزت بڑھتی گئی۔ آپ کی نیکی۔ پاکیزگی اور شرافت ضرب المثل ہے۔ مانا کہ ہم پر آج تک ظلم و تشدّد ہوتا آیا ہے لیکن اب ہمیں اپنی طاقت کا اظہار کرکے اس ظلم و ستم کا استبداد کرنا ہے۔ مادّی دُنیا کی اس ستم ظریفی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہے۔ جو کچھ ہوگیا وہ ہوگیا۔ اس کی کوئی پروا نہ کیجئے۔ فتح بالآخر ہماری ہی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رُوحانیت کی طاقت انجام کار غالب آئے گی۔ اپنی رُوحانیت پر یقین رکھئے اپنے آپ میں اعتماد پیدا کیجئے اور کام کرتے چلے جائیے۔ قوم اور مُلک کی خدمت میں جان و مال قربان کردیجئے۔ اپنے مُلک کو بُرا بھلا نہ کہیئے۔ اپنے وطن کے ھزاروں سال قدیم تقدّس کو نہ بھولئے۔ اپنی عظمت کو فراموش نہ کیجئے۔ اپنی پُرانی روایات کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائیے۔ کسی بھی ایسی روایت کی مذمت نہ کیجئے جو نہایت درجہ توہّم آمیز اور بعید از عقل معلوم ہوتی ہو کیوں کہ یاد رکھیئے کہ یہ روایات کسی نہ کسی صورت سے ضرور کارآمد رہی ہوں گی۔ اگر فی زمانہ ان روایتوں کی ضرورت نہیں رہی تو وہ خود بخود مٹ جائیں گی۔ تخریب میں اپنی طاقتیں نہ صرف کیجئے۔ انھیں تعمیری کام میں لگائیے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھیئے کہ دُنیا میں کوئی ایسا مُلک نہیں ہے جس کی روایات اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ہمارے مُلک کی روایات کے بمقابلہ کسی صورت سے بھی زیادہ بہتر ہوں۔ میں نے دُنیا کے ہر مُلک میں ذات پات کا رواج دیکھا ہے۔ لیکن کسی ملک میں بھی اس رواج کا منصوبہ اور مقصد اِس مُلک کے بمقابلہ زیادہ شاندار نہیں پایا۔ ہر انسانی سماج میں تفرقات کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اگر ذات پات کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔ اگر ہر شخص کو کسی نہ کسی ذات میں شامل ہونا ہے تو میں اپنے لئے وہ ذات اختیار کروں گا۔ جو پاکیزگی۔ تمدّن اور قربانی کی قائل ہو۔ زرداروں سے تعلق رکھنا مجھے ہرگز پسند نہیں آسکتا۔ میری نظر میں بھگوان اور بھگوان کے بھگتوں اور پجاریوں کی ذات ، روپیے والوں کے پجاریوں کی ذات سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر آپ کو مجھ سے اتفاق نہیں تو نہ سہی آپ اپنے ہم خیال لوگوں میں شامل ہو جائیے۔ میری تو آپ سے یہی درخواست ہے کہ اوروں کو بُرا بھلا مت کہیئے کسی پر بھی خواہ مخواہ نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیجئے۔ اسی کے لئے تو آپ نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے۔

اگر آپ کے دل میں واقعی درد ہے اگر آپ سچ مچ قوم اور مُلک کی بلکہ دنیا بھر کی خدمت

کرنا چاہتے ہیں تو اُس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ لب بستہ اور دل کُشادہ رہیئے۔ دنیا کا سُدھار خاموش اور پُرخلوص کام ہی سے ہو سکتا ہے۔ جب تک آپ اپنے دل و جگر کی وسعتوں میں سارے جہاں کا درد نہیں سمو لیتے جب تک آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ دنیا کی نجات کا تمام بوجھ آپ کے کندھوں پر ہے اس وقت تک کوئی بھی ٹھوس تعمیری کام مشکل ہے اور یہ احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ اپنی رُوحانیت سے آگاہ ہو جاتے ہیں جب ساری کائنات آپ کی محبّت میں بس جاتی ہے اس لئے میں آپ سے بار بار کہوں گا کہ پہلے ویدانت کے نُور سے اپنا دماغ منوّر کیجئے پھر اس روشنی کو گھر گھر پہونچایئے۔ اپنی زندگی میں اس کی مثال قائم کیجئے تاکہ لوگ اس کی تقلید کر سکیں۔ آپ اپنے میں اِس رَبّانیت کو بیدار کیجئے جو ہر رُوح میں پوشیدہ اور خوابیدہ ہے اور اس یزدانی طاقت کا سہارا لے کر خدمتِ خلق کے کاموں میں لگ جایئے۔ کامیابی یا ناکامیابی، فتح یا شکست نصیبوں سے ہے لیکن خود اسی بات سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے کہ 'مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا' یہ احساس بجائے خود غنیمت ہے کہ آپ ایک اہم مقصد کے لئے جی رہے ہیں۔ ایک اعلیٰ آدرش کو حاصل کرنے کی خاطر سرگرم عمل ہیں اور اسی کے لئے آپ نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے، محض اسی خیال سے ہی دل کو شانتی ملتی ہے لیکن میں ویدانت کے فلسفۂ یک جان و بسیار قالب کی تعلیم محض دل کی تسلی کے لئے نہیں دے رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو اس تعلیم پر عمل کرنے سے پورا نہ ہو سکے۔ ہماری کامیابی یقینی ہے، کامرانی ہماری اصل ہے خدمتِ خلق کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیجئے۔ تمام بنی نوعِ انسانی کی دنیا و عقبےٰ کی نجات اسی میں ہے۔

بھگتی یوگ (عشقِ الٰہی)

(۱) بھگتی کی تعریف

स (तन्मयो) ह्यमृत ईशसंस्थो ज्ञ: सर्वगो भुवनस्यास्य गोप्ता ।
य ईशेऽस्य जगतो नित्यमेव नान्यो हेतुर्विद्यत ईशनाय ॥
यो ब्रह्माणं विदधाति पूर्वं यो वै वेदांश्च प्रहिणोति तस्मै ।
तंह देवं आत्मबुद्धिप्रकाशं मुमुक्षुर्वै शरणमंह प्रपद्ये ॥ [ل]

وہ کائنات کی رُوحِ رواں وہ اصلِ حیات — کہ جس کے سامنے ممکن نہیں خیالِ ممات
وہ حکمرانِ دو عالم۔وہ شاہِ جن و بشر) — (ہے جس کے حکم سے قائم نظامِ شام وسحر)
زمیں سے تا بفلک جس کی حکمرانی ہے — ازل سے تا بہ ابد جس کی پاسبانی ہے
شعور و دانش و علم و ہنر کا سرچشمہ — (بشر کی معرفت خود نگر کا سرچشمہ)
مقام جس کا معیّن نہیں جو ہر سُو ہے — (چمن چمن ہے جو رنگ اور رَوش روش بُو ہے)
(وہ ایک خالق و پروردگار ہے سب کا — وہ کارساز و مددگار و یار ہے سب کا)
وہ سب کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے — وہ رُوح و تن کے خزائن سے خوب واقف ہے
زماں میں ہے وہی ناظر مکاں میں حاضر ہے — (وہ آپ غیب ہے وہ آپ ہی مظاہر ہے)
(وہ بے نیاز و صمد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ — وہ لاشریک واحد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ)

[ل] اِس شلوک کا ترجمہ کرتے وقت میں نے اسکے مرکزی خیال کو پھیلا کر بیان کیا ہے جو شعر یا مصرعہ یا مصرعے کا حصہ اصل کے مطابق نہیں ہے۔ اُسے واوین میں بند کر دیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

نہیں ہے اور کوئی بھی جہاں میں جس کے سوا
وہی ہے خالقِ ہستی وہی ہے سب کا خُدا
اُسی کے دَم سے حیاتِ شعور پلتا ہے
(دماغ و دل میں اُسی کا چراغ جلتا ہے)
اُسی کی ذاتِ منوّر سے ہے برہم پیدا
اُسی نے برہمّ کو بخشی ہے ویدوں کی وِدیّا
وہی ہے وید وہ انجیل ہے وہی قرآن
(وہی اوستھا کا نغمہ وہی ہے اوم کی جان)
اُسی کے حُسن کا آئینہ سب پیمبرؐ ہیں
اُسی کے نغمے کی آواز یہ سخنور ہیں
نجات جو ہوں میں اُس کی شَرَن میں آیا ہوں
متاعِ زیست لُٹانے کو آج لایا ہوں
اُسی کے کرتا ہوں دن رات میں تلاش قدم
نجات بخش خودی سوز، نور پاش قدم
وہ نور جس میں بصیرت ہے شوقِ جلوہ ہے
وہ نُور جس سے مری اپنی ذات پیدا ہے

بھگتی یوگ (عشقِ الہٰی) کے معنی ہیں پرماتما (خدا) کی سچّی اور پُرخلوص تلاش۔ یہ تلاش پریم یا محبت سے شروع ہوتی ہے۔ پریم ہی سے یہ جاری رہتی ہے اور پریم ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ پرماتما کی انتہائی بھگتی میں صرف ایک لمحے کے لئے بھی دیوانہ ہو جانے سے دوامی آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ بھگتی کی جامع تعریف ناردجی نے ان الفاظ میں کی ہے "پرماتما کے ساتھ انتہائی پریم یا محبت کا نام بھگتی ہے"۔ جب کسی اِنسان کو یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو ساری کائنات اس کی محبت میں بس جاتی ہے۔ وہ سب سے محبت برتنے لگتا ہے کسی سے نفرت نہیں کرتا اور اس کو ہمیشہ کے لئے اطمینانِ قلب اور آسودگی کی نعمت عظمیٰ حاصل ہو جاتی ہے یہ محبّت قطعًا بے لوث ہوتی ہے۔ اسے دُنیوی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ جب تک دل میں ایک بھی خواہش باقی رہتی ہے۔ عشق الہٰی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ بھگتی یوگ کا پایہ دوسرے سب یوگوں (کرم یوگ۔ راج یوگ۔ اور گیان یوگ) سے بڑا ہے۔ کیونکہ ان یوگوں میں ایک مقصد (نجات) مدِّ نظر ہوتا ہے۔ لیکن بھگتی اپنا ثمرہ خود ہوتی ہے یہ خود ہی وسیلہ اور خود ہی مقصد ہے۔

بھگتی کے موضوع سے ہمارے قدیم رشیوں مُنیوں کو ہمیشہ اور مسلسل طور پر بڑی دلچسپی رہی ہے شانڈلیہ[1] اور نارد ایسے بزرگوں نے تو اس موضوع پر بالخصوص لکھا ہی ہے۔ ان کے علاوہ ویاس سوتر[2] کے بڑے بڑے مفسّروں نے بھی جو بظاہر گیان یعنی معرفت کے علمبردار ہیں۔ پریم یا بھگتی کے بارے میں اشارتاً بہت کچھ کہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ویاس سوتر کے کئی مُفسّروں نے بھگتی کے موضوع سے متعلق بیشتر پہلوؤں کی وضاحت کرنے

---

[1] SHANDILYA [2] Vyas Sutra.

کی کوشش کچھ اس انداز سے کی ہے کہ اُن پر گیان کا خشک مفہوم چھا جائے۔ لیکن وہ اس میں بہت حد تک کامیاب نہیں ہوئے۔ خصوصاً پوجا اور پرستش کے متعلق سوتروں کی تاویل میں اس قدر آورد ہے کہ اصل کو توڑ جوڑ کر اس سے گیان کے معنی نکالے جا رہے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بھگتی سوتروں کی تفسیر اس طرح ہو ہی نہیں سکتی ان کا اپنا مقام ہے۔

لیکن یہاں یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گیان اور بھگتی میں اتنا زیادہ فرق درحقیقت ہے نہیں جتنا لوگ سمجھ بیٹھے ہیں۔ آگے چل کر ہمیں معلوم ہوگا کہ دونوں راستے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں۔ دونوں ایک ہی دائرے کے دو قطر ہیں۔ جو ہمیشہ اپنے مرکز کی طرف مائل رہتے ہیں اور بالآخر اس مرکز پر پہونچ کر آپس میں مل جاتے ہیں۔ یہی حال راج یوگ کا بھی ہے۔ جب راج یوگ کو مُکتی یا نجات حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھ کر اس پر عمل کیا جاتا ہے اور کم فہم لوگوں یا ضعیف الاعتقاد جاہلوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا آلۂ کار نہیں بنایا جاتا (بدقسمتی سے ڈھونگ بازوں اور اسرار فروشوں[ا] کے ہاتھوں اس کی مٹی اکثر اس طرح پلید ہوتی ہے)، تو ہم اُسی ایک منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔ جہاں اور طریقوں سے بھی رسائی ہوتی ہے۔

بھگتی کے مسلک کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ محبوبِ حقیقی کو پالینے کے لئے اِس سے زیادہ آسان اور کوئی طریقہ نہیں کیونکہ یہ مسلک ہمارے فطری رُجحان کے موافق ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ اپنے معیار سے گر کر عشق اکثر مذہبی دیوانگی اور تعصّب کی مکروہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی مثالیں آپ کو ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں سب میں ملیں گی۔

عشق جب اندھا ہو جاتا ہے تو جنون بن جاتا ہے۔ بھگوان کا بھگت جب بھگوان کو صرف اپنے لئے محدود اور مخصوص کرنا چاہتا ہے یا سب اپنے مخصوص معبود کی عبادت پر مجبور کرنا چاہتا ہے تو بھگتی خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آدمی دوسروں کو اپنے سے کم سمجھنے لگتا ہے اور اُن پر ہر طرح کے ظلم روا رکھنے لگتا ہے۔ یہیں سے تعصّب اور دیوانہ پن کی ابتدا ہوتی ہے بھگتی کے اسی پست مقام سے تعلق رکھنے والے عبادت گزاروں میں مذہبی دیوانے پیدا ہوتے ہیں۔ میں مانتا ہوں محبوبِ حقیقی کے کِسی خاص نام ہی کو واحد حقیقت مان کر بس اسی سے وابستگی رکھّے بغیر یعنی اس کو اپنا اشٹ مانے بغیر حقیقی محبت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اگر نظر میں وسعت نہ ہو تو یہی والہانہ محبت بسا اوقات تعصّب اور خود ستائی کو جنم

ا۔ CHARLATANS AND MYSTERY MONGERS.

دیتی ہے اور آدمی اپنے "رویہ" کے علاوہ باقی ہر طریقۂ کار کی مذمت کرنے لگتا ہے ۔ ہر ملک میں کمزور اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اپنے معبود کے ساتھ اُن کی محبت کا انداز بس یہی ہوتا ہے کہ دوسرو کے معبود کے ساتھ نفرت برتی جائے۔ اس طرح محبت مثبت خاصیت سے منفی نقص بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں دُنیا میں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے مخصوص معبود سے والہانہ طور پر محبت کرتے ہیں۔ جنہیں اپنے مذہبی آدرش سے قابلِ رشک عقیدت ہوتی ہے لیکن دوسروں کے معبود کا نام سُنتے ہی یا اس کی پرستش ہوتے ہوئے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی برافروختگی وحشیانہ تعصّب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ان کے ہوش و حواس تک بجا نہیں رہتے۔ اس قسم کی بھگتی تو کتّے کے جذبۂ وفاداری سے ملتی جُلتی ہے جو اپنے مالک کے مال و اسباب کی حفاظت اس لئے کرتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اسے اُڑا نہ لے جائے لیکن کُتّے کی یہ جبلّی خاصیت متعصب انسان کے شعور سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ کتّے کا مالک کسی بھی بھیس میں اس کے سامنے کیوں نہ آئے۔ کُتّا کبھی بھولے سے بھی اُس کو دشمن نہیں سمجھ سکتا۔ برعکس اس کے جو لوگ تعصّب کا شکار ہوتے ہیں۔ ان سے تمیز کی قوت رخصت ہو جاتی ہے ان کو ذاتی پاس اور لحاظ کا اس قدر خیال رہتا ہے کہ ان کے لئے دوسروں کی بات پر غور کرنا مشکل ہو جاتا ہے وہ یہ سوچنا ہی نہیں چاہتے کہ کسی اور کی بات کہاں تک دُرست یا غلط ہے ان کو تو بس یہی دیکھنا ہوتا ہے کہ بات کہنے والا کون ہے۔ اگر وہ اُن کا ہم مذہب ہے تو اس کی ہر بات درست ہے اور اگر اس کا تعلق کسی دوسرے فرقے یا مذہب سے ہے تو اس کی بات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت نیک رحم دل اور ایماندار ہونے کے باوجود اور اپنے ہم خیالوں کے ساتھ حد درجہ محبت برتنے والے ایسے لوگ ذاتی طور پر دوسرے مذہب یا فرقے کے لوگوں کے خلاف ذلیل سے ذلیل کاروائی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

لیکن اس خطرے کا امکان بھگتی کے اُس درجے میں ہوتا ہے جسے ابتدائی درجہ کی (گَونی[1]) بھگتی کہتے ہیں۔ جب بھگتی میں پختہ کاری آجاتی ہے۔ اور وہ اس منزل میں پہونچ جاتی ہیں جسے بلند ترین (پرا[2]) بھگتی کہتے ہیں تو اس قسم کے شرمناک تعصّب اور مذہبی دیوانگی کے اظہار کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ جس شخص پر اس بلند پایہ بھگتی کا غلبہ ہوتا ہے، وہ خدائے محبت کے اس قدر قریب پہونچ جاتا ہے کہ پھر اس کی ذات سے نفرت کے اظہار کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا۔

---

[1] गौणी [2] परा

ہم میں سے ہر شخص کو اپنی زندگی میں اپنا کیرکٹر یا کردار تعمیر کرنے کی صلاحیت میسر نہیں۔ لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ نہایت درجہ ارجمند کیرکٹر یا کردار وہی ہوتا ہے جس میں گیان بھگتی اور یوگ تینوں ہم آہنگ ہو کر شامل ہوتے ہیں۔ ایک پرندے کو اُڑانے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی دو بازو اور ایک دُم جسے پتوار کی طرح کام میں لاکر پرندہ جدھر چاہے مڑ جاتا ہے۔ انسان کی رُوحانی پرواز کے لئے ایک بازو گیان یعنی معرفت ہے اور دوسرا بازو بھگتی یا عشق الٰہی اور یوگ وہ دُم ہے جس سے توازن قائم رہتا ہے جو لوگ پرستش کے ان تینوں اجزا کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے۔ جو گیان بھگتی اور یوگ کے طریقوں پر ایک ساتھ عمل نہیں کر سکتے اور صرف بھگتی کو اپنا مسلک بنا لیتے ہیں ان کو یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ رُوحانی ارتقا کے ابتدائی مرحلوں میں رسم و رواج کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اِن تمام دستوروں اور رسموں کا مقصد ہمیں اِس منزل تک لے جانا ہے جہاں ہمارا دل خدا کی بے پایاں محبت میں سرشار ہو جاتا ہے۔ رسم و رواج کی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

بھگتی یا عشقِ الٰہی کی طاقت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ گیان یوگ اور بھگتی یوگ کے نظریوں میں اس قدر فرق ضرور ہے کہ گیانی لوگ بھگتی کو مُکتی یا نجات حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اور بھگت لوگ اس کو وسیلہ بھی مانتے ہیں اور مقصد بھی لیکن میرے خیال میں اس فرق کی دراصل کوئی حقیقت نہیں۔ یہ تو ایک ظاہری امتیاز ہے۔

بات یہ ہے کہ ابتدائی مراحل میں جب بھگتی پرستش کی صُورتوں میں نمایاں ہوتی ہے اس کی حیثیت واقعی ایک وسیلے کی ہوتی ہے جس کی مدد سے انسان رُوحانی ارتقا کی منزل تک پہونچنا چاہتا ہے لیکن آگے چل کر جب معبود کی حقیقت کا احساس ہونے لگتا ہے تو پرستش بھی اپنی ظاہری بندشوں سے آزاد ہونے لگتی ہے جیوں جیوں انسان اپنے خدا کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی پرستش بھی بلند صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور آخرکار معبود اور عبادت دونوں ایک ہو جاتے ہیں بھگتی کی یہ منزل گیان (عرفان) کی منزل بھی ہے۔ گیانی اپنے مخصوص طریقے یعنی گیان یوگ پر زور دیتے وقت پر یہ بھول جاتے ہیں کہ جب بھگتی کا جذبہ پُورے عروج پر پہونچتا ہے تو سچا گیان یا حقیقی علم خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح بھگتی پر زور دینے والے اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ کامل گیان سے سچی بھگتی کبھی جُدا نہیں ہو سکتی۔

آیئے آج اِن سب باتوں کو مدِّ نظر رکھ کر یہ دیکھیں کہ بھگتی کے بارے میں ویدانتی مفسروں کی کیا رائے ہے۔ مثلاً اورتی رسکرو پدیشت[۱] (आवृत्तिरसकृदुपदेशात्) سوتر کی وضاحت کرتے ہوئے

---

۱ AVRITTIRASAKRIDUPADESHAT.

اُردو میں اس سوتر کا
(بقیہ حاشیہ اگلا صفحہ پر)

بھگوان شنکر آچاریہ بھگتی کے متعلق فرماتے ہیں "جس طرح لوگ کسی بادشاہ کے وفادار دوست یا خادم کو راج بھگت کے لقب سے موسوم کرتے ہیں یا ایسے شخص کو گورو بھگت کہتے ہیں جو اپنے گرو کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے کو اپنا واحد مقصد سمجھتا ہے اسی طرح بھگوان کا بھگت بھی وہی ہے جس کو ہر وقت اُسی کی سیوا کا خیال ہو یا جس طرح خاوند پر جان دینے والی بیوی اپنے پیارے خاوند کے تصور میں محو و مستغرق رہتی ہے اسی طرح بھگوان سے پیار کرنے والا بھگت بھی بھگوان کی اشتیاق انگیز اور مسلسل یاد کو دل سے لگائے رکھتا ہے۔

اس خود سپردگی، اس دھیان اور اس لگن ہی کو بھگتی کہتے ہیں۔ دھیان سے کیا مراد ہے؟ صرف محبوب کی مسلسل یاد جو تیل کی دھار کی طرح کبھی ٹوٹتی نہیں۔ جب پرماتما کو اس طرح ہر وقت اور مسلسل یاد رکھنے کی مہارت حاصل ہو جاتی ہے تو ہر قسم کی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں کتب مقدسہ میں یاد کے اسی مسلسل عمل کو مکتی یا نجات کا وسیلہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ مسلسل یاد براہِ راست دیدار سے کسی طرح کم نہیں ہوتی دونوں کا درجہ برابر ہوتا ہے آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر یاد کو دیدار کی برابری کیونکر حاصل ہو سکتی ہے اور پھر اس سے نجات کیسے ملتی ہے۔ اس کی وضاحت میں شری شنکر آچاریہ نے پہلے تو مندرجہ ذیل بیان کا حوالہ دیا ہے کہ "جب اس ہستی کا دیدار ہو جاتا ہے جو دور بھی ہے اور نزدیک بھی تو انسان کی تمام بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اُس کے دل میں جو بھی شکوک ہوتے ہیں وہ مٹ جاتے ہیں اور کرم (کام) کے تمام سنسکار یعنی تاثرات معدوم ہو جاتے ہیں"۔ اس کے بعد بھگوان لکھتے ہیں "جو قریب ہے اس کو ضرور دیکھا جا سکتا ہے لیکن جو دور ہے اس کو صرف یاد ہی کیا جا سکتا ہے" اس کے باوجود کتب مقدسہ کا ارشاد ہے کہ ہم کو نہ صرف اس کا دیدار کرنا ہے جو قریب ہے بلکہ اس کو بھی دیکھنا ہے جو دور ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی یاد کا ذکر ہمارے یہاں کیا گیا ہے اس میں احساس کی اتنی شدت ہوتی ہے کہ اس کو دیدار کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

دراصل مسلسل یاد کا یہ عمل بڑھتے بڑھتے اُس بلندی پر پہونچ جاتا ہے جہاں یہ دیدار ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شدید اور مسلسل یاد (یعنی دھیان) دیدار کے برابر ہے پھر بھی یہ کیونکر ثابت ہوتا ہے کہ دھیان سے نجات کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ یہاں دیکھنا ہے کہ پرستش یعنی پوجا پاٹ کسے کہتے ہیں۔ ہماری کتبِ مقدسہ کے نفسِ مضمون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پرستش سے مراد ہے مسلسل یاد۔ عرفان و آگہی پرستش کے سلسلۂ عمل کی ہی آخری کڑی ہے۔ جس چیز کو ہم علم کہتے ہیں وہ آخر کسی چیز کی مسلسل یاد ہی تو ہے۔ شرتی میں لکھا ہے کہ جب بھگوان کی یاد کو براہِ راست مشاہدے کا بلند درجہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مفہوم یہ ہے کہ دھیان یا مراقبہ ضروری ہے جس کی بسا اوقات تعلیم دی جاتی ہے۔

حاصل ہو جاتا ہے تو وُہ موکھش کا سادھن یعنی نجات کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اُس کی وجہ یوں بیان کی جاتی ہے "اس کی آتما (ذات) کی بارگاہ میں رسائی نہ تو طرح طرح کی سائینسوں (حکمتوں) کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل و خرد کے زور سے اور نہ ہی دیدوں (یعنی مقدس مذہبی کتابوں) کے کثیر مطالعہ کی مدد سے یہ معراج حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کو آتما چاہے بس وہی اس کو پا سکتا ہے اُسی پر یہ آتما خود کو منکشف کرتی ہے محض سُننے اور سوچنے اور دھیان کرنے ہی سے آتما کا دیدار حاصل نہیں ہوتا جس کو آتما چاہے وہی اُس تک پہونچ سکتا ہے"۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ طریقہ عمل کیا ہے جس سے آتما اپنا انکشاف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ جو چیز بہت زیادہ محبوب ہوتی ہے اسی کی تمنا بھی کی جاتی ہے آتما بھی اپنے محبوب کی متمنّی ہے۔ جس کو آتما سے انتہائی عشق ہوتا ہے آتما بھی اُس کو اپنا محبوب بنا لیتی ہے اور پھر اپنے اس محبوب کو اپنے تک لے آتی ہے۔ بھگت کو بھگوان کے پانے میں بھگوان خود مدد کرتا ہے۔ بھگوان نے فرمایا ہے "جو ہمیشہ مجھ سے لَو لگائے رکھتے ہیں اور پریم کے ساتھ میری یاد کرتے ہیں۔ مجھے بڑی بھگتی سے پوجتے ہیں میں اُن کی قوت ارادی کو وہ راستہ دکھا دیتا ہوں جس کے ذریعہ ان کی رسائی مجھ تک ہو جاتی ہے اِسی لئے کہا گیا ہے کہ "جو شخص بھگوان کے دھیان یعنی اس مسلسل یاد کو عزیز رکھتا ہے جو براہ راست مشاہدے ہی کی ایک شکل ہے وہ بھگوان کو ضرور پا لیتا ہے کیونکہ یہ دھیان خود اس ہستی (یعنی پرماتما) کو عزیز ہے جس کی دائم یاد ہماری آرزو اور جس کا دیدار ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ ایسا شخص پرماتما کو بھی محبوب ہوتا ہے ایسے بھگت کی بھگوان کو خود تلاش ہوتی ہے وہ پرماتما کو پا لیتا ہے۔ بھگتی کی تعریف دُوسرے رشیوں، مُنیوں نے بھی انہیں الفاظ میں کی ہے بھگوان بادراین نے اتھاتو برہم جگیاسا[۱] (

) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بھگتی سے مُراد ہے پرماتما کی مسلسل یاد جو دیدار کے برابر ہے" اِسی طرح پاتنجلی رشی کا ایک سُوتر ہے ایشور پرانی دھناودا (ईशवर प्रानी धना०द) "پرماتما (مالک کل) کی پرستش۔ اس سُوتر پر بھوج[۲] نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے "پرانی دھن[۳]" بھگتی کے اس جذبے کو کہتے ہیں جس میں کسی ثمرے مثلاً لذاتِ نفسانی وغیرہ کی خواہش کے بغیر تمام کرم (اعمال) اُس ہستی کو سپرد کئے جاتے ہیں جو گرُودں کی بھی گورو ہے (مرشدوں کی بھی مرشد ہے) ہادیوں کی بھی ہادی ہے۔ بھگوان ویاس[۴] نے بھی اس سُوتر کی تفسیر کرتے ہوئے "پرانی دھن" کو بھگتی کی وہ شکل قرار دیا ہے جس کے ذریعہ مالکِ کُل" کا رحم و کرم یوگی پر نازل ہو جاتا ہے اور وہ اُس کی (وصل الٰہی اور نجات) خواہشات کی تکمیل کر کے اس کو برکاتِ یزدانی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

۱ अथातो ब्रह्मजिज्ञासा ۲ Bhoj. ۳ Pranidhan. ۴ Vyas.

سے مالا مال کر دیتا ہے۔ شانڈلیہ[1] رکھیشور لکھتے ہیں "بھگتی پرماتما کے ساتھ انتہائی پریم یا محبت کو کہتے ہیں" لیکن اس کی بہترین تعریف بھگت راج پرہلاد[2] نے پرارتھنا کی صورت میں فرمائی ہے۔ بھگوان کو مخاطب کرتے ہوئے وہ یوں دعاگو ہوتے ہیں۔

या प्रीतिरविवेकानां विषयेष्वनपायिनी ।
त्वामनुस्मरतः सा मे हृदयान्मापसर्पतु ॥

یعنی بھگوان جیسا نہ مٹنے والا اندھا پیار دنیا والے کم فہمی اور جہالت کے باعث دنیا کی چند روزہ چیزوں سے رکھتے ہیں، ویسا ہی شدید اور لافانی پیار اپنے چرنوں کا مجھے عطا کرنا تاکہ جب میں تیرا دھیان کروں تو تیری والہانہ اور جاودانی محبت میرے دل سے کبھی دور نہ ہو[4]۔ تو یہ ہے بھگتی۔ پرماتما سے پریم اور ایشور سے لگن اس ذاتِ مطلق سے عشق کیسی اور چیز کے ساتھ محبت خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ اس کو بھگتی کا درجہ نہیں دیا جاسکتا جیسا کہ سری رامانج آچاریہ نے اپنی تصنیف سری بھاشیہ[3] میں فرمایا ہے۔

---

[1] Shandilya [2] Prahalad [3] Sri Bhashya

[4] اس خیال کی بنیاد پر بھگتی کے رنگ میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

جو پیار مجھے دنیا سے ہے	جو پاگل پن جو اندھا پن
اپنے چرنوں سے میرے پربھو	بخشو وہ لگاوٹ وہ بندھن
دنیا کا یہ فانی پیار مٹے	لگ کے نہ مٹے پر تیری لگن
جگ پریت کے گیت بہت گائے	شکتی دو کروں تیرا درشن
مر مٹتا ہوں دھن دولت پہ	تجھ پر ہو نچھاور تن من دھن
جس مستی پر جاں دیتا ہوں	اس سے بھی زیادہ کر دے مگن
تم ست چت آنند پربھو	نے روپ نہ نام تیرا بھگون
پر داس کی خاطر راس رچے	ق حاضر ہے یہ تن من کا آنگن
آنکھوں میں چھپی تیری ناچے	پھولا نہ سمائے میرا من
مایا نے نچایا ناچ مجھے	اب کرتی آئے یہ چھن چھن
اب تیری نظر سے دیکھوں میں	اب یہ نہ لبھائے میرا من
پھر ہاتھ نہ اس کے آؤں میں،	جتنا بھی لگائے چاہے جتن،
پھر پیار کروں دنیا سے میں	اس پیار سے ہو سوا اُتپن

आब्रह्मस्तम्बपर्यन्ताः जगदन्तर्व्यवस्थिताः ।
प्राणिनः कर्मजनितसंसारवशवर्तिनः ॥
यतस्ततो न ते ध्याने ध्यानिनामुपकारकाः ।
अविद्यान्तर्गतास्सर्वे ते हि संसारगोचराः ॥

مطلب یہ کہ برہما سے لے کر گھاس کے تنکے تک اس دنیا کی ہر چیز کرم (اعمال) سے پیدا شدہ جنم مرن کے سلسلے میں گرفتار رہتی ہے۔ ہر شے جہالت کی تاریکیوں میں بسی ہوئی ہے کسی چیز کو ثبات نہیں۔ لمحہ بہ لمحہ تغیر کا سلسلہ برابر چل رہا ہے۔ اس لئے دُنیا کی کوئی چیز اس قابل نہیں جس سے دل لگایا جائے جس پر دھیان جمایا جائے اور جس سے محبت کی جائے سچی محبت کے قابل بس ایک ہی ہستی ہے۔ اسی بات کو سوپنیشور[1] نے مہرشی شانڈلیہ کی اصطلاح انورکتی (अनुरक्त) کی تفسیر کرتے ہوئے یوں سمجھایا ہے۔ انو (अनु) سے مراد ہے پیچھے یا بعد اور رکتی سے مراد ہے لوٹ یا وابستگی تو انورکتی کے معنی یہ ہوئے کہ جو وابستگی قدرت اور اور قادر مطلق سے آگاہی ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہی سچی محبت ہے ورنہ بیوی بچوں کی محبت یا کسی اور چیز سے وابستگی پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا تھا ظاہر ہے کہ بھگتی اُن دماغی کاوشوں کے تسلسل کا نام ہے جو مذہبی عرفان کے سلسلے میں کی جاتی ہیں۔ جن کا آغاز ہوتا ہے معمولی پُوجا پاٹھ سے اور جن کا خاتمہ ہوتا ہے ایشور کی پرم بھگتی یعنی خدا کی بلند ترین درجے کی محبت پر۔

۱؎ Swapneshwar

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

یہ پیار تمہاری پُوجا ہو — جس میں تن من دھن ہو ارپن
سب چھوٹوں بڑوں کو اپناؤں — مٹ جائے یہ دل کا چھوٹا پن
جب دل میں بسے گی سب دُنیا — تم خود آجاؤ گے بھگون
تم ست چت آنند پر بھو تی — پر نام روپ کا یہ بندھن
اِک داس کی خاطر لے لو گے — کر لوں گا میں من بھر پُوجن
لپٹوں گا ان سے جی بھر کے — چوموں گا میں تیرے پاک چرن
پلکیں جو اُن پر رکھ دوں گا، — بن جائیں گے آنسو دُرِ عدن
جو بہہ جائیں گے دو قطرے — بن جائیں گے آب گنگ و جمن
چرنوں کو جو مستک چھو لے گا، — تو رشک کرے گا مجھ پہ گگن
اُس وقت نہ جانے کیا ہو گا
جب گلے لگا لو گے موہن

بھگتی یوگ کا قدرتی پن
اور
اُس کا مرکزی راز

ارجن نے بھگوان کرشن سے سوال کیا "کچھ لوگ مُسلسل یکسُوئی سے آپ کی پرستش کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس ہستی کو پُوجتے ہیں جو ہر قسم کی تفریق وتمیز سے بالاتر ہے جس کا وجود مُطلق ہے۔ اِن دونوں میں سے کس طبقے کے لوگ زیادہ بڑے یوگی ہوتے ہیں"۔ بھگوان نے جواب میں کہا" جو لوگ میری ذات پر اپنے دل ودماغ کو مرکوز کردیتے ہیں۔ دوامی تسلسل کے ساتھ مجھ کو پُوجتے ہیں مجھ پر پُوری طرح ایمان لاتے ہیں اور جن میں مکمل عقیدت ہوتی ہے وہ میرے بہترین عبادت گزاروں میں ہیں اور دراصل وہی بڑے یوگی ہوتے ہیں۔ جو لوگ ایسی ہستی کی پرستش کرتے ہیں جو اپنی جگہ مطلق ہے۔ مختارِ کُل ہے جو حرف وبیان کی زد میں نہیں آتی جو غیر متفرق اور ناممکن القیاس ہے۔ حاضرِ کُل ہے اور ہمہ گیر۔ لاجنب اور جاودانی ہے۔ ان لوگوں کی رسائی بھی بالآخر مجھ ہی تک ہوتی ہے کیونکہ میں ہی سب کی آخری منزلِ مقصود ہوں لیکن جن لوگوں کے دل نراکار برمھ یعنی غیر متشکّل ہستی مُطلق کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ ان کی رَاہِ عمل زیادہ دشوار ہوتی ہے۔ کیونکہ مُجسّم روح کے لئے غیر مجسم حقیقت تک پہنچنا نہایت مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان لوگوں کو خود اپنے سہارے تمام حواس کو قابو میں لانا پڑتا ہے اُنھیں سب چیزوں کی یکتائیت میں یقین رکھ کر اور تمام ذی رُوحوں کو برابر جان کر اُن سے ہر حالت میں نیک

سلوک کرنا اور ہر وقت دوسروں کی بھلائی کے کام میں مصروف ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جو لوگ مجھ پر مکمل طور پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے سب اعمال مجھ سے معنون کر کے مجھے سونپ دیتے ہیں جو اپنے تمام کرموں کا پھل میرے سپرد کر دیتے ہیں جو میرے ہی دھیان میں مشغول رہتے ہیں اور کسی چیز کے ساتھ وابستگی کے بغیر مجھے پوجتے ہیں میں ان کو جنم مرن کے سمندر میں بار بار ہچکولے کھانے سے بچا لیتا ہوں۔ انھیں اپنی شرن (پناہ) میں لے لیتا ہوں کیونکہ اُن کا دل ہمیشہ کلیتاً مجھ ہی وابستہ رہتا ہے۔"

بھگوان کرشن اِس بیان میں گیان یوگ اور بھگتی یوگ دونوں کا ذکر آجاتا ہے۔ اس میں دونوں یوگوں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ گیان یوگ کی عظمت و شوکت کا کیا کہنا اس عظیم الشان فلسفے کی بلندی سب تسلیم کرتے ہیں پھر بھی عجیب بات یہ ہے کہ ہر آدمی سمجھتا ہے کہ میں یقیناً اس فلسفے کی ہر ہدایت پر عمل کر سکتا ہوں بہت کم لوگ اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ فلسفے کے مطابق صحیح معنوں میں زندگی بسر کرنا بڑا مشکل کام ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش میں ہمیں بڑے خطروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے کہ انسان فلسفے کو توڑ مروڑ کر من مانی باتیں کرنے لگتا ہے اس دُنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک وہ جن کی خصلت شیطانی ہوتی ہے اور جو صرف جسمانی عیش و آرام ہی کو اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی خصلت رحمانی ہوتی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ جسم صرف زندگی کے مقصد یعنی معرفت اور وصل الٰہی کے حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ ایک ایسا آلہ کار ہے جس کی مدد سے رُوح کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ عام دیکھنے میں آتا ہے کہ صرف نیک خصلت انسان ہی نہیں بلکہ شیطان سیرت آدمی بھی اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے کتبِ مقدسہ کے خوب حوالے دیتا ہے۔ فلسفیانہ نظریوں اور دینی احکام سے شیطان اس طرح کام لیتا ہے گویا یہ اسی کی حرکات کی حمایت کے لئے لکھے گئے ہوں۔ فلسفہ یا گیان یوں تو ہمیں نیک اعمالی کی جانب مائل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن بسا اوقات گیان کے نظریئے نا اہلوں اور نابکاروں کے لئے بُرے افعال کا جواز مہیا کر دیتے ہیں لیکن بھگتی یوگ میں اِس قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ بھگتی یوگ عین فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ بھگتی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اس میں مٹھاس اور نرمی ہوتی ہے۔ بھگت گیان یوگی کی طرح بلند پروازی سے کام نہیں لیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُسے پستیوں میں گرنے کے خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن اس کی کامیابی یقینی ہے اس کی مدد بھگوان خود کرتے ہیں۔ اور آخر وہ تمام بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ جن میں رُوح گرفتار ہے، اسی کا نام نجات ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سب کو بھگتی کی راہ پر چلنا چاہیئے مقصد تو آزادی حاصل کرنا ہے۔ اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے رجحان کے مطابق انسان جو راستہ چاہے اختیار کر سکتا ہے مسلک کی نوعیت کچھ بھی ہو مطلب تو منزل سے ہے بھگتی سے اچھے اور بُرے بندھن کیونکر ٹوٹ جاتے ہیں۔

اِس کی مثال کرشن کی گوپیوں نے مہیا کی ہے بھگوان کے دھیان میں جو پرم آنند یعنی سرورِ مطلق ان کو حاصل ہوا اس کی رَو میں اُن کے نیک کاموں کے تاثرات بھی زائل ہو گئے اور سب خواہشات مٹ گئیں۔ محبوبِ حقیقی کی فرقت میں ان کو جو شدید روحانی اذیت ہوئی اِس سے ان کے تمام گناہ دُھل گئے۔ خرابُ جاناں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس طرح اُن کو مکتی یا نجات حاصل ہو گئی۔[1] بھگتی یوگ کا مرکزی راز اس بات کے جاننے میں مضمر ہے کہ انسان کے دل میں جو مختلف قسم کے احساسات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود غلط نہیں ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اُن کو نہایت احتیاط کے ساتھ زیرِ قابو لایا جائے اور ان کو رہنمائی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ بلند سطح پر پہنچایا جائے تاکہ بالآخر وہ انہیں بلند ترین مقام حاصل ہو جائے جہاں پہونچ کر ان تمام احساسات اور جذبات کا رُخ خُدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ جب تک ہمارے جذبات اور احساسات عشقِ الٰہی کے اِس مقام پر نہیں پہونچ جاتے۔ اس وقت تک ہم محبت کے پست مقام سے گزرتے ہوتے ہیں۔ مسرت اور اذیت کے احساسات ہماری زندگی کا حصّہ ہیں۔ اور ان سے ہم کو آئے دن بار بار سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ہمیں ہر بار ان کی رہنمائی کرنا ہو گی۔ جب کسی انسان کو اذیت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو دولت یا ایسی ہی اور کوئی دنیوی چیز میسر نہیں تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے احساس کا رُخ غلط راستے کی طرف ہے اُس کو دُکھ تو اس بات کا ہونا چاہیئے کہ اس کی رسائی محبت کی بلند ترین معراج تک نہیں ہو سکی۔ وہ خُدا تک نہیں پہونچ سکا۔ یہ دُکھ اس کی نجات کا باعث ہو گا۔ اسی طرح اگر آپ کے ہاتھ میں چند سکے آ جاتے ہیں اور آپ بڑے خوش ہوتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ اس خوشی کا رُخ تو صحیح نہیں اُس کا رُخ تو بلندی کی طرف ہونا چاہیئے۔ اس سے آپ کو بلند ترین آدرش کی تکمیل کا کام لینا چاہیئے آپ کو خوشی ہونا چاہیئے بھگوان کو پانے کی۔ اس قسم کے آدرش کی تکمیل سے جو مسرت ہو گی وہ بلند نوعیت کی مسرت ہو گی۔ دوسرے قسم کے احساسات پر بھی یہی کُلیہ عائد ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے بھگوان کے بھگت انسانی جذبات و احساسات میں سے کسی ایک چیز کو بھی غلط نہیں سمجھتے وہ تمام احساسات کا رُخ پرماتما کی طرف اِس طرح پھیر دیتے ہیں کہ وہ اسی کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اور بھگت بھگوان میں لین ہو جاتا ہے:

तच्चिन्ता विपुलाह्लाद क्षीणपुण्यचया तथा ।
तदप्राप्ति महद्दु:ख विलीनाशेष पातका ।।......
निरुच्छ्वसतया मुक्ति गतान्या गोपकन्यका ।।

---

[1] ماخوذ از وشنو پُران

عشق حقیقی اور بیانِ مجاز

بھگوت بھگتی یا عِشق الٰہی کے بلند ترین اور مکمل آدرش یا نصب العین کی نوعیت کا اظہار انسانی زبان میں ناممکن ہے۔ انسانی تخیّل خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اس میں اِتنی صلاحیت نہیں کہ عشقِ الٰہی کے لامحدود کمال اور حُسن کو تصوّر میں بھی لا سکے اس مشکل کے باوجود ہر ملک میں مذہبِ عشق کے پیرو خواہ ان کا مقام بلند ہو خواہ پست ہمیشہ اپنی محبّت کے آدرش کو سمجھنے اور اپنے ذاتی جذبات عِشق کی وضاحت کے لئے ناکافی اور خام انسانی زبان ہی استعمال کرتے آئے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس عِشق حقیقی کی ناقابل اظہار نوعیت کو مثال کے ذریعہ پیش کرنے میں عِشق مجازی کے گوناگوں پہلوؤں سے کام لیتے آئے ہیں حقیقت کا خاموش احساس اور چیز ہے اور اس کا بیان دُوسری چیز انسان خدا کو پا سکتا ہے لیکن الہیاتی چیزوں کا تصوّر خود اپنی فطرت کے محدُود دائرے ہی میں کر سکتا ہے۔ ذات مطلق کا مکمّل شعور و احساس ممکن ہے لیکن مجاز کی زبان میں اس کا بیان ممکن نہیں اور جب ہم حقیقت کو مجاز کا لباس پہناتے ہیں۔ تو ذات مطلق کو اضافی رنگ دے دیتے ہیں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے غور سے دیکھا جائے تو تمام عالمِ کائنات کے وجُود کا شعور و ادراک دراصل لامحدُود حقیقت کی مجازی حد بندی ہے جیسے خیال کی مجازی اور محدود صُورت ہوتی ہے ویسے ہی نشان اور بیان بے کنار خدا کی مجسّم صُورتے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بھگوان کے بھگت عِشق مجازی کی عام اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں[1]

بیان کی اِن حدُود کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عِشق الٰہی کی مختلف صُورتیں و مدارج

---

[1] ۔ ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کیا ہیں بڑے بڑے لکھنے والوں نے اس موضوع پر اپنے تجربات اور اپنی سمجھ کے مطابق اسی کی کئی صورتیں واضح کی ہیں اور اس کے مختلف مدارج بیان کئے ہیں بھگتی کی پہلی صورت "شانت بھاؤ" (پُر سکون طبیعت) کی ہے اس سکون کے مقام پر عشق میں اضطراب نہیں ہوتا۔ دل میں محبت کی آگ نہیں بھڑکتی۔ بھگت یعنی عاشق کے دماغ میں عشق دیوانگی کی حد تک خلل انداز نہیں ہوتا ایسا عاشق (بھگت) چُپ چاپ خدا کی پرستش کرتا رہتا ہے وہ مروجہ رسم ورواج اور دینی دستوروں اور طریقوں سے کچھ تھوڑا ہی بلند اٹھ سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بڑی آہستہ روی سے کام لیتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی رفتار میں بگولوں کی سی تیزی ہوتی ہے۔ شانت بھاؤ (پُر سکون) بھگت اوّل الذکر لوگوں کی طرح ہوتے ہیں اُن میں اضطراب نہیں ہوتا وہ سکون پسند اور نرم دل ہوتے ہیں۔

پُر سکون بھگتی میں جب جذبات کی لہریں اٹھتی ہیں تو وہ عام سطح سے اُوپر اُٹھنے لگتی ہے جب یہ جذبات خدمت گزاری کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ہم ایسی بھگتی کو داسیہ کہتے ہیں بھگتی کا یہ بھاؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان خود کو پرماتما کا خادم (داس) سمجھتا ہے اپنے آقا کے ساتھ ایک وفادار ملازم کی حیثیت سے وابستگی ہی اس کا آدرش یا نصب العین ہوتی ہے۔

جذبات کی لہریں جب اور اُوپر اُونچی اُٹھتی ہیں تو سکھیہ بھاؤ (सख्य भाव) یعنی جذبہ دوستی تک جا پہونچتی ہیں۔ بھگت بھگوان سے کہنے لگتا ہے کہ تو میرا محبوب دوست[1] ہے۔ جس طرح

---

[1] مندرجہ ذیل اشعار میں خدا کو دوست کی صورت میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

میرے جیون کا من کا ساتھی	کب کوئی مجھ سے جدا ہوتا ہے
ہر نفس ساتھ مرے چلتا ہے	ہر قدم راہ نما ہوتا ہے
بخش دیتا ہے خطائیں ساری	ضامنِ لغزشِ پا ہوتا ہے
وہی منزل ہے وہی شوقِ سفر	وہی خود بانگِ درا ہوتا ہے
میں جسے کہتا ہوں میرا میرا	سب اُسی کا تو دیا ہوتا ہے
سانس بن کر مری ہوتا ہے رواں	ہر نفس بادِ صبا ہوتا ہے
خون میں جوشِ جوانی ہے وہی	سر میں سودائے وفا ہوتا ہے
دردِ دل بن کے کبھی اُٹھتا ہے	بڑھ کے پھر خود ہی دوا ہوتا ہے
خود ہی خوں کرتا ہے میرے دل کا	خود ہی پھر خون بہا ہوتا ہے

دوست دوست کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے اسی طرح بھگت بھگوان کو اپنا رازداں بنا لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ اُس کا دوست یہ ہم دم کا ساتھی کبھی اُس کی خامیوں پر نکتہ چینی کرے گا۔ بلکہ وہ اُن خامیوں کے باوجود اُسکی مدد ہی کرے گا۔ جیسے دو دوستوں کے درمیان برابری کا تصور ہی کارفرما رہتا ہے ویسے ہی بھگت اور بھگوان کے درمیان بھی دوستی اور برابری کا جذبۂ محبت موجزن ہو جاتا ہے، مَن و تُو کا فاصلہ کم ہونے لگتا ہے اور خدا ہمارا دوست بن کر ہمارے زیادہ نزدیک آ جاتا ہے اور ہم اس سے بحیثیت دوست اور ہمدم کے اپنی زندگی کی تمام داستان بلا تکلف کہہ سکتے ہیں اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں کے تمام راز اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہوتا ہے کہ وہ ہماری حفاظت اور حمایت کرے گا کیونکہ اس مقام پر بھگت بھگوان کو فقط اپنا برابر کا دوست اور ہمدم ہی نہیں بلکہ اس کو اپنے کھیل کا ساتھی سمجھتا ہے حق تو یہ ہے کہ ہم سب اس عالمِ کائنات میں ایک طرح کا کھیل کھیل رہے ہیں جس طرح بچے مزے سے اپنے کھیل کھیلتے ہیں یا جس طرح راجے مہاراجے بے فکری سے شغل و شغب میں مصروف

(بقیہ حاشیہ)

خود ہی تاثیرِ دوا بنتا ہے — خود ہی اعجازِ دُعا ہوتا ہے
میری ہستی ہے اسی کے دم سے — کب کوئی اس کے سوا ہوتا ہے
وہی پیدا ہے سکوتِ لب میں — وہی نغموں میں چھپا ہوتا ہے
کبھی بنتا ہے سکونِ ساحل — کبھی طوفانِ بلا ہوتا ہے
ہے وہی نالہ و فریاد و فغاں — اور وہی نغمہ سرا ہوتا ہے
ہے وہی پردۂ خاموشی بھی — وہی خود سازو صدا ہوتا ہے
وہی ہیجانِ اناالحق ہے کبھی — کبھی تسکینِ رضا ہوتا ہے
لا الٰہ ہے وہی اِلا اللہ ہے — وہی ہر بُت میں بسا ہوتا ہے
ہو کے آنکھوں سے نہاں وہ اکثر — رُوح میں جلوہ نما ہوتا ہے
وہ شہنشاہِ دو عالم ہے مگر — خادمِ صدق و صفا ہوتا ہے
دوست ہر ایک کا ہے وہ لیکن — دشمنِ مکر و ریا ہوتا ہے
اُس کی ہر بات مجسم سچ ہے — اُس کا ہر وعدہ وفا ہوتا ہے
کیا کہوں ہمدمِ دیرینہ مرا — مجھے ملتا ہے تو کیا ہوتا ہے
شکرِ صد شکر کہ میرے لب پر — نہ شکایت نہ گلہ ہوتا ہے
بے طلب اُس کی نظر سے مجھ کو — ساغرِ کیف عطا ہوتا ہے

رہتے ہیں اسی طرح بھگت تبسل بھگوان (محبوب حقیقی) نے بھی اس عالم کائنات میں اپنی لیلا رچا رکھی ہے سوچا جائے تو اس کامل الاکمل ہستی نے جسے کسی چیز کی بھی احتیاج نہیں تخلیق کا یہ سب سلسلہ کیوں جاری کر رکھا ہے؟ آخر ہم کسی احتیاج کی تکمیل ہی کے لئے تو ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں احتیاج وہیں ہوتی ہے جہاں کوئی چیز ناتمام ہو۔ خدا کی ہستی مکمل ہے اس کو کوئی احتیاج نہیں تو اس کے پیش نظر اور کون مقصد ہے؟ اس نے تخلیق و تخریب کا یہ نظام کیوں جاری کر رکھا ہے؟ تخلیق کے مقصد سے متعلق ہم لوگوں نے بہت سی من گھڑت کہانیاں بنا رکھی ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں خود ہمارے ذہن کی اختراع اور اپج کا نتیجہ ہیں۔ اس دنیا کی پیدائش کے سلسلے میں خدا کے متعلق جو حکایتیں زبان زدِ خلائق ہیں وہ محض حکایتیں ہی ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔ جو ہستی ہر طرح سے مکمّل ہے جس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں اُس کے لئے مقصد کے کیا معنی؟ ظاہر ہے کہ اگر دنیا کا کوئی مقصد ہے تو خود خالق کی تفریحِ طبع کا سامان مہیّا کرنا ہے ہر طرف اسی کی لیلا رچی ہوئی ہے۔ یہ جنم مرن۔ یہ تخلیق و تخریب اور یہ ارتقا و انحطاط سب اسی کا کرشمہ ہے۔ یہ تمام عالمِ کائنات اس کے کھیل کا میدان ہے یہ تمام مذاہب محض اس کے تفنن طبع کا ایک ذریعہ ہیں اور فقط اسی کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم سب اس کھیل میں شریک ہو کر دیکھیں۔ خدا ہر وقت ہمارے ساتھ کھیل کھیلنے میں مشغول ہے زندگی کا لطف اسوقت آتا ہے جب ہم اس کو ایک کھیل سمجھ کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں اگر آپ مفلس اور بے زر ہیں تو کیا ڈر ہے؟ اس افلاس اور اپنی اس بے زری ہی کا ناٹک کھیل کر اس کا لُطف اُٹھائیے۔ اگر آپ دولت مند ہیں تو اپنی دولت مندی کا تماشا دیکھئے اس کا حظ اُٹھائیے اگر کسی قسم کے خطرات درپیش ہوں تو ان کو بھی محض کھیل سمجھ کر اُن سے گزر جائیے اور اگر عیش و آرام میسّر ہو تو پھر کیا۔ لگے ہاتھوں یہ کھیل بھی کھیل لیجئے۔ یہ دُنیا تو بس کھیل کا میدان ہے جہاں ہر وقت یزدانی کھیل جاری ہے ہم سب اس کھیل میں شامل ہیں خدا بھی اور بندے بھی۔ ہم یہ کھیل اسی کے ساتھ تو کھیل رہے ہیں خدا ہمارے کھیل کا دوامی ساتھی ہے۔ اس کو تو کھیلنے میں کمال حاصل ہے اس نے کتنا حسین نظام قائم کر رکھا ہے۔ کھیل کے دور چلتے ہیں ایک دور کے بعد یہ کھیل بھی تھوڑے یا زیادہ عرصے کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ گویا دم لینے کی فرصت دی جا رہی ہو۔ سستا لینے کے بعد پھر تمام کھلاڑی میدان میں آجاتے ہیں اور کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے لیکن آپ بھول جاتے ہیں کہ یہ سب سلسلہ ایک کھیل ہے جس میں آپ خود اپنی مرضی سے حصہ لے رہے ہیں اس سے حبس، ماور مجبوری کا غلط احساس پیدا ہو جاتا ہے اور قسم قسم کے مصائب اور آلام نمودار ہو جاتے ہیں دل ان کے بوجھ سے دبنے سا لگتا ہے اور دُنیا کی بے پناہ طاقت آپ پر غالب آجاتی ہے اور آپ کو

اپنا غلام بنالیتی ہے اس کا علاج یہی ہے کہ آپ اپنی حقیقت کو نہ بھولئے۔ ہمیشہ یاد رکھئے کہ آپ اُس یزدانی کھیل میں شامل ہیں جو مُسرت سے مُرتب و مُنظم ہے اور جس کا مقصد نشاطِ خودی ہے۔ جوں ہی آپ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں گے کہ ان چند روزہ تغیراتِ زمانہ کی فی نفسہٖ کوئی حقیقت ہے جُوں ہی آپ کو اس بات کا پختہ طور پر یقین ہوجائے گا کہ یہ تمام کائنات محض ایک اسٹیج ہے جس پر ہم خود خدا کے ساتھ مل کر زندگی کا ناٹک کھیل رہے ہیں اسی وقت یہ ساری مصیبتیں اور اذیتیں ختم ہوجائیں گی۔ دیکھئے تو خدا خود کس طرح ذرّے ذرّے کے اندر کھیل رہا ہے۔ اور کھیل ہی کھیل میں نہ جانے کتنے کرّہ ہائے زمین چاند سورج اور ستارے تخلیق ہو رہے ہیں دیکھئے تو وہ آدمی کے دل میں کس طرح چٹکیاں لے رہا ہے حیوان کے اندر کیونکر مضطرب ہے اور نباتات میں کیسے رگِ جان بن رہا ہے یا یوں کہیے کہ اُس نے ایک شطرنج بچھا رکھی ہے ہم سب اس شطرنج کے مہرے ہیں وہ مہروں کو شطرنج کے تختے پر رکھ کر ان کو خلط ملط کر دیتا ہے پھر کبھی ان کو ایک انداز سے ترتیب دیتا ہے تو کبھی دوسرے انداز سے رکھ لیتا ہے اور ہم سب شعوری یا بے شعوری کے عالم میں اس کھیل میں حصّے لے رہے ہیں۔ ہماری خوشی اسی میں ہے ہاں جن لوگوں کو اس بات کا شعور اور احساس ہے کہ وہ اس کھیل میں حصّہ لے رہے ہیں اُن کی مُسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

بھگتی کی تیسری صُورت کا نام واتسلیہ بھاوَ वात्सल्य भाव ہے اس تصوّر کے تحت بھگت لوگ پرماتما کو جگت پِتا سمجھ کر اس کی عبادت کرنے کے بجائے اسے اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے ہیں۔ بظاہر آپ کو یہ بات کچھ عجیب و غریب سی معلوم ہوگی لیکن دراصل اس طرح خُدا سے محبّت کرنے کا مقصد خودہماری تربیت ہے عام طور پر ہمارے دماغوں پر خدا کے متعلق اقتدار و اختیار کا تصوّر کچھ اُس طرح غالب ہوتا ہے کہ ہم ہمیشہ اس سے مرعوب رہا کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ و خدا (بھگت اور بھگوان) میں فاصلہ قائم رہتا ہے سچی محبت میں ہمیں اس فاصلے کو مٹا دینا پڑتا ہے بھگوان کو اولاد کی طرح پیار کرنے سے یہ فاصلہ باقی نہیں رہتا بھگتی میں خوف اور دہشت کا عنصر ہونا ہی نہیں چاہیئے تعظیم اور اطاعت کے تصوّرات کردار کی بقا کے لئے ضروری ہوتے ہیں لیکن جب کردار میں مضبوطی آجاتی ہے تو ان تصوّرات کی حدوں سے بھی آگے نکلنا ضروری ہوتا ہے جب بھگت یا پریمی پُرسکون اور پُرامن بھگتی یا پریم کے مزے سے واقف ہوجاتا ہے اور جب اس بھگتی یا پریم کے رس سے لُطف اندوز ہو لیتا ہے تو اس کو اخلاق اور تربیت کے اصُولوں کا سہارا لینے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ خدا کی طاقت، عظمت اور شان کے رعب میں آکر اسے دیوتاؤں کا دیوتا قرار دینا بھگت کی نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پرماتما کے پریم کی طلب میں جو لوگ دیوانے ہوتے ہیں وہ تو اس کا قرب چاہتے ہیں اس لئے وہ خدا کے تصوّر سے وابستہ اختیار

واقتدار کے خیالات کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں جب کوئی بھگت بھگوان کو اپنا بچہ سمجھ کر پیار کرتا ہے تو اس سے کسی قسم کی نوازش طلب کرنے کا خیال ہی ذہن میں نہیں آسکتا آخر ماں باپ اپنی اولاد سے تھوڑے ہی مرعوب ہوتے ہیں وہ تو ہمیشہ اپنے بچوں کو کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے کچھ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اولاد کی محبت سے مجبور ہو کر تو ماں باپ اپنے آپ کو بچوں کے لئے بار بار قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اس طرح خدا کو اپنا بچہ سمجھ کر اس کی بھگتی کرنے سے بھگت اس کے زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے لیکن عشق الٰہی کا یہ طریقہ خدا کو اپنے بچے کی طرح پیار کرنے کا یہ تصور صرف ان مذہبی فرقوں میں پھولتا پھلتا ہے جو ایشور اوتار کی فلاسفی میں یقین رکھتے ہیں مسلمانوں کے لئے تو خدا کو اپنی اولاد سمجھنا قطعاً ناممکن ہے البتہ عیسائیوں اور ہندوؤں میں اس تصور کو عملی صورت با آسانی دی جا سکتی ہے۔ عیسائی اس مطلب کے لئے یسوع مسیح اور ہندو سری کرشن کے عہد طفلی کے تصور سے کام لے سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سی عورتیں بھگوان کی بھگتی خود کو کرشن کی ماتا سمجھ کر کرتی ہیں عیسائی عورتیں بھی حضرت مسیح کو اپنا بچہ تصور کر سکتی ہیں۔ اس طرز عمل سے اہل مغرب کو خدا کی مادریت کا علم حاصل ہو جائے گا جس کی انھیں اس زمانے میں بڑی ضرورت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ خدا کے متعلق دبدبہ و جلال کا تصور ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں کچھ اس طرح پیوست ہے کہ اسے نکال باہر کرنے کے لئے اس طرح کی قربت کے تصور کی ضرورت ہوتی ہے پھر بھی ادب و احترام نیز ہیبت جلالت اور شوکت و سطوت کے تصورات کو کلیتاً محبت یا بھگتی کے جذبات میں منتقل کرنے کے لئے سالہا سال کی مدت اور مسلسل ریاضت درکار ہوتی ہے۔

بھگوت بھگتی یا عشق الٰہی کے بلند ترین تصور کو مادھوریہ (माधुर्य) کہتے ہیں اس تصور میں بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ اسی دنیا میں جذبۂ محبت کا بلند ترین اظہار مرد اور عورت کے پیار کی شکل میں ہوتا ہے اس عالم میں اس سے زیادہ واضح اور مضبوط تعلق کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے آدمی کی تمام فطرت متزلزل ہو جاتی ہے جو اس کی ہستی کے ذرے ذرے میں سرایت کر کے اس کو دیوانہ بنا دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کو خود اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی یہ وہ پیار ہے جو زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ یہ انسان کو یا تو خدائے تعالیٰ کے بلند مقام تک پہونچا دیتا ہے یا پھر اسے گرا کر شیطان سیرت بنا دیتا ہے بھگتی (عشق الٰہی) کے بلند ترین آدرش کی بنیاد طوفان خیز مجازی عشق پر رکھی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ربانی محبت کے تصور میں بڑی حلاوت ہوتی ہے اس جذبے کے تحت بھگت خود کو بیوی سمجھ کر بھگوان کو اپنا خاوند تصور کرتا ہے اور اس کے قدموں پر اپنا سارا پیار نچھاور کر دیتا ہے۔ بھگتی کے اس تصور میں ہم سب کے سب عورتیں ہیں مرد ہے تو صرف ایک پرماتما۔ ہمارا محبوب ہے تو بس وہی خدائے مطلق۔ خلاصہ یہ کہ بھگتی کے اس رنگ میں مرد

اور عورت کی محبت کے کمال کو بھگوان کے لئے ارپن کر دینا پڑتا ہے جو والہانہ محبت ایک مرد کو اپنی محبوبہ سے ہو سکتی ہے یا جتنا پیار ایک عورت اپنے مالک کو دے سکتی ہے وہ ایک بھگت بھگوان پر لٹا دیتا ہے۔ ہماری دنیوی زندگی کے ناٹک میں محبت مختلف صورتوں میں نمودار ہوتی ہے لیکن وہ دراصل ایک ہی محبوبِ مطلق یعنی پرماتما کی طرف مرکوز ہوتی ہے۔ خدا ہی ہر صورت میں محبت کا مقصد ہے خواہ وہ محبت ماں کی ہو۔ وہ پیار بہن کا ہو یا وہ جاں نثاری بیوی کی ہو لیکن بدقسمتی سے انسان اس حقیقت سے واقف نہیں اس کو اس بے پایاں سمندر کا علم نہیں ہے جس میں محبت کے تمام دریا اور ندیاں نالے جا کر مل جاتے ہیں وہ اس جامع اور مکمل ہستی سے آشنا نہیں جس میں ہم سب کا وجود ہے اسی کم فہمی کی وجہ سے انسان بسا اوقات اپنی محبت کا رُخ اس زندۂ جاوید ہستی کے بجائے انسانی وجودوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی طرف پھیر دیتا ہے، مثلاً عام طور پر انسان کے دل میں اولاد کے لئے جو محبت بھری ہوتی ہے وہ ان چھوٹے چھوٹے خوبصورت اجسام کے لئے نہیں ہے جن کو ہم بچے کہتے ہیں وہ اُمڈتی ہوئی محبت تو اس پاکیزگی معصومیت اور اُٹھتی ہوئی زندگی کے لئے ہے جو بچوں کے وجود میں چمک رہی ہے اور جس کی اصل خود بھگوان ہیں۔ اگر آپ آنکھیں بند کر کے اپنی محبت کا مقصد محض بچوں کے اجسام کو بنائیں گے اور ایک نہ ایک دن جب ان میں سے کوئی جسم دنیا سے اُٹھ جائے گا تو آپ کو اس کی جدائی سے سخت دُکھ پہونچے گا البتہ اس دُکھ سے آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اگر آپ اپنی محبت کے فطری جذبے کو محض فانی اجسام کے لئے وقف کر دیں گے تو بالآخر آپ کو اذیت اور پریشانی سے سامنا ہوگا اس لئے محبت کی یہ دولت ہمیں اُس بلند و برتر ہستی کو نذر کر دینا چاہیے جو نہ کبھی مرتی ہے اور نہ جس میں کبھی کوئی تغیر آتا ہے۔ اس ہستی کو جس کی محبت کے سمندر میں کبھی مد و جزر ہوتا ہی نہیں۔ ہماری محبت کو اپنی اس صحیح منزلِ مقصود پر پہونچنا چاہیئے۔ اس کا رُخ لازمی طور پر اُس ہستی کی جانب ہونا چاہیئے جو خود پیار کا ایک بے پایاں اور اتھاہ سمندر ہے جس میں عشق و محبت کے سب دریا آ کر مل جاتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ تمام ندیاں نالے اور دریا بالآخر سمندر میں گر کر ایک ہو جاتے ہیں ان کا رُخ ہمیشہ سمندر ہی کی طرف ہوتا ہے۔ پانی کا وہ ایک قطرہ بھی جو پہاڑ سے لڑھکتا ہوا کسی چشمے یا دریا میں آ ملتا ہے۔ اپنے بہاؤ کو روک نہیں سکتا اور آخر کار کسی نہ کسی طرح سمندر میں پہونچ ہی جاتا ہے ہمارے تمام خیالات اور جذبات کی منزل خدائے تعالےٰ ہی کی بلند و برتر ذات ہے اگر آپ کو کسی بات پر غصہ آئے تو خدا ہی پر نکالئے۔ کوسنا ہے تو اسی دوست اسی محبوب کو کوسئے اور کون ہے جو چپ چاپ آپ کا غصہ برداشت کرلے گا کس میں اتنا صبر اتنا تحمل ہے کہ آپ کی ہر بات کو خاموشی سے سن لے۔ یہاں تو آپ کے غیظ و غضب کا ردِ عمل لازمی ہے مثلاً اگر آپ مجھ پر برس پڑیں تو یقیناً میری طرف سے بھی ناراضگی

اور غُصّے کا اظہار ہوگا۔ ایک انسان میں کسی دوسرے انسان کی بات برداشت کرنے کی تاب بہت کم ہوتی ہے ہاں پرماتما سے جو چاہے کہہ لیجئے اس سے جھگڑا بھی کر لیجئے تو اسے منظور ہے اس سے گلہ اور شکایت کیجئے تو بھی اُسے قبول ہے تو آیئے اس محبوبِ لاثانی ہی کو اپنے غم و غصّہ کے جذبات بھی سونپ دیں اس سے کہیں تم میرے پاس کیوں نہیں آتے۔ تم مجھے اس طرح تنہا کیوں چھوڑ جاتے ہو؟

غور سے دیکھئے تو آپ اس کی بارگاہ کے سوا زندگی کا لطف اور کہاں اُٹھا سکتے ہیں۔ مٹی کے اِن چھوٹے چھوٹے تودوں سے جنھیں دوست اور رشتے دار کہتے ہیں آپ کو کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ ہم کو تو بے پایاں راحت کے جوہرِ خالص کو تلاش کرنا ہے اور وہ جوہرِ خالص خُدا کی ذات ہے۔ ہمارے تمام خیالات اور جذبات کو اسی طرف مائل ہونا چاہیئے اُن کا مقصد ہی یہ ہے کیونکہ اگر ان کی رسائی اِتنی بلند منزل پر ہوگی تو یہ کم ظرفی کی تنگ و تاریک راہوں میں کھو جائیں گے۔ برعکس اس کے بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو جانے کے بعد ادنیٰ سے ادنےٰ جذبات میں بھی ایک شان ایک بلندی پیدا ہو جاتی ہے اُن کا ہیولا ہی بدل جاتا ہے۔

انسانی جسم اور دماغ کی طاقتوں کا اظہار خواہ کسی صُورت سے ہو سب کی منزلِ مقصود خُدائے تعالےٰ کی واحد ذات ہوتی ہے۔ غُصّہ ہو یا پیار، مُحبت ہو یا نفرت۔ قلبِ انسانی سے جس جذبے کا بھی اظہار ہو اس کا رُخ اسی ہستیِ مُطلق کی طرف ہونا چاہیئے۔ دراصل غُصّہ و نفرت کے جذبات تو ناکام محبّت ہی کا دوسرا نام ہیں جسکی لَو محبُوبِ حقیقی سے لگ گئی اس کے لئے ناکامی اور غم و غصّے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ پرماتما کی ذات ہی تو واحد محبُوب ہے۔ اس کے علاوہ یہ دل اپنی مُحبت کا سرمایہ اور کس کو پیش کر سکتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی حسین و جمیل نہیں اس سے زیادہ بلند و برتر اور کسی کی ذات نہیں۔ وہ بذاتِ خود حُسن ہے بلندی ہے۔ اس عالمِ کائنات میں اس سے زیادہ خوبصورت اور کس کی ذات ہے۔ زمان و مکان کی اَن پہنائیوں میں اس کے سوا ہماری محبّت کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے اس سے زیادہ پیار ہم اور کس کے ساتھ کر سکتے ہیں؟ اس لئے اسی کو اپنا محبُوب بنایئے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بھگوت بھگت یعنی عاشقانِ الٰہی جب بھگوت بھگتی یا عِشقِ الٰہی کے گُن گاتے ہیں تو عشقِ مجازی کی زبان استعمال کر لیتے ہیں کیونکہ اسی سے ان کا مطلب کافی طور پر ادا ہو سکتا ہے نادان لوگ اس راز کو ہرگز سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی آنکھ تو مادّی سطح سے اُوپر اُٹھ ہی نہیں سکتی۔ وہ رُوحانی محبت کی دیوانگی کے کرب کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے اُن کے لئے تو محبّت محض ایک جنسی اور جسمانی تعلق ہے۔ مثلاً وہ کسی دیوانے کی اس دُعا کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ "میرے محبُوب مجھے بس ایک بوسہ عطا کر دے۔ میرے محبُوب جس کے لبوں کا تو نے بوسہ لیا ہے اس کے دِل

میں تیری تمنّا اور بھی بڑھ جاتی ہے اس کے تمام رنج اور الم مٹ جاتے ہیں اور وہ صرف ایک تیری ذات کے علاوہ اور ہر چیز کو بھول جاتا ہے" اس لئے اگر ہمّت ہے تو محبوبِ حقیقی کے اسی بوسے کی تمنّا کیجئے اس کے لبوں کے اسی لمس کی تلاش میں سرگرداں رہئے جو بھگت (عاشق) کو دیوانہ بنا دیتا ہے اور انسان کو خدا کی منزل تک پہونچا دیتا ہے جس شخص کو بھی اس بوسے کی نعمت حاصِل ہوگئی ہے اس کی نظر میں نظرت کا تمام ہیولے بدل جاتا ہے۔ اس کی نظر سے یہ تمام کائنات غائب ہوجاتی ہے یہ سورج اور یہ چاند ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں اور یہ تمام عالم شہود بذاتِ خود تحلیل ہوکر محبت کے اس بے پایاں سمندر میں مِل جاتا ہے۔ یہ ہے محبت کی دیوانگی کا کمال جس کا بیان عشقِ مجازی کی زبان میں ہوتا ہے اور جسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

خدا کے سچے عاشق مجاز کی ایک اور صورت کو بھی اپنا لیتے ہیں جس میں محبّت کی شدّت بیوی اور خاوند کے پیار سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے یہ وہ صُورت ہے جسے سماج ناجائز محبّت کے نام سے پُکارتا ہے ایسی محبت میں دیوانگی کی جو شدّت ہوتی ہے عاشق اس کو اپنی روح میں گھول کر محبوبِ حقیقی کو بطور نذر پیش کرتا ہے۔ اس محبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جتنی جتنی رکاوٹیں اُس کے راستے میں پیش آتی ہیں اس میں اتنا ہی زیادہ ولولہ اور جوش اُبھرتا چلا جاتا ہے۔ خاوند اور بیوی کی محبّت ہموار ہوتی ہے اس میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہوتی برعکس ان کے اس نوخیز حسینہ کی محبّت کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے جو خود اپنی پسند کے محبوب سے عشق کرتی ہے لیکن اس کے والدین اور رشتے دار اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ رُکاوٹیں اس کی راہ میں پیدا کی جاتی ہیں اتنا ہی زیادہ اس کی محبّت کا جذبہ زور پکڑ جاتا ہے۔ بھگوان کے بھگت اسی جذبہ کو اپنا کر اپنے محبوب کو پانے کی لگن میں لگے رہتے ہیں۔ اس کی مثال کرشن اور گوپیوں کا پیار ہے۔ زبان کو اس کے بیان کی تاب نہیں اس دیوانگی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے جو کرشن کی گوپیوں کے حصے میں آئی تھی۔ برندابن کے کُنج ہی جانتے ہیں کہ کرشن کی بانسری کی مست کُن آواز سُن کر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی ہوئی گوپیاں کس طرح پاگلوں کی طرح بھاگی بھاگی چلی آتی تھیں۔ اپنے دینوی فرائض کا خیال تو دور رہا۔ اُن کو کسی بات کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا اس دُنیا اور اس دُنیا کے تعلقات کی انھیں کوئی پروا نہ تھی۔ انھیں ذرا بھی اپنی سُدھ بُدھ نہیں رہتی تھی۔ دنیا کی مسرّتوں کی خواہش اور اذیتوں کا خوف سب مٹ جاتے تھے یہ ہے محبت کی حقیقی معراج۔ کون ہے جس میں اس منزل تک پہونچنے کا دم ہے۔

میرے بھائیو! بھگتی اور پریم (عشقِ الٰہی) کا دعوےٰ کرنا آسان ہے اس کو نباہنا بہت مشکل

ہے۔ آپ ایشور بھگتی کی بات کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آپ کا دھیان اس دُنیا کی فضول اور بے معنی ٹیم ٹام کی طرف بھی لگا رہتا ہے۔ آپ خود بتایئے کہ کیا آپ میں خلوص کا برائے نام بھی شائبہ ہے کیا آپ کے جذبات میں ذرا بھی صداقت ہے یاد رکھئے جہاں رام ہے وہاں کام (خواہش) کی کوئی گنجائش نہیں اور اور جہاں کام (خواہش) ہے وہاں رام کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ دونوں کا ایک ساتھ قیام ممکن ہی نہیں جس طرح روشنی اور تاریکی کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں اسی طرح بھگوان کی بھگتی اور دُنیا کی غلامی بھی اکٹھی نہیں رہ سکتی۔

بھگتی (عشق الٰہی)

اَوْر

گیان (معرفت) کی معراج ایک ہے

اُنپشدوں کے مطابق علم کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک کتابی علم کا درجہ دوسرا معرفتِ ذات کا درجہ۔ اوّل الذکر کا درجہ (اپنی جگہ پر بہایت بلند مرتبہ ہونے پر بھی) علمِ معرفت سے کم مانا گیا ہے اِس میں مقدس مذہبی کتابوں اور دینی رسم ورواج دونوں کا علم شامل ہے۔ معرفت کا درجہ اِس سے کہیں زیادہ بلند ہے معرفت خود آگہی اور حقیقت شناسی پر مشتمل ہے۔

منڈوک[ل] اونپشد میں لکھا ہے:-

द्वे विद्ये वेदितव्ये इति ह स्म यद्ब्रह्मविदो वदन्ति परा चैवापरा च ॥
तत्रापरा ऋग्वेदो यजुर्वेदः सामवेदोऽथर्ववेदः शिक्षाकल्पो व्याकरणं निरुक्तं
छन्दो ज्योतिषमिति । अथ परा यया तदक्षर-मधिगम्यते ॥

یعنی برہم (ذاتِ مطلق) کے جاننے والوں کا کہنا یہ ہے کہ گیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجے کا گیان یعنی علمِ معرفت اور ادنےٰ درجے کا (اپرا) گیان جس میں رگ وید، سام وید، اتھروو ید اور یجروید کی تعلیم شکھشا یعنی وہ علم جس کا تعلّق تلفّظ اور لہجے سے ہے "کلپا" (یعنی آداب پرستش) قواعد

ل Mundaka Upanishad.

(یعنی علم ہجا، صرف اور نحو) نرکت (یعنی زباندانی کی وہ شاخ جو الفاظ کی ساخت اور ان کے معنوں سے بحث کرتی ہے)۔ علم عروض۔ علم ہیئت ونجوم۔ سب شامل ہیں۔ بخلاف اس کے اعلیٰ درجے کا گیان اس کو کہتے ہیں۔ جس کے ذریعہ اُس ہستی کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو غیر متغیر ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اعلیٰ درجے کے گیان سے واضح طور پر مُراد ہے برہم یعنی ذاتِ مطلق کی معرفت۔ دیوی بھاگوت میں پرابھگتی (بھگتی کے کمال) کی وضاحت اِن الفاظ میں کی گئی ہے:۔

"جس طرح تیل ایک برتن سے دوسرے برتن میں اُنڈیلا جاتا ہے اور اُس کی دھار درمیان سے ٹوٹتی نہیں۔ اسی طرح جب دل بھگوان کے مُسلسل دھیان میں محو رہتا ہے اور اس دھیان کا سلسلہ کہیں اور کبھی ٹوٹتا نہیں تو ہم کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو پرابھگتی یا اعلیٰ درجے کی بھگتی کہا جاتا ہے۔ جب دل دماغ یکسو ہو کر کسی خلل اور انتشار کے بغیر اور تسلسل کے ساتھ بھگوان کی جانب اس طرح رجوع ہوتے ہیں۔ اس طرح سے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ پھر اس سے اُن کی علیحدگی ناممکن ہو جاتی ہے تو عشقِ الٰہی (پربھو پریم) کا اظہار اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے۔ بھگتی کی اور جتنی بھی صُورتیں ہیں وہ ابتدائی ہوتی ہیں اور وہ اِنسان کو اعلیٰ مدارج یعنی پرابھگتی کی منزل تک پہونچانے کے لئے تیار کرتی ہیں۔ اس پرابھگتی کو راگ آنوگا[1] بھی کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ بھگتی بھگوان سے لگن لگ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھگتی وابستگی (راگ آنوگا) کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

پرابھگتی کی خصوصیت یہ ہے کہ جب یہ انسان کے دل میں گھر کر لیتی ہے تو اس کے دماغ میں ہمیشہ خدا ہی کا تصور برسر کار رہنے لگتا ہے اور سب چیزیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ پھر خدا کے علاوہ اور کسی چیز کا خیال تک نہیں آتا۔ رُوحانی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ تن تنہا موہ اور مایا کی زنجیریں توڑ کر موکھش یا نجات حاصل کر لیتا ہے وہ ہر قید سے یہاں تک کہ عبادت اور پرستش کی بندشوں سے بھی کُلیتاً آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ تنہا خود دل ہی دل میں ہر وقت خدا کی عبادت کرتا رہتا ہے اس کی نظر میں رسم ورواج کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ نشانات اور علامتیں[2] مثلاً مُورتیاں اور مندر۔ صلیب اور گرجے۔ محراب اور مسجد یہ مقدس مذہبی کتابیں اور دینی نظریئے یہ سب چیزیں غیر ضروری ہو جاتی ہیں۔ اور کسی صورت سے بھی اس کے کام نہیں آسکتیں۔ بھگوان کی بھگتی کے اِس بلند مقام تک پہونچنا کوئی آسان کام[3] نہیں ہے۔ عام طور پر انسانی محبت کا جذبہ وہیں پھولتا پھلتا ہے جہاں اس کو بدلے میں دوسری طرف سے بھی پیار ملتا ہے۔ جہاں

---

[1] Raganuga. [2] Forms & Symbols.

[3] کہ عشق آساں نمود اول ولے اُفتاد مشکلہا

محبت کے جواب میں محبت نہیں ملتی وہاں انسان کے دل میں قدرتی طور پر سرد مہری اور بے رُخی پیدا ہو جاتی ہے دُنیا میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی جن میں محبت جواب نہ پاکر بھی قائم رہتی ہے۔ ایسی محبت کی ایک مثال پروانے کی لگن ہے شمع پروانے کو جلا کر خاک کر دیتی ہے لیکن پروانہ برابر اُس سے محبت کئے جاتا ہے۔ آگ میں گر گر جان دے دیتا ہے یہی اس کی محبت ہے۔ یہ محبت اس کی فطرت کا جزو بن گئی ہے اُس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ جل جل اس طرح محبت کی راہ میں جاں نثار کئے جائے۔ یہی محبت کا کمال ہے جب انسان بھی خدا سے محبت محبت کی خاطر کرتا ہے۔ جب وہ اپنے محبوب حقیقی سے محض اس لئے محبت کرتا ہے کہ محبت کرنا ہی اس کی فطرت میں داخل ہو گیا ہے۔ جب خدا سے کچھ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب بھگوان سے پریم اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے بغیر دل کو چین اور آرام ہی نہیں ملتا تو انسان کو یقیناً محبت کی معراج۔ محبت کی انتہائی منزل حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دُنیا کو مذہب۔ اخلاق اور رُوحانیت کی راہ دکھانے کے لئے ایک مثال اور قائم ہو جاتی ہے۔

منزلِ عشق

جب پریم یا مُحبت کا یہ بلند ترین مقام حاصِل ہوجاتا ہے تو انسان کو مذہبی اور فلسفی نظریوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تمام فلسفہ اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے جب فلسفے کا سرچشمہ مِل جائے تو پھر فلسفے کی پروا کون کرتا ہے آزادی مکتی اور نجات کا خیال بھی بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔ بھگوت پریم (عشقِ الٰہی) کے آنند یا سرور میں مُکتی (نجات) کی پرواہ ہی کسے ہوتی ہے بھگتوں کی تو ہر وقت یہی پرارتھنا (التجا) ہوتی ہے کہ "بھگون" مجھے دولت چاہیئے نہ دوست۔ نہ مجھے حُسن وجمال کی تمنّا ہے نہ علم وفضل کی خواہش۔ میں موکھش یعنی نجات کا بھی طلبگار نہیں مجھے جنم پر جنم عطا کر۔ مجھے بار بار اِس دُنیائے آب و گل میں لاتا کہ میں بار بار تیری محبّت کا لُطف اُٹھاتا رہوں میں تجھ میں لس کر تیرے مقام پر نہیں پہونچنا چاہتا۔ مجھے تو صرف تیرا پیار مطلوب ہے میں شکر کی ڈلی بن کر کیا کروں گا میں تو اُسے گھول گھول کر پینا چاہتا ہوں۔ مان لیا کہ "میں" وہ ہوں جو "تو" ہے لیکن میں تجھ سے واصل ہوکر من و تو کے اس شیریں تعلّق کو مٹانا نہیں چاہتا تو یہ علاحدگی۔ یہ دُوری ہی منظور ہے کیونکہ اسی کی وساطت سے تو میں تیرے دیدار کا لُطف حاصِل کرسکتا ہوں اسے کہتے ہیں "محبّت کی غرض سے محبت کرنا ہے" یہ نشاطِ رُوح کا سب سے بلند مقام بھگت تو بھگوان کے درشنوں کا آنند لوٹنے کی غرض سے ہزاروں بار قیدِ حیات قبول کرنے کے لئے تیّار ہے وہ تو ہر وقت ہاتھوں میں پریم کی ہتھکڑیاں اور پاؤں میں محبت کی بیڑیاں ڈالے بھگوان کی غلامی میں خوش ہے بھگت کی نظر میں بھگتی یا پریم کے علاوہ اور کوئی چیز بھی برائے نام وقعت نہیں رکھتی وہ تو یہ چاہتا ہے کہ ہر طرح سے اپنے محبوب پر دل اور جان نثار کئے جائے اُس کا محبوب اُس کو اپنا پیار عطا کرے بھگتوں کی اِس محبت کا مزہ دُنیا والوں کو کیا معلوم۔ دُنیا

والے تو اسے دیوانگی کہتے ہیں وہ اِسے غیر فطری سمجھتے ہیں ان کی یہ مُحبت جوار بھاٹے کی اس طوفانی لہر کی مانند ہے جو سمندر سے اُٹھ کر دریا کے دہانے کی طرف بڑھتی اور دریا کی روانی کو روک کر پانی کی ایک اُونچی دیوار کھڑی کر دیتی ہے۔ بھگوان کے پریمی شیروں کی طرح دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرتے ہیں۔ اس طوفانِ حیات میں خس و خاشاک کی طرح بہنے والے لوگ ان دیوانوں کی دلیری اور شجاعت کو بھلا کیا سمجھیں گے دُنیا تو ان کو ہمیشہ سے پاگل کہتی آئی ہے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایک ایسے بزرگ کو جاننے کا اتفاق ہوا جنھیں دُنیا پاگل کہا کرتی تھی۔ وہ یہ سُن کر کہا کرتے تھے۔

"میرے دوستو۔ یہ تمام دنیا ایک پاگل خانہ ہے۔ بعض لوگ دنیوی محبت میں ہوش کھو بیٹھتے ہیں بعض نام کی ہوس میں دیوانے ہو جاتے ہیں کسی کو شہرت کی دُھن رہتی ہے کسی کو دولت کی۔ کوئی ثواب کمانے اور حیثیت و منزلت حاصل کرنے کے خیال میں سرگرداں رہتا ہے۔ اتنے بڑے اس پاگل خانے میں میں بھی ایک پاگل ہوں البتہ میں خدا کے لئے دیوانہ ہوں۔ آپ دولت کے دیوانے ہیں میں بھگوان کے درشنوں کے لئے پاگل ہو رہا ہوں۔ ہم سب پاگل ہیں آپ بھی پاگل ہیں اور میں بھی پاگل ہوں۔ آپ اپنی دیوانگی کو ہوش مندی سمجھتے ہیں میں اپنے پاگل پن کو سب سے افضل اور برتر گردانتا ہوں۔" یہ ہے سچے پریمی کی برق صفت دیوانگی جو تمام دُنیا کی آلائشوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور جسکے سامنے کسی چیز کا وجود نہیں ٹھہرتا۔ بھگوان کے بھگت کو یہ تمام عالمِ کائنات محبّت کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے جب انسان کا دل اس قسم کی محبّت سے لبریز ہو جاتا ہے تو اس کو سرور کامل (پرمانند) کی دوامی نعمت ہاتھ آتی ہے۔ بھگوت بھگتی یا پریم کی اس مقدّس اور مُبارک دیوانگی سے دُنیاوی خواہشات کا مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتا ہے اور جب خواہشات مٹ جاتی ہیں تو خود غرضی بھی رُخصت ہو جاتی ہے۔ عاشق کو خدا کی قربت حاصل ہو جاتی ہے اور جب دل میں خدا بسنے لگتا ہے تو پھر اُسمیں کسی دُوسرے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔

محبّت کے مذہب کی ابتدا دوئی کے تصوّر سے ہوتی ہے۔ ہم خدا کی ہستی کو ایک علاحدہ ہستی سمجھ کر اپنے وجُود کو اس سے جُدا محسُوس کرتے ہیں پھر محبّت ہم دونوں کے درمیان آجاتی ہے اور انسان خدا کے نیز خُدا انسان کے قریب ہو جاتا ہے انسان ایسی حالت میں دُنیا کے تمام رشتوں کو خدا ہی سے منسوب کرنے لگتا ہے۔ باپ۔ ماں۔ دوست۔ آقا اور عاشق غرض ہر دنیوی تعلق کو خدا ہی پر عاید کرتا ہے وہ خدا کو باپ کہہ کر اس کی عزّت کرتا ہے ماں پکار کر اس کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ بیٹے کا پیار دے کر اس کو اور بھی اپنے قریب لے آتا ہے۔ مالک سمجھ کر اس کی خدمت کرتا ہے یا عاشق مان کر اُس سے مُحبّت کی دولت مانگتا ہے وہ خدا کو ان سب صورتوں میں دیکھتا ہے اور آخر کار اس کی محبّت ان تمام مقاماتِ راہ سے گزر کر عروج

کے اس مقام پر پہونچ جاتی ہے، جہاں اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبود کی ہستی میں محو ہو گیا ہے محبت کی ابتدائی صورت خود غرضی ہے۔ ہم پہلے اپنے آپ ہی سے پیار کرتے ہیں بس اپنی اسی چھوٹی سی ذات کے ہر واجب اور ناواجب تقاضے کو پورا کرتے ہیں یہ خود غرضی ہماری محبت کو بھی تنگ نظر بنا دیتی ہے لیکن آہستہ آہستہ ہماری محبت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ایک دن ایسا آجاتا ہے کہ تمام کائنات ہماری محبت میں بس جاتی ہے اور ہر طرف خدا کی ہی لا محدود اور واحد ذات کا نور پھیل جاتا ہے۔ محبت کی کرنیں تعلقات کی حسین ہفت رنگی کو چھوڑ کر یکجا ہو جاتی ہیں۔ اور عشقِ حقیقی کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھتا ہے۔ خودی کے محدود سائے غائب ہو جاتے ہیں۔ محبت کی اس روشنی میں انسان کا ہیولیٰ ہی بدل جاتا ہے اور آخر کار اس کو اس حسین اور روح پرور حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ عاشق۔ عشق۔ اور معشوق دراصل ایک ہیں ۞

بھگتی یوگ کی تعلیم[1]

ابھی تک ہم راج یوگ کی تعلیمات اور جسمانی تربیت کے سادھنوں پر غور کر رہے تھے۔ اب ہم بھگتی یوگ کا ذکر کریں گے لیکن یہ یاد رکھیئے گا کہ حصولِ رُوحانیت کے لئے کوئی مخصوص یوگ (طریقۂ عمل) لازمی نہیں ہے۔ میں آپ کے سامنے کئی طریقے اور کئی آدرش محض اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ ان میں سے جو طریقہ یا آدرش آپ کے لئے موزوں ہو۔ آپ اُسے اختیار کریں۔ اگر کوئی ایک طریقہ یا آدرش آپ کی طبیعت کے موافق نہ ہو تو آپ دوسرا طریقہ یا آدرش اختیار کر سکتے ہیں۔

ہماری فطرت کے مختلف پہلو ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے رُجحانات کے نفسیاتی، رُوحانی۔ ذہنی نیز عملی غرضنکہ تمام کے تمام پہلوؤں کی خوب نشو ونما ہو لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق ہماری شخصیت میں ایک ہی پہلو دوسروں کے بمقابلہ زیادہ نمایاں طور پر ترقی پاتا ہے۔ اور دوسرے پہلو یہاں تک دَب جاتے ہیں کہ ہم اکثر انھیں سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں مجموعی طور پر یہی حالت مختلف قوموں کی ہے۔ یہ قومیں عموماً زندگی کے کسی ایک مخصوص آدرش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کی تشکیل میں

---

[1] باقاعدہ لیکچروں کے علاوہ سوامی جی کچھ منتخب شاگردوں کی جماعت میں یوگ کی تعلیم دیا کرتے تھے یہ باب انھیں شاگردوں کے نوٹوں (تحریری یادداشتوں) پر مبنی ہے جس طرح گیان یوگ کے باب میں سوامی جی کے مفہوم و معانی کو اُبھارنے کے لئے وضاحت طلب نوٹوں کو قدرے پھیلا دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس باب میں بھی حسبِ ضرورت کہیں کہیں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ایک خاص آدرش اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ بس وہ اسی سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے اور دوسرے پہلوؤں کی طرف سے آنکھ بند کر لیتی ہیں۔ شخصی یا قومی زندگی کا آدرش تو دراصل یہ ہے کہ ہماری ذات کے متعدد پہلو برابر نشوونما پائیں اور ان میں توازن ہو۔ دُنیا کی تمام مصیبتوں کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم خود کو انفرادی یا مجموعی طور پر محدود کر لیتے ہیں۔ اپنی اپنی ایک علیحدہ راہ اختیار کر لیتے ہیں اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ بس اپنی پسندیدہ راہ کے علاوہ اور کوئی دوسری راہ ہے ہی نہیں۔ ہم دوسروں کے آدرش کو سمجھنے کی کوشش تک نہیں کرتے۔ اس طرح ان سے ہمدردی کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ یہی کمزوری ہماری ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ ذرا خیال کیجئے کہ ایک شخص آفتاب کو زمین کی سطح سے نیچے کسی کان کی سُرنگ سے دیکھ رہا ہے، دوسرا اُسے زمین کی سطح سے اور تیسرا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھ رہا ہے۔ یوں تو یہ سب ایک ہی آفتاب کا نظّارہ کر رہے ہیں۔ لیکن ہر شخص کو آفتاب کا ایک جداگانہ ہیولا نظر آتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کُہرے یا دُھند میں آفتاب کو دیکھتا ہے تو اس کو تو آفتاب کی صورت اور بھی مختلف نظر آئے گی۔ شکلیں تو بہت سی ہیں لیکن آفتاب درحقیقت ایک ہی ہے۔ نظر کے زاویے مختلف ہیں لیکن جس چیز کو سب دیکھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی ہے اور وہ چیز ہے آفتاب۔

ہر شخص کا میلانِ طبع اس کی فطرت اور اس کی جبلّت کے مطابق جُداگانہ ہوتا ہے۔ اسی میلانِ طبع کے مطابق وہ اپنا نصب العین یا آدرش بناتا ہے اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک خاص راستہ اختیار کرتا ہے۔ راستے کئی ہیں لیکن سب کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے۔ مثلاً ایک رومن کیتھولک کی طبیعت میں رُوحانیت کی گہرائی ہوتی ہے۔ لیکن بالعموم اس کے ساتھ تنگ دلی وابستہ ہوتی ہے برعکس اس کے توحید[1] کے قائل عیسائیوں میں وسعتِ نظر تو ہوتی ہے لیکن ان میں رُوحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔ اُن کی نظر میں مذہب کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ہم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے ایک طرف رومن کیتھولک کی گہرائی اور دوسری طرف ایک توحید پرست عیسائی کی کشادگی نظر۔ ہم میں آسمان کی سی پہنائیاں اور سمندر کی سی گہرائیاں ہونا چاہیئے۔ ہمارے دل میں ایک مذہبی دیوانے کا سا جوش ہونا چاہیئے اور ہمارے دماغ میں ایک صوفی کی سی آگہی اور معرفت کی روشنی اور ہماری نظر میں ایک لاادری کی سی وسعت۔ انسانی ارتقا اور رُوحانی عروج کی جس حالت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس سے میری مُراد عام فہم رواداری نہیں ہے۔ تنگ نظر انسانوں نے رواداری کے معنوں کو یہاں تک محدود کر دیا ہے کہ اس

---

[1] Unitariaus

کی صورت ہی مسخ ہوکر رہ گئی ہے ۔ رواداری ۔ مساوات اور اخوت کے درجے سے گر کر ذرّہ نوازی کے ہم معنی ہوگئی ہے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ عام طور پر جو لوگ روادار ہونے کا دعوے کرتے ہیں ۔ اُن کو اپنے منصب و مرتبہ کی بلندی کا مکمّل احساس ہی نہیں بلکہ غرور ہوتا ہے وہ دوسروں کو درجے میں اپنے سے کمتر خیال کرتے ہیں ۔ اور بسا اوقات اُنھیں حقارت کی نظر سے بھی دیکھتے ہیں ۔ البتہ اُنھیں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی اپنے مقام پر زندہ رہنے کا حق ہے ۔ اُن کی رواداری کی عملی صورت میری نظر میں تو اُن کے دماغ کی ایک نہایت ہیبت ناک کیفیت پر دلالت کرتی ہے ۔ اِس لئے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم سب کو ایک ہی طرف جانا ہے ۔ ہم سب کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے لیکن ہمارے سفر کے راستے مختلف ہیں ۔ کیونکہ ہر شخص کی ضرورت اور اس کی طبیعت کا رُجحان جُداگانہ ہے ۔ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو اُس کے مزاج کے لئے موزوں اور مناسب ہو راستے کی علیٰحدگی کو ہم سب کے ہم سفر ہونے میں حائل نہیں ہونا چاہیئے ۔ ہم میں ہمہ گیری ہونا چاہیئے ۔ ہماری سیرت اور ہمارا کردار ایسا ہونا چاہیئے کہ ہم ہر قسم کے ہر نظریہ کو سمجھ سکیں اور اسے اس طرح اپنا سکیں جس طرح اس کے خاص پیرو اس کو اپناتے ہیں ۔ ہمارا مسلک صرف رواداری ہی نہیں ۔ بلکہ سب کو اپنانا ہے ۔ یہی ہمارا آدرش ہے ۔ یہ کام ہے تو نہایت مشکل ۔ ہمیں چاہیئے کہ دوسروں کے ساتھ پوری ہمدردی کریں ۔ ان کے نظریوں کو سمجھیں اور اُن کے ساتھ قدم ملاکر چلیں ۔ اُن کی اُمنگوں میں شریک ہوں ۔ اور ان کے مذہب کو سچّا مان کر اور اُسے قبول کرکے اُن کے ساتھ خُدا کی تلاش میں مصروف ہوں ۔ ہر مذہب کے دو جزو ہوتے ہیں ۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی ۔ مثال کے طور پر دینِ مسیحی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ آپ نزول (اوتار) تثلیث اور حضرت مسیح کے وسیلے سے حصولِ نجات میں اعتقاد رکھتے ہیں یہاں تک تو میں بھی آپ سے اتفاق کرتا ہوں لیکن جب آپ فرماتے ہیں کہ دینِ مسیحی کے علاوہ اور کوئی دوسرا مذہب سچّا نہیں اور خُدا کا ظہور کسی اور شکل میں نہیں ہوتا تو میں آپ سے نہایت مؤدّبانہ عرض کروں گا کہ یہ آپ کے مذہب کا منفی پہلو ہے ۔ ذرا سوچیئے تو آپ کس بنا پر دوسروں کے مذہب کو جھوٹا کہتے ہیں ۔ کیا آپ نے ان کے مذہب پر چل کر دیکھا ہے کہ وہ واقعی غلط ہے ۔ آپ کو اس بات کا تو پورا حق ہے کہ اپنے مذہب کو سچا بتائیں ۔ لیکن آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ دوسروں کا مذہب جھوٹا ہے ۔ اگر آپ دوسروں پر اُن کا راستہ بند کردیں گے ۔ ان کو اپنے مسلک کی پیروی کا حق نہیں دیں گے تو پھر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ یاد رکھیئے کہ ہر مذہب کا ایک خاص پیغام ہوتا ہے جو وہ دنیا کو پہنچانا چاہتا ہے ۔ یہی خصوصیت اس کی زندگی اور بقا کا راز ہوتی ہے جن لوگوں کو اس پیغام سے رُوحانی تسکین حاصل ہوتی ہے وہ اُسے قبول کرتے ہیں لیکن جب کوئی مذہب دوسروں کے خلاف

احتجاج کرتا ہے جب وہ اُن کا شیرازہ درہم برہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس وقت وہ ایک منفی اور خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں میں نیک و بد کی تمیز تک نہیں رہتی اور وہ یہ بات بھول جاتے ہیں۔ کہ مذہب دراصل کس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر شروع ہوا تھا اور کہاں جا کر اس میں گراوٹ پیدا ہوئی ہے۔ دُنیا کی ہر طاقت انجام کار اپنے مرکز پر واپس آجاتی ہے۔ قدرت کی ہر قوت کا انجام اُس کے نقطۂ آغاز پر ہوتا ہے۔ ہر طاقت بالآخر اپنا "سرکٹ" (چکر) مکمّل کرلیتی ہے۔ اور جس قوت کا نام اِنسان ہے۔ اس کا آغاز خدا کی ذات لامحدود سے ہوتا ہے۔ اور وہ پھر اسی سمندر کی سمت واپس چلا جاتا ہے۔

بارگاہِ خداوندی میں انسان کی یہ واپسی دو صورتوں سے ہوتی ہے۔ ایک صورت تو ہے آہستہ آہستہ مراجعت کی یعنی انسان غیر شعوری طور پر اسی طرف چلتا جائے جدھر اسے فطرت لے جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنی اندرونی طاقت سے کام لیا جائے۔ یہ طاقت ہمیں فطرت کی اندھی پیروی کرنے سے روکتی ہے زندگی کی بے تحاشا دوڑ میں ایک لمحے کے لئے رُک جانے کو کہتی ہے۔ اور کاروانِ فطرت سے قطع تعلق کرکے اپنے مرکز کی طرف واپس جانے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم فطرت کی لمبی راہ پر گامزن رہیں تو ایک طول طویل سفر کے بعد پُورا چکر کھا کر ایک روز اپنے اسی اصلی مقام پر پہونچ جائیں گے جہاں ہمارے سفر کا آغاز ہوا تھا لیکن ہماری اندرونی طاقت ہمیں جھٹ سے مرکز کی طرف واپس جانے کی نزدیکی راہ[1] کا پتہ دیتی ہے اگر ہم اس کی ہدایت پر عمل کریں اور اپنے دامن کو فطرت سے چھڑا کر خالقِ فطرت کی طرف مُڑ جائیں تو ہماری رُوح خدا تک جا پہنچے گی۔ بس یہی وہ راہِ عمل ہے جو یوگی اختیار کرتا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ہر شخص کو اپنی فطرت کے مطابق اپنا نصب العین یعنی اپنا آدرش خود منتخب کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مراد ذاتِ مطلق کی وہ مخصوص صورت ہے جسے کوئی شخص اپنے رُجحان طبیعت کی مناسبت سے بطور معبود چُن لیتا ہے اس آدرش کو اشٹ[2] یا ذاتی عقیدہ کہتے ہیں عشق کے تقدّس اور پاکیزگی کا تقاضا ہے کہ خدا کو جس مجسّم صورت میں آپ دیکھتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہی آپ کا اِشٹ ہے اِشٹ سے آپ کا تعلق ذاتی ہے۔ اِس کا علم آپ کی ہی ذات تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس تعلق سے جو صورتیں پیدا ہوں انھیں مخفی رکھنا چاہیئے دوسرے محبت اور وفا کے جذبات کا بھی مطالبہ یہی ہے کہ ہمیشہ اپنے اِشٹ کی پوجا

---

[1] Short-Cut.

[2] اس سے مُراد ہے اپنی پسند کا معبود اسکے بارے میں ایک شاعر نے یوں وضاحت کی ہے۔

کاش تم اس کا فیصلہ میرے ہی دل پہ چھوڑ دو ؛ کس کی میں بندگی کروں کون مرا خدا بنے (منور لکھنوی)

کی جائے ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا خاص طریقِ کار ہم کو کیونکر معلوم ہو ۔ یقیناً یہ کام سخت مشکل ہے لیکن اگر آپ لگاتار تندہی کے ساتھ بھگوان سے لگن لگا کر اس کی پرستش کریں گے تو یہ طریقِ کار خود بخود معلوم ہو جائے گا ۔ خدا نے تین خالص چیزیں انسان کو عطا کی ہیں ۔ ایک تو یہ جسمِ انسانی ۔ دوسری آزادی یا نجات کی تمنّا اور تیسری ایسے انسان سے امداد حاصل کرنے کی طاقت جو آزاد ہو چکا ہے ۔ ہمیں اِن تینوں سے کام لینا ہے ۔ جسم کو صحت مند بنا کر بھگوان کی سیوا میں لگانا ہے ۔ آزادی کی خواہش کو اُبھار کر عشق کی دیوانگی کے درجے تک پہنچانا ہے ۔ اور کسی سچّے سالک کے بتائے ہوئے رستے پر چل کر منزلِ عشق تک پہنچنا ہے لیکن یاد رکھئے کہ بھگتی یا حُبِّ الٰہی شخصی خدا[۱] کے بغیر ممکن نہیں ۔ عاشق اور معشوق کے تعلق ہی کا نام تو عشق و محبت ہے اِسی لئے بھگت اپنے بھگوان کو انسان کا رُوپ دے کر اپنا محبوب بنا لیتا ہے ۔ خدا لامحدود ہے ۔ اس کی کہیں ابتدا ہے نہ انتہا لیکن محبت اُس کی لامحدودیت کو محدود انسانی قالب میں بھی قائم رکھ کر اس کی پُوجا کرتی ہے اس کے بغیر چارہ ہی نہیں کیونکہ جب تک ہمارے محسوسات اور مدرکات حواس کی حدود کے اندر گھرے ہوئے ہیں یعنی جب تک ہم انسانی جسم کی قید میں ہیں ۔ ہمارے لئے لامحدودیت کا تصور ممکن ہی نہیں ۔ کائنات کی تمام وسعتوں کی آخر ایک حد ہے ۔ ہم لامحدودیت کو مجبوراً محدود انسانی قالب کا رنگ دیتے ہیں ۔ یہ ہماری تسلی کے لئے کافی نہیں لیکن شخصی خُدا کے تصور سے بڑھ کر اور کوئی تصور بقیدِ حیات ناممکن ہے ۔

ایک اور بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے تمام مشاہدات میں خود ہماری نظر شامل ہے ۔ ہمیں اپنے گردوپیش جو کچھ دکھائی دیتا ہے ، وہ ہماری اپنی ہستی کی روشنی میں نظر آتا ہے ۔ اس دُنیا میں کوئی شے نہیں جسے مشہودِ محض[۲] کہہ سکتے ہیں ۔ ہر شے سے ہمارا شعور وابستہ ہے ۔ مثلاً جس چیز کو ہم کُرسی کہتے ہیں ۔ وہ ایک انجانی خارجی چیز اور اُس کے اندرونی ردِّعمل سے مل کر پیدا ہوتی ہے اِسی طرح دُنیا کی ہر شے ادراک و شعور کی روشنی ہی میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر ایک سفید رنگ کا مضبوط اور چمک دار بکس لیجئے ۔ اور اسے ایک طرف ایک اندھے اور لُولے اور دوسری طرف ایک ثابت الحواس شخص کے سامنے رکھ کر تینوں سے کہیئے ، کہ اس بکس کی صفات بیان کریں ۔ ان تین چار اور پانچ حواس کے مالکوں کی رائے قدرتی طور پر مختلف ہوگی صرف آخر الذکر شخص کو صندوق میں وہ سب صفتیں نظر آتی ہیں جو ابھی بیان کی گئی ہیں ۔ دوسروں کو اپنے حواس کے مطابق ایک یا دو صفتوں کا ادراک نہیں ہوگا ۔ اب فرض کیجئے کہ کسی شخص کے چھ حواس ہیں لازماً اس کو تو اس صندوق میں ایک اور بھی صفت نظر آئے گی یہ ہے حقیقت تمام عالمِ شہود کی اس کا انحصار خود ہماری نظر پر ہے ۔

---

[۱] Personal God. [۲] Pure simple object.

تو دیکھا آپ نے کہ اوّل تو ہم بقیدِ حواس خُدا کا تصور صرف شخصی صُورت میں کر سکتے ہیں اور دوسرے اس تصوّر کا انحصار خود اپنی اپنی نظر پر ہوتا ہے۔ اگر میری نظر صرف محبت اور معرفت پر رہتی ہے تو مجھے اس مُسبب الاسباب کی ذات سے بھی محبت اور معرفت برستی ہوئی نظر آئے گی جس ہستی کے وجود سے میرے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے بھلا میں اس کو محبت سے عاری کس طرح تصور کر سکتا ہوں۔ بقیدِ حواس تو ہم انسانی صفات کے بغیر اس مُسبب الاسباب کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا ہم اس کی حقیقت جان سکتے ہیں تو میں کہونگا کہ ہاں لیکن ابتدائی منزل میں تو اس عالمِ کائنات کے اندر خدا کو اپنی ہستی سے علیحدہ دیکھنا ایک لازمی امر ہے۔ خُدا کے تصوّر کی تین ارتقائی منزلیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی تصور تو وہ ہے جس میں خُدا ہم کو خود ہماری طرح مُجسّم نظر آتا ہے۔ اس طرح کے تصور کی مثال آپ کو آرٹ میں ملتی ہے۔ خدا کے متعلق اس سے زیادہ بلند تصوّر وہ ہے جس میں ہم اُسے انسانی صفت سے مُتصِف کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے ہمارے سامنے وہ بلند ترین تصور آ جاتا ہے جس میں ہم براہِ راست خُدا کو خدا کی حیثیت سے دیکھ پاتے ہیں۔

لیکن یاد رکھیئے کہ کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہو۔ اِن تینوں منزلوں میں ہم واحد خدا ہی کو دیکھتے ہیں اس کے علاوہ اور کوئی ہستی ہے ہی نہیں۔ جسے ہم دیکھ پائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کوئی فسانہ نہیں۔ اس معاملے میں دھوکا نہ کھائیے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ایک مثال دے کر بتایا کہ اپنی اپنی حیثیت کے لحاظ سے ہم مختلف مقامات سے آفتاب کو مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں لیکن ہر مقام پر آفتاب ہی کو دیکھتے ہیں۔ ماہتاب یا کسی اور چیز کو تو نہیں دیکھتے۔ اِسی طرح خدا کے سوا کسی اور چیز کا وجود ہے ہی نہیں۔ البتہ ہم اُسے مختلف مقامات سے مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں۔ اس سے تو مفر کی کوئی صُورت ہی نہیں۔ اپنی سرشت سے مجبور ہو کر ہم اسے خود اپنی ہی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ انسان کی صورت میں بھی اس کا تصوّر کرتے ہوئے اُسے لا ابتدا اور لا انتہا غیر محدود اور بے پایاں کہتے ہیں۔ حواس کی حد یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال ہم ہستی مطلق کی حیثیت سے خدا کا تصور کر بھی پاتے ہیں تو اس حالت میں بھی اس کی پرستش کرنے اور اس کے قدموں پر اپنا پیار نثار کر کے آنند لینے کے لئے اس کو پھر ایک مجسم صورت دے کر منظرِ عام پر لانا پڑتا ہے۔

ہر مذہب میں ایشور بھگتی (حبِّ الٰہی) دو صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ پہلی صُورت میں بھگتی مختلف قسم کے خارجی دستوروں رسموں اور رواجوں تک محدود ہوتی ہے۔ اس میں مخصوص دُعاؤں اور منتروں وغیرہ کی شکل میں الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اور دوسری صورت میں بھگتی پریم یا محبت بن کر نکلتی ہے یہ وہ صورت ہے جہاں محبت اپنی منزل آپ بن جاتی ہے۔ بھگتی ہر قسم کی خارجی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے اس دُنیا میں ہم قدم قدم پر قوانینِ قدرت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان قوانین کو

توڑنے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں اس آزادی کی جدّ وجہد میں ہم احکامِ فطرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قدرت پر پُورا قابو پالیں۔ اُسے اپنے پیروں تلے روند دیں۔ مثال کے طور پر قدرت ہماری حفاظت کے لئے مکان مہیا نہیں کرتی۔ لیکن ہم مکان بنواتے ہیں۔ فطرت نے ہمیں مادرزاد ننگا پیدا کیا۔ لیکن ہم کپڑے پہنتے ہیں۔ آزادی حیاتِ انسانی کی غایت ہے سرور ونشاط کی تکمیل مکمّل آزادی سے ہی ہوسکتی ہے۔ جب تک ہم میں قوانینِ فطرت کو شکست کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جب تک ہمیں اپنی بندشوں اور اپنی خامیوں کا احساس ہوتا ہے ہم رنج وغم سے نجات نہیں پاسکتے۔ دراصل ہم قانونِ فطرت کی پابندی اس لئے کرتے ہیں کہ ایک روز اس پابندی سے نجات حاصل کرلیں اور قانون کی حدوں سے اوپر ہو جائیں زندگی کی یہ تمام کش مکش اس لئے جاری ہے کہ ہم قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کریں۔ اس کے سامنے سرِ تسلیم نہ خم کریں (اسی لئے تو مجھے عیسائی سائنسدانوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی آزادی اور رُوح کی یزدانیت میں یقین رکھتے ہیں) رُوح تو گرد وپیش کے حالات سے بلند وبرتر ہوتی ہے۔ یسوع مسیح کے شاندار الفاظ میں ہر شخص کو یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ "یہ تمام عالم کائنات میرے باپ کی حکومت ہے۔ اور میں اُس کا وارث ہوں[ط]"۔ ہر انسان کو دعوٰے ہونا چاہیئے کہ میری رُوح ہر چیز کو اپنا تابع بنا سکتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مکمّل آزادی یا نجات حاصل کرنے کے لئے قانون کی حدوں سے گزرنا ضروری ہے۔

خارجی امداد کے مختلف طریقے۔ یہ تمام دستور اور رسمیں۔ یہ طرح طرح کے اُصول اور نظریئے سب کا اپنا اپنا جُداگانہ مقام ہے۔ سب کا مقصد یہ ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے پہلے ہمیں سہارا دیں۔ اپنی بے پایاں قوت کا احساس ہونے تک ہماری پُشت پناہ بنیں۔ جب ہم میں توانائی آجائے گی تو ان چیزوں کی چنداں ضرورت نہ رہے گی۔ یہ چیزیں تو ہماری دایہ ہیں۔ ابتدائے عمر میں اِن کے بغیر ہمارا کام چل ہی نہیں سکتا یہ جو مقدس مذہبی کتابیں ہیں ان کی حیثیت بھی بس دایہ کی سی ہے یہ ہماری رُوحانی تربیت میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ اُن کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی اس کی مثال یہ ہے کہ ہم اپنے جسم کی تندرستی اور صحت کے لئے مختلف دوائیں اور جڑی بوٹیوں کا استعمال کرتے ہیں لیکن جب ہمارے جسم میں طاقت اور توانائی آجاتی ہے تو ہمیں اُن کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ ہم پر یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ دوائیں بجائے خود کچھ نہیں کرسکتیں ان سے طاقت اخذ کرنے کی قوت تو خود ہم میں موجود ہے۔ اِس لئے ہمیں اس دن کو قریب لانے کے لئے برابر مصروفِ کار رہنا چاہیئے جب ہمیں اپنے جسم اپنے ماحول اور قدرت کے تمام قوانین پر پوری

ط The universe is my Father's kingdom. I am the Heir-Apparent.

طرح اختیار حاصل ہو جائے گا اور ہمیں خارجی سہاروں کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی جسم اور دماغ (شریر اور من) دراصل ایک ہی چیز کی دو غیر مرئی اور مرئی صورتیں ہیں۔ ہمارے من کی ساخت لطیف اجزا سے ہوتی ہے اور جسم کثیف عناصر سے بنتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہمارا من خود اپنے رجحانِ طبع کے مطابق جسم کی تخلیق کر لیتا ہے۔ لطافت کثافت سے ہمیشہ بالا ہوتی ہے۔ اس لئے جب انسان اپنے من کو قابو میں کر لیتا ہے تو اس کا جسم خود بخود زیرِ عمل آجاتا ہے یہی حال خیال اور بیان کا بھی ہے۔ ہر خیال اپنے اظہار کے لئے الفاظ ایجاد کر لیتا ہے۔ الفاظ محض خیال کی مجازی صورت ہیں لا محدود تصوّر الفاظ میں مجسّم ہو جاتا ہے۔ جیسے جسم کی وساطت سے ہم اپنے غیر مادی اپنے پن کو سمجھ پاتے ہیں۔ اسی طرح شبد کی وساطت سے ہم خدا تک پہونچ سکتے ہیں۔ ہر لفظ ایک خاص خیال کا حامل ہوتا ہے۔ خیال سے اُتر کر لفظ تک اور لفظ سے اٹھ کر خیال تک آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہے ہم غصّے کی حالت میں ہوتے ہیں تو دوسروں کے لئے بیوقوف اور احمق وغیرہ سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن رنج اور یاس کے عالم میں ہمارے مُنھ سے صرف ہلکی سی آہ ہی نکلتی ہے۔ پھر یہی الفاظ بجائے خود غم و غصّے کے احسانات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے سُننے سے اِس قسم کے یہ جذبات اُبھر آتے ہیں لیکن یہ احساسات لمحاتی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے الفاظ میں بھی کوئی خاص قوت نہیں ہوتی۔ مگر بعض احساسات دائمی ہوتے ہیں۔ مثلاً محبت۔ امن و سکون صداقت مسرّت تبرک اور پاکیزگی کے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے ہر مذہب میں مخصوص الفاظ ہوتے ہیں جو انسان کے ان بلند ترین محسوسات کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ جن بلند خیالات اور محسوسات نے ان الفاظ کو جنم دیا ہے۔ وہی خیالات یا احساسات اِن الفاظ سے اُبھر آتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اُن کے معنی پر پوری طرح غور کریں۔ اس طرح سے یہ مخصوص الفاظ (شبد) روحانی ترقی میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ہر لفظ ایک مخصوص نصب العین کا ایک خاص آدرش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور اُس کی وساطت سے یعنی اس پر یکسوئی سے غور کر کے ہم اس آدرش کے نزدیک پہونچ سکتے ہیں۔ یوں تو اِن مقدس اور پُر اسرار الفاظ کی اہمیت کا اعتراف ہم سب کرتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ میں بذاتِ خود کوئی جادو نہیں ہوتا۔ انھیں صرف کتابوں میں سرسری طور پر پڑھ لینے سے تو ہم پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا لیکن جب ہم اُن پر غور کرتے ہیں اور اُنکے معنی سمجھنے لگتے ہیں تو ہم پوری طرح ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں اثر انگیز ہونے کے لئے ان الفاظ کی تہہ میں زندہ روحانی طاقت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ ہم ان الفاظ کو کسی ایسی ہستی کی مبارک زبان سے سُنیں جس نے خُدا کو پالیا ہو۔ ایسا خدا رسیدہ انسان ہی ان الفاظ (شبدوں) کی خوابیدہ طاقت کو جگا کر ہماری زندگی کو متحرک کر سکتا ہے۔ ایسے شخص میں

یہ طاقت ہوتی ہے کہ اپنے لمس سے یا ایک آدھ لفظ سے رُوحانیت کی لہر کو رواں دواں کر دے مثلاً یسوع مسیح میں یہ طاقت بدرجۂ اتم موجود تھی اور آج بھی عیسائی مذہب میں دستِ شفقت[1] کی جو رسم جاری ہے وہ اس طاقت کی نشاں دہی کرتی ہے۔ جو شخص رُوحانی لہر کو دوسروں میں منتقل کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہی سچّا گرُو ہے۔ حضرت مسیح ایسے جگت گرُووں کے لئے تو الفاظ کا استعمال تک ضروری نہیں۔ وہ تو محض اپنی قوتِ خیال سے اپنی ایک جنبشِ نگاہ ہی سے اِنسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتے ہیں۔ البتہ دوسرے گرُو جو اس مقام تک نہیں پہونچ پاتے۔ رُوحانیت کی اسی لہر کو اپنے شاگردوں اور بھگتوں میں منتقل کرنے کے لئے الفاظ یعنی شبدوں سے ضرور کام لیتے ہیں۔ یہی شبدوں کی اصل اہمیت ہے۔

یہ ہے بھگتی کے نفسیاتی پہلو کا مختصر بیان بھگتی کا عملی پہلو یہ ہے کہ دوسروں کے عیوب پر نظر نہ ڈالیے آپ کسی انسان کی خامیوں کو دیکھ کر اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتے۔ مثلاً زمین پر پڑے ہوئے چند سڑے اور کچّے سیبوں کو دیکھ کر آپ سیب کے درخت کی نسبت کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے۔ اسی طرح کسی انسان کے چند نقائص کو دیکھ کر اس کے پُورے کردار کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یاد رکھیے بدمعاش آدمی خواہ کسی مُلک کے رہنے والے ہوں بیشتر ان کی ذات سے ایک ہی قسم کا کردار ظاہر ہوتا ہے۔ چور اور قاتل ایشیا کے ہوں یا یُوروپ اور امریکہ کے سب اپنی اپنی جگہ چور اور قاتل ہی تو ہیں اُن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہی قبیلے یا قوم کے فرد ہیں۔ ان چند گمراہ انسانوں کو دیکھ کر تمام نسلِ انسانی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلینا قطعاً غلط ہوگا اس کے لئے تو شریف آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ کردار کے مختلف نمونے تو آپ کو صرف نیک پاک صاف اور دلیر انسانوں میں ہی ملیں گے۔ شرافت اور بلند خیالی پر غور کیجیے۔ کم ظرفی اور ضلالت کا نام ہی نہ لیجیے یہ تو جہالت اور کمزوری کی علامتیں ہیں۔ لوگوں کو یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ وہ کمزور ہیں۔ نکتہ چینی تو ایک عملی تخریب ہے۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں تو چاہیئے کہ ہمیشہ اپنی اور دوسروں کی توجہ بلند اور اعلیٰ چیزوں کی جانب رکھیں ہم سب کی اصل پاک اور نُورانی ہے اگر ہمیں کسی کے بارے میں کچھ کہنا ہے تو اس کے نقائص اور معائب کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کی عظیم الشان فطرت کا ذکر زبان پر لانا چاہیئے۔ رُوح کی عظمت اور شان تو سب میں یکساں ہے فطری بلندی

---

[1] Laying of hand. یہ عیسائی مذہب کی ایک رسم ہے اس کے مطابق جب رُوحانیت کے طالب علم کو پادری کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تو وہ کسی بڑے پادری کے آگے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا ہے اور بڑا پادری اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے مذہب کی تبلیغ کا حق بخش دیتا ہے یہ رسم کئی دوسرے مواقع پر بھی ادا کی جاتی ہے۔

ہر شخص کا پیدائشی حق ہے ہمیں اس حق کی یاد دہانی کرانا چاہیئے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ خدا کی جانب زیادہ لوگ کیوں نہیں مائل ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن میں حواسِ خمسہ کی حدود سے باہر نکل کر تلذذ اور احتظاز حاصل کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ زیادہ تعداد تو ایسے لوگوں کی ہے جنھیں باطنی زندگی کا نہ تو شعور ہی ہے اور نہ احساس۔ ان لوگوں پر نکتہ چینی کرنا ان میں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا ایک اور بھی شدید احساس پیدا کرتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ انھیں بار بار اپنی عظمت اور شان کی یاد دہانی کرائی جائے۔ انھیں اپنی لامحدودیت سے غافل نہ ہونے دیا جائے۔

بھگتی کی عملی صورت کا دوسرا پہلو ہے ظاہری رسم ورواج کی قیود سے نکل کر پرستش کو اس محبت کے درجے تک پہونچا دینا جو ہر بندش سے آزاد ہو۔ انگریزی زبان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "گرجا میں پیدا ہونا تو بہت اچھا ہے۔ اس میں مرنا نہیں اچھا ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ مذہبی رسم ورواج کی چار دیواری میں نشوونما پانا تو رُوحانی ارتقا کے لئے ضروری ہے لیکن محض انھیں بندشوں میں مقید رہ کر زندگی گزار دینا اور رُوحانیت کی آزاد ہوا میں سانس لئے بغیر اسی حبس میں گھُٹ کر مرجانا اعلیٰ انسانی کردار کی علامت نہیں ہے۔ ایک چھوٹے اور نازک پودے کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے گرد جھاڑیاں لگا دی جائیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ان جھاڑیوں کا ہٹانا لازمی ہو جاتا ہے۔ ورنہ پودا بڑھ کر درخت نہیں بن سکتا اگر وہ جھاڑیوں میں گھرا رہے گا تو اس کی نشوونما رُک جائے گی۔ اور اس میں قوت اور توانائی نہیں آسکے گی۔ یہی حال رسمی پوجا پاٹھ یا عبادت کا ہے۔ یہ تمام رسم ورواج اور یہ عبادت کے نپے تلے طریقے اپنی جگہ ایک حد تک ضروری ہیں لیکن درجہ بدرجہ اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے ہم اس حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور ایک ایسے بلند تر مقام پر پہونچ جاتے ہیں۔ جہاں ہم کو ان بندشوں سے کلیتاً آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب ایشور بھگتی یا عشقِ الٰہی میں کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ تو پھر ہم ایشور کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ دُور سے اس کی صفات کے تصوّر کا طریقہ چھوٹ جاتا ہے ہم یہ نہیں سوچتے کہ خُدا قادرِ مطلق ہے۔ حاضرِ کُل ہے۔ اور اسی طرح کی دوسری صفتیں اس میں موجود ہیں۔ خدا کی ہستی اور اس کی موجودگی کے احساس کی شدّت ہی میں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ہم خُدا سے کسی اور چیز کے لئے متمنی نہیں ہوتے۔ جب وہ خود ہمارے سامنے موجود ہو تو پھر کسی چیز کے مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں کچھ مانگنا نہیں ہے تو قدرتی طور پر خدا کی صفات کا خیال نہیں آتا۔ موصوف کی صفات کے تصوّر کے پسِ پشت صفت کرنے والی کوئی نہ کوئی خواہش یا مانگ ہوتی ہے۔ سچے بھگتوں کو تو صرف خُدا کی محبت درکار ہوتی ہے۔ لیکن مسلک تشبیہ[۱]

۱۔ ANTHROPOMORPHISM.

سے پھر بھی چھٹکارا نہیں ملتا۔ ہم اپنی سرشت سے مجبور ہیں۔ جس کے باعث ہم خدا کو بھی اپنے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ ہم انسانی تصوّرات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہم اپنے جسم کی حدود کو طے نہیں کر پاتے۔ یہ مجبوریاں ہمارے ساتھ مرتے دم تک لگی رہتی ہیں۔ اِس لئے ہماری بھگتی۔ ہمارا عشقِ الہٰی بھی ہمیشہ انسانی محبت کا رنگ لئے ہوتا ہے لیکن محبت پھر بھی محبت ہے، رسمی عبادت سے بہت بلند جو درجہ بدرجہ بلند تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

عشقِ الہٰی (ایشور پریم) کی بھی دُنیاوی محبت کی طرح پانچ صُورتیں ہوتی ہیں۔
ایک محبت وہ ہے جس میں (معبود) محبوب کی عظمت اور طاقت کا خیال حاوی رہتا ہے۔ اور ساتھ ہی محبوب سے مُرادیں پُوری ہونے کی توقع بھی ہوتی ہے اس محبت کا درجہ سب سے کم ہے۔ اسکی مثال وہ محبت ہے، جو ایک بچے کو اپنے باپ سے ہوتی ہے، محبت جب مُرادوں کی حد سے گزر کر صلہ و انعام کے خیال کو ترک کر دیتی ہے تو خدمت کے مقام پر پہونچ جاتی ہے۔ یہ محبت کی دوسری صورت ہے، اِنسان خدا کو اپنا آقا۔ اپنا مالک سمجھ کر اُس کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اور اس خدمت کو اپنا انعام سمجھتا ہے۔ خدمت کی یہ خواہش اور ہر قسم کے جذبات پر غالب آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اس بات کا خیال تک نہیں آتا کہ ہمارے مالک کی صفات کیا ہیں وہ اچھا ہے۔ مہربان ہے یا نامہربان ہمارے لئے تو اس کی خدمت کا موقع ملنا ہی غنیمت ہے۔ عین مسرّت ہے۔ وفادار خادم کو جب مالک کا تقرب حاصل ہونے لگتا ہے تو محبت بلند ہو کر دوستی کے درجے تک جا پہنچتی ہے یہ ہے عشق کی تیسری صورت حقیقی دوست وہی ہیں جن میں کمتری یا برتری کا احساس کُلیتًا مٹ گیا ہو جو ہر حیثیت سے مساوی ہوں اس کی مثال ہیں۔ کھیل کود کے ساتھی جو ہر حالت میں ایک دوسرے کی رفاقت کا دم بھرتے ہیں۔ اِنسان اور خدا کا تعلق جب محبت کے اس درجے تک پہونچتا ہے، تو اِنسان خدا کو اپنا دوست اور رفیق سمجھنے لگتا ہے۔

اس سے بھی بلند درجہ ماں کی محبت کا ہے ماں کی بے لاگ مُحبت اپنی مثال آپ ہے جب بھگتوں کی محبت یہ (چوتھی) صُورت اختیار کرتی ہے تو وہ بھگوان کو اپنا نونہال سمجھ کر اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتے ہیں محبت کی یہ صورت دوسری صورتوں کے بمقابلہ زیادہ بلند مرتبہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں خوف کا عُنصر ذرا بھی نہیں ہوتا۔

پانچویں یعنی سب سے زیادہ بلند پایہ محبت خاوند اور بیوی کی محبت ہوتی ہے۔ اس مقام پر آ کر محبت اپنا انعام آپ ہو جاتی ہے یہ محبت کلیتًا بے غرض ہوتی ہے۔ ایشور بھگتی جب اپنے کمال کو پہونچتی ہے تو یہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ خدا کو محبوبِ کامل جان کر عاشقانِ حقیقت اس پر دل و جان قربان کرتے ہیں اور اسی میں ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے عشقِ مجازی کی زبان میں اس خیال کو اس حسین انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

"چار آنکھیں ملتی ہیں تو دو رُوحوں میں انقلاب آنے لگتا ہے۔ محبت ان دونوں رُوحوں کے درمیان آجاتی ہے اور ایک کو دُوسرے سے ملا کر یکجان و دو قالب بنا دیتی ہے"۔

جب انسان اسی آخری اور نہایت درجہ مکمل قسم کی محبت کے درجے میں پہونچ جاتا ہے تو تمام خواہشیں کالعدم ہو جاتی ہیں سارے دستور۔ اور ہر قسم کے اصول مٹ جاتے ہیں۔ وہ عبادت خانوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے یہاں تک کہ مکتی یا نجات کی خواہش بھی دل میں باقی نہیں رہتی۔ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ ہر مذہب کا منتہا و مقصد تو ہے دنیا و مافیہا کی قید سے آزادی حاصل کرنا اور جنم مرن (پیدائش و مرگ) کے سِلسلے سے چھٹکارا پانا لیکن عاشقانِ حقیقت کو اس سے نجات کی بھی کوئی خواہش نہیں رہتی۔ یہاں یہ جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس بلند ترین محبت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں جنس کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا جنسیت میں جسموں کا فرق و امتیاز باقی رہتا ہے۔ بلند ترین محبت ایک ربطِ کامل ہے جس میں فرق و امتیاز یعنی جنسیت کا سوال ہی نہیں اُٹھ سکتا۔ یہ ربط کامل یہ اتصال صرف رُوحوں کا ہوتا ہے جسمانی تصور جس قدر کم ہوتا جائے گا اتنی ہی زیادہ مکمل ہماری محبت ہوگی۔ آخر کار وہ منزل آجاتی ہے جب تمام جسمانی تصور فراموش ہو جاتا ہے اور دو رُوحیں باہم واصل ہو کر ایک ہو جاتی ہیں۔ عاشق و معشوق کا تصور ہو یا نہ ہو محبت کا خیال بذاتِ خود ہمیشہ قائم رہتا ہے اسی ازلی خیال سے عاشق و معشوق کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اسی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ یہی خیال مجازی صورتوں میں جلوہ گر ہو کر ناز و نیاز کی رنگینیاں پیدا کرتا ہے لیکن ان میں محدود ہو کر نہیں رہ جاتا ہے۔ مجازی صورتیں بجائے خود حسین نہیں ہوتیں۔ ان میں حُسن پیدا ہوتا ہے تو محبت کی نظر سے ہوتا ہے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھنے پر لیلیٰ کا حُسن آشکار ہوتا ہے۔ اسی بات کو ایک انگریزی مثال میں یوں کہا گیا ہے کہ عاشق کو اپنی حبشی محبوبہ کے ابرو میں ہیلن[۱] کا حسن نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معشوق حبشی ہو یا کوئی حُورِ جنّت وہ تو عاشق کے جذبۂ عشق کے اظہار کا ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ ایک نِشان ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنی محبت کی دولت کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ اس بے بہا دولت کو اس نِشان پر قربان کر دیتا ہے اہمیت اس نِشان کی نہیں اہمیت تو اس جذبۂ محبت کی ہے جو ازلی ہے اور جو ہماری حقیقت ہے جسے پانے کے لئے ہم ہمیشہ خارجی نشانات کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن جسے ہم ان نشانات سے بے نیاز ہو کر بھی پا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر خود سیپی[۲] کے اندر وہ مادہ ہوتا ہے جس سے لعل بنتے ہیں لیکن اس کا اظہار اسی وقت ہوتا ہے جب خارجی محرکات[۳] اس کے باطن میں داخل ہوتے ہیں۔ ان محرکات کی بجائے خود کیا قیمت ہے لیکن جب سیپی انہیں اندرونی مادّے سے لیپ دیتی ہے تو انہیں بے بہا موتی بنا دیتی ہے اسی طرح انسان کا داخلی جذبہ خارجی نشانات سے متحرک ہوتا ہے اور اپنی جمال انگیز قوت سے حُسن کے اس کمال تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے جو خود اس کی اپنی حقیقت ہے۔ اس جذبۂ محبت کو نشان یا محرک کی مدد

---

[۱] HELEN. [۲] OYSTER. [۳] IRRITANTS.

لے کر اپنے کمال کو مجسم کرنا پڑتا ہے حسن و محبت کے اس کمال کو ہم خدا کہتے ہیں۔ یہی ہم سب کا محبوب ہے۔ انسان دراصل اِسی آدرش سے محبت کرتا ہے اسی محبوب کا متلاشی ہوتا ہے خواہ اس کی ظاہری علامت کچھ بھی کیوں نہ ہو محبت ہی ہمارا بلند ترین نصب العین ہے وہ محبت جو کلیتاً بے غرض ہے جو اپنا انعام آپ ہے۔ یہ تمام عالم شہود محبتِ الٰہی کے جلووں سے متشکل ہے۔ محبت ہماری اصل ہے۔ اسی سے ہماری سرشت ہوتی ہے اسی سے ہماری زندگی قائم ہے محبت کو محبت سے عشق ہے یہی حقیقت ہے اس کو سمجھا تو جا سکتا ہے لیکن سمجھایا نہیں جا سکتا۔ محبت کو دیکھا جا سکتا ہے دکھایا نہیں جا سکتا۔ اس کا اظہار ناممکن ہے۔ محبت کیا چیز ہے اس کا بیان کرنا محال ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی گونگا آدمی مکھن کھا رہا ہو وہ مکھن کھانے کا لطف تو اٹھا سکتا ہے لیکن اس لطف کو بیان کرنے سے قاصر ہے اور اگر کوئی کچھ بیان کر بھی دے تب بھی اس بیان سے مکھن کھانے کا مزا تو وہی اٹھا سکتا ہے جس نے کبھی نہ کبھی مکھن کھایا ہے۔ اور لوگ اس سے کیا لطف اٹھا سکیں گے۔ اسی طرح محبت کی خاطر محبت کرنا کیا چیز ہے؟ اس کا اندازہ انھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے کبھی خود محبت کر کے دیکھی ہو ؎ کجا دانند حال ما سُبک ساران ساحل ہا۔ محبت ایک مثلث کی مانند ہے اس کا پہلا زاویہ یہ ہے کہ اس میں کسی سے کچھ مانگا یا طلب نہیں کیا جاتا اس میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا اس کا دوسرا زاویہ یہ ہے کہ محبت کسی سے ڈرتی نہیں اس کو کسی بات کا خوف نہیں ہوتا۔ اور اس کا تیسرا زاویہ یہ ہے اور یہی زاویہ اس مثلث کی راس بھی ہے کہ محبت محض محبت کی غرض سے کی جاتی ہے۔ محبت ہی کی طاقت سے جو اس میں لطافت اور بلندی آتی ہے۔ جہاں تک انسانی روابط کا تعلق ہے ان میں محبت شاذ ہی نظر آتی ہے کیونکہ انسانی محبت میں ایک جانب دُوسری جانب کی محتاج ہوتی ہے۔ لیکن خدا کی محبت ایک ایسا چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس کو کوئی گزند نہیں پہونچا سکتا اس میں کوئی خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ جب انسان خدا کو اپنی زندگی کا بلند ترین نصب العین یعنی آدرش سمجھ کر اس سے محبت کرتا ہے جب وہ اس کے سامنے بھکاری بن کر نہیں جاتا اس سے کچھ طلب نہیں کرتا تو اس کی محبت اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہونچ جاتی ہے اور اس عالم کائنات کی ایک بہت بڑی قوت بن جاتی ہے لیکن محبت کے میدان میں کمال حاصل کرنا جلد بازی کا کام نہیں اس میں وقت لگتا ہے۔ عاشقی کوئی آسان بات نہیں اس کے راستے میں بہت سے مشکل مقام آتے ہیں لیکن اس کا آغاز کر کے دیکھئے۔ انجام کار منزل مقصود تک رسائی ہو ہی جائے گی یاد رہے کہ ہمیں آغاز کار اُس مقام سے کرنا پڑتا ہے جو ہماری فطرت کے زیادہ سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے بعض اشخاص فطری طور پر محبتِ الٰہی کو خدمت اور عبادت کی صورت دیں گے اور بعض کسی قسم کے خوف دہر اس کے بغیر خدا کو اپنا نونہال سمجھ کر اس سے پیار کریں گے اس میں کوئی مضائقہ نہیں بہرحال دونوں کا ثمرہ خدا کے ہاتھ ہوتا ہے ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اپنی فطرت اور جبلت کے مطابق ہم خدا سے محبت کرنا شروع کر دیں اور باقی سب کچھ اسی پر چھوڑ دیں ؎

بھگتی اور فلاح عامّہ

مجھ سے کئی بار پوچھا گیا ہے کہ آخر مذہب۔ رُوحانیت اور ایشور بھگتی کا عملی فائدہ کیا ہے اس سے سماج کو کیا فیض پہونچتا ہے۔ مذہب بنی نوع انسان کے کس کام آتا ہے۔ اس سوال کے پس پشت جو ذہنیت کام کر رہی ہے اس کے مطابق سماج کے فائدے ہی کو ہر چیز کی قدر و قیمت کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے۔ سماج کی بہبودی ہی حقیقت کا معیار ہے۔ دراصل یہ بات ہی غلط ہے منطق اور دلیل سے کام لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ سماج کی اپنی کوئی ہستی نہیں۔ سماج بجائے خود ہمارے نشو و نما کی ایک منزل ہے جس میں ہو کر ہمیں لازمی طور پر گزرنا پڑتا ہے۔ مذہب اور روحانیت کی اہمیت کا اندازہ اسی نقطۂ نظر سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ارتقا سے سماج کی حالت سُدھر جاتی ہے۔ سماج کی بھلائی اور بہبودی کی کوششوں سے ہماری ارتقا خود بخود نہیں ہو جاتی۔ سماجی بھلائی سے مذہبی قدروں کا اندازہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے کسی سائنٹیفک دریافت کی افادیت کے متعلق رائے اس لحاظ سے قائم کرنا کہ اس سے چھوٹے بچوں کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ ایسا کرنا محض جہالت ہے۔ دراصل سماج کسی مستقل چیز کا نام نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ سماج مستقلاً کمال پر پہونچ جائے۔ سماج کو ایک مستقل چیز قرار دینا تو گویا یہ کہنا ہے کہ بچے کا وجود دائمی وجود ہے۔ جس طرح بچہ روز بروز نشو و نما پاتا ہے اسی طرح سماج بھی دم بدم بدلتا رہتا ہے اس لئے نہ تو کوئی آدمی نرا مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی سماج کی کوئی مستقل صورت ہو سکتی ہے۔ یہ الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں انسان کو سماج وغیرہ ایسی ابتدائی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس لحاظ سے سماج ایک حد تک فائدہ مند ہو سکتا ہے لیکن سماج ہمارا نصب العین نہیں ہو سکتا۔ سماج میں مسلسل انقلاب آتے رہتے ہیں۔ اور ان انقلابوں کا آنا لازمی ہے۔ یہی ارتقا کا تقاضا ہے۔ ہماری موجودہ تجارتی تہذیب اور اس کے بلند بانگ دعووں اور دوسری

تمام لغویات وخرافات کو ایک دن لازمی طور پر ختم ہونا ہے یہ تماشا بہت دنوں تک جاری نہیں رہ سکتا دنیا ارتقا کی منزلوں کو طے کرتی رہے گی۔ آج دنیا کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے قوتِ خیال جس کا اظہار منفرد اشخاص کی ذات سے ہوتا ہے میرے گروجی فرمایا کرتے تھے "اپنے کنول کے پھول کو کھلانے کی کوشش کرو شہد کی مکھیاں خود بخود اس کی طرف دوڑتی آئیں گی"۔ دنیا کو ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جنہیں دیوانگی کی حد تک خدا سے محبت ہو ایسے ہی انسان دنیا کا حقیقی معنوں میں بھلا کر سکتے ہیں لیکن ایشور بھگتی بھی خود اعتمادی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی بھگت کو جب تک اپنی بھگتی میں یقین نہیں ہوتا اسکو خدا کی ہستی پر بھی مکمل یقین نہیں ہوسکتا پہلے خود اپنے اندر اعتماد کا جوہر پیدا کیجئے پھر آپ کو خدا کی ہستی پر بھی ایمان آجائے گا۔ اس دنیا کی تاریخ گنتی کے چھ افراد پر مشتمل ہے جن کو اپنی ذات اور جن خدا پر مکمل اعتقاد تھا جن کا کردار نہایت پاک وصاف تھا اور جن کی سیرت میں گہرائی اور طہارت تھی سب سے پہلے ہمیں اپنے کردار کو مضبوط اور پاک بنانا ہے۔ اس کے لئے تین باتیں لازمی ہیں ایک حساس اور درد آشنا دل جس میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہو دوسرے تیز و طرار دماغ جس میں فکر کی گہرائی اور خیال کی وسعت دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہوں اور تیسرے مضبوط اور توانا ہاتھ جن میں قوتِ عملی ہر وقت بے تاب اور بے قرار ہو۔ یہ چیزیں خود غرض اور بے رحم دنیا کے زہریلے ماحول میں میسر نہیں ہوسکتیں اس کے لئے دنیوی حدود سے باہر قدم رکھنا لازمی ہے۔ آپ اپنے آپ کو ایک ڈائنامو[۱] (بجلی پیدا کرنے والی مشین) بنالیجئے جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے دل میں دنیا کے لئے درد پیدا کیجئے۔ ہم لوگ عام طور پر دنیا کے دھندوں میں کولھو کے بیل کی طرح جٹے رہتے ہیں۔ ہمارے دل میں ہمدردی کے جذبات گھٹ گھٹ کر فنا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار میں پھنس کر ایسے کتنے آدمی ہیں جن میں عمل کی اہلیت باقی رہ جاتی ہے، کہاں ہے وہ درد اور وہ احساس جس نے اگنیٹس لوایولا[۲] جیسی ہستیوں کو جنم دیا اپنے جذبہ محبت اور اپنے حلم و بردباری کو عمل کی کسوٹی پر پرکھیے۔ محبت اور اخوت میں بغض وحسد کی گنجائش نہیں جس شخص میں بغض وحسد ہوگا وہ کبھی منکسر المزاج اور محبت کرنے والا نہیں ہوسکتا بغض وحسد تو نہایت خوف ناک گناہ ہے۔ یہ جذبہ نہایت پراسرار طور پر انسان کے دل ودماغ میں داخل ہوجاتا ہے ان سے اپنے آپ کو بچائیے۔ آپ خود اپنے دل سے پوچھئے کیا اس میں نفرت اور بغض وحسد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ نفرت اور غصے کے ان جذبات سے جن کا اظہار دنیا میں آئے دن ہوا کرتا ہے، ہمیشہ نیک کاموں پر پانی پڑجاتا ہے۔ اگر آپ پاک وصاف ہیں اگر آپ مضبوط ہیں تو آپ خود اکیلے ساری دنیا کا مقابلہ کرسکتے ہیں یاد رکھئے کہ تیز سے تیز دماغ ایک خشک صحرا کی مانند ہے۔ جب تک ایک حساس دل سے پاکیزگی کی برکھا نہیں ہوگی

۱ـ Dynamo.   ۲ـ Ignatius Loyola.

اِس میں کوئی چیز بھی اُگ نہیں سکتی ۔ جب تک دماغ کے ساتھ احساس کام نہ کرے ۔ دماغ یہ تنہا کوئی کام نہیں کر سکتا آپ محبت ہی کو اپنی زندگی کا محرک بنا لیجئے محبت کبھی ناکام نہیں ثابت ہوئی ہے اگر آپ کے دل میں محبت ہے تو آپ کا دماغ خود بخود غور و فکر کے صحیح راستے پر چل نکلے گا ۔ آپ کے ہاتھوں سے نیک اعمال خود بخود سرانجام پانے لگیں گے ۔ یہ باتیں محض خواب و خیال کی باتیں نہیں ہیں ۔ رشیوں منیوں اور خدا رسیدہ عارفوں نے ایشور یا خدائے پاک کے بارے میں محض قیاس آرائی سے ہی کام نہیں لیا ہے ان کو تو اُس کا دیدار بھی حاصل ہوا ہے ۔ حضرت یسوع مسیح نے کہا ہے، خدا کا دیدار حاصل ہوگا[ك] ۔ تمام پیغمبروں اور عارفوں کا یہ دعویٰ کہ انہیں خدا کا دیدار حاصل ہوا ہے ۔ ہزاروں سال پیشتر ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کو بھگوان کے درشن ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا ۔ نہ جانے کتنے انسانوں کو خدا کا دیدار حاصل ہو چکا ہے ہمارے بزرگوں نے تو اپنی مثال قائم کر کے ہمارا کام آسان بنا دیا ہے ہمیں اس خدا تک پہونچنے کا راستہ دکھا دیا ہے جو اس تمام عالمِ اسباب سے ماورا ہے ۔ اب ہمیں محض ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی منزل کو پالینا ہے حقیقت کا شاندار خاکہ ہمارے سامنے موجود ہے ہمیں تو بس اُس کی تکمیل کرنا ہے ؂

ك The pure in heart shall see Goo.

دیوی پوُجا[1]

"رنج اور خوشی" انسانی مدرکات کے دو ایسے متحدہ اور تعمیری عُنصر ہیں جن کے بغیر کسی قسم کا شعور و احساس ممکن ہی نہیں۔ ان سے مفر کی کوئی صُورت نہیں جس بات سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے اسی سے رنج بھی پہونچتا ہے اور جس چیز سے ہمارا دل دکھی اور رنجیدہ ہوتا ہے وہی سکھ اور راحت کا موجب بھی بنتی ہے۔ ہماری تمام دُنیا انہیں دونوں اجزا یعنی غم اور خوشی سے مرکّب ہے ان سے چھٹکارا پانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ زندگی کے دل کی دھڑکن میں یہ متضاد حرکات شامل ہوتی ہیں پھر بھی امن و سکون کی خاطر دنیا ان دونوں متضاد اجزا میں باہم موافقت و مطابقت پیدا کرنے کی بے سُود کوشش کرتی رہتی ہے اور رشی مُنی (عارف) سچی مسرت کے لئے اسی تضاد کا حل سوچتے رہتے ہیں لیکن زندگی کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ جہاں دُکھ اور درد کی آگ ہمیں جھلس کر رکھ دیتی ہے وہاں وقتاً فوقتاً راحت و آرام کی ٹھنڈی ہوائیں بھی ضرور چلتی ہیں مگر ان رُوح افزا جھونکوں سے جلن کی شدّت کا احساس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں جہاں تہ بہ تہ تاریکی نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے وہاں روشنی کی ایک کرن اگر کبھی کبھی تاریکی کا پردہ چاک کر دیتی ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تاریکی اور زیادہ گھری ہو جاتی ہے۔

یہ تلخ تجربہ عمر کے ساتھ ہوتا ہے اوائلِ عمر میں تو ہر طرف امید اور خوشی کی فضا نظر آتی ہے جوں جوں

---

[1] اس تقریر کی بنیاد ہیں وہ چھوٹی چھوٹی اور علیحدہ علیحدہ یادداشتیں جو سوامی وویکانند جی کی ایک جماعتی گفتگو کے دوران حاصل کی گئی تھیں۔ یہ گفتگو نیویارک میں ہوئی تھی۔

آدمی بڑا ہوتا ہے اس کو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام زندگی ایک فریب ہے یہاں کسی ایک مقصد کی بھی تکمیل نہیں ہو پاتی آدمی کی ایک پیاس بھی پوری طرح نہیں بجھ پاتی۔ تمام عمر اسی چیستان کو حل کرتے بیت جاتی ہے۔ اگر زندگی کے اس مسئلہ کا کہیں حل ملتا ہے تو بس مذہب میں ملتا ہے اور مذہب میں بھی اس کی دو صورتیں ہیں کچھ مذہب ایسے ہیں جو نیکی اور بدی کی دو طاقتوں کے وجود میں یقین رکھتے ہیں وہ خدا اور شیطان کو دو علیحدہ علیحدہ طاقتیں مانتے ہیں یہ عقیدہ اہل ایران میں رائج تھا یہودیوں کی معرفت یہ عقیدہ تمام یورپ اور امریکہ تک پھیل گیا ہزاروں سال پیشتر تو یہ مفروضہ انسانی نسل کے لئے کافی ثابت ہوا ہوگا لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ مفروضہ قابلِ مدافعت نہیں رہا۔ آج کل کا ذہین انسان اس قسم کی باتوں کو قبول نہیں کر سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی چیز قطعی طور پر اچھی یا بُری نہیں ہوتی۔ ایک بات ایک شخص کے لئے اچھی ہوتی ہے اور دُوسرے کے لئے بُری۔ آج جو چیز اچھی سمجھی جاتی ہے کل اسی کو خراب قرار دے دیا جاتا ہے یا اسکے برعکس آج جو چیز خراب شمار ہوتی ہے کل وہ اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ خدا اور شیطان کا تصوّر زندگی کی تفسیر نہیں کر سکتا دراصل خدا کے تصور میں بھی درجہ بدرجہ ارتقا کی صورت نمودار ہوتی ہے اوائل تاریخ میں ہر قبیلے کا اپنا اپنا خدا تھا جب کوئی قبیلہ دوسروں پر غالب آتا تو اس کا خدا دوسرے قبیلوں کے خداؤں کا خدا مان لیا جاتا مثلاً قدیم زمانے میں مصریوں اور بابل والوں نے اس قبائلی فتح و شکست کو یوں عملی صورت دی کہ ان کا خدا مولوق[1] مفتوحہ قبائل کے خداؤں کا خدا قرار دیا گیا اور دوسرے خُداؤں کو مولوق کی عبادت گاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا بہرحال خُدا اور شیطان کے متعلق اِس قسم کی قیاس آرائیوں کے باوجود سُکھ دُکھ کی پہیلی پہیلی بنی رہی نیکی بدی کا راز سربستہ ہی رہا اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ مِل پایا کہ انسان گناہ کیوں کرتا ہے؟ گُناہ کا ارتکاب آخر کس قوت کے زیر اثر ہوتا ہے؟ بعض لوگوں نے اس سوال کو یہ کہہ کر مٹا دیا کہ جو کچھ ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے اور ان رازوں کو سمجھنا ہماری عقل سے باہر ہے لیکن حقیقت سے آنکھیں بند کر لینے سے اس کی تلخی مٹ نہیں جاتی دل کو اس طرح سہارا دے کر ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں ایسا کرنا تو مصیبت کو دیکھ کر شتر مُرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے کے برابر ہے یا ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا لینا ہے۔ دونوں حالتوں میں ہم اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر دنیا میں سب کچھ ہماری بھلائی ہی کے لئے ہوتا ہے تو پھر اخلاق کی کیا قیمت رہ جاتی ہے۔ اخلاق کا اصلی اصول اور لب لباب ہے ایثار قربانی اور اپنے پر دُوسروں کو ترجیح دینا۔ خود کو مٹا دینا۔ اس اخلاق کا ہر شخص دم بھرتا ہے لیکن کیوں؟ اگر عالم کائنات کا خدائے اعظم نیک اور رحیم و کریم ہے اگر وہ سب کی بھلائی کا ضامن ہے تو پھر ہم پر ایثار اور قربانی کی ذمہ داری

---

[1] مولوق۔ زمانہ قدیم کا ایک کنعانی بُت جس پر بچوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی (مترجم)

کیوں آتی ہے ہم سے ان اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کی توقع ہی کیوں کی جائے اور اگر خدا قہار ہے اگر طاعون، قحط اور جنگ وجدل کی آفات اس کی بدولت نازل ہوتی ہیں تو ایسا خدا یقیناً ایک انتقامی ذہنیت رکھنے والی اور خودغرض ہستی ہے جسکے لئے انسان کے دل میں خوف تو ہو سکتا ہے عزت اور محبت نہیں ہو سکتی۔ خدا کے متعلق اس قسم کے تصورات اور اخلاقیات میں زبردست تصادم پیدا ہو جاتا ہے جس کو دور کرنے کے لئے انسان ہمیشہ سے کوشش کرتا چلا آیا ہے۔

ہمیں زندگی کی ان تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا ہے۔ ہم سب کو اس زندگی میں تجربے حاصل کرنا ہیں۔ تلخ تجربات سے بچنے کی ہم لاکھ کوشش کریں لیکن جلد یا بدیر ہم ان کی گرفت میں آہی جاتے ہیں۔ مجھے اس شخص پر رحم آتا ہے جو تمام صورت حالات کا مقابلہ نہیں کرتا اور کارزارِ زندگی سے فرار کی راہ تلاش کرتا ہے کیونکہ ہمیں سچی آگاہی انھیں ناخوشگوار تجربات سے ملتی ہے۔ اِنہیں تجربات سے تو ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دیومالا ویدوں کی ہو یا اودستھا کی اس کی بنیاد پر اس مسئلہ کی جو توضیح کی گئی ہے وہ ناکافی اور ناقابلِ قبول ہے۔ اس میں فی زمانا کوئی جان نہیں۔ آج اس سے ہماری پوری تسلّی نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے تمام بنیادی سوال بدستور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں اِن کا کوئی تسلّی بخش جواب نہیں ملتا۔ البتہ خدا کا تصوّر جب انرجی (ENERGY) یا طاقت کی صورت میں کیا جاتا ہے تو یہ مشکل دُور ہونے لگتی ہے۔ اس کا حل نظر آنے لگتا ہے اس تصور کا پتا بھی ویدوں میں چلتا ہے۔ اس تصور نے "دیوی" یا "ماتا" کی صورت اختیار کرلی مثلاً ویدوں میں دیوی کی شان میں لکھا ہے۔

"میں روشنی ہوں۔ میں ہوا ہوں۔ سُورج اور چاند کی روشنی میری ہی روشنی ہے۔ میرے ہی دم سے تمام مخلوقات کے قالب میں جان پڑی ہے۔"

یہ تھا وہ بنیادی تصوّر جس نے آگے چل کر ماتا پوجن (ماں کی عبادت) کا روپ دھارن کرلیا۔ دیوی تو جا سے ہماری مراد زندگی کے جنسی پہلو کو نمایاں کرنا نہیں یعنی یہ کہ باپ اور ماں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز قائم کیا جائے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اسی تصوّر کی تہہ میں جو اوّل ترین خیال کام کر رہا ہے وہ ہے انرجی (ENERGY) یعنی طاقت کا خیال اس طاقت کا خیال جو سب جانداروں کے اندر کام کر رہی ہے۔" اس تصوّر کی ارتقا آہستہ آہستہ ہوئی جیسے بچہ ہڈی، ماس اور اعصاب یعنی (Nerves) کا محض ایک پتلا ہوتا ہے لیکن جوان ہو کر طاقت اور توانائی کا مجسمہ بن جاتا ہے اسی طرح خدا کے متعلق انسان کے تصورات بھی آہستہ آہستہ ترقی کرتے گئے اور آخر کار ان سے نتیجہ کے طور پر انرجی یا طاقت کا تصوّر رونما ہوا۔ شروع شروع میں انسانی دماغ نیکی اور بدی۔ ثواب اور گناہ میں کوئی تمیز نہیں کرتا تھا اس امتیاز کا تصوّر اس وقت پیدا ہوا جب شعور کی ترقی کیسا تھ

یہ معلوم ہوا کہ ہمارے اندر ایک ایسی طاقت موجود ہے جو خارجی بندشوں اور مجبوریوں کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہر قدم پر مقاومت اور کشاکش کرنا ہماری صفات میں داخل ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہمارے وجود کا انحصار ہی داخلی اور خارجی طاقتوں کے اس دائمی مقابلہ ومقاومت پر ہے۔ ہمیں دنیا کا ذرہ ذرہ اپنی مخالفت پر تلا ہوا نظر آنے لگا اور ہمیں اس بات کا شعور ہوا کہ ہماری داخلی طاقت پر اس مخالفت کے ردِ عمل ہی سے ہمارے مدرکات ومشاہدات نیز ہمارے خیالات وتصورات کی تشکیل ہوتی ہے۔

ایشور یا خدا کے متعلق یہ نظریہ بالکل نیا تھا۔ اس سے پہلے خدا کا تصور ایک عظیم الشان نیک اور پارسا انسان کا تصور تھا۔ ویدوں کی مناجاتوں کے مطابق ورنؔ[1] اور اندرؔ[2] دونوں دیوتا بھگتوں پر بہترین عطیات اور برکات کی بارش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور ایک شخصی خدا کا تصور ہے لیکن آہستہ آہستہ یہی خیال ترقی کرتے کرتے ایک غیر مرئی کائناتی طاقت کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نئے اصول کے مطابق اس تمام مظاہراتی دنیا کے پسِ پشت صرف ایک ہی طاقت کام کر رہی ہے۔ یہ طاقت خواہ کسی صورت میں جلوہ گر ہو اس کی نوعیت یکساں رہتی ہے۔ گناہ گار کے گناہوں اور اوتاروں پیغمبروں اور نجات دہندوں کی روحانیت میں وہی ایک طاقت کار فرما ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خیال میں ایک جدت ہے ایک نیا پن ہے۔ خدا کا قدیم تصور تشخصی تھا۔ اس نئے خیال سے ایک عالم گیر طاقت کے تصور کا آغاز ہوتا ہے جسے شروع شروع میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

"جب بدی کو مٹانا ہوتا ہے تو رُدرا[5] کی کمان کا چلّہ میں چڑھاتا ہوں۔"

آگے چل کر گیتا میں قدرے زیادہ وضاحت کر دی گئی ہے بھگوان کرشن فرماتے ہیں۔

"اے ارجن۔ میں ہی ستیہ[3] ہوں اور میں ہی استیہ[4] ہوں۔ میں ہی اچھا ہوں اور میں ہی بُرا ہوں اور میں ہی پاپیوں (گناہ گاروں) کی قوتِ گناہ گاری ہوں لیکن اس انقلاب خیز تصور کی تاب بھلا کتنے آدمی لا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بھگوان نے گیتا میں اس خیال کو زیادہ وضاحت کے ساتھ نہیں ظاہر کیا بجائے اس کے انہوں نے اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک انسان سے نیک کام سرانجام پاتے ہیں اسی وقت تک بھگوان کی طاقت اس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

لیکن یہ حقیقت کا ایک پہلو ہے اس کا دوسرا پہلو بھی چھپایا نہیں جا سکتا یہ پہلو ایرانیوں کے مذہب

---

[1] VARUN. [2] INDRA. [3] ستیہ سے مراد ہے وہ شے جس کا وجود دوامی ہوتا ہے۔ [4] استیہ سے مراد ہے وہ شے جس کا وجود عارضی ہوتا ہے۔ [5] RUDRA.

میں شیطان کا تصور بن کر نمودار ہوا لیکن چونکہ ہندوستان میں شیطان کا تصور کبھی تھا ہی نہیں اس لیے یہاں اس نئے تصور کا شعور پیدا ہوا کہ خیر و شر ایک ہی طاقت کی دو صورتیں ہیں "شر" ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس عالم کائنات کا وجود ایک حقیقت ہے جس میں نیکی اور بدی دونوں شامل ہیں اور اگر اس عالم کا کوئی خالق ہے تو نیکی اور بدی یہ دونوں چیزیں بھی اسی کی تخلیق ہیں۔ اگر اس جہان کا کوئی حکمراں ہے تو اس کی قدرت خیر و شر دونوں پر ہے وہ دونوں کے لئے ذمہ دار ہے اگر اُسی کی طاقت سے ہم کو زندگی نصیب ہوتی ہے تو اس کی طاقت ہماری موت کا باعث بھی ہے۔ ہماری خوشی اور ہمارے غم دونوں کی اصل وہی ہے اسی کی بدولت ہمارے قہقہوں اور آنسوؤں میں باہم دیگر ایک ربط ہے مگر اس دُنیا میں آنسوؤں کی مقدار قہقہوں کی مقدار سے کہیں زیادہ ہے، اس کا سبب بھی خود وہی ایک طاقت ہے ایسا کہنا صریحاً غلط بیانی ہے کہ رنگین اور مہکتے ہوئے پھول۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے برف پوش ہمالیہ ایسے پہاڑ تو ایک رحیم و کریم اور پاک خدا نے بنائے ہیں لیکن ہمارے گناہوں اور ہماری خامیوں کا ذمہ دار یا تو کوئی شیطان ہے یا ان کا صدور خود ہمارے اعمال سے ہوتا ہے۔ اس قسم کے نظریوں سے یقیناً تسلی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ایک ٹانگ پر کھڑی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دنیا کے خدا کے تصور میں بھی ایسی ہی خامی رہ گئی ہے ؎

علاوہ اس کے کہ نیکی اور بدی کے علیحدہ علیحدہ وجود کا نظریہ بذات خود ادھورا ہے اس پر عمل کرنے سے انسان بے رحم درندوں کے پست درجے تک گر جاتا ہے۔ اگر نیکی اور بدی قطعی طور پر دو مختلف چیزیں ہیں جن میں باہم دیگر کوئی تعلق نہیں تو جو لوگ بزعم خود نیک ہیں وہ دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور اُن کے دل میں ہمدردی کا جذبہ ذرا بھی نہیں رہتا مثلاً شریف گھرانے کی عورتیں اگر دُور سے بھی کسی طوائف کو دیکھ لیں تو راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ جاتی ہیں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے ہو سکتا ہے کہ کئی باتوں میں وہ طوائف ان شریف زادیوں سے بہتر ہو لیکن چونکہ وہ بدنام ہو چکی ہے اس لئے ہر شریف عورت اس سے نفرت کرنے لگتی ہے اور اس طرح دنیا میں دوامی رشک و حسد اور نفرت کا جذبہ پھیلنے لگتا ہے اور انسان انسان کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امتیاز کی ایک خلیج حائل ہو تی جاتی ہے۔ جو لوگ خود کو نیک سمجھتے ہیں وہ اُن لوگوں سے دُور رہنے لگتے ہیں جن کو وہ بُرا سمجھتے ہیں یا کم سے کم جنہیں وہ اپنے سے کم شریف جانتے ہیں اس طرح سے اچھے اور بُرے کا فرق پیدا ہو کر انسان کی فطری وحدت کو مختلف ٹکڑوں میں منقسم کر دیتا ہے میری نظر میں یہ بہیمانہ نظریہ خالص گناہ ہے بلکہ گناہ سے بھی بدتر۔ درحقیقت نیکی اور بدی کا وجود علیحدہ علیحدہ نہیں ہے نیکی زندگی کے ارتقائی عمل کا محض ایک روشن پہلو ہے اور بدی اسی ارتقا کی کمی کا نام ہے جتنا جتنا کوئی شخص ارتقا کی اعلیٰ منازل کے قریب ہوگا دُنیا اُسے نیک اور پارسا کہے گی اور جتنا جتنا کوئی شخص ارتقا کے ابتدائی مراحل میں گرفتار ہوگا اتنا اتنا ہی لوگ اُسے برا کہہ کر بدنام کریں گے لیکن جس قوت ارتقا کی بدولت یہ زندگی قائم ہے وہ تو

پاکباز اور گنہگار سب میں یکساں طور پر کارفرما ہے جیسے سُورج کی روشنی اچھوں اور بُروں دونوں پر یکساں پڑتی ہے کیا سورج دونوں میں کسی قسم کا امتیاز روا رکھتا ہے؟ کسی ایسے خدا کا تصوّر جو فقط اپنے پرستاروں پر رحمت اور شفقت کی بارش کرتا ہے۔ ایک ادھورا تصور ہے ایک نامکمّل نظریہ ہے۔ خدا کو جگت پتا ماننا ایک پرانا عقیدہ ہے لیکن اس کی اصل خود ہمارا ہی حسین تخیّل ہے جس کی رو سے خدا مسرّت کا چشمہ ہے۔ آنند کا ساگر ہے۔ ہم زندگی کے تلخ حقائق کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تو گناہ یا بدی کے وجود ہی سے انکار کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ایک قسم کی حسین خود فریبی ہے۔ ہمارے کہنے سے بدی نہیں مٹ جاتی اس کی ہستی صفر کے برابر نہیں ہو جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ "میں" یہ "انا" ہی سارے گناہوں کی جڑ ہے اور یہ "میں"۔ یہ "انا" کسی صورت سے مٹتی نہیں۔ کیا میں صفر ہوں؟ کیا میری ہستی کوئی معنی رکھتی ہے؟ کون ہے جس نے اس "انا" کو مٹا دیا ہے۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ہمیں کامیابی نہیں ہوتی۔ ہم چاہے ہر روز لگاتار کوشش کریں کہ ہمیں اپنی ہستی کا احساس اس "میں" کے شعور سے آزاد ہو کر ہونے لگے لیکن عموماً ہمیں اس کوشش میں ناکامی ہوتی ہے۔ اس "میں" سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ ایک ایسے خدا کا تصوّر جو نیکی اور پاکیزگی ہی کا مجسمہ ہے بدی اور گناہ سے فرار کی ایک صورت ہے لیکن یہ فرار ناممکن ہے۔ ہمیں تو بدی اور گناہ کی تلخ حقیقت کا دُو بدُو مقابلہ کرنا ہے۔ ہمیں تو کُل حقیقت کا شعور حاصل کرنا ہے۔ صرف اس کے خوشگوار پہلو کو اپنانے اور اُسکے دلخراش پہلو کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو پھر وہ خیر و شر دونوں کا خدا ہے۔ میرے لئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ میں اس کے صرف ایک رُخ پر نظر جما کر اس سے جزوی محبت کروں اور جہاں ہنسی خوشی نیکی پاکیزگی نیز سکون اور راحت ہو وہاں تو خدا کو جلوہ گر دیکھوں اور جہاں رنج و غم ہو، بدی اور گناہ ہو پریشانی اور کلفت ہو وہاں سے اپنے خدا کو دور ہٹا لوں، اگر مجھے واقعی خدا سے عشق ہے تو مجھے ہر حالت میں اُس سے پیار کرنا ہوگا۔ ہر صورت میں اُسے اپنانا ہوگا۔ عارف اور عاصی دونوں میں اُس کا جلوہ یکساں طور پر دیکھنا ہوگا چراغ سے ہر حالت میں روشنی برستی ہے یہ اور بات ہے کہ اس روشنی میں کوئی جعلی دستخط کرتا ہے یا کوئی اشد قحط میں مدد دینے کے لئے ایک ہزار ڈالر کا چیک لکھتا ہے۔ بے چارہ چراغ تو ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ روشنی بذاتِ خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی ہم خود اُس کو اچھے یا بُرے کام کے لئے استعمال میں لا کر اچھی یا بُری بنا دیتے ہیں:

خدا کی طاقت یا انرجی کے اس نظریئے کا کچھ نام بھی رکھا جانا ضروری تھا تا کہ اُس کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آسکے اسی لئے اس طاقت یا انرجی کو "ماتا" کا نام دیا جاتا ہے اِس نام کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نظریئے کو سب سے پہلے ایک عورت نے پیش کیا جسے بعد میں آنے والی نسلوں نے دیوی کا درجہ دیا۔ اس کے بعد اس نظریئے کا ذکر سانکھیہ کے فلسفے میں آتا ہے، اِس فلسفے میں بھی طاقت یا انرجی کو مؤنث باندھا گیا ہے۔ یہی ساری زندگی کی محرک ہے۔ اسی نے

خدا کو ساکن قرار دیا ہے جیسے مقناطیس ساکت ہوتا ہے۔ حرکت ہوتی ہے تو لوہے کے برادے میں ؛

ہندوستان میں عورت کو جو سب سے زیادہ بلند مرتبہ دیا جاتا ہے۔ ماں کی حیثیت سے دیا جاتا ہے۔ ماتا کا پایہ بیوی سے بھی زیادہ بلند ہوتا ہے۔ بیوی اور بچے انسان کو چھوڑ کر چلے جاسکتے ہیں لیکن ماں کبھی ایسا نہیں کرسکتی۔ ماں ہمیشہ ماں رہتی ہے اس کی محبت کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ وقت کے ساتھ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ماں کی پاک محبت میں کسی قسم کی غرض نہیں ہوتی وہ کوئی عوض معاوضہ کرنا نہیں جانتی اس کی محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔ ایسی محبت کون کرسکتا ہے؟ کس کے پہلو میں ایسا بے غرض دل ہوسکتا ہے؟ اولاد کی محبت ہو یا بیوی کی کسی کا مقابلہ ماں کی محبت سے نہیں ہوسکتا۔ ماں کی محبت تو بے بدل ہوتی ہے اسی لئے کائناتی طاقت کو ماتا کا نام دیا گیا ہے۔ ماتا ہی وہ شکتی ہے جس کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے اسی کی ذات سے یہ عالمِ کائنات پیدا ہوتا ہے اسی کی ذات سے یہ فنا بھی ہوتا ہے اور تخلیق و تخریب کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری رہتا ہے کہ تباہی اور فنا ہی تخلیق اور آفرینش کا نقطۂ آغاز بنتی ہے جیسے پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ کر آدمی کسی وادی میں قدم رکھتا ہو ویسے ہی زندگی کے اختتام یعنی موت سے نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر ہمت ہو تو اس کائناتی طاقت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے جس کا کام نیکی اور بدی میں برابر جاری رہتا ہے حقائقِ زندگی سے چشم پوشی مناسب نہیں ان سے فرار تو کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔ بہادر وہی ہے جو ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جائے ورنہ ساری عمر حرص و ہوا ہمارا تعاقب کرتے رہیں گے ؛

جن دلیر انسانوں میں برائی کا سامنا کرنے کی ہمت ہے صرف انہیں کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہ سارا "خیر و شر" ماتا کا کھیل ہے۔ کھیل کو کھیل سمجھیے، اُسکو اتنی اہمیت کیوں دیجئے یہ "ماتا" بذاتِ خود قادرِ مطلق ہے اس کو کون مجبور کرسکتا ہے۔ ذرا سوچیے تو کہ "ماتا" نے اس سارے برہمانڈ کو اس عالم کائنات کو کیوں پیدا کیا۔ اس میں اُس کی کچھ ذاتی غرض تو ہے نہیں۔ وہ تو ہر حالت میں مکمّل ہے اُس کو کچھ بھی حاصل کرنا نہیں۔ اس کی تہہ میں اس کا کوئی مقصد کوئی منشا نہیں ہوسکتا تھا تو پھر اس تمام سلسلۂ تخلیق کا منشا کیا ہے۔ محض کھیل۔ محض تفنّنِ طبع۔ ہم اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہم سب اس کھیل میں شامل ہیں۔ ہم سب ماتا کے ساتھی ہیں۔ اسی بھول سے ہم میں تفرقات پیدا ہو جاتے ہیں اور ہم طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہو جاتے ہیں ہماری نجات تو ہمیشہ اس نکتے کو یاد رکھنے ہی میں ہے کہ ہم سب ماں کے اس کھیل میں حصہ لینے والے اس کے سنگی ساتھی ہیں ؛

ذرا ان اذیتوں کا خیال کیجیے جو ماں کو اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت میں سہنا پڑتی ہیں لیکن کیا کوئی ماں ان کو اذیّت سمجھتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس کو تو اپنے بچوں کے لئے مصیبتیں اٹھانے میں بھی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اولاد کی حفاظت کے لیئے برت رکھتی ہے۔ پوجا پاٹھ کرتی ہے دعائیں پڑھتی ہے ان کی نگرانی کرتی ہے! اولاد کو وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیار کرتی ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ماں کی

کوئی غرض نہیں ہوتی اس کی محبت بے لوث ہوتی ہے؛

مگر اس محبت کا اتنا تقاضا ضرور ہے کہ ماں کے بچے کم از کم ماں کی محبت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ماں محبت سے پیار کرے تو عین نعمت ہے لیکن اگر وہ محبت سے مجبور ہو کر کبھی کچھ کہہ سن دے جب بھی اسے نعمت ہی سمجھنا چاہیئے۔ یہی تعلق ہم سب کا جگت ماتا سے ہونا چاہیئے۔ راحت حاصل ہو تو خیر اچھی بات ہے۔ راحت کا طلب گار کون نہیں ہوتا لیکن اگر کبھی رنج بھی پیش آجائے تو ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے ایک مچھر ایک سانڈ کے سینگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً مچھر کے ضمیر نے اسے ملامت کی اور وہ سانڈ سے کہنے لگا۔ "سانڈ صاحب میں آپ کے سینگ پر بڑی دیر سے بیٹھا ہوا ہوں اس سے آپ کبیدہ خاطر ہو رہے ہوں گے اس لئے مجھے بڑا افسوس ہے لیجئے میں چلا جاتا ہوں" سانڈ نے جواب میں کہا "نہیں بھائی تمہیں جانے آنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے سارے گھر والوں کو لے آؤ اور بخوشی میرے سینگ پر رہو بسو اس سے میرا کیا بگڑتا ہے"؛

دنیا کے رنج و غم کی حالت اس چھوٹے سے مچھر کی سی ہے جو ہمیں صرف اسی وقت تک ستا سکتا ہے جب تک خود ہم میں کمزوری ہے۔ اگر ہم میں طاقت ہے تو ہم اس کہانی کے سانڈ کی طرح بے خوف ہو کر تمام رنج والم کو چیلنج دے سکتے ہیں۔ بہادری اور دلیری اسی میں ہے کہ آدمی نڈر ہو کر ماں کی ذات میں پورا اعتقاد رکھے۔ اس کے اس اعتقاد میں کسی درجہ سے بھی فرق نہ آنے پائے؛

ماتا کہتی ہے :-

"میں ہی زندگی ہوں۔ میں ہی موت ہوں"۔ یہ زندگی اور یہ موت دونوں ماتا ہی کے تو سائے ہیں۔ سکھ اور دکھ اس کے وجود سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام قسم کی راحتیں اسی کی ذات کا جلوہ ہیں۔ یہ جتنی مصیبتیں ہیں سب سے اسی کی ہستی نمایاں ہو رہی ہے۔ زندگی بھی ماتا ہے اور موت بھی ماتا ہے۔ جنت بھی وہی ہے اور دوزخ بھی وہی۔ اس کی حقیقت کو وہی جان سکتا ہے جو اس کی ہستی میں محو ہو جائے۔ ڈوب جائے۔ اگر ہم ماتا کو نہیں پہچان پاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں خود میں یقین واعتماد نہیں۔ ہم صبر وتحمل سے کام نہیں لیتے۔ ہم دلیری اور ہمت سے کوسوں دور ہیں۔ ہم ایک راہ چلتے انسان پر تو یقین کر لیتے ہیں لیکن اس ہستی پر یقین نہیں لاتے جس کی ذات سے یہ تمام عالم کائنات قائم ہے ہم خدا کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جبتک ہمارا کام ہماری مرضی کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ جب تک ہماری خواہشات پوری ہوتی رہتی ہیں اس وقت تک تو ہم یہ ماننے کے لئے تیار رہتے ہیں کہ کوئی ہستی ایسی ضرور ہوگی جو نظام عالم کو چلا رہی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے۔ جب ہمیں چوٹ پر چوٹ لگتی ہے۔ صدمے پر صدمہ پہونچتا ہے اس وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی کمی ہے۔ کوئی خامی ہے۔ ہماری دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے۔ ہماری انسانیت کا سانپ جو ہر وقت پھن اٹھائے رہتا ہے۔ ان کانٹوں سے (یعنی ہماری مصیبتوں سے) زخمی ہو جاتا ہے اور خدا کا

وہ دلفریب تصوّر مٹ جاتاہے جس کے مطابق ہم اس کو ایسا حکمرانِ عالم سمجھتے ہیں جو کہیں دُور رہ کر دن رات ہماری خواہشات کے پُورا کرنے میں لگا رہتا ہے جسے بس ہمارے عیش و آرام کا سامان ہی مہیا کرنا ہے۔ جیوں جیوں ہماری انانیت مٹتی جاتی ہے ہم خدا کے نزدیک پہونچتے جاتے ہیں اور آخر کار ہماری رسائی خود حواگی کی منزل تک ہو جاتی ہے جہاں ہم ماتا کے چرنوں میں سر جھکا کر اپنا سب کچھ اُس کو سپرد کر دیتے ہیں اور اس کی رضا کو اپنی رضا بنا لیتے ہیں اس کے بعد ہر قسم کے اضداد مٹ جاتے ہیں۔ سُکھ دُکھ کا امتیاز کالعدم ہو جاتا ہے۔ دونوں ایک اسی ماتا کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں۔ اگر مصیبت آتی ہے تو آئے ہم اُسے خوش آمدید کہیں گے اور اگر راحت میسّر آئے گی تو اس کا بھی خیر مقدم کریں گے۔ بھگتی (عشقِ الٰہی) کی اس منزل میں پہونچ کر زندگی کے سب پیچ و خم نکل جاتے ہیں سب تفرقات مٹ جاتے ہیں۔ اُسوقت برہمن۔ اچھوت اور کتے ایسے جانور سب میں ماتا کا جلوہ نظر آتا ہے پھر نہ کوئی چھوٹا رہتا ہے نہ بڑا۔ ہم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ جب تک ہم سارے عالم کائنات کو یکساں نظر سے دیکھ کر اُس کے ساتھ محبت نہیں کریں گے۔ جب تک ہماری محبت کا یہ جذبہ بے غرضانہ اور غیر فانی نہ ہوگا ہم بار بار گمراہی کا شکار ہوتے رہیں گے لیکن بے غرضانہ محبت کی اس منزل پر پہونچنے سے ہر چیز کی جزوی اور انفرادی ہستی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گی اور ہم کو ہر چیز میں صرف اُسی لامحدود اور لافانی ماتا ہی کا جلوہ نظر آنے لگے گا[1]

---

[1] سوامی جی نے انہیں خیالات کا اظہار اپنی نظم "کالی ماتا" میں کیا ہے۔ اس کا آزاد ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ (ایڈیٹر)

نکل کر آسمان کے سب ستارے
اندھیری رات کی بے رحم ڈائن
فلک پر دندناتی پھر رہی ہے،

ہوا بپھری ہوئی ہے چیختی ہے،
اچانک توڑ کر زنداں کو جیسے
نکل آئی ہوں دیوانوں کی روحیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲

یہ روحیں ڈال کر باہوں میں باہیں
کبھی جو بے تحاشہ ناچتی ھیں،
بگولے بن کے آندھی گھومتی ہے

سمندر طیش میں آکر کچھ ایسے
اُٹھاکر اپنی لہروں کی چٹانیں،
زمین و آسماں پر پھینکتا ہے،
بپا ہر سمت ہوتی ہے قیامت

بھیانک دیو صورت کالے بادل
مئے پندار سے بد مست ہو کر
پکڑ کر ہاتھ سب اک دُوسرے کا
فضائے زندگی پر چھا رہے ہیں

کڑکتی بجلیوں کی روشنی میں
نظر آتے ہیں لاکھوں دُوت یم کے
مجسّم خوف و ہیبت کالے کالے
خوشی سے ناچتے اور دن دناتے
دبائیں ہر طرف پھیلا رہے ہیں
اجل کے گھاٹ اُترتے جا رہے ہیں
یہ انسان جیسے ہوں حشراتِ ارضی
جدھر دیکھو اُدھر برپا قیامت
کہیں آنسو، کہیں نالے، کہیں غم

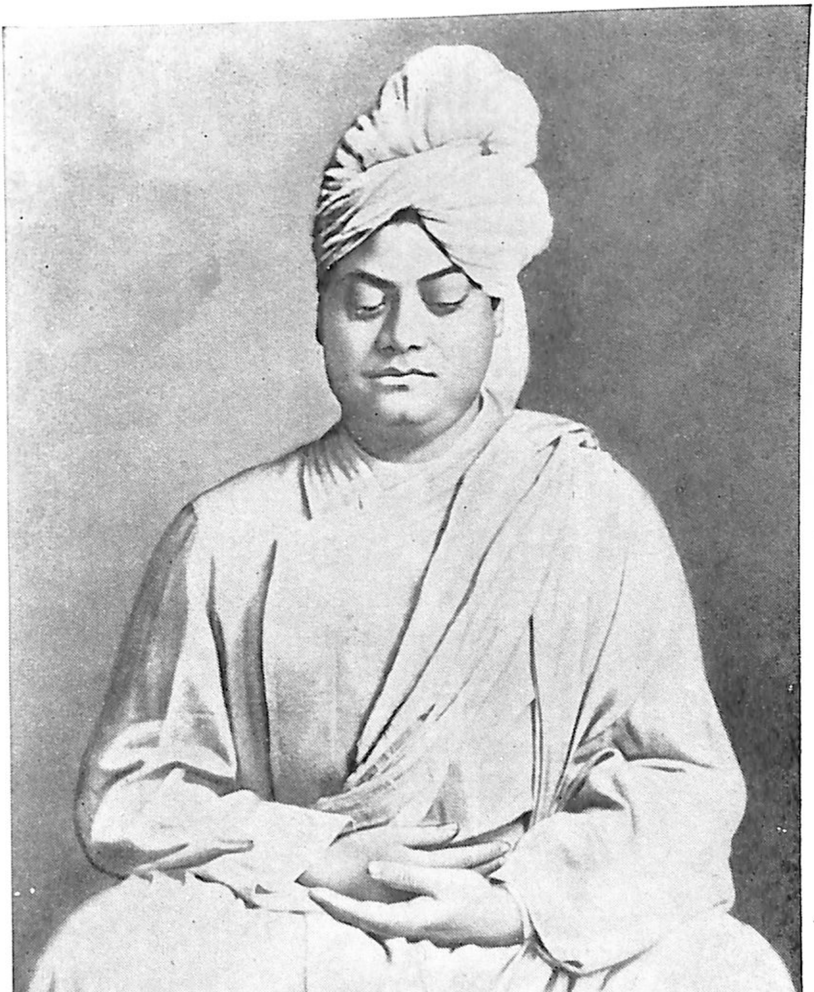
تو ہی ماں ہے تو ہی دیوی ہے - آجا
ترے ہی نام سے پیدا ہے ہیبت
ترے ہی دم سے قائم یم کی ہستی
اگر چاہے تو اک ٹھوکر سے تیری

جہانِ رنگ و بو ہو جائے برہم
زماں تجھ سے مکاں تجھ سے ہے آجا
یہ تخریبِ جہاں تجھ سے ہے آجا

فقط وہ آئے گا تیرے مقابل
ترے جلوے کی لائے گا وہی تاب
خوشی سے جو اجل کا جام پی کر
شریکِ رقصِ تخریب و فنا ہو

میں تیرے حسن کا بھی ہوں پجاری
تری ہیبت سے بھی ہے پیار مجھ کو
میں رنگ و بو کا دل دادہ ہوں لیکن
نہیں برقِ فنا کا خوف مجھ کو
مجھے ہے نور پاروں سے محبت
اندھیروں سے نہیں لیکن گریزاں
تو آ جس رنگ میں ہو تیری مرضی
مجھے ہر رنگ منظور ہے تیرا

تو ہی ماں ہے تو ہی دیوی ہے آجا
ترے درشن کو ہوں بے تاب اب میں
لبوں پر آ گئی ہے اب جان میری
تو ہی ماں ہے تو ہی دیوی ہے آجا



راج یوگ[1]

دُنیا کی دُوسری سائینسوں کی طرح راج یوگ بھی ایک معتبر سائینس ہے فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں دُوسری سائینیں مادّی مشاہدات پر مبنی ہیں راج یوگ مافوق الشعوری عالم کے واقعات کی تشریح اور ترتیب کرتا ہے۔ اور اس طور پر یہ علم ہمیں روحانی عالم تک جانے کا راستہ دکھاتا ہے یا یوں کہیئے کہ یہ ہماری زندگی کی بنیادی سائینس ہے دُنیا کے ہر اوتار پیغمبر اور رُوحانی معلّم نے خدا کے متعلق یہی دعویٰ کیا ہے کہ "میں نے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' میں خدا کو واقعی جانتا ہوں" مثلاً حضرت یسوع مسیح اور سینٹ پیٹر نے بھی تو اسی بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ جن حقیقتوں کا درس دیتے تھے اُن کا واقعی مشاہدہ کرتے تھے۔

یہ مشاہدہ یوگ سے حاصل ہوتا ہے زندگی کا احساس یادداشت اور شعور پر ہی محدود نہیں۔ اِن حدود سے پرے مافوق الشعور کا جہان آباد ہے' جہاں شعور اور ادراک دم نہیں مار سکتے، مافوق الشعور اور تحت الشعور بظاہر یکساں نظر آتے ہیں کہنے کو تو دونوں حالتیں بے حس ہوتی ہیں لیکن ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے وہی فرق جو جہالت اور علم میں ہوتا ہے' راج یوگ ہمیں مافوق الشعور کا پتا دیتا ہے لیکن اس کی بنیاد عقل اور شعور پر ہے' بحیثیت سائینس کے اس علم کا اکتساب دماغی طاقت اور عقلی کاوشوں سے ہوتا ہے' آخر یکسوئی دماغ ہی تو تمام علم و ادراک کا ماخذ ہے'

---

[1] سوامی جی نے اپنی امریکن شاگرد مسز سارا، سی، بُل Mrs. Sara C. Bull. کے مکان پر ایک مخصوص جماعت کو راج یوگ پر کچھ سبق دئے، ہماری خوش قسمتی سے ان سبقوں کے نوٹ محفوظ رکھ لئے گئے ۱۹۱۳ء میں ان کو چھپوا کر خاص الخاص لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا انہیں پیش کرتے وقت بقدرِ ضرورت پھیلا دیا گیا ہے' (ایڈیٹر)

اور یوگ ہمیں یکسوئی دماغ سکھاتا ہے یہ اور بات ہے کہ آخر کار یہ عقل وشعور کی حدود سے پرے نکل جاتا ہے، کون ہے جو مادہ کو اپنا غلام نہیں بنانا چاہتا، تعلیم اور تربیت کا مقصد یہی ہے۔ سائینس کی تمام کوششیں اسی مقصد کو حاصل کرنے کی طرف مرکوز ہیں۔ مادہ کو ہمارا غلام ہونا ہی چاہیئے یوگ ہمیں قدرت پر قابو پانے کا راستہ دکھاتا ہے یوگ کے لفظی معنی ہی ہیں "قابو پانا" "جوڑنا" یا "متصل کرنا" یوگ روحِ انسان کو روحِ اعظم یعنی خدا سے واصل کرتا ہے،

یوگ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا شعور ہماری فطرت کے لامنتہا سلسلے کی ایک کڑی ہے، ہمارا دماغ تو بس ہمارے شعور سے ہی محرک ہوتا ہے اور اسی کے اشارے پر کام کرتا ہے، یوگ دماغ کی حدود سے گزر کر شعور کی وسعتوں میں جانے کا علم ہے، اسی علم کی بدولت بالآخر ہم اپنی حقیقت کو پاتے ہیں جو مافوق الشعور ہے،

شعور کی تین سطحیں ہیں ان میں سے دو سے ہم کسی قدر واقف ہیں۔ تحت الشعور یا غیر شعوری سطح اور دماغی ادراک اور احساس کی سطح ہمارے احساسِ خودی کی ترکیب میں زیادہ حصّہ تحت الشعور کا ہے اور بہت کم دماغی ادراک کا، لیکن شعور کی تیسری سطح جس سے ہم عام طور پر کلیتاً ناواقف ہوتے ہیں دماغی ادراک سے بہت بلند ہے اور یہ ہماری لاعلمی کا ثبوت ہے کہ ہم نے اس سطح کو جہاں شعور اپنے کمال کو پہونچتا ہے مافوق الشعور کا نام دے رکھا ہے،

یوگ ہمیں اس مقام پر پہنچنے کی راہ دکھاتا ہے، مسلسل اور مخلصانہ عمل سے لاعلمی اور جہالت کے پردے یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں، اور ہمارے شعور کے نئے نئے رُخ آشکار ہوتے جاتے ہیں ہمارے تہ بستہ دماغ کی تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئی زندگی کے نئے واقعات اور نئی حقیقتوں کا انکشاف ہو رہا ہے ہمارے سامنے نئے نئے عالم تخلیق ہوتے نظر آتے ہیں، یہی نہیں بلکہ نئی نئی قوتیں ہمارے ہاتھ آجاتی ہیں،

یوگ کے عمل میں اگر خطرہ ہے تو یہی ہے کہ مافوق الفطرت قوتوں کو حاصل کر کے انسان اسی مقام پر رُک جاتا ہے، ہمیں راہ میں رُکنا نہیں چاہیئے یہ قوتیں چمکتے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کے برابر ہیں، اہلِ بصیرت کی آنکھوں میں ان کی کیا چکا چوند پیدا ہوگی؟ یوگ کے اس مقام سے آگے تو روحانیت کے لعل وجواہر کی کان ہے ہمیں تو مقاماتِ راہ سے آگے نکلنا ہے، ہماری منزل تو خود خدا ہے، خدا ہی زندگی ہے، خدا کو نہ پانا ہی ہماری موت ہے۔

راج یوگ کے عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔ اول اس دنیا اور عقبےٰ میں عیش وطرب اور تکمیلِ لذات کے تمام خیالات کو ترک کر دو اور صرف خدا ہی سے دل لگاؤ، وہی واحد حقیقت ہے ہم دنیا میں معرفتِ حق کے لئے آئے ہیں تو نہیں پانے کے لئے نہیں آئے۔ لذتیں حیوانوں کے لئے چھوڑ دو جسمانی لذات سے جس قدر وہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں ہم اور آپ کبھی نہیں ہو سکتے۔ انسان کا وجود معنوی غور وفکر کے لئے بنا ہے

اور اسے اس وقت تک جد و جہد کرنا چاہیئے جب تک کہ وہ موت کو مسخر نہ کرلے۔ انسان کی نظر حق و صداقت کی روشنی کو دیکھنے کے لئے بنی ہے، جسمانی احساسات کے اندھیرے سے نکلنا ہی ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ ہمیں اپنی سب کوششیں اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مخصوص کر دینا چاہیئے باقی سب باتیں فضول ہیں جاہ و مرتبہ بے معنی ہے۔ سماج یا رائے عامہ کی پرستش بُت پرستی ہے، لگن لگاؤ تو بس بھگوان سے آخر جسمانی لذات اور دنیاوی خواہشات کی حقیقت ہی کیا ہے، رُوح کے کوئی جنس نہیں ہوتی، روح کسی خاص مقام یا وقت سے مخصوص نہیں ہے، اس کا کوئی ملک نہیں، کوئی قوم نہیں، وہ زمان و مکان سے بالا ہے،

ترکِ خواہشات بجائے خود کافی نہیں، یوگ کے عمل کے لئے دُوسری ضروری بات یہ ہے کہ اپنے دل میں معرفتِ حق اور معرفتِ رب کی بے پناہ آرزو پیدا کرو خدا کو پانے کے لئے بے تاب و بے قرار ہو جاؤ ٹھیک اسی طرح جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی سانس لینے کے لئے بے تاب ہوتا ہے، صرف بھگوان کی چاہت کرو، کسی دُوسری چیز پر نہ جاؤ باقی سب چھلاوہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ دھوکا کھا جاؤ ہر طرف سے مُنہ موڑلو اور صرف خدا ہی کی تلاش کرو۔

اس تلاش کی تکمیل کے لئے تیسری ضروری چیز ہے ریاضت۔ ریاضتیں چھ ہیں (۱) ضبطِ دماغ۔ من کو اِدھر اُدھر جانے سے روکنا (2) ضبطِ حس۔ حواس کو آوارہ بھٹکنے سے روکنا (3) دماغ (من) کو لطون کی جانب مائل کرنا (۴) بغیر شکوہ و شکایت کے زندگی کے ہر واقعہ کو قبول کرنا (5) دماغ کو ایک ہی خیال پر مرکوز کرنا، یہاں تک کہ وقت کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ (6) اپنی اصلی فطرت اپنی رُوحانی حقیقت پر بار بار اور مسلسل غور کرنا۔

دُوسرے الفاظ میں ریاضت کے معنی یہ ہوئے کہ اپنے دماغ اور حواس کو یکسو کر کے اپنی داخلی حقیقت پر مرکوز کر دو، جسمانی انفرادیت کے وہم سے چھٹکارا پاؤ، اپنی کمتری اور فرومایگی کے خیال کے طلسم کو توڑ دو، دن رات ہر وقت اور ہر گھڑی، اپنے آپ سے کہو کہ تم واقعی کیا ہو، تمہاری اصل کیا ہے، یہاں تک کہ تم محسوس کرلو کہ تم خدا سے واصل ہو گئے ہو، اس ضبط و نظم کی پابندی کے بغیر کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں الوہیت یا مجرد حق کا شعور ہو سکتا ہے لیکن ہم اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ جونہی ہم اپنے تجربے کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم اُسے محدود کر دیتے ہیں اور جو چیز بیان میں آتی ہے وہ الوہیت یا مجرد حق نہیں ہوتی۔

ہمیں محسوسات کی حدوں سے پرے جانا ہے اور ادراک کی حدوں کو بھی عبور کرنا ہے اور ہم میں ایسا کرنے کی طاقت ہے۔

پہلا سبق

اس سبق کا مقصد انسان کی انفرادیت۔ اس کے احساسِ خودی کو اُبھارنا ہے۔ انفرادیت کی نشو و نما لازمی ہے، بالآخر سب مرکزِ حیات تک پہنچ جاتے ہیں جہاں یکسانیت اور وحدت ہی کا احساس ہوتا ہے لیکن وحدت الوجود کے اس مقام تک پہنچنے کے لئے انسان کی خودی کو تقویت دینا ضروری ہے۔

تکمیلِ خودی تخیل مدد سے ہوتی ہے، کہتے ہیں "تخیل الہام کشف اور ادراک کی بنیاد ہے" یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ تمام پیغمبر، شاعر اور موجد زبردست قوتِ متخیلہ کے مالک ہو گذرے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام فطرت کا راز خود ہمارے اندر موجود ہے، ہم ہی قدرت کے راز داں ہیں، ہماری ہستی ہی سے فطرت کی وضاحت ہوتی ہے لیکن اس وضاحت کا بیان ہماری قوتِ متخیلہ کرتی ہے، قدرت کے راز کو ہمارا تخیل ہی آشکار کرتا ہے، مثلاً درخت سے سیب گرنے کا عمل یا اُوپر پھینکے ہوئے پتھر کے زمین پر واپس آنے کا عمل خارجی دنیا میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن اس کے سبب کا علم یعنی اصولِ کشش خود ہمارے اندر ہے، خارجی واقعات سے محرک ہو کر ہماری قوتِ متخیلہ اُسے دریافت کر لیتی ہے۔

یہ بے بہا قوت ضبط اور اعتدال سے حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے والا یا فاقے کرنے والا، یوگی نہیں ہو سکتا اسی طرح زیادہ سونے والا یا نیند نہ کرنے والا بھی یوگ حاصل نہیں کر سکتا جسمانی سطح سے اوپر دماغی سطح پر بھی ضبط کی ضرورت ہے۔ لاعلمی، تلون، حسد، کاہلی، غیر معتدل وابستگی یوگ کے عمل میں سدِ راہ ثابت ہوتے ہیں، سچا یوگی انہیں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔

یوگی کے لئے تین ضروری چیزیں یہ ہیں۔ اول جسمانی اور ذہنی پاکیزگی، دوئم، صبر و تحمل۔ سوئم۔ استقلال اور ثابت قدمی، یوگ کے طالب کو جسم اور ذہن کو اور پستی کی طرف لے جانے والی ہر ناپاکی اور گندگی سے دُور رہنا چاہیئے، دُوسرے اُسے عمل پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے۔ یوگ کوئی آسان کام نہیں، ممکن ہے شروع شروع میں حیرت انگیز واقعات اور مظاہرے پیش آئیں لیکن یہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہتے، وہ زمانہ جب یوگ کرنے والے کو رُوحانی ترقی کا کوئی ظاہری ثبوت یا نشان نہیں ملتا بڑا مشکل زمانہ ہوتا ہے بسا اوقات مایوسی اور نا امیدی چھا جاتی ہے لیکن عامل کو صبر ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ انجام کار اُسے یقیناً اپنا مقصد حاصل ہو گا، ثابت قدمی اپنا انعام ضرور لاتی ہے، ہر حالت میں ریاضت جاری رہنی چاہیئے، صحت ٹھیک ہو نہ مشق اور ریاضت کا ناغہ ایک دن بھی نہیں ہونا چاہیئے:

مشق یا ریاضت کا بہترین وقت وہ ہے جب دن اور رات ملتے ہیں ہمارے جسموں کے مدوجزر میں یہ سب سے زیادہ پُرسکون وقت ہے اس وقت جسموں میں پورا توازن ہوتا ہے، یوں سمجھیئے کہ یہ وقت جسمانی اُتار چڑھاؤ کا نقطۂ صفر ہے لیکن اگر مشق یا ریاضت اس وقت پر ممکن نہ ہو تو پھر صبح اُٹھنے کے بعد اور شام کو سوتے وقت کر لینا چاہیئے ؛

مشق یا ریاضت کے لئے ذاتی صفائی نہایت ضروری ہے۔ روزانہ اشنان یا غسل کرنا لازمی ہے ریاضت کا طریقہ یہ ہے :-

غسل کے بعد مشق کے لئے جم کر بیٹھ جائیے، اور دل میں خیال کیجئے کہ آپ چٹان کی طرح اپنی جگہ مضبوط ہیں اور کوئی چیز آپ کو ہلا نہیں سکتی، سر، بازوؤں اور کمر کو ایک سیدھ میں رکھیئے لیکن خیال رہے کہ ریڑھ کی ہڈی پر کسی قسم کا کوئی زور نہ پڑے یوگ کا تمام عمل اِسی ریڑھ کی ہڈی کے راستے ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اِس عمل میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہ آئے۔ اس طرح اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد دل میں خیال کیجئے کہ سر سے پاؤں تک آپ کے جسم کا ہر عضو کامل اور درست ہے۔ اس خیال کی شِدّت یہاں تک ہو کہ آپ کے جسمانی کمال کی تصویر آپ کے دماغ پر چھا جائے، اگر ضرورت ہو تو پاؤں کی اُنگلیوں سے لے کر سر تک ایک ایک عضو کو چھو کر اُس کے کامل ہونے کا خیال کیجئے۔ جسم کے کسی بھی حصّے میں کمی کا خیال تک نہ آنے پائے اس طرح پاؤں سے سر تک ہر ایک ہر عضو کو مکمل سمجھیئے اور پھر اس خیال سے گذر کر تمام جسم کے مکمل ہونے کے خیال کو اپنایئے، خیال کیجئے کہ یہ جسم خدا کا عطا کیا ہوا ایک مکمل آلہ ہے جس کی مدد سے آپ کو حقیقت تک پہونچنا ہے۔ یا یوں سمجھیئے کہ یہ جسم ایک جہاز ہے جس میں آپ کو سنسار کا سمندر پار کرنا ہے اور ابدی اور سرمدی حقیقت کے ساحل تک پہنچنا ہے۔

اب ناک کے دونوں نتھنوں سے ایک لمبا سانس لیجئے پھر اُسے باہر پھینک کر اس وقت تک دم سادھے رہیئے جب تک آپ آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں اس طرح چار بار سانس لیجئے اور چھوڑیئے، اس کے بعد معمول کی طرح طبعی انداز سے سانس لینے لگیئے اور خدا سے انوار و تجلیات کی اس طرح دُعا مانگیئے (پرماتما سے پرکاش کی پرارتھنا کیجئے) ؛

"میں اس درخشاں وجود کی عظمت اور شان کا دھیان کرتا ہوں جو اس کائنات کا خالق ہے، میری دُعا ہے کہ وہ میری فکر کو جلا بخشے "

اسی خیال میں ڈوب کر دس پندرہ منٹ تک دھیان لگایئے۔

اپنے تجربات اپنے گرو (مرشد) کے سوا کسی سے نہ کہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو خاموش رہیئے ضرورت کے بغیر بات نہ کیجئے۔ اپنے خیالات نیکی اور بھلائی پر مرکوز رکھیے، یاد رکھیئے کہ جیسے ہمارے خیالات ہوتے ہیں، آخر ہم ویسے ہی

بن جاتے ہیں پاک اور مقدس خیالات تمام ذہنی ناپاکیوں کو جلا دیتے ہیں پاکیزگی اور تقدس پر دھیان لگائے رکھنے سے تمام ناپاکیاں مٹ جاتی ہیں۔ یوگ صدق وصفا حاصل کرنے کا عمل ہے۔ نقط یوگی ہی سچے معنوں میں پاک ہوتا ہے، دوسرے لوگ تو دُنیا کی آلودگیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، صرف یوگی ہی آزاد ہے باقی سب لوگ تو دنیا کے غلام ہیں، غلامی کی زنجیر کی ہر کڑی کو یکے بعد دیگرے توڑ کر ہی ہم اپنے خدا کے نزدیک آسکتے ہیں اور یقین مانو کہ ہم سب میں اس حقیقتِ ازلی تک پہنچنے کی اہلیت اور طاقت ہے۔ اگر خدا کی کوئی حقیقت ہے تو ہمیں اس کے وجود کو یوں محسوس کرنا چاہیئے جیسے ہم اپنے گرد و نواح کے واقعات کا ادراک کرتے' اگر رُوح کا کوئی وُجود ہے تو ہمیں اس قابل ہونا چاہیئے کہ ہم اُسے دیکھیں یا محسوس کریں اور سچ تو یہ ہے کہ رُوح کو پانے کا فقط ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے جسم کے خیال سے اوپر اُٹھ جائیں اور یوں سمجھنے لگیں کہ ہم رُوح ہی روح ہیں جسم ہیں ہی نہیں ہ

یوگ کے مطابق ہمارے اعضا کو دو مخصوص درجوں میں منقسم کیا جاتا ہے' داخلی یا ادراک اور احساس کے اعضا اور خارجی یا حرکت کے اعضا[1]۔ اول الذکر گیان یا علم کے اعضا ہیں اور دوسرے عمل کے' باطنی اعضا کو مجموعی طور پر "منس" یا "من"[2] کہتے ہیں اس کے چار پہلو ہیں (۱) "منس" یا من یعنی ذہن' غور وفکر کی طاقت' عام طور پر ہم اس طاقت کو استعمال کرنا نہیں جانتے' ہمیں اس پر قابو نہیں ہوتا اور یہ طاقت بے لگام ہو کر بے مدعا بھٹکتی رہتی ہے اور اس طرح ضائع ہو جاتی ہے۔ (۲) بدھی[3] (عقل و دانش) بدھی ہماری قوتِ ارادی ہے (۳) اہنکار[4] (احساسِ شعورِ ہستی) یہ ہے خودی کے شعور میں ڈوبی ہوئی "انا" (یا "میں" کا اٹوٹ احساس) (۴) چت[5] (شعور و احساس کی بنیادی طاقت) یہی وہ چیز ہے جس میں باقی تینوں طاقتیں بسی ہیں اسی سے ان تینوں کی تشکیل ہوتی ہے اور اسی کے طفیل یہ تینوں طاقتیں یا صلاحیتیں اپنا اپنا کام کرتی ہیں' یوں سمجھیئے کہ چت ہستی کی عمارت کا فرش ہے' جس پر باقی سب طاقتوں کی دیواریں کھڑی ہیں' یا یہ کہ چت ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بے کنار سمندر ہے اور ہماری تمام صلاحیتیں اس سمندر کی سطح پر لہروں کی صورت میں موجزن ہیں۔

یوگ ہمیں چت پر قابو پانا سکھاتا ہے یہ وہ سائنس ہے جس کی مدد سے ہم چت کو مختلف صورتوں میں منقلب ہونے سے روک سکتے ہیں۔ یوگ کے علم اور عمل سے ہم چت کو مختلف قوتوں اور صلاحیتوں کا روپ دھارن

---

[1] Organs of sense and organs of motion. [2] Manas.

[3] Buddhi (Intellect or will) [4] Ahamkara.

[5] Chita.

کرنے سے باز رکھ سکتے ہیں جس طرح چاند کا عکس سمندر کی سطح پر موجوں یا لہروں کی وجہ سے قائم نہیں رہ سکتا اُسی طرح آتما (روح) یا ہماری سچی خودی کا عکس ہماری دماغی لہروں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر سمندر پوری طرح ساکن ہو جائے تو اُس کی سطح آئینہ صورت چاند کے عکس کو اپنا لے گی اسی طرح اگر چت کو قابو میں لا کر بالکل ساکن کر لیا جائے تو ہماری خودی اس آئینے میں اپنی پوری آب و تاب سے نمایاں ہو جاتی ہے اور ہم اپنے آپ کو پہچان لیتے ہیں۔

ہمارا من محض جسم نہیں ہے، اس کی اصل مادہ ضرور ہے لیکن یہ مادہ کی بہت لطیف صورت ہے۔ یہ من جسم سے دائمی طور پر وابستہ نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ کبھی کبھی خود ہمارے تجربے میں آتا ہے کہ ہمیں من کا وجود جسم کے تعلق سے بالا محسوس ہوتا ہے ایسی حالت میں من اور جسم کے بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، یوگ کی مدد سے ہم اپنی مرضی کے مطابق من کو جسم سے علیحدہ کر سکتے ہیں اپنے حواس پر پورا قابو پا کر ہم اپنے من کی طاقت کو ہاتھ میں لا سکتے ہیں اور اگر اس طرح ہم اپنے من کو پوری طرح اپنے اختیار میں لے آئیں تو تمام کائنات ہمارے اختیار میں آ جائے گی تمام دنیا ہماری مطیع ہو جائے گی۔ آخر یہ عالمِ کائنات ہمارے حواس ہی کی حدِ ادراک تو ہے، جو کچھ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اسی کا نام تو ہم نے دنیا رکھا ہے۔ اس لئے اگر حواس پوری طرح ہمارے قابو میں آ جائیں تو ہمیں دنیا پر بھی پورا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ حواس سے آزاد ہونا ہی خُدا یعنی وجودِ اعلیٰ کی امتیازی خصوصیت ہے جو قادرِ مطلق بھی ہے اور آزادِ مطلق بھی، روحانی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم حواس کے بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتے ہیں، جب تک حواس ہم پر مسلط ہیں ہم غلام ہیں۔ دُنیا داری حواس کی غلامی ہی کا تو نام ہے:

> اگر ہم اپنے من کے سمندر کو موجزن ہونے سے روک لیں اگر ہم اس من کو بالکل ساکن کر لیں تو اجسام یعنی جنم مرن کا یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا نہ جانے کتنے لاکھوں برسوں سے ہم اپنے لئے ایک کے بعد دوسرا جسم تخلیق کرتے آ رہے ہیں، اس جد و جہد میں ہم بھول گئے ہیں کہ جسم اختیار کرنے کی اصل غایت کیا ہے۔ ہمارا مقصدِ حیات تو ہے اپنے کمال کو حاصل کرنا لیکن ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ نئے نئے جسم اختیار کرنا (یعنی بار بار جنم لینا) ہی اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصد ہے۔ اس خود فریبی ہی کو مایا کہتے ہیں ہمیں اس طلسم کو توڑنا ہے ہمیں اپنے اصل مقصد کی طرف اپنے مرکز کی طرف لوٹنا ہے اور اس بات کا یقیناً احساس و شعور کرنا ہے کہ ہماری اصل یہ جسم نہیں۔ یہ تو ہمارا دست بستہ غلام ہے، یوگ ہمیں یہی تو سکھاتا ہے کہ اپنے من کو اس جسم کی قید سے آزاد کرو، اسے جسم سے جدا کر کے، اپنے اصلی وجود کا احساس کرو پھر دیکھو کہ زندگی کس رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہماری بھول تو یہی ہے کہ ہم زیست کی حرکت اور احساس کو جسم سے منسوب کر لیتے ہیں اور پھر سمجھنے لگتے ہیں کہ جسم زندہ ہے اور اس کا اپنا وجود ہے ہم نے جسم کے لباس کو اتنے یگوں سے اختیار کر رکھا ہے کہ ہم بار بار بھول جاتے ہیں کہ ہم جسم کے مترادف نہیں ہیں، یوگ

ہی وہ طریقۂ عمل ہے جس کی مدد سے ہم جب چاہیں اپنے آپ کو جسم سے علیحدہ کر سکتے ہیں اور اس بات کو ذہن نشین کر سکتے ہیں کہ جسم ہمارا غلام ہے، یا یوں کہیئے کہ یہ ہمارے ہاتھ میں ایک آلۂ کار ہے، جسم کے ہم مالک ہیں۔ جسم ہمارا آقا نہیں، یوگ کے عمل کا اول مقصد ہی من کی طاقتوں پر اختیار پانا ہے جب ہمیں من پر پوری قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو یوگ ہمیں اس طاقت کو خاص خاص مقصد پر پوری طرح مرکوز کرنے کا طریقہ بتاتا ہے جس سے ہم کسی بھی مقصد کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں[1]۔ لیکن یاد رہے کہ یوگ میں کمال سالہا سال بلکہ جنم جنم کی لگاتار مشق اور محنت سے حاصل ہوتا ہے، یہاں تو بات کرنے سے بھی مَن کی طاقت مُنتشر ہو جاتی ہے، زیادہ باتیں کرنے والا شخص کبھی یوگی نہیں بن سکتا۔ کامیابی کا راز خاموشی اور مسلسل عمل میں مُضمر ہے۔

---

[1] سوامی جی کا اشارہ یوگ کی اُن قوتوں کی طرف معلوم ہوتا ہے، جن کا ذکر انہوں نے اپنے مکمل مضمون "راج یوگ" میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مختصراً صورتِ حال یہ ہے کہ جیسا "دھرنا" (Dharna.) - من کو کسی خاص چیز یا موضوع پر یکسو کرنا)" "دھیان" (Dhvana. - یکسوئی کے موضوع میں غرق ہو جانا) اور سمادھی (Samadhi.) (دھیان یا استغراق کا کلیتاً داخلی اور معنوی ہو جانا) کی حالتیں ایک ہی موضوع سے متعلق ہو کر یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی ہیں اور پھر آپس میں مدغم ہو جاتی ہیں تو اُس حالت میں دُنیا کی تمام طاقتیں یوگی کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ اُسی حالت کو "سمایام" (Samyama.) کہتے ہیں۔ یوگی جس چیز پر سمایام کرتا ہے وہ اُس کی غلام ہو جاتی ہے، مثلاً وقت پر سمایام کرنے سے گذشتہ اور آیندہ کا سب حال معلوم ہو جاتا ہے، الفاظ اور اُن کے معنی پر سمایام کرنے سے جانوروں کی بولیاں سمجھ میں آجاتی ہیں، خود اپنے تحت الشعور پر سمایام کرنے سے پچھلے جنموں کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں کسی دُوسرے آدمی کے جسم کے مخصوص نشانوں پر سمایام کرنے سے اُس کے من کی نوعیت سے آگہی ہو جاتی ہے اور اس کے من پر سمایام کر کے اس کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں اپنے جسم کی صورت پر سمایام کرنے سے یوگی اپنے آپ کو غائب کر سکتا ہے، اپنے کرموں پر سمایام کر کے یوگی اپنی موت کے وقت سے واقف ہو جاتا ہے، ہاتھی یا شیر پر سمایام کر کے یوگی ان کی طاقت کو اپنے جسم میں پیدا کر لیتا ہے، حلق پر سمایام کرنے سے بھوک مٹ جاتی ہے، چاند پر سمایام کرنے سے آفاق کا علم اور سُورج پر سمایام کرنے سے تمام کائنات کا علم حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح مختلف چیزوں پر سمایام کرنے سے یوگی پانی پر چل سکتا ہے، آگ میں کود سکتا ہے۔ جب چاہے اپنا جسم چھوڑ سکتا ہے، دُوسروں کے من کی باتیں جان سکتا ہے، یہاں تک دُوسروں کے جسم میں داخل ہو سکتا ہے، تمام عناصر پر غالب آسکتا ہے، چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے، تمام عُلوم حاصل کر سکتا ہے لیکن یاد رہے کہ ان تمام طاقتوں کو ترک کر کے ہی عرفان کا مقام آتا ہے ؂

دوسرا سبق

راج یوگ کو ہشت جہتی[1] یا ہشت قدم یوگ کہتے ہیں اس کے عمل کے لئے آٹھ باتیں ضروری ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) "یما"[2] یا تہذیبِ نفس، اسی پر یوگ کی بنیاد ہے، یوگ کے طالب کی تمام زندگی اسی کے تحت بسر ہونی چاہیئے طریقۂ عمل کے پانچ حصّے ہیں یعنی تہذیبِ نفس کے لئے پانچ ہدایتوں پر عمل ضروری ہے :

(ا) کسی کو خیال یا بول یا عمل سے نقصان نہ پہنچانا :

(ب) خیال، بول یا عمل سے کسی بھی شے پر حریصانہ نظر نہ رکھنا۔

(پ) خیال، بول اور عمل میں پُوری پاکیزگی :

(ت) خیال، بول اور عمل میں پُوری صداقت :

(ٹ) کسی سے کچھ نہ لینا تحائف وغیرہ قبول نہ کرنا اور ہر طرح سے بالکل بے نیاز ہو کر رہنا[3] :

(۲) "نیم"[4] (تحفظِ اصُول وضوابط) اس میں جسم کی دیکھ بھال، صحت و توانائی کا خیال، روزانہ اشنان، خوراک کی پاکیزگی و اعتدال وغیرہ شامل ہیں :

(۳) "آسن"[5] (ریاضت) اس سے مُراد نشست کا طریقہ ہے، کمر، مونڈھے اور سر کو ہمیشہ ایک سیدھ میں ہونا چاہیئے تاکہ ریڑھ کی ہڈی کا راستہ یوگ کے عمل کے لئے بالکل صاف رہے :

---

۱ Eight Fold Yoga. ۲ Yama.

۳
(a) non injury by
(b) non covetousness in
(c) Perfect chastity in
(d) Perfect truthfulness in
} thought. word and deed
(e) non-receiving of gifts.

۴ Niyama. ۵ Asana.

(۴) "پرانایام[1]" (تہذیب یا ضبطِ انفاس) اس سے مراد انفاس کو اپنی مرضی کے مطابق روکنا یا چلنے دینا ہے، اس مشق سے "پران[2]" یعنی زندگی کی بنیادی قوتِ محرکہ پر قابو پانا مطلوب ہوتا ہے؛

(۵) "پراتیاہارا[3]" اس سے مراد ہے من کو باطن کی طرف لگانا اور باہر جانے سے روکنا، زندگی کو سمجھنے کے لئے اس پر خوب غور کرنا؛

(۶) "دھرنا[4]" یعنی یکسوئی میں کسی ایک موضوع پر غور کرنا؛

(۷) "دھیان[5]" یعنی غور و فکر اور استغراق؛

(۸) سمادھی (مراقبہ) - یہ ہے مقام انوار و تجلیات کا، ہماری تمام ریاضت اور مشق کا حاصل۔

"یم اور نیم" (تہذیب نفس اور تحفظِ اصول و ضابطہ) زندگی بھر کی ریاضتیں ہیں۔ ان کی مشق تمام عمر کرنا ہوتی ہے، جہاں تک دوسری ریاضتوں کا تعلق ہے اُن کی مشق یکے بعد دیگرے کی جاتی ہے۔ جب تک پہلی منزل کی ریاضت میں کمال حاصل نہ ہو جائے اگلی منزل کی ریاضت کی مشق شروع نہیں کرنا چاہیئے ایک ریاضت کی مشق کو پوری طرح سمجھ کر اور اُسے درجۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دوسری ریاضت شروع کرنا چاہیئے؛

اس سبق کا موضوع ہے "پرانایام" یعنی پران (انفاس، زندگی کی قوتِ محرکہ) پر اختیار پانا۔ راج یوگ کے عمل میں انفاس (سانس) کے ضبط و ترتیب سے پہلے انسان نفسیاتی سطح[6] پر پہنچ جاتا ہے، اور پھر رُوحانی سطح پر۔ پرانایام ہمارے جسمانی نظام کی مرکزی کل ہے، راج یوگ کی بنیاد اسی پر ہے۔ پرانایام کا عمل پھیپھڑوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ پھیپھڑوں کا عمل دل پر ہوتا ہے، اور دل کا دورانِ خون پر، دورانِ خون کی ترتیب و تنظیم مغز پر اثرانداز ہوتی ہے، اور مغز سے دماغ (من) رنگ پکڑتا ہے، اس طرح راج یوگ میں پرانایام کی مشق سے دماغ (من) پر اختیار حاصل کیا جاتا ہے اور جب انسان من پر قابو پالیتا ہے تو خارجی دنیا خود بخود اس کی مطیع ہو جاتی ہے، ہماری قوتِ ارادی عین اسی طرح اثر پیدا کر سکتی ہے جس طرح خارجی واقعات یا احساسات ہماری قوتِ ارادی اور طاقتِ عمل کو بیدار اور محرک کرتے ہیں، عموماً ہماری قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے، ہم مادّی چیزوں سے اس قدر چپٹے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنی لطیف دماغی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ارادے اکثر خارجی اثرات سے تشکیل ہوتے ہیں اور ہمارے اعمال خارجی محرکات سے وجود میں آتے ہیں۔ خارجی فطرت کے متواتر دباؤ سے

---

[1] Pranayama.

[2] پران سے مراد محض سانس نہیں ہے "پران" کے معنی کے لئے صفحہ ملاحظہ کیجئے۔

[3] Pratyahara. [4] Dharma. [5] Dhyana. [6] Psychic Plane.

ہمارا توازن قائم نہیں رہتا اور ہمارے پاؤں زندگی کے میدان میں لڑکھڑا جاتے ہیں حالانکہ ہمارے اندر وہ زبردست طاقت ہے کہ ہم جب کبھی چاہیں خارجی فطرت کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے وہ بھی کیا زندگی ہے جو خارجی فطرت کا غلام ہو کر بسر کی جائے :

دُنیا کے اولیا اور مذہبی رہنما ہماری اندرونی طاقت کا زندہ ثبوت ہیں۔ ان بزرگوں نے پہلے اپنی داخلی کائنات کو تسخیر کیا اپنے باطن کے عالم شعور و ادراک پر فتح پائی اور پھر خارجی دنیا کے سامنے یقین و ایمان کی بے پناہ طاقت کو کچھ ایسے آشکار کیا کہ تمام دُنیا اُن کے قدموں میں جھک گئی وہ بات کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکم صادر کر رہے ہیں کیا مجال کوئی اُن کی حکم عدولی کر سکے۔ یوگ اسی اندرونی طاقت کو حاصل کرنے کا علم ہے آپ نے وہ کہانی تو سنی ہوگی کہ ایک بادشاہ نے اپنے وزیر کو ایک اونچے برج میں قید کر دیا تھا وزیر کی ہدایات کے مطابق اُس کی بیوی ایک بھونرا، کچھ شہد، ریشمی دھاگا، ڈوری اور ایک مضبوط رسا لے کر وہاں پہنچی اس نے بھونرے کی ٹانگ سے ریشمی دھاگا باندھ دیا اور اُس کی مونچھوں پر شہد لگا کر اسے برج کی دیوار پر چھوڑ دیا بھونرا شہد کے لالچ میں اوپر چڑھتا گیا اور اس طرح ریشمی دھاگا آخر وزیر کے ہاتھ جا لگا اُس کی بیوی نے دھاگے کے دوسرے سرے سے ڈوری باندھ دی اور جب وزیر نے ڈوری کو کھینچ لیا تو اس کے سرے سے رسا باندھ دیا گیا وزیر نے رسا برج کی چھت سے باندھ دیا اور اس کی مدد سے نیچے اتر آیا۔ یہ مثال یوگ کے عمل کی ہے ہم اپنے من پر آہستہ آہستہ اختیار حاصل کر لیتے ہیں ہمارا سانس کہانی کے ریشمی دھاگے کی طرح ہے سب سے پہلے ہم اپنے سانس کو قابو میں لاتے ہیں۔ سانس کے ضبط اور تربیت سے بڑھتے بڑھتے ہم نفسیاتی اور روحانی طاقتوں پر اختیار حاصل کر لیتے ہیں اور بالآخر دھیان (یکسوئی) کی طاقت سے جسم کی قید سے رہائی پا لیتے ہیں اس آزادی ہی کو نجات یا مُکتی کہتے ہیں۔ آزادی کی منزل پر پہنچ کر ہم اُن سب ذرائع اور وسائل کو ترک کر سکتے ہیں جن کی مدد سے ہم نے اپنا سفر طے کیا !

پرانایام کے عمل کے تین حصے ہیں (۱) پورکا[۱] یعنی اندر کو سانس لینا۔ (۲) کمبھکا[۲] یعنی سانس روکنا اور (۳) ریچکا[۳] یعنی باہر کو سانس پھینکنا۔

علم یوگ کے مطابق مغز (دماغ) سے دو دھاریں[۴] اٹھتی ہیں اور ریڑھ کی ہڈی کے دونوں جانب علیحدہ علیحدہ گھومتی ہوئی واپس مغز کو آجاتی ہیں۔ ان میں سے ایک مغز کے بائیں جانب سے اٹھتی ہے اور مغز کے نیچے سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی کے دائیں طرف گھوم جاتی ہے اور اس ہڈی کے ساتھ ساتھ جا کر

---

۱ Puraka. ۲ Kumbhaka ۳ Rechaka.
۴ Currents

اس کے نچلے حصّے میں پہنچتی ہے جہاں سے وہ بائیں جانب مُڑ جاتی ہے اور انگریزی کے ہندسے آٹھ (8) کے نصف حصّے کی صورت میں واپس مغز کو چلی جاتی ہے، اس لہر کو "پنگلا"[1] (آفتابی یا سُورج مُکھی لہر) کہتے ہیں۔ دُوسری لہر کا نام "اِدا"[2] (ماہتابی یا چندر مُکھی) ہے، یہ لہر پنگلا کے مقابل میں چلتی ہے اور دونوں مل کر "8" کی شکل میں دن رات چلتی رہتی ہیں، اُن کے اس راستے کا نچلا حصّہ اوپر کے حصّہ سے زیادہ کُشادہ ہوتا ہے۔ یہ لہریں اپنے رستے کے مختلف مقامات (نقطوں) پر جنہیں "اندوھتے"[3] کہتے ہیں زندگی کی محرکہ قوتوں کا سرمایہ جمع کرتی جاتی ہیں لیکن ہمیں اس عمل کا ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔ یوگ کے عمل "دھیان" یا یکسوئی سے ہم انہیں محسوس کر سکتے ہیں اور جسم کے تمام حصّوں میں ان کی موجودگی کا پتہ لگا سکتے ہیں، یہ "آفتابی" اور "ماہتابی" لہریں جن سے زندگی قائم ہے، ہمارے سانس سے گہرا تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ سانس پر قدرت حاصِل کر کے ہم جسم پر پُوری طرح قابو پا سکتے ہیں :

کتھا اپنشد[4] میں جسم کو رتھ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ من (دماغ) اس رتھ رُوپی جسم کی لگام ہے اور بُدّھی (فکر و نظر) اس کا رتھبان ہے، حواس اس رتھ کے گھوڑے ہیں جو حرص و ہوس کی سڑک پر سرپٹ دوڑنے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتے ہیں۔ اس رتھ پر ہماری "ذات" کی سَواری نکلتی ہے۔ جب تک ہمیں اپنی حقیقت اپنی خودی کا احساس نہ ہوگا، جب تک ہم اپنی عظمت اور شان سے واقف اور اپنی منزل سے آگاہ نہیں ہوں گے، جب تک ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں ہوگا تب تک ہم اپنے رتھبان (اپنی بُدھی) یعنی شعور و ادراک کی طاقت کو اپنی مرضی کے مطابق رتھ چلانے کا حکم نہیں سکیں گے، تب تک ہماری منزل ہم سے کوسوں دُور رہے گی، بلکہ عین ممکن ہے کہ حسیات کے سرزور اور خطرناک گھوڑے بے لگام ہو کر ہوسناکی کی ڈھلان پر بے تحاشہ بھاگ نکلیں اور رتھ اور رتھبان دونوں کا خاتمہ ہو جائے "پنگلا" اور "اِدا کی لگامیں ان گھوڑوں کے مُنہ میں ڈالی ہوئی ہیں۔ ان لگاموں سے اُن کی روک تھام ہو سکتی ہے، ہماری بُدّھی (ہمارے رتھبان) کے لئے لازم ہے کہ ان دونوں لگاموں کو اچھی طرح اپنے ہاتھ میں تھامے رکھے تاکہ حواس کے گھوڑوں پر پُورا قابو رہے، دُوسرے لفظوں میں ہمیں اپنے آپ میں اخلاق کی طاقت پیدا کرنی ہوگی، اخلاقی طاقت حاصِل کئے بغیر ہم اپنے اعمال پر کسی قسم کا قابو نہیں پا سکے صرف یوگ ہی ہمیں یہ طاقت عطا کرتا ہے یوگ کے عمل کی بدولت ہی ہمیں اخلاقیات کی تعلیم پر عمل کرنے کی طاقت حاصِل ہوتی ہے۔ کیونکہ انسانی کردار کو اخلاقی معیار کی بلندی تک لے جانا ہی تو یوگ کا مقصد ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے مذہبی رہنما ہوئے ہیں، وہ سب کے سب حقیقی معنوں میں یوگی تھے کیونکہ زندگی کی اِن لہروں پر جو ہمارے اندر موجزن ہیں انہیں پُوری قدرت حاصِل تھی، ہوتا یوں ہے کہ یوگی اِن

---

۱ Pingla.　　۲ Ida.　　۳ Plexuses.

۴ Katha Upanishad.

دونوں لہروں کو ریڑھ کی کرسی[1] (ینو) پر ہی تھام لیتا ہے اور اُنہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ ایک لہر بن کر ریڑھ کی ہڈی کے گرد گھومنے کے بجائے اُس کے بیچ سے گزریں اس طرح جب "پنگلا" اور "اڈا" کی لہریں مل کر ریڑھ کے خلا سے گزرنے لگتی ہیں تو وہ آگہی کی لہریں بن جاتی ہیں اور انسان پر علم و معرفت کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ یہ سعادت صرف یوگی ہی کا حصہ ہے، اور یوگی "پرانایام" سے اس مقام پر پہنچتا ہے:

لیکن یاد رہے کہ سب کے لئے ایک ہی طریقۂ عمل کارگر نہیں ہو سکتا، جو جس کے لئے موزوں ہو اُسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے[2]۔ جہاں تک "پرانایام" کا تعلق ہے اس کا اصول یہ ہے کہ سانس میں ہم آہنگی اور توازن ہونا چاہیئے۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ شروع شروع میں مشق کے لئے گن گن کر سانس لیا جائے لیکن چونکہ سانس کے ساتھ ساتھ گنتی کرنا بالکل "میکانکی"[3] طریقہ ہے، اس لئے گنتی کے بجائے ہم "اوم" کا مقدس لفظ استعمال کرتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ "اوم" کو دوہرا کر اس میں توازن پیدا کر لیتے ہیں۔ اوم کی بار بار تکرار سے سانس اوم ہی کے وزن پر چلنے لگتا ہے:

"پرانایام" کا طریقہ یہ ہے، ناک کا دایاں نتھنا انگوٹھے سے بند کر دو پھر بائیں نتھنے سے سانس اندر کو لینا شروع کر دو اور ساتھ ساتھ من میں چار بار لفظ "اوم" کو دہراؤ پھر انگوٹھے کے پاس والی اُنگلی بائیں نتھنے پر رکھو اور دونوں نتھنے مضبوطی سے بند کر کے سانس روک لو اور من میں آٹھ بار اوم کہو۔ اس کے بعد دائیں نتھنے سے انگوٹھا ہٹا لو اور آہستہ آہستہ سانس خارج کرو اور ساتھ ساتھ من میں چار بار اوم کہو جب سانس خارج کر چکو تو ناف کو اندر کی طرف کھینچو تاکہ پھیپھڑوں میں جو ہوا رہ گئی ہو وہ بھی باہر نکل جائے۔ اب یہی عمل دوہراؤ لیکن اب کے بائیں کے بجائے، دائیں نتھنے سے سانس لو یعنی بائیں نتھنے کو انگوٹھے کے پاس والی اُنگلی سے دبا کر دائیں نتھنے سے آہستہ آہستہ سانس لو اور ساتھ ساتھ من میں چار بار اوم کہو، پھر انگوٹھے سے دائیں نتھنے کو دبا کر سانس کو اندر تھام لو اور من میں آٹھ بار اوم کہو، پھر بایاں نتھنا کھول دو اور من میں چار بار اوم کہتے ہوئے آہستہ آہستہ پھیپھڑوں سے ہوا خارج کرو بعد میں ناف کو پہلے کی طرح اندر کو کھینچو:

ہر نشست میں یہ عمل دو بار کرو یعنی چار بار پرانایام کرو، دو بار ایک نتھنے اور دو بار دُوسرے سے، پرانایام شروع کرنے سے پہلے اگر تھوڑی سی پرارتھنا (دُعا) کر لی جائے تو بہتر ہوگا:

اس عمل کی مشق ایک ہفتہ تک متواتر کرنا چاہیئے پھر تدریجاً سانس لینے کا وقت بڑھاتے جاؤ لیکن سانس لینے اور روکنے کے وقت میں وہی نسبت قائم رہنا چاہیئے یعنی اگر سانس لیتے وقت چار کے بجائے چھ بار اوم کہا

---

[1] Base of the spinal chord.

[2] یہاں سوامی جی کا اشارہ دوسرے یوگوں یعنی گیان یوگ، کرم یوگ، اور بھگتی یوگ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

[3] Mechanical

جائے تو سانس خارج کرتے وقت بھی چھ بار اوم کہو اور "کمبھکا" (سانس روکنے کے وقت) کے دوران میں بارہ بار پرانایام کا عمل ہمیں رُوحانیت، پاکیزگی اور تقدس کے زیادہ نزدیک لے جانے میں بہت مددگار ثابت ہوگا لیکن یاد رہے کہ اس عمل سے ہم میں جو قوتیں بیدار ہوں گی اُن کے استعمال سے ہمیں احتراز کرنا ہوگا نہیں تو ہم رُوحانی ارتقاء کی شاہراہ سے ہٹ کر نفسیاتی طاقتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائیں گے۔ صرف پریم کی ہی واحد طاقت کو اپنا کر اُسے اور بھی بڑھاتے جانا ہوگا باقی سب طاقتوں کو اپنے اپنے مقام پر پاکر وہیں چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ جانا ہوگا۔ راج یوگ کے ذریعے پرماتما تک پہنچنا ہمت والوں کا کام ہے اس میدان میں ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور رُوحانی طاقت اور توانائی درکار ہے یہاں تو ہر قدم اس بات کا دھیان رکھ کر اُٹھانا ہوگا کہ کامیاب بس وہی آدمی ہو سکتا ہے جس میں پرماتما کی خاطر سب کچھ ترک کر دینے کی ہمت ہے اور ایسا آدمی کروڑوں میں ایک ہوتا ہے جو منازلِ راہ کو ترک کرتا ہوا اس بات پر تُل جاتا ہے کہ "میں ان سب مقامات سے پرے خود خدا تک جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا" نورِ حقیقت کی تاب ہر کوئی نہیں لا سکتا، بہت کم لوگ حق کے جلال کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں لیکن اگر ہمیں واقعی کچھ حاصل کرنا ہے اگر ہمیں واقعی خدا تک رسائی مطلوب ہے تو پھر اس مقصد کو پانے کے لئے جان کی بازی لگا دینا ہوگی

تیسرا سبق

کنڈلینی[۱]

رُوح کو رُوح سمجھو، رُوح مادہ نہیں ہے، ہم عام طور پر اپنی روح کو جسم سمجھ لیتے ہیں لیکن اگر ہمیں رُوح کا بطور رُوح احساس کرنا منظور ہے تو ہمیں رُوح کے تصور کو حسیات اور مدرکات سے علیحدہ کرنا ہوگا جس وقت ہم ایسا کر پائیں گے اُس وقت ہم امر (زندۂ جاوید) ہو جائیں گے۔ آخر موت کیا ہے بس تغیر اور تغیر کیا ہے۔ علت و معلول کی دورنگی، جو چیز تغیر پذیر ہے، اسی کو ہم فانی کہتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ جسم اور دماغ (باوجود اس کے دماغ لطیف ہے) دونوں میں متواتر تغیر ہوتا رہتا ہے، دونوں کبھی بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتے اس لئے ظاہر ہے کہ دونوں فانی ہیں۔ غیر فانی تو وہی ہو سکتا ہے جو غیر پذیر ہے، جس پر کسی قسم کا کوئی عمل نہیں ہو سکتا اور وہ ہے ہماری رُوح آتما، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہستی ہے تو رُوح کی، ہم رُوح ہیں۔ البتہ اس حقیقت کو پانے کے لئے ہمیں لاعلمی اور جہالت کے

---

[۱] Kundalini.

پردوں کو ہٹانا ہوگا جن کے نیچے یہ حقیقت دب گئی ہے: جس چیز کو ہم جسم کہتے ہیں وہ بھی دراصل لطیف خیال ہے جس نے ٹھوس صورت اختیار کرلی ہے "آفتابی" اور "ماہتابی" لہریں (پنگلا اور اِڑا) جسم کے ہر حصہ کی قوتِ محرکہ ہیں انہیں کی بدولت ہم زندہ ہیں، مردہ اجسام میں تو ان کا نشان نہیں ملتا۔ ہماری صحت اور تندرستی، طاقت اور توانائی انہیں سے پیدا ہوتی ہے بلکہ فوری ضروریات پوری کرنے کے علاوہ یہ لہریں ہمیں زندگی کی قوت کا ذخیرہ بھی مہیا کرتی ہیں وہ اس ذخیرہ کو ریڑھ کی ہڈی کے خاص نقطوں[۱] پر جمع کر دیتی ہیں ان نقطوں کو عام زبان میں "اعصابی[۲] مرکز" کہتے ہیں۔

یوں تو یہ لہریں ہر شخص کے جسم میں کارفرما ہیں لیکن یوگی کو دوسروں پر اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ انہیں صرف محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں واقعی دیکھتا بھی ہے، یوگ کے عمل سے ان لہروں میں درخشندگی پیدا ہو جاتی ہے اور "مرکز" بھی چمک اٹھتے ہیں۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ عمل دو قسم کا ہوتا ہے، شعوری اور غیر شعوری، لیکن یوگی کی رسائی مافوق الشعور تک ہوتی ہے ہر زمانے میں اور ہر ملک میں سنت مہاتماؤں، مذہبی رہنماؤں اولیا اور پیغمبروں نے مافوق الشعور کے وجود کا ثبوت بہم پہنچایا ہے مافوق الشعور علم و معرفت کا سرچشمہ ہے شعور کے اس مقام پر غلطی کا امکان نہیں رہتا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے مافوق الشعور جبلت کے مترادف نہیں ہے، ان میں زمین آسمان کا فرق ہے، جبلت کی حرکت محض میکانکی ہوتی ہے جبلت کے عمل میں جان نہیں ہوتی برعکس اس کے مافوق الشعور کا عمل ادراک اور شعور سے بھی بلند سطح پر وجود میں آتا ہے اسی لئے اس کو القا اور الہام کا نام دیا گیا ہے، یوگ کہتا ہے کہ القا اور الہام کا مقام ہم سب کی دسترس میں ہے: مافوق الشعور تک پہنچنے کی صلاحیت ہر انسانی وجود کو ودیعت کی گئی ہے اور انجام کار سب اسی سے بہرہ ور ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یوگ ہمیں اس بلند مقام پر پہنچنے کا عملی طریقہ بھی بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر یہ جو "آفتابی" اور "ماہتابی" لہریں (پنگلا اور اِڑا) کارفرما ہیں، ان کا رُخ موڑ کر انہیں ریڑھ کی ہڈی کے گرد گھومنے کے بجائے ریڑھ کی ہڈی میں سے ہو کر گزرنے پر مجبور کر دیا جائے یوگ کے عمل سے یہ لہریں اپنے لئے ریڑھ کی ہڈی کے بیچ سے ایک نیا راستہ نکال لیتی ہیں۔ اس راستے کو سوشمنا[۳] کہتے ہیں جب کوئی انسان اس عمل میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اپنے جسم سے بالکل جدا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُسے شعورِ ذات ہو جاتا ہے۔

یوگ کے عمل کے لئے ریڑھ کی نیو مقعد کی تکونی شکل کی ہڈی[۴] کے قریب جو اعصابی مرکز ہے وہ سب سے زیادہ اہم ہے یہ مرکز جنسی قوت کے مادہ تخلیق کا خزانہ ہے، یوگی اس مرکز کا بیان تمثیلاً یوں کرتے ہیں کہ ریڑھ کی

۱۔ Plexuses.　　　۲۔ Nerve Centres.

۳۔ Sushumana.　　　۴۔ Sacrum.

نیو پر ایک مثلث ہے جس میں ایک چھوٹا سا اژدہا کنڈلی مارے سو رہا ہے، اس سوئے ہوئے اژدہے کو "کنڈلینی"[۱] کہتے ہیں اور اس کو جگانا ہی (یا جیسے کہ میں نے ابھی عرض کیا آفتابی اور ماہتابی لہروں کو ریڑھ کی نیو سے ریڑھ کے بیچ سے گزرنے پر مجبور کرنا ہی) راج یوگ کا سارا مقصد ہے۔ اس عمل سے جنسی مادہ کی زبردست قوت کا رُخ ہمارے جسمانی نظام کے تخلیقی مرکز[۲] یعنی دماغ کی طرف ہو جاتا ہے (دُوسرے لفظوں میں ہم حیوانی درجے سے اُوپر اُٹھ جاتے ہیں) آہستہ آہستہ یہ طاقت دماغ میں جمع ہو جاتی، اور "اوجس"[۳] یا روحانی طاقت کہلاتی ہے۔ نیک خیالات اور اچھے افکار سے اس طاقت کی ترقی ہوتی ہے۔ دعائیں پرارتھنائیں اور مناجات اُس حیوانی قوت کو جو ہمارے جسم میں موجود ہے، رُدھانی شکتی یعنی "اوجس" میں تبدیل کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ اسی "اوجس" ہی کی بدولت انسان انسان کہلانے کا حقدار ہے، یہ روحانی طاقت صرف انسان ہی کے اندر پیدا ہوتی ہے اور انسان ہی کے وجود میں قیام کرتی ہے جس آدمی کی تمام حیوانی (جنسی) طاقت[۴] "اوجس" میں تبدیل ہو جاتی ہے وہ دیوتاؤں کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے، ایسے آدمی کی ہر بات میں بلا کا زور ہوتا ہے، کوئی اس کے آگے سر نہیں اٹھا سکتا ایسے ہی آدمی وقتاً فوقتاً دنیا میں نئی جان ڈال دیتے ہیں اسی روحانی طاقت کو حاصل کرنے کے لئے تو یوگی یوگ کے عمل سے اور تخیّل اور قوتِ ارادی کی مدد سے "کُنڈلینی" کے اژدہے کو جگاتا ہے اور تدریجاً ایک مقام سے دُوسرے تک اُٹھاتے ہوئے بالآخر اُسے بلند ترین مقام یعنی صنوبری (تخلیقی) غدود[۵] تک لے آتا ہے، اس بامِ عروج پر پہنچ کر انسان کی جنسی قوت (جو اس کی تحویل میں سب سے بڑی طاقت ہے) تمام تر رُوحانی طاقت یعنی "اوجس"[۶] میں تبدیل ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک ایسا نہیں ہو پاتا کوئی انسان (خواہ مرد ہو یا عورت) رُوحانی زندگی گو پا ہی نہیں سکتا۔

یہ بات نہیں کہ یوگ کے عمل سے کوئی نئی طاقت پیدا ہو جاتی ہے دراصل کسی نئی طاقت کی تخلیق تو ممکن ہی نہیں، بڑی سے بڑی طاقتیں خود ہمارے اندر موجود ہیں ہمیں تو بس یہ سیکھنا ہے کہ اُن پر کیسے قابو پایا جائے اور اُن کا رُخ کیسے اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیا جائے، سوال تو بس ان طاقتوں کو اپنی قوتِ ارادی کی مدد سے حیوانیت سے موڑ کر روحانیت کی طرف لے جانے کا ہے اسی لئے تو تمام اخلاقی اور مذہبی نظاموں کا سنگ بنیاد تجرد اور پاکیزگی کو قرار دیا گیا ہے، بہرحال راج یوگ کے عمل کے لئے تو خیال، بول اور عمل میں پاکیزگی شرطِ اول ہے اگر شادی شدہ

---

[۱] Kundalini.

[۲] Dynamo of the human system.

[۳] Ojas.

[۴] Animal sex force.

[۵] Pineal gland.

[۶] دماغ کے زیریں حصے میں ایک غدود جس کے اعمال و خواص معلوم نہیں۔

لوگ اس یوگ کا عمل کرنا چاہتے ہیں تو اُنہیں بھی ازدواجی زندگی کو خیرباد کہنا ہوگا یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی اپنے وجود کی سب سے بڑی طاقت کو ضایع کرکے، رُوحانی منازل طے کرسکے، رُوحانیت زندگی کی سب سے کڑی منزل ہے اس پر پہنچنے کے لئے ہمیں اپنی سب طاقتوں کو ایک مرکز پر لاکر پُوری تندہی اور یکسوئی سے کوشش کرنا ہوگی دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر زمانے کے سنت مہاتما، اولیا اور مذہبی رہنما یا تو شروع ہی سے تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے یا اُنھوں نے ازدواجی زندگی ترک کردی تھی۔ یاد رہے کہ پاک باطن و پاک نظر ہی خدا کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں[لے]۔

عملی ہدایت یہ ہے کہ پرانایام کرنے سے پہلے کنڈلینی کی مثلث کا خیال کیجئے، آنکھیں بند کرکے اپنے تخیل میں اس کی تصویر اس طرح کھینچئے کہ یہ آپ کو شعلوں سے گھری ہوئی روشن اور درخشاں دکھائی دے، اور اس کے بیچوں بیچ اژدہا کُنڈلی مارے بیٹھا ہو جب آپ کو کُنڈلینی بالکل صاف نظر آجائے تو یوں سوچئے کہ آپ نے اُسے ریڑھ کی ہڈی میں رکھدیا اور کُمبھکا (یعنی ضبطِ نفس) کے وقت یہ خیال کیجئے کہ آپ روکے ہوئے سانس کو اژدہا کے سر پر ڈال رہے ہیں تاکہ وہ جاگ جائے جتنی زیادہ طاقت آپ کے تخیل میں ہوگی اتنا ہی جلدی آپ حسبِ منشا اپنا مقصد حاصل کرسکیں گے اور کُنڈلینی بیدار ہو جائے گی جب تک کُنڈلینی اس طرح بیدار نہ ہو جائے اپنے خیال کو اسی بات پر مرکوز رکھیے کہ وہ جاگا چاہتی ہے، اپنی آفتابی اور مہتابی لہروں کی حرکت کو محسوس کیجئے اور اُنہیں ریڑھ کی ہڈی کے درمیانی راستے (Sushumana.) سے گزرتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کیجئے ایسا کرنے سے یوگ کے عمل میں کامیابی جلد حاصل ہو جاتی ہے۔

چوتھا سبق

اس سے پہلے کہ ہم اپنے من پر قابو پانے کی کوشش کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کریں یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ من بڑا چنچل ہے، ہر وقت اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے یہ ایک جگہ نہیں ٹھیرتا اس میں اِستقلال اور یکسوئی پیدا کرنا مشکل ہے، اِس آتش بپا من کو اس کی آوارگیوں سے کھینچ کر ایک خیال پر جمانا بڑا مشکل کام ہے اس کی بار بار مشق کرنا ہوگی، ہمیں اپنی قوتِ ارادی سے اس من کو اپنی گرفت میں لانا ہے، اُسے ٹھہرنے پر مجبور کرنا ہے اور بھگوان کے دھیان میں لگانا ہے، اُسے دنیا کے خیالات سے ہٹا کر خدا کی عظمت اور جلال کے خیال پر مرکوز کرنا ہے۔

من کو اپنی گرفت میں لانے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ چُپ چاپ بیٹھ جائیے اور اُسے تھوڑی دیر کے لئے

لے Only the pure in life can see God.

جہاں چاہے بھٹکنے دیجئے ساتھ ہی ساتھ اس خیال کو مضبوطی سے تھامے رکھئے کہ "میں اپنے من کی آورگی کا تماشہ کر رہا ہوں میں اپنے من سے جدا ہوں" پھر دیکھئے کہ آپ کا من بھی یہ سوچنے لگے گا کہ وہ آپ کی ہستی سے جدا ہے غور و فکر کے اس مقام پر جب آپ اور آپ کا من ایک دوسرے سے علیحدہ نظر آنے لگیں تو اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہ سوچئے کہ آپ کی ہستی خدا کے وجود میں شامل ہے اور آپ کا مادہ یا مادہ کی لطیف صورت یعنی من سے کوئی تعلق نہیں یہ خیال کیجئے کہ من ایک ساکن جھیل ہے جو آپ کے سامنے پھیلی ہوئی ہے جس میں خیالات بلبلوں کی صورت میں اٹھتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں ان خیالات کو بس میں لانے یعنی ان بلبلوں کو پکڑنے کی کوشش مت کیجئے بس نظارہ کرتے جائیے دیکھتے جائیے کہ وہ کہاں کہاں تیرتے چلے جاتے ہیں جیسے کسی تالاب میں پتھر پھینکنے سے پہلے بڑے بڑے حلقے یا گرداب پیدا ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ حلقے محدود ہوتے چلے جاتے ہیں ویسے ہی آپ کے من کی جھیل کی سطح پر شروع شروع میں بہت بڑے بڑے حلقے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے نظر آئیں گے لیکن آہستہ آہستہ ان کا محیط کم ہوتا چلا جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ خارجی محرکات پتھر کی طرح من کی جھیل میں گرتے ہیں اور پھر خیالات کی لہریں مرکز سے محیط کی طرف تیز تیز چلنے لگتی ہیں۔ من کو قابو میں لانے کے لئے اس عمل کو الٹنا ہوگا اور ہمیں اپنے خیالات کو سمیٹ کر محیط سے مرکز کی طرف لانا ہوگا محیط کے قریب کے بڑے بڑے حلقوں کو آہستہ آہستہ تنگ کرتے ہوئے انہیں یکے بعد دیگرے مرکز پر لا کر من کو انجام کار ایک نقطہ پر جمانا ہوگا اور اسے اس نقطہ پر قائم رکھنا ہوگا۔ اس مطلب کے لئے خود کو اس خیال پر قائم رکھئے کہ "میں من نہیں ہوں میں تو من کا مشاہدہ کرنے والا ہوں۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرا من کس طرح سوچ بچار کرتا ہے میں تو اپنے من کے ہر ارادے ہر حرکت اور ہر عمل کا تماشہ کر رہا ہوں"۔

اس طرح متواتر خیال کرنے سے آپ کی اپنے من سے وابستگی روز بروز کم ہوتی چلی جائے گی یہاں تک کہ آخر کار آپ اپنے آپ کو اپنے من سے بالکل الگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور واقعی محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کی ہستی من کے وجود سے علیحدہ ہے۔ جب آپ اس مقام پر پہنچ جائیں گے تو آپ کا من آپ کے بالکل مطیع ہو جائے گا اور ایک غلام کی طرح آپ کے اشارے پر چلے گا۔ یوگ کی پہلی منزل ہے حواس اور حسیات سے بالا انتہا یوگ کی معراج ہے من پر پوری طرح فتح پا لینا۔ اس سے پہلے مشق اور ریاضت کے کئی بہت سخت مقام آتے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ جہاں تک ممکن ہو اکیلے یا ایکانت میں رہئے۔ جس جگہ بیٹھ کر آپ یوگ کی مشق کرتے ہیں وہ زمین (فرش) سے اونچی ہونی چاہئے لیکن اس قدر نہیں کہ اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہو۔ پہلے اپنی نشست پر چٹائی بچھائیے اس پر نرم کھال اور سب سے اوپر ریشمی چادر بچھا دیجئے۔ نشست کی پشت نہ ہو تو اور بھی بہتر ہے بہرحال اسے اپنی جگہ پر یوں قائم رہنا چاہئے کہ مشق کے دوران میں ہلنے کا کوئی امکان نہ ہو۔

لیکن سب سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ ہم اپنے من کو ساکن کریں۔ خیالات کی لہروں کو پیدا نہ ہونے

دیں تاکہ ہمیں اپنی گہرائی اور وسعت کا پورا احساس ہو۔ اسی بات کو تشبیہ بدل کر یوں کہا جاسکتا ہے کہ خیالات کی تصویروں سے ہمیں اپنے من کو خالی کرنا ہے، اگر ہم خدا کو تمثیلاً نہیں بلکہ حقیقتاً سمجھنا چاہتے ہیں تو دماغی بُت سازی اور صنم پرستی کو بند کرنا ہوگا، ہر قسم کی دماغی تصویر کشی کو چھوڑنا ہوگا جب ہمارے من میں کوئی اور چیز نہیں رہے گی تو خدا ہی کا جلوہ نظر آئے گا اس لئے ہمیں خود کا یوں نگہبان ہونا پڑے گا کہ جونہی کوئی خیال من میں اُٹھتا نظر آئے اُسے فوراً وہاں سے نکال دیا جائے یہ کام نہایت مشکل ہے۔ اس کو سرانجام دینے کے لیے ہمیں مادہ اور جسم کی حدود سے باہر نکلنا ہوگا دراصل یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے اور اسی لئے تمام زندگی مسلسل کوشاں ہے۔ ہر مجسّم چیز کے پیچھے اس کی غیر مرئی لطیف صُورت ہوتی ہے۔ ہر آواز (لفظ) کے پیچھے اس کے معنی ہوتے ہیں[1]۔ ہمیں ظاہر سے گزر کر باطن تک جانا ہے کثرتِ جلوہ سے وحدتِ حُسن کو پانا ہے اور یہ احساس دھیان ہی سے حاصِل ہوتا ہے۔ دھیان گیان کی زندگی ہی تو ہماری ہستی کا بلند ترین مقام ہے۔ حواس سے حظ اُٹھانا تو زندگی کے حیوانی مقام کی خصوصیت ہے، انسان کی زندگی تو غور و فکر کی زندگی ہے۔ انسان کے لئے تو اسی میں سچّا سرُور ہے، اسی سے آگے رُوحانی استغراق کا مقام ہے جب رُوح اپنے آپ کو پالیتی ہے تو ہماری آنکھیں کھُل جاتی ہیں اور حُسنِ کائنات ہمارے سامنے پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہو جاتا ہے، زندگی کتنی حسین ہے اس کا صحیح اندازہ صرف یوگی ہی لگا سکتا ہے۔

---

[1] اس نقطہ کی تشریح سوامی جی نے اپنے مکمل مضمون بعنوان راج یوگ میں یوں کی ہے:-

جس چیز کو ہم آواز کہتے ہیں وہ تین چیزوں سے مرکب ہے۔ اول خارجی ارتعاش، دُوسرے داخلی اعصابی حرکت جس سے خارجی ارتعاش کی خبر دماغ تک جاتی ہے، تیسرے دماغی ردِّ عمل جس سے ادراک اور شعور کی رَو پھوٹ پڑتی ہے اور ہمیں اس خارجی چیز کا ادراک ہوتا ہے جس نے لطیف لہروں کو جنم دے کر ہمیں اپنے وجُود یعنی خارجی محرک سے آگاہ کیا۔ ان تین حالتوں کو یوگ کی اصلاح میں "شبد" (آواز)، ارتھ (معنی) اور گیان (علم۔ معرفت) کہتے ہیں علم طبیعات اور عضویات کی زبان میں ان کو غیر مرئی ارتعاش، اعصابی حرکت اور دماغی ردِّ عمل کہتے ہیں یہ تین عمل ایک دُوسرے سے مختلف ہونے کے وجود آپس میں کچھ یوں خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ہمیں بیک وقت ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ احساس نہیں ہوتا — ہم اُن کے مجموعی اثر سے واقف ہیں لیکن یوگی اپنے عمل اور ریاضت کی بدولت ان کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ اور ہر ایک پر اختیار پا سکتا ہے[1]۔

---

[1] مثالوں کے لئے صفحہ ۴۶۲ کے نوٹ کا ملاحظہ کیجئے۔

کیوں کہ اس کی نظر سے مجسّم چیزوں کی لطیف صُورت پنہاں نہیں ہوتی۔

ہمارا سب سے اُونچا آدرش خدا ہے۔ خدا ہی کا دھیان کیجیے دراصل ہم خود ہی "وہ" ہیں[1]۔ خُدا کو پایا جاسکتا ہے سمجھا اور سمجھایا نہیں جا سکتا۔ دانندۂ کل کا علم نہیں ہو سکتا "وہ" ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا ہے لیکن اس کا احساس ہو سکتا ہے کیوں کہ ہم خود ہی "وہ" ہیں۔

اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جیسے کسی کی نظر ہوتی ویسے ہی اُسے دنیا نظر آتی ہے اگر ہم پاک نظر ہیں تو ہمیں دُنیا میں بُرائی دکھائی ہی نہیں دے گی، شر کا وجود ہے تو ہماری نظر میں۔ اگر ہمیں بُرائی نظر آتی ہے تو یوں سمجھیے کہ ہم خود اُس کی تخلیق کر رہے ہیں، ہم جو کچھ ہیں اُسی کا عکس ہم خارجی دنیا کے آئینہ خانے میں دیکھتے ہیں، یہ جسم بھی خود ہمارا بنایا ہوا ہے، اور یہ تمام کائنات بھی خود ہماری ہی تخلیق ہے ہمارے لطیف خیالات ہی ٹھوس صورت اختیار کرکے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر وقت یہی سوچنا چاہیئے کہ ہم "وہ" ہیں۔ یہ پورا عالم ہمارا ہی شریر (جسم) ہے، یہ سوچ کر ہی ہمیں اس بات کا گیان ہوگا کہ ہم امر ہیں۔ زندۂ جاوید ہیں[2]۔ ہم ایک دُوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کیوں کہ یہاں تو کوئی دوسرا ہے ہی نہیں، ہماری نہ ابتدا ہے نہ انتہا، نہ کبھی ہمارا جنم ہوا نہ کبھی موت آئیگی، ہم تو "وہ" ہیں، ہماری اصل پریم ہے اور بس۔ آؤ اس حقیقت کا اعلان کرو اور کہو "یہ تمام عالم میرا ہی شریر ہے، سب تندرستی اور توانائی مجھ ہی میں ہے، میں ہی اصلِ نشاط ہوں، تمام مسرتیں مجھ میں بسی ہیں" یاد رکھو کہ دنیا کے تمام اعمال وافعال خود ہماری ہی ہستی کا عکس ہیں۔ یوگ کے عمل سے بالآخر اسی حقیقت کا تو ہم احساس کر لیتے ہیں، اگرچہ بظاہر ہم زندگی کی سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں ہیں لیکن ہم ہستی کے بے کنار سمندر سے جُدا تو نہیں، بھلا کسی لہر کا بجائے خود قیام ہی کیوں کر ہو سکتا ہے، ہم تو اس سے پیوستہ ہیں، ہم تو "وہ" ہیں۔

اس خیال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو، تخیل سے بجا کام لو اس طرح ہمارا تخیل ہمارا بہت بڑا دوست اور مددگار ثابت ہو سکتا ہے جہاں عقل وادراک کی رسائی نہیں وہاں تخیل کی پہنچ ہے جہاں مدرکات کے دیئے بجھ جاتے ہیں وہاں تخیل کی روشنی ہی ہماری رہنمائی کرتی ہے بلند ترین خیال انا الحق کا خیال ہے، میں "وہ" ہوں کے خیال میں بس کر زندگی کرنا ہی یوگ کا عملی مقصد ہے، جسے ہم الہام کہتے ہیں وہ کوئی خارجی چیز نہیں ہے، الہام باطن سے ہوتا ہے اگر ہم القا کی روشنی کے طالب ہیں تو ہمیں اپنی اعلیٰ ترین قوتوں کو کام میں لا کر یہ روشنی خود اپنے اندر سے پیدا کرنا ہوگی۔

---

[1] Thou are That.

[2] ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔

پانچواں سبق

پرتھارا اور دھرنا[1]

بھگوان کرشن نے گیتا میں فرمایا ہے" مجھے کوئی کسی بھی طریقے سے ڈھونڈھے آخر سب مجھ تک آجاتے ہیں آخر سب کو مجھ تک پہنچنا تو ہے ہی" بھگوان تک پہنچنے کا ایک طریقہ راج یوگ ہے، اس یوگ کے اس عمل میں "پرتھارا" کے معنی ہیں من کو اِدھر اُدھر سے سمیٹ کر مطلوبہ شے پر معکوس کرنا، من کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ من ہے کہاں، اس لئے اس مشق کا پہلا قدم یہ ہے کہ من جہاں جاتا ہے اُسے جانے دیجئے صرف دیکھتے جایئے کہ یہ کہاں کہاں بھٹکتا ہے، کیا کیا سوچتا ہے اس کے بعد اسے ایک مرکز پر لانا ممکن ہو جائے گا۔ آخر من رُوح نہیں ہے یہ تو مادہ ہی کی لطیف صورت ہے، جیسے ہم جسم کے مالک ہیں ویسے ہی من پر بھی ہماری ملکیت ہے اور ہم اپنی اعصابی قوتوں سے کام لے کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتے ہیں۔ ہماری ذات جسم اور من دونوں سے بالا ہے ہم آتما ہیں ہم ابدی ہیں غیر تغیر پذیر ہیں، ہم شاید معنی ہیں جسم اور من (دماغ) دونوں ہمارے وجود سے قائم ہیں۔ آخر ہمارا جسم (شریر) اُن لطیف داخلی محرکات کا جسے ہم دماغ (من) کہتے ہیں، ایک ٹھوس خارجی منظر ہے یا یوں کہئے کہ جسم نتھرا یا ہوا دماغ ہے، خیال کی لطافت مجسم شریر بن گئی ہے۔

اس لطیف طاقت کو بس میں لانے کے لئے ہی تو پرانا یام کا عمل برتا جاتا ہے۔ جب سانس بائیں نتھنے سے چل رہا ہو تو آرام کرنے کی علامت ہوتی ہے، اس وقت آرام کر لینا چاہیئے جب سانس دائیں نتھنے سے چلے تو وہ کام کا وقت ہوتا ہے لیکن جب سانس ہموار ہو کر دونوں نتھنوں سے برابر چل رہا ہو تو وہ وقت دھیان کا ہوتا ہے، ایسے وقت میں ہمارے جسم میں توازن اور سکون ہوتا ہے یہی حالت غور و فکر اور دھیان گیان کے لئے موزوں ہوتی ہے، باقی وقت میں یکسوئی کی کوشش فضول ہوتی ہے۔

پرانا یام کی مشق سے خیالات آہستہ آہستہ خود بخود بس میں آجاتے ہیں اُس کی مشق برابر جاری رکھنا چاہیئے جب انگوٹھے اور اُنگلی سے نتھنوں کو بند کرنے کی کافی مشق ہو جائے تو آپ دیکھیں گے تو قوتِ ارادی یا صرف خیال ہی کی مدد سے آپ ایسا کرنے کے قابل ہو جائیں گے، اس مقام پر پرانا یام کے عمل میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت

---

[1] Pratyahara and Dharna.

ہوتی ہے۔ اگر عامل کسی خاص اشٹ[1] (بھگوان کی کوئی مخصوص صورت، اوتار، پیغمبر، محبوب آدرش) پر ایمان رکھتا ہو تو سانس لیتے اور نکالتے وقت اوم کے بجائے اپنے "اشٹ" کا نام لینا چاہیئے اور سانس روکنے (کُمبھکا) کے وقت لفظ "ہُوم[2]" کا استعمال کرنا چاہیئے، رُکے ہوئے سانس کو بالتواتر "ہُوم" کہتے ہوئے "کُنڈلینی" یعنی ریڑھ کی ہڈی کے اژدہے کے سر پر بار بار زور سے دے ماریئے اور خیال کیجئے کہ یہ عمل اُسے جگا دے گا دُوسرے یہ سوچئے کہ آپ کی خُودی خُدا سے وابستہ ہے۔ آپ پرماتما سے مُتصل ہیں۔ اِس طرح آپ اپنے آپ کو مَن سے جُدا کر لیں گے، اِس کے بعد آپ کے خیالات دَبے پاؤں آپ کے مَن میں نہیں آ پائیں گے۔ جب بھی کوئی خیال آپ کے من میں اُٹھے گا آپ اس کی آمد سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔ یا یوں کہیئے کہ ہر خیال اپنی آمد کا اعلان کر کے آئے گا اور ہم اس راز سے واقف ہو جائیں گے کہ من میں خیال کیونکر اور کیسے پیدا ہوتے ہیں یہاں تک کہ کسی خیال کے شعوری سطح پر آنے سے پہلے ہی ہم جان لیں گے کہ اب من کیا سوچنے والا ہے۔ جس طرح عام زندگی کی سطح پر ہم دُور ہی سے کسی کو آتا ہُوا دیکھ لیتے ہیں اسی طرح داخلی دنیا میں بھی ہم خیالات کو اُٹھتا ہوا دیکھ پائیں گے۔ یہ وہ مقام ہے جب ہم اپنے آپ کو اپنے من سے بالکل جُدا کر پاتے ہیں اور اپنی ذات کو اپنے خیالات سے علیحدہ دیکھنے لگتے ہیں یوگ یہی ہے کہ خیالات کو اپنی ذات پر غالب نہ آنے دیا جائے اور اپنی ذات کو من سے علیحدہ کر کے خیالات کا دُور سے تماشہ کیا جائے۔ اس طرح سے تمام خیالات خود بخود مر جاتے ہیں۔ پہلے عام خیالات کی جگہ تقدس کے خیالات دل میں بھر لیجئے پھر اِن مقدس خیالات کی پیروی کرتے ہوئے اُن کے ساتھ ساتھ چلتے جایئے حتیٰ کہ یہ خیالات بھی آہستہ آہستہ مِٹ جائیں، اس مقام پر قادرالمطلق خدا کا جلوہ آپ کے سامنے موجود ہوگا۔ یہ ہے وہ مافوق الشعوری حالت جب عیاں یا خیالات مِٹ جاتے ہیں۔ خُدا کے خیال کے ساتھ ساتھ چل کر اس مقام تک آ جایئے جہاں خیال کا بھی گزر نہیں، جہاں خیال گُھل جاتا ہے، خدا کے خیال کے ساتھ گُھل جایئے، پھر خُدا ہی خُدا ہوگا۔

یوگ کے عمل کے دَوران میں آپ کو مختلف رُوحانی تجربات حاصل ہوں گے اور رُوحانی جلوے نظر آئینگے مثلاً یوگی ان نورانی حلقوں کو بخوبی دیکھ سکتا ہے جو انسان کے نورِ باطن کی علامت ہیں کبھی کبھی ہمیں کوئی چہرہ شعلوں سے گھِرا ہوا دکھائی دیتا ہے ان شعلوں کی روشنی میں ہم اس کے کردار کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں، ایسی حالت میں جو شناخت ہوتی ہے وہ ہمیشہ بے خطا ہوتی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا "اشٹ" (بھگوان کی وہ مخصوص صُورت جس کو ہم پوجتے ہیں مثلاً اوتار پیغمبر) ہمارے سامنے خود جلوہ گر ہو ایسی حالت میں ہم اس منور جلوے میں مگن ہو کر اس پر یک سُوئی سے دھیان لگا سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھوں دیکھی چیز کا کوئی مقابلہ ہی

---

[1] Ishta.   [2] "Hum" (Hoom).

نہیں۔ یوں تو ہم اپنے تمام حواس کے ذریعے کسی شے کا تصور کر سکتے ہیں لیکن جو تصویر کسی کو آنکھوں سے دیکھ کر قائم ہوتی ہے وہ زیادہ صاف اور دیرپا ہوتی ہے ہمارا تخیل اور تصور زیادہ تر ہماری نظر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے خیالات اور تصورات نیم لطیف نیم مادی ہیں ہم کسی صورت نشان یا علامت یا دھیمے کے بغیر سوچ ہی نہیں سکتے بات یہ نہیں کہ فکر و خیال اور اس کی ظاہری مجسم صورت لازم و ملزوم ہیں مثلاً جانور اپنے خیالات کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اُن میں سوچ بچار کی اہلیت ہی نہیں ہے بلکہ جہاں تک ملاحظہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانور بھی سوچ سکتے ہیں اس لئے گمان غالب ہے کہ خیال اور اُس کے اظہار میں کوئی ایسا تعلق نہیں جس کی وجہ سے وہ ایک دُوسرے کے بغیر قائم ہی نہ رہ سکیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خیال کو اس کے مجسم اظہار سے تقویت پہنچتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے "اُشٹ" کا جلوہ پا کر اپنے دھیان کو اُس پر پُوری طرح مرکوز کر سکتے ہیں اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یوگ کے عمل میں اپنے تخیل کو قائم اور برقرار رکھیے اور اس سے پوری مدد حاصل کیجیے لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ کے خیالات پاکیزہ اور مقدس ہوں ہم میں سے ہر ایک کی قوتِ متخیلہ اپنی اپنی خاصیتیں لئے ہوئے ہوتی ہے اس لئے لازم ہے کہ ہر شخص کو اس راہ چلنا چاہیے جو اس کے لئے فطرتی پر موزوں ہو، اس سے یوگ میں آسانی ہوتی ہے جو صورت ہماری آج ہے وہ پچھلے جنموں کے کرموں کا نتیجہ ہے جیسا کہ بودھ مت والے کہتے ہیں "ایک چراغ سے دُوسرا چراغ جلتا ہے" چراغ مختلف ہوتے ہیں لیکن روشنی ایک ہے۔ مختلف جنموں میں ہماری صورت مختلف ہو سکتی ہے، لیکن ہماری ذات، ہماری اصل ایک ہے آخر ہمیں اس حقیقت کو پانا ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، عمل سے سب کچھ ہو سکتا ہے، خوشی خوشی اور ہمت باندھ کر عمل کیے جاؤ کامیابی یقینی ہے، صبر و تحمل سے کام لو۔ استقلال اور استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دو جسمانی اور دماغی پاکیزگی کا خاص خیال رکھو، روز غسل کرو خیالات کو پاک اور صاف رکھو۔ آخر ایک دن تم یوگی بن جاؤ گے۔ جلد بازی مت کرو اگر مشق اور عمل کے دوران میں زبردست رُوحانی اور نفسیاتی قوتیں ہاتھ آئیں تو بھی اُن کو میل راہ سمجھ کر پیچھے چھوڑ دو اور آگے بڑھتے جاؤ یاد رکھو کہ یہ قوتیں غیر محتاط آدمی کو گمراہ کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ دیکھنا کہیں یہ قوتیں تمہیں اپنی راہ سے بہکا نہ دیں بس ایک خدا ہی کو اپنا سچا مقصد بنائے رکھو، صرف ابدیت کی تلاش کرو جسے پانے کے بعد سدا کے لئے چین اور سکون مل جاتا ہے جب کُل کو پالیا تو پھر رہ ہی کیا گیا جس کے لئے تگ و دو کی جائے۔ اس کے بعد ہمارا وجود کامل اور آزاد ہو جاتا ہے، ہمیں اکملیت کا وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جسے ستیہ چت آنند کا نام دیا گیا ہے جہاں ہمارا وجود کامل ہمارا علم (گیان) کامل اور ہمارا سرور (آنند) کامل ہو جاتا ہے ٭

—o—

چھٹا سبق

"سوشمنا"[1]

سوشمنا پر دھیان کرنا بہت ہی مفید ہے۔ جب آپ کو اس کی جھلک مل جائے تو مدت تک اس پر دھیان کیجئے، دھیان کا یہ طریقہ بہترین ہے، ریڑھ کی ہڈی کے متعدد مقامات سے گزرتا ہوا یہ راستہ مُکتی اور نجات کا زندہ راستہ ہے، یہ ایک نہایت درجہ لطیف اور روشن دھاگے کی طرح ریڑھ کے سلسلے کے بیچ سے گزرتا ہے، "کنڈلینی" بیدار ہو کر اُسی راستہ سے دماغ کی طرف اوپر اُٹھتی ہے یوگ کی اصطلاح میں "سوشمنا" کے مختلف مقامات کو کنول[2] کہتے ہیں نیچے والا کنول ریڑھ کی نیو کی مثلث کے گرد ہوتا ہے، اور سب سے اُونچا کنول دماغ میں صنوبری (تخلیقی) غدود[3] کے گرد، ان دونوں کے درمیان چار کنول اور ہیں یعنی سوشمنا کے کُل چھ مقام (کنول) ہیں، یہ مقام یوں ہیں:

۱۔ ریڑھ کی نیو کا کنول ۔ ۲۔ ناف (نابھی کے مقابل) کا کنول ۔ ۳۔ دل کا کنول ۔ ۴۔ حلق کا کنول ۔ ۵۔ آنکھوں کے درمیان کا کنول ۔ ۶۔ صنوبری (تخلیقی) غدود (یعنی دماغ) کا کنول ۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں کنڈلینی کو جگا کر آہستہ آہستہ ان چھ مقامات سے گزرنا ہے، باری باری ہر منزل سے اُوپر اُٹھتے ہوئے دماغ کی منزل تک پہنچنا ہے، ہر مقام ہمارے من کی ایک تہ کے برابر ہے، ہمیں ایک ایک کرکے ان تہوں کو کھولنا ہے اور بالآخر عرفان کی بے کنار وسعتوں کو پانا ہے، یہی یوگ ہے ۔

---

[1] Sushumana. [2] Lotuses.

[3] Pineal gland.

حق ورعائت[1]

(یہ لیکچر سیسم[2] کلب لندن میں دیا گیا)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کارخانے میں دو متضاد طاقتیں کام کررہی ہیں ۔ایک تفریق کی طاقت ہے اور دوسری تنظیم کی پہلی طاقت ہر وقت چیزوں کے فرق اور اُن کی انفرادیت کو ابھارتی ہے ۔ اور اُنھیں ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے ۔ دوسری طاقت تفرقات سے قطع نظر کر کے اُن کی بُنیادی یکسانیت پر زور دیتی ہے ، اور انفرادیت کو مجموعی وجود بخشتی ہے ۔ قدرت کے ہر شعبے اور ہر مظہر میں یہ دونوں طاقتیں کارفرما ہیں ۔ اور اُن کے عمل سے اِنسان کی زندگی کا ہر پہلو متاثر ہوتا ہے ۔مادّی اور طبیعاتی سطح پر ان دونوں طاقتوں کا عمل صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی طاقت ہر چیز کو دوسرے سے جُدا کرتی ہے ۔ اُن کے درمیانی فرق کو بڑھاتی ہے اور اُن میں اور بھی زیادہ امتیاز پیدا کرتی چلی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ زندگی کے نئے نمونے ظہور میں آتے ہیں ۔اس کے برعکس دوسری طاقت شکل اور صورت وغیرہ کی مشابہت پر زور دیتی ہے اور اس کی بنا پر جماعتوں اور نوع[3] کے تصور کو جنم دیتی ہے ۔اِنسانی زندگی میں بھی یہ دو طاقتیں ہمیشہ سے کارفرما رہی ہیں ۔

پہلی طاقت آدمی آدمی میں امتیاز اور اس فرق کو پیدا کرتی ہے اس قدر بڑھاتی ہے کہ ہر فرد کو دوسرے سے جُدا کر کے رہتی ہے ۔اس کے برعکس تنظیم اور اتحاد کی طاقت آپس میں ملتی جُلتی باتوں کو اُبھار کر افراد کو اول جماعتوں میں منقسم کرتی ہے اور پھر قوموں نسلوں اور نوع انسانی کے شیرازے میں باندھ دیتی ہے ۔جب سے ہماری

ھ۱ Privilege.　ھ۲ Sesame Club.　ھ۳ Species.

مجموعی زندگی کی تشکیل ہوئی ہے۔ اُس وقت سے آج تک یہ دونوں طاقتیں ہمارے سماج میں اپنا اپنا تفریق و تنظیم کا عمل دکھا رہی ہیں۔ مختلف مقاموں پر، مختلف زمانوں میں ان کا عمل مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا رہا ہے اور اُسے طرح طرح کے نام دیئے گئے ہیں۔ لیکن درحقیقت بات اتنی ہی ہے کہ ایک طرف تفریق کی طاقت ذات پات، اور اونچ نیچ کے درجے بناتی رہی ہے اور دوسری طرف تنظیم اور اتحاد کی طاقت ان تفرقات کو مٹانے میں کوشاں رہی ہے۔ ایک طرف ان خودساختہ تفرقات کی بنا پر حقوق کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور دوسری طرف اِس عمارت کو ڈھانے کی لگاتار کوشش ہوتی رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام دُنیا اِن دونوں طاقتوں کے لئے میدانِ جنگ بن رہی ہے۔ تفریق کے حامی کہتے ہیں کہ دُنیا کی بنیاد ہی تفریق پر ہے۔ تفریق ہی زندگی ہے۔ مکمل یکسانیت موت کا دوسرا نام ہے۔ اِس سے انکار نہیں کہ دُنیا میں یکسانیت کا عمل بھی ہوتا رہتا ہے۔ قدرت کی طاقتوں میں یکسانیت کی طاقت بھی اپنا مقام رکھتی ہے لیکن انسان کو اس طاقت کا مقابلہ کرنا چاہیئے نہیں تو یہ تمام زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔ جب دائرۂ حیات کا ہر نقطہ اپنے مرکز میں جذب ہو جائے گا تو دائرہ ہی نہیں رہے گا۔ تمام کائنات عملِ تفریق کا کرشمہ ہے تنظیم اور اتحاد سے یہ تمام مناظر سمٹ کر ایک بے جان اور ہموار مادہ کی صورت اختیار کر لیں گے اور ہمیں ایسی حالت منظور نہیں۔ یہی دلیل ہمارے گردونواح کی دوسری سب چیزوں پر عاید ہوتی ہے اور تو اور اگر ہمارے اجسام میں بھی مکمل یکسانیت پیدا ہو جائے تو اجسام کی موت واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر سماج سے درجہ بندی اُٹھ جائے تو سماج ہی نہیں رہے گا اور اگر کہیں ہمارے خیالات اور احساسات میں بھی یکسانیت آجائے تو ہمارے دماغ کمزور اور نکمے ہو جائیں گے۔ یکسانیت کو زندگی سے دُور رکھنا ہی بہتر ہے۔ تفریق کے پرستاروں کی یہ دلیل لفظوں کے معمولی اُدل بدل کے ساتھ ہر ملک اور ہر زمانے میں پیش کی گئی ہے۔ مثلاً ہندوستان کے برہمن اسی دلیل کی بنا پر کہتے ہیں کہ ذات پات سماج کے لئے ضروری ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان کی مجموعی زندگی کے لئے فرق و امتیاز لازمی ہے۔ اس طرح سے یہ لوگ سماج کی تقسیم اور درجہ بندی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس درجہ بندی کی بدولت اُن کی اپنی ذات کے وہ مخصوص حقوق بحال رہتے ہیں جو اُنہوں نے دوسری ذاتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھ کر حاصل کئے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ذات کے فرق کو مٹانے سے سماج ہی مٹ جائے گا اور اس کے ثبوت میں بڑے فخر سے خود اپنے سماج کی مثال پیش کرتے ہیں جو پچھلے ہزاروں سالوں سے زندہ ہے۔ حالانکہ اس عرصے میں اور قومیں اُٹھیں اور مٹ گئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو نظام قوموں کو لمبی عمر عطا کرتا ہے، وہ یقیناً اُن سب دوسرے نظاموں سے بہتر ہے جس کے تحت قومیں جلد ہی مٹ جاتی ہیں۔

بظاہر اِن باتوں میں ضرور زور ہے۔ لیکن اس کے برعکس یکسانیت کے طرفدار بھی کچھ کم نہیں۔ ہر ملک

اور ہر زمانے میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو یکسانیت کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں رہے ہیں۔ اُپنشدوں کے زمانے سے لے کر آج تک دُنیا کے مہاتماؤں اوتاروں، پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں (مثلاً مہاتما بدھ اور یسوع مسیح) نے یکسانیت اور مساوات کی تبلیغ کی ہے آج اِس فلسفۂ مساوات و یکسانیت نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا ہے لیکن اس کی اصل مذہبی مساوات سے مختلف نہیں ہے۔ مذہبی رہنما ہمیشہ مظلوموں اور غریبوں کے حقوق کو منوانے میں لگے رہے ہیں وہ ہمیشہ ذات پات اور درجہ بندی کے خلاف رہے ہیں۔ کیونکہ اس سے سماج کے چند رُکن سب حقوق کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ تفریق ہی ظلم و ستم کی جڑ ہے، اِس لئے تفریق کو مٹانے ہی میں نجات ہے۔

اِس طرح تفریق و تنظیم کی طاقتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہی ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے لئے خاص حقوق حاصل کر لئے ہیں وہ اُنھیں قدرتی طور پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہر طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی بے طرفہ اور لغو کیوں نہ ہوں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو آئے دن کے ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتے۔ اور انسانی مساوات کو عملی طور پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بسا اوقات جوش میں آکر یہ لوگ بھی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اور یک طرفہ اور لغو باتیں کرنے لگتے ہیں۔

اب مافوق الطبعیات اور الٰہیات[لے] کی طرف آئیے یہاں بھی آپ کو دو متضاد نظریئے ملیں گے۔ بودھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی ایسی ہستی کے تصور کی ضرورت ہی نہیں جو اس دُنیا کی کثرت کو وحدت کا رنگ دے دُنیا جیسی ہے ویسی ہی ہے ہمیں تو اس کثرتِ نظارہ کو قبول کرنا چاہیئے۔ یہی کثرت تو اس جہان کی جان ہے۔ مانا کہ اس سے دُکھ پیدا ہوتا ہے۔ مانا کہ اِس میں خامیاں ہیں لیکن اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے۔ ویدانتی کہتے ہیں کہ حقیقت ہے تو بس وحدت کی، کثرت تو بس دکھاوے کی بات ہے۔ مایا ہے۔ اس لئے وہ سب کو یہی رائے دیتے ہیں۔ مایا کے جنگل سے نکل کر وحدت کو پانے کی کوشش کرو۔ اس کے برعکس بودھ کہتے ہیں۔ وحدت خیالی چیز ہے۔ دھوکا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو نظر آتی ہے۔ بودھوں اور ویدانتوں کے اعتقادات کا یہ فرق آج تک نہیں مٹ سکا اور آج بھی دُنیا میں دو قسم کے مفکر ملیں گے۔ ایک وہ جو دُنیا کو مایا کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس جہانِ شہود کے علاوہ کسی اور ہستی کی حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ الٰہیات اور مذہب پانچ ہزار سال پہلے اپنے کمال تک پہونچ گئے تھے۔ اس کے بعد تو ہم اُن ہی حقائق کو مختلف زبانوں اور پیرایوں میں بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہاں زمانے کے ساتھ ساتھ نئی نئی مثالیں پیش آتی رہی ہیں اور

لے Metaphysics.

ہمارا مذہبی ادب اس دولت سے مالا مال ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی طور پر آج بھی دو نظریئے پیشِ نظر ہیں۔ ایک عالمِ شہود ہی کو حقیقت مانتا ہے۔ اور دوسرا اس کثرت کے پیچھے وحدت الوجود کا حامی ہے۔ کثرت کے حامی بڑے زور شور سے اعلان کرتے ہیں کہ زندگی نام ہی کثرت اور تفریق کا ہے۔ وحدت اور یکسانیت موت کا دوسرا نام ہے۔ اس کے خلاف وحدت کے پرستار پورے وثوق کے ساتھ دعوے کرتے ہیں۔ کہ یہ تمام کثرت وحدت سے پیدا ہے۔

وحدت اور کثرت کی یہ جنگ اخلاقیات کے میدان میں اچانک ختم ہو جاتی ہے علمِ اخلاقیات وہ واحد علم ہے جس میں وحدت اور کثرت کا جھگڑا اٹھتا ہی نہیں۔ اخلاقیات کی بنیاد محبت اور اتفاق پر ہے۔ یہاں تفرقات کی گنجائش ہی نہیں۔ اس بات پر وحدت اور کثرت کے حامی دونوں متفق ہیں کہ اخلاقیات میں چھوٹے بڑے کی تفریق و تمیز کی اجازت نہیں۔ اخلاقیات کا مقصد ہی یکسانیت اور مساوات ہے، آج تک دُنیا میں جتنے بھی بلند پایہ اخلاقی نظام قائم کئے گئے ہیں۔ سب کے سب مساوات اور اخوت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ تفریق کو گوارا نہیں کرتے اُن کا آدرش تو یکسانیت ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر اخلاقیات میں وحدت اور یکسانیت اور مساوات کے اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں تو کیا وحدت اور کثرت کے نظریوں کے اختلاف کو کسی اور طرح بھی مٹایا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی دماغ کی خاصیت یہ ہے کہ ہر قسم کی کھوج نکالنے میں تیز ہے۔ ویدانتیوں کے دُور رس دماغ نے زندگی کا تجزیہ کر کے وحدت کے نظریئے کو پیش کیا اور اسی پر اخلاقیات اور مذہبی تعلیم کی بنیاد رکھی۔ اِس کے خلاف بودھوں نے اس وحدت کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کثرت بجائے خود ہی حقیقت ہے۔ اور دُنیا کی مختلف چیزوں میں کوئی ایسا تعلق نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ سب کی اصل ایک ہے۔ یُورپ میں یونانی فلاسفر بھی اسی نتیجے پر پہونچے۔ پروفیسر میکس مُلر نے اپنی ایک کتاب میں اس بات کو ایک کہانی کے رُوپ میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک برہمن ایتھنز میں سُقراط سے ملنے گیا۔ برہمن نے سقراط سے پُوچھا "یہ بتائیے کہ بلند ترین علم کیا ہے"؟ سقراط نے کہا "تمام علوم کا مقصد یہ ہے، کہ اِنسان اپنے آپ کو پہچانے"۔ برہمن نے کہا بھلا خُدا کو جانے بغیر انسان اپنے آپ کو کیونکر جان سکتا ہے" یہ ہے تفریق و تنظیم کے نظریوں کے فرق کا ایک اور پہلو یُونانی نقطۂ نگاہ سے (جو آج کل یُورپ کا نقطۂ نگاہ ہے) انسان کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے متعلق خارجی علم حاصل کرے۔ ہندوستانی زاویۂ نظر سے (جو تمام پُرانے مذہبوں کا زاویۂ نظر ہے)، اِنسان کو پہلے خدا کے متعلق آگہی ہونی چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں یونانیوں کے لئے خدا کا تصور قدرت ہی کے تصور میں موجود ہے لیکن ہندوستانی خدا ہی میں قدرت کو بسا ہوا پاتے ہیں[لے]۔ خوش قسمتی سے آج ہم ایک طرف

لے The one sees God in Nature, the other sees Nature in God.

Printed at : PRABHAT OFFSET PRESS
2841, Kucha Chelan, Darya Ganj, Delhi